

امام عظیم
رحمۃ اللہ علیہ

اور

علم الحدیث

حضرت لانا محمد علی صاحب صدیقی کا زحلوی

امام اعظم اور علم الحدیث

مؤلف
حضرت مولانا محمد علی صاحب دہلوی
صدر دارالعلوم الشہابیہ
سیالکوٹ

انجمن دارالعلوم الشہابیہ ○ ریکورڈ وڈ سیالکوٹ شہر

(جملہ حقوق محفوظ)

ملکیت	— — — —	انجمن دارالعلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ
تالیف	— — — —	مولانا محمد علی الصدیق، الکاظمی
ترتیب فہارس	— — — —	عبدالوکیل علوی ایم۔ اے
عناوین	— — — —	۲۸۸
آیات	— — — —	۵۲
احادیث	— — — —	۹۳
طابع	— — — —	حفیظ اللہ فاروقی
تنزیہ و آرائش	— — — —	سید نفیس الحیدری، لاہور
کتابت	— — — —	محمود صوفی، گوجرانوالہ
مطبع	— — — —	نہالہ بشیر پٹر، لاہور
کل صفحات	— — — —	۸۱۲
تاریخ اشاعت	— — — —	اپریل ۱۹۸۱ء

قیمت روپے ۵۵۵

انتساب

عالی جناب عباس حسین ملک رئیس اعظم شہر سیالکوٹ کے نام
جن کی دینی حمیت اور محبت اسلام میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ
وریادلی اور ہمدردانہ عنایت کی انجمن دارالعلوم الشہابیہ
رہن منت ہے اور جو اپنے دل میں آئندہ بھی انجمن کے
فلاحی، تعلیمی اور تبلیغی کاموں کو پروان چڑھانے کا
خاص جذبہ رکھتے ہیں۔

انجمن دارالعلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ

پیش لفظ

باسمہ سبحانہ :-

۱۹۵۳ء میں جب مرزا بیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک میں نظر بندی کے ایام سیالکوٹ جیل میں گزار رہا تھا، میراجی چاہا کہ علم حدیث میں امام اعظم کی جلالتِ قدر اور اس فن میں اُن کی عظمت کو شاہراہِ عام پر لاؤں اور یہ تمنا اس لیے ہوئی کہ جیل ہی کی زندگی میں ایک روز صبح کی نماز کے بعد اذکارِ مسنونہ میں مشغول تھا کہ اچانک میری جیل کی زندگی کے دورِ فیتق میرے کمرے میں آئے۔ ان میں سے ایک کو میرے سے عقیدت اور دوسرے کو عقیدت تو نہیں مگر تلمذ کی نسبت حاصل تھی۔ بغیر کسی تمہید کے دونوں نے مجھ سے دریافت کیا:

آپ دارالعلوم الشہابیہ میں کس قدر عرصہ سے رہتے ہیں؟
میں نے جواباً بتایا کہ

۱۵ فروری ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم الشہابیہ سے وابستگی ہوئی ہے اور اب ۱۹۵۳ء ہے حساب کر لو غالباً اٹھارواں سال ہے۔

اٹھارہ کا لفظ سنتے ہی دونوں کچھ چونک سے گئے اور باہم آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنے لگے
میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟
اُن میں سے ایک نے کہا کہ

میں نے آج رات خواب دیکھا ہے کہ میں دارالعلوم گیا ہوں۔ دارالعلوم کا کتب خانہ بڑا شاندار ہے
شیشہ لگی ہوئی خوبصورت الماریاں ہیں، کتب خانے میں ایک نورانی صورت بزرگ ہستی سپید لباس
میں جلوہ افروز ہے۔ میں نے اُن سے مصافحہ کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ ہیں۔
میں نے مؤدبانہ انداز میں دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم الشہابیہ میں کتنے عرصہ سے قیام پذیر ہیں۔
جواب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے غالباً اٹھارواں سال ہے۔

میں یہ خواب سن کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ دو روز تک اسی پریشانی میں وقت گزرا تیسرے دن میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا اس خواب کے بعد میرے قلب میں امام اعظم کی محدثانہ نشان اور علم حدیث میں ان کی عظمت کے موضوع پر کام کرنے کا داعیہ رونما ہوا اور اس داعیہ کا اپنے دوستوں میں اظہار بھی کر دیا۔ جب میں نے اپنے احباب کو یہ بات بتائی تو میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو تیرہ برس تک التوا میں پڑا ہے کا لیکن حالات و واقعات کچھ اسی طرح بن گئے۔

ارمغانِ ایمان

جیل سے باہر آتے ہی دوستوں کے اصرار سے ارمغانِ ایمان پر نظر ثانی کی۔ مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو دارالعلوم کی انتظامی اور اہتمامی مصروفیات سب راہ ہو گئیں۔ نئے انداز میں نئے طرز کے اسکول کا آغاز کیا، پرائمری پھر مڈل۔

اسلام کا نظامِ اذکار

اسکول کی انتظامی مصروفیات ہی میں اسلام کا نظامِ اذکار نامی کتاب کی طباعت کا مرحلہ بھی پیش آگیا۔ اس کے لیے جب مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے کمر ہمت باندھی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری کتاب پر نظر ثانی کی جائے اصل کتاب صرف ۷۷ صفحات پر مشتمل تھی نظر ثانی میں کتاب کی ضخامت ساڑھے تین سو صفحات سے زائد ہو گئی۔

نقوشِ زنداں

جیل کی زندگی میں کچھ وقت خود ہی تفریح طبع کے لیے مقرر کر رکھا تھا اور تفریح یہ ہوتی تھی کہ روزانہ قلم کی زبان سے کسی عزیز، کسی دوست اور کسی بزرگ کو مخاطب کر کے جو کچھ جی میں آتا لکھ دیتا مختلف بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھتے ہوتے یہ خطوط میرے بکس میں محفوظ تھے۔ میرا معمول تھا کہ جو کچھ بھی لکھتا تاریخی ترتیب کے ساتھ بکس میں رکھ دیتا۔ جیل سے آنے کے بعد کافی عرصہ یہ خطوط لکھے رہے۔ ایک روز میں نے یہ خطوط نکال کر مولوی محمد شریف قاسمی کو نقل کرنے کے لیے دیے۔ مولوی صاحب نے ان کو اس طرح نقل کیا کہ ان کا حسن و جمال دوبالا ہو گیا۔ احباب نے

پڑھے تو ان کی طباعت کے لیے متقاضی ہو گئے۔ بالآخر مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا بھی انتظام کیا۔

ان کاموں سے فراغت ہوتی تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ نے اپنی نگرانی میں مختلف ادارے کھول دیے۔ پرائمری اسکول، مڈل اسکول، شعبہ حفظ قرآن، شعبہ علوم اسلامی، شعبہ تبلیغ، شعبہ نشر و اشاعت اور دارالافتاء۔ انتظامی و اہتمامی مشغولیتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ فرصت میرے لیے معدومات میں سے ہو گئی اور اس پر یہ سرگرائی کہ اخراجات کے لیے آمد کے وسائل ساتھ نہ دیتے تھے۔ یہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں پورا اتروں انتظامی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمیٹیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ امام اعظم پر کچھ لکھنا پر سکون زندگی کے بغیر ممکن نہ تھا اور زندگی کا سکون میرے لیے عنقا تھا۔ بار بار ایسا ہوا کہ کچھ سرمایہ جمع کیا جو نہی ترتیب کے لیے تیار ہوتا تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ کے مختلف اداروں کی پھیلی ہوئی پریشانیوں سے طبیعت میں انقباض آجاتا اور دوچار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑتا۔

ستمبر ۶۵ء کی چھ تاریخ تھی کہ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان پر ناپاک ارادوں سے حملہ کر دیا۔

دارالعلوم کے تمام ادارے بند ہو گئے اور سہ عدد شریعہ برانگیزہ کے خیرادراں باشند کے مطابق میں جس سکون کی تلاش میں تھا الحمد للہ مل گیا۔ تنہائی اور بالکل تنہائی۔ میں اور میری رفاقت کا کام دارالعلوم کے کتب خانے کی کتابیں کر رہی تھیں۔ الحمد للہ، ادن کی شبانہ روز محنت کے بعد امام اعظم اور علم الحدیث کی ہستی وجود میں آگئی ضروری ہے کہ امام اعظم اور علم الحدیث کے متعلق چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ کتاب کی ترتیب سے مقصود یہ تھا کہ امام اعظم کی محدثانہ شان کو خود محدثین کی زبانی شاہرو عام پر لایا جائے لیکن محدثانہ شان کو بتانے کے لیے مولف نے محسوس کیا کہ علم حدیث کے تاریخی تعارف کے بغیر یہ بحث اصولی حیثیت سے ناممکن ہے گا۔ اس لیے اولاً علم حدیث کا تاریخی چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ مقصد کے پیش نظر جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اول کوشش کی گئی ہے کہ حدیث میں امام اعظم کی علمی زندگی کا کوئی گوشہ بغیر اشارہ و تشریح کے نہ رہ جائے اور جن جن مقامات کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت محسوس ہوئی ان پر مستقل مباحث لکھے گئے۔ یہ مباحث بعض مقامات پر قدرے طویل ہو گئے مثلاً حدیث میں امام اعظم

کے اساتذہ پر پورے سو صفحات کا بحث ہے۔

مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت پر بیس صفحات میں تبصرہ ہے۔

تاریخ تدوین حدیث کا چونکہ امام اعظم سے خاص تعلق ہے اس لیے یہ بحث ۲۹۳ سے شروع ہو کر ۳۲۶ تک آگئی ہے۔

تصانیف کی تاریخ کے تذکرے میں کتاب الآثار پر مختلف حیثیتوں سے صفحہ ۳۲۴ سے ۳۲۶ تک بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ حدیث کی دوسری کتابوں مثلاً مؤطا، جامع معمر، جامع سفیان کے ساتھ اس دور کی تصانیف کا پورا تاریخی خاکہ صفحہ ۳۱۲ تک پیش کیا گیا ہے۔

علم حدیث میں مسانید کی حیثیت اور تاریخ لکھ کر مسند امام احمد اور مصنف عبدالرزاق کی تاریخی اور علمی حیثیت کی نشاندہی کی ہے۔ تیسری صدی میں صحاح کی تالیف پر ایک تفصیلی نوٹ ہے۔ الغرض تمام موضوعات پر تفصیل و تشریح کا یہی انداز رہا ہے۔ بلاشبہ یہ تفصیلات قاری کے لیے بار خاطر ہوں گی مگر مؤلف اپنی افتاد طبع سے کچھ مجبور ہے۔ زبان قلم پر بات آنے کے بعد روکنا مؤلف کے بس کی بات نہیں ہے۔

۳۔ کتاب میں جو علمی مواد فراہم کیا گیا ہے اس میں مؤلف نے حوالہ کا التزام کیا ہے اور کتاب کے آخر میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست بھی شامل ہے۔ کام کی علمی نوعیت کے پیش نظر کتابوں کی نایابی مؤلف کے لیے پریشان کن رہی ہے۔ اس پریشانی میں جن گرامی قدر شخصیت کی علمی محنتوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اور جن کے لیے میرے روئیں روئیں سے دعائیں نکل رہی ہیں وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جامعہ اسلامیہ بہاولپور ہیں۔ موصوف کی تصانیف مائتس بہ الحاجۃ، امام ابن ماجہ اور علم حدیث، تعلیقات و دراسات، تعلیقات ذب و بابات میری قدم قدم پر رہنما رہی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ کتاب میں مطبعی اغلاط کافی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب لکھنے کے بعد طباعت کے وقت دارالعلوم کے تعلیمی ادارے کھل چکے تھے، نہ میں تصحیح کر سکا ہوں اور نہ پروف پڑھ سکا ہوں اور نہ اس پر صحیح معنی میں نظر ثانی کر سکا ہوں حتیٰ کہ کتاب کی فہرستیں مرتب کرنے کا بھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔

فہرستوں کی ترتیب کے لیے میں عزیز امین اللہ وثر ایم۔ اے لیکچرر پنجاب یونیورسٹی کے لیے خلوص قلب سے دعا گو ہوں انہوں نے بڑی تندہی اور عرق ریزی سے کتاب کی فہرستیں مرتب کیں۔

آخر میں میں اپنے ان احباب کا بھی صمیم قلب سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری صرف ایک آواز پر مصارف طباعت کے لیے مطلوبہ رقم پیش کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ جزا اہم اللہ۔

معذرت

تمام خامیوں کے باوجود وقت کی تنگی اور عظیم الفرستی قدم قدم پر میرے خیالات کو میری خواہش کے مطابق عملی جامہ پہنانے میں مانع رہی ہے۔

چونکہ ۱۹۶۶ء میں اس کتاب کو پیش کرنے کا اعلان ہو چکا تھا اس لیے کام کی رفتار تیز رکھنی پڑی، مسودے کو میرے ایک عزیز مولوی محمد شریف قاسمی صاف کرتے تھے میں اس پر سرسری نگاہ ڈالتا تھا اور کاتب کے حوالہ کرنے کو کہہ دیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں گزشتہ کا استحضار رہنا مشکل تھا اس لیے عنوانات میں جس قدر ترتیب کا حسن قائم رہنا چاہیے تھا، قائم نہیں رہ سکا۔ ارباب علم سے استدعا ہے کہ وہ اپنی منصفانہ علمی تنقید سے مطلع فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں اس کا خیال رکھا جائے۔ اللہم تقبل منا انک انت السميع العليم۔



امام اعظم اور علم الحدیث کے متعلق کلمی قدر آراء

حضرت مولانا علامہ ابوالوفا افغانی رحمہ اللہ صدر مجلس احياء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن،
 ماشاء اللہ تعالیٰ آپ نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا کہ قوم کو مستفنی کر دیا۔ کتاب کی
 تحقیقات اور اس کی خوبیاں تو فوراً اس پر بھی واضح ہو جائیں گی جس نے اس کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے جاتیجہ
 امان و تعمق سے دیکھا ہو، ہزارک اللہ تعالیٰ خیراً بڑی تحقیق کی اور تفصیل سے بیان کیا۔ کاش یہ کتاب عربی
 میں ہوتی تو اس کی منفعت عام ہوتی۔ اب اس کا فائدہ صرف ان کے لیے ہے جو اردو سے واقف ہیں۔
 میں کتاب پر تفصیلاً تو اس وقت کچھ لکھ سکوں گا کہ اس کا پورا مطالعہ کر سکوں۔ اشغال و امراض غور سے
 پوری کتاب کے مطالعہ کی اجازت کہاں جیتے ہیں۔ تاہم میں ضرور اس کے مطالعہ سے فارغ ہونے کی
 کوشش کروں گا بشرط زندگی، والموت ادنیٰ من شرک نعلہ، تبدیل آب و ہوا کے لیے افغانستان جانے
 کا قصد ہے دو ماہ بعد اگر میسر ہو تو شاید دیکھ سکوں۔ اب تو کتاب الحجہ جز ثانی کی طباعت میں
 مشغول ہوں، اکثر سہتہ کی طباعت ہو چکی ہے بحمد اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اس قسم کی خدمتوں کی
 توفیق دے اور حیات طیبہ نصیب فرماتے و تفکم اللہ کل خیر، آپ کے تعارف کا مشتاق ہوں والسلام
 دو متم بالخير والعافیہ۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرسہ خیر المدارس، ملتان

حدیث اور امام اعظم، پونجی، ماشاء اللہ، اس کا رزق تو اید و مردان چنین کنند۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر دارالعلوم، کراچی

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی جلال، شان اور علمی کمالات، ورع و تقویٰ، عبادت و زہادت ایسی چیز نہیں جس سے کوئی لکھا پڑھا مسلمان ناواقف ہو، اپنوں اور غیروں میں موافق اور مخالف سبھی میں یہ چیز ناقابل اختلاف سمجھی گئی ہے لیکن ہر امام اور ہر عالم مقتدا۔ علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو حیثیت فن کے اپنے سعی و عمل کے لیے مخصوص کر لیتا ہے یا منجانب اللہ ایسے اسباب ہو جاتے ہیں کہ یہ فن ان کی خصوصیت بن جاتی ہے۔ وہ دنیا میں عام طور پر اسی فن کے ماہر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب کہیں نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے علوم و فنون کا ماہر نہیں ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام علوم اسلامیہ، تفسیر، حدیث وغیرہ میں بلکہ عقلیہ کلام وغیرہ میں بھی اعلیٰ کمال عطا فرمایا تھا۔ مگر ان تمام علوم و فنون میں سے جس چیز کو اپنے لیے خاص فن کی حیثیت سے انہوں نے اختیار فرمایا وہ فقہ فی الدین ہے۔ اس لیے دنیا میں ان کی عام شہرت فقہ کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ اہل بصیرت سے تو یہ بات مخفی نہیں کہ فقہ میں کوئی شخص مہارت و امامت کا درجہ اس وقت تک حاصل کر ہی نہیں سکتا جب تک قرآن و سنت میں مہارت تامہ حاصل نہ کرے۔ مگر بعض سطحی نظر والوں نے امام اعظم کی جلال شان فی علم الحدیث پر کچھ شبہات کیے کچھ دوسرے لوگوں نے اسے حوام میں پھیلایا اور بہت سے عوام غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر میری دیرینہ تمنا تھی کہ حضرت امام اعظم کی مہارت علم حدیث اور ان کے اساتذہ و تلامذہ فی الحدیث پر کوئی کتاب لکھی جائے۔ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے خود احقر نے محدثین حنفیہ کے نام سے ایک مقالہ ماہنامہ القاسم دارالعلوم دیوبند میں شروع کیا تھا مگر اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

حال میں حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی کی تصنیف جدید امام اعظم اور علم الحدیث، نظر نواز ہوئی تو دیرینہ تمنا پوری ہونے کا وقت آگیا۔ کتاب کو جوں جوں دیکھتا گیا مسرت برپا ہوتی گئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ پوری شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بہترین اور مستند مواد جمع فرمادیا، اور اس کی افادیت اس سے اور بڑھ گئی کہ ہر جگہ اصل ماخذ کا حوالہ پوری وضاحت کے ساتھ دیا ہے۔ اور جب کتاب کے مقدمہ میں یہ پڑھا کہ اس کی تالیف کا زمانہ صرف وہ سترہ دن ہیں جن میں پاکستان ہندوستان کے حملہ پر دفاعی جہاد میں مصروف تھا اور

مولانا مظلہ کا محل قیام سیالکوٹ خصوصیت سے اس جنگ کا سخت ترین محاذ تھا انہی دنوں میں اس کتاب کی تالیف ہوئی تو معلوم ہوا کہ بلاشبہ یہ ایک کرامت ہے۔ اب کتاب چھپی ہوئی سامنے ہے سترہ دن میں کوئی متوسط آدمی اس کو اطمینان سے پڑھ کر بھی پورا نہیں کر سکتا۔ لکھنا اور وہ بھی سینکڑوں کتابوں کے حوالوں اور ان کی تشریحات کے ساتھ لکھنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

بہر حال کتاب کو مختلف مقامات سے پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ الحمد للہ اس موضوع پر کافی، شافی اور بڑا قابل قدر ذخیرہ مولانا نے پیش فرمادیا ہے فجزاہم اللہ خیر الجزاء

حضرت مولانا نعمت اللہ شاہ صاحب، حیدر آباد (دکن)

کتاب امام اعظم اور علم الحدیث، کے ابواب و فصول ایک مستقل کتاب کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر چاروں ائمہ کے فقہ کی تدوین کی جائے اور مختلف معروضات پر مضمونوں اور تذیل اور ترتیب، تہذیب نگارش جو علم الحدیث نبوی خاطر جمع کیے گئے ہیں، کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے، میں اس کتاب کو ہر مسلم یونیورسٹی اور ہر دارالعلوم کے لیے لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ میں نے مواعظیت اور اپنے خطبات کے لیے اس کتاب کو نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ سینکڑوں اسماء الرجال، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کیوں نہ لکھی جائیں اس کتاب کی اہمیت پیدا نہیں کر سکتیں۔

حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب صدر شعبہ تفسیر اسلامی یونیورسٹی، بہاولپور

یہ کتاب حضرت مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی کا تصنیفی شاہکار ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامع الکمال تھی۔ آپ بیک وقت فقیہ اعظم اور مجتہد بھی تھے، عارف، زاہد، عابد اور متقی بھی تھے، مفسر، متکلم اور سیاسی مبصر بھی تھے۔ اس کے ساتھ قضا و افتاء کا سرچشمہ بھی تھے اور یہ عظیم محدث اور ناقد حدیث بھی تھے، آخری وصف کے علاوہ باقی اوصاف امام کی تاریخی حیثیت اس قدر واضح تھی کہ ان پر کسی مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ ان میں کسی موافق مخالف کو تردید نہ تھا، البتہ آپ کا آخری کمال کہ آپ ایک عظیم محدث اور ناقد حدیث تھے بعض حضرات کی نظروں سے پوشیدہ تھا اگرچہ آپ کا یہ کمال بھی واقعات اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر بالکل منقطع تھا لیکن اس کے

دلائل، کتب رجال، تاریخ و طبقات کے وسیع ذخیروں میں منتشر ہونے کی وجہ سے ناظرین کی نگاہوں کو جھلکتے۔ حضرت مولانا موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے کہ آپ نے ان ذخائر منتشرہ کو غٹان بعیدہ سے فراہم کر کے نہایت عمدہ ترتیب، سگفتہ تعبیر اور موزوں اسلوب استدلال کی شکل میں پیش کیا اور ساتھ ہی جدید معیاری فہرست بھی منسلک کر دی۔ یہ کتاب صرف ایک تاریخی کتاب نہیں بلکہ دلائل حجیت حدیث، مقابہت و اجتہاد، شرائط و خصوصیات، کتب حدیث و احول محدثین، علم اصول الحدیث، علم الرجال کے قیمتی مباحث کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ علماء اور مدرسین کے لیے بھی ضروری ہے اللہ تعالیٰ آپ کی اس خدمت کو قبول فرمادے۔

حضرت مولانا محمد رفیع خاں صاحب، شیخ الحدیث نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

آپ کا ار سال بردہ گرامی قدر علمی تحفہ موصول ہوا، کچھ حصہ پڑھا اور سیر نہ ہوا، یہی خیال اور اردہ تھا کہ ساری کتاب کو دفعۃ پڑھ کر اپنے تاثر کا اظہار بھی وصولی کے عریضہ میں بھیج دوں گا مگر افسوس کہ اچانک تین چار بیماریاں حملہ آور ہوئیں جن میں ایک عارضۃ قلب بھی ہے، چند دن صاحب فراش رہا اور نماز کے لیے بھی گھر سے باہر نہ جاسکا، اب خدا خدا کر کے کل سے مسجد اور مدرسہ میں حاضری دیتا ہوں لیکن نظر جاکر مطالعہ مشکل ہے۔ جتنا حصہ کتاب کا پڑھا ہے بلا مبالغہ دل کی تر سے دعائیں نکلتی رہی ہیں کہ ایسی مدلل، مٹھوس اور لا جواب کتاب اپنے باب میں آگئی ہے جس کے بعد انشاء اللہ اس سلسلہ میں عنوان تو بدل سکتا ہے لیکن تحقیق حد آخر کو پہنچ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس جناب کو تمام اہل اسلام کی طرف سے عموماً اور حضرات اخلاف کی طرف سے خصوصاً جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

راقم کی صحت کے لیے خصوصی اوقات میں دعا فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد رفیع خاں صاحب، شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ، گوجرانوالہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کا ندھلوی کی تصنیف امام اعظم اور علم الحدیث، کے چیدہ چیدہ مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا، میرے خیال میں حضرت مولف کی یہ علمی کاوش دانش ور سنجین حاصل کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مولانا نے یہ کتاب تصنیف کر کے ملت اسلامیہ کی ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔
 امام اعظم کے علم حدیث سے استفادے اور تعلق کے بارے میں بعض لوگ جن غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اگر انہوں نے تعصب سے بالاتر ہو کر اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش کی تو امید ہے کہ یہ تصنیف لطیف ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کافی حازک کامیاب ہو جائے گی۔
 مصنف محترم نے کتاب کے پیش لفظ میں جن تین امور کا ذکر کیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محترم کے قلم نے ان کا پورا پورا لحاظ کیا ہے اور اسلامی دونوں امور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔
 دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو تمام مسلمانوں کے لیے نافع بنائے اور مصنف محترم کو دنیا و آخرت میں بہتر صلہ عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حضرت مولانا محمد بشیر صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ،

ہمارے محترم مولانا الحاج محمد علی صدیقی کاندھلوی نے اپنی مایہ ناز تصنیف "امام اعظم اور علم الحدیث" کو بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا ہے جس کا متن ۴۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ممدوح نے اس میں بالآمل ثابِت کیا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف علم فقہ میں ہی امام الائمہ نہیں بلکہ علم حدیث میں بھی ایک برترین اور قابلِ فخر مقام رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی کم علمی یا حاسدانہ نگاہ اسے معلوم نہ کر سکے تو چشمہ اُفتاب را چہ گناہ۔

موضوع کتاب کا دائرہ تحقیق اگرچہ صرف امام اعظم کی محدثانہ شان کا اظہار ہے مگر ضمناً بڑے بڑے مفید بحث زیرِ قلم آگئے ہیں، چنانچہ کہیں تو مقام حدیث کی اہمیت بتائی ہے اور کہیں قرآن و سنت کا باہمی تعلق نہایت لطیف سیرایہ میں واضح کیا ہے۔ کہیں اس بات کی تشریح و توضیح ہے کہ ابتدائیں کتابت حدیث کی ممانعت کیوں تھی پھر اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ حدیث کی تدوین وصالِ نبوی کے ایک سو سال بعد ہوتی اور اس کے ثبوت میں دورِ نبوت میں حدیث کے کتابی ذخیرے کی نشاندہی کر کے ثابت کر دکھایا ہے کہ تحریر حدیث کی ابتداء دورِ نبوت میں ہی شروع ہو چکی تھی اور خلافت راشدہ کے دور میں اشاعت حدیث کی سب سے زیادہ کوشش فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کی۔
 امام اعظم کے نام اور کنیت پر بحث کرتے ہوئے بعض لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ

آپ کے جدِ محمد غلام تھے۔ اور اس کی تائید میں خود امام موصوف کی تشریح پیش کی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کے متعلق کہ (اگر ایمان یا علم) ثریا میں بھی ہو گا تو ابھی فارس میں سے کچھ لوگ اسے حاصل کر لیں گے) سیر حاصل بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ امام اعظم اس بشارت میں بدرجہ اولیٰ داخل ہیں بلکہ اس کا اولین مصداق آپ ہی ہیں۔

امام موصوف کی تابعیت کے ثبوت میں آپ کی روایت عن اہل بیت کو بھی بدلائل ثابت کیا ہے پھر آپ کی تعلیم و تربیت کے مبحث میں علم حدیث میں آپ کے شیوخ کی علمی عظمت و برتری ثابت کر کے کوفہ کی علمی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں ان دنوں حدیث و فقہ کی تعلیم کا کس قدر چرچا تھا اور امام موصوف نے کتنے جلیل القدر شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا۔

امام اعظم کا حفاظِ حدیث میں برترین مقام واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ ناقدین نے راویوں کی عدالت و ثقاہت کے بارے میں امام موصوف کی رائے کو خاص طور پر پیش کیا ہے۔ گویا آپ علم ہجر و تعدیل اور اسماء الرجال کے فن میں بھی یکتا سے روزگار تھے۔ آپ کے تلامذہ حدیث کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کر دیا ہے کہ جلیل القدر ائمہ حدیث و فقہ کو آپ سے تلمذ کی نسبت ہے اور اصحاب صحاح ستہ بھی بالواسطہ آپ کی شاگردی کے دائرہ سے خارج نہیں۔

”حدیث میں امام اعظم کے اصول، اور حدیث و قیاس کے باہمی تعارض کے مبحث اہل نظر کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ الغرض زیر تبصرہ کتاب گونا گوں مبحث کو ضمن میں لیے ہوئے ہے جو صرف طلبہ حدیث کے لیے ہی نہیں بلکہ طبقہ علماء کے لیے بھی بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ اگر مولانا بعض علمی مباحث کو حذف کر کے صرف اس مواد کو شائع کر دیں جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی محدثانہ شان کے اظہار پر مشتمل ہے تو عام پڑھنے لکھنے والے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔“

مولانا کا طرزِ بیان سگفتہ اور دل آویز ہے اور سب بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے ہر مکتب فکر کے علماء فضلاء کے نام بڑے ادب و احترام سے لیے ہیں اور یہی خوبی ہے جس سے ہمارے اکثر علماء تہی دست نظر آتے ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کے مواد اور عناوین کی ترتیب اور ان کے باہمی تعلق میں زیادہ دقت نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر مبحث ایک خاص دائرہ میں محدود ہو اور یہ بکھرے ہوئے درگراں مایہ ایک مسلسل مسکاب مواد پر نظر آئیں۔

علمی نسب نامہ

امام اعظمؒ نے سربراہ حکومت عباسیہ ابو جعفر منصور دوانیقی کے سامنے برسرِ دربار بتایا ہے :

”ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ امیر المومنین ابو جعفر منصور کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے۔ عیسیٰ نے امیر المومنین کو مخاطب کے کہ اے امیر المومنین اھذا عالم الدنیا الیوم، یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں، ابو جعفر منصور نے امام اعظمؒ سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کن لوگوں کا علم حاصل کیا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا علم حاصل کیا ہے۔ ابو جعفر نے کہا کہ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں۔“

(تاریخ بغداد، جامع المسانید)

علمی شہرت

”امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظمؒ کی شہرت سُننا تھا۔
 ملنے کا بے حد مشتاق تھا حَسَنِ اِتِّفَاق سے مکہ میں
 اس طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک
 شخص پر ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں۔ مجمع میں میں نے
 ایک شخص کی زبان سے کلمہ سنا کہ اے ابو حنیفہ! میں نے
 جی میں کہا کہ تمنا تو بر آئی، یہی امام ابو حنیفہ ہیں۔“

(مناقب ابی حنیفہ للذہبی ص ۲۲)

علمی طلب

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ
طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحب کے
رفیق ہیں، نقل کرتے ہیں،

”میں امام اعظم کا رفیق مدرسہ تھا، وہ علم حدیث
کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے یہی
حال زہد و تقویٰ میں ہوا۔ اور فقہ کا معاملہ تو
تمہارے سامنے ہے۔“

علمی کمال

حافظ ابن عبد البر نے مشہور محدث ینرید بن ہارون کا امام اعظمؒ کے بارے میں یہ تاثر نقل کیا ہے :

”میں نے ہزار محدثین کے سامنے زانوئے

ادب تہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث

لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ

سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم

صرف پانچ ہیں ان میں اولین مقام ابو حنیفہؒ کا

ہے۔“

(جامع بیان العلم وفضلہ - الانتقار ص ۱۶۳)

علمی جامعیت

امام ابو جعفر طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالہ سے امام

ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

”ہم مکہ میں امام اعظم کے پاس رہتے تھے، آپ کے

پاس اربابِ فقہ اور اصحابِ حدیث کا ہجوم ہو گیا۔

آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو

صاحبِ خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو مہڑاتے۔“

(مقدمہ اعلام السنن ص ۷۲)

فہرست مضامین تفصیلی

صفحہ	عنوان	شمارہ
۴۴	آیت دعوت اور اس کی تفسیر	۱
"	حافظ ابن کثیر اور ان کا مختصر تفسیر	۲
"	دعوت نبی اور امت دونوں کا کام ہے	۳
۴۸	اتباعِ محبت کی نشانی ہے	۴
"	اتباع کے موضوع پر قرآن کا دعویٰ	۵
۴۹	اتباع کی سرشاریوں کا نتیجہ	۶
"	آیت دعوت کا اجمال اور اس کی تشریح	۷
"	آیت کے چہرہ اجمال سے نقاب کشائی	۸
"	حضرت ابو موسیٰ اشعری اور ان کا مختصر چہرہ	۹
۵۰	امت دعوت اور امتِ احباب	۱۰
"	امام بخاری کا حدیث ابی موسیٰ سے استدلال	۱۱
"	حدیث ابی موسیٰ کی رہنمائی	۱۲
"	زمین کی بارش سے استفادہ میں تین قسمیں	۱۳
"	انسانی قلوب کی علم و ہدایت سے استفادہ میں تین قسمیں	۱۴
"	پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین یعنی محدثین	۱۵
۵۱	حدیث ابی موسیٰ میں محدثین اور اربابِ روایت	۱۶
"	علامہ سندھی کا تشریحی نوٹ	۱۷
"	محدثین کے بارے میں حضور انور کا ایک اور ارشاد	۱۸
"	پانی سے پیداوار کرنے والی زمین یعنی مجتہدین	۱۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۲	حدیث ابی موسیٰ، مجتہدین اور فقہاء	۲۰
"	علامہ سندھی کی رہنمائی	۲۱
"	فقہاء و مجتہدین کے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	۲۲
۵۳	محدثین اور مجتہدین اسلام کا علمی سرمایہ ہیں	۲۳
"	حدیث من یدر اللہ بہا خیروا کی تخریج	۲۴
"	حافظ ابن القیم کا تفصیلی بیان	۲۵
"	حکیم الامت شاہ ولی اللہ کا بیان	۲۶
"	اصحاب روایت اور اصحاب درایت دونوں ارشاد کا منطوق ہیں	۲۷
۵۴	امت اجتہاد کی طاعت ضروری ہے	۲۸
"	امت محمدیہ میں علماء کی دو قسمیں	۲۹
"	فقہائے اسلام کا حافظ ابن القیم کی زبانی تعارف	۳۰
"	کویت اطاعت میں اولی الامر سے فقہاء مراد ہیں	۳۱
۵۵	صاف اور سنگلاخ زمین یعنی مقلدین	۳۲
"	مقلدین کی طرف ارشاد میں اشارہ	۳۳
"	علامہ قسطلانی کی تشریح	۳۴
"	تقلید کی حقیقت	۳۵
"	ابن ماجہ کے حوالے سے صحابہ کے پانچ طبقے	۳۶
۵۶	صحابہ کے اختلاف مدارج پر شاہ ولی اللہ کا بیان	۳۷
"	علم تحقیقی اور تقلیدی دونوں علم ہیں	۳۸
"	منصب امامت میں مولانا شہید کا بیان	۳۹
۵۷	علامہ شاطبی کی بیان کردہ علماء کی قسمیں	۴۰
"	اہل سنت کے تقلیدی موقف پر امام ذہبی کا بیان	۴۱
"	شاہ ولی اللہ کی اختیار کردہ تقلید کی تعریف	۴۲
۵۹	امام اعظم کی فقہانیت میں شہرت کی وجہ	۴۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۹	مجتہد ہونے کی ضروری شرطیں	۴۴
"	مجتہد کون ہوتا ہے؟ اس کا جواب علامہ شاطبی کی زبانی	۴۵
۶۰	محدثین علم حدیث و روایت میں فنکار ہیں	۴۶
"	ائمہ اربعہ کا حدیث میں مقام اور شاطبی کا بیان	۴۷
"	حدیث کیا ہے؟	۴۸
"	قرآن میں نبوت کا مقام اور منصب اور اس کی تشریح	۴۹
۶۱	قرآن و قرائع کے تحت نازل ہوا ہے	۵۰
"	بتدریج نزول قرآن کی توجیہ اور اس سے استدلال	۵۱
"	قرآن اور وقائع میں باہم تعلق	۵۲
۶۲	قرآن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآن کو نور کہنے کی وجہ	۵۳
"	قرآن اور سنت میں چراغ اور روشنی کی نسبت ہے	۵۴
"	حدیث تاریخ سنت کا نام ہے	۵۵
"	السنة کے ایک سے زیادہ اصطلاحی معنی	۵۶
"	فقہاء کی اصطلاحی زبان میں السنة	۵۷
۶۳	قرآن یکے کے قرار سب سے اور السنة کے لیے محدثین کی روایات	۵۸
"	سنت کا سنت ہونا روایات محدثین کا محتاج نہیں ہے	۵۹
۶۴	اس موضوع پر حافظ ابن تیمیہ کا لطیف بیان	۶۰
"	قرآن کی حفاظت کے دو طریقے سینہ اور صحیفہ	۶۱
"	سنت کی حفاظت بھی دو طرح ہوئی سینہ اور عمل کا پیمانہ	۶۲
۶۵	حفاظت سنت اور حفاظت قرآن میں فرق کی وجہ	۶۳
"	تاریخ سنت کے لیے حدیث کا لفظ	۶۴
"	لفظ حدیث کا قرآن میں استعمال	۶۵
۶۶	قرآن میں دین کی نعمت کے اظہار کا نام تحدیث ہے	۶۶
"	تاریخ سنت کے لیے نام تجویز کرنے میں اُمت کی دیانت	۶۷

صفحہ	عنوان	شمارہ
۶۶	حدیث کا صحیح مقام	۶۸
"	دین میں قرآن و سنت کی حجیت	۶۹
"	منکرین حدیث کا اسلام میں مقام	۷۰
۶۷	قرآن اور سنت میں فرق	۷۱
"	قرآن و سنت دونوں وحی ہیں	۷۲
"	قرآنی وحی کی شان اعجاز و اس کا مقام تبعدی	۷۳
"	قرآن کی تلاوت اور سنت کے اتباع پر زور	۷۴
"	قرآن و سنت میں نامہ اور پیام کا فرق ہے	۷۵
"	نامہ و پیام کے فرق پر امام ابو محمد الجوینی کی تصریح	۷۶
۶۸	حافظ جلال الدین السیوطی کی تائید	۷۷
"	قرآن معجزہ ہے سنت معجزہ نہیں ہے	۷۸
۶۹	سنت کا آغاز روایت بالمعنی سے ہوا ہے	۷۹
"	نامہ اور پیام کا تفصیلی فرق	۸۰
"	سنت بھی اللہ کی وحی ہے	۸۱
"	قرآن نظم و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے	۸۲
۷۰	قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہے	۸۳
"	نزول قرآن کے بعد قرآن کا بیان بھی اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے	۸۴
"	قرآن کی بتائی ہوئی وحی کی تین صورتیں	۸۵
"	نزول قرآن کے لیے وحی کے اقسام سے گناہ میں سے ایک کی تعیین	۸۶
۷۱	علامہ آلوسی اور علامہ طیبی کے بیانات	۸۷
"	نفث فی الردع، رویا اور الہام کو قرآن نے وحی کہا ہے	۸۸
"	امام شافعی کی الرسالہ میں تشریح	۸۹
۷۲	قرآن میں حکمت سے مراد سنت ہے	۹۰
"	حکمت سے سنت مراد ہونے پر قرآنی آیات سے استدلال	۹۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
۷۲	حکمت سے کیا مراد ہے اس کا امام شافعی کی جانب سے تفصیلی جواب	۹۲
۷۳	حکمت کی تدبیریں بھی قرآن کی آیات کی طرح تلاوت ہوتی تھیں	۹۳
۷۴	سنت کے وحی الہی ہونے پر حافظ ابن القیم کا جامع تبصرہ	۹۴
۷۵	کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت پر امام احمد کا بیان	۹۵
۷۵	کتاب و سنت کے باہمی رشتہ پر امام ابو حنیفہ کے بیانات	۹۶
۷۶	قرآن میں حضور انور کی اتباع کا غیر مشروط اور بے قید حکم ہے	۹۷
"	پیغمبر قرآن کے شارح ہیں	۹۸
۷۷	سنت میں روایت بالمعنی جاتر ہونے کی عقلی توجیہ	۹۹
"	حافظ جلال الدین السیوطی کا مختصر اور اجمالی تعارف	۱۰۰
۷۸	السنة میں تو اتر لفظی نہ ہونے پر الجزائری کا بیان	۱۰۱
"	تواتر سے بحث کرنا محدثین کے دائرہ کار سے باہر ہے	۱۰۲
"	حافظ ابن تیمیہ کی بتائی ہوئی دو اصولی باتیں	۱۰۳
۷۹	کلام کے اشرف اور افضل ہونے کا معیار اور امام خطابی	۱۰۴
"	اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق	۱۰۵
"	ما اوحی میں کتاب کی قید تلاوت کے ساتھ مخصوص ہے	۱۰۶
۸۰	صحیح مسلم کی حدیث ابی سعید کا منشاء	۱۰۷
"	حدیث ابی سعید خدری معطل ہے	۱۰۸
۸۱	حافظ ابن حجر کا اجمالی تذکرہ	۱۰۹
"	لا تکتبوا عنی غیر القرآن میں غیر کا موصوف محذوف ہے	۱۱۰
۸۲	کتابت کی ممانعت پر ڈاکٹر صبیحی صالح کی رائے	۱۱۱
"	ممانعت کے عملی مصداق پر امام خطابی کا بیان	۱۱۲
"	المحدث الفاضل میں رامہرمزی کی رائے	۱۱۳
۸۳	حضرت ابو ہریرہ کی مسند احمد کی حدیث سے استدلال	۱۱۴
"	ڈاکٹر حمید اللہ کی حدیث ابی سعید کے مصداق کے متعلق رائے	۱۱۵

صفحہ	عنوان	شمارہ
۸۳	حدیث ابی سعید کتابت کی حدیثوں کے معارض نہیں ہے	۱۱۶
"	حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اجازت اور اس پر احادیث سے استدلال	۱۱۷
۸۶	حدیث ابی سعید کے تین جوابات	۱۱۸
"	حدیث ابی سعید کا نسخ اور علامہ احمد محمد شاہ کا اصرار	۱۱۹
۸۷	ناقابل انکار حقیقت	۱۲۰
"	دور نبوت میں حدیث کا کتابی ذخیرہ	۱۲۱
۸۸	احکام و سنن کی کتابیں	۱۲۲
"	عمرو بن حزم صحابی کی تالیف	۱۲۳
"	عمرو بن حزم کی تالیف کی تاریخی حیثیت	۱۲۴
۸۹	قاضی ابوبکر کے پاس عمرو بن حزم کی دستاویز	۱۲۵
۹۰	دستاویز عمرو بن حزم ائمہ اسلام میں متداول ہے	۱۲۶
۹۰	کتاب الصدقہ نبوت کا تحریری سرمایہ ہے	۱۲۷
۹۲	خلفاء راشدین کا کتاب الصدقہ پر عمل	۱۲۸
"	سالم بن عبد اللہ سے کتاب الصدقہ کی روایت	۱۲۹
"	کتاب الصدقہ کی تاریخی اور روایتی حیثیت	۱۳۰
۹۳	صحابہ کرام اور کتابت حدیث	۱۳۱
"	صحیفہ صادقہ کی روایتی حیثیت	۱۳۲
"	صحیفہ صادقہ کا توارث	۱۳۳
۹۵	صحیفہ علی مرتضیٰ اور اس کی روایتی حیثیت	۱۳۴
۹۶	صحیفہ صدیقی اور اس کا تاریخی مقام	۱۳۵
۹۷	صحیفہ جابر اور اس کی تاریخی حیثیت	۱۳۶
۹۸	صحیفہ سمرہ بن جندب	۱۳۷
"	صحیفہ سمرہ کی روایت	۱۳۸
"	امام حسن بصری کا اجمالی تذکرہ	۱۳۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۹۹	صحیفہ صحیحہ اور اس کا پورا نام	۱۴۰
"	الصحیفۃ الصحیحہ اور الصحیفۃ الصادقہ	۱۴۱
"	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۴۲
"	اہل عرب میں علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کے ذرائع	۱۴۳
"	حدیث بیان کرنے والے صحابہ کرام	۱۴۴
"	حدیث روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد	۱۴۵
۱۰۱	اس قدر قلیل تعداد صحابہ کی روایت کی وجہ	۱۴۶
"	شاہ ولی اللہ کا تاریخی انکشاف	۱۴۷
"	تعداد حدیث کے لحاظ سے صحابہ کی قسمیں	۱۴۸
۱۰۳	صحابہ کرام کے امام حاکم کے بتائے ہوئے بارہ طبقے	۱۴۹
"	صحابہ کرام میں حفاظ و فقہاء	۱۵۰
۱۰۴	فقہاء صحابہ کی حفاظ صحابہ پر تنقید	۱۵۱
۱۰۵	صحابہ میں حضرت ابو ہریرہ کا مقام	۱۵۲
"	حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ کا موازنہ	۱۵۳
۱۰۶	ترجیح روایت کے لیے فقہ راوی کی شرط	۱۵۴
"	حفظ و ضبط اور فقہ و اجتہاد میں موازنہ	۱۵۵
"	حضرت عائشہ کے صحابہ پر تعقیبات	۱۵۶
"	حضرت عمر کی جانب منسوب بیانات کا صحیح منشاء	۱۵۷
۱۰۸	امام دارمی اور حکیم الامت کی رائے	۱۵۸
"	موقف عمر کی عمل عمر سے تعین	۱۵۹
۱۰۸	حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں ایک ہزار چھتیس محدث	۱۶۰
"	امراء بلاد فقہاء اور محدثین ہوتے تھے	۱۶۱
۱۰۹	صدر اول میں سنت سے فقہ مراد ہوتا تھا	۱۶۲
"	خلافت راشدہ اور تدوین حدیث	۱۶۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۰۹	حافظ ابو بکر بن عقال کا توضیحی بیان	۱۶۴
"	دورِ خلافت میں حدیث کے مدون نہ ہونے کے وجوہ	۱۶۵
۱۱۰	نبوت کا امتیازی مقام خلافت ہے	۱۶۶
"	آیت نسخ کی شاہ ولی اللہ کی بیان فرمودہ تفسیر	۱۶۷
۱۱۱	اسلام میں خلافت راشدہ کے اعمال کی حجیت	۱۶۸
"	اسلام میں سنت نبوت اور سنت خلافت دونوں واجب الاتباع ہیں	۱۶۹
۱۱۲	السنتہ کی تعریف اور اس کی حقیقت	۱۷۰
"	ما انا علیہ واصحابی کی تشریح	۱۷۱
"	فرقہ ناجیہ کی تعریف	۱۷۲
۱۱۳	اسلام نظام نبوت و خلافت کے مجموعہ کا نام ہے	۱۷۳
"	قرآن میں صراط مستقیم کا تصور	۱۷۴
"	انعام یافتہ طبقہ کی قرآن سے تعیین	۱۷۵
"	صحابہ کے اوصاف خصوصی	۱۷۶
۱۱۴	نبوت اور امت دونوں کا کام دعوت	۱۷۷
"	امر بالمعروف امت کی غیریت کا مہنتی ہے	۱۷۸
"	شہادت علی الناس امت کا فریضہ ہے	۱۷۹
۱۱۵	نبوت اور امت کا فرائض میں اشتراک	۱۸۰
"	خلافت راشدہ کے دور میں خدمت حدیث	۱۸۱
"	خدمت حدیث کی خاطر فاروق اعظم کے اقدامات	۱۸۲
۱۱۶	ایک شبہ کا ازالہ	۱۸۳
"	محدثین کا بتایا ہوا ضابطہ اور اصول	۱۸۴
"	فاروق اعظم کی احادیث	۱۸۵
۱۱۷	سنن بدیہی اور سنن زوائد میں امتیاز	۱۸۶
"	فاروق اعظم کی محققانہ دقیق نظر	۱۸۷

صفحہ	عنوان	نمبر
۱۱۸	تحدیث و روایت میں فاروق اعظم کا کارنامہ	۱۸۸
"	امام اعظم کا نام، کنیت اور لقب	۱۸۹
"	نعمان کی لغوی تحقیق اور نام میں معنویت	۱۹۰
۱۲۰	حنیف کے لغوی معنے اور اس کے مجازات	۱۹۱
"	ابو حنیفہ امام اعظم کی کنیت تفاؤل کی بنا پر ہے	۱۹۲
"	حنیفہ نامی امام اعظم کی کوئی لڑکی نہیں	۱۹۳
"	ابو حنیفہ دراصل ابوالملة الحنیفہ ہے	۱۹۴
۱۲۱	امام اعظم کا نسب نامہ	۱۹۵
۱۲۲	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۹۶
"	نسبت و لاکی وجہ سے امام اعظم تیمی ہیں	۱۹۷
"	ولا کے معنے اور علامہ نووی کی تصریح	۱۹۸
"	ولا بمعنی دوستی کے لیے امام اعظم کی تصریح	۱۹۹
"	معنی ولا کے لیے عبداللہ بن یزید کا انکشاف	۲۰۰
۱۲۳	عبداللہ بن یزید کا چہرہ امام ذہبی کی زبانی	۲۰۱
"	اسماعیل بن حماد کا تشریحی بیان	۲۰۲
"	ابو حازم عبدالحمید کا بیان اور اس کی تضعیف	۲۰۳
۱۲۴	امام اعظم کے والد کے لیے حضرت علی کی دُعا	۲۰۴
"	اسماعیل کا دُعا کے بارے میں تاثر	۲۰۵
"	امام اعظم کے بارے میں نبوی پیش گوئی	۲۰۶
"	فارس کے بارے میں صحیحین کی روایت	۲۰۷
۱۲۵	صحیحین کا مصداق محدثین کے نزدیک امام اعظم ہیں	۲۰۸
"	حافظ سیوطی کا دعویٰ	۲۰۹
۱۲۶	علامہ حنفی اور علامہ عزیزی کی تشریح	۲۱۰
"	شاہ ولی اللہ کا مکتوبات میں محاکمہ	۲۱۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۲۷	نواب صدیق حسن خاں کا اعتراف	۲۱۲
۱۲۸	نواب صاحب کے بیان پر تبصرہ	۲۱۳
۱۲۸	محدثین میں ابن ماجہ اور بخاری کے سوا کوئی عجیب نہیں ہے	۲۱۴
۱۲۹	امام اعظم اور اعجاز نبوی	۲۱۵
۱۲۹	تمام مکاتیب فکر کی طرف سے امام اعظم کو خراج عقیدت	۲۱۶
۱۳۰	امام اعظم کی محبت سنی ہونے کی نشانی ہے	۲۱۷
۱۳۰	عبد العزیز بن میمون امام اعظم کے معاصر ہیں	۲۱۸
۱۳۱	دکین بن الجراح فتاویٰ میں امام اعظم کے اقوال کو اپناتے تھے	۲۱۹
۱۳۱	امام یحییٰ بن سعید امام اعظم کے فتویٰ میں مقلد تھے	۲۲۰
۱۳۱	امام اعظم کی تقلید ۱۹۵ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی	۲۲۱
۱۳۱	یحییٰ بن سعید امام ابو یوسف کے شاگرد ہیں	۲۲۲
۱۳۱	رخ نور اور سراپائے امامت	۲۲۳
۱۳۲	امام اعظم کی تاریخ ولادت میں اختلاف	۲۲۴
۱۳۲	امام اعظم تابعی ہیں	۲۲۵
۱۳۲	اسلام میں صحابہ کا مقام	۲۲۶
۱۳۳	صحابہ کی عدالت قرآن سے ثابت ہے	۲۲۷
۱۳۳	عدالت صحابہ پر ملا علی قاری اور ابن عبد السلام کی تصریح	۲۲۸
۱۳۴	تابعین کی بزرگی اور اسلام میں ان کا مقام	۲۲۹
۱۳۴	حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سے استدلال	۲۳۰
۱۳۵	حدیث عائشہ کی روایت سے استدلال	۲۳۱
۱۳۵	خیبر القرون کی محدثین کی پیش کردہ تفسیر	۲۳۲
۱۳۵	صدر اول اور سلف صالح کی تشریح	۲۳۳
۱۳۶	کمال علم اور کمال ایمان میں صحابہ کا مقام	۲۳۴
۱۳۶	دور نبوت میں امام اعظم کی ولادت	۲۳۵

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۳۷	محمد ثین کی زبان میں تابعی	۲۳۶
"	صحابی کی تعریف امام بخاری کی زبانی	۲۳۷
۱۳۸	ارشادات نبوت سے امام بخاری کی تائید	۲۳۸
۱۳۹	امام اعظم کو صحابہ کی دید کا شرف بے غبار ہے	۲۳۹
"	امام اعظم کی تابعیت اور محمد ثین کرام	۲۴۰
۱۴۰	امام اعظم کی تابعیت اور حافظ ابن حجر عسقلانی	۲۴۱
۱۴۱	امام اعظم کی تابعیت پر حافظ ولی الدین عراقی کا فیصلہ	۲۴۲
"	امام اعظم کی تابعیت پر حافظ زین الدین عراقی کا تبصرہ	۲۴۳
۱۴۲	حافظ عراقی کی بیان کردہ تابعین کی فہرست	۲۴۴
"	علامہ قسطلانی کی رائے	۲۴۵
۱۴۳	حافظ ابن عبد البر کا تابعیت امام کے بارے میں انکشاف	۲۴۶
"	عبد اللہ بن الحارث سے امام اعظم کو شرف دید	۲۴۷
"	حافظ ابو بکر الجعابی اور عبد اللہ بن الحارث کی تاریخ وقات	۲۴۸
"	حافظ ابو بکر الجعابی اور ان کی تاریخ رجال سے واقفیت	۲۴۹
"	دید کی شہادت ایک مثبت دعویٰ ہے	۲۵۰
۱۴۴	اثبات ونفی میں تعارض پر محمد ثین کا فیصلہ	۲۵۱
"	جزء رفع یدین میں امام بخاری کا زریں فیصلہ	۲۵۲
"	امام اعظم کا حضرت انس کو دیکھنا متفق علیہ ہے	۲۵۳
۱۴۵	صحابہ و تابعین کے لیے قرآن میں چار وعدے	۲۵۴
"	امام اعظم کا زمانہ طلب علم	۲۵۵
"	ولید بن عبد الملک مکتبہ میں کار آمد سپہ سالار	۲۵۶
۱۴۶	زمانہ ولید میں اسلامی حکومت کا جغرافیہ	۲۵۷
"	امام اعظم کے چھپنے اور لڑکپن کا دور	۲۵۸
"	کوفہ کی مرکزی حیثیت	۲۵۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۴۶	کوفہ کا جغرافیائی مقام	۲۶۰
"	زمانہ فاروق اعظم میں کوفہ کی آبادی اور اس کی وجوہ	۲۶۱
"	کوفہ کی آباد کاری کے لیے کمیٹی کی تشکیل	۲۶۲
"	کوفہ میں آباد کاروں کی اولین تعداد ۴۰ ہزار ہے	۲۶۳
۱۴۷	کوفہ کی جدید تشکیل اور ابو الہیاج الاسدی کا سفرے	۲۶۴
"	کوفہ کا نقشہ اور اس کی تمدنی و تہذیبی مرکزیت	۲۶۵
"	کوفہ میں زمانہ فاروق میں مسلمانوں کا متول	۲۶۶
"	۴۰ ہزار آباد کاروں میں صحابہ کی تعداد	۲۶۷
۱۴۸	صحابہ کی تعداد میں محدثین و مورخین کا اختلاف	۲۶۸
"	احمد امین کی زبانی کوفہ کا علمی نسب نامہ	۲۶۹
۱۵۰	علماء کوفہ کے شوق طلب علم پر ابن تیمیہ کا انکشاف	۲۷۰
"	فن قرآن و تجوید کے امام اور کوفہ	۲۷۱
"	علم التفسیر اور کوفہ	۲۷۲
"	عربیت اور نحو و صرف کی تدوین اور کوفہ	۲۷۳
"	علماء لغت کے یہاں کوفہ کی لسانی اہمیت	۲۷۴
۱۵۱	امام اعظم کی علمی طلب کاریوں کا زمانہ	۲۷۵
"	علمی طلب کاریوں کے لیے نقطہ آغاز	۲۷۶
"	آخانہ طلب میں امام اعظم کی علم الکلام سے دلچسپی	۲۷۷
"	علم الکلام میں امام اعظم کی مہارت	۲۷۸
۱۵۲	نظری العلم کے لیے امام شعبی کا مشورہ	۲۷۹
"	اشترائع کی طرف متوجہ کرنے میں امام شعبی کا کردار	۲۸۰
"	آغاز طلب علم کے بائے میں غلط فہمی کا ازالہ	۲۸۱
"	امام اعظم اور فنون عصریہ	۲۸۲
"	علم الشرائع سے پہلے امام اعظم نے فنون حاصل کیے	۲۸۳

صفحہ	عنوان	۲۷
۱۵۳	علم الکلام میں امامت پر شیخی ابن شیبان کا بیان	۲۸
۱۵۴	زمانہ امام اعظم میں مروجہ علوم اور ان کی تقسیم	۲۸
"	امام اعظم کے طلب علم کی تاریخی ترتیب	۲۸
"	امام اعظم نے لڑکپن میں علوم عصریہ میں تکمیل فرمائی تھی	۲۸
۱۵۵	امام اعظم اور علوم عقلیہ	۲۸
"	علوم حقلیہ میں مہارت پر عبداللہ بن ابی حفص کا بیان	۲۸
"	امام اعظم کی کلامی اور عقلی علوم میں شہرت	۲۹
"	مختلف مدارس اور مکاتیب سے امام اعظم کے مناظرے	۲۹
"	امام اعظم کے زمانہ میں علمی مسائل	۲۹
۱۵۶	حافظ ابن رجب حنبلی کا اختلاف پر تاسف -	۲۹
"	مسئلہ ایمان میں اختلاف اور جہم بن صفوان کا موقف	۲۹
"	مسئلہ ایمان اور امام اعظم	۲۹
۱۵۷	ایمان میں تصدیق، اقرار اور اعمال کا باہمی ربط	۲۹
"	ارشاد نبوت سے ربط کی تائید	۲۹
۱۵۸	زبان کا اقرار ایمان میں کیوں شرط ہے	۲۹
۱۵۹	ایمان میں امام اعظم کے نزدیک اقرار کی اہمیت	۲۹
۱۶۱	ایمان کے موضوع پر امام اعظم کا قانونی موقف	۳۰
"	امام اعظم کی علم کلام میں تصانیف	۳۰
"	معتزلہ کا غلط پروپیگنڈا	۳۰
۱۶۲	البیاضی طائش کبریٰ، بزازمی اور بزدوسی کی تصریحات	۳۰
۱۶۳	امام اعظم کی کلامی کتابوں کی تاریخی حیثیت	۳۰
۱۶۴	علم کلام اور اس کا حکم	۳۰
۱۶۵	امام اعظم کے نزدیک اسلامیات میں علم کلام کی حیثیت دفاعی سرمایہ کی ہے	۳۰
۱۶۵	امام الحرمین اور امام غزالی کی تائید	۳۰

صفحہ	عنوان	نمبر
۱۶۶	علم کلام کے موضوع پر اولیت کا شرف امام اعظم کو حاصل ہے	۳۰۸
۱۶۶	۹۵ھ سے ۱۰۴ھ تک کا وقت امام اعظم نے حدیث پر صرف کیا	۳۰۹
۱۶۸	امام اعظم طالب علم حدیث کی حیثیت سے	۳۱۰
۱۶۹	امام شعبی کا امام اعظم کے اکابر شیوخ میں شمار	۳۱۱
۱۶۹	امام شعبی کی حدیث میں شانِ جامعیت	۳۱۲
۱۷۰	امام اعظم کے طلب علم کی تاریخی داستان کا اجمالی خاکہ	۳۱۳
۱۷۰	بیس سال کی عمر میں حدیث پڑھنے کی وجہ	۳۱۴
۱۷۰	علم حدیث میں امام اعظم کی سہولت	۳۱۵
۱۷۰	امام مسعر بن کدام کی شہادت	۳۱۶
۱۷۰	علم حدیث میں امام مسعر بن کدام کا مقام	۳۱۷
۱۷۳	امام یحییٰ کی زبانی امام اعظم کی علمیت کا اعتراف	۳۱۸
۱۷۳	امام اعظم کے حدیث میں اساتذہ	۳۱۹
۱۷۳	امام اعظم کے اساتذہ حدیث کی عظمت	۳۲۰
۱۷۳	اساتذہ کی عظمت سے تلامذہ کی عظمت کا اندازہ	۳۲۱
۱۷۵	امام اعظم کی برتری کی ادنیٰ شہادت	۳۲۲
۱۷۵	مملکت اسلامی میں حدیث کی درسگاہیں	۳۲۳
۱۷۶	علم حدیث کی صبح صادق کا طلوع	۳۲۴
۱۷۸	امام اعظم کے اساتذہ میں پہلا طبقہ	۳۲۵
۱۷۸	محدثین کے نزدیک عدم صحت موضوع ہونے کو مستلزم نہیں ہے	۳۲۶
۱۷۸	حدیث کے صحیح نہ ہونے کا مطلب	۳۲۷
۱۷۹	حدیث ضعیف کی بھی دو قسمیں ہیں	۳۲۸
۱۷۹	حدیث افراق کے بارے میں فیروز آبادی کا دعویٰ	۳۲۹
۱۸۰	صحابہ سے شرفِ روایت	۳۳۰
۱۸۱	صحابہ سے روایت کے بارے میں ثبوت مستند ہے	۳۳۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
۱۸۱	امام اعظم کا انس بن مالک سے تلمذ	۳۳۲
۱۸۲	حضرت انس بن مالک کا اجمالی سوانحی چہرہ	۳۳۳
۱۸۳	حضرت انس سے امام اعظم کی روایت طلب علم	۳۳۴
۱۸۴	امام اعظم کا عبداللہ ابن الحارث سے تلمذ	۳۳۵
"	امام اعظم کی زبانی عبداللہ سے ملاقات کا واقعہ	۳۳۶
۱۸۵	عبداللہ سے امام اعظم کے سماع کی تصریح	۳۳۷
"	عبداللہ بن الحارث کی تاریخ وفات	۳۳۸
"	حافظ ابو بکر الجعفی علی حدیث اور تاریخ رجال کے امام ہیں	۳۳۹
۱۸۶	عبداللہ ابن ابی اوفیٰ سے امام اعظم کا تلمذ	۳۴۰
۱۸۷	تحمل روایت کی عمر اور محدثین کا نقطہ نظر	۳۴۱
۱۸۸	انصال روایت کی شرط اور بخاری و مسلم	۳۴۲
۱۸۹	کوفہ میں علم حدیث	۳۴۳
"	کوفہ میں صحابہ کرام	۳۴۴
۱۹۳	بخاری شریف میں کوفہ کے رہنے والے راویوں کی تعداد	۳۴۵
۱۹۴	کوفہ کے محدثین کی تذکرۃ الحفاظ سے فہرست	۳۴۶
۱۹۵	علامۃ التابعین امام شعبی سے تلمذ	۳۴۷
۱۹۶	حدیث کی زبانی یادداشت کا دور	۳۴۸
۱۹۹	امام حماد بن سلیمان سے امام اعظم کا تلمذ	۳۴۹
۲۰۲	تاریخ کا ایک المناک حادثہ	۳۵۰
۲۰۳	امام حماد پر ارجار کی تہمت	۳۵۱
۲۰۴	حافظ بیوطی کی زبانی ارجار کی حقیقت	۳۵۲
۲۰۹	ابو اسحاق البیہقی سے تلمذ	۳۵۳
۲۲۱	الامام الحافظ شیبان سے امام صاحب کا تلمذ	۳۵۴
۲۱۲	الحکم بن عتیبہ سے امام اعظم کا تلمذ	۳۵۵

صفحہ	عنوان	نمبر
۲۱۴	امام اعظم کا طلب علم کے لیے سفر	۳۵۶
۲۱۵	علم کی خاطر اسلام میں سفر کی اہمیت	۳۵۷
۲۱۶	حدیث اور فقہ کا باہمی تعلق	۳۵۸
"	فقہ و حدیث کا تعلق شاہ ولی اللہ کی زبانی	۳۵۹
۲۱۷	فقہ و حدیث کا تعلق علامہ خطابی کی زبانی	۳۶۰
۲۲۳	رحلت علمیہ کی تاریخ	۳۶۱
۲۲۴	امام اعظم کے اسفار حج کی تعداد	۳۶۲
"	لیث بن سعد کی امام اعظم سے پہلی ملاقات	۳۶۳
۲۲۵	مکہ میں امام اعظم کے ارد گرد اہل فقہ اور محدثین کا ہجوم	۳۶۴
۲۲۶	مکہ میں امام اعظم کا چار سال نور ماہ قیام	۳۶۵
۲۲۶	حجاز میں امام اعظم کے علمی مشاغل	۳۶۶
۲۲۷	محدث اور فقیہ میں جوہری فرق	۳۶۷
۲۲۸	حدیث اور روایت حدیث میں امتیاز	۳۶۸
۲۲۹	روایت و اسناد سے پہلے حدیث کا مقام	۳۶۹
۲۳۱	اسناد و روایت کے فن میں وسعت	۳۷۰
۲۳۱	جو حدیث ابو حنیفہ کو ایک یا دو واسطوں سے ملی ہے	۳۷۱
۲۳۱	وہ امام بخاری و مسلم کو چھ واسطوں سے ملی	۳۷۲
۲۳۳	صحابہ اور کبار تابعین میں کوئی ضعیف نہ تھا	۳۷۳
۲۳۴	مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت	۳۷۴
"	حرمین کے عمل پر اعتماد اور امام بخاری کا مسلک	۳۷۵
۲۳۵	امام اعظم کا عطاء ابن ابی رباح سے تلمذ	۳۷۶
۲۳۶	عطاء ابن ابی رباح سے امام اعظم کی پہلی ملاقات	۳۷۷
۲۳۸	عطاء ابن ابی رباح کی علمی وسعت پر ایک ضروری تبیین	۳۷۸
۲۳۹	عمرو بن دینار سے امام اعظم کا تلمذ	۳۷۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۴۰	حکومت اور عدالت	۳۸۰
۲۴۱	عمرو بن دینار مکی اور عمرو بن دینار بصری	۳۸۱
۲۴۲	حافظ ابو الزبیر محمد بن مسلم سے امام اعظم کا تلمذ	۳۸۲
۲۴۴	مدینہ مکرمہ کی علمی حیثیت	۳۸۳
۲۴۵	مدینہ طیبہ کے فقہائے سب سے	۳۸۴
۲۴۵	عمر بن عبد العزیز کی مدینہ میں مشاورتی کونسل	۳۸۵
۲۴۶	فقہاء سب سے پر ابن العمد حنبلی کا نوٹ	۳۸۶
۲۵۰	مدینہ کے علم و عمل پر اعتماد	۳۸۷
۲۵۳	خوابگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبوی میں عبادت	۳۸۸
۲۵۵	الحافظ ابو عبد اللہ نافع العدوی سے تلمذ	۳۸۹
۲۵۶	روایت میں راویوں کا تعبیری اختلاف	۳۹۰
۲۵۸	احادیث فقہ اور روایات حدیث	۳۹۱
۲۵۹	ابو بکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری سے تلمذ	۳۹۲
۲۶۰	محدثین کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح سند	۳۹۳
۲۶۲	ایک لطیف نکتہ	۳۹۴
۲۶۲	قاسم بن محمد کی شان علمی	۳۹۵
۲۶۴	عمرہ بنت عبد الرحمن کا علمی مقام	۳۹۶
۲۶۶	بیا امام اعظم نے امام مالک سے روایت لی ہے؟	۳۹۷
۲۶۹	اشہب کی روایت سے غلط فہمی اور اس کی حقیقت	۳۹۸
۲۶۹	اصح الاسانید کے موضوع پر حافظ مغطائی کی تحقیق	۳۹۹
۲۷۱	امام مالک کی نظر میں امام اعظم کا مقام	۴۰۰
۲۷۲	بصرہ اور اس کی علمی حیثیت	۴۰۱
۲۷۵	الامام ابو بکر ایوب بن ابی تمیمہ السخیتی	۴۰۲
۲۷۷	حدیث میں امام اعظم کا نمایاں مقام	۴۰۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۸۰	مجهول اور ضعیف راویوں سے روایت	۴۰۴
۲۸۲	علم اسناد و روایت میں مجهول کا مسئلہ	۴۰۵
۲۸۳	مجهول کی قسمیں اور اس پر علماء کی اراار	۴۰۶
۲۸۵	امام اعظم کی شفعا سے روایت ان کی تعدیل ہے	۴۰۷
۲۸۶	ضعیف روایات کا درجہ شواہد اور توابع کا ہے	۴۰۸
۲۹۰	خطا اور غلطی سے کوئی پاک نہیں ہے	۴۰۹
۱۹۱	موضح اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کے اوہام	۴۱۰
۲۹۴	تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظم کے مشائخ	۴۱۱
۲۹۵	تذکرہ الحفاظ کا علمی مقام	۴۱۲
۲۹۷	امام اعظم کا حفاظ حدیث میں مقام	۴۱۳
۲۹۹	امام اعظم ابو حنیفہ اور اسناد عالی	۴۱۴
۳۰۱	اسناد عالی کی تلاش سلف کی سنت ہے	۴۱۵
۳۰۲	اسناد عالی کے استنباط پر حدیث سے استدلال	۴۱۶
۳۰۶	امام اعظم کی احادیات	۴۱۷
۳۰۹	اسناد عالی کی دوسری قسمیں	۴۱۸
۳۰۹	امام اعظم کی ثنائیات اور کتاب الآثار سے نمونہ	۴۱۹
۳۱۰	امام اعظم کی ثلاثیات	۴۲۰
۳۱۱	امام بخاری کی ثلاثیات اور ان کے ذرائع	۴۲۱
۳۱۱	امام مکی بن ابراہیم اور امام بخاری کی ثلاثیات	۴۲۲
۳۱۳	ابن فضال بن مخلد اور امام بخاری کی ثلاثیات	۴۲۳
۳۱۴	امام اعظم کی رباعیات اور ان کا درجہ	۴۲۴
۳۱۵	تاریخ تدوین حدیث اور ضبط کے تین دور	۴۲۵
۳۱۶	طرق و اسانید حدیث کی تعداد محدثین کی زبانی	۴۲۶
۳۱۷	احادیث صحیحہ کی محدثین کی بیان کردہ تعداد	۴۲۷

صفحہ	عنوان	شمارہ
۳۱۸	قرآن کی ۶۲۳۶ آیتیں اور ۴۴۰۰ حدیثیں	۴۲۸
۳۲۰	احادیث یاد کرنے کا سلف میں رواج	۴۲۹
۳۲۱	تدوین حدیث اور عمر بن عبدالعزیز	۴۳۰
۳۲۲	جمع قرآن اور صحابہ کی مساعی جلیلہ	۴۳۱
۳۲۴	جامع القرآن کا حضرت عثمان کے لیے لقب	۴۳۲
۳۲۵	سلسلہ سے ۹۵۰ تک موضوع حدیث پر علمی سرمایہ	۴۳۳
۳۲۶	عمر بن عبدالعزیز کا تدوین حدیث کے لیے سرکلہ	۴۳۴
۳۳۰	اسلام کے علمی سرمایہ پر حافظ ابن خرم کا بیان	۴۳۵
۳۳۱	فرمان خلافت میں حدیث عمر کا اضافہ	۴۳۶
۳۳۲	اسلام میں خلفاء راشدین کی سنت	۴۳۷
۳۳۶	جمع قرآن بیان قرآن پر ایک اہم تفسیری نکتہ	۴۳۸
۳۳۶	آیت جمع کی تفسیر ابن عباس اور شاہ ولی اللہ کی تنقید	۴۳۹
۳۳۷	ان عینا جمعہ کی شاہ ولی اللہ کی بیان کردہ تشریح	۴۴۰
۳۴۱	عمر اول اور عمر ثانی کے عمل میں ہم آہنگی	۴۴۱
۳۴۲	تدوین حدیث کی اولیت کا شرف	۴۴۲
۳۴۳	دوسری صدی ہجری میں تدوین حدیث	۴۴۳
۳۴۵	امام اعظم شراعی کے مدون اول ہیں	۴۴۴
۳۴۷	حدیث میں امام اعظم کی تصنیف	۴۴۵
۳۴۷	کتاب الآثار کا طریق تالیف اطلاق سے	۴۴۶
۳۴۸	اطلاقی طریق میں تلامذہ کے لیے محدثین کی تعبیری زبان	۴۴۷
۳۴۹	کتاب الآثار کے نسخے اور اس کی روایات	۴۴۸
۳۵۰	کتاب الآثار بروایت امام محمد اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۴۹
۳۵۳	کتاب الآثار بروایت ابی یوسف اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۰
۳۵۵	کتاب الآثار بروایت امام زفر اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۱

صفحہ	عنوان	نمبر
۳۵۷	کتاب الآثار بروایت حسن بن زیاد اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۲
۳۵۸	ناموں کی تصحیف پر ایک ضروری توضیح	۴۵۳
۳۶۰	کتاب الآثار کی روایتی صحت	۴۵۴
۳۶۱	کتاب الآثار کی علمی حیثیت	۴۵۵
۳۶۳	کتاب الآثار کا تاریخی مقام	۴۵۶
۳۶۵	کتاب الآثار کی امتیازی حیثیت	۴۵۷
۳۶۷	کتاب الآثار کی مقبولیت	۴۵۸
۳۶۹	کتاب الآثار کا اس دور کے محدثین پر اثر	۴۵۹
۳۷۱	کتاب الآثار کی مسانید کے نام پر قلمی خدمت	۴۶۰
۳۷۳	الجواب اور مسانید کا فرق	۴۶۱
۳۷۵	حافظ محمد بن محمد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۲
۳۷۶	حافظ ابوالعباس احمد بن محمد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۳
۳۷۸	حافظ عبداللہ الحارثی بنجاری جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۴
۳۸۰	حافظ محمد بن ابراہیم الاصفہانی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۵
۳۸۱	حافظ ابوالحسین محمد بن المنظر جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۶
۳۸۲	حافظ ابو عبداللہ حسین بن محمد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۷
۳۸۳	حافظ ابو نعیم الاصفہانی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۸
۳۸۴	حافظ ابن ابی العوام جامع مسند ابی حنیفہ	۴۶۹
۳۸۵	حافظ ابن عدی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۰
۳۸۶	حافظ ابوالحسن اشعری جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۱
۳۸۷	حافظ ابوبکر بن عبدالباقی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۲
۳۸۸	حافظ طلحہ بن محمد جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۳
۳۸۹	حافظ ابن عساکر دمشقی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۴
۳۹۰	حافظ عیسیٰ جعفری مغربی جامع مسند ابی حنیفہ	۴۷۵

صفحہ	عنوان	شمارہ
۳۸۹	محدث خوارزمی کا ترتیب دادہ جامع المسانید	۴۷۶
۳۹۰	اطراف حافظ ابن القیسرانی	۴۷۷
۳۹۱	مبانی امام اعظم کی شرحیں	۴۷۸
۳۹۲	حدیث کا دوسرا مجموعہ موطا امام مالک	۴۷۹
۳۹۳	کتب حدیث میں موطا کا مقام	۴۸۰
۳۹۶	موطا کی وجہ ترجیح	۴۸۱
۳۹۷	موطا کے روایتی تسلسلے کی مرکزی شخصیتیں	۴۸۲
۳۹۸	جامع معمر بن راشد اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۸۳
۴۰۲	جامع سفیان الثوری اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۸۴
۴۰۴	اس دور کی اور کتابیں	۴۸۵
۴۰۵	کتاب السنن محمد بن جریر	۴۸۶
۴۰۶	کتاب الفرائض محمد بن مقسم	۴۸۷
۴۰۷	کتاب السنن لزامدہ ابن قدامہ	۴۸۸
۴۰۸	کتاب السنن یحییٰ ابن زکریا	۴۸۹
۴۰۹	کتاب السنن وکیع بن الجراح	۴۹۰
۴۱۰	کتاب السنن سعید بن ابی عروبہ	۴۹۱
۴۱۱	کتاب التفسیر محمد بن بشر	۴۹۲
۴۱۲	کتاب المزید عبد اللہ بن المبارک	۴۹۳
۴۱۳	سیرت و منازعی اور ان کی حیثیت	۴۹۴
۴۱۴	فقہ و شرائع اور ان کی تاریخی حیثیت	۴۹۵
۴۱۵	فقہ و شرائع میں امام اعظم کی تصانیف	۴۹۶
۴۱۶	سلسلہ سے سنلہ تک حدیث	۴۹۷
۴۱۷	دوسری صدی کے مصنفین اور ان کی کتابیں	۴۹۸
۴۱۸	مصنفین اور تلامذہ امام اعظم	۴۹۹

صفحہ	عنوان	شمار
۲۲۵	تیسری صدی میں علم حدیث	۵۰۰
/	علم حدیث میں کثرت طرق	۵۰۱
۲۲۶	محدثین و حفاظ حدیث کے مراتب	۵۰۲
۲۲۸	حدیث میں موافقات کا توسع	۵۰۳
/	علم حدیث میں مسانید کی تالیف	۵۰۴
۲۳۰	مصنفین مسانید کا پیش ہناؤ	۵۰۵
۲۳۱	تیسری صدی کے مسانید کی فہرست اجمالی	۵۰۶
/	مسانید کی تصنیف میں شرف اولیت	۵۰۷
۲۳۲	عبید اللہ بن موسیٰ کا تشیع اور محدثین کے یہاں اس کا مطلب	۵۰۸
۲۳۳	مسند امام احمد بن حنبل کی عظمت	۵۰۹
۲۳۶	کیا مسند امام احمد میں موضوع حدیثیں بھی ہیں؟	۵۱۰
۲۳۷	مسند امام بقی بن مخلد کی وسعت	۵۱۱
۲۳۹	علم حدیث میں مصنفات	۵۱۲
/	مصنف عبدالرزاق اور اس کی تاریخی حیثیت	۵۱۳
۲۴۰	امام عبدالرزاق کو امام اعظم سے شرف تلمذ	۵۱۴
۲۴۱	مصنف ابن ابی شیبہ اور اس کی روایتی حیثیت	۵۱۵
۲۴۲	مصنف ابن ابی شیبہ کی خصوصیات	۵۱۶
۲۴۴	امام مالک اور امام لیث بن سعد کی خط و کتابت	۵۱۷
۲۴۶	امام ابو حنیفہ کی کتاب السیر پر امام اوزاعی کی تنقید	۵۱۸
۲۴۸	تیسری صدی ہجری میں صحاح کی تدوین	۵۱۹
۲۵۰	ابن ماجہ، سنن دارمی یا موطا کا صحاح ستہ میں شمار	۵۲۰
۲۵۱	صحیح امام بخاری اور صحیح امام مسلم کا علم حدیث میں مقام	۵۲۱
۲۵۵	محدثین کرام کے نزدیک صحیحین کا مقام	۵۲۲
۲۵۶	صحیحین میں صحت حدیث کا معیار	۵۲۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۴۵۶	الترام صحت اور اس کا مطلب	۵۲۴
۴۵۷	بخاری و مسلم کی شرطیں اور علماء کی آراء	۵۲۵
۱۶۱	تلقی امت بالقبول اور صحیحین	۵۲۶
۴۶۵	بخاری و مسلم کا اصحیت میں مقابلہ بعد میں آنے والوں سے ہے	۵۲۷
۴۶۶	صحیح بخاری کا پورا نام اور اس کی سب سے بڑی خوبی	۵۲۸
۴۶۸	صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں موازنہ	۵۲۹
۴۷۱	حدیث میں امام مسلم کا مقام	۵۳۰
۴۷۳	سنن نسائی اور صحاح میں اس کا مقام	۵۳۱
۴۷۶	سنن ابی داؤد کا صحاح میں مقام	۵۳۲
۴۷۹	سنن ابی داؤد کی فقہ میں اونچی ہونے کی وجہ	۵۳۳
۴۸۰	سنن ترمذی کا صحاح ستہ میں درجہ	۵۳۴
۴۸۱	ترمذی میں صحیح کے ساتھ حسن اور غیب کی اصطلاح	۵۳۵
۴۸۴	ترمذی کے بارے میں ایک اہم سوال	۵۳۶
۴۸۷	صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا مقام	۵۳۷
۴۸۹	مؤلفین صحاح کے نقطہ نظر کا تالیف میں اختلاف	۵۳۸
۴۸۹	امام بخاری کا صحیح کی تصنیف میں نقطہ نظر	۵۳۹
۴۹۱	امام مسلم کا صحیح کی ترتیب میں مطلع نظر	۵۴۰
"	امام ابو داؤد کا سنن کی تالیف میں مقصد	۵۴۱
۴۹۲	امام ابو عیسیٰ ترمذی کا سنن کی تالیف میں پیش نہاد	۵۴۲
۴۹۳	امام نسائی کا کتاب کی تالیف میں مسلک	۵۴۳
۴۹۴	امام ابن ماجہ کا مطلع نظر	۵۴۴
۴۹۴	صحاح ستہ کی علمی خدمت	۵۴۵
۴۹۵	مستخرجات صحیحین اور استخراج کے فوائد	۵۴۶
۴۹۶	احادیث صحیحین کے طرق و اسانید کی تعداد	۵۴۷

صفحہ	عنوان	شمارہ
۴۹۸	صحیحین اور دوسری کتابوں کے اطراف	۵۴۸
۴۹۹	دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین حدیث	۵۴۹
۵۰۰	تیسری صدی کے محدثین کا چہرہ نشاء ولی اللہ کی زبانی	۵۵۰
۵۰۱	حجۃ اللہ میں بیان کردہ دوسری صدی کے محدثین کا حال	۵۵۱
۵۰۳	دوسری اور تیسری صدی میں صحت حدیث کا معیار	۵۵۲
۵۰۵	دوسری صدی کے ائمہ حدیث اور احادیث مرسلہ	۵۵۳
۵۱۰	افراد و غرائب اور تیسری صدی کے محدثین	۵۵۴
۵۱۱	ابوداؤد و ترمذی کی حدیث قلتین	۵۵۵
۵۱۳	سنن ابی داؤد کی حدیث تائین	۵۵۶
۵۱۵	صحیحین کی حدیث خیاری مجلس	۵۵۷
۵۱۸	امام اعظم ابو حنیفہ اور حدیث کی صحت	۵۵۸
۵۱۹	راوی کے ضبط صدہ کی اہمیت اور اس کی شرط	۵۵۹
۵۲۰	ضبط کا مفہوم اور اس کی محدثین کی نظر میں سنگینی	۵۶۰
۵۲۲	امام اعظم اور رد و قبول روایت	۵۶۱
۵۲۵	آئینی و قانونی لحاظ سے احادیث کی شہرت	۵۶۲
۵۲۷	امام اعظم اور اہل ہوی سے روایت	۵۶۳
۵۳۳	جہر بسمہ کے بارے میں حافظ زبلی کا خالص محدثانہ نقطہ نظر	۵۶۴
۵۳۴	جرح و تعدیل رواۃ حدیث اور امام اعظم	۵۶۵
۵۳۶	علامہ سخاوی کی جرح و تعدیل پر ایک مؤرخانہ دستاویز	۵۶۶
۵۳۷	جرح و تعدیل کے موضوع پر امام ترمذی کا امام اعظم سے استدلال	۵۶۷
۵۳۸	امام اعظم اور جابر جعفی کی تضعیف	۵۶۸
۵۴۰	زید بن عیاش اور امام مالک اور ابو حنیفہ کا اختلاف	۵۶۹
۵۴۱	اسماء الرجال اور امام اعظم	۵۷۰
۵۴۵	ستحمل روایت حدیث اور امام اعظم	۵۷۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۴۶	تحمّل روایت کے طرق	۵۷۲
۵۴۶	سماع و عرض	۵۷۳
۵۵۱	تحمّل روایت اور اجازت	۵۷۴
۵۵۲	تحمّل روایت اور مناولہ	۵۷۵
۵۵۲	حدیث نشاذ اور امام اعظم	۵۷۶
۵۵۹	روایت بالمعنیٰ اور امام اعظم	۵۷۷
۵۶۲	حفظ کا الفاظ سے اور معرفت کا معانی سے تعلق ہے	۵۷۸
۵۶۲	روایت بالمعنیٰ کی اجازت اور اس کی ضروری شرطیں	۵۷۹
۵۶۵	روایت بالمعنیٰ کے جواز کے لیے علماء کے بیان کردہ نتائج	۵۸۰
۵۶۹	روایت بالمعنیٰ کا دائرہ کار وسیع ہونے سے علماء کی پریشانی	۵۸۱
۵۷۳	مراتب حدیث اور امام اعظم کا مسلک	۵۸۲
۵۷۴	تواتر اسناد پر اصول حدیث کے علماء کی آراء	۵۸۳
۵۷۶	تواتر عمل اور ان کی قانونی طاقت	۵۸۴
۵۷۷	حدیث ضعیف کو اگر تواتر عمل کی تائید ہو تو وہ صحیح قرار پاتی ہے	۵۸۵
۵۷۸	تواتر قدر مشترک، تواتر معنوی کی حقیقت	۵۸۶
۵۸۰	اخبار آحاد کی جمیت اور امام اعظم	۵۸۷
۵۸۲	اخبار آحاد کا معیار احتجاج	۵۸۸
۵۸۵	معیار احتجاج میں اصحاب روایت اور ارباب درایت کا مسلک	۵۸۹
۵۸۶	سند سے متعلق تحقیق محدثین کا اور متن سے متعلق تنقیح فقہاء کا کام ہے	۵۹۰
۵۸۷	صحت حدیث کے ساتھ قبولیت حدیث کی شرطیں	۵۹۱
۵۸۸	قبولیت حدیث کی پہلی شرط کہ مسلمہ اھولوں کے خلاف نہ ہو	۵۹۲
۵۹۱	حدیث مسیح عمامہ اور اس کے مسلمہ اھولوں سے تصادم	۵۹۳
۵۹۱	کیا ہر حدیث بجائے خود ایک اصول ہے؟	۵۹۴
۵۹۲	حدیث کذبات ابراہیم اور اس پر الجزائری کی تنقید	۵۹۵

صفحہ	عنوان	شمارہ
۵۹۳	معانی قرآن سے متصادم حدیث	۵۹۶
۵۹۴	حدیث کے ضعیف ہونے کی وجوہ متعدد اور متباہن ہوتی ہیں	۵۹۷
۵۹۵	حدیث المتباہیان کی محدثانہ اور فقیہانہ تعلیل	۵۹۸
۵۹۶	حدیث کی مقبولیت میں معانی قرآن سے تصادم علتِ قاعدہ ہے	۵۹۹
۵۹۷	حدیث مصراۃ اور معانی قرآن سے اس کا معارضہ	۶۰۰
۵۹۸	حدیث مصراۃ اور سنت مشہورہ سے اس کا معارضہ	۶۰۱
۶۰۰	حدیث مصراۃ اور اس پر امام اعظم کے موقف کی غلط ترجمانی	۶۰۲
۶۰۱	سنت مشہورہ سے معارضہ حدیث	۶۰۳
۶۰۲	سنت مشہورہ سے معارضہ اور حدیث عمرو بن سلمہ	۶۰۴
۶۰۳	اخبارِ آحاد کا توارث سے معارضہ اور امام اعظم کا موقف	۶۰۵
۶۰۴	حدیث بسملہ کی تعلیل اور حافظ ابن تیمیہ کا جواب	۶۰۶
۶۰۵	احادیث رفع یدین کا توارث سے معارضہ	۶۰۷
۶۰۶	علامہ معین الدین سندھی کا خدشہ اور اس کا جواب	۶۰۸
۶۰۷	اعمال و اقوال صحابہ کا اسلام میں مقام	۶۰۹
۶۰۸	اخبارِ آحاد میں مفاہمت اور امام اعظم	۶۱۰
۶۰۹	رفع یدین کی مختلف حدیثوں میں مصالحت	۶۱۱
۶۱۰	ہبہ کی واپسی پر احادیث میں مفاہمت	۶۱۲
۶۱۱	ارشادِ نبوت اور صحابی کے فتویٰ میں مفاہمت	۶۱۳
۶۱۲	احمد حسین کراچی، اپر فکرمی اختلاف کی بنا پر جرح	۶۱۴
۶۱۳	ولوغ کذب پر ابو ہریرہ کا فتویٰ اور امام بیہقی کی معذرت	۶۱۵
۶۱۴	نعم بن حماد پر وضع حدیث کا الزام	۶۱۶
۶۱۵	جماعت کھڑی ہو جانے پر سنتیں پڑھنا اور حدیث ابی ہریرہؓ	۶۱۷
۶۱۶	مختلف اوقات میں سنتوں کی ادائیگی پر نیکی	۶۱۸
۶۱۷	صبح کی سنتوں کی ادائیگی پر آثارِ صحابہ	۶۱۹

صفحہ	عنوان	شمارہ
۶۴۰	نقیس بن نهد کے واقعہ کا غلط استعمال	۶۲۰
۶۴۱	وجہ ترجیح احادیث اور امام اعظم	۶۲۱
۶۴۳	کیا مختلف احادیث میں فقہیت وجہ ترجیح ہے؟	۶۲۲
۶۴۵	فقہیت صحت روایت کی نہیں بلکہ ترجیح کی شرط ہے	۶۲۳
۶۴۷	رفع یدین کے موضوع پر امام ابو حنیفہ اور امام اوزاعی کی گفتگو	۶۲۴
۶۴۸	واقعہ کی روایتی حیثیت اور علامہ سندھی کا چیلنج	۶۲۵
۶۴۹	علو اسناد سے ہٹ کر فقہیت کیوں وجہ ترجیح ہے	۶۲۶
۶۵۰	حنفیہ کے نزدیک وجہ ترجیح فقہیت ہے اکثریت نہیں ہے	۶۲۷
۶۵۱	حدیث ضعیف اور امام اعظم	۶۲۸
۶۵۲	متقدمین میں امام ترمذی سے پہلے حدیث کی تقسیم ثنائی تھی	۶۲۹
"	متقدمین اور متاخرین کی حسن میں فرق	۶۳۰
۶۵۳	رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث پر عمل حنفیہ کا مذہب ہے	۶۳۱
"	ضعیف پر عمل میں امام ابو حنیفہ اور امام احمد میں ہم آہنگی	۶۳۲
"	ضعیف سے متقدمین کی اصطلاحی ضعیف مراد ہے	۶۳۳
۶۵۶	حدیث قہقہہ سے وضو ٹوٹنے پر استدلال	۶۳۴
۶۵۷	نبیذ ترم سے وضو کی حدیث اور اس کی تحقیق	۶۳۵
۶۵۸	مقدار آیام حیض پر حدیث ضعیف اور اس سے استدلال	۶۳۶
۶۵۹	ضعیف پر عمل کے بارے میں ارباب روایت کے مسالک	۶۳۷
۶۶۰	حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی تین شرطیں	۶۳۸
۶۶۱	ضعیف پر عمل اور علامہ ودانی کا شبہ اور اس کا جواب	۶۳۹
۶۶۲	ودانی کے شبہ پر علامہ خفاجی کا جواب	۶۴۰
۶۶۳	علامہ خفاجی کے جواب پر مولانا عبدالحی کی تنقید	۶۴۱
۶۶۵	ودانی کے شبہ کا خود ودانی کا دیا ہوا جواب	۶۴۲
۶۶۶	حدیث و قیاس میں تعارض اور امام اعظم	۶۴۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۶۶۶	قیاس کی شریعت پر علماء کی آراء	۶۴۴
۶۶۰	خبر واحد اور قیاس میں تعارض پر امام اعظم کے موقف کی توضیح	۶۴۵
۶۶۱	فخر الاسلام کی جانب سے امام اعظم کے مسلک کی غلط ترجمانی	۶۴۶
۶۶۲	صدر الاسلام کی جانب سے امام اعظم کے مسلک کی صحیح ترجمانی	۶۴۷
۶۶۳	شیخ ابوالحسن کرخنی کی جانب سے صدر الاسلام کی تائید	۶۴۸
۶۶۴	علم حدیث میں امام اعظم کے اصول اور ان کی تاریخی حیثیت	۶۴۹
۶۶۵	صحت حدیث کے اصول اور قبولیت حدیث کے ضوابط	۶۵۰
۶۶۶	جیسے صحت کے موضوع پر قوانین تحریری ہیں ایسے ہی قبولیت کے موضوع پر اصول تحریری ہیں	۶۵۱
۶۶۷	دوسرے علوم کی طرح حدیث بھی ایک علم ہے	۶۵۲
۶۶۸	شاہ ولی اللہ کا بے محل سہارا اور اس پر تفصیلی بحث	۶۵۳
۶۶۹	شاہ صاحب کا منشا اور خود ان کی زبانی اس کی تعیین	۶۵۴
۶۷۰	اصول و ضوابط صحت و قبولیت حدیث	۶۵۵
۶۷۱	مجتہدین کے پیش نظر شریعت کا پورا نظام ہوتا ہے	۶۵۶
۶۷۲	مجتہدین اس حیثیت میں انبیاء سے مشابہت رکھتے ہیں	۶۵۷
۶۷۳	تلامذہ حدیث اور امام اعظم	۶۵۸
۶۷۴	الحافظ یحییٰ ابن زکریا بن ابی زائدہ اور ان کی محدثانہ شان	۶۵۹
۶۷۵	الحافظ عبد اللہ بن یزید ابو عبد الرحمن المقرئ اور ان کی محدثانہ شان	۶۶۰
۶۷۶	امام مقرئ سے متعلق ابن ابی حاتم کا مغالطہ	۶۶۱
۶۷۷	الحافظ الامام عبد اللہ بن المبارک کی محدثانہ شان	۶۶۲
۶۷۸	یتیم فی الحدیث کا مطلب	۶۶۳
۶۷۹	الامام الحافظ ابراہیم بن طہمان	۶۶۴
۶۸۰	محدثین کی اصطلاحی زبان میں ارجاء کی حقیقت	۶۶۵
۶۸۱	الامام الحافظ مکی بن ابراہیم	۶۶۶

صفحہ	عنوان	شمارہ
۷۱۰	الامام الحافظ الفخاک بن محمد البوصام النبیل	۶۶۷
۷۱۳	الامام الحافظ نیرید بن ہارون	۶۶۸
۷۱۵	الامام الحافظ وکیع بن الجراح	۶۶۹
۷۱۸	الامام الحافظ علی بن مسہر	۶۷۰
۷۱۹	الامام الحافظ حفص بن غیاث	۶۷۱
۷۲۲	الامام الحافظ متیم بن بشر	۶۷۲
۷۲۴	محدثین کا امام اعظم سے علمی رشتہ	۶۷۳



اہم تعلیقات و حواشی کی فہرست

صفحہ	عنوان	نمبر
۴۷	عماد الدین ابن کثیر حافظ کا چہرہ	۱
۴۸	آیت امتحان میں دلیل محبت اور فائدہ محبت کا بیان	۲
۴۹	ابوموسیٰ اشعری عبداللہ بن قیس کا چہرہ	۳
۵۱	حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ... الخ کی تخریج اور امام شافعی کی تشریح	۴
۵۲	علامہ سندھی ابوالحسن نور الدین محمد بن عبدالمہادی کا ترجمہ	۵
۶۳	قرآن سب سے پر تشریحی نوٹ	۶
۶۷	امام الحرمین دو عظیم المرتبت شخصیتوں کا لقب ہے	۷
۶۹	قرآن نظم اور معنی دونوں کا نام ہے	۸
۷۱	الرسالہ کی حیثیت اور اس کی تالیف کا پس منظر	۹
۷۷	حافظ جلال الدین السیوطی کا تعارف	۱۰
۸۱	حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری کا چہرہ	۱۱
۸۵	امام ابو داؤد اور امام دارمی کا تعارف	۱۲
۸۸	حافظ ابن عبدالبر الوعر و قرطبی کا تعارف	۱۳
۹۲	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی کا چہرہ	۱۴
۹۵	عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جده کی اصول کی روشنی میں تشریح	۱۵
۹۶	امیر المؤمنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل البخاری کا تعارف	۱۶
۹۷	امام حماد بن سلمہ کا محدثین کی زبانی تعارف	۱۷
۱۰۰	مشہور ناقد ابو عبد اللہ ذہبی کا چہرہ	۱۸

صفحہ	عنوان	شمارہ
۹۸	مشہور صوفی امام حسن بصری کا تعارف اور محدثین میں مقام	۱۹
۱۰۰	آیت قرآنی بل ہو آیات بیّنات سے صراطِ مستقیم کا استنباط	۲۰
۱۱۹	امام ابو حنیفہ کو امام اعظم کے لقب سے یگانے اور بیگانے پکارتے ہیں	۲۱
/	حافظ ابن حجر مکی کا چہرہ	۲۲
۱۲۱	ابن خلدکان کا نام لقب مولد و مسکن اور وجہ تسمیہ	۲۳
۱۲۲	ابوزکریا یحییٰ بن اسحاق نووی کا علمی مقام	۲۴
/	ولاء اور اس کی قسمیں ولاء اسلام ولاء حلف، ولاء لزوم	۲۵
۱۲۳	امام الحسین بن علی ابو عبد اللہ صغیری کا تعارف	۲۶
/	ابو خازم عبد الحمید بن قاضی عبدالعزیز کا حکمیہ	۲۷
۱۲۵	حدیث ابی ہریرہ لسان العلم بالشریاء پر نوٹ	۲
۱۲۶	حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث کا علمی و عملی چہرہ	۲۹
۱۲۸	امام مسلم بن الحجاج ابو الحسین کا تعارف	۳۰
/	امام اہل السنۃ احمد بن حنبل الشیبانی کا تعارف	۳۱
۱۳۲	اولو العزم من الرسل کی تشریح اور ان کی تعداد	۳۲
۱۳۳	عدالت کی لغوی تحقیق اور اس کے مختلف اطلاقات	۳۳
۱۳۴	عبداللہ بن مسعود کا روایت حدیث میں مقام	۳۴
۱۳۶	خیر القرون قرنی میں جمہور کا مسلک	۳۵
۱۳۸	تابعی کی تعریف پر شبہ اور اس کا الزام	۳۶
۱۴۰	حدیث کے ضعیف ہونے کا محدثین کے یہاں مطلب	۳۷
۱۴۱	حافظ زین الدین عراقی کا اجمالی ترجمہ	۳۸
۱۸۳	حدیث طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم کی تخریج اور اس کے طرق	۳۹
/	حرم میں امام اعظم کی عبداللہ بن الحارث سے ملاقات	۴۰
۱۶۱	مشہور محدث عفان بن مسلم کا چہرہ	۴۱
۲۰۶	موطا امام محمد کی روایتی و تاریخی حیثیت	۴۲
۲۰۸	ترک رفع یدین پر حدیث ابن مسعود اور مختلف طریقوں سے اس کی تخریج	۴۳

صفحہ	عنوان	شمارہ
۲۱۱	امام الحدیث علی بن الجعد کا چہرہ	۴۴
۲۱۵	آیت نقر سے مختلف مسائل کا استنباط	۴۵
۲۱۸	حدیث اور روایت حدیث میں جوہری فرق	۴۶
۲۱۹	تلاش علم کے لیے چلنا و طرح کا ہے	۴۷
۲۲۱	خلف بن ایوب فقیہ و محدث کا تعارف اور ان کا مقام	۴۸
۲۳۵	اختلافی مسائل میں عمل حریم کا علمی مقام	۴۹
۲۵۱	زیارۃ قبر النبی پر حدیث ابن عمر اور اس کی تصحیح	۵۰
۲۵۷	مسائل فقہ کے امام اعظم سے تواتر منقول ہونے پر تبصرہ	۵۱
۲۶۳	لیث بن سعد کے امام اعظم سے شرف تلمذ کی تحقیق	۵۲
۲۶۹	ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن مسلم کا ترجمہ	۵۳
۲۷۰	حافظ علم الدین صالح بن سراج الدین البلقینی کا ترجمہ	۵۴
۲۷۷	نضر بن محمد ابو عبد اللہ مروزی استاد محدث اسحاق کا ترجمہ	۵۵
۲۷۸	ابو محمد عبد اللہ حارثی بخاری کی محدثانہ شان	۵۶
۲۸۹	امام اعظم کی تاریخ ولادت سے حافظ محمد بن ابراہیم کے بیان کی توضیح	۵۷
۲۹۸	خارجہ ابن زید کے قلیل الحدیث اور کثیر الحدیث ہونے پر تبصرہ	۵۸
۲۹۹	استحاف النبلاء کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کا تعارف	۵۹
۳۰۰	اسناد کے امت اسلامیہ کے خصائص سے ہونے پر علماء کی آراء	۶۰
۳۰۷	ابراہیم بن عثمان البوشیبہ کا پورا چہرہ	۶۱
۳۲۲	جمع قرآن کے لیے زید بن ثابت کے انتخاب کی وجوہ	۶۲
۳۵۳	ابو سلیمان الجوزجانی کا ترجمہ	۶۳
۴۲۳	اسد بن القزات قاضی قیروان کا تعارف	۶۴
۴۵۳	صحیح مسلم میں التزام صحت کا دعویٰ اور اس کی تشریح	۶۵
۴۶۷	ابو بکر محمد بن احمد شمس اللامہ سرخسی کا مبسوط ترجمہ	۶۶
۴۶۹	ابراہیم بن سیار نظام معتزلی کا تعارف	۶۷
۴۷۱	فخر الاسلام علی بن محمد اور صدر الاسلام محمد بن محمد کا تعارف	۶۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى سب سے پہلے ایک ارشادِ ربّانی اور ایک حدیث سن لیجئے۔ اللہ سبحانہ فرماتے ہیں۔

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمِنَ اتَّبَعَنِي
وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَ مَا آتَا مِنَ الْمُسْرَةِ كَيْفَ يَشَاءُ

کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں روشنی کی بنا پر اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری پیروی کی وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ کی پاکی ہو میں مشرکوں سے نہیں ہوں۔

ارشادِ ربّانی کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں،

قُلْ مَنْ اتَّبَعَ يَدْعُوا إِلَى مَا عَادَ عَلَى اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جو شخص بھی حضور کا پیرو کار ہے اس کا کام اسی بات کی دعوت دینا ہے جس کی حضور انورؐ نے دعوت دی ہے۔

اس آیت میں دعوت کو دونوں کا کام بنایا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ جیسے آپ کی پیروی کرنے والے آپ کے ساتھ دعوت میں شریک ہیں، فرق ہے تو صرف یہ کہ دعوت دینا نبی کا کام

۱۔ پارہ ۱۳ آیت ۱۰۸ لے ابو الفداء کفایت، عماد الدین لقب، اسماعیل بن عمر بن کثیر نام ہے

نسباً قرشی، وطن دمشق ہے۔ ولادت ۷۰۱ھ میں بمقام مبدل ہوئی۔ حافظ جمال الدین المزی

۷۲۲ھ، حافظ ابن تیمیہ ۷۲۸ھ، حافظ شمس الدین ۷۴۸ھ کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ہے

ابن العماد خبلی، حافظ ابن حجر، حافظ سیوطی، حافظ ابن تفرحی اور شیخ ابن ناصر نے ان کے مناقب لکھے

ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۷۴۰ھ میں وفات پائی مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲

اللہ کا نبی ہونے کی وجہ سے ہے اور مومن کا صرف امتی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ نبی کا متبع اور پیرو کا ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایسے ہی طاعت میں بھی دونوں شریک ہیں لیکن نبی کی طاعت نبی ہونے اور اس کے معصوم ہونے کی وجہ سے ہے اور امتی کی طاعت متبع رسول اور مجتہد ہونے کی وجہ سے ہے۔ شاطبی نے الموافقات میں الامدی نے احکام میں اسے عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

اتباع محبت کی نشانی ہے

بات بڑی معنی خیز ہے اور اس کی معنویت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اس پر غور کیا جائے کہ نبوت کے اس کام میں نبوت کی اتباع کرنے والے شریک ہیں۔ صرف ایمان لانے والے نہیں۔

اتباع کے موضوع پر قرآن نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ اللہ سبحانہ کی محبت کی نشانی نبوت کا اتباع ہے۔ اور جو اس نشانی کو قائم کرنے میں پورا اترتے ہیں اللہ سبحانہ ان کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ ان کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں۔

ارشاد ہے:

فَلْإِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

کہہ دو اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو و محبوب بنالے گا
اللہ پاک تم کو اور بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو۔ اللہ بڑا
بخشنہارا اور رحم کار ہے۔

۱۔ اس آیت میں محبت الہی کے دعوے کی جانچ کے لیے اچھا معیار بتایا ہے یعنی اتباع رسول۔ جو جتنا متبع رسول ہو گا اسی قدر اس کی محبت الہی کا دعویٰ زیادہ معتبر و مستم ہو گا۔ اس کو اسی بنا پر آیت امتحان کہتے ہیں۔ ابوسلیمان الدارانی کہتے ہیں جب لوگوں نے محبت کے بلند بانگ دعوے کیے تو اللہ سبحانہ نے آیت محبت نازل کی۔ اس آیت میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ دلیل محبت اور فائدہ محبت، محبت الہی کی علامت اگر اتباع رسول کو قرار دیا۔ تو محبت کا فائدہ یہ بتایا کہ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

جوابات یہاں شرط و جزا کے پیرائے میں کہی گئی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ اتباع کی سرشاریاں درج کر رہی بات مقام مدح میں بولی گئی ہے یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّونَهُمْ اور کہیں رضی اللہ عنہم و رضوا عنه۔

آیت دعوت کا اجمال اور اس کی حدیث سے تشریح

آیت دعوت نے یہ بات کھول دی ہے کہ نبوت کی پیروی کرنے والوں کا کام نبوت کے کام میں ہاتھ بٹانا ہے۔ لیکن آیت ہاتھ بٹانے کی نوعیت میں مجمل ہے۔ اس اجمال کے چہرے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقاب اٹھائی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہدایت اور دین اللہ سبحانہ نے مجھے دے کر دیا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی۔ زمین کے ایک حصے نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پیا۔ گھاس اور سبزہ اچھا اگایا اور ایک حصہ جو بخر تھا اس نے پانی کو سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہ نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا خود پانی پیا دوسروں کو پلایا لیکن زمین کا ایک حصہ جو چٹیل تھا اس نے نہ پانی روکا اور نہ گھاس اگایا۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ سبحانہ کے دین میں نفقہ کیا اور اللہ سبحانہ نے اسے دین سے فائدہ دیا۔ اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو

۱۔ نام عبد اللہ بن قیس، کنیت ابو موسیٰ ہے۔ فتح خیبر کے زمانے میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے۔ حضور انورؐ نے ان کو حضرت معاذ کے ساتھ یمن کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ کے گورنر رہے ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ بصرہ کے شہریوں کے قرأت اور فقہ میں استاد ہیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ علم کا ماخذ صحابہ میں چھ بزرگ ہیں۔ عمرؓ، علیؓ، ابی بن مسعودؓ، زید اور ابو موسیٰ اشعریؓ، صفوان بن سلیم فرماتے ہیں کہ زمانہ نبوت میں یہ چار فتویٰ دیتے تھے۔ عمرؓ، علیؓ، معاذ اور ابو موسیٰ اشعریؓ۔ آواز اتنی اچھی تھی کہ قرآن پڑھتے تو سماں بندھ جاتا حضور انورؐ نے ایک دفعہ قرآن سنا تو فرمایا۔

لَقَدْ أَدَّبَنِي مِنْ مَّاءٍ مِنْ مِزَابِ رِئَالٍ دَاوُدَ۔ ۴۴ ہڈی الحجرت کے مہینے میں استعمال ہوا۔

کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے ادھر سر اٹھا کر نہیں دیکھا
اور ہدایت ہی کو قبول نہیں کیا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے یہ

اس حدیث کی مخاطب امتِ اجابت یعنی مسلمان ہیں نہ کہ اُمتِ دعوت یعنی عام انسان اسی
بنیاد پر حضرت امام بخاری نے کتاب العلم میں عالم بننے اور عالم بنانے کی فضیلت کا عنوان قائم کر کے
بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم ہونے اور علم سکھانے کی فضیلت کا مقام ایمان سے پہلے
نہیں بلکہ ایمان کے بعد ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ حق و باطل کی اویزش میں حق کے بقا کا کیا قانون
ہے۔ اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے
ایسی صاف اور عامۃ الوجود مثال پیش کی ہے جس کے معائنہ سے کوئی انسانی نگاہ بھی محروم نہیں
فرمایا جب پانی برستا ہے اور زمین کے لیے شادابی اور گل ریزی کا سامان مہیا ہونے لگتا ہے تو م دیکھتے
ہو کہ زمین بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانے میں تین حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

الف :- پانی کو چوس کر پیداوار کرنے والی زمین

ب :- پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین

ج :- ناقابل کاشت اور ناقابل ذخیرہ

ٹھیک ایسے ہی علم و ہدایت کی بارش کے لیے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔

الف :- وہ جو قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں

ب :- وہ جو قرآن و سنت سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں

ج :- وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ ہی استنباط و استخراج کرنے والوں میں سے ہیں۔

پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین یعنی محدثین

جو لوگ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں یہ زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے

كَانَتْ مِنْهَا آجَادِبٌ أَمْسَكَتْهَا أَلَمٌ فَتَنَعَ اللَّهُ

بِالنَّاسِ فَنَزَلَ لِبُؤَا وَسَقُوا وَتَرَعُوا۔

زمین کا ایک حصہ جو بخر تھا اس نے پانی کو روکا اللہ نے اس سے لوگوں

کو فائدہ دیا لوگوں نے پانی پیا اور زمین سیراب کی۔
 سے تعبیر کیا ہے۔ یہ قرآن و سنت کی بالذات نگرانی کرنے والے اور ان کے الفاظ کو اس طرح سمیٹے
 ہوتے ہیں کہ ان میں بال برابر فرق نہیں آنے دیتے۔ یہ ہیں اصحاب حدیث اور محدثین۔ علامہ سندھی
 فرماتے ہیں۔

قسم ینتفع بعین علمہ ذالک کاہل الحفظ والروایت لہ
 یہ وہ قسم ہے جس میں بالذات علم ہی سے فائدہ ہوتا ہے جیسے محدثین
 اور اصحاب روایت۔

اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
 نَصَرَ اللّٰهُ اَمْوَالًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ حَفِظَهَا وَوَعَاَهَا دَاذِلْهَا
 فَرُبَّ حَابِلٍ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ
 رواہ الشافعی

خوش و خرم رکھے اللہ اس شخص کو جس نے میری بات سنی اسے محفوظ
 رکھا اور پوری حفاظت سے آگے روانہ کیا۔ بہت سے سمجھ کی بات
 رکھنے والے بات کو اپنے سے زیادہ سمجھ دار تک پہنچاتے ہیں۔

پانی سے پیداوار کرنے والی زمین یعنی مجتہدین
 کچھ لوگ صرف پانی کی حفاظت ہی کا کام نہیں بلکہ اس سے مسائل کے استخراج اور استنباط

لے سندھی علی البخاری ج ۱ ص ۲۶

لے یہ حدیث ان لفظوں میں بحوالہ ابن مسعود بیہقی میں ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی میں الفاظ یہ
 ہیں نَصَرَ اللّٰهُ اَمْوَالًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ حَفِظَهَا وَوَعَاَهَا دَاذِلْهَا
 حدیث مسند بزاز میں بحوالہ ابوسعید خدری صحیح ابن حبان میں بحوالہ زید بن ثابت آئی ہے۔ نیز دوسرے
 صحابہ مثلاً معاذ بن جبل، نعمان بن بشیر، جابر بن مطعم اور ابو الدرداء کے حوالے سے بھی یہی حدیث مختلف
 الفاظ میں مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ یہ حدیث بھی خود بتا رہی ہے کہ علماء دو قسم کے ہیں۔ حفاظ اور
 فقہاء ہر حافظ حدیث فقیہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام شافعی نے اس حدیث پر یہ خاص نوٹ لکھا ہے۔
 دَلَّ عَلٰی اَنَّهُ قَدْ جَمَلَ الْفَقْهَ غَيْرَ فِقْهٍ، یَکُوْنُ لَمْ حَافِظًا وَلَا یَکُوْنُ فِیْہِ فِقْہًا۔ (الرسالۃ ص ۵۵)

کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس کے ثمرات سے رائے عامہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ نتائج کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ یہ تمثیل میں زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے

نَقِیَّةٌ قَبِلَتْ الْمَاءَ فَأَنْبَتَ الْكَلَاءُ وَالْعُشْبَ الْكَثِیْرُ
صاف زمین جس نے پانی کو چوس لیا اور پانی کے ذریعے گھاس اور
زیادہ سے زیادہ سبزہ اُگایا۔

سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لوگ قرآن و سنت کے پانی سے اپنی قوتِ اجتہاد کے ذریعے مسائل کے موتی نکالنے والے اور پانی کو نہیں بلکہ پانی کے نتائج کو شاہراہِ عام پر لانے والے ہیں یہ ہیں اربابِ اجتہاد اور فقہاءِ کرام۔

علامہ سندھی فرماتے ہیں:

قسم ینتفع بثمرات علمہ و نتائجہ کاهل الاجتہاد
والاستخراج

یہ وہ قسم ہے جس میں علم کے ثمرات اور نتائج سے فائدہ ہوتا ہے جیسے
مجتہدین اور فقہاء۔

اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ يُدِرِ اللَّهُ بِهِ حَلِیْراً یُفَقِّهُهُ فِی الدِّیْنِ بَلَّغَ

جس کے ساتھ اللہ سبحانہ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین میں
فقاہت عطا فرماتے ہیں۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ارشادِ نبوت کی روشنی میں ارشاداتِ نبوت کا ذخیرہ رکھنے والے ہوں

۱۔ پورا نام ابو الحسن نور الدین محمد بن عبد الہادی ہے۔ سندھ میں مقام ٹھٹھہ کے رہنے والے ہیں یہیں
نشو و نما پائی، تعلیم تسمت میں حاصل کی مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ حرمِ نبوی میں ان کا درس حدیث خاص شہرت
رکھتا تھا۔ ۳۳۸ھ میں وفات پائی اور البقیع میں دفن ہوئے۔ حدیث کی چھ کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں۔
۲۔ سندھی علی البخاری ج ۱ ص ۲۶۔ ۳۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۔ ۴۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے
حضرت معاویہ سے صرف مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے، ابو داؤد و مسلم، ترمذی نے ثوبان سے۔ ترمذی
نے معاویہ بن قرہ سے اور ابو داؤد نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔

یعنی محدثین یا ارشادات نبوت اور قرآن سے مسائل نکالنے والے ہوں یعنی فقہاء دونوں اسلام کا سرچشمہ علمی ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں۔

ایک قسم وہ حفاظ ہیں جن کا کام صرف روایات کو یاد رکھنا اور جیسی سنی ہیں ویسی ہی آگے پہنچا دینا ہے۔ ان کا کام مسائل معلوم کرنا اور استنباط کرنا نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علماء کی ہے جن کا کام محفوظ سرمایہ مسائل نکالنا اور احکام مستنبط کرنا ہے۔ پہلی قسم جیسے حافظ ابو زرعہ اور ابو حاتم اور دوسری قسم جیسے امام مالک، امام شافعی وغیرہ۔ خود صحابہ میں بھی حفظ روایت اور استنباط مسائل کے لحاظ سے یہ تقسیم موجود تھی۔ غور فرمائیے۔ عبد اللہ بن عباسؓ چہر امت اور قرآن کے ترجمان ہیں۔ مگر اس کے باوجود آپ کی ان حدیثوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے جن میں ذاتی سماع اور دید کی تصریح ہو۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ کے صرف فتاویٰ ضخیم جلدوں میں جمع کیے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی ان کے دریائے نقاہت کی ایک چلو ہے۔

ذالك فضل الله يوتيه من يشاء ان کے مقابلے میں ابو ہریرہؓ حفظ روایت میں علی الاطلاق حافظ امت تو ہیں مگر تفقہ اور استنباط میں ابن عباسؓ کے پاس گ بھی نہیں۔ حفظ روایت اور استنباط مسائل کے لحاظ سے یہی تقسیم امت کو صحابہ سے وراثت میں ملی ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

التخريج على كلام الفقهاء و تتبع لفظ الحديث لكل منهما
اصل اصیل فی الدین ہے۔

فقہاء کے انداز پر حدیث سے مسئلہ نکالنا اور الفاظ حدیث کا تتبع و تلاش دونوں کی دین میں بنیادی حیثیت ہے۔

دونوں اس ارشاد نبوت کا منطوق ہیں۔ محدثین بھی اور فقہاء بھی، یا بالفاظ دیگر اصحاب روایت

بھی اور اصحابِ درایت بھی۔

ائمہ اجتہاد کی طاعت ضروری ہے

اسی بنا پر حافظ ابن القیم جو زمی نے اعلام میں دونوں کو الفاظِ نبوت کو اُگے پہنچانے والے ہوں یا الفاظِ نبوت کو سمجھانے والے ہوں یہ کہہ کر کہ

حضورِ انور کی جانب سے تبلیغ دو طرح کی ہے الفاظِ نبوت کی تبلیغ اور معانی کی تبلیغ۔

بتایا ہے کہ اُمتِ محمدیہ کے علماء دو قسموں میں منحصر ہیں ایک حفاظِ حدیث۔ یہ اُمت کے رہنما اور مخلوق کے پیشوا ہیں جنہوں نے اُمت کے لیے دین کو محفوظ رکھا ہے۔ اور اس کی ہر قسم کے رد و بدل سے حفاظت فرماتی ہے۔ اُگے فرماتے ہیں :

دوسری قسم ان فقہاءِ اسلام کی ہے جن کو مسائل نکالنے کی نعمت ارزانی ہوئی اور جو حلال و حرام کے ضابطے بنانے کے لیے متوجہ ہوتے ان فقہاء کا مقام زمین میں ایسا ہے جیسے ستارے آسمان میں۔ ان کے ذریعے ہی تاریکیوں میں سرگرداں راستہ معلوم کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کھانے اور پینے سے زیادہ ہے اور ان کی طاعت والدین سے بھی زیادہ از روئے قرآن فرض ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے قرآن کی یہ آیت لکھی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔

اے ایمان والو! تم کو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اولی الامر کا جو تم میں سے ہوں۔

اور بتایا ہے کہ

اس آیت کی رو سے فقہاء اور مجتہدین کی طاعت فرض ہے اور اس

آیت میں عبد اللہ بن عباس، جابر بن عبد اللہ، حسن بصری ابو العالیہ

عطاء بن ابی رباح، ضحاک اور مجاہد کے خیال میں "اولی الامر" سے

حکام نہیں بلکہ فقہاء اسلام مراد ہیں۔

صاف اور سنگلاخ زمین یعنی مقلدین

جو لوگ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہوں اور نہ قرآن و سنت سے مسائل نکالنے پر قدرت رکھتے ہوں۔ اس ارشاد نبوت میں زمین کی وہ قسم ہیں جسے زبان نبوت نے اس تمثیل میں اُٹھا ہی قِیْعَانٌ لَا تَمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَاءً سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اُمت کا وہ طبقہ جو مسلمان ہونے کے باوجود علم نبوت سے بہرہ ور نہیں۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں حَسَوْ مَنْ دَخَلَ فِي الدِّينِ دَلَسَ يَسْمَعُ الْعِلْمَ، یعنی وہ مسلمان ہو دین سیکھنے کے لیے زندگی بھر کچھ وقت بھی دین سیکھنے پر صرف نہیں کرتے اور کوئی موقع بھی دین کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کے لیے نہیں نکالتے۔ وہ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا کا مصداق ہیں۔ اُمت اسلامیہ میں ان کی اکثریت ہے اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں جو جانتے ہیں ان سے پوچھ پوچھ کر گزارہ کریں۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ تقلید پر چونکیں اس لیے اس حقیقت کو آشکارا کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم صرف تحقیق کا نام ہے اور صدر اول میں صرف تحقیق تھی۔ تقلید کا نام و نشان نہ تھا وہ سخت غلط فہمی میں ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے سنن ابن ماجہ کی حدیث انس بن مالک

امتى على خمس طبقات فاربعون سنة اهل برو تقوى

ثم الذين يلونهم الى عشرين ومائة سنة اهل

مواهم وتواصل ثم الذين يلونهم الى ستين ومائة

اهل تدابر وتقاطع ثم المصرج المهرج النجا النجا۔

میر ہی اُمت پانچ طبقوں پر ہے چالیس برس تک تونیک اور

پیرمیزگار لوگ ہوں گے پھر اُن کے بعد والے ایک بیس برس تک

اپس میں رجم کرنے والے اور حق قرابت ادا کرنے والے ہوں گے۔

پھر ان کے بعد والے لوگ ایک سو ساٹھ تک باہم ترک صحبت اور قطع تعلقات کرنے والے ہوں گے۔ پھر ان طبقوں کے بعد قتل ہی قتل ہے (اس زمانے سے) نجات طلب کرو نجات طلب کرو۔

میں آئے ہوئے پانچ طبقوں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ صحابہ کرام میں مختلف مراتب اور مدارج تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَأَنَّ جَمَاعَةَ سَلِيمِ الْفِطْرَةِ بِرِمَازِلِ شَتَّى بُودِهِ أَنْطَاقُهُ مَخْلُوقٌ بِرِاسْتِعَادِ كَسْ
كَمْ شَبِيهِ بِاسْتِعَادِ أَنْبِيَاءِ بُودِ وَنُورُهُ أَنْبُوتِ دُرِّ جُوہِ طَبِيعَتِ إِيْشَاءِ مَوْجِ -
إِيْشَاءِ سِرِّ دَفْتَرِ اُمْتِ آمَدَنْدِ وَبَشَاهُوتِ دَلِّ اَآءِ وَاعِيَةِ وَأَنَّ عُلُومَ رَاطَلَقِي
مُؤَوَّهِ أَنْدِ وَبَارِهِ اَزْ تَحْقِيقِ نَصِيبِ إِيْشَاءِ شَدِّ - وَطَاقَتُهُ اسْتِعَادِ تَقْلِيدِ تَمَامِ
وَاسْتِعَادِ قَبُولِ اَلْعَكَاسِ اَآءِ وَاعِيَةِ وَأَنَّ عُلُومَ مُؤَوَّندِ وَحَصَرِ اَزْ سَعَادَاتِ
يَافَتَنْدِ وَكَلَّا وَعَدَ اللّٰهُ اَلْحَسَنِيَّ اَلَيْهِ

پھر یہ فطرت سیدمہ والے بھی مختلف مراتب پر تھے۔ بعضے تو ایسی استعداد کے ساتھ مخلوق ہوئے تھے کہ وہ (استعداد) انبیاء کی استعداد سے مشابہ تھی۔ اور ان کے جوہر طبعیت کے اندر نبوت کا نمونہ امانت رکھا گیا تھا۔ یہ لوگ اُمت کے سر دفتر ہوئے ان لوگوں نے اپنے دل کی شہادت سے اس داعیہ کو اور ان علوم کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے لیا اور تحقیق کا ایک حصہ ان کو نصیب ہوا اور بعضے تقلید کی استعداد کامل رکھتے تھے اور انہوں نے اس داعیہ اور ان علوم کے عکس کو قبول کیا اور سعادت سے ایک حصہ پایا اور سب کے لیے اللہ نے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

یہاں سے یہ بات الم نشرح ہو گئی کہ علم تحقیقی ہو یا تقلیدی دونوں علم ہیں اور دونوں اُمت کو صحابہ سے وراثت میں ملے ہیں مولانا اسماعیل شہید نے منصبِ امامت میں یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ :

علم با احکام شرعیہ بہ دو طریق حاصل میشود تقلید و تحقیق۔ و علم انبیاء از جنس علم تقلیدی اصلاً نیست بلکہ آنچہ ایشان را ازین علم بدست آمد ہمہ بطریق تحقیق حاصل شد و تحقیق را دو طریق است اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول باشد والہام بشرطیکہ از مداخلت نفسانی محفوظ باشد پس مشابہہ بانبیاء در علم احکام یا مجتہدین مقبولین باشند یا ملہمین محفوظین و از بسکہ استناد احکام بسوئے کشف والہام در اوائل امت معروف نہ بود پس مشابہہ بانبیاء درین فن مجتہدین مقبولین اند پس ایشان را از ائمہ فن باید شمر و مثل ائمہ اربعہ ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار گذشتہ اند فاما مقبول در میان جمہور امت ہمیں چند اشخاص اند پس گویاکہ مشابہت تامہ درین فن نصیب ایشان گردیدہ بنار علیہ در میان جمہیر اہل اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند و بقوت اجتہاد موصوف بہ

علم بہ احکام شرعیہ دو طریق پر حاصل ہوتا ہے۔ تقلیداً اور تحقیقاً۔ اور علم انبیاء منجمد علم تقلیدی بالکل نہیں بلکہ جو کچھ ان کو علم حاصل ہوا تمام بطریق تحقیق حاصل ہوا۔ اور تحقیق کے دو طریق ہیں۔ اول اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول ہو۔ دوم الہام بشرطیکہ مداخلت سے محفوظ ہو۔ پس انبیاء علیہم السلام کے مشابہہ علم احکام میں یا مجتہدین مقبولین ہیں۔ یا ملہمین محفوظین اور چونکہ کشف والہام کی طرف احکام کی نسبت اوائل امت میں معروف و مشہور نہ تھی پس مشابہہ بانبیاء اس فن میں مجتہدین مقبولین، ہیں۔ سو ان کو ائمہ فن سے معلوم کرنا چاہیے۔ مثل ائمہ اربعہ، ہر چند کہ مجتہدین دین بہت کچھ گزرے ہیں۔ لیکن مقبول در میان جمہور امت یہی چند اشخاص ہیں۔ پس گویاکہ مشابہت تامہ اس فن میں انہیں کے نصیب ہوئی۔ نظر براں تمام اہل اسلام خواص و عوام میں بلقب امام معروف ہوئے اور بقوت اجتہاد موصوف بہ۔

علامہ شاطبی نے موافقات میں لکھا ہے کہ شریعت میں قابل اعتماد و قابل اعتبار وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان میں عمل پر آمادگی ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ اہل علم تین قسم کے ہیں۔

۱۔ ایک وہ جن کا علم تقلیدی ہے اور درجہ کمال حاصل نہیں ہے

۲۔ دوسرے وہ جن کا علم استدلالی ہے اور دلائل و براہین سے واقف ہیں

۳۔ تیسرے وہ جن کا علم تحقیقی ہے خود علم ان کے لیے ملکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ شریعت میں علم معتبر وہ ہی ہے جس کے ذریعے انسان عمل پر آمادہ ہو جاتے تو پھر علم تقلیدی کے علم نہ ہونے کی وجہ کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ مقلد اپنی عملی زندگی میں جن کی تقلید کرتا ہے صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ قرآن و سنت کے ترجمان ہیں۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اہل سنت کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے اہل سنت کے تقلیدی موقف کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ

الناس لم يأخذوا قول مالك والشافعي واحمد وغيرهم
الا لكونهم يندون اقوالهم الى ما جاربهم النبي
صلی اللہ علیہ وسلم فان هؤلاء من اعلم الناس
بما جاربهم واتبعهم لذلك واشدا اجتهدا في معرفة
ذلك واتباعه لہ

لوگوں نے امام مالک، شافعی اور احمد کی باتوں کو صرف اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ اکابر اپنی باتوں کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کی طرف نسبت کرتے ہیں کیونکہ یہ ائمہ تمام لوگوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی باتوں یعنی احادیث کے سب سے زیادہ عالم ہیں اور سب سے زیادہ احادیث کی پیروی کرنے والے اور احادیث کی معرفت اور اتباع میں سب سے اچھی قوت اجتہاد رکھنے والے ہیں۔

اسی بنا پر شاہ ولی اللہ نے اصولیین کی بنائی ہوئی عام شاہراہ سے ہٹ کر تقلید کی یہ تعریف کی ہے ان یكون اتباع الروایة دلالۃ علیہ یعنی بات نبوت کی ہو اور الفاظ امام مجتہد کے ہوں

اسے مان لینے کا نام تقلید ہے۔

الغرض ارشاد نبوت کی رُو سے دونوں محدثین ہوں یا فقہاء۔ اسلام کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ منطوق میں محدثین سے اخذ کرنا اور مفہوم میں فقہاء کی تقلید کرنا اسلاف کا مسلک اور اکابر کا مذہب ہے۔ میری اس تحریر کا منشا یہ ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ امام اعظم کی ذات گرامی صرف امام فقہارت ہی نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔ چونکہ امام اعظم کی زیادہ شہرت فقہارت میں ہوئی اس لیے کچھ لوگوں کی نظروں سے امام اعظم کی محدثانہ شان اور جھل ہو گئی اور فقہارت میں شہرت کی وجہ میں جو کچھ سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ امام موصوف نے بطور فن جس چیز کو تمام علوم میں کمال پیدا کرنے کے بعد اپنا یادہ علم الفقہ تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص جس فن کو اپناتا ہے۔ شہرت اسی میں ہوتی ہے۔ امام بخاری اور مسلم فقہی مسائل میں صاحب رائے تھے مگر ان کو محدثین سے نکال کر فقہاء میں کسی نے شمار نہیں کیا کیونکہ فقہ کو انہوں نے بطور فن نہیں اپنایا تھا۔ تاریخ تو فن کے اپنانے کے لحاظ سے کسی شخص کا تعارف کراتی ہے۔ یہ بات ایک درجہ میں صحیح ہے کہ ایک شخص محدث ہے مگر فقیہ نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص فقیہ اور مجتہد ہو مگر محدث نہ ہو کیونکہ مجتہد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً اس کی نظر شریعت حقہ کے پورے پورے سسٹم، قرآن حکیم، اسوۂ نبوت اور اعمال صحابہ پر ہو اور اس کی نظر سے شریعت کا کوئی گوشہ اوجھل نہ ہو۔ اور پھر ان سے مسائل نکالنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔

چنانچہ شاطبی لکھتے ہیں،

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين

احدهما فهم مقاصد الشريعة على كمالها

والثاني من الاستنباط

درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو دو صفتوں سے موصوف

ہو۔ ایک یہ کہ پوری کی پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو، دوسرے

یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔

یاد رہے کہ شریعت کے پورے سسٹم میں بصیرت ہونے اور اس سسٹم کے کسی ایک گوشے

میں فنکار کی حیثیت سے نام آوری پیدا کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ محدثین نے ایک فنکار کی حیثیت سے حدیث میں نام پیدا کیا ہے۔ لیکن ائمہ اربعہ کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا فن علم حدیث میں یہ نہیں کہ حدیث کس کس سند سے آئی ہے بلکہ ان کا مقام علم حدیث میں وہ ہے جو علامہ شافعی نے الموافقات میں لکھا ہے۔

وَانْ كَانَ مَتَمَكِّنًا مِّنَ الْاِطْلَاعِ عَلَى مَقَاصِدِهَا كَمَا قَالُوا

فِي الشَّافِعِيِّ وَابْنِ حَنِيفَةَ فِي عِلْمِ الْحَدِيثِ

اگر شریعت کے مقاصد پر اطلاع رکھتا ہو جیسا کہ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے متعلق علم الحدیث کے بارے میں سب کی رائے ہے

اور اجتہاد میں یہی وہ اُسوہ ہے جو صحابہ نے چھوڑا تھا۔ الغرض میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی ذات گرامی صرف امام فقہت نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔

حدیث کیا ہے

امام اعظم کی محدثانہ شان اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کے تذکرے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ حدیث کے بارے میں بتایا جائے۔ اتنی بات تو کم و بیش سب ہی جانتے ہیں کہ قرآن میں اللہ پاک نے لوگوں کو صرف حضور انور کی نبوت و رسالت سے روشناس نہیں کیا۔ بلاشبہ نبوت ایک عہدہ اور منصب ہونے کی وجہ سے ایمانیات سے متعلق یعنی ماننے اور باور کرنے کی چیز ہے مگر قرآن نے منصب کے ساتھ نبی کے مقام کا بھی ذکر کیا ہے۔

منصب تو یہی ہے کہ جناب سیدنا محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب الهاشمی المکی ثم المدنی نبی اور رسول ہیں جو قرآن کی صورت میں خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں اور مقام یہ ہے کہ آپ رسول ہونے کے ساتھ اس پیغام الہی یعنی قرآن کے مبلغ، داعی، معلم اور مبین بھی ہیں۔ آپ طبیعات کے محل اور خباثت کے محرم ہیں۔ اس کے ذریعے آپ باہمی تنازعات کے حکم، قاضی اور معاشرے کی اسلامی زندگی کے لیے اُسوہ حسنہ ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ نبی و رسول ہونے کی حیثیت میں امت سے آپ کے ماننے کا اور مقامات والی شخصیت

ہونے کی وجہ سے امت سے آپ کی طاعت، اتباع، توقیر، تعظیم اور محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔
 منصب اور مقام دونوں کو سمجھ لینے کے بعد حضور کو نبی مانتے ہوئے آپ کے کاموں،
 باتوں، عادتوں اور حالتوں کی قانونی حیثیت کو نہ ماننے کا مطلب آپ باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ
 یہ منصب کو مان کر مقام نبوت کا انکار ہے۔ کیونکہ اگر نبی کی باتوں، کاموں اور عادتوں کی
 قانونی حیثیت نہیں مانی جاتی تو پھر نبی کا نبی ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے اور اس طرح
 نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

قرآن و قانع کے تحت نازل ہوا ہے

رسول کے مقامات ہی کو انسانیت میں اجاگر کرنے کے لیے قرآن کا نزول بتدریج اور
 آہستہ آہستہ ہوا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ سبب قرآن سے
 آبی ہوتی صدیہ ہی ہے۔

وَقَرَأْنَا مَا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَ عَلَى النَّاسِ عَلَى مَكَّةَ وَ
 نَزَّلْنَاهُ نَزْلاً مُبِينًا

اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے جدا جدا کر کے پڑھے تو اس کو لوگوں پر
 بٹھ کر اور اس کو ہم نے امارتے امارتے اتارا۔

گویا آہستہ آہستہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ جیسے جیسے حالات پیش آتے ان کے موافق
 ہدایات حاصل ہوتی رہیں اور اس کے نتیجے میں وہ جماعت بٹھے آگے چل کر تمام دنیا کا معلم
 بننا ہے۔ قرآن کی ہر بات اور موقع و محل کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے یاد رکھ سکے۔ اور
 آنے والی نسلوں کے لیے کسی بھی قرآنی بات کے لیے بے موقع اور بے جا استعمال کی گنجائش
 نہ ہے۔ اس طرح ان تیس سالہ نزول قرآن کے وقت میں پیش پا افتادہ حالات و وقائع
 کا نام یا صاحب قرآن کی تیس سالہ شب دروز میں قرآن ہی کی ہدایات پر اٹھی ہوئی
 عادتوں، باتوں، کاموں اور حالتوں کا نام لے رہا ہے۔ دراصل یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک
 قرآن، دوسرے وقائع جن کے تحت قرآن اتر رہا ہے۔ ان دونوں میں وہ ہی تعلق ہے

جو نقش اور نقاش میں حکمت اور حکیم میں پروردگار اور پروردگاری میں، معمار اور عمارت میں، نظم اور ناظم میں ہوتا ہے۔ اگر آپ چراغ کی روشنی کو چراغ سے یا چراغ کو اس کی روشنی سے الگ نہیں کر سکتے تو پھر اسنہ کو قرآن سے یا قرآن کو اسنہ سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ قرآن کو چراغ اور اسنہ کو اس کی روشنی یا اسنہ کو چراغ اور قرآن کو اس کی روشنی کہہ دیجئے۔ قرآن میں دونوں تعبیریں موجود ہیں۔ ایک مقام پر قرآن میں نبوت کو روشنی کہا گیا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝

بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔

اور دوسری جگہ خود قرآن کو روشنی قرار دیا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَرُوهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَآمَنَّا إِلَيْكُمْ
نُورًا مُّبِينًا ۝

تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند اور آداری ہم نے تم پر روشنی واضح۔

دونوں نور ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ وحی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایات کا نام کتاب یا قرآن اور اسی وحی کی رہنمائی میں بنے ہوئے نقشہ عمل کا نام اسوۂ حسنہ یا اسنہ ہے۔

حدیث تاریخ سنت کا نام ہے

اگرچہ متاخرین نے اصطلاحی طور پر اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے لفظ اسنت کو ایک سے زیادہ معانی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ مثلاً

حضور انور کے افعال و اقوال اور آپ کی موجودگی میں ہونے والے کاموں، باتوں کو اسنت کہا گیا ہے۔ بدعت کے مقابلے پر لفظ سنت استعمال ہوا ہے۔

حضور انور کے کاموں، باتوں، عادتوں اور حالتوں کو بھی سنت کہا گیا ہے۔

لیکن فقہاء اور اسلامی قانون کے علماء کی زبان میں نبوت کے اس محسوس جادۂ عمل کو سنت

کہتے ہیں جو ذاتِ نبوت نے اسلامی معاشرے کی دینی زندگی کے لیے بطور پیمانہ عمل پیش کیا ہو اور جسے جماعت صحابہ نے دین بنا کر اختیار کیا ہو۔ چاہے یہ افعال اعمال ہوں یا اخلاق و معاملات۔ اسی بنا پر صحابہ کے معمولات کو بھی سنت کہا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جیسے قرآن کے لیے قرارِ سبحدہ کی روایات ہیں ایسے ہی سنت کے لیے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا قرارِ سبحدہ کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا روایات

۱۔ قرارِ سبحدہ قرآن پاک کے وہ سات قاری جن کی قرأت کے مطابق ساری دنیا میں تلاوت قرآن کی جاتی ہے حافظ عبد القادر قرشی الجواہر المضية میں فرماتے ہیں۔ سات ماہتاب ائمہ قرار یہ ہیں

۱۔ عبد اللہ بن کثیر بن المطلب القرشی مولا ہم ابو عبد تا بعین میں سے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر سے قرآن کا سماع کیا ہے۔ ۲۷۱ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ بعض نے ۲۷۲ھ بتایا ہے۔

۲۔ نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم اللیثی مدنی۔ ان کے بزرگ اسفہان کے رہنے والے تھے۔ ابو رویم کفایت ہے ۲۷۱ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

۳۔ ابن عامر۔ یہ عبد اللہ بن عامر بن یزید بن تمیم بن ربیعہ البصبی دمشقی ہیں۔ دمشق کے قاضی تھے۔ کبار تابعین سے ہیں۔ ۲۷۱ھ کے آغاز میں ولادت ہوئی اور عاشوراء کے دن ۲۷۱ھ کو وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں تاریخ ولادت ۲۷۰ھ ہے اس لحاظ سے ان کی عمر ایک سو دس برس کی ہوتی ہے۔

۴۔ ابو عمرو بن العلاء بن عمار بن عبد اللہ المقرئ البصری۔ ان کا نام کسی نے بیان کسی نے بیان کسی نے سچا کسی نے عثمان کسی نے محبوب اور کسی نے کچھ اور بتایا ہے۔ ۲۷۱ھ میں کوفہ میں انتقال ہوا۔

۵۔ عاصم بن ابی النجود البکری الاسدی۔ ۲۷۱ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں سن وفات ۲۷۲ھ ہے۔ امام سفیان ثوری اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ بہد لہ ابو النجود کا نام ہے۔ اور عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں کہ یہ ان کی ماں کا نام ہے مگر ابو بکر ابن ابی داؤد نے اسے غلط کہا ہے۔

۶۔ حمزہ بن حبیب بن عمار بن اسماعیل الزبایہ التیمی مولا ہم الکوفی ابو عمارہ بمقام حلوان ۲۷۱ھ میں وفات پائی ہے

۷۔ کسائی ابو الحسن علی بن حمزہ الاسدی مولا ہم الکوفی۔ ۲۷۱ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے حمزہ اسدی کے

پاس قرأت کی تھی۔

ان ساتوں میں بجز ابن عامر اور ابو عمرو کے کوئی عرب نہیں ہے۔ (الجواہر المضية ج ۲ ص ۲۲۲-۲۲۳)

محدثین پر موقوف ہے۔ اگر حدیث کے نام سے اسناد و روایت کا کوئی بھی سلسلہ موجود نہ ہوتا۔ تو پھر بھی سنت اپنی جگہ ایسے ہی موجود ہوتی۔ حدیث تو دراصل تاریخ سنت اور اس کی روایت کا نام ہے اس تاریخی اور روایتی سلسلہ سے پہلے بھی حدیث موجود تھی۔ اور اس کے بعد بھی موجود ہے۔ قرآن ہمارا سنت دونوں روایتی اور تاریخی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ خالص ایک فکری اور علمی شاہکار ہے اس لیے وہ کتابی طور پر ہی متواتر ہے۔ اور سنت چونکہ ایک عملی چیز ہے۔ اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے۔ بلاشبہ اگر قرآن کا قرآن ہونا روایات قرار کا محتاج نہیں ہے۔ تو سنت کا سنت ہونا بھی روایات محدثین کا محتاج نہیں ہے۔

اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ قرآن کے لیے ائمہ قرأت کی روایات بعد میں منستہ وجود پر آتی ہیں تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ سنت کے لیے بھی ائمہ حدیث کی روایات بعد میں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ تاریخ قرآن ہے۔ اور یہ تاریخ سنت ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے یہی بات کیسے لطیف انداز میں بیان فرماتی ہے۔

انما قولنا رواہ البخاری كقولنا رواه القراء السبعة
والقرآن منقول بنقل المتواتر

ہمارا یہ کہنا کہ اسے بخاری نے روایت کیا ہے ایسا ہی ہے جیسا ہم کہیں کہ
اسے ائمہ سب سے قرار نے روایت کیا ہے حالانکہ قرآن متواتر منقول ہے

اور یہاں تک فرما گئے

لو لم يخلق البخاري ومسلم لم ينقص من الدين شيء له

اگر بخاری اور مسلم پیدا نہ ہوتے تو دین میں کچھ بھی کمی نہ ہوتی۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دین میں جو چیز قرآن کے بعد حجیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ سنت ہے حدیث نہیں ہے۔ حدیث تو تاریخ سنت کا نام ہے۔

معاذ کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ

قرآن کی حفاظت کے لیے جیسے دو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ایک سینہ دوسرے صحیفہ۔

ٹھیک ٹھیک اسی طرح سنت کی حفاظت بھی دو طرح سے ہوئی ہے۔ ایک سینہ دوسرے

عمل کا محسوس پیمانہ۔

چونکہ قرآن نازل ہی علم بن کر ہوا تھا اس لیے اس کی حفاظت بھی علم ہی کی طرح سینہ اور صحیفہ سے ہوتی اور سنت چونکہ اسی علم کے پر تو اور عکس کا نام تھا اس لیے اس کی حفاظت عمل کی طرح سینہ کے ساتھ صحیفہ سے نہیں بلکہ رائے عامہ کی محسوس عملی زندگی کے ذریعے ہوتی۔ صرف نوعیت کا فرق ہوا۔ ورنہ نفس حفاظت تو قرآن و سنت دونوں کی ہوتی اور نوعیت کا یہ فرق بھی خود قرآن و سنت کے باہمی فرق کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ قرآن متراسر علم کا نام ہے اور سنت متراسر عمل اور کردار کا نام ہے سنت سن سے ہے سن الطریقۃ کے معنی راستہ چلنے کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں سن فلان طریقاً من الخیر فلاں نے نیکی کا کام کیا۔ اسی سے لفظ سنت طریقہ اور سیرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جب یہ انسانی اعمال کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی شاہراہ عمل، طریق کار کے ہوتے ہیں اسی سے ہے سنوا بہم سنتہ اہل الکتاب مجوسیوں سے اہل کتاب کا پرتاؤ کر دو۔

تاریخ سنت کے لیے حدیث کا لفظ

اگرچہ لغت میں لفظ حدیث کا قریب قریب وہی مفہوم ہے جو اردو میں بات کا ہے مگر تاریخ سنت کے لیے یہ لفظ محدثین کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ قرآن ہی سے لیا گیا ہے۔ انبیاء کے کاموں، عادتوں، باتوں اور حالتوں کے لیے قرآن میں اللہ پاک نے ایک سے زیادہ مقامات پر حدیث ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سورہ ذاریات میں حضرت ابراہیم کے متعلق ایک واقعہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ۔

کیا پہنچی تجھ کو بات ابراہیم کے مہمانوں کی جو عزت والے تھے۔

حضرت موسیٰ کے حالات میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو جگہ فرمایا ہے:

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے لیے بھی قرآن میں لفظ حدیث آیا ہے

وَإِذْ أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا

اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے ایک بات

مزید برآں یہ کہ اللہ پاک نے قرآن میں ایک مقام پر حضور انور کو حکم دیا ہے

أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ قرآن کی زبان میں دین کی نعمت کو پیش کرنے کا نام حدیث ہے۔ اللہ اکبر! امت کی علمی دیانت کو کن لفظوں میں سراہا جائے جس نے اپنے رسول کی سنت کی تاریخ اور تعلیمی زندگی کے واقعے کے لیے قرآن سے الگ ہو کر نام بھی سچو نہ کرنا گوارا نہیں کیا۔

حدیث کا صحیح مقام

تشریحات بالا سے یہ امور واضح ہو گئے کہ

۱۔ دین میں قرآن و سنت دونوں حجت ہیں۔ دونوں قطعی اور یقینی ہیں۔ دونوں کی حفاظت ہوتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو علم اور دوسرے کو عمل کی صورت میں امت کے پاس چھوڑا ہے اور پورا پورا اطمینان کر لیا کہ دونوں محفوظ ہو چکے ہیں۔ حضور انور کے بعد خلفاء راشدین نے دونوں کی حفاظت کی اور دونوں کی نشر و اشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا۔

۲۔ حدیث تاریخ سنت کا نام ہے اور سنت شناسی کا ذریعہ ہے۔ اس کے فنکاروں کو محدثین کہتے ہیں۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا مقام دین کی زندگی میں کیا ہے؛ جنہوں نے منصب رسالت کی عظمت و عزت کو گھسانے اور نبی کی سنت سے امت کا رشتہ توڑنے اور سنت کی حیثیت کو لوگوں کی نگاہوں میں مستتبہ بنانے کے لیے یہ بات گھڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف ایک ہی قسم کی وحی نازل ہوئی ہے جو قرآن کی صورت میں موجود ہے اور اس سے الگ کسی قسم کی وحی کو ماننا یہودیت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی بنیاد پر سنت کی تقدیس کو واقدار بنانے کے لیے یہ عمارت بھی بنائی ہے کہ سنت چونکہ وحی نہیں ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک اجتہادی رائے ہے جسے قانونی لحاظ سے واجب الاتباع نہیں کہا جاسکتا۔ اس انداز فکر کی لغویت بالکل واضح ہے کیونکہ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ وحی متلو کے علاوہ بھی بکثرت نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بلکہ خدا کے برگزین پر وحی نازل ہوتی رہی ہے جس پر خود عمل کرنا اور جس کی تعمیل پوری امت سے کرانا انبیاء علیہم السلام کے مقاصد بعثت میں شامل تھا۔

قرآن اور سنت میں فرق

لیکن وحی ہونے کے لحاظ سے قرآن و سنت میں غلام نے جو جو ہر ہی فرق بتایا ہے وہ بھی گوش گزار فرمایا ہے۔ اور قرآن کی بیان کردہ وحی کی قسموں میں قرآن و سنت دونوں کا مقام معلوم کر لیجئے۔

در اصل قرآن ہوا سنت دونوں اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ وحی ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن حکیم وحی ہونے کے ساتھ اپنے اندر شانِ اعجاز بھی رکھتا ہے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے اس کی کتابت کا اہتمام فرمایا۔ برخلاف اس کے سنت چونکہ معجزہ نہ تھی۔ اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی و مطالب آپ پر نازل ہوئے تھے اور اس کو آپ اپنے لفظوں میں ادا فرماتے تھے اور یہ الفاظ بھی حسب ضرورت مختلف ہوتے تھے۔ کیونکہ آپ کو مختلف طبائع اور مختلف مذاق کے لوگوں کو سمجھانا پڑتا تھا اس لیے اس کے لفظوں کی بعینہ تلمذات کا حکم نہ تھا۔ بالفاظ دیگر قرآن و سنت میں وہی فرق ہے جو اردو زبان میں نامہ و پیام میں ہوتا ہے۔

امام الحرمین کا نظریہ

یہ فرق حافظ جلال الدین السیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں امام الحرمین کے والد امام ابو محمد الجونی سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ کلام دو قسم کا ہے ایک قسم یہ کہ اللہ سبحانہ حضرت جبریل سے فرمائیں کہ ہمارے رسول کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ

۱۔ حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں کہ امام الحرمین دو عظیم المرتبت شخصیتوں کا لقب ہے ایک حنفی اور دوسرے شافعی۔ حنفی تو ابو المنظر یوسف القاضی الجرجانی۔ اور دوسرے شافعی یعنی ابو المعالی عبد الملک ابن الامام ابو محمد عبد اللہ بن الجونی المتوفی ۴۷۸ھ ہیں۔ چونکہ آپ کا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں جگہ قیام رہا اور آپ نے دونوں جگہ تدریس و افتاء کا کام کیا۔ اس لیے آپ کو امام الحرمین کہتے ہیں۔ امام غزالی نیشاپور میں تشریف لاتے تو امام الحرمین ہی کے پاس ہے اور ان کی ہی محنت سے امام غزالی یفرن مولیٰ بن گئے۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ جن کے غزالی شاگرد ہوں خود ان کی جلالت علمی کا کیا حال ہوگا۔

اللہ سب سے نہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں کام کرو ایسے کرو حضرت جبریل
رب العزت کا پیغام سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ بعد ازیں رسول خدا صلی اللہ علیہ
وسلم کے پاس تشریف لاتے ہیں اور اللہ سبحانہ کا پیغام پہنچاتے ہیں
قال له ما قال رب، ولم تكن العبارة تلك العبارة، یعنی بات
اللہ سبحانہ کی ہوتی ہے اور عبارت حضرت جبریل کی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے مہتمد سے کہے کہ فلاں شخص
سے کہو کہ بادشاہ کہتا ہے کام ٹھیک کیا کرو، فوج تیار رکھو۔ اس پیغام
کو اگر قاصد اپنے الفاظ میں یوں پہنچا دے کہ سست مت ہو۔ محنت کرو۔ اور
فوجی نظام کو پامال نہ ہونے دو تو تعبیر کے اس اختلاف سے ادائے
پیغام میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اور اسے فرض رسالت کی ادائیگی
میں کوتاہی کا نام نہیں دیا جائے گا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ سبحانہ
حضرت جبریل سے کہیں کہ یہ خط ہمارے رسول کو جا کر سناؤ اور اس
کے سامنے پڑھو۔ حضرت جبریل تشریف لاتے ہیں اور بلا کم و کاست
اور بغیر رد و بدل خط آکر سناتے ہیں اور ان کے سامنے پڑھ دیتے ہیں۔

حافظ جلال الدین السیوطی کی تائید

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ دوسری قسم قرآن اور پہلی قسم سنت ہے اور امام جوینی کے
نظر یہ کی تائید میں لکھتے ہیں۔

وقد رایت من السلف ما یعضد کلام الجوینی۔

میں نے سلف سے ایسی چیز دیکھی ہے جس سے جوینی کے کلام کی تائید
ہوتی ہے۔

گہر یا قرآن یعنی نامہ اپنے الفاظ و معانی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ سنت معجزہ نہیں ہے
قرآن میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل جائز نہیں ہے۔ لیکن سنت یعنی پیغام

روایت بالمعنی ہے۔ یعنی اصل مقصود مولیٰ سبحانہ کا ہے اور الفاظ کا جامہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ہے۔

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ چونکہ سنت کا آغاز ہی روایت بالمعنی سے ہوا ہے اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز ہے اور قرآن پہلے ہی چونکہ روایت باللفظ میں وحی ہوا ہے اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز نہیں ہے کیونکہ پیام میں اگر پیامی آپ کا غشا اور مافی الضمیر صحیح طور پر مرسل الیہ تک پہنچا دیتا ہے تو پیام رسائی کا مقصد حاصل ہو گیا خواہ پیغام رساں اسے آپ کے الفاظ میں نہ پہنچائے بلکہ اکثر اوقات اس کے لیے الفاظ میں تبدیلی کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن نامہ کی صورت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ان ہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر قاصد نے بیچ میں خط کو چاک کر ڈالا اور اسی مضمون کا دوسرا خط تحریر کر دیا یا اس کا مطلب ہی بلا کم و کاست زبانی جا کر بیان کر دیا تو وہ کسی طرح اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوا بلکہ الٹا خیانت کا ملزم اور بددیانتی کا مرتکب ٹھہرا۔

سنت بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے

سنت بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے مگر اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے جس میں الفاظ کی بعینہ ادائیگی ضروری نہیں ہے اور قرآن حکیم کی نوعیت دوسری قسم کی ہے۔ یہاں اصل لفظ ہیں جو روح القدس کے ذریعے حق تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور آپ کے ذریعے امت تک پہنچے۔ ان میں نہ روایت بالمعنی کی اجازت ہے نہ کسی قسم کے

لہ علامہ نے تصریح کی ہے کہ قرآن نظم و معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ورا یہ میں ہے ان القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعاً ابوالحسن مرغینانی رقمطراز ہیں انا امرنا بحفظ اللفظ والمعنی فانہ دلالة علی النسوة شرح اصول میں علامہ عبدالعزیز بخاری لکھتے ہیں القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعاً ان تصریحات کا مقصد یہی بتانا ہے کہ قرآن کی حیثیت نامہ کی ہے نہ کہ پیام کی۔ اسی بنا پر ترجمہ قرآن کو ہم قرآن نہیں کہہ سکتے۔ اُلو سی لکھتے ہیں فلا شک ان الترجمة لیست بالقرآن نماز میں قرآن پڑھتے کا حکم ہے نہ کہ ترجمہ قرآن کا فاقوہ و اما تیسرے من القرآن اور قرآن نام ہے نظم و معنی دونوں کا۔

تغیر و تبدل کا اختیار۔ ہاں ترجمہ و تفسیر کی اجازت ہے لیکن اسے کلام الہی نہ کہا جائے گا یہ بات بھی خود قرآن ہی کی بیان کردہ حقیقت ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ
جب ہم پڑھیں تو ساتھ رہ اس پڑھنے کے بلاشبہ ہمارے ذمے ہے
اس کا بیان۔

یہاں دعویٰ یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد قرآن کا بیان بھی اللہ سبحانہ کے ذمے ہے۔ اگر قرآن کا یہ بیان خود قرآن سے کوئی علیحدہ چیز ہے اور یقیناً ہے کیونکہ اگر قرآن ہی کو قرآن کا بیان بتایا جائے تو پھر اس کے لیے بھی قرآن ہونے کی وجہ سے بیان کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ ایک غیر متناہی ہو جائے گا، ماننا پڑے گا کہ بیان قرآن خود قرآن سے الگ ہے جو قرآن نہیں ہے۔ اگر قرآن سے الگ ہے تو اللہ سبحانہ کی جانب سے ہے اور بذریعہ وحی ہے۔ یہ وحی جس کے ذریعے قرآن کا بیان عمل میں آیا ہے۔ کون سی ہے؟ خود قرآن نے نزول وحی کی تین صورتیں بتائی ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بَأْذِنِهِ مَا يَشَاءُ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَكِيمٌ

کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اللہ سے یا پڑے کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے تحقیق وہ سب سے اوپر ہے مخلوق والا۔

۱۔ اَوَّلُ : وحی

۲۔ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ

۳۔ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بَأْذِنِهِ مَا يَشَاءُ

نزول قرآن کے لیے جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ تیسری ہے یعنی بواسطہ فرستہ اللہ سبحانہ وحی فرماتیں مگر فرشتہ آنکھوں سے نظر نہ آئے بلکہ براہ راست نبی کے قلب پر فرشتہ کا نزول ہو۔ یہی صورت ہے جسے حدیث میں یا یقینی مثل صلصلة الجرس سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی کو حدیث میں ہوا شدہ علیٰ فرمایا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ تمنا ہے نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم پر زیادہ ترویج اسی طرح آتی تھی۔ اسی صورت کو حافظ سیوطی نے اصوب الحالین بتایا ہے علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن اس طرح ہوا ہے کہ فرشتہ اللہ سبحانہ سے روحانی طور پر وحی حاصل کرتا ہے اور اسے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے اور آپ کو القا کرتا ہے۔ اس صورت میں یقیناً بیانِ قرآن کا نزول نہیں ہوا ہے۔ ایسی ہی وہ صورت نہیں ہے جسے قرآن میں من وراء حجاب کہا ہے۔ نزولِ بیان کے لیے اگر کوئی صورت ہے تو تیسری ہے جسے قرآن وحیا کہہ رہا ہے جس میں نفث فی الردع، الہام اور روایات صادقہ سب داخل ہیں۔ حضرت امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ نے الرسائل میں اب نہیں بلکہ اب سے بارہ سو سال پہلے بتا دیا ہے کہ نہ صرف سنتِ قرآن کا بیان ہے۔ اور یہ بیان اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی آیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ کلامِ الہی کی تین صورتوں میں سے جس صورت میں سنتِ آپ پر نازل ہوئی ہے۔ وہ وہی ہے جسے قرآن نے وحیا کہا ہے اور جس میں نفث فی الردع یا امراء وغیرہ داخل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

لے الرسائل۔ یہ اصول فقہ میں امام شافعی کی لکھی ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ انصاف میں رقمطراز ہیں:-
مختلف نصوص میں مطابقت کرنے کے لیے قواعد بنائے گئے اس لیے اجتہادی مسئلوں میں بڑا رخنہ پڑتا تھا حضرت امام شافعی نے اس کے قواعد بنائے اور ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ و هذا اقل تدوین کان فی اصول الفقہ (ص ۲۸)

در اصل یہ کتاب امام شافعی نے امام عبدالرحمن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے امام شافعی کے مشہور شاگرد ابو ثور کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ امام عبدالرحمن بن مہدی نے امام شافعی کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ ایسی کتاب لکھیں جس میں قرآن کے معانی و مطالب ہوں اور جس میں اخبار و احادیث کی اقسام حجت، اجماع اور کتاب و سنت کے ناسخ و منسوخ کا تذکرہ ہو۔ امام ابو ثور فرماتے ہیں فوضع لہ رسائلہ اس درخواست کے مطابق امام شافعی نے الرسائل لکھا۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۵)
حافظ ابن حجر عسقلانی نے توالی التاسیس میں اس خط کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے کتب عبدالرحمن بن مہدی الی الشافعی وهو شاب ان یضع لہ کتاباً فوضع لہ کتاب الرسائل (ص ۵۵)
الحاصل اصول فقہ کی کتاب الرسائل امام عبدالرحمن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔

القی فی روعہ کل ما سن و سنتہ الحکمۃ الذی القی فی روعہ من اللہ
فکان بما القی فی روعہ سنتہ

آپ کی تمام سنت آپ پر القاء کی گئی۔ سنت ہی وہ حکمت ہے۔ جو
آپ پر القاء ہوئی لہذا سنت نبوی اللہ سبحانہ کی جانب سے القاشدہ ہے

قرآن میں حکمت سے مراد سنت ہے

یہ صرف امام شافعی کی رائے نہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہے بلکہ قرآن کے مطالعہ سے بھی
یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکمت سے مراد سنت ہے۔ قرآن میں آپ کو ایسی متعدد آیات ملیں گی
جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی قرآن کی طرح اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل ہوتی ہے۔ سورۃ نساء
میں ایک جگہ ارشاد ہے :

وَ أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ
تَكُنْ تَعْلَمُ .

اور اللہ نے اتاری تجھ پر کتاب اور حکمت اور تجھ کو سکھائیں وہ باتیں جو
تو نہ جانتا تھا۔

سورۃ بقرہ میں ایک موقع پر فرمایا ہے :

وَ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ .

اور یاد کرو اللہ کا احسان تم پر ہے اور اس کو کہ جو اتاری تم پر کتاب
اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ۔

ان آیات میں اور اس طرح کی دوسری آیات میں کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد
ہے۔ کیونکہ حکمت کا ذکر قرآن کے ساتھ آیا ہے چنانچہ امام شافعی نے اپنے ایک مناظرے میں اسے
دلائل سے ثابت کیا ہے اور جب ان سے پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ اس قسم کی آیات
میں حکمت سے کیا مراد ہے آپ نے جواباً فرمایا کہ :

حکمت سے مراد سنت ہے۔ سائل نے کہا اس کا بھی امکان ہے
کہ يعلمہم الكتاب والحكمة کا یہ مطلب ہو کہ رسول کتاب کی

تعلیم دیتا ہے اور خصوصی طور پر حکمت کی اور حکمت سے مراد اللہ کے احکام ہوں۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے لوگوں کے سامنے ایسے ہی بیان کرتا ہے جیسا کہ اس نے ان کے سامنے تمام فرائض نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کو پیش کیا ہے اور اس طرح گویا خود اللہ نے کتاب کے ذریعے فرائض کو محکم بنا دیا ہے اور اللہ نے خود ہی بیان کر دیا کہ یہ فرائض زبان نبوت پر کیسے ہیں؟ مخاطب نے کہا کہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اگر یہی مطلب ہے تو پھر اس کا پتہ بغیر خبر نبی کے کیسے ہو سکتا ہے اس صورت میں بھی ارشادات نبوت کی ضرورت ہوگی۔ سائل بولا اگر کتاب و حکمت دونوں سے مراد ایک چیز ہو اور کلام میں صرف تکرار ہی ہو۔ امام شافعی نے فرمایا یہ آپ ہی بتائیے کہ کون سی چیز پسندیدہ ہے کتاب و حکمت دونوں الگ ہوں یا دونوں کا مطلب ایک ہو۔ سائل نے جواب دیا دونوں کا احتمال ہے چاہے تو کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے سنت ہو جیسا کہ آپ کا خیال ہے اور چاہے دونوں سے ایک ہی مراد ہو۔ امام شافعی نے فرمایا زیادہ قرین عقل یہی صورت ہے کہ کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے جیسا کہ میرا خیال ہے اور اس پر قرآن میں شہادت ہے۔ سائل نے پوچھا کہ قرآن میں کون سی شہادت ہے امام شافعی نے جواب میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَإِذْ كُنَّا مَا يَتْلُو فِي بُيُوتِكُمْ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۖ

سورۃ احزاب کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں کی طرح حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواج مطہرات کے گھروں میں ہوتی تھی۔ اور تلاوت کا مطلب جیسا کہ امام شافعی نے بتایا ہے یہ ہے کہ

انما معنی التلاوة ان ينطق بالسنة كما ينطق بالقرآن

تلاوت کے معنی یہ ہیں کہ سنت کو بھی ویسے ہی بولا جاتا ہے جیسے قرآن کو۔

فرا سوچئے کہ ازدواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کی آیوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی ہے اور حضور نور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن کے سوا کیا سناتے تھے۔ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ آپ کی سنت تھی اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے تذکار کا حکم ہے اس لیے اسی آیت سے سنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی بدیہی ہے کہ علم و ذکر خود مقصود بالذات نہیں بلکہ عمل کے لیے مقصود ہیں۔ اس لیے اسی آیت سے سنت پر عمل کا وجوب بھی معلوم ہو گیا۔ اور جب سنت کا دوسرا نام حکمت ہے تو ان آیات سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سنت بھی منزل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن ہی کی ان تصریحات کی بنا پر تمام ائمہ اور علماء سلف اس پر متفق ہیں کہ بعیدہم الكتاب والحكمة اور اس طرح کی دوسری آیات میں جو حکمت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد سنت ہے اور سنت بھی وحی الہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

اللہ سبحانہ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن و حکمت ہیں۔

اس کے بعد حافظ ابن قیم نے وہی آیات تلاوت فرمائی ہیں جن میں کتاب و حکمت کی تنزیل و تعلیم کا ذکر ہے۔ ان آیات کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

کتاب تو قرآن ہے اور حکمت سے باجماع سلف سنت مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے پاکر جو خبر دی ہے اور اللہ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں۔ یہ اہل اسلام کا بنیادی اور اتفاقی مسئلہ ہے۔ اس کا انکار وہی کرے گا جو ان میں سے نہیں ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز بھی دی

گنتی یعنی سنتِ یلہ

پھر یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا اور قرآن کے بیان کو اپنا بیان بتایا ہے۔ مگر قرآن میں دوسری جگہ قرآن کے پڑھنے اور قرآن کے بیان کو حضور کا کام بتایا ہے **لَتَقَرَّ أَعْيُنُ النَّاسِ عَلَى مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ تَاوِيلًا** اور انزل لَنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ تَاوِيلًا۔ اس آیت میں للناس اور ما نزل الیہم لاکر یہ بتایا ہے کہ کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت ہی اس لیے پیش آئی کہ نبوت کے بیان کے ذریعے کتاب الہی کا منشا صاف اور واضح ہو کر آئے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں :

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر روانہ فرمایا تاکہ اس کو سب ادیان پر غالب کرے۔ ان پر وہ کتاب اتاری جو عمل کرنے والوں کے لیے سزا سر نور و ہدایت ہے اور اپنے نبی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن کے ظاہر، باطن، خاص، عام اور نسخ منسوخ بتائیں۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کتاب اللہ کے مفہوم معنی کے مبین تھے۔ اس کام کو صحابہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جن کو اللہ نے اپنے نبی کی رفاقت کے لیے منتخب کیا تھا۔ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان اور توضیح نقل کی ہے۔ اس مشاہدہ کی وجہ سے وہی سب زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاننے والے اور اس بات سے واقف تھے کہ قرآن کی آیت میں اللہ کی مراد کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کی مراد بتانے والے صرف صحابہ کرام ہیں۔

امام ابو حنیفہ کے بارے میں امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ :

جو حدیثیں صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہیں۔ نیز جو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے امام ابو حنیفہ اس کو
اپناتے ہیں۔

حافظ ذہبی نے امام سیحی بن معین کی سند سے امام اعظم کا جو ارشاد نقل کیا ہے اس سے بھی حدیث
کے قرآن کا بیان ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:
میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے جو ثقات کے ذریعے
مشہور ہوئی ہوں اور اگر یہاں بھی نہ ملے تو پھر صحابہ میں جس کا قول چاہتا
ہوں لیتا ہوں۔

صرف یہی نہیں بلکہ کئی دوسرے مواقع پر بھی انہوں نے فرمایا ہے کہ فقہ اسلام اور قوانین اسلام تک
پہنچنے کے لیے سنت ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

قرآن میں اللہ سبحانہ نے ایک سے زیادہ ارشادات میں اتباع رسول کا حکم دیا ہے اور حکم بھی اس
بارے میں مطلق اور بے قید ہے۔ یعنی اتباع کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے
کسی خاص گوشے کی تعیین نہیں کی۔ یہ ایک طرف اگر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ذات نبوت
زندگی کے ہر گوشے میں واجب الاتباع ہے تو دوسری طرف اس میں اس بات کی بھی رہنمائی ہے
کہ پیغمبر اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں معصوم ہوتا ہے جیسے آپ کی زندگی میں آپ کی پیروی ضروری
تھی اسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ارشادات، اخلاق، اعمال اور احوال کی روشنی
میں زندگی کا نقشہ تیار کرنا ضروری ہے۔ غرض سنت قرآن کا بیان ہے۔ اس کے مجمل کی تبیین ہے
اس کے معنی کی توضیح و تائید کرتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

اول قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی شرح کی ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن
میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کے اقرار و انکار کے مترادف ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن کی طرح اس کا بیان بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ فرق صرف

یہ ہے کہ ایک ما انزل اللہ جو کچھ اللہ نے آمارا، اور دوسرا ما اراک اللہ (جو کچھ تم کو اللہ نے دکھایا) ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

دوم یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآن کے مفسر تھے۔ آپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ آیات قرآنی کی تفسیر و تاویل کرے۔ اس لیے صرف سنت ہی قرآن کا بیان ہے اور یہ بیان سنت کے علاوہ کسی دوسری راہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

سوم یہ کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اثر مروی نہ ہو تو صحابہ تفسیر کا حق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے قرآن اتر رہا ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیات قرآنی کی تاویل سنی اور جو سنت سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔

بہر حال سنت بھی اللہ پاک کی وحی ہے مگر اس کی حیثیت پیام کی ہے اور قرآن بھی اللہ سبحانہ کی وحی ہے اور اس کی حیثیت نامہ کی ہے۔ سنت میں روایت بالمعنی جائز ہے مگر قرآن میں روایت بالمعنی ناجائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں اعجاز کے ساتھ شانِ تعبد بھی ہے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں :

لے جلال الدین لقب، ابو الفضل کنیت، عبدالرحمن بن الکمال نام ہے۔ انوار کے دن یکم رجب ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے، ۸۰ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا بعد ازیں علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ کاشغری نے طبقات میں خود ان کی زبانی نقل کیا ہے کہ تین سو ساतذہ سے علمی استفادہ کیا ہے۔ ۱۷ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون سے نہ صرف فارغ ہو چکے تھے بلکہ میدان تالیف میں بھی قدم زن ہو گئے تھے۔ عربی ادب اور حدیث میں علامہ تفتی الدین شبلی حنفی کے شاگرد ہیں۔ چھ علموں میں اجتہاد ہی شان رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، معانی، بیان۔

ان کی تصانیف کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے اپنے تئیں اجتہاد کے مدعی تھے مگر فرماتے تھے کہ اجتہاد دو قسم کا ہوتا ہے، اجتہاد مطلق، اجتہاد نفسی،

اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہے اور دوم تا قیامت باقی ہے اور مجتہد منسوب ہونے کا ان کو دعویٰ تھا۔ ہمیشہ امام شافعی کے مذہب کے مطابق مسئلہ بتاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ پوچھنے والا مذہب دریافت کرتا ہے میرا اجتہاد نہیں پوچھتا۔ اللہ اکبر! اللہ کے دین میں کس قدر احتیاط ہے تبیض الصیفہ کے نام سے امام اعظم کے مناقب پر کتاب لکھی ہے۔ ۹۱۱ھ میں بعمر ۸ سال دس ماہ گیارہ دن وفات پائی۔ (استحاف)

والمستة في ذلك ان المقصود منه التعبد والاعجاز به^۱

راز اس میں یہ ہے کہ قرآن سے مقصود تعبد اور اعجاز ہے۔

برخلاف سنت کے کہ اس کے الفاظ میں اعجاز نہیں بلکہ اس کے معانی میں شانِ تعبد ہے اور سنت معنی ہی کے لحاظ سے متواتر بھی ہے چنانچہ علامہ الجزائری رقمطراز ہیں۔

المرجح انه ليس في السنة متواتر الا المتواتر في المعنى دون اللفظ^۲

راجح یہی ہے کہ سنت میں تواتر لفظی نہیں بلکہ صرف تواتر معنوی ہے۔

اور عمل کے لیے معنی ہی کے متواتر ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے الفاظ میں نہ تعبد ہے اور نہ اعجاز۔ اسی بنا پر متواتر سے بحث کرنا محدثین کا کام نہیں۔

ان المحدثين لا يبحثون عن المتواتر لاستغنائه بالتواتر عن ايراد سند له^۳

محدثین کے یہاں متواتر سے کوئی بحث نہیں ہوتی کیونکہ تواتر کو سند کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

اس موقع پر حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات لکھ گئے فرماتے ہیں کہ اس مقام پر دو اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں:-

۱۔ قرآن اپنے الفاظ اور معانی میں ایک ایسی امتیازی شان رکھتا ہے کہ اس میں کوئی کلام بھی کسی طرح اور کسی وجہ سے قرآن کی ہمہری کا دعویٰ نہیں کر سکتا نہ الفاظ میں اور نہ معنی میں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی غیر عربی میں قرأت ناجائز ہے۔ کیونکہ غیر عربی میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ ہے مگر قرآن ہرگز نہیں ہے۔ قرآن تو نظم اور معنی دونوں کا نام ہے۔ ترجمہ اگرچہ درست ہے مگر قرآن کی طرح اس کی قرأت و تلاوت ہرگز جائز نہیں۔

۲۔ قرآن میں الفاظ کے ساتھ معنی کی بھی ایک ایسی نمایاں حیثیت

ہے کہ کوئی کلام بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے معنوی
 اعجاز میں زیادہ قوت ہے۔ قرآن کی اس آیت میں جو توحیدی کی گئی
 ہے وہ ہر قسم کے اعجاز کے پیش نظر کی گئی ہے
 قُلْ لِّئِنْ أَجْتَعْتَ الْإِنْسَ وَالْجِنَّ عَلَىٰ أَنْ يَتَّبِعُوا بِمِثْلِ
 هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُوا بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
 بَعْضًا ظَهِيرًا لِّلْآخَرِ

امام خطابی فرماتے ہیں:

کلام کی جان تین چیزیں ہیں۔ لفظ، معنی اور نظم۔ قرآن ان تینوں
 میں بہت بلند، اشرف اور افضل مقام رکھتا ہے۔ قرآن کے
 الفاظ سے زیادہ فصیح، مختصر اور شیریں الفاظ آپ کو کہیں نہیں
 ملیں گے۔ قرآن کا نظم اپنی مثال آپ ہے۔ حسن تالیف قرآن کی
 ذاتی خوبی ہے۔ معانی کے لحاظ سے عقلاً سنے ہمیشہ قرآن کا لوہا
 مانا ہے۔ یہ تینوں خوبیاں الگ الگ تو ایک سے زیادہ مقامات
 پر موجود ہیں مگر یہ ساری خوبیاں یک جا قرآن کے سوا کہیں
 موجود نہیں ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ الفاظ کی سطح موتیوں سے
 لدی ہوئی ہے۔ حسن کی نظم کی تہ میں سوتیں بہہ رہی ہیں اور
 گہرائی سے معانی اُبل رہے ہیں۔

اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق

اسی بنیادی اور جوہری فرق کو بتانے کے لیے قرآن میں وحی کے متعلق دو قسم کے حکم ہیں
 کہیں وحی الہی کی اتباع پر زور دیا گیا ہے۔ اور کہیں وحی الہی کی تلاوت کا حکم ہے مگر
 قرآن نے ان دونوں میں ایک جوہری فرق قائم رکھا ہے۔ قرآن میں جہاں وحی کی تلاوت
 کا حکم ہے وہاں ماادحی کے ساتھ الکتاب کی قید ضرور لگائی ہے مثلاً اتل ما ادحی الیک

من کتاب ربک اور اتل ما ادھی الیٹ من الکتاب یا اسی قسم کے دوسرے مقامات، لیکن جہاں وحی کی اتباع کا مطالبہ ہے وہاں لفظ کتاب کو مٹا دیا گیا۔ مثلاً اتباع ما ادھی الیٹ من ربک اور ان اتباع الا ما یوحی الیٹ واصبر اور اتباع ما یوحی الیٹ من ربک اور ان اتباع الا ما یوحی الی من ربی اور لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم اتی ملک ان اتباع الا ما یوحی الی

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات ہیں جہاں وحی کی اتباع کا تذکرہ کیا ہے لفظ کتاب نہیں لایا گیا۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں نے اپنے مطالعہ قرآنی میں یہی محسوس کیا ہے کہ قرآن پر جتنا چاہتا ہے کہ وحی جو ذات نبوت پر آتی ہے وہ کتاب تک محدود نہیں ہے بلکہ کتاب سے باہر بھی وحی ہے۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کے لفظوں میں اعجاز کے ساتھ شان تعبیر بھی ہے۔ غیر کتابی وحی کا اتباع کیا جاتا ہے۔ گویا تلاوت الفاظ میں تعبد کی وجہ سے کتابی وحی کی خصوصیت ہے اور اتباع کا دائرہ کتابی اور غیر کتابی وحی کے لیے عام ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث ابی سعید کا منشا

اس روشنی میں صحیح مسلم کی اس حدیث کا منشا بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں حضرت ابوسید خدریؓ کی زبانی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت منقول ہے۔

لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیحی و حدثوا عنی ولا حرج و من کذب علی متعمداً فلیتبرأ مقعدہ من النار۔

مجھ سے نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا وہ اسے مٹا دے مجھ سے حدیث بیان کیا کرو اس میں کوئی سحرچ نہیں اور جس شخص نے میرے متعلق اراداً جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنالے۔

اگرچہ امام بخاری اور دیگر محدثین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں بلکہ معلول ہے چنانچہ حافظ

ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں:

منہم من اعل حدیث ابی سعید وقال الصواب وقفہ علی

ابی سعید قالہ البخاری

کچھ لوگوں نے حدیث ابی سعید کو معطل قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ابی سعید ہے۔

یعنی ان کی تحقیق میں یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ خود ابوسعید خدری کے ہیں جن کو غلطی سے راوی نے مرفوعاً نقل کر دیا ہے لیکن بالفرض اگر اس روایت کو موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ممانعت وقتی اس لیے تھی کہ قرآن کے الفاظ میں تبد ہے قرآن سے الگ ہو کر کوئی وحی نہیں جس کے الفاظ میں تبد ہو اور تبدی طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو، خود انداز بیان بول رہا ہے کہ مقصود یہی ہے۔ فرمایا ہے: لا تکتبوا عنی قرآنًا غیر القرآن یعنی مجھ سے تلاوت کی چیز قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو۔ اس ارشاد میں قرآن کی شان تبدی کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی تائید خود حضرت ابوسعید خدری کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں درج کیے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

لہ شہاب الدین لقب، ابو الفضل کنیت، احمد بن علی بن محمد بن الکتابی العسقلانی نام ہے۔ تاریخ پیدائش ۷۷۳ھ ہے۔ ابن حجر سے مشہور ہیں۔ سیوطی طبقات میں رقمطراز ہیں کہ حافظ عراقی سے وفات کے وقت دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہے فرمایا کہ ابن حجر پیر البزرجی نے نظم العقیان فی اعیان الاعیان میں ان کا تذکرہ اس طرح شروع کیا ہے فرید زمانہ حامل لواء السنۃ ذہبی هذا العصر نصارہ وجوہہ الذی ثبت ہم علی کثیر من الاعصار فحارہ امام هذا الفن للمتقدمین و مقدم عساکہ المسلمین و عمدۃ الوجود فی التوہین و التصحیح۔ حافظ زین الدین العراقي الشیخ سراج الدین البلقینی، الشیخ برہان الدین الانباسی، علامہ عزالدین بن جماعة، علامہ عبد الدین یزدی آبادی جیسے اساطین علم کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف میں فتح الباری شرح صحیح بخاری بڑے معرکہ کی شرح ہے۔ حافظ سیوطی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ اولین و آخرین میں اس جیسی کتاب نہیں ہے۔

عن ابی نصرۃ قال قلت لابن سعید الخدری الا تکتب ما
 نسخ منک قال انزیدون ان تجعلوها مصاحف
 ابو نصرۃ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید سے دریافت کیا کہ کیا ہمیں آپ
 سے سنی ہوئی احادیث کو لکھنے کی اجازت ہے فرمایا کیا تم ان کو مصحف
 بنانا چاہتے ہو۔

ابو نصرۃ ہی نے حضرت ابو سعید خدری کے حوالے سے اس سوال کے جواب میں کہ ہمیں لکھنے کی
 اجازت دیجئے یہ بھی نقل کیا ہے :

قال اُردتم ان تجعلوه قرآنًا لالہ

فرمایا کیا تم نے اسے قرآن بنانے کا ارادہ کیا ہے نہیں نہیں۔

یہاں ڈاکٹر صبحی صالح استاذ اسلامیات دمشق یونیورسٹی کی رائے ہے کہ ابو سعید خدری کی
 روایت میں لکھنے کی جس ممانعت کا تذکرہ ہے اس کا پس منظر زمانہ نزول وحی میں وحی اور
 اس کی تشریح میں القیاس کا اندیشہ ہے۔

معالم السنن میں علامہ خطابی نے اس ممانعت کے عملی مصداق کی توضیح کرتے ہوئے بتایا
 ہے کہ سنت کو قرآن کے ساتھ ایک ہی صحیفہ میں لکھنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ اختلاط نہ
 ہو اور پڑھنے والے کے لیے سامان اشتباہ نہ ہو۔ علامہ خطابی کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

انما نهى ان يكتب الحديث مع القرآن في صحيفة واحدة

لئلا يختلط به ويستبہ علی القاری۔

ایک صحیفہ میں قرآن کے ساتھ حدیث لکھنے سے اس لیے منع کیا

تاکہ القیاس نہ ہو اور قاری پر مشتبہ نہ ہو۔

راہرمزی نے المحدث الفاصل میں حدیث ابن سعید خدری کا ذکر کر کے لکھا ہے

فاحسبه انه كان ممنوعا في اول الهجرة وحین كان لایومن

الاشتغال به من القرآن۔

میرا خیال ہے کہ آغاز ہجرت میں ممنوع تھا۔ بالخصوص اس وقت جبکہ اس میں لگ کر قرآن سے ہٹ جانے کا امکان تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت آغاز ہجرت میں ہوئی ہے اور معلوم ہے کہ ابو سعید خدریؓ میں جنگ اُحد میں اتنے کم عمر تھے کہ فوج میں بھرتی ہونے کے شوق میں آئے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا۔

یہاں اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک اور حدیث پیش نظر ہو تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت تشریف لاتے جب ہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھ رہے تھے۔ فرمایا کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے کہا وہ باتیں جو ہم نے آپ سے سنی ہیں۔ فرمایا کیا تم کتاب اللہ کے سوا کوئی اور کتاب چاہتے ہو؟ تم سے پہلے امتوں کو اس کے سوا کسی چیز نے نہیں گمراہ کیا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے ساتھ دیگر کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔

ایک اور روایت اسی کے ہم معنی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اس ممانعتی حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان تمام روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شہد یا اس کے بعد ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بہت ہی عجیب و غریب تقریر فرمائی ہے۔ میں سے نو مسلموں کی ایک جماعت مدینے آئی ان میں کئی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کو قرآن حکیم کی سورتیں یاد کرنے کے لیے دی گئیں کہ پڑھیں اور یاد کریں۔ جب ان لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تقریر سنی تو حسن عقیدت سے یہ

تقریب بھی لکھ لی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نے قرآن کے ان ہی اوراق پر جو انہیں یاد کرنے کے لیے دیے گئے تھے لکھ لی ہے

اس بنا پر حضور انور نے فرمایا۔ کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔ اور اسی موقع پر یہ بات فرمائی گئی لَا تَكْتُبُوا عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ مِنْ كُتُبٍ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فليسمع۔

حضرت ابوسعید خدری نے حضور انور کا یہی ارشاد حضرت ابوسہریرہ سے سنا تو اسے بطور ارشاد نبوت بیان فرمادیا۔ شاید اسی علتِ دقیقہ کے پیش نظر امام بخاری نے اسے موقوف قرار دیا ہے۔ اس صورت میں علتِ ممانعت صرف اختلاط اور قرآن و غیر قرآن کا التباس ہے۔ اس لیے یہ ان احادیث کے معارض نہیں ہے جن میں احادیث لکھنے کی صریح اجازت ہے۔ مثلاً جامع بیان العلم، تفسیر العلم اور المحدث الفاصل میں حضور انور کا یہ ارشاد۔ کہ

قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ

علم کو کتاب سے مقید کرو

یا تدریب الراوی میں یہ واقعہ کہ

عن رافع بن خدیج انه قال قلت يا رسول الله انا اسمع

منك اشياء اُفككتبها قال اكتبوا ولا حرج علیہ

رافع کہتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ سے کچھ سنتے رہتے

ہیں کیا ہمیں لکھنے کی اجازت ہے فرمایا لکھو کوئی مضائقہ نہیں ہے

علامہ احمد محمد شاہ کراچی کہنا بالکل درست ہے کہ

اگر حدیث ابی سعید ان احادیث کے بعد میں ہوتی تو تمام صحابہ کو

پتہ ہوتا۔ پوری امت کا اس پر مجتمع ہونا اس بات کی نشانی ہے

کہ فیصلہ یہی ہے اور اجماع تو اثرِ عمل سے ثابت ہے۔

اور پھر جہاں تک حدیث کے بیان کرنے کی اجازت کا تعلق ہے۔ وہ اس میں صاف اور

صریح موجود ہے کہ حدثوا عني مجھ سے حدیثیں بیان کیا کرو۔ ممانعت تو دراصل قرآن کے

سو کسی دوسری چیز کے لکھنے کی اس بنا پر کی گئی تھی کہ قرآن سے باہر کسی دوسری وحی میں نہ اعجاز ہے اور نہ شانِ تعبد۔ ورنہ نفسِ حدیث بیان کرنے کی اجازت تو خود ابو سعید خدری کی یہ حدیث بھی دے رہی ہے اور کتابت ہی کے متعلق دوسری احادیث میں صاف اجازت آتی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے:

ایک انصاری صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں بیٹھتے آپ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے مگر یاد نہ رہتیں۔ بالآخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت آنحضرت سے کی کہ یا رسول اللہ! میں آپ سے حدیثیں سنتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہیں مگر میں انہیں یاد نہیں کر سکتا اس پر آپ نے فرمایا کہ اپنے دانتیں ہاتھ سے مدد لو اور اپنے دست مبارک سے ان کو لکھنے کا اشارہ فرمایا۔

سنن ابی داؤد اور مسند دارمی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ

لہ جامع ترمذی باب ما جاء فی الرخصة فی کتابہ العلم

۱۔ سلیمان بن الاشعث بن اسحاق بن بشیر نام، ابو داؤد و کنیت، عرب کے مشہور قبیلہ ازد سے نسب تعلق کی وجہ سے ازدی اور سجستان میں بودوباش کی وجہ سے سجستانی ہیں۔ سجستان دراصل مشہور مقام سیستان کی تعریف ہے۔ تاریخ ولادت ۲۳ھ ہے۔ امام احمد، شعبی، ابوالولید طلیس، مسلم بن ابراہیم اور یحییٰ بن معین کے شاگرد ہیں۔ علامہ شیخ ابوالاسحاق الشیرازی نے طبقات میں ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان پر فقہی ذوق بہ نسبت دوسرے محدثین کے زیادہ غالب تھا۔ اسی لیے ان کی کتاب میں صرف احادیث احکام ہیں اور فقہی احادیث کا جتنا وغیرہ اس کتاب میں موجود ہے صحیح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر بن زبیر غزالی المتوفی ۳۵۷ھ رقمطراز ہیں۔ احادیث فقہ کی حصہ استیعاب میں جو بات ابو داؤد کو حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین صحیح کو نہیں۔ ان کی وفات جمعہ کے دن ۶ ایشوال المحرم ۲۵۵ھ میں بصرہ ۳۳ سال ہوئی اور بصرہ میں دفن ہوئے۔

۲۔ عبداللہ بن عبد الرحمن نام، ابو محمد کنیت، عرب کے قبیلہ دارم سے نسب لگاؤ کی وجہ سے دارمی، سمرقند میں رہائش کی وجہ سے سمرقندی ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۳۱ھ ہے۔ یزید بن ہارون (جو کہ امام اعظم کے شاگرد ہیں) جعفر بن عون وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ امام مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور محمد بن یحییٰ زینی نے ان کے سامنے زائوئے ادب طے کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ خراسان میں چار شخص حفاظِ حدیث ہیں۔ ابو زرعة، محمد بن اسماعیل بخاری، دارمی، حسن بن شجاع، یحییٰ، عوف و آلے دن جمعرات کو بمقام مرو ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے لیے اس کو لکھ لیتا تھا۔ پھر قریش نے مجھ کو منع کیا اور کہنے لگے کہ تم جو بات سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر میں غصہ میں بھی کلام فرماتے ہیں اور خوشی میں بھی یہ سن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اور آنحضرت سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے اپنی انگشت سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمانے لگے کہ تم لکھو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس سے بجز حق کے کچھ نہیں نکلتا۔

یہ احادیث بتا رہی ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں آمدہ ممانعت خاص تھی اور خصوصیت یہی تھی کہ الفاظ کا تعبیر تلاوت کی حیثیت میں قرآن سے باہر کسی چیز میں نہیں ہے اور قرآن و حدیث دونوں کی یہ حیثیتیں آج بھی قائم ہیں۔ اس لیے روایت ابی سعید ان روایات سے معارض نہیں جن میں کتابت کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کا حکم ہے۔

اگرچہ علماء نے یہ فرض کر کے کہ ابوسعید کی روایت معارض ہے اس کے علاوہ اور بھی جوابات دیے ہیں مثلاً :

اول : یہ کہ حدیث ابی سعید موقوف ہے۔

دوم : یہ کہ ممانعت خاص اس شخص کے لیے تھی جس کے حافظہ پر پورا اعتماد تھا۔

سوم : یہ کہ ابوسعید کی حدیث منسوخ ہے۔

علامہ احمد محمد شاہ کا اصرار ہے کہ آخری جواب درست ہے اور دوسرے علماء نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے۔ علامہ امیر میانی فرماتے ہیں :

آغاز میں ممانعت اختلاط کے اندیشے کے پیش نظر تھی۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں قرآن نے ابھی گھر نہیں کیا تھا اور حفاظ خال خال تھے جب قرآن سے رائے عامہ میں بستنگی پیدا ہو گئی اور قرآن کے اسلوب، کمال بلاغت اور حسن نظم سے تعلق پیدا ہو کر ایسا امتیازی ملک پیدا ہو گیا کہ قرآن اور غیر قرآن میں امتیاز کرنے لگے اور التباس کا

اندیشہ جاتا رہا تو ممانعت ختم ہو گئی یہ

لیکن حدیث ابنی سعید کا جو محمل ہم نے بنایا ہے اس کو مانتے ہوئے تعارض کا سوال ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اس سے کراہت کتابت پر استدلال کیا ہے یہ ان کی رائے ہے۔ ارشاد نبوت کا یہ مصداق نہیں ہے۔ اس کی تائید ان واقعات سے بھی ہوتی ہے جو خود کتابت حدیث کے سلسلے میں ایک سے زیادہ زمانہ نبوت میں پیش آئے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پورے دین کی حفاظت کے لیے وہی آسان طریقہ اختیار کیا گیا جو اس دور میں اہل عرب کا فطری اور رائج الوقت طریق تھا۔ قرآن حکیم جو دین کی تمام بنیادی اور اساسی تعلیمات پر مشتمل اور جملہ عقائد و احکام کے متعلق کلی ہدایات کا علمبردار ہے۔ اس کا لفظ لفظ لوگوں نے نوک زبان کیا۔ مزید احتیاط کے لیے خود حضور اقدس نے معتبر کتابوں سے اس کو لکھوایا، حدیث جو شریعت اسلامی کی تمام اعتقادی اور عملی تفصیلات کا نام ہے۔ اس کا قولی حصہ صحابہ نے اپنی عادت کے موافق اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا کہ جس اہتمام کے ساتھ وہ اس سے پہلے اپنے خطیبوں کے خطبے، شاعروں کے قصیدے اور حکماء کے مقولے یاد رکھا کرتے تھے اور اس کے عملی حصے پر فوراً عمل درآمد شروع کر دیا گیا، ظاہر ہے کہ اس وقت میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد کو جب قرآن حکیم کا کافی حصہ نازل ہو چکا اور عموماً آبادی قرآنی ذوق سے آشنا ہو گئی۔ اودھر غزوہ بدر کے بعد مدینے میں بہت سے لوگوں نے لکھنا سیکھ لیا تو پھر حدیث کے لکھنے کا سلسلہ بھی جیسے جیسے زمانہ نبوت ہی میں شروع ہو گیا جہاں تک ان واقعات کی تفصیل کا تعلق ہے۔ یہ ایک بڑی طویل طویل داستان ہے۔ ہم یہاں اشارات کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ارشادات نبوت کے لکھنے کا مسئلہ خود زمانہ نبوت ہی میں طے ہو گیا تھا۔

دور نبوت میں حدیث کا کتابی ذخیرہ

اسی کے نتیجے میں حدیث کی کتابت کے کام کا آغاز دور نبوت ہی میں ہو چکا تھا۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و سنن کے ساتھ دیوانی اور فوجداری ضوابط

لکھا کر لوگوں کو دیے اور احکام و سنن کی یہ کتابیں حضور کی جانب سے باہر کے لوگوں کے لیے اسلام شناسی کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر جامع بیان العلم میں رقمطراز ہیں۔

کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقات والذیات والفراتق والسنن یہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات، خون بہا، فرائض اور سنن پر مشتمل دستاویز لکھی۔

احکام کی یہ تحریری دستاویزیں سرکار نبوت کی جانب سے مایہ ناز سے باہر جانے والے گورنروں کو باقاعدہ ملتی تھیں۔

عمر بن حزم صحابی کی تالیف

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشہور صحابی عمر بن حزم کو سب ان کا مکتب بنا کر روانہ فرمایا۔

استعملہ النبی صلعم علی بنجران اور استیعاب میں ہے کہ وذا لک سنة عشر یہ واقعہ شام کا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی روانگی کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک دستاویز کتابی شکل میں قلم بند کرا کے دی۔ اس دستاویز میں دیوانی اور فوجداری ضوابط کے ساتھ فرائض و سنن کی بھی تفصیل تھی۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں۔

ابو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر نام، ابو عمر کنیت اور قرطبہ داندس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قرطبی ہیں۔ ماہ ربیع الاول ۳۶۸ھ تاریخ ولادت ہے۔ اپنے وطن ہی میں اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ بہترین تصانیف ان کا علمی کارنامہ ہیں خصوصاً التہبید کے بارے میں حافظ ابو حزم کا فیصلہ ہے کہ فقہ حدیث میں میرے علم میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ الاستذکار لمذاہب، علم الامصار، الاستیعاب لاسمار الصحابة، ان کے علاوہ اور بے شمار کتابیں ہیں۔ امام مالک امام شافعی اور امام اعظم کے فضائل و مناقب پر بھی الامتعا کے نام سے کتاب لکھی ہے جمعہ کے دن ربیع الثانی ۴۶۳ھ کو شہر شاطبہ میں وفات پائی۔

۱۔ البوداد باب کتابہ العلم، مسند دارمی ص ۶۷، جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۱
۲۔ اصابع ج ۴ ص ۲۹۳ ۳۔ الاستیعاب ج ۲ ص ۴۳۷

و کتب لہ کتابا فیہ الفرائض والسنن والصدقات والذیات^۱
 آپ نے ان کے لیے فرائض، سنن اور صدقات و ذیات پر مشتمل
 کتاب لکھی۔

حافظ عسقلانی نے تو نہیں مگر حافظ ابن عبد البر نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ عمر بن حزم کو صرف
 عامل یعنی کمشنر اور انتظامی سربراہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کو لیف قہمہم فی الدین و
 یعلم القرآن۔ معلم قرآن و فقہ بنا کر بھی روانہ فرمایا۔^۲ یعنی یہ کمشنر ہونے کے ساتھ دین کے
 مفتی اور قرآن کے معلم بھی تھے۔ اور تعلیم و اقتدا ہی کے لیے اس دستاویز میں الفرائض،
 السنن قلم بند کیے گئے تھے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ یہ کتاب چمڑے میں تحریر تھی۔ اور
 عمرو بن حزم کے پوتے ابوبکر بن حزم کے پاس موجود تھی۔ ابوبکر خود یہ کتاب میرے پاس
 لے کر آئے تھے اور میں نے اس کو پڑھا ہے۔^۳

عمرو بن حزم نے اس قیمتی دستاویز کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اکیس دیگر فرامین نبوی بھی
 فراہم کیے اور ان سب کی ایک کتاب تالیف کی جو زمانہ نبوت کی سیاسی دستاویزوں اور برکاری
 پروانوں کا اولین مجموعہ ہے۔

اس کی روایت مشہور محدث ابوجعفر الدیلمی نے کی ہے۔ چنانچہ اعلام السالکین عن کتب
 سید المرسلین کے نام سے ابن طولون نے جو کتاب لکھی ہے اور جو زیور طباعت سے آراستہ
 ہو چکی ہے۔ اس میں حضرت عمرو بن حزم کی یہ تالیف بطور ضمیمہ شامل اور محفوظ کر دی گئی ہے
 آپ آئندہ پڑھیں گے کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے ان ہی عمرو بن حزم کے پوتے
 قاضی ابوبکر کو تدوین حدیث کے کام پر مامور کیا تھا۔ نیز امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ
 ہونے کے بعد جب صدقات کے بارے میں نبوی دستاویز کی تلاش ہوئی تو یہی دستاویز
 امیر عمر کو عمرو بن حزم کی اولاد کے پاس ملی تھی۔ چنانچہ حافظ دارقطنی فرماتے ہیں۔

ان عمر بن عبدالعزیز حین استخلف ارسل الی المدینۃ
 یتلمس عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصدقات

فوجدہ عند آل عمرو بن حزم کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی
عمرو بن حزم فی الصدقات ۱۷

عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ بننے کے بعد مدینہ اس مقصد کے لیے قاصد
روانہ کیا کہ صدقات کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی
دستاویز تلاش کرے۔ یہ دستاویز عمرو بن حزم کی اولاد کے پاس ملی۔

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مالیاتی اور فوجداری حصہ کو ابو داؤد، نسائی ابن
حبان اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ امام زہری نے اسی کو قاضی ابوبکر بن حزم سے روایت
کیا ہے۔ چنانچہ امام ابو داؤد نے اپنے مراسیل میں اسے درج کیا ہے۔ حافظ جمال الدین زیلعی نے
مراسیل ابی داؤد کے حوالے سے یہ دستاویز نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

نسخة کتاب عمرو بن حزم تلقاها الائمة الاربعة بالقبول
وہی متوارثہ ۱۸

عمرو بن حزم کی کتاب کو چاروں اماموں نے قبول کیا ہے۔ اور یہ
متوارث ہے۔

بلکہ صاحب الروض الباسم نے بتایا ہے کہ حافظ ابن کثیر نے ارشاد میں اس کے سارے طرق
پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ کتاب ائمہ اسلام میں زمانہ جدید و قدیم دونوں میں برقی جاتی
رہی ہے اور اس پر لوگوں کا اعتماد رہا ہے۔

فہذا الكتاب متداول بين ائمة الاسلام قديماً وحديثاً
يعتمدون عليه ۱۹

اور حافظ یعقوب بن سفیان یہاں تک فرما گئے۔ میرے علم میں عمرو بن حزم کی کتاب
سے زیادہ کوئی کتاب صحیح نہیں ہے صحابہ اور تابعین کا بھی یہ کتاب مسائل میں مرجع تھی۔

كان الصحابة والتابعون يرجعون اليه ويدعون
آراءهم ۲۰

۱۷ دارقطنی ص ۲۱۰ ۱۸ نصب الراویہ للمحافظ الزیلعی ج ۲ ص ۳۴۲

۱۹ الروض الباسم ج ۱ ص ۲۴ ۲۰ ۱۸۷

حافظ محمد بن ابراہیم وزیر لکھتے ہیں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ عمرو بن حزم کی کتاب کی مقبولیت پر صدر اول کا اجماع تھا۔

اجماع الصدر الاول علی قبول حدیث عمرو بن حزم علیہ
احادیث کی کتابوں میں اس کتاب کی جستہ جستہ حدیثیں منقول ہیں اور امام بیہقی فرماتے ہیں
کہ حفاظ حدیث میں سے سلیمان بن داؤد الخولانی، امام احمد، ابو حاتم، ابو زرعہ، دارمی اور ابن عدی
نے اسے خراج تحسین ادا کیا ہے بلکہ
اور تنقیح الانظار میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے لکھا ہے :

اسی حدیث کو مسنداً بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور مسلاً بھی مسنداً جن
ائمہ حدیث نے اس کو روایت کیا ہے وہ یہ ہیں۔ امام نسائی نے سنن
میں امام احمد نے مسند میں، امام ابو داؤد نے مراسل میں، امام دارمی
امام یعقوب بن سفیان، امام ابویعلیٰ موصلی نے اپنے اپنے مسند میں
نیز حسن بن سفیان، عثمان بن سعید، عبداللہ بن عبدالعزیز بغوی
نے ابو زرعہ دمشقی، احمد بن الحسن ابن عبد الجبار صوفی، حامد بن
شعیب، حافظ طبرانی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت
کیا ہے۔ امام بیہقی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث موصول الاسناد ہے۔
اور اس حدیث کو جن لوگوں نے مسلاً روایت کیا ہے وہ
ایک سے زیادہ ہیں علیہ

کتاب الصدقہ

اس تحریری دستاویز کے علاوہ دوسرا تحریری سرمایہ بھی خود نبوت ہی کا سانحہ و پرداختہ
صحابہ کے پاس موجود تھا۔ ابو داؤد اور ترمذی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ
تحریر فرمائی۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اس پر عمل کیا اور حضرت صدیق اکبر کے بعد حضرت فاروق اعظم

کا بھی اسی پر عمل رہا۔ امام ابو داؤد اور امام ترمذی نے اس نوشتہ کی حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔ اور امام ترمذی تو یہاں تک لکھ گئے۔

والعمل علیٰ هذا الحدیث عند عامة اهل العلم حضرت عمر کے بعد یہ دستاویز آپ کے خاندان میں رہی۔ امام زہری کہتے ہیں کہ مجھے خود فاروق اعظم کے پوتے حضرت سالم نے یہ تحریر دکھائی ہے میں نے اسے پڑھا ہے اور اسے حرف بحرف زبانی یاد کیا ہے قال ابن شہاب اقرا نسیہا سالم بن عبد اللہ فو عیتہا علی وجہہا۔ اس کتاب کی بھی حضرت عمر بن عبد العزیز نے مدینہ میں گورنری کے زمانے میں حضرت سالم سے نقل لی تھی اور زمانہ خلافت میں اسے اپنی قلمرو میں نافذ کیا تھا۔

واضح رہے کہ حضرت سالم کو بھی عمر بن عبد العزیز نے تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا تھا۔ حافظ جمال الدین زبلی نے نصب الراية فی تخریج احادیث الہدایہ میں یہ پوری دستاویز نقل کی ہے۔ بہر حال حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا تحریری سرمایہ خود نبوت ہی نے اپنے زمانے میں لوگوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگرچہ محسوس و مرقی اسوۂ حسنہ کی موجودگی میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسی بنا پر جو دستاویزیں باہر روانہ نہیں کی گئیں۔ ان میں صرف صدقات جیسی چیز پیش پا افتادہ ضرورت کے لیے قید تحریر میں لائی گئی۔ باقی اسلام کے

اے محمد بن عیسیٰ بن سورہ نام، ابو عیسیٰ کنیت، عرب کے قبیلہ سلیم سے نسبی لگاؤ کی وجہ سے سلمیٰ اور ترمذ میں بوداؤش کی وجہ سے ترمذی ہیں۔ سنن ترمذی، کتاب العلل اور شمائل نبوی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ حدیث کے مشہور اساتذہ کے سلسلے زانوے ادب طے کیا ہے۔ امام بخاری ان کے اساتذہ میں سے ہیں۔ حاکم نے عمر بن عبدک کے حوالے سے بتایا ہے کہ امام بخاری کی وفات کے بعد خراسان میں امام بخاری کا جانشین زہد و تقویٰ اور علم و حفظ میں ابو عیسیٰ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ روتے روتے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئے۔ اگرچہ امام ترمذی امام بخاری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں مگر ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ خود استاد نے ان سے حدیث کا سماع کیا ہے بعض مواقع پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں امام بخاری اور مسلم سے اختلاف کیا ہے۔ تاریخ ولادت ۳۰۰ھ اور وفات ۳۲۰ھ رجب ۲۴۹ھ بمقام ترمذ ہوئی۔

۱۷ دارقطنی ص ۲۰۹ ۱۸ دارقطنی ص ۲۰۹ ۱۹ تاریخ الخلفاء

۲۰ نصب الراية ج ۲ ص ۳۳۸

یہ خود اسوۂ حسنہ موجود تھا۔ لیکن جب مدینہ سے جانے والوں کے لیے دستاویزیں لکھی گئیں تو اس میں صرف صدقات نہیں بلکہ الذیات الفرائض اور اسنان تک قلم بند کیے گئے۔ یہ چند نوشتوں کا حال ہے۔ ورنہ ان کے علاوہ مختلف قبائل کو تحریریں ہدایات، خطوط کے جوابات، سلاطین وقت کے نام دعوت نامے، معاہدات اور صلح نامے۔ اس قسم کا بہت سا تحریریں سرمایہ حضور انور نے چھوڑا ہے۔ علمائے اس موضوع پر کتا ہیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً کتاب الاموال الامام ابو عبیدہ انعام بن سلام المتوفی ۳۲ھ اعدام الساکین حافظ ابن طولون المتوفی ۵۲۳ھ اور الوثائق السیاسیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صحابہ کرام اور کتابت حدیث

حضور ہی کے زمانے میں حضور انور کی اجازت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مجموعے صحابہ کرام نے مرتب کیے۔ مثلاً

صحیفہ صادقہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حضور انور کی اجازت سے آپ کے ارشادات لکھنے شروع کیے۔ کیوں لکھتے تھے؟ خود فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے ارادے سے قلم بند کر لیتا تھا۔ یہی لکھی ہوتی دستاویز ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب ہو گئی تھی۔ اس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا۔ فرماتے تھے۔ مجھے زندگی میں دو چیزیں مرغوب ہیں ربط اور صادقہ۔ ربط وہ بارغ جو ان کے والد نے وقف کیا تھا اور یہ اس کے متولی تھے۔ اور صادقہ کے متعلق فرماتے ہیں یہ

اما الصادقة فصحيفة كتبتها عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

صادقہ یعنی وہ صحیفہ جو میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھا ہے

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہی صحیفہ ان کی وفات پر ان کے پڑپوتے عمرو بن شیبہ بن محمد بن عبداللہ کو ملا تھا یہ حدیث کی کتابوں میں اس نام سے روایات کا جس قدر ذخیرہ ملتا ہے۔ وہ

لے جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۲ لے جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۲ لے تہذیب ترجمہ عمرو بن شیبہ

اسی صحیفہ کا سرمایہ ہے۔ حافظ زبیری نے اسے بھی عمرو بن حزم کی کتاب کی طرح متواتر قرار دیا ہے۔ امام ترمذی ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں اما اکثر اهل الحديث يحتجون بحديث عمرو بن شعيب و يشتمونه یعنی محدثین کی اکثریت عمرو بن شعیب کی احادیث کو صحیح اور قابل استدلال سمجھتی ہے عبد اللہ کے پڑپوتے یعنی عمرو بن شعیب کی ثقاہت میں کسی کو کوئی کلام نہیں اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ یہ صحیفہ حضرت عبد اللہ ہی کا نوشتہ ہے لیکن چونکہ ان کے والد کا انتقال اپنے والد کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ اس لیے محدثین کا اس میں اختلاف ہے کہ شعیب نے دادا سے پڑھا ہے کہ نہیں؟ اگر پڑھا ہے تو سماع متصل ہے۔ اگر نہیں پڑھا تو سماع مرسل ہے حافظ عسقلانی سید الحفاظ یحییٰ بن معین سے ناقل ہیں۔

وجد شعيب كتب عبد الله فكان يرويه عن جده مرسلًا

و هي صحاح عن عبد الله بن عمرو وغيره انه لم يسمعها

شعيب نے عبد اللہ کی کتابیں پائی ہیں اس لیے ان کتابوں کے ذریعے

اپنے دادا سے ان کی روایات مرسل ہیں۔

یہ تو ایک محدثانہ عرف ہے ورنہ آج بھی ہم حدیثیں جن کتابوں سے نقل کرتے ہیں تو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوچتے کہ خود بیان کرنے والے کا کتاب کے مؤلف سے اسنادی رشتہ متصل ہے یا نہیں۔

در اصل محدثین کے یہاں بہ نسبت کتابوں کے حافظہ پر زیادہ اعتماد کا اسی طرح رواج تھا۔ جیسے ہمارے عرف میں حافظ کے مقابلے میں کتابوں پر اعتماد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس دور میں کتابت گویا اہل علم میں ایک بہت بڑی کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ اور ان کا یہ طرز عمل صرف اسنادی رشتہ کو متصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ لیکن آج کی دنیا میں بہ نسبت راوی کے خود مؤلف کی ذات پر اعتماد ہے۔ اس لیے اس نظریہ کا مقام محدثانہ اصطلاح سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ نسخہ حضرت شعیب کو اپنے دادا سے وراثت میں ملا ہے خواہ شعیب نے دادا سے پڑھایا نہیں۔ اور کتب حدیث میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جده سے جس قدر احادیث کا ذخیرہ ہے وہ سب اسی صحیفہ علمی کا سرمایہ ہے۔ ان کی مرویات کی تعداد سا سو

ہے۔ مسند امام احمد میں ان کی حدیثیں ۱۳۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

صحیفہ علی مرتضیٰ

یہ صحیفہ چمڑے کے ایک تھیلے میں تھا جس میں یہ صحیفہ نیام سمیت سما جاتا تھا اس کے متعلق خود حضرت علی کا بیان ہے مَا كُنْتُ نَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا الْقُرْآنَ وَمَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ یعنی ہم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن اور اس صحیفہ کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ یہ وہی صحیفہ ہے جس کے متعلق صحیح بخاری میں حضرت علی کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ

لے موصوف کی حدیث میں اس اسنادی سلسلے کے ساتھ جوہ عن ابیہ عن جبرہ کے لاتے ہیں علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ اس ذبیعے سے آئی ہوئی موصوف کی روایات میں حجت و استدلال کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت حسب تصریح امام ترمذی اسے حجت سمجھتی ہے مگر کچھ کی لائے میں ان کی یہ روایات قابل حجت نہیں ہیں۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہے کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جبرہ میں جبرہ کی ضمیر کا مرجع کون ہے اگر ضمیر کا مرجع خود عمرو کی ذات ہے تو اس صورت میں عمرو کے دادا محمد بن عبد اللہ ہیں اور حاصل یہ ہے کہ روایت عمرو کے اپنے والد شعیب سے سنی ہے اور شعیب نے عمرو کے دادا محمد بن عبد اللہ سے سنی ہے اور معلوم ہے کہ شعیب کے دادا صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں اس لیے اصطلاح محدثین میں یہ حدیث مرسل ہے اور اگر جبرہ کی ضمیر کا مرجع عمرو نہیں بلکہ شعیب ہے تو مطلب یہ ہے کہ عمرو نے روایت اپنے والد شعیب سے سنی اور شعیب نے اپنے دادا عبد اللہ بن عمرو صحابی سے سنی ہے تو اس صورت میں یہ حدیث مرفوع متصل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع جن کے خیال میں شعیب ہے ان کی لائے میں عمرو کی روایات قابل حجت ہیں کیونکہ شعیب کی ملاقات عبد اللہ بن عمرو کے ثابت ہے اور جو لوگ جبرہ کی ضمیر کا مرجع عمرو بتاتے ہیں ان کے خیال میں یہ روایات تاریخی طور پر صحیح نہیں ہیں اسی بنا پر حافظ دارقطنی نے تصریح کی ہے کہ جن اسانید میں دادا کے نام کی تصریح آجائے وہ بے غبار ہیں اور تصریح نہ ہو تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے استدلال نہ کیا جائے کچھ ہو یہ سلسلہ سند محمد بن یحییٰ کے یہاں اصح الاسانید ہے امام بخاری فرماتے ہیں کہ امام احمد امام علی ابن المدینی امام اسحاق بن راہویہ امام ابو عبیدہ اور سہاسے عام اصحاب کی لائے میں یہ سلسلہ سند قابل حجت ہے۔ اُمت میں سے کسی نے اسے رد نہیں کیا ہے۔ امام بخاری پوچھتے ہیں کہ ان ائمہ کے بعد اور کون ہے؟ بلکہ امام اسحاق نے تو اس سلسلہ سند کو ابوب عن نافع عن ابن عمر سے تشبیہ فرمائی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ اس سلسلہ سند کی جلال و قدر کو آشکارا کرتی ہے اور یہ بھی لکھا ہے ان الاحتجاج بہ هو الصحیح المختار الذی علیہ المحققون من اهل الحديث وهم اهل هذا الفن وعنه يؤخذ لے صحیح بخاری

سے منقول ہے کہ مجھے میرے والد نے بھیجا اور کہا کہ یہ کتاب لو اور حضرت عثمان بن عفان کے پاس لے جاؤ اس میں صدقہ کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں۔ نیز اس کتاب میں زکوٰۃ کے علاوہ خون بہا، قیدیوں کی رہائی، قصاص، حرمِ مدینہ کے حاد، وغیرہ کی طرف نسبت کا حکم، نقص عہد، غیر اللہ کے نام پر فحش و غیرہ مسائل و احکام درج تھے۔

صحیفہ صدیقی

حضرت صدیق اکبر نے جب حضرت انس کو بحرین کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا تو حکومت کے واجبات کے بارے میں ایک یادداشت ان کو لکھ کر دی۔ اس دستاویز کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔
بسم اللہ الرحمن الرحیم ہذا خزانة الصدقة التي فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المسلمین والتي امر اللہ بھا علیہ امام بخاریؒ نے اس نوشتہ کی روایات کو کتاب الزکوٰۃ کے تین

۱۔ صحیح بخاری ۲۔ جامع بیان العلم ۳۔ اسلئے کہ کفیت ابو عبد اللہ نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن میسر بن بزرہ ہے چونکہ بزرہ کے صاحبزادے یحییٰ بن جعفر کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے، اس لیے ان کو نسبت ولادہ کی وجہ سے جعفری کہتے ہیں۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ امام بخاری کے دادا ابراہیم بن میسر کے حالات کا تاثر یہ ہے ہمیں کوئی پتہ نہیں چلا لیکن امام بخاری کے والد محترم امام مالک امام حماد بن زید کے شاگرد اور عبد اللہ بن مبارک کے صحبت یافتہ ہیں۔ اسماعیل اور امام ابو حفص کبیر خفگی کے درمیان بہت مخلصانہ محبت تھی۔ اسماعیل کی وفات کے وقت امام ابو حفص کبیر موجود تھے۔ اس وقت ان سے اسماعیل نے کہا تھا کہ میں اپنے مال میں ایک درہم بھی حرام یا شبہ کا نہیں پاتا، مقدمہ ص ۴۸، یہ تعلقات اسماعیل کی وفات کے بعد بھی دونوں خاندانوں میں برابر استوار رہے۔ چنانچہ امام بخاری اور امام ابو حفص کبیر کے صاحبزادے ابو حفص صغیر مدت تک طلبِ حدیث میں رفیق اور ہم سفر رہے ہیں۔ ایک بار امام ابو حفص کبیر نے امام بخاری کو اس قدر مال تجارت دیا تھا جس کو کچھ تاجر دوں نے پانچ ہزار کے نفع سے خریدا اور کچھ اس سے زائد نفع دے کر خریدنے کو آمادہ تھے لیکن امام بخاری نے اپنے ارادے کو بدلنا پسند نہ کیا، مقدمہ فتح، حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابو حفص کبیر کو (جو امام ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد ہیں) امام بخاری کے ساتھ میں شمار کیا ہے اور ان کے حق میں ابو حفص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اس کا شہرہ ہوگا“ امام بخاری جمعہ کے دن ۳۱ شوال ۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے خود فرماتے ہیں کہ گیارہ سال کی عمر میں میں نے امام اعظم کے دونوں شاگردوں امام وکیع اور امام عبد اللہ بن المبارک کی کتابیں لوگوں بان (بقیہ حاشیہ ص ۹۶ پر)

مختلف ابواب میں درج کیا ہے اور امام ابو داؤد نے اس صحیفہ کو حدیث کے مشہور امام حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے جس میں حماد خود تصریح کرتے ہیں کہ میں نے خود تمامہ سے اس نوشتہ کو حاصل کیا ہے۔ امام حاکم نے یہ دستاویز نقل کی ہے بلکہ حافظ ابو جعفر طحاوی نے بھی یہ دستاویز بحوالہ حماد بن سلمہ بتائی ہے مگر اس میں حماد بن سلمہ کی یہ تصریح بھی ہے کہ مجھے ثابت البتانی نے یہ دستاویز لینے تمامہ بن عبد اللہ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے مجھے یہ دستاویز دی۔ میں نے دیکھا ہے کہ فاذا علیہ خاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تھی۔

صحیفہ جابر

حافظ ذہبی نے تذکرے میں حضرت قتادہ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ

دست کا بقیہ جاثیہ، ہیکر لی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ صاحب تصنیف ہو چکے تھے۔ آپ کی تصانیف اگرچہ کافی ہیں لیکن ان میں مسند الجامع، صحیح المختصر من اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنتہ و ایامہ و صحیح بخاری کے نام سے مشہور ہے سب سے زیادہ معمر کی کتاب ہے یہ صرف حدیث ہی کی نہیں بلکہ علوم و اول کا خلاصہ ہے۔ تاریخ وفات یکم شوال ۲۵۶ھ ہے۔

۲۔ امام ذہبی نے ان کا تذکرہ الامام الحافظ شیخ الاسلام کے پر شوکت القاب سے کیا ہے۔ کنیت ابو سلمہ اور نام حماد بن سلمہ، بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المفنیہ میں، حافظ بزاز نے مناقب میں ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ شہاب بن تعمیر کہتے ہیں کہ امام حماد کو ابدال میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے کہ اسلام میں سعید بن عربی کے ساتھ پہلے مصنف ہیں۔ امام عبد الرحمن بن مہدی نے ان کی بار ساف کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے اگر حماد سے کہا جائے کہ تم کو کل مرنا ہے تو یہ عمل میں اضافہ نہیں کر سکتے یعنی پہلے سے ہی اس قدر ہمہ گیری ہے۔ عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ عابد تو دیکھے لیکن ان سے زیادہ خیر، قرأت قرآن اور عمل لوجہ اللہ پر میں نے مواظب کوئی نہیں دیکھا۔ دس ذی الحجہ بعد نماز عید ۱۶۷ھ میں وفات پائی۔

۳۔ ابو داؤد ص ۲۲۵ کے مستدرک حاکم ج ۱ ص ۳۹۰ کے مخرج معانی الآثار ص ۱۶

۴۔ کنیت ابو عبد اللہ نام محمد بن احمد بن عثمان الترمذی الدمشقی الذہبی ہے۔ علامہ تاج الدین ابسکی نے محدث العصر خاتم الحفاظ امام العصر لکھا ہے۔ فقہ، حدیث، تاریخ، تجوید، رجال میں بے مثال تھے۔ ان گنت (باقی صفحہ ۹۸ پر)

بصرہ میں سب سے زیادہ حافظ تھے۔ ان کے سامنے حضرت جابر کا صحیفہ پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا۔ قرات علیہ صحیفۃ جابر مرقۃ لحفظہا حضرت جابر کا صحیفہ ایک بار پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا۔ حافظ عسقلانی نے طلحہ بن نافع کے ترجمہ میں سفیان بن عیینہ اور امام شعبہ دونوں کا بیان لکھا ہے کہ حدیث ابی سفیان عن جابر انما ہی صحیفۃ ابی سفیان جو حضرت جابر کی حدیثیں بیان کرتے ہیں وہ صحیفۃ جابر ہی سے نقل کرتے ہیں۔

صحیفہ سمرہؓ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام حسن بصری کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت سمرہ بن جندب سے ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا ہے جس کی بیشتر حدیثیں سنن اربعہ میں موجود ہیں امام علی بن المدینی اور امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ اس نسخہ کی سب حدیثیں اسی کی ہیں۔ اسی نسخہ کو امام حسن بصری کے علاوہ خود حضرت سمرہ کے صاحبزادے سلیمان نے بھی ان سے روایت کیا ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں سلیمان روی عن ابیہ نسخۃ کبیرۃ یہ

ص ۱۱۹ کا بقیہ حاشیہ)۔ کتابوں کے مصنف ہیں امام اعظم کی سیرت پر مستقل رسالہ لکھا ہے تذکرۃ الحفاظ میں ایک مقام پر علم الحدیث اور طلب الحدیث پر ایک بڑا مفید نوٹ لکھا ہے۔ ۳۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور تاریخ وفات ۳۷۷ھ ہے۔

لے تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۹ لے تہذیب ترجمہ طلحہ بن نافع

۳۷۷ھ الحسن بن ابی الحسن نام ابو سعید کنیت۔ مدینہ میں نشوونما پائی۔ شہادت عثمان کے وقت چودہ سال عمر تھی۔ حضرت عثمان غنی، عمران بن حصیل، میسرہ بن شعبہ اور ان کے علاوہ چند در چند صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ مرسل حدیثیں پیش فرماتے یعنی تابعی ہونے کے باوجود ارشاد کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے۔ اپنے اور حضور کے درمیان واسطہ کا ذکر نہ کرتے جیسا کہ عموماً سعید بن المسیب، کحول دمشقی، ابراہیم نخعی اور دیگر اکابر تابعین کا معمول تھا۔ امام محمد بن جریر فرماتے ہیں :

ان الناس باسرها علی قبول المرسل تابعین سارے کے سارے مرسل کے قبول کرنے پر متفق تھے۔ امام علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ امام حسن بصری کے مراسلات صحیح ہیں خلاصہ ان کے متعلق امام اعظم کتاب الآثار میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام باقر سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں (ص ۲۰۹) تاریخ وفات ۳۷۷ھ

لے تہذیب ج ۲ ص ۹۳

صحیفہ مصححہ

یہ اصل میں حضرت ابو ہریرہ کی تالیف ہے۔ جو انہوں نے اپنے شاگرد ہمام بن منبہ کے لیے ترتیب دی تھی۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہ سے اس صحیفہ کے راوی ہمام ہیں۔ اس لیے صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دراصل اس کا نام صحیفہ ابی ہریرہ لہمام بن منبہ ہونا چاہیے۔ آپ پہلے سن چکے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ صحابہ میں سے اگر کسی کی حدیث دانی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے تو وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے۔ موصوف نے الصحیفۃ الصادقہ کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ شاید حضرت ابو ہریرہ نے ان ہی کی تقلید میں اپنی تالیف کا نام الصحیفۃ الصمیمۃ رکھا ہے۔ بہر حال یہ تالیف عمدہ صحابہ کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کو دمشق اور برلن میں اس کے دو قلمی نسخے ملے ہیں۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد انہوں نے پہلی صدی ہجری کی اس گراں مایہ تالیف کو شائع کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مقابلہ کرنے پر نظر آتا ہے کہ بعد کے موقوفوں نے مفہوم تو کیا کوئی لفظ تک نہیں بدلا۔ اس صحیفہ کی ہر حدیث نہ صرف صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے ملتی ہے بلکہ مسند احمد میں آج بھی پورے کا پورا رسالہ بلا حذف و اضافہ موجود ہے۔ اس سے متعلق تفصیلات کے لیے صحیفہ ہمام بن منبہ کا مقدمہ دیکھتے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہم نے زمانہ صحابہ میں حدیث کی تدوین پر ان تالیف کا تذکرہ لوگوں کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کیا ہے کہ حدیث کی تدوین ایک سو سال بعد ہوئی ہے۔ یاد رکھتے یہ بہت بڑا سنگین مغالطہ ہے۔ حدیث کے موضوع پر تالیف و تصنیف کے اس قدر سرمایہ ہونے کے۔ باوجود یہ سمجھنا تاریخ سے بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صبحی صالح نے علوم الحدیث میں تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ صحابہ کرام کے چند نوشتے ہیں جو بہت سی احادیث پر مشتمل ہیں یا جو مستقل کتاب یا صحیفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ورنہ اگر صحابہ کی ان تمام تحریروں کو یکجا کیا جاتے جس میں انہوں نے کسی حدیث کا تذکرہ کیا ہے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تدوین حدیث کے کام کا آغاز دور نبوت ہی میں ہو چکا تھا اور پھر

دور صحابہ میں بھی یہ کام ہوتا رہا تحریری بھی تقریری بھی۔ لیکن زیادہ تر توجہ تقریری طور پر کام کرنے کی طرف مبذول تھی کیونکہ — ۶ باب والوں کی تاریخ اور ان کی معاشرت میں علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کا پہلے سے یہی طریقہ رائج تھا۔ وہ اپنے تمام شجرہ ہائے نسب، اہم تاریخی واقعات، جنگی کارنامے، بڑے بڑے خطبے، لمبے لمبے قصیدے اور نظمیں سب زبانی یاد رکھتے تھے۔ قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے اپنے لیے اسی طریقے کو سراہا اور خود نبوت اور صحابہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

بَنِي هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ ذُتُوا الْعِلْمَ

بلکہ وہ آئین صاف ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم ملا ہے

یہی طریقہ ارشاد نبوت کو محفوظ رکھنے کے لیے صحابہ نے اختیار کیا اور خود ذات نبوت نے بھی ان کو ایسا ہی کرتے کو کہا تھا۔ چنانچہ وفد عبدالقیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب حاضر ہوا تو آپ نے وفد کو زبانی ہدایات سے نوازا تو یہ خصوصی ہدایت بھی فرمائی کہ

احفظوهن ان کو زبانی یاد کر لو

حدیث بیان کرنے والے صحابہ کرام

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جن صحابہ کرام کے ذریعے احادیث کا ذخیرہ امت کو ملا ہے اور تاریخ احکام یا تاریخ سنت کی معلومات کا سرمایہ جن اکابر کی وساطت سے کتابوں میں آیا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار میں سے صرف چار ہزار مرد و زن ہیں۔ چنانچہ امام حاکم لکھتے ہیں:

لہ یعنی جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پڑھا نہیں ایسے ہی دین جو وہ لے کر آئے ہیں ان کے صحابہ (جن کو اللہ کی جانب سے علم ملا ہے) کے ذریعے بن لکھے سینہ بسینہ جاری ہو گا اللہ کے فضل سے ان کے ہی سینے اس کے الفاظ و معانی کی حفاظت کریں گے الفاظ کی حفاظت کرنے والوں کو حفاظ و قرآر اور معانی کی نگرانی کرنے والوں کو فقہاء و مجتہدین کہتے ہیں صراط مستقیم یہی ہے کہ دین کے پہنچانے میں حفاظ و قرآر اور دین کے سمجھنے میں فقہاء پر اعتماد رکھے دونوں میں سے کسی ایک میں بھی خود رانی کرنا خسارے کو مول لینا ہے اور غالباً حدیث افراق میں ما انا علیہ و اصحابی سے بھی یہی تباہ مقصود ہے۔

لے الخیرات الحسان ص ۱۰

قد روی عنه صلى الله عليه وسلم من الصحابة اربعة آلاف
رجل وامرأته

صحابہ میں سے صرف چار ہزار مرد و زن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
روایات بیان کی ہیں۔

اتنی بڑی تعداد میں سے اس قلیل عدد ہی کے ذریعے علوم نبوت ہم تک پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ
صحابہ میں ہر شخص یہ کام نہ کرتا تھا بلکہ خاص خاص وہ حضرات ہی کرتے تھے جن کو اپنی قوت و حافظہ
پر پورا پورا اعتماد تھا اور یہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ روایت کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے
ازالۃ الخفا میں لکھا ہے۔

فاروق اعظم عبد اللہ بن مسعود را باجئے بکوفہ فرستاد و معتقل بن یسار و عبد اللہ
بن معتقل و عمران بن حصین را بے بصرہ و عبادہ بن الصامت و ابوالدرداء
را بشام و معاویہ بن ابی سفیان را کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت
کہ از حدیث ایشان تجاوز نکنند

فاروق اعظم نے عبد اللہ بن مسعود کو ایک جماعت دے کر کوفہ روانہ کیا۔
معتقل بن یسار، عبد اللہ بن معتقل اور عمران بن حصین کو بصرہ اور عبادہ
ابن الصامت ابوالدرداء کو شام، معاویہ ابن ابی سفیان کو جو کہ شام
کے امیر تھے پوری تاکید فرمائی کہ ان کی حدیث سے تجاوز نہ کریں۔

یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ صحابہ میں یہ کام ہر شخص نہیں کرتا تھا اور جو کرتے تھے ان میں
بے حد فرق مراتب تھا۔ اس فرق مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سب سے زیادہ احادیث
کی تعداد جن حضرات سے آتی ہے وہ صرف چار ہیں۔ مثلاً

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، ان
کے بعد اس سے کم تعداد والے تین ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، جن صحابہ کی
روایات ہزار سے زیادہ نہیں وہ صرف دس ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعرؓ، حضرت ہریر بن عازبؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابوامامہ باہلیؓ۔

وہ صحابہ جن کی روایات سو سے زیادہ ہیں وہ تعداد میں انیس ہیں
حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبادہ بن الصامتؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت ابوقحافہؓ، حضرت بکر بن عبد ربیعؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت ابویوب انصاریؓ، حضرت میسرہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت ابومسعود انصاریؓ، حضرت جریر بن عبداللہؓ، حضرت سہل بن سعدؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ثوبانؓ۔

ان کے بعد سینکڑوں سے نیچے احادیث بیان کرنے والے صرف چوراسی ہیں۔

انیس حدیثیں بیان کرنے والے صرف دو صحابی ہیں۔

اٹھارہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چھ صحابی ہیں۔

سترہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔

سولہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔

پندرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چار صحابی ہیں۔

چودہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف گیارہ صحابی ہیں۔

تیرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف سات صحابی ہیں۔

سب سے زیادہ تعداد ایک ارشاد بیان کرنے والے صحابہ کی ہے۔ اس کے بعد پھر نہیں۔ بالترتیب ہزاروں تک یہ۔

اور جن صحابہ کے ذریعے امت کو اپنے پیغمبر سے بعلم کی میراث ملی ہے۔ علمائے ان کی زندگیوں پر مفصل اور مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے قدیم کتاب اس موضوع پر اگرچہ السیوطی کے خیال میں امام بخاری کی تالیف ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قدیم کتاب اس موضوع پر طبقات ابن سعد ہے۔ صحابہ کے حالات میں اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب عرصہ

منفرد تھی اب یورپ میں چھپ گئی ہے۔ اس کے بعد دوسری کتابیں منصفہ وجود پر آتی ہیں۔ طبع شدہ کتابوں میں سب سے مبسوط حافظ ابن حجر عسقلانی کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ ہے۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس میں کل صحابہ ۱۲۷۹ کے تراجم آئے ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں تمام صحابہ کو پانچ طبقوں اور امام حاکم نے بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقات صحابہ یہ ہیں :

- ۱۔ وہ لوگ جنہوں نے مکہ میں مسلمان ہونے میں پہل کی جیسے خلفاء راشدین۔
- ۲۔ وہ لوگ جو مشرکین مکہ کے دارالندوہ میں مشاورت سے پہلے مسلمان ہوئے۔
- ۳۔ مہاجرین حبشہ

۴۔ اصحاب عقبہ اولیٰ

۵۔ اصحاب عقبہ ثانیہ

۶۔ وہ مہاجرین جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ جلتے ہوئے قبا میں ملے۔

۷۔ اصحاب بدر

۸۔ وہ صحابہ جنہوں نے بدر اور حدیبیہ کے درمیان ہجرت کی ہے۔

۹۔ اصحاب بیعت الرضوان

۱۰۔ وہ صحابہ جو حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان مہاجر ہوئے۔

۱۱۔ وہ صحابہ جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے۔

۱۲۔ وہ بچے جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح مکہ کے دن اور حجۃ الوداع میں زیارت

کی ہے۔

صحابہ کرام میں حفاظ و فقہاء

پھر صحابہ کرام میں خدمتِ دین کا کام علمی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔
کچھ تو وہ تھے جن کا کام صرف محفوظ سرمایہ کو آگے پہنچانا تھا۔ یہ احادیث روایت کرتے تھے
کچھ وہ تھے جن کا کام قرآن و حدیث کے محفوظ سرمایے سے مسائل کا استنباط اور ان میں تفسیر
اور تدبر تھا۔ اس سلسلے میں حدیث ابی موسیٰ اشعری پر حافظ ابن القیم کی تصریحات آپ پڑھ چکے ہیں۔
ان دونوں طبقوں میں باہم علمی مسائل پر اپنے اپنے فن کے لحاظ سے گفتگو بھی ہوتی اور فقہاء کی
جانب سے ان حفاظ پر فقہی اعتراض بھی ہوتے تھے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پیش کیا۔
لوگو! اس چیز سے وضو کر دیجے آگ نے بدل دیا یعنی آگ پر پچی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں تو گرم پانی سے وضو کرتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میرے بھائی! جب تم حضور انور کا ارشاد گرامی سنو تو اس کے لیے مثالیں نہ تراشو۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے کہ ابو حسان الاعرج کہتے ہیں کہ دو شخص حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس آئے اور انہوں نے ان کو بتایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ
انما الطیبة فی المرأة والدابة والدار

بے شک شگون عورت، سواری اور گھر میں ہے

حضرت عائشہؓ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے قرآن الوداع صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ایسا نہیں ہے۔ حضور تو یوں فرماتے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ شگون عورت، گھر اور گھوڑے میں ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب

حضرت ابو ہریرہؓ نے بات کا آخری حصہ سنا آغاز نہیں سنا جتنا سنا بیان کر دیا۔

مسند ابی داؤد و طیالسی میں ہے کہ حضرت علقمہؓ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عائشہؓ کے پاس تھے۔ ابو ہریرہؓ آئے حضرت عائشہؓ نے کہا اے ابو ہریرہؓ کیا تم یہ حدیث بیان کرتے ہو کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت کو بلی کے باندھنے، کھانا پینا بند کرنے کی پاداش میں عذاب ہوا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ جی ہاں میں نے حضور سے ایسا ہی سنا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ بہتہ ہے کہ یہ عورت کون تھی؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ یہ عورت کافرہ تھی۔ خوب یاد رکھو اللہ سبحانہ کے نزدیک مومن کا اس سے کہیں زیادہ اکرام ہے کہ وہ اسے صرف ایک بلی کی وجہ سے عذاب دے۔

یاد رہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ پر حضرت عائشہؓ کے ان تعقیبات سے یہ شبہ ہرگز نہ کرنا چاہیے، کہ اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کی شان فقہا بہت پر کوئی حریف آتا ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کے تعقیبات صرف حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ان کی جانب سے ایسے تعقیبات تو ان پر بھی ہیں جو فقہا بہت میں معروف اور کثیر الفتاویٰ ہیں۔ مثلاً فاروق اعظمؓ، علیؓ بن ابی طالبؓ۔

ابن سعد نے صفات میں ابن القیم نے اعلام میں حضرت ابو ہریرہ کو ان صحابہ میں شمار کیا ہے جو بیان فتاویٰ و مسائل میں درمیانے درجہ پر تھے۔ کسی صحابی کے کثیر الحدیث اور ضبط و حفظ میں شہرت پالینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عظیم الفقہ ہوتے ہیں۔ اگر کثرت حدیث اور اسناد و روایت کی فن کاری کی وجہ سے ارباب طبقات نے امام احمد اور امام بخاری کو فقہاء میں شمار نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام احمد اور امام بخاری فقیہ نہ تھے۔ یقیناً تھے لیکن دوسرے ارباب فن کی طرح ان کا یہ فن نہ تھا ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ یقیناً فقیہ تھے مگر فاروق اعظم، علی بن ابی طالب اور ابن مسعود کی طرح فنکار نہ تھے ان کی فنکاری تحدیث و روایت تھی۔ علامہ عبدالغفر بن بخاری نے کشف الاسرار میں، حافظ ابن الہمام نے تحریر میں، حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضمینہ میں یہ بات پوری قوت کے ساتھ واضح کی ہے۔ حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ فقیہ ہیں اور اسباب اجتہاد سے مالا مال تھے۔

حافظ عبدالقادر قرشی لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ فقیہ تھے ان کو حافظ ابن حزم نے فقہاء صحابہ میں شمار کیا ہے۔ شیخ تقی الدین السبکی نے ان کے فتاویٰ کتابی صورت میں جمع کیے ہیں۔ یہ امر آخر ہے کہ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں ان کو فنی شہرت نہ ہو جیسا کہ الوابل الصیب میں ابن القیم حافظ ابن حزم کے حوالہ سے رقمطراز ہیں۔

ابن عباس کے فتاویٰ، تفسیر اور مسائل کا حضرت ابو ہریرہ کے فتاویٰ سے کیا مقابلہ اور کیا نسبت؟ بے شک حضرت ابو ہریرہ حفظ میں صاحب مقام ہیں بلکہ علی الاطلاق پوری امت میں حافظ ہیں حدیث کو جیسا سنا ہے آگے پیش کرتے ہیں۔ ان کی ساری توجہات کا مرکز حفظ حدیث اور ان محفوظ حدیثوں کو آگے پہنچانا ہے اور ابن عباس کی توجہ کا مرکز تفقہ اور استنباط مسائل ہے لیجئے خود ان کے الفاظ پڑھ لیجئے۔

فكانت همته مصروفة الى الحفظ وتبليغ ما حفظه كما سمعه

وهمة ابن عباس مصروفة الى التفقه والاستنباط۔^{۱۷}

ابو ہریرہ کی ساری توجہ حدیثوں کے یاد کرنے اور یاد شدہ حدیثوں کے پہنچانے پر لگی تھی اور ابن عباس کی ہمت و توجہ کا مرکز تفقہ و فتاویٰ

اور استنباط مسائل تھا۔

اسی بنا پر اصول کی کتابوں میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ ان صحابہ کی حدیثوں کو جو فقہ و اجتہاد میں معروف ہیں ترجیح دی جائے۔ برخلاف ان کے جو فقہ و اجتہاد میں نہیں بلکہ صرف عدالت و حفظ میں ممتاز و مشہور ہیں۔ ان کی حدیث کو رائج نہیں قرار دیا جائے گا۔ فقہ و اجتہاد میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں خلفاء راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عید اللہ بن الزبیر، حضرت عائشہ، حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاذ بن جبل کا نام لیا ہے اور حفظ و عدالت میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی اور حضرت بلال کا نام لیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

ان عرف بالفقہ والتقوى في الاجتهاد كالحفظة الراشدين كان
حديثه حجة وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه
كانه ابى هريرة۔

اگر فقہ اور اجتہاد میں مشہور ہو جیسے خلفاء راشدین تو اس کی حدیث حجت ہے اور اگر کوئی عدالت، ضبط و حفظ حدیث میں مشہور ہو مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو جیسے ابو ہریرہ اور انسؓ۔

اب سابقہ بیانات کی روشنی میں آپ ہی فیصلہ فرمائیے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت فاروقؓ کو کس چیز میں شہرت حاصل ہے یقیناً حضرت ابو ہریرہؓ کو حفظ میں اور حضرت فاروقؓ اعظمؓ کو فقہ و اجتہاد میں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ فقیہ نہیں ہیں۔ حاشائے حاشا فقیہ ہیں مگر حضرت ابن عباسؓ، حضرت فاروقؓ اعظمؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرح فقہ میں معروف نہیں اور کسی فن میں شہرت نہ ہونا کوئی عیب نہیں یہ تو فرق مراتب ہے۔

حافظ زرکشی نے حضرت عائشہؓ کے ایسے تعقیبات کو ایک رسالہ نامی ”الاجابۃ فیما استدرکتہ عائشہ علی الصحابۃ“ میں جمع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو چکا ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنی عادت کے مطابق اسی کی تلخیص ”عین الاجابۃ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ“ کے نام سے کی ہے۔ یہ مطبع معارف اعظم گڑھ ہندوستان میں طبع ہوا ہے۔

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صحابہ میں اس لحاظ سے فرق مراتب تھا اور فرق مراتب کی یہی میراث

”تابعین اور تبع تابعین کو بھی صحابہ سے ملی ہے۔
اور یہاں سے یہ حقیقت بھی الم نشرح ہو گئی کہ حضرت فاروق اعظم کے متعلق جو یہ تصریحات ملتی ہیں کہ

اقتلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔

یا حضرت قرظہ کا یہ کہنا کہ نہانا عمر (منع کیا ہم کو عمر نے) اور یا حضرت ابو ہریرہ کا ابو سلمہ کے سوال پر یہ کہنا کہ

لو كنت احدث في زمان عمر مثلاً احدثتكم بغيري بخفصة لـ

اگر میں زمانہ عمر میں ایسے حدیث بیان کرتا جیسے تم سے کرتا ہوں تو مجھے

وہ درے لگاتے۔

تو ان کا منشا وہ نہیں جو عموماً آج سمجھ لیا گیا ہے بلکہ اس کا پس منظر یہ ہے کہ فاروق اعظم نے تحدیث اور اشاعت سنت کے لیے سرکاری طور پر شخصیتیں مقرر کی تھیں۔ ہر کس و ناکس کو یہ کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ امام دارمی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا یہ منشا تھا کہ غزوات اور جنگی سرگرمیوں کے واقعات رائے عامہ کے سامنے نہ بیان کیے جائیں۔ صرف فرائض و سنن سے ان کو روشناس کیا جاتے اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا مطلب یہ تھا کہ حضور انور کی وہ حدیثیں جن کا تعلق عادات و شمائل سے ہے وہ نہ بیان کی جائیں کیونکہ ان سے کوئی غرض شرعی متعلق نہیں یا وہ حدیثیں مقصود ہیں جن کے حفظ و ضبط کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے ان نادیات کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمر کا موقف خود ان کے طرز عمل سے متعین ہو سکتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے تمام ممالک محروسہ میں معلمین مقرر کیے تھے اور ہر جگہ تاکید ہی احکام روانہ کیے تھے کہ ان معلمین سے فرائض اور سنن سیکھو جیسا کہ قرآن سیکھتے ہو۔ چنانچہ مسند دارمی میں ہے۔ تعلموا الفرائض والسنن كما تعلمون القرآن۔ (فرائض اور سنن کو سیکھو جیسے تم قرآن سیکھتے ہو)

اور قرآن کے ساتھ صحت الفاظ و اعراب بھی سیکھو۔ ان کے خاص الفاظ حسب روایت

ابن الانباری یہ ہیں۔ تعلّموا اعراب القرآن کما تعلّمون حفظہ اعراب قرآن لیکھو جیسے اس کو یاد کرنا سیکھتے ہو۔

مورخین نے چونکہ زمانہ فاروق اعظم میں تنظیمی نظم کے لیے کوئی خاص عنوان قائم نہیں کیا اس لیے ان معلّموں کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی مگر جستہ جستہ تصریحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر شہر میں متعدد صحابہ اس کام پر مامور تھے۔ قرۃ العینین میں ہے کہ دور ہر شہر سے مقررے و محدثے رافضیہ آپ نے ہر شہر میں ایک فارسی اور ایک محدث بھیجا۔ اور روضۃ الاحباب کے حوالے سے لکھا ہے کہ زمانہ فاروق اعظم میں ایک ہزار چھتیس شہر فتح ہوئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ فاروق اعظم نے اپنے دور خلافت میں ایک ہزار چھتیس صبیہ کرام کو حدیث کی اشاعت کے لیے مقرر فرمایا۔ آپ چاہیں تو تذکرۃ الحفاظ، سداً للاحیاء اور الاصابہ جیسی کتابوں سے ایسے صحابہ کی ایک فہرست مرتب کر سکتے ہیں۔ جن کو حضرت عمرؓ نے معلّمین سنن اور محدثین کی حیثیت سے روانہ کیا۔ ایک بار مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے بہات و اشکاف نقطوں میں فرمائی۔

انی اشہدکم علی امراء الامصار انی لمر بعثتہم الیٰ ففہم الناس فی دینہم لے
میں تم گواہ بناتا ہوں کہ میں نے امراء کو شہروں میں دین سکھانے کے لیے روانہ کیا ہے۔
ایک اور تقریر میں اس سے زیادہ وضاحت ہے۔

انی واللہ ما بعث الیکم عمالی لیضربوا البشارکم و لکنی ابعثتہم الیکم
لیعلموا دینکم و سنتہ نبیکم لے

میں بقسم کہتا ہوں کہ میں نے امراء کو صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں دین اور
تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔

گویا فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ہر ملکی افسرانظامی سربراہی کے ساتھ محدث اور معلّم فقہ
ہوتا تھا اور یہ التزام صرف انتظامیہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فوجی افسروں میں بھی اس کا خاص
لحاظ ہوتا تھا۔ قاضی ابو یوسف رقمطراز ہیں:

لے قرۃ العینین ص ۱۳۱ لے کتاب الخراج ص ۱۱۸

لے کتاب الخراج ص ۱۱۵

ان عمر بن الخطاب کان اذا اجتمع الیہ جمیش من اهل الایمان بعث
علیہم رجلاً من اهل الفقه والعلم۔

حضرت عمر کے پاس مسلمان فوجی آتے تو ان پر اہل فقہ اور علم کو امیر بناتے۔
یاد رہے کہ صدر اول میں فقہ سے مراد سنت ہوتی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :
مسلمین در زمان شیخین متفق بودند باخذ بہ سنت ظاہر کہ معتبر بفقہ است۔
مسلمان شیخین کے زمانے میں سنت کو اپنانے پر متفق تھے جسے فقہ
کہتے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ تاریخ کی اتنی بڑی شہادت ہوتے ہوئے روایت
حدیث سے مخالفت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں
بلکہ سرکاری طور پر اس کے لیے خاص شخصیتیں مقرر تھیں۔

خلافت راشدہ اور تدوین حدیث

خلفاء راشدین کے سائے دور میں ارشادات پیغمبر کی عمومی حفاظت رائے عامہ نے اسی طرح
کی اور اسی کا نام ان کی زبان میں العلم تھا۔ اور یہ علم کی نگرانی سابقہ رواج کے مطابق بطریق
الروایت تھی۔

یہ بات کہ خلافت راشدہ میں باقاعدہ قانونی طور پر کتابی صورت میں حدیث کی تدوین کیوں نہیں
کی اس کے لیے ہم یہاں حافظ ابو بکر بن عقیل کے بیان کا ایک اقتباس مدبرہ ناظرین کرتے ہیں۔
ابو بکر بن عقیل الصقلی بروایت ابن بشکوال رقمطراز ہیں کہ۔ حدیث کا سارا ذخیرہ زمانہ نبوت
کے بعد صحابہ کے سینوں میں الگ الگ تھا۔ یعنی کسی کو کچھ معلوم تھا۔ ساری زندگی ایک ہی شخص
کو معلوم نہ تھی اور پھر جسے جو کچھ بھی معلوم تھا وہ بھی معافی کی حد تک۔ کیونکہ الفاظ کی حفاظت کا
اس کے لیے کوئی قانونی اہتمام روز اول ہی سے نہیں کیا گیا تھا۔ برخلاف قرآن کے اس کے
الفاظ کی قانونی طور پر نگرانی کی گئی تھی۔

ایسی حالت میں اگر صحابہ کرام زمانہ خلافت راشدہ میں قرآن ہی کی طرح احادیث کو بھی یکجا کر لیتے

اس میں ایک طرف یہ خوبی ضرور ہوتی۔ کہ ایک قابل اعتماد علمی سرمایہ کتاب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا مگر یہ قیامت بھی یقینی طور پر پیش آتی کہ قرآن اپنے اعجاز کی وجہ سے متعینہ الفاظ میں محفوظ تھا برخلاف سنت کے کہ اس کے معانی و مطالب مقرر تھے مگر الفاظ کا اعجاز نہ ہونے کی وجہ سے قرآن جیسی حفاظت نہیں کی گئی۔ اس لیے حدیث کا جو ذخیرہ کتاب سے باہر رہتا وہ حدیث ہونے کے باوجود بے اعتبار ہو جاتا۔

ان وجوہ سے خلافت راشدہ نے حدیث کو خود سرکاری طور پر کتابی طرز پر جمع نہیں کیا بلکہ اس کو بعد میں آنے والوں پر چھوڑ دیا۔
اس کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ

۱۔ نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دوسرے انبیاء کی نبوتوں کے مقابلے میں ایک نمایاں حیثیت لے کر آئی ہے۔ دوسری نبوتوں سے اس کو ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ یہ نبوت اپنے ساتھ خلافت لے کر آئی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے نبوت کے اس امتیاز کو قرآن کا منطوق قرار دیا ہے۔ قرآن کی مشہور آیت نسخ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَسِيَهَا نَاتُ بَحْثُ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا
فَقَوْلُهُ بِحْثُ مِنْهَا فِيمَا تَكُونُ النَّبُوءَةُ مضمومة بالخلافة
جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو لے آتے ہیں
اس سے اچھی یا اس جیسی۔ اس سے اچھی اور بہتر کا مطلب یہ
ہے کہ ہم وہ نبوت عطا کرتے ہیں جو خلافت سے وابستہ ہو۔

حجۃ اللہ ہی میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

اعظم الانبياء شأناً من له نوع آخر من البعثة وذلك
ان يكون مراد الله تعالى فيه ان يكون سبباً لخروج الناس
من الظلمات الى النور ان يكون قومه خير أمة اخرجت
للناس فيكون بعثه يتناول بعثاً آخر۔

نبیوں میں بڑی شان کا نبی وہ ہے جو نبی ہونے کے ساتھ ایک اور
بعثت بھی ساتھ لے کر آئے۔ یہ اس طرح کہ نبی کی نبوت کے ذریعے
اللہ سی نہ کا مقصد ایک تو لوگوں کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان

کی روشنیوں میں لانا ہوا اور دوسرا یہ کہ اس کی قوم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے روانہ کیا گیا ہو۔ اس لیے آپ کی بعثت ایک دوسری بعثت کے کرائی ہے اور یہ آپ کی قوم کی بعثت ہے۔

۲۔ اسلام میں خلافت راشدہ کی حد تک قول خلیفہ کا مقام حجت اور دلیل کا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے خلفائے ارشاد و کردار کی حجیت پر ازالۃ الخفاس ج ۱ ص ۷۳۰ پر تفصیلی بحث کی ہے اور اپنے دعویٰ کو قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کہ
وَلِيُكْمِلَنَّ لَكُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ

پر لکھا ہے

دریں آیت افادہ مے فرماید: ”بسی ایشاں ممکن و شائع و مشہورے شود دین مرتضیٰ است“

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کی کوشش سے اس کو جو قوت ملی اور دین کی جو اشاعت اور شہرت ہوئی وہ دین پسندیدہ ہے۔

اور آیت :

الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَّا هُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ اَقَامُوا الصَّلَاةَ

پر لکھتے ہیں کہ :

دریں آیت افادہ فرمود ہر نماز سے ترک کو اتنے وام معروف و نہی منکر کے کہ از ممکناں ظاہر شود محمود و محل رضا است

یعنی خلافت راشدہ کے قول و فعل کے دین میں حجت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے قرآن میں دین کو ان کی طرف نسبت کر کے اسے اپنا پسندیدہ قرار دیا ہے اس لیے ان کے تمام اعمال دین میں محمود و محل رضا ہیں۔

۳۔ اسلام میں جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت واجب الاتباع ہے ایسے ہی خلفاء راشدین کی سنت بھی واجب الاتباع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس نے ان کو معیار حق گردانتے ہوئے ہمیں ان کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عرابض بن ساریہ سے

روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
 فحلیکم بسنتی و سنتی الخلفاء الراشدين المحدثین
 تمسکوا بہا وعضوا علیہا بالتواجد لہ
 میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت سے چمٹ جاؤ، اسے تمام لو
 اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔
 اسی سنت کی تعریف یہ کی جاتی ہے،

السنة هي الطريقة المملوكة فيشتمل ذالك التمسك
 بما كان علیہ و خلفائہ الراشدون من الاعتقادات والاعمال
 والاقوال و هذه هي السنة الكاملة۔

سنت طریقہ مسلوکہ کا نام ہے۔ یہ حضور انور کی سنت اور خلفاء راشدین
 کے تمام اعتقادات، اعمال اور اقوال کو شامل ہے یہی سنت کاملہ ہے۔

۴۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں امت کے اختلاف و افتراق کا پتہ دیا ہے وہاں
 امت کے لیے اختلاف کے اسی دلیل میں شاہد و نجات کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے
 مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اصْحَابِي (وہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں) یہاں آپ نے اپنے ساتھ صحابہ
 کو ملا کر راسخات کی تعیین فرمائی ہے۔

اسی بنا پر فرقہ ناجیہ کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

الْفِرْقَةُ النَّاجِيَةُ هُمُ الْاَخِذُونَ فِي الْعَقِيدَةِ
 وَ اَنْعَمَ جَمِيعًا بِمَا ظَهَرَ مِنَ الْكِتَابِ وَ السُّنَّةِ وَ جَرَى
 عَلَيْهِمْ مَجْمُوعُ الصَّحَابَةِ وَ التَّابِعِينَ۔

فرقہ ناجیہ وہ ہی لوگ ہیں جو عقیدہ و عمل دونوں میں کتاب و سنت
 کے ظواہر اور جمہور صحابہ و تابعین کی شاہد راہ پر ہوں۔

یعنی فرقہ ناجیہ مفہوم میں کتاب و سنت اور مصداق میں صحابہ و تابعین سے استفادہ کرتا ہے

اور اسی مفہوم و مصداق کی ہم آہنگی کو بتانے کے لیے اس فرقہ ناجیہ کا نام اہل السنۃ والجماعۃ رکھا گیا ہے۔
اس تفصیل سے آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ

اسلام کا علمی، اخلاقی اور روحانی نظام نبوت اور خلافت سے مل کر بنا ہے۔ یعنی قرآن کی ہدایات، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی تشریحات اور خلافت کی آئینی اور قانونی ترتیب کا نام مکمل اسلام ہے۔ اگر صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ میں سے کوئی بھی تدوین سنن کا یہ کام کرتا تو یقیناً یہ تدوین پورے اسلام کی اُمینہ دار نہ ہوتی بلکہ خلفاء کے او وارانہ میں سے ایک کے رہ جانے سے بھی سنت کی تدوین اور حوری ہوتی۔ اس لیے ان اکابر میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔

۵۔ قرآن حکیم میں اللہ سبحانہ نے مسلمان کا منتہائے نظر صراطِ مستقیم قرار دیا ہے اور اسی کی طلب گاری کے لیے ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں درخواست کرتا ہے صراطِ مستقیم کے تعارف یا تعریف میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ نہیں کہ وہ صرف انبیاء کا راستہ ہے بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ پاک نے انعام فرمایا ہے صِرَاطُ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے) اور ان انعام یافتگان کی قرآن ہی نے خود جو تعبیریں کی ہیں وہ دنیا کے سامنے ہے فرمایا :

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ
وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ -

میں لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہداء،
اور صالحین۔

یہ آیت گرامی اس بات میں فیصلہ کن ہے کہ صرف انبیاء کی نہیں بلکہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ قرآن کی زبان میں صراطِ مستقیم ہے۔

آیت استخلاف میں جہاں مخاطبوں سے منکد کے ذریعے خلافت کا وعدہ کیا ہے وہاں ان کی صلاحیت کا پہلے ذکر کیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر کلمہ حصر لا کر صدیقیت اور شہادت کو صحابہ کا وصف خصوصی بتایا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

وَالشَّهَادَةُ عِنْدَ رَبِّهِمْ -

اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے یہی لوگ
صدقہ یقین اور شہداء ہیں اپنے پروردگار کے حضور۔
ایک اور موقع پر کلمہ خطاب کے ذریعے صحابہ کو کہا ہے -
لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ
تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔

اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک عقائد، اعمال، اخلاق اور آداب میں
نبوت اور خلافت کے قائم کیے ہوئے نقوش کا نام صراطِ مستقیم ہے۔
اسی بنا پر قرآن نے نبوت کے سارے کاموں کو اپنے مخاطبوں کے فرائض بتا دیے مثلاً
نبوت کا کام دعوت ہے قرآن منکم کے خطاب ہی زور سے اسے اپنے مخاطبوں کا فرض قرار
دیا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ -

چاہیے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے۔
نبوت کا مشن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے قرآن نے اسے امت کی خیریت کا جہنی
قرار دیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ -

تم بہترین امت ہو لوگوں کے لیے بپا کیے گئے ہو نیکی کا حکم دیتے
ہو اور بُرائی سے روکتے ہو۔

نبوت کا مقام شہادت علی الناس ہے قرآن نے اسی کو اپنے مخاطبوں کے نقطہ اعتدال
پر ہونے کی علت بتا کر خلافت کا فرض قرار دیا ہے۔

كَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ
عَلَى النَّاسِ

ایسے ہی بنا دیا ہم نے تم کو درمیانِ امت تاکہ تم ہو جاؤ گواہ لوگوں پر
نبوت کا کام تبیین ہے مگر قرآن میں اسی کو خصوصی طور پر خلافتِ راشدہ کا فریضہ

قرار دیا ہے۔ فرائض کا یہ اشتراک بول رہا ہے کہ اسلام نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے۔
 اس تمام تفصیل سے مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ چونکہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت
 نبوت کا خلافت کے ساتھ پیوند ہے۔ نبوت اگر انفرادی اسوہ ہے تو خلافت اسی کی اجتماعی تشکیل
 کا نام ہے اس لیے خلافت راشدہ کے اس دور میں جو اسلامی نقطہ نظر سے معیار حق اور حجت و
 دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنن کو کتابی صورت میں مدون نہیں کیا گیا اگر ایسا کیا جاتا تو دور
 خلافت تدوین سے رہ جاتا اور سنت کی ادھوری تدوین ہوتی۔

خلافت راشدہ کے دور میں خدمتِ حدیث

دورِ خلافت راشدہ میں حدیث کی اشاعت میں سب سے زیادہ کوشش حضرت فاروق اعظمؓ
 نے کی ہے اور صرف حدیث نہیں بلکہ روایت کے اصول کے موجد و حقیقت حضرت عمرؓ ہی ہیں
 جیسا کہ آپؓ آئندہ پڑھیں گے۔

حدیث کے سلسلے میں جو کام حضرت فاروق اعظمؓ نے کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ
 ۱۔ احادیثِ نبوت کو نقل کر کے وقتاً فوقتاً گورنروں اور ضلعی حکام کے پاس روانہ کرتے۔
 ان احادیث کا تعلق سنن و فرائض سے ہوتا۔

۲۔ صحابہ میں جو لوگ فنِ حدیث کے امام تھے ان کو مختلف ممالک میں حدیث کی تعلیم کے لیے
 روانہ کیا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

فاروق اعظمؓ عبد اللہ بن مسعودؓ را بجھے بکوفہ فرستاد و معقل بن یسارؓ
 و عبد اللہ بن معقلؓ و عمران بن حصینؓ را بہ بصرہ و عبادہ بن الصامتؓ
 و ابوالدرداءؓ را بہ شام و معاویہ بن ابی سفیانؓ کہ امیر شام بود قدغن بلین
 نوشت کہ از حدیث ایشان تجاوزه نہ کنند۔

فاروق اعظمؓ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ
 کوفہ روانہ کیا اور معقل بن یسارؓ و عبد اللہ بن معقلؓ اور عمران بن حصینؓ
 کو بصرہ، عبادہ بن الصامتؓ، ابوالدرداءؓ کو شام روانہ کیا اور حضرت

معاویہ کو بڑی تاکید سے لکھا کہ ان کی حدیثوں سے آگے نہ بڑھیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں ببادی النظر فہنوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ فاروق اعظم نے اگر واقعی اشاعتِ حدیث کا اتنا اہتمام فرمایا ہے تو پھر حضرت عمرؓ سے دفترِ حدیث میں احادیث کیوں کم مروی ہیں؟ یہ غلط فہم روزنی ہے لیکن دراصل یہاں ایک مغالطہ اور غلط فہمی ہے۔ محدثین کے یہاں یہ مانا ہوا اصول ہے کہ صی بی جب کوئی ایسا مسئلہ بیان کرے جس میں رائے کو دخل نہ ہو تو اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لے مطلب یہی ہوگا کہ حدیث مرفوعہ ہے جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے حافظ ابن عبد البر اور دوسرے محدثین سے نقل کیا ہے اور ہے بھی یہ ایک عقلی قانون۔ اس اصول کی روشنی میں حضرت فاروق اعظم کی تقریروں اور تحریری فرامین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے جس قدر اصولی مسائل بیان ہوئے ہیں وہ سب احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث نے یہ بات کھول کر بیان کی ہے:

مضمون احادیث در خطب خود ارشاد می فرمائید تا اصل احادیث
بآں موقوف خلیفہ قوت یابد۔ یار اینکہ بغور سخن نرسند این را نمی فهمند
و نمی دانند کہ فاروق اعظم تمام علم حدیث را اجمالاً تقویت داده و
اعلان نموده ہے

فاروق اعظمؓ اپنی تقریروں میں حدیثوں کا حوالہ دیتے تاکہ حدیث کا
ذخیرہ موقوف خلیفہ ہونے کی وجہ سے زیادہ مستند ہو جائے جو لوگ
غور و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ فاروق
اعظمؓ نے تمام علم حدیث کو اس طرح قوی سے قوی تر بنا دیا ہے
اور اس کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔

قرۃ العینین میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

حضرت فاروق اعظمؓ کی حدیثیں صرف اس قدر نہیں جو ان کے نام سے
مسانید میں موجود ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر صحابہ سے جس قدر
روایات مرفوعہ نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں وہ سب فاروق اعظم ہی
کی روایات ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ
اور حضرت ابوہریرہؓ کی بے شمار روایات کا وہ ذخیرہ ہے جن کو ان
بزرگوں نے فاروق اعظمؓ سے سُن کر براہِ راست حضور انور صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

خدمتِ حدیث کے سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں حضرت فاروق اعظمؓ کا
ایک کارنامہ یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی تمام تر توجہ ان احادیث کی اشاعت پر صرف کی جن
سے عبادات، معاملات یا اخلاق کے مسائل متنبط ہوتے تھے۔

سنن ہدیٰ اور سنن زوائد میں امتیاز

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی چند در چند اعمال و افعال کا مجموعہ تھی اور آپ
رسول اللہ ہونے کے ساتھ عربی ہونے اور قریشی ہونے کی بھی حیثیت رکھتے تھے اس لیے فاروق
اعظمؓ نے ان سب حیثیتوں میں بھی ایک نمایاں امتیاز اور خطِ فاصل قائم کیا تاکہ سنن ہدیٰ اور
سنن زوائد میں اختلاط اور التباس نہ ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

فاروق اعظمؓ نظر دقیق در تفریق بیان احادیث کہ بتبلیغ شرائع و
تکمیل افراد بشر تعلق دارد از غیر اُن مصروف ساخت لهذا احادیث
شما اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و احادیث سنن زوائد در لباس
و عادات کمتر روایت مے کرد بدو وجہ۔ یکے اُنکہ اینہا از علوم تکلیفیہ و
تشریعیہ نیست۔ تحمل کہ چوں اہتمام تام بر وایت اُن بکار ببرد بعض
اشیاء از سنن زوائد بر سنن ہدیٰ مشتبہ گردد۔
فاروق اعظمؓ نے وقتِ نظر سے دو قسم کی حدیثوں میں ایک جوہری فرق

قائم کیا اور بتایا کہ وہ حدیثیں کون سی ہیں جن کا تعلق شرائع سے ہے اور وہ کون سی ہیں جو ان سے متعلق نہیں ہیں اسی لیے حضرت عمرؓ روئے احادیث کم بیان کرتے جن کا تعلق سنن زوائد سے ہوتا اور اس میں دو وجہ پیش نظر تھیں ایک یہ کہ سنن زوائد کا تعلق تشریح سے نہیں ممکن ہے کہ ان کی روایت کا اہتمام لوگوں میں سنن زوائد اور سنن بدی میں اشتباہ پیدا کر دے۔

شاہ صاحب نے قرۃ العینین میں بالکل درست لکھا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحابہ کو خاص اسی مشن پر تمام اطراف مملکت میں روانہ فرمایا اور ان کو روایت کا طریقہ سکھایا اور روایت حدیث کی ان کو زیادہ سے زیادہ تخریض فرمائی اور سب عامہ کو ان حضرات سے احادیث سیکھنے کی ترغیب دی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری نگرانی خود کی اور ان کی بیان کردہ حدیثوں کو جانچا اور پرکھا اور اس کے ساتھ ان محدثین کو قرآن و حدیث میں باہم ربط و قرآن میں آئی ہوئی عام بات کی سنت کے ذریعے تخصیص اور مجملات قرآن کے لیے سنت کے ذریعے بیان کے قوانین سکھائے۔

اللہ اکبر! ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو حدیث بیان کرنے سے روکتے تھے۔ بزرگوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات لوگ خود نہیں سمجھتے اور بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ایسا نہ ہو کہ دامن مقصود ہاتھ سے نکل جائے میں بتا رہا تھا کہ حضور الزور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ بتانے سے پہلے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ امام اعظم کے بارے میں چند ضروری اور بنیادی باتیں ناظرین کے سامنے رکھوں۔

نام، کنیت اور لقب

نام نعمان، کنیت ابو حنیفہ اور لقب امام اعظم ہے۔ پیدائش کا سال ۱۱۰ھ مطابق ۶۹۹ء ہے ابن حجر مکی نے امام صاحب کو یہ کہہ کر اسم باسمی قرار دیا ہے کہ نعمان لغت میں دراصل اس خون کو کہتے ہیں جس پر بدن کا سارا ڈھانچہ قائم ہے اور جس کے ذریعے جسم کی ساری مشینری حرکت

کہتی ہے۔ اسی لیے روح کو بھی نعمان کہتے ہیں چونکہ امام اعظمؒ کی ذات گرامی اسلام میں قانون سلاہی کے فن کے لیے محور اور اس کے مدارک و مشکلات کے لیے مرکز ہے اس لیے آپ کا نام نعمان ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَابْتِوَحَيْفَةً بَعْدَ قِسْوَامِ الْفِقْهِ (ابو حنیفہ فقہ کا آسرا ہیں) سرخ اور خوشبودار گھاس کو بھی نعمان کہتے ہیں اور امام صاحب کی کمالاقتی مہک اور لہک سے اسلامی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہے۔

طَابَتْ خَلَالُهُ وَ بَلَغَ الْغَايَةَ كَمَالُهُؒ

عادات میں پاکیزگی اور کمال انتہا کو پہنچ گیا۔

ابن حجرؒ مثنویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نَعْمَانُ فُتِّلَانُ کے وزن پر نعمت سے بنا ہے۔ اسم گرامی میں معنوی رعایت یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی مخلوق خدا کے لیے ایک نعمت ہے اسی لیے آپ کا

ؒ ابو حنیفہ کو امام اعظمؒ کہتے والے صرف احناف ہی نہیں بلکہ بیگانے اور بیگانے سب ہی ان کو اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے تذکرہ میں، حافظ محمد بن ابیہم الوزیریؒ نے الروض الباسم میں اور ملک العلماء عزالدین بن عبد السلامؒ نے قواعد الاحکام میں اسی لقب سے پکارا ہے اور کیوں نہ پکاریں جبکہ بقول حافظ محمد بن ابیہمؒ آپ کی علمی بزرگی، عدالت تقویٰ اور امانت تو اتنے سے ثابت ہے اور آپ کا علمی مقام تمام عالم اسلامی میں شرقاً و غرباً سترہ سہ سے آج تک علماء میں مانا ہوا ہے۔

ؒ الخیرات الحسان ص ۱۰ ۳ الخیرات الحسان

ؒ پورا نام احمد بن محمد بن علی بن حجر ہے۔ ان کو اہلبیت مصر غربی میں ایک شہر کے محلہ ابی الہتیم میں بود و باش کی وجہ سے کہتے ہیں اور قبیلہ بنی سعد سے نسب تعلق کی وجہ سے ان کو سعدی کہتے ہیں (النور السافر فی القرن العاشر) رجب ۹۸ھ میں ولادت ہوئی بچپن ہی میں والد کا سایہ سہرا اٹھ گیا یتیمی کا سارا وقت عارف باللہ شمس الدین بن ابی الحاکم اور امام شمس الدین الشاذلیؒ کی کفالت میں گزرا، اشتاویؒ ان کو ابی الہتیم سے مقام قطیف الشریف میں لے گئے ابتدائی کتابیں اسی جگہ پڑھیں پھر جامع ازہر میں داخل ہو گئے اچھے اور مہربان اساتذہ کی آغوش میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، منطق اور فرائض میں خاص مہارت پیدا کی ۳۳۹ھ کے آخر میں مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج کے بعد واپس آ گئے لیکن ۳۹۹ھ میں گھر بار سمیت مکہ معظمہ میں ڈیرا لگایا اور تا وفات یہیں درس و افتاء کا کام کیا ان کی تصانیف میں بڑی مفید کتابیں ہیں تاریخ وفات ۳۹۵ھ ہے۔ مناقب امام اعظمؒ پر الخیرات الحسان کے نام سے کتاب لکھی ہے مسک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔

نام نامی نعمان ہے۔ فرماتے ہیں۔

فَاكْبُوْا حَنِيفَةً لِّنِعْمَةِ اللّٰهِ عَلٰی خَلْقِهِۦ

ابو حنیفہ مخلوق کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔

آپ کی کنیت ابو حنیفہ ہے لغت میں حنیفہ حنیف کا مونث ہے۔ حنیف اسے کہتے ہیں جو سب سے ہٹ کر اللہ کا ہو رہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو حنیف کہتے ہیں۔ امام اعظم نے یہ کنیت اپنے لیے کیوں تجویز فرمائی ہے؟ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ صرف تفاؤل کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے جیسے عموماً ابوالحسن، ابوالحسنات، ابوالکلام وغیرہ کنیتیں رکھی جاتی ہیں ورنہ اس نام کی آپ کی کوئی صاحبزادی نہیں ہے۔

وَلَا يُعْلَمُ لَهَا ذَكَرٌ وَلَا اُنْثٰی غَيْرُ مُحَمَّدٍ

آپ کی کوئی لڑکی نہیں ہے اور نہ حماد کے سوا کوئی لڑکا

اور یہ محض قیاس آرائی ہے کہ عراقی زبان میں حنیفہ ودات کو کہتے ہیں اور آپ کا قلم ودوات سے چونکہ گہرا لگاؤ رہا ہے اس لیے آپ کو ابو حنیفہ کہتے ہیں۔

در اصل جیسے اشخاص میں حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف ہیں ایسے ہی ادیان میں ان کا دین حنیف اور مل میں ان کی ملت حنیفہ ہے۔ حنیف دراصل وہ شخص کہلاتا ہے جو سب سے کٹ کر مولیٰ کا ہو رہے۔ اسی بنا پر غلط دین سے ہٹنے اور کٹ کر اسلام اختیار کرنے والے کو حنیف کہتے ہیں۔ اسلام کو دین حنیف اور ملت حنیفہ کہتے ہیں حتیٰ کہ ستخف مسلمان ہو جانے کے مترادف ہو گیا۔ زرخشتری نے اساس البلاغہ میں اس کے سارے مجازات جمع کر دیے چونکہ امام اعظم میں دین حنیف اور ملت حنیفہ کی خدمت کا جذبہ و شوق شروع ہی سے تھا اور اسی جذبہ و شوق کی بنا پر آپ نے تمام فنون کی تکمیل کے بعد فن کاری کے لیے علم الشرائع کو اپنایا جس کے ذریعے پورے دین کی خدمت ہو سکے میری مراد علم الفقہ ہے اس لیے آپ نے ان ہی لطیف احساسات کے اظہار کی خاطر بر بنائے تفاؤل اپنی کنیت ابو حنیفہ تجویز فرمائی۔ اصل میں ابوالملۃ الحنیفہ ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے زرخشتری کے حوالہ سے لکھا ہے :

وَتَدَّ اللّٰهُ الْاَرْضَ بِالْاَعْلَامِ الْمُنِيفَةِ كَمَا وَطَّدَ الْحَنِيفِيَّةَ

عجمی اور قبیلہ تہیم سے نسبت ولہ کی وجہ سے تیمی ہیں جس طرح امام بخاری کو اسی تعلق کی بنا پر حنفی اور امام ابن ماجہ کو ربیع کہا جاتا ہے ایسے ہی امام صاحب کو تیمی کہتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء والصفات کے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ لفظ مولیٰ زیادہ تر دوستی کے عہد و پیمان یعنی مولیٰ الموالات کے معنے میں استعمال ہوتا ہے تاہم مولیٰ چونکہ غلام کو بھی کہتے ہیں اس لیے امام اعظم کے بارے میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے اور وہ مولیٰ کے معنے غلام کے سمجھ بیٹھے لیکن چونکہ خود امام صاحب کی اپنی تصریح موجود ہے کہ یہ نسبت دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے اس لیے اب دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ امام طحاوی مشکل الآثار میں جو فن حدیث میں اپنے موضوع پر بے مثال کتاب ہے عقد موالات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عبداللہ بن یزید کہتے ہیں میں امام ابو حنیفہ کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا تم کون ہو، میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا یعنی نو مسلم۔ امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کر لو پھر تمہاری نسبت بھی

سہ یوزکر یا کنیت محی الدین لقب یسبحی بن اشرف نام ہے تاریخ ولادت محرم الحرام ۲۳۱ھ ہے دمشق کے مضافات میں "نوی" نامی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ نووی اور نوادی دونوں طرح بولا جاتا ہے بس ۲۳۲ھ میں دمشق تشریف لے گئے اور علامہ کمال الدین مغربی کے پاس رہے اور ان کے فیض صحبت سے اس درجہ علمی کمال کے مالک ہو گئے کہ فنون میں محقق اور حافظ حدیث تھے۔ ساری عمر بغیر شادی کے گزار دی ایک لمحہ بھی بیکار نہ تھے شب و روز تین ہی کام تھے مطالعہ، تصنیف اور ذکر الہی، کھانا چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار نوش فرماتے مدرسہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث تھے۔ آپ کی تصانیف میں شرح صحیح مسلم، الروضۃ، شرح المہذب، کتاب الاذکار، اور ریاض الصالحین مشہور ہیں۔ تاریخ وفات ۴۱۲ھ رجب ۲۷۶ھ ہے۔

سہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ مولیٰ صرف غلام ہی کو نہیں کہتے ہیں بلکہ ولہ اسلام، ولہ جلف اور ولہ لازم کو بھی ولہ کہتے ہیں اور ان تعلقات والوں کو مولیٰ کہا جاتا ہے امام بخاری کو ولہ اسلام کی وجہ سے حنفی، امام مالک کو ولہ جلف کی وجہ سے تیمی اور مقسم کو حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس زیادہ رہنے کی وجہ سے مولیٰ ابن عباس کہتے ہیں۔

ان کی طرف ہوگی میں خود بھی ایسا ہی تھا

یہ عبد اللہ بن یزید امام اعظم کے شاگرد ہیں چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ سمیع من ابن عون و ابی حنیفہ۔ یہ ابن عون اور ابو حنیفہ کے شاگرد ہیں بلکہ فن حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے اساتذہ میں ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بتایا یہ رہا تھا کہ امام اعظم کو تیمی غلامی کی وجہ سے منہیں بلکہ دوستی کے عہد و پیمان کی وجہ سے کہتے ہیں۔ الصیمری نے مناقب میں اور الخطیب نے تاریخ بغداد میں امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان لکھا ہے کہ:

میں اسماعیل پسر حماد پسر نعمان پسر ثابت پسر نعمان پسر مرزبان ابنہ فارس

سے ہوں اور ہم آزاد ہیں واللہ ہم پر غلامی کا دور کبھی منہیں آیا ہے

اس تاکید اور قسم والے بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے بارے میں پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بنی تیم کے آزاد کردہ غلام تھے اور اس غلط فہمی کا سرچشمہ ابو حاتم عبد الحمید کا وہ بیان ہے جو حافظ ذہبی نے مناقب میں درج کیا ہے لیکن اس بیان کا محور و مرکز

۱۔ مشکل الآثار ج ۳ ص ۵۴ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴

۳۔ الصیمری صیر بردن حیدر ہے اور اس کی صیمری نسبت ہے صیر ایک شہر کا نام ہے۔ پورا نام حسین بن علی بن محمد بن جعفر ہے ابو عبد اللہ کنیت ہے صیمری صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں خطیب بغدادی ان کے تلامذہ میں سے ہیں خطیب نے امام صیمری کی زبانی لکھا ہے کہ میں نے حافظ دارقطنی سے ان کی کتاب السنن کا سماع کیا ہے۔ ان کی تاریخ وفات التوارکادن ۲۱۱ شوال ۲۳۷ھ اور ولادت ۱۵۷ھ ہے خطیب نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ صدوق، واقرا، عقل، جمیل، المعاشرة، عارف، بحق، اہل علم حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں کہ بمقام ربع الکمرخ منصب قضا پر تا وفات فائز ہے ہیں۔ امام ابو الولید الباجی فرماتے ہیں کہ بغداد میں ان کو احناف کی امامت حاصل تھی اور لکھا ہے کان قاضیا عالما خیرا مولانا علی نے الفوائد البہیہ میں بتایا ہے کہ صیمری نے امام اعظم کے حالات پر ایک ضخیم کتاب اخبار ابی حنیفہ کے نام سے لکھی ہے۔ الجواب المضمیۃ ج ۱ ص ۲۱۴، الفوائد البہیہ ص ۲۸۔ ۵۔ التعلیقات علی المناقب ص ۸۔

۶۔ پورا نام عبد الحمید بن قاضی عبد العزیز ہے موصوف صرف ایک واسطہ سے امام محمد کے شاگرد ہیں اور حافظ ابو جعفر طحاوی کے استاد ہیں۔ ملا علی قاری نے ان کی تاریخ وفات ۱۹۲ھ لکھی ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بہترین قاضی اور بلند پایہ فقیہ تھے امانت و دیانت میں کمال تھے ابن الجوزی نے المنتظم میں ان کے آثار حمید کے بڑے گن گائے ہیں۔ المحاضر کتاب ادب القاضی و کتاب الفرائض ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

جسے قرار دیا گیا ہے وہ بے نام ہے اس لیے گناہ شخص کی بات پر فیصلے کی بنیاد رکھنا قرین انصاف نہیں ہے جب کہ خود امام صاحب اور ان کے پوتے کا بیان اس موضوع پر موجود ہے اور اس باب میں اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جس موالات کا تاریخ میں تذکرہ ہے وہ ولادہ محبت و مودت ہے۔ ولادہ عناق نہیں ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی نو مسلم مشرف بہ اسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقد موالات یعنی دوستی و قرابت کا عہد و پیمان کرتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف مولیٰ کہلاتا۔ بالتصریح تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ عقد موالات کس نے کیا تھا۔ امام صاحب کے والد کے بارے میں ملا علی قاری فرماتے ہیں :

وَلِدَ آبُو كَاثِبٍ عَلَى الْإِسْلَامِ ۝

ان کے والد ثابت مسلمان پیدا ہوئے۔

اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ زوطی نے مسلمان ہونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا ہو گا۔ زوطی کا اسلامی نام نعمان ہے۔ حضرت امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان بھی ہے کہ ہمارے پردادا ثابت حضرت علیؑ کے پاس گئے۔ حضرت علیؑ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دُعا کی ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے خود اسماعیل کا اس دُعا کے بارے میں یہ تاثر لکھا ہے :

ہمیں اُمید ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہمارے بارے میں حضرت علیؑ کی یہ دُعا ضرور قبول فرمائی ہے ۝

بالفاظ دیگر اُمت کو حضرت امام اعظم امیر المومنین علی مرتضیٰؑ کی دُعاؤں کے صدقے میں ملے ہیں۔ ملا علی قاری نے بھی مناقب امام میں اسماعیل بن حماد کا یہ بیان نقل کیا ہے ۝

امام اعظمؑ کے متعلق نبوی پیش گوئی

بہر حال امام اعظمؑ انجمنی ہیں۔ ماہ یا مرزبان آپ کے پردادا کا نام فارسی ہے اس لیے آپ کا نسل فارس سے ہونا یقینی ہے۔

فارس کے بارے میں صحیحین اور جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے جناب رسول اللہؐ

۱۔ الجواہر المفیہ ج ۲ ص ۴۵۲ ۲۔ عمدة الرعاہ ص ۳۴

۳۔ الخیرات الحسان ۴۔ مناقب امام ملا علی قاری منسلک الجواہر المفیہ ج ۲ ص ۴۵۴

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اسی صحبت میں سورۃ جمعہ نازل ہوئی جب آپ نے یہ آیت پڑھی۔ **وَاٰخِرُ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ حٰضِرِينَ** میں سے کسی نے عرض کیا کہ یہ دوسرے کون ہیں؟ جو ابھی تک ہم سے نہیں ملے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں خاموشی اختیار فرمائی پوچھنے والے نے یہی سوال دوبارہ کیا سہ بارہ کیا تب آپ نے حضرت سلمان فارسی کے کاندھے پر دست مبارک رکھ دیا اور فرمایا کہ **لَوْ كَانَ الْاِيْمَانُ عِنْدَ الثَّرِيَّا لَنَأْتَتْهُ رَبِّجَالٌ مِّنْ هٰؤُلَاءِ** اگر ایمان کہکشاں میں بھی ہو گا تو ان کے کچھ آدمی ضرور اسے پالیں گے۔

مسند احمد میں ایک اور سند کے ساتھ یہ الفاظ آتے ہیں:

لَوْ كَانَ الْعِلْمُ بِالْثَّرِيَّا لَنَأْتَتْهُ نَاسٌ مِّنْ اَبْنَاءِ فَاْرِسٍ

اگر علم ثریا میں ہو تو فارسی لوگ اسے پالیں گے۔

ابو نعیم اصفہانی، الشیرازی، الطبرانی اور امام مسلم نے یہی حدیث بالفاظ مختلفہ روایت کی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کا ایک مصداق شارحین حدیث نے امام اعظمؒ کو قرار دیا ہے حافظ سیوطی فرماتے ہیں **فَهٰذَا اَصْلُ صَحِيحٍ يُعْتَمَدُ عَلَيْهِ فِي الْبَشَائِرِ** (بشارت میں یہ قابل اعتماد اصل صحیح ہے) حافظ ابن حجر مکی نے حافظ سیوطی کے بعض شاگردوں کے حوالے سے

یہ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے تاریخ اصفہان میں اس حدیث کے سائے طرق جمع کر دیے ہیں۔ امام بخاری کے الفاظ آپ پڑھ چکے، امام مسلم نے رجال کی جگہ جل من انبار فارس نقل کیے ہیں۔ امام احمد اور ترمذی نے ایمان اور دین کی جگہ العلم روایت کیا ہے۔ **لَمْ تَبْيَضْ الصَّيْفَةُ مَعًا**۔

تہ بعض شاگردوں سے مراد سیرت شامیہ کے مصنف حافظ محمد بن یوسف شامی ہیں۔ علامہ ابن عابدین الشامی نے مواہب کے حاشیہ میں لکھا ہے العلامة الشامی تلمیذ الحافظ سیوطی، جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں نے استخاف میں یہاں پر حافظ سیوطی اور حافظ محمد بن یوسف پر سخت برہمی کا مظاہرہ کیا کہ انہوں نے اس حدیث کا مصداق خاص امام اعظمؒ کو کیوں قرار دیا ہے اور عون الباری علی ادلة البخاری میں اس پیش گوئی (باقی ص ۱۲۶ پر)

لکھا ہے کہ:

ہم اے استاد نے یقین کیا کہ اس حدیث سے امام ابو حنیفہ ہی مراد ہیں،
کیونکہ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ امام صاحب کے زمانے میں اہل فارس
میں سے کوئی بھی امام صاحب کے علمی مقام کو نہیں پہنچ سکا اور آپ
تو آپ بلکہ آپ کے تلامذہ کا بھی کوئی مقام نہ پاسکا بلکہ

صرف حافظ جلال الدین السیوطی اور حافظ محمد بن یوسف ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ دوسرے محققین
نے بھی حدیث کا مصداق امام اعظم ہی کو قرار دیا ہے۔ علامہ حنفی فرماتے ہیں:
حَمَلَهُ بَعْضُ الْمُحَقِّقِينَ عَلَى أَبِي حَنِيفَةَ - ۱
بعض محققین نے اسے امام ابو حنیفہ پر محمول کیا ہے۔

اور علامہ عزیزی لکھتے ہیں کہ:

عَلَى الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ أَبِي حَنِيفَةَ وَأَصْحَابِهِ - ۲

اس کا مصداق امام اعظم اور ان کے اصحاب ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

ایک روز اس حدیث پر ہم نے گفتگو کی میں نے کہا کہ امام ابو حنیفہ اس
حکم میں داخل ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ علم فقہ کی اشاعت ان کے ہاتھوں

(ص ۱۲۵ کا بقیہ حاشیہ) :- کو صرف زمرہ محدثین تک محدود رکھا ہے لیکن شاہ ولی اللہ نے محدثین کے ساتھ فقہاء کو بھی
شامل کر لیا ہے اور شاہ صاحب کے مشہور شاگرد بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی مرحوم نے اس کو اور زیادہ عام
کر کے فقہاء محدثین کے ساتھ مشائخ طریقت کو بھی اس کا مصداق بتایا ہے (مظہری ج ۳ ص ۲۵۸) اگرچہ ارشاد
کے الفاظ رجال من بولاء اس سے مانع نہیں ہیں مگر اس بشارت میں داخل ہونے کے لیے صرف توطن کافی نہیں
ہے بلکہ نسل فارس سے ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ابناہ فارس کی صاف تصریح ہے اور معلوم ہے کہ
توطن سے نسل تبدیل نہیں ہوتی ہے۔ لے الخیرات الحسان ص ۱۴

۱۔ السراج المینر ج ۳ ص ۲۱۸

۲۔ احمد نام، قطب الدین تاریخی نام، ولی اللہ عرف ہے، تیس واسطوں سے نسباً فاروقی ہیں۔ جزیرہ لطیف
میں فرماتے ہیں کہ ولادت چہار شنبہ کے روز ۴ شوال المکرم ۱۱۱ھ میں ہوئی ہے۔ حفظ قرآن کے بعد درسی
(باقی ص ۱۲۷ پر)

کرائی اور اہل اسلام کی اس کے ذریعے اصلاح فرمائی بالخصوص اس آخری دور میں کہ دولت بس یہی مذہب ہے سائے شہروں میں بادشاہ حنفی ہیں۔ قاضی حنفی ہیں اور مدرسین حنفی ہیں۔ یہ نواب صدیق حسن صاحب نے استخاف النبلاء المتقین میں بہت کچھ چینی و چناں کے بعد لکھا ہے کہ ہم امام درال داخل است و ہم جملہ محدثین فرس لہ۔ لیکن ہم جملہ محدثین، سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی ان ہی کی زبانی سنئے فرماتے ہیں کہ جہانزدہ محدثین مثل بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ و امثال ایشان۔

کیوں؟ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ زیر کہ ہمہ ایشان از عجم و سرزمین فارس بودند۔ کیونکہ یہ تمام عجمی تھے اور زمین فارس سے تعلق رکھتے تھے۔ حیرت ہے کہ نواب صاحب نے جملہ محدثین کو ارشاد نبوت کا مصداق بنانے کے شوق میں عجمی اور فارسی بنادیا حالانکہ تاریخ سے امام بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کئی عجمی ہونا ثابت نہیں ہے۔

ط ۲۱ کا بقیہ حاشیہ۔ کتابوں سے پندرہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کر لی حدیث پہلے ہندوستان میں شیخ محمد فضل سیالکوٹی سے پڑھی ہے۔ ۴۲ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ ایشان طاہر مدنی سے صحیح بخاری کا سماع کیا، موطا، مسند دلمی اور امام محمد کی کتاب الآثار پر بھی رشاہ صاحب کی تصانیف علماء کے لیے مشعل ہدایت ہیں رشاہ صاحب اپنے دور کے مجتہد اور مسائل فرعیہ میں عملاً حنفی تھے اور صرف از خود ہی عملاً حنفی نہ تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ ایسا ہی رہنے کی مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی ہے۔ فیوض الحرمین میں حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ان لفظوں میں لکھی ہے اِنَّ تَخَالِيفَ الْقَوْمِ فِي الْفُرُوعِ رِپِنِ قوم کے فروع میں اختلاف سے بچ کر رہو، علامہ نواب صدیق حسن مرحوم نے الحطہ میں ان کے طریقِ علمی پر ایک جامع تبصرہ کے بعد لکھا ہے کہ طریقتہ، کلمہ حنفی اور صرف رشاہ صاحب ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کے ہائے میں لکھا ہے کہ خاندان او حنفی بود۔ وہ مجدد تھے تاریخ وفات "ابو داؤد امام اعظم دین" ۴۷ھ ہے۔

لے مکتوبات ص ۱۶۸ لے، استخاف النبلاء المتقین ص ۲۲۴

امام مسلم کے متعلق خود امام نووی کی تصریح ہے کہ عَرَبِيٌّ صُلَيْبِيَّةٌ کیونکہ وہ نسباً قشیری ہیں خود نواب صاحب فرماتے ہیں۔

نَسَبُهُ إِلَى قَشِيرٍ مَصْفَرًا قَبِيلَةً مَعْرُوفَةً مِنَ الْعَرَبِ
عرب کے مشہور قبیلہ قشیر کی طرف اسم نسبت ہے۔

اور امام ابو داؤد و عربی نثر ادیب اور عرب کے مشہور قبیلے ازد سے تعلق کی وجہ سے ازدی ہیں۔ ترمذی قبیلہ بنی سلیم کی طرف نسبت کی وجہ سے سلمی ہیں۔ محدث حاکم ضبی اور امام دارمی بنی دارم کی طرف منسوب ہیں جو قبیلہ تمیم کی مشہور شاخ ہے اور امام المحمّد بن مالک بن انس خالصاً عربی ہیں اور امام احمد الشیبانی الذہلی ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں امام احمد کا پورا نسب ان کے صاحبزادے کی زبانی درج کیا ہے۔

انصاف فرمائیے کہ جملہ محدثین میں بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کون سا محدث فارسی النسل ہے۔ اگر ایسا ہی ہے اور ایسا نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ تاریخ کی کھلی شہادت موجود ہے تو پھر واقعات کی روشنی میں اس ارشادِ نبوت کا اولین مصداق امام اعظمؒ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

امام اعظمؒ اور اعجازِ نبویؐ

بہر حال اگر یہ حدیث صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ صحیحین میں موجود ہے تو پھر

۱۔ ابو الحسین کنیت، عساکر الدین لقب، مسلم بن الحجاج نام ہے ۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۵ سال کی عمر میں نصر آباد میں ۲۵ھ کو وفات پائی۔ علمی طلبگاروں کے سلسلہ میں حجاز، عراق، شام اور مصر آپ کی جولانگاہ ہے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں جلیل القدر تسنیف صحیح مسلم ہے۔ آپ نے اس کتاب کا انتخاب تین لاکھ بیس روایات کیا ہے جن کو انہوں نے براہِ راست اپنے شیوخ سے سنا تھا جیسا کہ محدث حاکم نے خود امام مسلم سے نقل کیا ہے حافظ مسلم بن قاسم نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام میں کسی نے ایسی کتاب تسنیف نہیں کی۔ (فتح الباری) ۲۔ کنیت ابو عبد اللہ نام احمد، امام بخاری نے آپ کو تاریخ میں الشیبانی الذہلی لکھا ہے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ میں آپ کا پورا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ آپ مارن بن شیبان بن ذہل کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے عربی نثر ادیب اس لیے آپ ذہلی بھی ہیں اور شیبانی بھی۔ سکونت کے لحاظ سے مروزی اور بغدادی ہیں۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔

بنانے والوں نے اگر بتایا ہے کہ امام اعظم اس نبوی پیش گوئی کا مصداق اولین ہونے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اعجازی کارنامہ ہیں تو اس میں مبالغہ ہی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر مہتممی نے لکھا ہے:

فِيهِ مُعْجَزَةٌ ظَاهِرَةٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَنَا
سَيِّدُ الْمُرَّةِ

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا معجزہ ہے۔ آپ نے ہونے والی بات کا پتہ دیا ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی برتری کے لیے یہ شرف کافی ہے کہ وہ نبوت کا معجزہ ہیں۔ اور اس سے بڑا شرف ہی کیا ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی مکاتیب میں سے ہر مکتب فکر نے امام اعظم کے مناقب کو اپنے لیے زاویہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شوافع میں حافظ جلال الدین السیوطی، حافظ ابن حجر مکی، حافظ ذہبی، ابن خلکان، ایاضی، علامہ نووی، امام غزالی اور حافظ ابن حجر عسقلانی، موالک میں سے حافظ ابن عبد البر اور حنابلہ میں سے علامہ یوسف بن عبد الحماد۔ الغرض اس ناوردۃ الدہر کی بے پیمائیوں کا یہ حال تھا کہ محدثین اور فقہاء میں سے کوئی منہیں جس کی زبان ان کے مفاخر اور آثار کے گیت نہ گا رہی ہو۔

الانتقام فی فضائل الثلاثة الفقہاء اور مناقب ذہبی سے اگر اس دور کے صرف ایسے علماء کی ایک فہرست تیار کی جائے جنہوں نے امام صاحب کے کمالِ علم و عمل کو سراہا ہے تو ان کی تعداد سو سے متجاوز ہوگی۔ مسعر بن کدام، ایوب السختیانی، سلیمان بن مہران، شعبۃ بن الحجاج، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن زید، ابن ابی عروبہ، ابن شہر مہ، یحییٰ بن سعید القطان، ان خوبان زمانہ کے حسن و جمال پر کون نام دھر سکتا ہے۔ لیکن وہ سب یک زبان ہیں کہ امام اعظم جیسا جمال ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔

امام اعظم کی محبت سستی ہونے کی علامت ہے

یگانے اور بیگانے نے سب ہی متفق ہیں کہ کہنے والوں نے اس ذاتِ گرامی کو معیارِ سنیت

بنادیا اور زہر ملا کہہ دیا کہ

مَنْ أَحَبَّ أَبَا حَنِيفَةَ فَهُوَ سُنِّيٌّ وَمَنْ أَبْغَضَهُ
فَهُوَ مُبْتَدِعٌ ۱۷

جو ابو حنیفہ سے پیار کرتا ہے وہ سنی ہے اور جو آپ سے بغض رکھتا
ہے وہ بدعتی ہے۔

اور ان ہی کی زبانی مسلمانوں کو یہ پیغام ملا ہے کہ

ہم اے اور لوگوں کے درمیان ابو حنیفہ ہیں جو ان سے محبت و تعلق رکھتا
ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ اہل سنت ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے
ہم یقین سے کہتے ہیں کہ وہ بدعتی ہے۔ ۱۸

معلوم ہے کہ یہ کہنے والے کون ہیں اور کس وقت کہہ رہے ہیں؟ یہ حافظ عبد العزیز بن میمون
ہیں۔ حضرت نافع، حضرت عکرمہ اور حضرت سالم کے سامنے ان کو زائوتے تلمذ طے کرنے کا شرف
حاصل ہے۔ اور ان کے تلامذہ میں یحییٰ القطان، عبد اللہ بن المبارک، عبد الرزاق اور وکیع بن الجراح
جیسے اساطین حدیث ہیں۔ ان کی وفات ۱۵۹ھ میں ہوئی ہے۔ یہ امام اعظم کے ایک معاصر کی
شہادت ہے اور معاصر کی شہادت ہی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر بڑے
بڑے جلیل القدر ائمہ حدیث مسائل میں امام اعظم کا لوہا مانتے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع
بیان العلم و فضلہ میں امام علی بن المدینی اور ملک الحافظ یحییٰ بن معین کے استاد امام وکیع بن الجراح
کے متعلق لکھا ہے كَانَ يَفْتِي بِرَأْيِ أَبِي حَنِيفَةَ حَافِظُ ابْنِ كَثِيرٍ وَرَأْيِ ابْنِ سَعِيدٍ
سَعِيدُ الْقَطَّانِ كَمَا فِي بَابِ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ يَحْتَمِرُ قَوْلُهُ فِي الْفَتْوَى ۱۹
سمجھ دار آدمی کے لیے اس میں یہ بات سوچنے کی ہے کہ یحییٰ القطان کی وفات اگر ۱۹۵ھ میں
ہوتی ہے تو امام ابو حنیفہ کی تقلید ۱۹۵ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی عوام تو عوام یحییٰ جیسے
اخص الخواص ان کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر اور حافظ ابن کثیر نے تصریح
کی ہے کہ امام یحییٰ القطان نے جامع صغیر باقاعدہ فاضی ابو یوسف سے سبقا پڑھی ہے۔

۱۷ الجواب المصنوع ج ۲ ص ۲۵۳ ۱۸ الجواب المصنوع ج ۱ ص ۱۸۲

۱۹ البدایہ ج ۱ ص ۱۵۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲

سیحی امام عبدالرحمن بن مہدی اور امام احمد کے اُستاد حدیث ہیں اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ میں نے سیحی جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ علم رجال میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔ عباس دوری نے سید الخفا سیحی بن معین کے حوالہ سے بتایا ہے کہ وہ فرماتے ہیں :

كُتِبَتْ الْجَامِعُ الصَّغِيرُ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحُسَيْنِ

میں نے جامع صغیر امام محمد سے لکھی ہے ۔

سیحی بن معین کے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابوزرعه اور ابویعلیٰ شاگرد ہیں ۔

رُخ النور اور سرِ پائے امامت

سن آئے ہو کہ امام اعظم کی ولادت سنہ ۲۹۹ بمقام کوفہ ہوئی حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں اور ابن خلکان نے تاریخ میں اسے راجح قرار دیا ہے ۔ لیکن ایک روایت میں حافظ سمعانی اور ان کے ساتھ حافظ ابن جہان نے کتاب الجرح والتعديل میں اور ابوالقاسم سمعانی نے روضۃ الصفا میں سنہ ۳۰۰ کو راجح بتایا ہے ۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کی سائے میں یہی صحیح ہے ان کا دعویٰ ہے کہ آپ معمر بن میں سے ہیں ۔

جَادَنَ الشَّعْبُ فِي النِّعَمِ

عمر نوے سے زیادہ ہے ۔

حافظ ذہبی نے مشہور محدث ابوالنعمان الفضل بن وکین سے نقل کیا ہے کہ امام اعظم خوش رو، خوش پوش، خوش مجلس، کریم النفس، خوشبو پسند اور اپنے رفقاء کے بڑے ہی ہمدرد تھے یہ امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قدمیانہ تھانہ بہت لاتبے تھے اور نہ کوتاہ، نہایت شیریں زبان، بڑے دلکش اور قادر الکلام تھے یہ

امام اعظم کے پوتے اسماعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ امام اعظم کسی قدر دراز قد تھے ۔ آپ کے رنگ پر گندم کوئی غالب تھی ۔ اچھا لباس پہنتے ، عام زندگی میں اچھی حالت میں رہتے ، خوشبو کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل و حرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہوتا تھا یہ

امام اعظمؒ تابعی ہیں

اللہ سبحانہ کی مخلوقات میں سب سے برتر حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔
بعد از خدا بزرگ تو فی قصہ مختصر

آپ کے بعد اولوالعزم من الرسل ہیں ان کے بعد باقی انبیاء کا مقام ہے۔ انبیاء کے بعد صحابہ کرام
اور صحابہ کے بعد تابعین عظام سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔

اسلام میں صحابہ کا مقام

صحابہ اور تابعین کو قرآن حکیم میں اللہ سبحانہ نے اپنی دائمی خوشنودی کا پروانہ عنایت فرمایا ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ
اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے

اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی خوبی کے ساتھ پیروی کی۔ اللہ ان سے راضی
ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ جن مہاجرین نے ہجرت میں اولیت اور سبقت کا ثمر
حاصل کیا اور جن انصار نے نصرت و اعانت میں پہل کی اور وہ لوگ جنہوں نے نیکو کاری اور حسن نیت
سے ان پیش رو ان اسلام کی پیروی کی ہے۔ ان سب کو اللہ سبحانہ کی خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے۔
قرآن کی یہ آیت صحابہ کی عدالت، ثقاہت، صداقت اور دیانت کی کھلی شہادت ہے اور یہ
ایک ایسی حقیقت ہے جس پر مدار اسلام ہے اور ان پر جرح کرنا دین کی پوری عمارت گرا دینے
کے مترادف ہے۔

چنانچہ ملا علی القاری فرماتے ہیں:

سے اولوالعزم من الرسل کی تعداد میں علماء کا اختلاف ہے حافظ سیوطی نے قول صحیح کے مطابق پانچ بتائے ہیں
نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

اولوالعزم نوح و الخلیل المجد و موسیٰ و عیسیٰ و الحبیب محمد

الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُولٌ مُطْلَقًا يَطَوَّاهُ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ
وَالْجَمَاعُ مَنْ يَعْتَدِلُ بِهِ

تمام صحابہ بلا قید عادل ہیں۔ قرآن و سنت اور امت کی جماعتی قوت کا
تقاضا یہی ہے۔

امام ابن الاثیر عز الدین علی بن محمد الجوزی رحمہ فرماتے ہیں:
الصَّحَابَةُ يُشَارِكُونَ سَائِرَ الْمَلَائِكَةِ فِي جَمِيعِ ذَلِكَ إِلَّا فِي
الْجُرْحِ وَالتَّعْدِيلِ فَإِنَّهُمْ كُلُّهُمْ عَدُولٌ
صحابہ ان تمام میں راویوں کے شریک ہیں لیکن ان کی جرح و تعدیل سے
بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عادل ہیں۔

۱۔ مرقات ج ۵ ص ۵۱۷۔ ۲۔ عدول عادل کی جمع ہے۔ عدالت عربی زبان کا مصدر ہے اس کے خاص معنی ہیں
اس لیے اس کے اصطلاحی اطلاقات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔
۱۔ عدل ظلم و جور کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اس وقت اس کے معنی معاملات و حقوق میں انصاف برتنے
کے ہیں مثلاً سلطان عادل، حکومت عادلہ، یہ علم الاجتماع کی اصطلاحی عدالت ہے۔
۲۔ عدل فسق و عصیان کے مقابلے میں بھی بولا جاتا ہے کہتے ہیں نماز میں امام عادل ہو یعنی متقی ہو فاسق نہ ہو
یہ فقہاء کی اصطلاح ہے۔

۳۔ عدل کے معنی اس ملکہ کے بھی آتے ہیں جو گناہوں سے دور رکھے یہ علم کلام کی اصطلاح ہے۔
۴۔ عدل کے معنی گناہوں سے محفوظ ہونے کے بھی آتے ہیں یہ خالص علم تصوف کی اصطلاح ہے۔
۵۔ عدل کے معنی بالا راہ روایت میں جھوٹ سے بچنے کے آتے ہیں یہ اصطلاح محدثین ہے اور یہی معنی اس
وقت مرد ہوتے ہیں جب حدیث کے فن میں راویوں کی عدالت کا دعویٰ کیا جاتا ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے
ہیں۔ پوری تلاش و جستجو کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صحابہ کرام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹ کو سخت
گناہ اور عیب سمجھتے تھے اور اس سے بیکر محتاط رہتے تھے اس لیے عدالت نام ہے روایت میں جھوٹ سے بچنے اور
ہر ایسے عمل سے دور رہنے کا جس سے روایت پر کوئی حرف آتا ہو۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر الروض الباسم میں امام شافعی
سے نقل کرتے ہیں کہ اگر عادل بے گناہ کو کہتے ہیں تو پھر انبیاء کو مستثنیٰ کرنے کے بعد پورے انسانی معاشرے میں کوئی
عادل نہیں ہے اور اگر گنہگار عادل ہے تو پھر مجروح و مقدوح کوئی نہیں اس لیے عادل وہ ہے جس کا دامن
(باقی ص ۱۳۳ پر)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ
قَالَ الْقَرْنُ الَّذِي أَنَا فِيهِمْ ثُمَّ الثَّانِي ثُمَّ الثَّالِثُ
ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے
اچھے لوگ کون ہیں؟ فرمایا میرے زمانے کے پھر دوسرے کے پھر تیسرے کے۔
حضرت امام محمد بن ابی الدین البزکری النودوی خیر القرون کی حدیث پر نوٹ لکھتے ہیں:
وَرَدَّتْ يَهْيَءُ أَنَّ حَضْرَةَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادُوا رُحَابَهُ كَازِمَانِهِ دَوْرًا
تَابِعِينَ كَاتِمِينَ اتِّبَاعَ تَابِعِينَ كَاتِمِينَ

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ
مراد ہے۔

جناب علامہ مولانا صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

یہی صدرِ اول اور سلف صالح ہیں۔ ان ہی کو ہر موضوع پر بطور دلیل
پیش کیا جاسکتا ہے ان ہی پر دین کی زندگی میں اعتماد ہے۔ دینی
زندگی کے سائے احوال، اعمال، اخلاق اور احکام میں یہی سند ہیں۔
ان تینوں دوروں میں دورِ اول یعنی زمانہ صحابہ (جو آج تک ہے) کمالِ علم، کمالِ ایمان
کے لحاظ سے دوسرے اور تیسرے دور سے افضل ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:-
قرنِ اول کمالِ علم اور کمالِ ایمان میں ایسے مقام پر تھا کہ قرنِ ثانی اور
قرنِ ثالث کی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی۔
ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

ان تینوں دوروں میں بہترین دورانِ لوگوں کا ہے جن کی نگاہوں

۱۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱۰ ۲۔ شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۹

۳۔ فتح الباری ج ۱ ص ۲۲ ۴۔ المحطہ ص ۲۲

۵۔ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص ۱۳۷

نے جمالِ جہاں آرا کا بحالتِ ایمان مشاہدہ کیا ہے یہی لوگ حق و باطل میں
 فرق کو سب سے زیادہ جاننے والے، حق کے سب سے زیادہ ماننے والے،
 حق کے سب سے زیادہ فریفتہ، باطل کے بیری اور حق کی خاطر سب سے
 زیادہ جان کھپانے والے ہیں۔ بعد میں آنے والوں کے مقابلے میں علم و
 دیانت، سرفروشی و حق آشنائی، حق پذیری اور حق کی خاطر مصائب کے
 استقبال میں سب سے پیش پیش ہیں یہ

حضرت امام اعظم کی پیدائش دورِ نبوت یعنی ۶۹۹ھ میں ہوئی ہے۔ آخری
 صحابی کی وفات کے وقت یعنی ۱۱ھ میں آپ کی عمر تیس سال ہے اور اگر حافظ سمعانی، حافظ

لے النبوات ص ۸۵۔ یاد ہے کہ جمہور کا تو یہی خیال ہے کہ قرنِ اول سے زمانہ صحابہ قرنِ ثانی سے زمانہ تابعین
 اور قرنِ ثالث سے زمانہ اتباع تابعین مراد ہے لیکن ازالۃ الخفاء میں حکیم الامت نے جدید تحقیق فرمائی ہے کہ قرنِ اول
 زمانہ آنحضرتؐ بود از ہجرت تا وفات و قرنِ ثانی زمانہ شیخین و قرنِ ثالث زمانہ ذی النورین، ایک دوسرے موقعہ
 پر فرماتے ہیں کہ قرنِ اول زمانہ ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم است تا زمانہ وفات و قرنِ ثانی از ابتداء
 خلافت صدیق تا وفات فاروق و قرنِ ثالث قرنِ حضرت عثمان، شاہ صاحب نے جمہور سے الگ اپنے اس
 دعوے کی توجیہ یہ بتائی ہے کہ قرنِ لغت میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو عمر میں قریب قریب ہوں اور عرف
 میں ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو ریاست و خلافت میں قریب قریب ہوں۔ جب خلیفہ دوسرا ہو اور وزیر دوسرا
 بھی دوسرا ہو فوجی انسپراجی اور شہری بھی اور ہوں تو قرن بدل جاتا ہے (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۸۴) یہ تو لغت اور عرف
 کے لحاظ سے قرن کی توجیہ ہے اس کے علاوہ جو محدثانہ تحقیق فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمایا ہے فرماتے ہیں۔ جب ہم
 ان تمام روایات کو جو عبارت میں مختلف اور مقصود میں متحد ہیں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قرونِ ثمانیہ سے اسی
 مدت کی تفصیل کی ہے اور اس مدت کو تین قرون میں تقسیم کر کے ان کی تعریف صرف اس لیے کی ہے کہ ان قرون کے مدبر اور
 صاحبانِ حکومت بے حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور اعمالِ نیک کی اشاعت اور غلبہ اسلام کے بارے میں اللہ سبحانہ کا وعدہ ان قرون
 میں پروان چڑھا (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۶۶) شاہ صاحب کی یہ تحقیق از روئے لغت بالکل جچی تلی ہے اور اس تحقیق کی
 رو سے جن حدیثوں میں زمانہ صحابہ و تابعین میں فتنوں کی خبر دی گئی ہے ان میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی ہے اور
 چونکہ جمہور علماء نے ان تین قرون سے دوسری کچھ مراد لیا ہے جسے ہم نے کتاب میں اختیار کیا ہے اس لیے ان کو ان تمام
 حدیثوں میں تاویل کی راہ اختیار کرنی پڑی ہے اور ان تمام حدیثوں کے لیے مطالب کے نت نئے جملے بنائے جن میں
 صحابہ اور تابعین کے زمانے میں فتنوں کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

ابن حبان، حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کی پیش فرمودہ تاریخ ولادت ۱۶۱ھ پر اعتماد کیا جاتے تو آپ کی عمر ۵۵ سال ہو چکی ہے۔ اگر ۱۶۱ھ ہی کو مان لیا جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عمر کی تیس بہاریں دیکھنے کے باوجود آپ نے کسی صحابی کی زیارت نہیں کی جبکہ ابو الطفیل جنگ اُحد والے دن پیدا ہوئے آٹھ سال زمانہ نبوت پایا کوفہ میں قیام کیا حضرت علیؓ کے ساتھ تمام مشاہد میں شریک ہے اور حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق ۱۶۱ھ میں وفات ہوئی۔ حافظ ابن حجر بھی امام ذہبی کے تقریب میں ہمنوا ہیں۔

مَاتَ سَنَةَ عَشَرَ وَ جُمُعَةَ ۱۶۱ھ میں وفات پائی ہے۔

اس وقت حضرت امام اعظم کی عمر تیس سال تھی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ابو الطفیل شہادت علی رضی اللہ عنہ کے بعد مکہ تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوا تو حضرت امام اعظم سولہ سال کی عمر میں حج کو تشریف لے گئے وہاں ابو الطفیل موجود تھے زیارت نہ ہونا ایک حیرت والی بات ہے اور اگر یہ درست ہے کہ ابو الطفیل نے کوفہ ہی میں باقی زندگی گزار دی تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک شخص ایک شہر میں پورے تیس سال گزارے اور اس شہر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی موجود ہوں مگر زیارت نہ ہو۔

محدثین کی زبان میں تابعی

سب مانتے ہیں کہ امام اعظم نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور حافظ ذہبی، حافظ عسقلانی، ہسافل قسطلانی، حافظ دارقطنی، ابن الجوزی، خطیب بغدادی، ابن سعد، قاضی ابن خلکان، امام یافعی، شیخ ابن حجر مکی، شیخ بیہقی اور حافظ توریشی کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ امام اعظم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے اور جیسا صحابی ہونے کے لیے بحالت ایمان ذات نبوت کا دیدار کافی ہے ایسا ہی تابعی ہونے کے لیے صرف صحابی کا دیکھ لینا کافی ہے۔ روایت نہ تابعی ہونے کے لیے شرط ہے اور نہ صحابی ہونے کے لیے، خود امام بخاری نے صحیح میں صحابی کی یہ تعریف کی ہے کہ

مَنْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ رَأَاهُ

مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَهُوَ مِنْ أَصْحَابِهِ لَہ
جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یا دید کا شرف بحالت ایمان
حاصل ہو وہ صحابی ہے۔

اور یہ تعریف ارشادات نبوت سے لی گئی ہے۔ ترمذی میں ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم سے سنا ہے کہ کسی ایسے مسلمان کو آگ نہ لگے گی جس نے مجھے
دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا لہ

صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت جابرؓ نے بحوالہ حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کی ہے :
حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ان میں سے لشکر روانہ
کیا جائے گا وہ کہیں گے دیکھو کیا تم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
کے صحابہ میں سے کوئی ہے اگر ہو گا تو اس کی برکت سے ان کو فتح
ہوگی۔ پھر دوسرا لشکر روانہ کیا جائے گا وہ کہیں گے خَلِّ فِيهِمْ
مَنْ رَأَى أَصْحَابَ النَّبِيِّ؟ کیا ان میں کوئی حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم کے صحابہ کو دیکھنے والا ہے پس ان کی فتح ہوگی، پھر تیسرا لشکر
روانہ کیا جائے گا کہا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے
جس نے اصحاب نبوت کی زیارت کرنے والوں کو دیکھا ہو۔ لہ

اس ارشاد نبوت سے صحابی اور تابعی کی تعریف واضح ہو کر سامنے آگئی کہ نبوت کی دید کا
جسے بحالت ایمان شرف حاصل ہو وہ صحابی ہے اور اس میں تمام محدثین یک زبان ہیں۔ اس موضوع
پر محدثین کی بھی دورائیں نہیں ہوتی ہیں ایسے ہی جن آنکھوں نے صحابہ کو مسلمان ہونے کی حالت
میں دیکھا ہو وہ تابعی ہے لہ

لہ صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۸۷ لہ ترمذی ص ۲۴۸ لہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۲۲
لہ بعض لوگوں کو کتابوں میں تابعی کی یہ تعریف پڑھ کر مَنْ لَقِيَ الصَّحَابِيَّ... الخ غلط فہمی ہو گئی ہے
اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ دیکھنے والا تابعی نہیں بلکہ ملاقات کرنے والا تابعی ہے لیکن وہ اگر تقارکے
(باقی ص ۱۳۹ پر)

حافظ ابن حجر عسقلانی کی رائے

حافظ ابن حجر عسقلانی سے کسی نے دریافت کیا کہ امام اعظم تابعی ہیں یا نہیں؟ حافظ صاحب نے اس کا جواب دیا ہے حافظ ابن حجر مکی نے النجرات الحسان ص ۲۱ پر ملا علی قاری نے شرح مسند امام اعظم ص ۲۸۴ پر اور حافظ جلال الدین سیوطی نے تبصیر الصغیرہ ص ۵۰۴ پر نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

امام اعظم نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے کیونکہ آپ کی تاریخ ولادت سنہ ۶ کو فہ میں ہے۔ کو فہ میں اس وقت حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ موجود تھے کیونکہ ان کی وفات بالاتفاق بعد میں ہوئی، بصرے میں حضرت انس بن مالکؓ تھے ان کی وفات سنہ ۶ کے بعد ہوئی۔ ابن سعد نے ایک بے غبار سند سے یہ بیان درج کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے ان دو کے علاوہ اور بھی صحابہ بقید حیات تھے، بعض اکابر نے صحابہ سے امام صاحبؒ کی روایت کے موضوع پر کچھ رسائل بھی لکھے ہیں لیکن ان کی سندیں ضعیف سے خالی نہیں ہیں۔ بہر حال اتنی بات معتمد اور طے شدہ ہے کہ آپ نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور ابن سعد کی تصریح کے مطابق یہ بھی امر واقعہ ہے کہ کچھ صحابہ کرام کی زیارت کا امام ابوحنیفہؒ کو شرف حاصل ہے اس لحاظ سے امام صاحبؒ کا شمار طبقہ تابعین میں ہے اور یہ شرف امام صاحبؒ کے سوا امام صاحبؒ کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہیں ہے۔ نہ امام اوزاعیؒ کو شام میں نہ حماد بن زیدؒ اور حماد بن سلمہؒ کو بصرہ میں نہ سفیان ثوریؒ کو کو فہ میں نہ امام مالکؒ کو مدینہ میں نہ امام مسلم بن خالدؒ کو مکہ میں اور نہ لیث بن سعدؒ کو مصر میں بلکہ

سہ یہ جو فرمایا کہ ان کی سند ضعیف سے خالی نہیں تو اس سے غلط فہمی نہ ہو جائے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضعیف الاسناد ہے یہ نہیں ہے کہ ثابت نہیں ہے تدریب میں حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ اگر بسند ضعیف ہو تو ہم اسے ضعیف الاسناد تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کے ہونے کا انکار نہیں کر سکتے اگر اس کے خلاف کوئی شہادت (باقی ص ۱۲۱ پر)

اسی قسم کا ایک اور سوال حافظ ولی الدین عراقی کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا امام اعظمؒ تابعی ہیں؟ حافظ عراقی نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ حافظ سیوطی نے تبیض الضعیفہ میں نقل کیا ہے۔ اس میں حافظ عراقی نے صاف اقرار کیا ہے کہ اگر صحابی کے دیکھنے کا نام تابعیت ہے تو امام ابوحنیفہؒ کا شمار بلاشبہ تابعین میں ہے اور کوئی نہیں جو اس بنیاد کو مان کر امام اعظمؒ کی تابعیت کا انکار کر سکے۔

حافظ زین الدین عراقی کا تبصرہ

علامہ محی الدین نووی نے تقریب میں نسوع الحادی والاربعون میں روایت الا کا بر عن الاصاغر پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑوں کا چھوٹوں سے استفادہ کی ایک قسم یہ بتاتی ہے کہ ایک شخص تابعی ہو کر کسی ایسے شخص سے روایت لے جو تابعی نہیں ہے جیسے عمرو بن شعیب کہ یہ تابعی نہیں ہیں لیکن تابعین نے ان سے روایات لی ہیں۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے باوجود تابعی ہونے کے عمرو بن شعیب سے استفادہ کیا ہے ان کی تعداد حافظ عراقی نے پچاس سے زائد بتاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ

وعدہم المحافظ العراقي ابو الفضل نيفاد خمسين^۱
حافظ عراقی نے ان کو پچاس سے زیادہ شمار کیا ہے۔

فقہ^{۱۴۳} کا بقیہ حاشیہ، نہ ہو تو وہ قابلِ پذیرائی ہے حافظ ابن قیم نے اعلام میں لکھا ہے کہ الاصل الرابع، لاخذ بالمرسل والحدیث الضعیف اذا لم یکن فی الباب شیئاً یفدہ من سائے وفتر حدیث ورجال میں ایسی کوئی شہادت نہیں جس میں کوئی امام کے متعلق یہ بتائے کہ آپ نے صحابہ کو نہیں دیکھا ہے بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اصحابہ اثبتوہ بالاسانید الصحاح والحسان اور اصولاً یہی راجح ہے۔

۱۵ پورا نام احمد بن عبد الرحیم بن الحسین ہے ولی الدین لقب ابو زرعہ کنیت ہے اپنے والد زین الدین عراقی کے ہاتھوں پروان چڑھے ہیں ۲۲۰ھ میں ولادت ہوئی، ۳ سال کی عمر میں ان کو ان کے والد دمشق لے گئے، جوان ہوئے مصر آ گئے، یہاں کے مشائخ سے استفادہ کیا دوبارہ دمشق گئے اور وہاں کے مشائخ سے فیض یاب ہوئے ان کو یہ شرف ہے کہ ان کی جلد مرویات اور مصنفات کا ان سے ان کے اکابر اور بزرگوں نے سماع کیا۔ فقہ، اصول، معانی و بیان ادب عربی میں کمال حاصل تھا۔ نوجوانی ہی میں منہ تدیس پر بیٹھ گئے تھے ان کی تصانیف میں کافی کتابیں ہیں ان کا بسوط ترجمہ ابن فہد نے لمخط الا لحاظ ارض ۲۸۴ تا ۲۹۰ لکھا ہے۔ ان کی وفات، اشعبان ۳۲۰ھ کو ہوئی۔

۱۶ پورا نام عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمن الکمری الرزبانی ہے، حافظ ابن فہد نے لمخط الا لحاظ میں اور حافظ (باقی ۱۴۳ پر)

اس کے بعد حافظ عراقی کے بیان کردہ تابعین کے ناموں کی یہ فہرست دی ہے ابراہیم بن یسیر، یوب
 السخنی، یحییٰ بن الاشج، ثابت بن عجلان، ثابت البنانی، جریر بن حازم، حبان بن عطیہ حبیب ابن ابی
 موسیٰ، جریر بن عثمان، المحکم بن عقیہ حمید الطویل، داؤد بن قیس، داؤد بن ابی ہند الزبیری، عدی، سعید
 بن ابی ہلال، سلمہ ابن دینار سلیمان الشیبانی، سلیمان الاعمش، عاصم الاحوال، عبد اللہ بن عبد الرحمن الطائفی
 عبد اللہ بن عون، عبد اللہ بن ابی علیک، عبد الرحمن بن حرطہ عبد الغزیز بن رفیع عبد الملک بن بختہ سج، عبد اللہ
 العمری، عطاء ابن ابی رباح عطاء ابن السائب، عطاء الخراسانی، العلاء ابن الحارث، علی بن المحکم، عمرو بن دینار،
 ابو اسحاق السبعی، قتادہ، محمد بن اسحق، محمد بن مجاہد، محمد بن عجلان ابو الزبیر، زہری، مطر الوراق، مکحول،
 موسیٰ ابن ابی حاتم، ابو حنیفہ النعمان بن ثابت، ہشام بن عروہ، ہشام بن الغار، وہب بن منبہ سجی
 ابن ابی کثیر، زید بن ابی حبیب نے عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے ان تابعین میں امام اعظم کا بھی
 اسم گرامی موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم حافظ عراقی کے نزدیک تابعی ہیں۔ یاد رہے کہ حافظ
 عراقی فن حدیث میں بڑے پائے کی شخصیت ہیں۔

علامہ قسطلانی کی رائے

علامہ قسطلانی نے امام اعظم کو تابعین کے زمرے میں شمار کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-
 ہذا مذہب المجہود من الصحابہ کا بن عباس و علی و معاویہ و انس بن مالک و
 خالد و ابی ہریرہ و عائشہ و ام ہانی و من التابعین الحسن البصری و ابن
 سیرین و الشجی و ابن المسیب و عطاء و ابو حنیفہ و من الفقہاء ابو یوسف
 و محمد و الشافعی و مالک و احمد علیہ

صلۃ کا بقیہ حاشیہ ۱۔ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے عزالدین بن جعفر فرماتے تھے کہ مصر
 میں ان کے سوا کوئی حدیث دانی کا دعویٰ کرتا ہے وہ صرف مدعی ہے علامہ سبکی، العلائی اور ابن کثیر نے ان کی بے حد تعریف کی ہے
 ان کی تصانیف میں الفیہ اس کی شرح، تحزیب احیاء تکملہ شرح الترمذی وغیرہ ہیں۔ ابن فہد لکھتے ہیں کہ تین سال کی عمر میں
 سایہ پردی سے محروم ہو گئے تھے ۸۰ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا علم حدیث انہوں نے الشیخ علاؤ الدین ابن الترمکانی
 الحنفی سے حاصل کیا اور ان سے ہی حدیث کی دستاویز فیضیت لی تحصیل علم کے لیے سفر کی صنعتیں برواشت کیں۔
 بہت غریبوں، فضیلتوں اور بزرگیوں کا سرمایہ تھے۔ بدھ کے دن ۸ شعبان ۸۰۰ھ میں بمقام قاہرہ اللہ کو پہاڑے
 ہو گئے تعذہ اللہ برحمتہ۔ لے ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۸۲

یہ تمام صحابہ تابعین اور فقہاء کا مذہب ہے صحابہ جیسے ابن عباسؓ، علیؓ، معاویہؓ، انسؓ، خالدؓ، ابو ہریرہؓ، عائشہؓ، ام ہانیؓ، تابعین میں جیسے حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، شعبیؒ، ابن المسیبؒ، عطاءؒ اور ابو حنیفہؒ اور فقہاء میں جیسے ابو یوسفؒ، محمدؒ، شافعیؒ، مالکؒ اور احمدؒ۔

اس میں امام اعظم کا تابعین کے زمرے میں صاف تذکرہ موجود ہے۔
محمد ثنین میں سے حافظ ابو عمرو بن عبد البر کی شخصیت سے کون ناواقف ہے، موصوف نے حضرت انسؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابی عبد اللہ بن الحارث بن جرز کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے۔

إِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ رَأَى أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ الْحَارِثِ
بْنِ جَزْءٍ۔

امام ابو حنیفہ کو حضرت انس بن مالک اور حضرت عبد اللہ کی دید کا شرف ہے۔
عبد اللہ بن حارث کی حدیث پر تفصیلی کلام انشاء اللہ آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی بیش بہا تصنیف الانصار میں لکھا ہے کہ
مات عبد اللہ بن الحارث بن جزء سنة سبع وتسعين لله

یاد رہے کہ حافظ ابو بکر الجعابی اپنے وقت میں علل حدیث اور تاریخ رجال کے بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ مشہور محدث دارقطنی ان کے شاگرد ہیں۔ ابو علی نیشاپوری کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ حافظ حدیث کوئی نہیں دیکھا۔ ان کو چار لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے درس حدیث میں اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ گھر، گلی، شاہراہوں پر انسان ہی انسان ہو جاتے تھے۔ ابو الفضل القحطان کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابو بکر الجعابی کی زبانی سنا ہے کہ میں جب رقعہ پہنچا وہاں میرے پاس حدیث کی کتابوں کا گٹھا تھا۔ ایک روز ملازم غمگین صورت بنائے ہوئے آیا، بولا کہ آپ کی ساری کتابیں ضائع ہو گئیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں ان میں صرف دو لاکھ حدیثیں تھیں وہ سب مجھے زبانی یاد ہیں۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ علل رجال کے امام تھے۔

یہ امام اعظم کے بارے میں دید کی شہادت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مثبت دعویٰ ہے اس کے

مقابلے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ایک منفی چیز ہے۔ اُصولی طور پر مثبت کو منفی پر مقدم ہونا چاہیے۔ امام بخاری نے جزء رفع یدین میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ ایک بات کے بیان کرنے والے دو شخص ہوں۔ ایک کہے میں نے کرتے دیکھا ہے دوسرا کہے میں نے نہیں دیکھا ہے۔ ان میں مثبت شاید ہے نافی شاید نہیں ہے کیونکہ اسے کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ عبد اللہ بن زبیر کہتے ہیں دو شاہدوں نے گواہی دی ایک نے کہا حمید نے اقرار کیا ہے کہ اس کے ذمہ ایک ہزار روپیہ ہے، دوسرا کہتا ہے کوئی اقرار نہیں کیا جو شخص مثبت کا اظہار کر رہا ہے وہ شاید ہے اسی کو اپنا یا جائے گا۔ یا مثلاً بلال کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اور فضل بن عباس کہتے ہیں کہ آپ نے نماز نہیں پڑھی، بلال کی بات کو قبول کیا جائے گا کیونکہ یہ شہادت ہے اور نافی کی بات ناقابل التفات ہے۔

لیجئے اسی تراذ میں امام اعظم کی تابعیت کے معاملے کو تول کر دیکھ لیجئے۔ ایک طرف حافظ ذہبی اور ابن سعد سیف ابن جابر کی زبانی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ امام اعظم نے انس بن مالک کو دیکھا ہے اور دوسری طرف یہ کہنے والا کوئی نہیں کہ، نہیں دیکھا، اگر بالفرض ایسی کوئی بات ہوتی بھی ہو تو پھر بھی کہا جاسکتا تھا کہ مثبت شاید ہے اسی تراذ میں روایت کے مسئلہ کو بھی تول لیجئے۔ ایک طرف کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ امام اعظم نے صحابہ سے روایت کی ہے اس کے مقابلے میں دارقطنی صدیاں گزرنے پر کہتے ہیں کہ امام اعظم نے روایت نہیں کی، فرمائیے امام بخاری کے پیش کردہ ضابطہ کے مطابق شاید کون ہے؟ وہ جو وجود کا پتہ دے رہا ہے یا وہ جو نہیں، نہیں کر رہا ہے آپ ہی انصاف فرمائیے۔

الغرض امام اعظم کا زمانہ صحابہ میں ہونا اور حضرت انس کا دیکھنا محدثین کے یہاں اتفاق ہے اس لیے وہ یقیناً تابعی ہیں اور تابعی ہونے کی وجہ سے اللہ سبحانہ کے اس ارشاد کا مصداق ہیں۔
 وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ۔
 کیونکہ اس آیت میں مہاجرین و انصار سے جمیع صحابہ مراد ہیں چنانچہ حمید بن زیاد کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے محمد بن کعب قرظی سے صحابہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں تمام صحابہ کی بخشش کا اعلان کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کہاں؟ فرمایا کیا تم نے

قرآن نہیں پڑھا۔ قرآن میں ہے والسا بقون... الخ اس آیت نے تمام صحابہ کرام کو بخشش کا شرف ٹھیک کر دیا ہے البتہ تابعین کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ احسان کے ساتھ صحابہ کے پیروکار ہوں، اس لیے اس آیت نے مسلمانوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک صحابہ دوسرے وہ جو احسان کے ساتھ صحابہ کے تابعین ہوں اور دونوں کے لیے اس آیت میں چار اہم بانٹان وعدے کیے گئے ہیں۔

اول یہ کہ اللہ سبحانہ ان سے راضی ہو گیا۔

دوم یہ کہ صحابہ اور تابعین اللہ سے راضی ہو گئے۔

سوم یہ کہ وہ جنتی ہیں۔

چہارم یہ کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

امام اعظم تابعی ہونے کی وجہ سے ان تمام وعدوں کے مصداق ہیں اور یہ شرف آپ کے سوا ائمہ اربعہ میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے امام اعظم کو دوسرے اماموں پر مقدم کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے۔

لَا نَسْتَعِزُّكَ عَصْرَ الْقَعَابَةِ دَرَأَى أَشْيَ بَنِي مَالِكٍ

امام اعظم کا زمانہ طلب علم

امام اعظم کے بچپن کا زمانہ علوم کے لیے نہیں بلکہ فنون کے لیے باغ و بہار کا زمانہ تھا۔ آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو شہر مطابق شہر عریں ولید بن عبد الملک سریر آرائے حکومت ہوا بنو امیہ کا آفتاب اقبال اس وقت نصف النہار پر تھا۔ ولید خلافت اموی کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ فتوحات ملکی اور رفاد عامہ کے کاموں کی جو سرپرستی ولید نے اپنے دور حکومت میں کی ہے۔ بنو امیہ میں سے کسی نے کم ہی کی ہوگی۔ ولید کی حکومت کا دائرہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں حجاز و عراق سے افریقہ، شام، ایشیائے کوچک، ترکستان، ایران، افغانستاں اور پاکستان میں شہر ملتان تک پھیلا ہوا تھا۔ حسن اتفاق سے ولید کو تین کارآمد اور مفید سپہ سالار مل گئے تھے۔ قتیبہ بن مسلم الباہلی جس کے ذریعے ایشیا کے قلب تک اسلامی فتوحات پہنچیں، موسیٰ بن نصیر جس کے ذریعے اندلس میں جبرالٹر تک اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع

ہوا، اور محمد بن قاسم جس کے ذریعے پاکستان میں ملتان تک اسلامی فتوحات کا پھر ریا لہرایا۔
 غرض ایک ہی وقت میں مسلمانوں کی فوجیں مشرق و مغرب، شمال، جنوب میں فتح و نصرت کے
 پرچم اٹھا رہی تھیں اس کے بعد مسلمانوں کو ایسا کامیاب دور دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ ولید کا زمانہ
 حکومت ۳۵ سے ۴۶ء تک ہے اور یہی دور امام اعظم کے چھٹنے اور لڑکپن کا دور ہے
 یہ سارا زمانہ امام اعظم نے کوفہ میں گزارا ہے۔

کوفہ کی مرکزی حیثیت

کوفہ کی علمی حیثیت کیا ہے؟ اس پر تفصیلی بحث تو امام اعظم کے اساتذہ حدیث کے سلسلہ میں
 آئے گی مگر اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ داوی و جبلہ اور فرات کا جنوبی حصہ جسے علماء جغرافیہ
 عراق کہتے ہیں ایک خوشگوار، سرسبز و شاداب علاقہ اور تین ہزار سالہ مدینیت و تہذیب کا گہوارہ
 ہے بابلویوں آشوریوں کلدانیوں فارسیوں اور یونانیوں کی جڑ لگامگاہ رہا ہے۔ زمانہ خلافت فاروقی
 میں اس پر پرچم اسلام لہرایا تو مسلمانوں نے اپنے عہدِ مدین میں دو نئے شہر بسائے، کچھ تو اس لیے
 کہ مدائن دار الخلافہ کی آب و ہوا ان کو راست نہ آئی تھی اور کچھ اس لیے کہ ممالکِ محروسہ کا تعلق
 مدینہ طیبہ سے انتظامی طور پر حمل و نقل کے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے مشکل رہتا۔ حضرت
 فاروق اعظم نے شہرِ بسانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل فرمائی اس کمیٹی کے حسبِ ذیل ارکان تھے۔
 حضرت سعد بن وقاص اللیثی، حضرت سلمان فارسی، اور حضرت خذیفہ بن الیمان، ان حضرات
 نے شہر کے لیے دریائے فرات کا کنارہ تجویز کیا۔ رپورٹ مرکزی حکومت کو پیش ہونے پر شہر
 بسانے کی اجازت ملی۔ منظوری ہو جانے پر محرم الحرام ۳۸ھ جنوری ۶۳۸ء کو حضرت سعد بن
 وقاص جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں مدائن چھوڑ کر کوفہ آئے اور آپ کے ساتھ چالیس ہزار نفوس
 کوفہ میں آباد ہوئے۔

عدد ہزار بعون الفاء ان کی تعداد چالیس ہزار ہے۔

اولین رہائش کے لیے خیمے اور چھپر اختیار کیے گئے۔ لیکن خیموں اور چھپروں کے یہ
 گھر دندے آئے دن آگ کی تباہ کاریوں کا شکار رہتے تھے اس لیے کچھ عرصہ بعد حضرت فاروق اعظم

نے پختہ عمارت کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے پر عراقی تمدن کے مطابق حضرت ابو الہیاج الاسدی کو پورے شہر کا سروے کرنے پر مقرر کیا گیا۔ آپ نے بڑی محنت سے شاہراہوں، کوچوں، گورنمنٹ ہاؤس اور جامع مسجد کے لیے پلاٹ مقرر کیے۔ نقشہ اس طرح ترتیب دیا کہ شہر کے مرکزی مقام پر جامع مسجد ہو، جامع مسجد سے چاروں طرف چوڑی چوڑی سڑکیں ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے سڑکوں کی چوڑائی چالیس ہاتھ یعنی ساٹھ فٹ اور گلیوں کی گیارہ فٹ لکھی ہے یہ اور جامع مسجد کے بڑے دروازے کے سامنے کافی فاصلہ پر گورنمنٹ ہاؤس بنایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی عظیم الشان ترقی کی کہ مدائن کے خزانے، بابل و بصرہ کا تمدن اور عربی تہذیب یہاں اُمٹ کر آگئی حتیٰ کہ لفظ عراق کا مفہوم ہی کوفہ بن گیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ الطبری نے لکھا ہے کہ کوفہ کے تمدن جدید اور قبول کی داستانیں سن کر تمام عرب میں یہاں آباد کاری کے لیے ایک دلولہ پیدا ہوا۔ حضرت عقبہ نے انس بن جحبہ کو حضرت فاروق اعظم کے پاس روانہ کیا۔ حضرت فاروق نے ان سے پوچھا کہ کوفہ میں مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ اس کا جواب جو انہوں نے دیا وہ سننے کے لائق ہے فرمایا کہ :

انثالت علیہم الدنیا فہم یہیلون الذہب والفضة

ان پر دنیا بے پڑی اس لیے وہ سونا اور چاندی بہا رہے ہیں۔

یہ تو آپ سن چکے ہیں کہ کوفہ میں آباد کاری کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص کے ساتھ چالیس ہزار حضرات تھے۔ ان میں صحابہ کس قدر تھے۔ تصریح تو نہیں ملتی ہے مگر حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں علم اتین چھوڑنے کے اسباب بتاتے ہوئے جو یہ فقرہ لکھ دیا ہے کہ

ان الصحابة استخرجوا المدائن صحابہ کو مدائن کی آب و ہوا موافق نہ آتی

تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری تعداد ہی صحابہ کرام پر مشتمل تھی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پوری تعداد نے کوفہ کو وطن بنا لیا ہو۔ اگرچہ کوفہ کے تمدن اور قبول کو دیکھ کر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ صحابہ کا یہ جم غفیر اسی جگہ آباد ہوا ہو، لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات واپس ہو گئے ہوں مگر حافظ سخاوی کے بیان سے پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے وہ حافظ ذہبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں :

لے البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۷۵ لے تاریخ اسلام سیاسی ج ۱ ص ۱۰۱ لے فجر الاسلام ص ۱۸۰

لے تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۴۱

کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت علی ابن ابی طالبؓ جیسے حضرات نیز صحابہ کرام کی ایک خلقت یہاں آکر اتر ہی گئے۔

اس موضوع پر ان بزرگوں نے یہ اپنے علم کی حد تک بتایا ہے اور اسی لیے خیالات مختلف ہیں۔ چنانچہ امام حاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں ان مشاہیر کے نام لکھے ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ طیبہ سے دوسرے اسلامی شہروں میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے کوفہ سے ابتدا کی ہے اور سب سے زیادہ اسی جگہ آنے والوں کی تعداد بتائی ہے حافظ ابوبشر دولابی نے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص اور پچاس وہ بزرگ کہ جو غزوہ بدر میں آپ کے ہمراہ تھے کوفہ میں فروکش ہوئے۔ امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ نے اپنی تاریخ میں اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ آکر آباد ہوئے۔

حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابوبشر دولابی اور امام ابوالحسن عجمی کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے، صحابہ کی تعداد تو زیادہ ہی ہے مگر تبعین عدد ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق کی ہے۔ خود صحابہ کی تعداد کے بارے میں علماء کا ایسا ہی اختلاف ہے۔ حافظ ابوزر عہ نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے حافظ ابن عبدالبر نے حجۃ الوداع میں شریک ہونے والے صحابہ کی تعداد ۹۰ ہزار لکھی ہے۔ حافظ ابن حزم نے ایک لاکھ بتیں ہزار لکھی ہے اور شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو تعداد بتائی ہے وہ بھی سن لیجئے :

شَدَّ خَرَجَ إِلَى الْحَجِّ وَحَصَرَ مَعَهُ مَخَوٌّ مِنْ مِائَةِ أَلْفٍ وَآلُ بَعَّةٍ
وَ عَشْرِينَ أَلْفًا ۝

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق تعداد لکھی ہے صحابہ کی اس کثرت کے ساتھ احمد امین نے کوفہ کا علمی نسب نامہ جو لکھ دیا ہے وہ ان کی زبانی سن لیجئے :

کوفہ میں بے حد و حساب صحابہ کرام کا ورود ہوا۔ علم میں ان میں زیادہ مشہور حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔ حضرت

علی کو علمی نشر و اشاعت کے لیے سیاسی جھگیلوں کی وجہ سے وہ فراغت نہیں ہوئی جو حضرت عبداللہ بن مسعود کو نصیب ہوئی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کی شخصیت صحابہ میں سب سے بڑی علمی اور اثری شخصیت تھی، مسلمان ہونے میں ان کا چٹا غیر تھا۔ مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبشہ بھی ہجرت کی اور بعد ازیں مدینہ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملازم صحبت تھے۔ آپ کو حضور میں جلنے کی اجازت تھی۔ قرآن خوانی اور قرآن انی سے بے حد شغف تھا۔ اسلامی تعلیم، تفسیر قرآن میں امتیازی مقام کی وجہ سے آپ کا کبار علماء صحابہ میں شمار تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کو کوفہ کے شہریوں کا معلم بنا کر بھیجا تھا۔ اہل کوفہ نے ان سے علم حاصل کیا اور ان کے سامنے زانو سے شاگردی طے کیا۔

اور صرف علم ہی نہیں بلکہ اخلاق و آداب بھی ان سے ہی لیے۔ ان کے شاگردوں کے ہائے میں سعید ابن جبیر کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ہی اس شہر کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ لوگوں کو قرآن بھی پڑھاتے، تفسیر بھی سکھاتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی بیان کرتے اور پیش پا افتادہ حالات میں فتاویٰ بھی کتاب و سنت سے یا پھر اپنے اجتہاد سے دیتے۔ آپ کے مدرسہ کے چھ شاگرد مشہور ہیں۔ علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، عارث اور عمرو بن شریل۔ یہ حضرات کوفہ میں تعلیم و افتاء میں حضرت عبداللہ کے جانشین ہیں لیکن سب علماء کوفہ کا علمی مرکز صرف حضرت عبداللہ ہی کی شخصیت نہ تھی بلکہ ان میں سے بہتوں نے مدینہ جا کر حضرت فاروق اعظم، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت معاذ بن جبل اور دوسرے صحابہ سے علمی استفادہ کیا ہے اس کے نتیجے میں کوفہ کو ایک علمی گھرانہ کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ کوفہ کے علماء میں شرح، شعبی، سفینی، اور سعید بن جبیر بہت مشہور ہیں۔ اس بستی میں علمی ترقی ہوتی رہی تا آنکہ علم کا مئی تاج امام اعظم کے سر رکھا گیا ہے

فی الواقع صحابہ کی اس کثرت کے باوجود علماء کوفہ نے صرف حضرت عبداللہ ہی پر علمی استفادہ میں قناعت نہیں کی بلکہ ان کے شوق طلب کا عالم یہ تھا کہ وہ اس کی خاطر مدینے کا سفر کرتے تھے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

ابو عبد الرحمن السلمي اور دیگر علماء کوفہ جیسے علقمہ، اسود، عارت، ذریہ بن جہیش کہ جن کے پاس عاصم بن ابی النجود نے قرآن پاک کی قرأت کی ہے۔ ان سب لوگوں نے حضرت ابن مسعود سے قرآن سیکھا۔ نیز یہی حضرات مدینہ جاتے اور حضرت عمر، حضرت عائشہ، سے علم حاصل کرتے تھے اور کوفہ کے قاضی شریح نے فقہ کی تعلیم مین میں حضرت معاذ بن جبل سے لی تھی اے

اور پھر خپداوراق کے بعد لکھتے ہیں:

حضرت عبداللہ ابن مسعود کے تلامذہ حضرت عمر، علی اور ابوالدردار سے علم حاصل کرتے تھے۔

اس پر تفصیلی تبصرہ آئندہ اوراق میں آ رہا ہے یہاں مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ امام اعظم کی یہ بستی علمی بستی ہے۔ خلاصہ کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ فن قرأت و تجوید کے اگر سات امام ہیں جن کو قرار سب سے کہتے ہیں تو ان میں سے تین عاصم، حمزہ اور کسائی کو فی ہیں۔ علم التفسیر میں خود عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کو اعلم الناس بالتفسیر بتایا ہے اے حضرت سعید بن جبیر جن کو حضرت قتادہ تفسیر کا سب سے بڑا عالم مانتے ہیں وہ کوفہ ہی کے رہنے والے ہیں۔ عربیت اور نحو کی تدوین بھی کوفہ اور بصرہ ان دو شہروں میں ہوئی ہے۔ چنانچہ لغت اور نحو کی کتابوں میں ان دو شہروں کے سوا کسی اور شہر کے علماء کا اختلاف ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے کیسی اچھی بات لکھی ہے:

علم نسخونے کوفہ و بصرہ کے ان دو شہروں میں نشوونما پاتی ہے جو پہلی صدی، بحری میں اسلامی ثقافت کا سب سے اہم مرکز تھے جہاں علم کلام اور علم فقہ کی اساس رکھی گئی ہے اور جہاں ادب اور فنون

کے مدرسے قائم ہوئے۔

الغرض امام اعظم نے جس بستی میں آنکھ کھولی اور جس میں بچپن اور لڑکپن گزارا ہے۔ وہ صرف تمدن و تمدن ہی کا گہوارہ نہیں بلکہ علوم و فنون کی نگرہی ہے۔

امام اعظم کی علمی طلبکاریوں کا زمانہ

اگرچہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ امام کی علمی طلبکاریوں کی محرک علامۃ التابیین امام شعبی کی ذات گرامی ہے اور اس سے سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے کہ امام صاحب نے طلب علم کا سلسلہ پیچنے میں نہیں بلکہ بڑے ہو کر شروع کیا ہے لیکن یہ محض اندازہ اور خیال ہے۔

در اصل بات یہ ہے کہ علمی طلبکاریوں کا آغاز تو پیچنے ہی میں ہو گیا تھا مگر امام شعبی کی ذات گرامی نے امام اعظم کو علم الشرائع کی طرف مائل کیا ہے چونکہ امام اعظم کو دوسرے فنون کے ساتھ علم الکلام سے خاص دلچسپی تھی اور اس دلچسپی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ علم کلام میں اصول دین سے بحث ہوتی ہے اس لیے یہ علم تمام علوم سے برتر ہے۔ اس علم میں تکمیل کی اور صرف تکمیل ہی نہیں بلکہ اس درجہ امامت اور مہارت پیدا کر لی کہ:

بَلَغَ فِيهِ مَبْلَغًا يُشَارُّ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ

اس مقام پر پہنچ گئے کہ انگلیاں ان ہی کی طرف اٹھتی تھیں۔

اور اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو صدر الامہ نے یحییٰ ابن بکیر کے حوالہ سے امام اعظم کی زبانی لکھا کہ:

میں ایک روز بازار جاتے ہوئے امام شعبی کے پاس سے گزرا، امام شعبی نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ بازار آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ علمی مشغلہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں علماء کے پاس کم جاتا ہوں فرمایا کہ اس بارے میں غفلت کو راہ نہ دو۔ مطالعہ اور اہل علم کی صحبت کو اپنے لیے ضروری کر لو۔ مجھے

تم میں ہونہاری اور بیداری نظر آرہی ہے۔

یہ واقعہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ آغاز طلب کا مشورہ نہیں بلکہ نظر فی العلم اور مجاہد علماء کا مشورہ ہے۔ آپ خود ہی سوچتے کہ ایک شخص جو علم کی راہ سے واقف نہیں ہے، علماء سے ربط و ضبط نہیں رکھتا ہے صرف دکاندار ہے۔ اس میں ایک اجنبی شخص کے لیے کون سی کشش ہے جو اسے یہ کہنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم میں مجھے علمی بیداری نظر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام شعبی کو امام اعظم کی کلامی مسائل میں ہونہاری اور بیداری کی داستان معلوم تھی۔ اس بنا پر انہوں نے امام اعظم کو الشرائع کی طرف بلانے کا مشورہ دیا۔ اس کے نتیجے میں خود امام صاحب فرماتے ہیں کہ:

امام شعبی کی بات دل میں گھر کر گئی اور بازار چھوڑ کر بس علم ہی کا ہو رہا۔
گو یا علم ہی کے ہونے کا معاملہ اب پیش آیا ورنہ طلب علم کا آغاز تو اب سے بہت پہلے ہو چکا ہے،
خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو ایک غلطی کے ازالہ کی خاطر لکھنا پڑا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ
کے طلب علم کی داستان میں علم کلام کو بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے۔

امام اعظم اور فنونِ عصریہ

قرآن حکیم کی تعلیم سے فراغت کے بعد امام اعظم ان فنونِ عصریہ کی طرف پہلے متوجہ ہوئے جو اس زمانے میں رائج تھے۔ اس کی تائید اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو صدرالائمہ نے امام صاحب کی زبانی لکھا ہے اس میں خود امام صاحب نے ان علوم و فنون کو نام بنام بتایا ہے جن میں امام صاحب نے کمال پیدا کیا تھا۔

جب میں نے علم سیکھنے کا ارادہ کیا تو میں نے تمام علوم و فنون کو پیش نظر رکھا۔ اور پھر ان میں سے ایک ایک فن کو پڑھا ہے۔

اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ علم الشرائع کو اپنانے سے پہلے امام صاحب نے اسی بستی میں جسے خود امام صاحب نے معدن العلم والفہم کا نام دیا ہے۔ علم ادب، علم الشعر والتغایہ اور علم القراءۃ اور علم الکلام میں سے ایک ایک فن کو باقاعدہ پڑھ لیا تھا اور علم الکلام میں اس درجہ مہارت پیدا

کر لی تھی کہ خود فرماتے ہیں کہ اس میں میری طرف ہی لوگوں کی انگلیاں اٹھتی تھیں۔ اسی سلسلے میں صدرالائمہ اور خطیب بغدادی کی بیان کردہ داستان بھی گوش گزار کر لیجئے جو سیحی ابن شیبان کے حوالہ سے ہم تک پہنچی ہے۔

مجھے علم کلام میں کافی دسترس تھی ایک عرصہ اسی میں بیت گیا۔ لوگوں سے مناظرے کرتا۔ اسی فن کی حمایت اور مدافعت میرا مشغلہ تھا۔ بصرہ مختلف مدارس فکر کا گڑھ تھا۔ میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں۔ سال بھر یا اس سے زیادہ قیام رہتا تھا۔ اس زمانے میں میری خارجیوں کے فرقوں سے ٹکڑے ہوئی۔ میں علم کلام کو افضل ترین علم سمجھتا اور کہا کرتا تھا کہ یہی دین کی بنیاد کی نگرانی ہے۔ عرصہ گزرنے پر میں نے خود اپنے تئیں غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ اور تابعین کہا نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے بے بہرہ نہ تھے بلکہ ہم سے زیادہ ان کے علم میں گہرائی تھی۔ حقائق سے واقف تھے مگر اس کے باوجود ان کی زندگیاں مجاہدانہ شورشوں سے بیکسر خالی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کا مشغلہ نہ تھا بلکہ وہ لوگوں کو اس سے روکتے تھے۔ ان کے غور و فکر کی جولانگاہ علم الشرائع اور ابواب فقہ تھے یہی ان کا موضوع تھا یہی ان کی مجلسی زندگی کی رونق تھی۔ اسی کی لوگوں کو تعلیم دیتے اور اسی کے سیکھنے کی ترغیب دیتے۔ صدر اول ایسے ہی گزرا ہے تابعین بھی ان کے نقش قدم پر تھے۔ اس موقف پر پہنچ کر میں نے علم کلام کو خیر باد کہہ دیا۔ صرف فنی معرفت باقی تھی۔ اور زندگی میں بطور فن سلف کے علوم کو اپنا لیا۔ وہی کام شروع کیا جو وہ کرتے تھے اور اس کے فن کاروں سے رابطہ پیدا کر لیا اور ان کی ہی مجلسوں کو اپنا لیا اور اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا کہ متکلمین کا گروہ اسلاف کے نقش قدم سے ہٹا ہوا اور صالحین کے مقام سے دُور ہے ان کے دلوں میں قساوت ہی قساوت ہے کتاب و سنت کی مخالفت سے بے پروا بے روح اور تقویٰ سے دُور طبقہ ہے لہ

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلب گاریوں کا سلسلہ بچپن میں شروع ہوا ہے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ امام حماد کا انتقال سنہ ۱۲۰ء میں ہوا ہے اور یہ بھی تاریخ بغداد میں ہے کہ امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں امام حماد کی خدمت میں پورے اٹھارہ سال رہا ہوں، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ امام اعظم ایک تلمیذ علم الشرائع کی حیثیت سے تمام علوم میں تکمیل کے بعد امام حماد کی خدمت میں سنہ ۱۴۰ء میں تشریف لے گئے جب کہ امام اعظم کی عمر ۲۴ سال تھی اور یہ بات خود امام اعظم کے بیانون کی روشنی میں بے غبار ہے کہ امام حماد کی خدمت میں تشریف آوری علم الشرائع کی خاطر تمام علوم و فنون کے پڑھنے کے بعد ہوئی ہے۔

امام اعظم کے زمانے میں علم چار حصوں میں تقسیم تھا

الف: ادبی فنون کے مدرسے

ب: علوم عقلیہ کے حلقے

ج: مذاکرہ حدیث کی جماعتیں

و: استنباط مسائل کے مرکز

اگر ترتیب یوں قائم کی جائے کہ امام اعظم نے

اولاً: قرأت عاصم کے مطابق قرآن حفظ کیا۔

ثانیاً: آپ نے نحو، ادب اور شعر پر وقت صرف کیا۔

ثالثاً: آپ نے علم کلام اور علوم عقلیہ میں مہارت پیدا کی۔

رابعاً: آپ نے مذاکرہ حدیث کے حلقوں میں شرکت کی۔

خامساً: آپ نے استنباط و استخراج مسائل اور فقہ و اجتہاد کے لیے حماد کے سامنے زانوئے ادب تہ

کیا ہے۔

نوصاف پتہ لگ جاتا ہے کہ امام موصوف نے تعلیم کا آغاز بچپن میں کیا ہے اور ابھی بچپن سے گزر

کر لڑکپن ہی تھا کہ آپ نے نحو، قرأت، ادب و شعر اور علوم عصریہ کی تکمیل فرمائی تھی۔ اس کی وضاحت

امام صاحب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو امام مرغینانی نے نعیم بن عمرو کی زبانی نقل کیا ہے،

کہتے ہیں:

میں نے امام ابو حنیفہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ میں زمانہ حجاج میں لڑکپن

کی عمر میں بازار جانا تھا اور لوگوں سے علم کلام کے ذریعے عقائد پر باتیں

کرتا تھا۔ ایک روز مجھ سے ایک شخص نے دینی فرائض کے بارے ایک مسئلہ پوچھ لیا مجھے کوئی جواب نہ آیا۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ ایسے مسائل میں لب کشائی کرتے ہو جو بال سے بھی زیادہ باریک ہیں اور نظر بظاہر سہمی ہو شمند، مگر تمہیں ایک دینی فریضہ کا پتہ نہیں ہے۔ میں یہ سن کر شرمندہ ہو گیا۔

حجاج کی وفات جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۹۵ھ میں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ۹۴ھ میں امام اعظم کی عمر صرف چودہ سال کی ہوتی ہے اور اسی عمر کے شخص کو عربی زبان میں غلام کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سال کی عمر میں امام اعظم علم کلام اور علوم عقلیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔

امام اعظم اور علوم عقلیہ

قرآن حکیم اور فنون ادب کے بعد امام اعظم نے اپنی پوری توجہ علوم عقلیہ پر مرکوز کر دی تھی اور علوم عقلیہ میں مہارت کا یہ مشغلہ بیس سال کی عمر تک قائم رہا۔ امام زرنگری نے امام ابو عبد اللہ ابن ابی حنفہ کی زبانی جو واقعہ لکھا ہے کہ :

امام اعظم کوفہ میں پیدا ہوئے اور علم الکلام کی تلاش کرتے رہے اور لوگوں سے اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے تا آنکہ اس میں ماہر ہو گئے۔

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلب گاریوں میں مرکزی مقام علوم عقلیہ کو حاصل تھا اور یہ بھی لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ ایک عرصہ تک اس فن کے زور سے مختلف مدارس کا مقابلہ کیا۔ راتے عامر کے دماغی سکون کے لیے دلائل کا سامان فراہم کیا۔

آپ کی کلامی اور عقلی علوم کی جولانگاہ صرف کوفہ ہی نہ تھا بلکہ آپ کی اس فن میں اس درجہ بہتر ہو چکی تھی کہ جہمیت اور ارجاء کے استیصال کی خاطر کوفہ سے باہر بھی جانا پڑا۔ شیعہ اور خوارج کے ساتھ امام اعظم نے علوم عقلیہ میں اپنی خدا داد علمی صلاحیتوں سے جن جن فرقوں کو ان کے غلط عقائد پر خبردار کیا یہ ہیں جہمیت اور مرجئہ۔ ان فرقوں کے ظہور سے ایسے مسائل منصہ شہود پر آئے جن کا براہ راست اسلامی عقائد سے تعلق تھا۔ ان مسائل میں جو مسئلے خاص طور پر توجہ علمی کے مستحق رہے ہیں یہ ہیں۔

ایمان، تقدیر، صفات الہی۔ ان میں سب سے اہم ایمان ہے اور یہ بے حد افسوس اور صدمہ والی بات ہے کہ جو چیز اسلام میں سب سے اہم ہے اُمت میں سب سے پہلا اختلاف اسی میں رونما ہوا۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں،

یہ مسائل یعنی اسلام، ایمان، کفر و ایمان وہ بنیادی مسائل ہیں جن پر تفاوت اور سعادت اور جنتی و ماری ہونے کا دار و مدار ہے مگر اُمت ان ہی میں سب سے زیادہ اختلاف کا نشانہ بنی ہے بلکہ

اس اختلاف کی نزاکت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی بنیاد پر امام اعظم ہی کے زمانے میں ایک سے زیادہ مدارس فکر پیدا ہو گئے تھے۔

حافظ ابن تیمیہ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ میں فرماتے ہیں کہ جہم بن صفوان کی اُمتے میں ایمان صرف فہم کا نام ہے۔ حافظ ابن حزم نے الفصل فی الملل والاہواء والنحل میں لکھا ہے کہ اس کے نزدیک اگر ایک شخص زبان سے بھی انکار کرے۔ بتوں کی پوجا بھی کرے، فلاوہ یہودیت ڈال لے مگر اسے معرفت قلبی حاصل ہو تو مومن کامل ہے۔

خوارج کا خیال ہے کہ ایمان دل کی تصدیق، زبانی اقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن نہیں ہے کیونکہ عمل ایمان کا رکن ہے۔

ان مدارس کے سامنے امام اعظم نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی۔ اولاً اس لیے کہ ایمان اسلامی زندگی کی بنیادی اینٹ ہے اگر یہی غلط ہو تو اس پر اٹھی ہوتی ساری عمارت غلط ہو کر رہ جاتے گی۔ دوسرے اس لیے بھی کہ یہی اسلامی شہریت کے لیے فیصلہ کن چیز ہے۔ اس کا فیصلہ ہونے پر اسلام کا مالیاتی نظام، اقتصادی اور اجتماعی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر امام اعظم کے لیے ناگزیر اور سچا ناگزیر تھا کہ یہ واضح کریں کہ ایمان کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟

مسئلہ ایمان اور امام اعظمؒ

افراط و تفریط کی ان دونوں صورتوں میں کہ ایک فریق صرف قلبی معرفت کو ایمان کہتا ہے اور دوسرا اس کے مقابلے میں عمل کو بھی ایمان قرار دیتا ہے۔ امام اعظم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک

طرف اگر قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق ہے تو دوسری طرف عقل کو بھی اپیل کرتی ہے اور خود وجدان بھی اسے باور کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا ہے۔ امام اعظم نے بتایا ہے کہ ایمان نام ہے ان تمام باتوں کو جو نبوت محمدیہؐ کے آتی ہے باور کر لینے اور ماننے اور اس کے اقرار کرنے کا۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ دراصل یہاں تین چیزیں ہیں۔ دل کی تصدیق، زبان کا اقرار اور اعمال۔ تصدیق ایمان کا رکن ہے۔ اقرار شرط اور اعمال کی حیثیت مکمل اور متمم کی ہے۔ اگرچہ قرآن و سنت میں ان گنت مقام پر ایمان کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ قرآن کا اور نبوت کا طریق تعلیم اور اسلوب بیان دونوں فطری ہوتے ہیں اس لیے وہاں ہر بات فنی اصطلاحات سے بالا ہو کر سادہ طور پر سامنے آتی ہے۔ اسی ایمان کو دیکھ لیجئے جس میں دل کی تصدیق، زبان کا اقرار اور اعمال سب ہی داخل ہیں لیکن ان میں ہر ایک کا مقام الگ ہے۔ دل کی تصدیق اور اعمال میں باہمی ربط، اقرار کی حیثیت اور پھر اعمال میں باہم مراتب کا فرق سمجھنا کس قدر مشکل ہے مگر ذاتِ نبوتؐ نے ان سب کو نہایت سادہ طریق پر سمجھا دیا ہے ارشاد ہے کہ **بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ**.. انو اسلام کا محل پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ محل میں چھت ہوتی ہے، ستون ہوتے ہیں، در و دیوار ہوتے ہیں اور ان سب کے مجموعہ کا نام محل ہے پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ہے جس پر یہ پوری عمارت کھڑی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اتنا بڑا مکان تو آنکھوں سے نظر آتا ہے لیکن بنیاد جس پر محل کی یہ عمارت قائم ہے آنکھوں سے اچھل رہتی ہے وہ زمین نیچے ہوتی ہے اسی طرح اسلام بھی ایک مجموعہ کا نام ہے اس کے بھی اجزاء ہیں اس کی بھی ایک بنیاد ہے اس کے اجزاء میں ایسا ہی فرق ہے جیسے مکان کے اجزاء ہیں۔ ظاہر ہے کہ مکان کی تعمیر کے لیے جس قدر ستونوں کی حاجت ہے اتنی طاق اور روشنیاں کی نہیں۔ اسی طرح یہاں ارکانِ خمسہ، اقرار شہادتین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسلام کے ستون ہیں اور یہ پانچوں ستون تصدیقِ قلبی کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ جس طرح مکان کی بنیاد زمین میں مدفون ہوتی ہے ایسے ہی تصدیق بھی دل میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک موٹی سی مثال سے صاحبِ نبوتؐ نے جادۂ اہل حق کیسے واضح فرما دیا اور تصدیق و عمل کے باہمی ربط اور پھر اعمال کے باہم مراتب کو کس عمدگی سے سمجھا دیا ہے اسی بات کو امام اعظم نے علومِ رسمہ کے شیدائیوں کے سامنے رکن، شرط اور مکمل کا نام لے کر پیش کیا ہے چونکہ تصدیق کا معاملہ دل سے متعلق ہے اور دل کے حالات کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے ارکانِ خمسہ میں سے زبان کے اقرار کو قرآن و سنت میں ضروری بتایا ہے۔ حافظ

ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

اسلام کے ثبوت کا دار و مدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم
یکساں طور پر سب کو ہو سکے اس لیے توحید کا زبانی اقرار ہی مسلمان
ہونے کا معیار قرار دیا گیا اور اسی ایک کلمہ کو جنگ کے آغاز و
خاتمہ کا مدار بنا دیا گیا یہ

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

جب تک اقرار نہ ہو ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے
دل میں تصدیق موجود ہے یا نہیں۔ لہذا اگر ایک شخص اقرار نہیں
کرتا تو ہم سمجھیں گے کہ اس کو تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے۔ اس
لیے اقرار کا ہونا نہایت ضروری ہے یہ

اسی لیے امام اعظم ایمان میں دل کی تصدیق کے ساتھ زبان کے اقرار کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں
اگرچہ بعد میں آنے والے فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ اقرار کی حیثیت کیا ہے۔ ایک جماعت
رکن بتاتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ شرط ہو یا رکن، صرف تصدیق کا نام
ایمان نہیں ہے اس کی پوری وضاحت امام اعظم کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابو
عمر بن عبد البر نے ابو مقاتل کے حوالے سے نقل کیا ہے:

امام اعظم فرماتے ہیں کہ ایمان تصدیق و معرفت کے ساتھ اسلام
کے زبانی اقرار کا نام ہے۔ لوگ تصدیق میں تین قسم کے ہیں کچھ زبان و
دل دونوں سے مانتے ہیں، کچھ زبان سے مانتے ہیں مگر دل سے
منہیں مانتے، کچھ دل سے مانتے ہیں مگر زبان سے منہیں مانتے۔
پہلا طبقہ تو اللہ اور لوگوں کے نزدیک مومن ہے۔ دوسرا طبقہ عند اللہ
تو مومن نہیں مگر لوگوں میں مومن ہے کیونکہ لوگوں کو دل کا حال
معلوم نہیں اقرار کی بنا پر ان کے ذمہ ان کو مومن ہی کہنا ہے تیسرا
طبقہ اللہ کے یہاں مومن ہے مگر عند الناس کافر ہے یہ

یہاں تصدیق کے ساتھ اقرار ہی پر زور دیا ہے اور اسلامی زندگی میں اس کی اہمیت بتاتی ہے
 اقرار کو ایمان میں کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو صدر الائمہؑ نے
 لکھا ہے :

جہم بن صفوان آپ کے پاس آیا اور ایمان کے موضوع پر گفتگو کی ،
 بولا کہ میں آپ سے ایمان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ، امام
 صاحب نے فرمایا کہ تاحال تمہیں ایمان کا پتہ نہیں ہے بولا کہ پتہ تو ہے
 مگر کچھ شک ہے فرمایا کہ ایمان میں شک کا نام کفر ہے ۔ بولا ذرا
 میری بات تو سن لیجئے فرمایا کہ بولو لایہ بتائیے کہ ایک شخص جسے اللہ
 کی ذات کی معرفت حاصل ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا ہے
 کیا وہ مومن ہے یا کافر؟ فرمایا کہ جب تک زبان سے اقرار نہ کرے
 کافر ہے ۔ بولا کافر کیونکر ہو سکتا ہے اسے معرفت حاصل ہے امام
 صاحب نے فرمایا کہ اگر تم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہو اور اسے حجت
 بھی سمجھتے ہو تو دلائل قرآن سے دو در نہ غیروں کے انداز پر گفتگو
 کروں ۔ جہم بن صفوان نے کہا کہ میں قرآن کو اللہ کی کتاب مانتا ہوں ،
 امام صاحب نے فرمایا کہ قرآن میں اللہ سبحانہ کا ارشاد گرامی ہے ۔ وَ اِذَا
 سَمِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَى الْاِنْسَانِ مِنْ رَّبِّهِ فَقُولُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ عَلٰی رُءُوسِ السُّجُوْدِ
 وَمَا عَلٰی فُؤَادِیْنَ الْحَقِّ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ۔ اِلٰی ۔ فَاتَّبَعُوْهُم
 اَللّٰہُ یَمَّا قَالُوْا ۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے عن فؤاد کے ساتھ
 یَقُوْلُوْنَ (کہتے ہیں) اور قَالُوْا (انہوں نے کہا) لاکر بتا دیا
 کہ ایمان کے لیے دل کی معرفت کے ساتھ زبان کا اقرار بھی شرط ہے ۔
 اور ایمان قلب و زبان دونوں سے مطلوب ہے ۔ ایک ارشاد ہے
 قُولُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ اَیْکَ اور ارشاد ہے وَ اَلْزَمَهُمْ کَلِمَۃَ
 التَّقْوٰی یہاں بھی کلمۃ التقویٰ سے اقرار شہادتین مراد ہے ۔ ایک
 اور مقام پر ہے هُدُوْا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ یہاں الطیب
 من القول سے توحید و رسالت کا اقرار ہی مقصود ہے ۔ نیز فرمایا :

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ - اور يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ - ان آیات میں بھی الکلم الطیب اور القول الثابت
سے مراد زبان ہی کا اقرار ہے - یہ تو قرآن ہے -

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سلسلے میں فرمایا ہے قُولُوا
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَقَاطَعُوا اس میں لا الہ الا اللہ کہنے پر فلاح کو موقوف
قرار دیا ہے - قرآن و حدیث کے بعد خود انسانی بصیرت بھی یہی کہتی ہے
کہ اگر ایمان صرف دل کی معرفت کا نام ہوتا اور اقرار کی ضرورت نہ ہوتی
تو پھر ہر منکر قلبی معرفت کے بعد مومن ہوتا اور ابلیس کا مومنوں میں
شمار ہوتا کیونکہ اسے یہ معرفت تو کہ اللہ ہی اس کا خالق، مالک،
محب، اور محبت ہے - حاصل ہے اور تمام کافر بھی مومن ہونے چاہئیں
کیونکہ قرآن میں ان کی معرفت کا اقرار ہے اس کے بعد متعدد قرآنی
آیات پیش فرمائی ہیں

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام اعظم اقرار کو ایمان میں رکنیت کا درجہ دیتے ہیں کیونکہ اقرار
بھی ایک قسم کی تصدیق کا نام ہے - فرق ہے تو صرف یہ کہ مائدہ دل کی اور اقرار زبان کی تصدیق ہے -
امام اعظم کے نزدیک ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام نہیں ہے بلکہ اقرار اور التزام طاعت بھی
اس کا اہم جز ہے - اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد و قادی نہیں کرتا تو وہ مومن
نہیں کہلا سکتا - ابو مقاتل نے امام اعظم سے جو ایمان کی تعریف نقل کی ہے اس میں اقرار کا متعلق
اسلام کو قرار دیا ہے - چنانچہ فرماتے ہیں :

الْإِيْمَانُ هُوَ الْمُعْرِفَةُ وَالتَّصَدِيقُ وَالْإِقْرَارُ بِالْإِسْلَامِ

ایمان معرفت، تصدیق اور طاعت کے اقرار کا نام ہے -

الفقہ الاکبر میں اسلام کی حقیقت خود امام اعظم نے جو بتائی ہے یہ ہے :

الْإِسْلَامُ هُوَ التَّسْلِيمُ وَالْإِقْبَالُ وَإِلَّا وَاصِيَ اللَّهُ

اسلام ماننے اور احکام الہی کی سرپا پیروی کا نام ہے -

اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں بلکہ انقیاد اور التزام طاعت بھی اس کا اہم رکن ہے جیسے تصدیق رکھ کر التزام طاعت کا عہد نہ کرنا اسلام نہیں ہے ایسے ہی صرف فرمانبرداری کا التزام رکھ کر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہ ہونا ایمان نہیں ہے ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ زبان و دل تصدیق سے مرتین ہوں اور اسلامی دستور حیات کو اپنانے کا عزم مصمم ہوا قرار کا لفظ ایمان میں بے معنی اور بے جان نہیں ہے۔

امام اعظم کے ایمان میں اس قانونی موقف نے کہ ایمان نام ہے اقرار و تصدیق دونوں کا۔ دونوں فرقوں کی تردید کر دی جہمہ کی بھی اور مرتبہ کی بھی۔

ایمان کی اسی حقیقت کو امام احمد بن حنبل نے اس طرح پیش فرمایا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ مومن کی تعریف یہ ہے کہ اس کی شہادت دے کہ اللہ سبحانہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ یگانہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور شہادت دے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ نیز دوسرے پیغمبر جو کچھ لاتے ہیں ان باتوں کا زبان سے اقرار کرے اور جو کچھ اس کی زبان کہے دل اس کا ساتھ دے ایسے آدمی کے ایمان میں کوئی شک نہیں ہے

امام اعظم کی علم کلام میں تصانیف

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں امام اعظم نے علم الکلام کے موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں ان فرقوں کے مقابلے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کو واضح فرمایا ہے۔ یہ بات کہ اس موضوع پر امام اعظم کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ معتزلہ کی اڑائی ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں:

هَذَا كَلَامُ الْمُعْتَزَلَةِ وَدَعَاؤُهُمْ أَنَّهُ لَيْسَ لَهُ فِي عِلْمِ الْكَلَامِ
لَهُ تَصْنِيفٌ ۚ

یہ معتزلہ کی بات ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ امام اعظم کی علم کلام میں کوئی تصنیف نہیں ہے

اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس قسم کی افواہوں سے معتزلہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ امام اعظم کو اپنے مزعومات کی اشاعت کے لیے استعمال کر سکیں۔

علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں علم الکلام کے موضوع پر امام اعظم کی جن تصانیف کی نشاندہی کی ہے وہ یہ ہیں۔ الفقہ الاکبر، الرسالة، الفقہ الاوسط، کتاب العالم والمتعلم اور الوصیۃ۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی تالیف بھی اس زمانے کے رواج کے مطابق املاتی طرز پر ہوئی ہے۔

أَمْلَاهَا عَلَى أَصْحَابِهِم مِّنَ الْفُقَهَاءِ الْأَكْبَرِ وَالرَّسَالَةَ وَالْفِقْهَ
الْأَوْسَطَ وَكِتَابَ الْعَالِمِ وَالْمُتَعَلِّمِ وَالْوَصِيَّةَ۔^۱
علامہ طاش کبریٰ زادہ نے پوری قوت سے یہ بات بتائی ہے کہ:

امام اعظم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ الفقہ الاکبر اور العالم جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ کتابیں امام اعظم کی نہیں معتزلہ کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں بے علامہ بزازمی نے تصریح کی ہے کہ:

یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ علم کلام میں امام ابو حنیفہ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ الفقہ الاکبر اور العالم والمتعلم میں نے خود علامہ شمس الدین کی ارقام فرمودہ دیکھی ہیں اور ان پر لکھا ہوا تھا کہ یہ امام اعظم کی تصانیف ہیں۔^۲

صدر الاسلام ابوالیسر بزدوی نے اپنی مشہور کتاب اصول دین میں جو حال ہی میں مصر میں ڈاکٹر ہانس پتیرنس کی تحقیق سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آئی ہے اس میں امام اعظم کے بارے میں تصریح کی ہے کہ:

قَدْ صَنَعَ فِيهَا كُتُبًا وَقَعَ بَعْضُهَا إِلَيْنَا۔^۳

آپ نے علم کلام میں کچھ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کچھ ہمیں ملی ہیں۔
یہ ابوالیسر فروع و اصول میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور لکھا ہے كَانَ إِمَامَ الْأُمَّةِ عَلَى الْإِطْلَاقِ

^۱ اشارات المرام ص ۲۱ ^۲ مفتاح السعادة ج ۶ ص ۲۹ ^۳ مناقب کردوسی ج ۱ ص ۱۰۸

^۴ اصول دین بزدوی ص ۴

صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں چنانچہ ان کی سند یہ ہے :
 عَنْ اسمعيل بن عبد الصادق عن جده ابي اليسر عبد الكريم
 عن ابي المنصور الماتريدي عن ابي بكر الجوزجاني عن ابي سليمان
 عن محمد بن

علامہ بیاضی نے امام اعظم کی ان کتابوں کی تاریخی اور روایتی حیثیت کو شرح و بسط سے لکھا ہے
 وہ فرماتے ہیں :

الفقه الاکبر، الرسالة، الفقه الاوسط، العالم والمتعلم اور الوصیۃ کی امام اعظم سے
 روایت میں مرکزی حیثیت حماد بن ابی حنیفہ، قاضی ابو یوسف، ابو مطیع
 المحکم بن عبد اللہ اور ابو مقاتل حفص بن مسلم کی ہے۔ ان ائمہ سے ان
 کتابوں کو اسماعیل بن حماد، محمد بن مقاتل، محمد بن سماعہ، نصیر بن یحییٰ
 اور شاذل بن حکیم نے روایت کیا ہے۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کو نصیر بن یحییٰ اور محمد بن مقاتل سے امام ابو منصور ماریدی نے
 روایت کیا ہے۔ علامہ زاہد کوثری رقمطراز ہیں :

علم کلام میں امام اعظم کا یہ علمی سرمایہ اُمت کو وراثت میں ملا ہے۔ الفقه
 الاکبر، اس کی سند یہ ہے علی بن احمد الفارسی عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مقاتل
 عن عصام بن یوسف عن حماد بن ابی حنیفہ عن ابی حنیفہ۔ الفقه الاوسط،
 اس کی سند یہ ہے ابو زکریا یحییٰ بن مطرف عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مطیع
 البلیخی عن ابی حنیفہ۔ العالم والمتعلم۔ اس کی سند یہ ہے۔ الحافظ احمد بن
 علی عن حاتم بن عقیل عن الفتح بن ابی علوان و محمد بن یزید عن الحسن بن
 صالح عن ابی مقاتل عن ابی حنیفہ۔ الرسالة۔ نصیر بن یحییٰ عن محمد بن
 سماعہ عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ کی سند سے مروی ہے اور اسی سلسلہ
 سند سے الوصیۃ بھی مروی ہے۔

تاریخ و روایت کی یہ شہادتیں تیار ہی ہیں کہ علم کلام میں امام اعظم نے جو علمی سرمایہ چھوڑا ہے

وہ امام اعظم ہی کا ساختہ و پر داختہ ہے۔ اس پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ ہماری کتاب ”امام اعظم اور علم الکلام“ میں آئیں گی۔

علم کلام اور اس کا حکم

علم کلام کے موضوع پر امام اعظم کے بیانات پڑھ کر شاید آپ یہ غلط محسوس کریں کہ امام صاحب علم الکلام کی تعلیم و تعلم کی اشاعت کو امت میں پسند نہ کرتے تھے لیکن ایسا نہیں ہے۔ صدر الاسلام ابو الیسر زبیدی نے اپنی کتاب اصول دین میں اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

علم کلام در اصل ان مسائل کا نام ہے جن کی حیثیت اسلام میں اصول دین کی ہے اور جن کا سیکھنا فرض عین ہے۔ امام ابو حنیفہ نے یہ علم حاصل کیا ہے اور اس کے ذریعے معتزلہ اور تمام اہل بدعت سے منظرہ کیا ہے۔ آغاز میں آپ اپنے اصحاب کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے اور اس علم میں آپ نے کتابیں بھی تصنیف فرماتی ہیں جن میں سے کچھ تک ہماری رسائی ہوئی ہے اور کچھ کو اہل بدعت نے خورد برد کر دیا۔ جو کتابیں امام اعظم کی ہم کو ملی ہیں ان میں العالم والمتعلم اور الفقہ الاکبر ہے۔ العالم والمتعلم میں امام اعظم نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ علم کلام پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ چنانچہ اسی کتاب میں ہے کہ متعلم کہتا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علم کلام نہ پڑھنا چاہیے کیونکہ صحابہ کرام نے یہ علم نہیں پڑھا ہے۔ عالم کہتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہاں ٹھیک ہے ہمیں بھی علم کلام نہ پڑھنا چاہیے جیسے صحابہ نے نہیں پڑھا لیکن تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہمارے اور صحابہ کے معاشرے میں کیا فرق ہے جن حالات سے ہمیں دین کی زندگی میں دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان سے صحابہ دوچار نہیں تھے۔ ہمارا ایسے معاشرے سے سابقہ پڑا ہے جن کی باتیں مسلک حق کے خلاف چھوٹ اور بے لگام ہیں۔ جن کے یہاں ہمارا خون روا ہے کیا اس ذہن کے گرد و پیش میں ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ راستہ برو اور غلط کار میں ایک حد فاصل اور خط تمیز قائم کریں۔ یوں

سمجھو کہ صحابہ ایسے خوش آئند ماحول میں تھے جہاں جنگ کا نام و نشان نہ تھا
امن و سکون کی زندگی تھی۔ یقیناً ایسے ماحول میں سامان جنگ اور جنگی تیاری
کی ضرورت نہیں ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ایک جنگجو طبقہ نے حملہ کر کے
ایمان و اعتقاد کی زندگی کا امن و سکون تو بالا کر دیا ہے۔ اس لیے
ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے سامان جنگ کی ضرورت ہے۔ اور فوجی
ٹریننگ کی بھی۔ ہمارے اکثر فقہاء نے لوگوں کو علم کلام سیکھنے سے
روک دیا ہے لیکن جو امام ابو حنیفہ کے پیروکار ہیں وہ اس کی تعلیم و
تعلیم کے جواز کے قائل ہیں البتہ انہوں نے عمر کے آخری حصہ میں اس
میں مناظرے سے روک دیا تھا۔

گویا امام اعظم کی نظر میں علم کلام کو ایمان کے لیے ایک دفاعی سرمایہ کی حیثیت میں اپنانے میں کوئی مضائقہ
منہیں ہے۔ علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں بھی امام صاحب کے اس بیان کی وضاحت فرمائی
ہے جو بات روزِ اول علم الکلام کے بارے میں امام اعظم نے فرمائی ہے کہ اس کی حیثیت ایک دفاعی
سرمایہ کی ہے وہ ہی بات اس علم کے بڑے بڑے شہسواروں نے آخر میں کہی ہے۔ چنانچہ امام الحرمین
ابو محمد جوینی نصیحتۃ المسلمین میں فرماتے ہیں۔

قرآن کے دلائل غذا کے ذبے میں ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا
سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں ہیں کچھ کے لیے سود مند
مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تقریحات
پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی کچن کے
روحانی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ سے
گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی جیسے کلامی محقق نے اپنی زندگی کی آخری تالیف میں اقرار کیا ہے کہ:
إِنَّمَا الْمَقْصُودُ مِنْهُ حِفْظُ عَقِيدَةٍ أَهْلِ السُّنَّةِ وَحِرَاسَتُهَا
عَنْ تَشْوِيشِ أَهْلِ الْبِدْعَةِ ۝

علم کلام سے مقصود صرف بدعتیوں سے اہل السنہ کے عقیدہ کی حفاظت اور نگرانی ہے۔

ان اقراروں سے میں تو یہی سمجھا ہوں کہ جو بات اولاً امام صاحبؒ کی زبان پر آئی بالآخر وہی وقت کا آوازہ بن گیا۔ امام اعظم نے یہی تو بتایا ہے کہ علم الکلام کا اساسی مقصد اسلامی سوسائٹی کے لیے عقائد کی فراہمی کا کسی خاص عقلی ہنج پر سلیبس تیار کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی غایت صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے خود فریبی سے شک وارتیاب کی گود میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پر جتے ہوئے اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اس غلے کے لیے یونانی فلسفے کے میگزین سے ہتھیار مانگ کر لاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس طرح وہ اسلام کی عمارت کو گرا دیں گے۔ اصول جنگ کے مطابق یہ تو سب ہی کرتے ہیں کہ اپنے ہتھیاروں سے دوسروں کا مقابلہ کریں۔ اپنی قوت دوسروں کے مقابلے پر صرف کریں لیکن یہ تو انتہائی فراست اور زیر کی کہتے یا وقت کی سیاسی مہارت کہ گھر سے مقابلہ کے ارادے سے نکلے ہیں اور خالی ہاتھ ہیں۔ ارادہ ہے کہ اپنی دولت اور سرمائے کو اپنچ نہ آئے اور میدان بھی ہاتھ آجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا قرآنی دلائل اپنی جگہ رہے سنت کی پکار اپنے مقام پر۔ ان ہی کے میگزین سے دلائل کا اسلحہ لے کر ان سے مقابلہ کیا اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے امام غزالی نے لکھا ہے :

لَكِنَّهُمْ اعْتَمَدُوا فِي ذَلِكَ عَلَى مَا تَسْتَمَوْا مِنْ حَاوِي خُصُومِهِمْ

لیکن متکلمین نے اس معاملے میں اپنے مد مقابل کے مسلمات کا ہی سہارا لیا ہے۔

اور

وَكَانَ أَكْثَرُ خُصُومِهِمْ فِي اسْتِخْرَاجِ مَنَاقِصَاتِ الْخُصُومِ

وَمُسَاخَذَةِ بَتِهِمْ لِلْوَاغِزِ مُسْلِمًا قَبِيحًا

ان کی فکری توجہ صرف یہ تھی کہ مد مقابل کا توڑ کیا جائے اور ان کے مسلمات کے لوازم ہی سے ان کی گرفت کی جائے۔

اس سے مقصود یہی بتانا ہے کہ علم الکلام کا مقصد اصلی اپنوں کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو چپ کرانا ہے۔

الغرض امام اعظم کے بارے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ امام موصوف علم کلام کو کسی دجے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ امام اعظم کے موقف کو اس روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ

علم کی دنیا نے علم الکلام میں امام اعظم کو متکلم اول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ امام عبدالقادر بغدادی شافعی نے بتایا ہے کہ علم کلام کے موضوع پر اولیت کا شرف امام اعظم کو حاصل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

أَوَّلُ مُتَكَلِّمِيهِمْ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَ أَرْبَابِ الْمَذَاهِبِ أَبُو حَنِيفَةَ
وَإِذَا فَعِلَ فَإِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ لَهُ كِتَابٌ فِي الرَّأْيِ عَلَى الْقَدَرِ
سَمَاءُ الْفِقْهِ الْأَكْبَرُ وَ لَهُ بِرِ سَالَةٍ أَمْلَأُهَا فِي نُصْرَةِ
قَوْلِ أَهْلِ السُّنَّةِ أَنَّ الْأِسْتِطَاعَةَ مَعَ الْفِعْلِ لَهُ

فقہائیں سب سے پہلے متکلم ابو حنیفہ اور شافعی ہیں۔ ابو حنیفہ نے قدریہ کے رد میں فقہ اکبر نامی کتاب تصنیف کی ہے۔ موضوع استطاعت پر اہل السنۃ کے موقف کی نصرت میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔

علامہ ابو المنظر اسفرائینی نے امام اعظم کی کلامی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن النذیم نے بھی ان کتابوں کا پتہ دیا ہے اور آخر میں آپ کی وسعت علمی کے بارے میں لکھا ہے :-
أَفْعِلْهُمُ بَحْرًا وَ بَرًّا شَرُّ قَادِرًا غَرًّا بَاعِدًا وَ قَرِيبًا لَهُ

دور، نزدیک، مشرق، مغرب اور خشکی و تری میں آپ ہی کا علم ہے۔

تاریخ الاسلام سیاسی کے مولف حسن ابراہیم حسن نے بھی ابن النذیم کی ہمنوائی کی ہے۔ الغرض میں بتایا رہا تھا کہ امام اعظم کی طلب علم کی داستان میں علوم عقلیہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس میں ناموری اور شہرت کے پیش نظر امام شعبی نے امام اعظمؒ کو ۹۲ھ میں علم الشرائع کے لیے مطالعہ علمی اور مجالست علما کا مشورہ دیا۔ علم الشرائع کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظمؒ اپنے استاد حماد کے پاس ۱۰۰ھ میں یعنی چوبیس سال کی عمر میں گئے اور پورے اٹھارہ سال کے بعد علم الشرائع کی تعلیم و تمرین سے فراغت کے بعد مجتہد کی حیثیت سے ۱۲۰ھ میں لوگوں میں رونما ہوئے۔ ۹۵ھ سے ۱۰۴ھ تک کا پورا وقت امام اعظمؒ نے علم حدیث پر صرف کیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے آپ کو ذرا انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔ سرِ دست تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پندرہ سال کی عمر میں علوم عقلیہ

اور فنونِ عصریہ میں اتنی مہارت ہو جانا کہ اسی کو فن کی حیثیت سے اپنا لینا اور اسی پر مختلف مدارسِ فکر سے مقابلہ کرنا امام صاحب کا ایک ممتاز کارنامہ ہے۔ جہم سے مقابلہ کی داستان آپ سن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کلامی مسائل میں امام صاحب کے دوسرے فرقوں سے بھی مناظرے ہوتے ہیں مگر ہم ان کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسائل بہت طویل الذیل ہیں اندیشہ ہے کہ اپنے موضوع سے دُور نہ ہو جائیں۔

امامِ اعظمؒ طالبِ علمِ علمِ حدیث کی حیثیت سے

۹۶ھ میں امامِ اعظمؒ نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ حافظ ابن عبد البر اور خوارزمی نے تصریح کی ہے اور اسی حج میں تفقہ فی الدین کے موضوع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبد اللہ بن الحارثؓ کی زبان مبارک سے یہ ارشاد و سنا ہے یہ گویا علمِ حدیث کی اسجد ہوتی ہے۔

مَنْ تَفَقَّهَ فِي دِينِ اللَّهِ كَفَاهُ اللَّهُ حِمَّةً وَرَزَقَهُ مِنْ بَيْتِهِ
لَا يَحْتَسِبُ۔

جس نے اللہ کے دین میں فقہیت پیدا کر لی۔ اللہ اس کے سچے دُغم میں کافی ہے اور اس کو ایسے مقام سے رزق دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا۔

امام شعبی کے کہنے سے دل پہلے ہی مائل ہو چکا تھا۔ اس ارشادِ نبوت سے زخمی ہو گئے اور ۹۶ھ سے ہی علمِ الشرائع کی طرف رُخ کر لیا۔ اور زندگی کے اس موڑ پر آپ نے تمام علوم کا باہم موازنہ کیا مگر علمِ الشرائع کے لیے چونکہ علمِ الحدیث ناگزیر تھا اس لیے آغاز یہیں سے کیا اور ۹۷ھ سے علمِ حدیث کے طالبِ علم کی حیثیت اختیار کر لی اور ۹۸ھ سے شروع ہو کر ۱۰۴ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اگرچہ کام کا آغاز تو علمِ حدیث میں ۹۸ھ میں ہو چکا تھا مگر پوری باقاعدگی کے ساتھ پورا کا پورا وقت ۱۰۴ھ سے لگایا ہے۔ ۱۰۴ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا اور سب سے پہلے اپنے شہر کے مشہور محدث علامۃ التابعین سے استفادہ کیا۔ امام شعبی کی حدیث میں جلالتِ شان کا اندازہ کرنا ہو تو امام زہری کا حسبِ ذیل بیان پڑھیے :

علماء چار ہیں سعید مدینے میں، شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں اور
مکحول شام میں۔^{۱۷}

فن حدیث میں یہ امام اعظم کے اکابر شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں
امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ میں امام اعظم کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کر دی ہے وَهُوَ
اَكْبَرُ شَيْخٍ لِابْنِ حَنِيفَةَ۔^{۱۸}

اور معلوم ہے کہ امام شعبی متکلم نہ تھے۔ ان سے امام اعظم کا تلمذ صرف ان کے فن ہی میں ہو سکتا
ہے اور ان کا فن علم حدیث کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

امام عبداللہ بن عون البصری ^{۱۹} جو امام شعبی کے بھی شاگرد ہیں اور جن کے بارے میں امام
عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں مَا كَانَ بِالْبَصْرَةِ اَقْبَلَ عِلْمًا بِالسُّنَنِ عِرَاقٍ مِّنْ اَن سَعَى زِيَادَهُ
حدیث کا عالم کوئی نہ تھا۔ ان کا امام شعبی کے بارے میں بیان ہے:

اِذَا وَقَعَتْ اَلْفُقُوۡى اَلْقُبَصَنِ الشَّعْبِيُّ

جب کوئی فتویٰ آجاتا تو امام شعبی کو گھٹن ہوتی تھی۔^{۲۰}

اس سے معلوم ہوا کہ فقہ بھی امام شعبی کا فن نہ تھا بلکہ ان کا فن خود ان کے اعتراف کے مطابق

حدیث اور صرف حدیث تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اِنَّا لَسْنَا بِالْفُقَهَاءِ وَ لَكِنَّا سَمِعْنَا الْحَدِيثَ فَرَوَيْنَا الْفُقَهَاءَ

ہم فقہاء نہیں ہیں ہم تو احادیث سن کر فقہاء کے سامنے پیش کرتے ہیں۔^{۲۱}

امام شعبی کا اپنا فن حدیث تھا اور اس میں اس قدر جامعیت تھی کہ مشہور محدث عام الا حول
جو امام الحفاظ شعبی بن الحجاج، امام المحدثین زبیر بن ہارون، امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ
بن مبارک کے استاد ہیں فرماتے ہیں:

مَا رَأَيْتُ اَحَدًا اَعْلَمَ بِحَدِيثِ اَهْلِ الْكُوفَةِ وَالْبَصْرَةِ

وَالْحِجَازِ مِنَ الشَّعْبِيِّ۔

میں نے کوئیوں بصریوں اور حجازیوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ عالم کوئی نہیں دیکھا۔^{۲۲}

^{۱۷} تذکرۃ الحفاظ ۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۵، ۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۹

^{۱۸}، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۹

اس تمام تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ناظرین اوراق کے سامنے امام اعظم کی داستان طلب علم حدیث واضح اور صاف ہو کر آجائے۔

آپ چاہیں تو ان تاریخی حقائق کی روشنی میں اس داستان کو اس طرح سمیٹ سکتے ہیں۔

۱۔ حفظ قرآن بقرآت عاصم ۸۶ تا ۸۸ سال ۲ سال بعمر ۸ سال

۲۔ نحو و ادب ۸۸ تا ۸۹ سال ۲ سال بعمر ۱۰ سال

۳۔ علم الکلام ۸۹ تا ۹۲ سال ۵ سال بعمر ۱۴ سال

۴۔ مناظرہ ۹۲ تا ۹۵ سال ۴ سال بعمر ۱۷ سال

۵۔ علم الحدیث ۹۵ تا ۹۹ سال ۵ سال بعمر ۲۱ سال

۶۔ فقہ و علم الشرائع ۹۹ تا ۱۰۲ سال ۳ سال بعمر ۲۴ سال

گویا چالیس سال کی عمر میں امام اعظم اپنے استاد کی جگہ پر بحیثیت ایک مقنن، مجتہد، فقیہ، محدث اور مفسر کے تشریف فرما ہوئے۔

بیس سال کی عمر میں علم حدیث پڑھنے کی وجہ

اس عمر میں حدیث کا طالب علم بننے میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے جس کی کچھ شاندہی محدث خطیب بغدادی نے کی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کوفہ میں کچھ رواج ہی یہ چل پڑا تھا کہ طلب حدیث کی طرف بیس سال کی عمر میں قدم بڑھایا جائے۔ چنانچہ الخطیب رقمطراز ہیں۔

إِنَّ أَهْلَ الْكُوفَةِ لَمْ يَكُنِ الْوَاحِدُ يَسْمَعُ الْحَدِيثَ إِلَّا
بَعْدَ اسْتِكْمَالِهِ عَشْرِينَ سَنَةً۔

کوفہ والوں میں سے کوئی شخص بیس سال کی عمر سے پہلے حدیث کا طالب علم نہ بنتا تھا۔

امام الحسن بن عبدالرحمن راہرہزی کہتے ہیں کہ میرے سے ایک سے زیادہ مشائخ نے ذکر کیا ہے کہ محدث موسیٰ بن اسحاق سے جب دریافت کیا گیا کہ تم نے ابو نعیم سے حدیث کیوں نہیں لی؟ تو انہوں نے جواب دیا:

اہل کوفہ اپنے بچوں کو سچپنے میں علم حدیث کا طالب علم نہ بناتے تھے بلکہ
بیس سال کی عمر میں اس کے لیے روانہ کرتے تھے۔

موسیٰ بن ہارون کہتے ہیں کہ بصرہ میں حدیث پڑھنے کے لیے دس سال، کوفہ میں بیس سال اور شام میں
تیس سال کا طریقہ رائج تھا۔

اور ول کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ امام اعظم کے اس عمر میں طلب حدیث کے عزم
میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے۔ الفرض بیس سال کی عمر میں ۹۹ھ میں امام اعظم نے
سب سے پہلے اپنے شہر کے جلیل القدر محدث امام شعبی کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا جیسا کہ
ملا علی قاری نے حافظ ابوسعید السمعی کے حوالے سے خود امام صاحب کی زبانی لکھا ہے کہ:

میں دینی علوم میں لوگوں سے گفتگو کرتا تھا ایک بار مجھ سے ایک قرطبیہ
کے بانی میں پوچھا گیا مجھے جواب نہ آیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ الدین، عقائد،
میں مشکافیاں کرتے ہو اور فرائض کا پتہ بھی نہیں ہے۔ میں شرمندہ
ہو گیا بعد ازیں میں امام شعبی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔

امام شعبی کی خدمت میں جیسا کہ بتا چکا ہوں صرف حدیث کے لیے آئے تھے اور آنے کی وجہ
الکروری نے خود امام صاحب ہی کی زبانی یہ بتائی ہے۔
كَانَ الشَّعْبِيُّ مِنْ أَغْلَمِ النَّاسِ

علم حدیث میں زمانہ طالب علمی میں امام اعظم کی سبقت

بہر حال شاہد میں امام اعظم نے بیس سال کی عمر میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا اور جس محنت و
کوشش سے انہوں نے اس علم کو حاصل کیا ہے ان کے ہم عصروں میں سے بہت ہی کم نے اس محنت
سے حاصل کیا ہوگا حافظ سمعی لکھتے ہیں:

اِسْتُغْلِلَ بِطَلَبِ الْعِلْمِ وَبَايَعَ فِيهِ حَتَّى حَصَلَ لَهُ مَا
لَمْ يُحْصَلْ لِغَيْرِهِ۔

وہ طلب علم میں مشغول ہوئے تو اس درجہ ہوئے کہ جس قدر ان کو حاصل

ہوا دوسروں کو نہ ہو سکا یہ

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحب کے رفیق ہیں نقل کرتے ہیں :

میں امام اعظم کا رفیق مدرسہ تھا وہ علم حدیث کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے یہی حال زہد و تقویٰ میں ہوا اور فقہ کا معاملہ تو تمہارے سامنے ہے یہ

کوفہ ہی میں رہتے ہوئے امام صاحب کا علم حدیث میں مسعر بن کدام اور ان کے ساتھیوں سے آگے نکل جانا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ سب سے پہلے امام اعظم نے کوفہ میں جس قدر علم حدیث تھا اس کی تحصیل کی کیونکہ مسعر بن کدام کی علمی رفاقت امام اعظم کو کوفہ ہی میں حاصل ہوئی ہے۔ علم کی خاطر مسعر بن کدام کا کوفہ سے باہر جانا ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام مسعر بن کدام نے حدیث کی خاطر کبھی کوفہ سے باہر کا سفر نہیں کیا بلکہ

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسعر بن کدام کا مفصل اور مبسوط چہرہ قلم بند کیا ہے۔ علم حدیث میں ان کا پایہ معلوم کرنا ہو تو حافظ ابو محمد راہر مزنی کا یہ بیان پڑھئے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری میں جب کسی حدیث میں اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے تھے۔

ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو اس علم حدیث کی ترازو ہیں

امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت زیادہ تقدس کی وجہ سے ان کا نام ہی مصحف رکھا ہوا تھا۔

غور فرمائیے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ ان کا علم جس شخص کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ وہ علم حدیث کی ترازو ہے۔ علم حدیث میں اس کی جلالت قدر کا کیا حال ہو گا؟ اور پھر خود یہ میزان علم حدیث جس شخص کے بارے میں یہ انکشاف کرے کہ وہ علم حدیث میں مجھ سے بھی آگے ہے تو پھر اس کا علم حدیث میں کیا مقام ہو گا۔ اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوفہ ہی میں جس قدر علم حدیث پھیلا ہوا تھا اسے امام اعظم نے سمیٹ لیا تھا۔ اسی بنا پر امام الجرح والتعديل یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ :

بخدا امام اعظمؒ اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتوں کے اس دُنیا میں سب سے بڑے عالم تھے یہ

اور جس کی علمیت کا نہیں بلکہ علمیت کا سیجی دعویٰ کر رہے علم حدیث میں اس کی جلالت قدر کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ یاد رہے کہ خطیب نے بحوالہ سیجی بن معین تصریح کی ہے کہ سیجی بن سعید القطن فتویٰ میں امام اعظمؒ کے قول کو اپناتے تھے اور اہل کوفہ میں سے امام صاحب ہی کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ کبھی فرماتے کہ ابو حنیفہؒ نے بے شمار باتیں بہترین فرمائی ہیں اور کبھی کہتے کہ بخدا ہم نے ابو حنیفہؒ سے زیادہ بہتر رائے والا کوئی نہیں سنا ہے ہم ان کی اکثر و بیشتر باتوں کو اپناتے ہیں یہ

امام اعظمؒ کے حدیث میں اساتذہ

امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث میں صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین تینوں ہیں۔ ان سے باہر کوئی نہیں ہے۔ یعنی سب اساتذہ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی خیریت کی زبان نبوتؐ نے شہادت دی ہے۔ حافظ ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں اگرچہ اساتذہ کا شمار صرف ۴ بتایا ہے جن کی تفصیل حافظ سیوطی نے تبصیر الصیغہ میں پوری درج کر دی۔ لیکن حافظ ذہبی نے عَدَدُ کَثِيرٍ مِّنَ السَّابِقِينَ کہہ کر مشہور محدث ملا علی قاری کے دہانِ قلم سے نکلی ہوئی اس بات کو سچا کر دیا جو انہوں نے شرح مسند امام میں لکھی ہے کہ:

امام اعظمؒ کے اساتذہ صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین میں سے

بہت ہیں جن کی مجموعی تعداد چار ہزار ہے یہ

اور اس کی حافظ ابن حجر مکی نے بھی یہ لکھ کر تصدیق کی ہے کہ:

ابو حفص کبیر نے ان میں سے چار ہزار اساتذہ حدیث ذکر کیے ہیں۔

حافظ ابوبکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں ان مشائخ کا بسوط ترجمہ لکھا ہے اور

ان سے صدر الامر نے مناقب میں نقل کیا ہے۔

امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث کی عظمت

امام اعظمؒ کو اساتذہ کے معاملے میں سب ائمہ حدیث سے ممتاز کرنے والی چیز صحابہ کرام کے سامنے

زالوئے اوٹے کرنا ہے۔ یہ اساتذہ ہی کی عظمت ہے جس کا اظہار خود امام صاحب نے سربراہ حکومت عباسیہ ابو جعفر منصور و انیسویں کے سامنے برسر دربار کیا ہے۔

ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ امیر المومنین ابو جعفر منصور کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے۔ عیسیٰ نے امیر المومنین کو مخاطب کر کے کہا اے امیر المومنین ہَذَا عَلِيٌّ ابْنُ أَبِي النَّيُّومِ۔ یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں۔ ابو جعفر منصور نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کن لوگوں کا علم حاصل کیا ہے امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود، اور عبداللہ بن عباس کا علم حاصل کیا ہے۔ ابو جعفر نے کہا کہ آپ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں۔

اساتذہ کی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ کی عظمت سے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ میں امام بخاری کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے اولین طبقہ تابعین کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

الطَّبَقَةُ الْأُولَى مِمَّنْ حَدَّثَ عَنْ النَّبِيِّينَ

اور پھر ان تابعین کے یہ نام بتاتے ہیں۔ مکی بن ابراہیم، ابو عاصم النبیل، عبید اللہ بن موسیٰ، ابونعیم الفضل بن دکین اور خلاد بن یحییٰ، مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جن اساتذہ پر امام بخاری کے لیے طبقہ اولیٰ ہونے پر حافظ ابن حجر عسقلانی کو فخر ہے وہ خلاد بن یحییٰ کو چھوڑ کر سب کے سب امام اعظم کے شاگرد ہیں۔

صدر الائمہ مکی شمس الائمہ زہری سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حفص صغیر کے زمانے میں ایک بار احناف و شوافع میں بحث چھڑ گئی کہ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ میں افضل کون ہے؟ امام ابو حفص صغیر نے فرمایا کہ دونوں کے اساتذہ شمار کر لو۔ چنانچہ امام شافعی کے اساتذہ گنے گنتے تو اسی ہوئے پھر امام اعظم کے مشائخ کا حساب لگایا گیا تو چار ہزار نکلے۔ امام ابو حفص نے فرمایا

کہ ہذا اذنی من فضائل ابی حنیفۃ۔ یہ امام اعظم کی برتری کی ادنیٰ شہادت ہے۔
 امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں عبداللہ بن المبارک کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے چار ہزار اساتذہ
 سے علم حدیث حاصل کیا ہے اور پھر ایک ہزار سے روایت کی۔ عباس کہتے ہیں کہ ان میں سے
 آٹھ سو کی روایات مجھے بھی ملی ہیں۔ حافظ کبیر ابو داؤد طباطبائیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک
 ہزار اساتذہ سے احادیث لکھی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں:

میں نے ایک ہزار اسی حضرات سے حدیث لکھی ان میں ہر ایک
 محدث تھا۔

حافظ ابو یوسف یعقوب بن سفیان کا بیان ہے کہ میں نے پورے تیس سال رحلت میں بسر
 کیے اور ایک ہزار سے زائد اساتذہ سے حدیثیں سنی ہیں جو سب کے سب ثقاہت کی ترازو
 میں پورے تھے مگر سوچنے کی بات ہے کہ امام بخاری، امام ابو داؤد اور امام یعقوب کے اساتذہ
 کی یہ تعداد کوئی قابل تعجب نہیں ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محدثین اطراف و افاق عالم
 اسلامی میں پھیل چکے تھے اور جا بجا اسناد و روایت کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔ اتباع تابعین
 میں سے ایک شخص کے ہزار ہا شاگرد اور پھر ہر شاگرد کے ہزار ہا شاگرد تھے۔ تمام بلاد اسلامیہ
 میں سینکڑوں منہیں بلکہ ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں اور بڑے زور شور سے درس حدیث
 ہو رہا تھا۔ اس زمانے کی شہری زندگی میں علم حدیث اور تہذیب و راسخ تھا کہ ایک ایک محدث کے
 حلقہ درس میں ہزار ہا طلبہ کی شرکت ایک معمولی بات تھی۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسند
 عراق امام علی بن عاصم واسطی امام اعظم کے مشہور شاگرد کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے حلقہ درس
 میں تیس ہزار سے زیادہ طلبہ کا ہجوم ہوتا تھا۔ اور ان ہی کے صاحبزادے امام ابو الحسین
 عاصم بن علیؒ جو امام بخاری کے بھی استاد ہیں اور جن سے انہوں نے اپنی صحیح میں
 روایات بھی لی ہیں ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے۔ بغداد آئے ان کے
 اطلاقی درس میں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ابو الحسین بن المبارک کا بیان ہے کہ ان کی مجلس درس
 میں طلبہ کا اندازہ ایک لاکھ انسانوں سے اوپر لگایا جاتا تھا۔ عمر بن حفص کہتے ہیں کہ مقتصد باللہ

۱، ۲، مناقب موفق ص ۳۸۔ ۳، مقدم فتح الباری ص ۵۲۴۔

۴، ۵، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۵۹۔

نے ایک بار اپنے کارندوں کو رجعتہ النخل میں صرف اس مقصد کی خاطر روانہ کیا تھا کہ اندازہ لگائیں کہ امام عاصم کے درس حدیث میں کتنی تعداد ہے؟ امام عاصم چھت پر بیٹھ کر لوگوں کو سنتے تھے میں نے ایک روز سنا ہے کہ فرمایا ہے تھے حدیثنا اللیث بن سعد ہجوم اتنا تھا کہ آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی آپ نے اسی روز ایک کلمہ چودہ بار کہا اس مجلس کے شرکار کا اندازہ لگایا گیا تو ایک لاکھ بیس ہزار تھے لے امام اعظم ہی کے ایک اور شاگرد خاص ہیں ترمذی بن ہارون جو فن حدیث میں مشہور امام ہیں ان کے متعلق یحییٰ بن طالب کا بیان ہے کہ ان کی مجلس میں ستر ہزار کی حاضری ہوتی تھی بلکہ امام محمد کے بارے میں حضرت امام شافعی کا بیان ہے کہ امام محمد جب کوفہ میں موٹا کا درس دیتے تو ان کی فردو گاہ پر لوگوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ جگہ تنگ ہو جاتی اسی زمانے میں امام شافعی تحصیل علم کی خاطر کوفہ تشریف لاتے تھے کیونکہ یہ بتانے سے پہلے امام شافعی نے امام محمد کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ امام محمد فرماتے ہیں کہ میں امام مالک کی بنا مرتب میں تین سال رہا ہوں اور اس عرصہ میں میں نے ان سے سات سو حدیثیں سنی ہیں یہ ساری داستان امام مالک کی وفات کے بعد کی ہے اس کی پوری تفصیل اسد بن فرات نے اس طرح بتائی ہے کہ :

ہم ایک روز امام محمد کے حلقہ درس میں موجود تھے دفعۃً ایک شخص گرو میں پھلانگتا ہوا امام محمد کے پاس آیا اور ہم نے امام محمد کی زبان سے یہ الفاظ سنے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ مُصِیْبَةً مَا اَعْظَمَهَا مَاتَ مَالِکُ بْنُ أَنَسٍ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الْحَدِیْثِ اِنَّا لَنَدْرُکُہُ بِرُحْمِیْ مُصِیْبَتِہِ ہے کہ امیر المؤمنین فی الحدیث امام مالک کی وفات ہو گئی ہے۔ امام محمد جب اس کے بعد امام مالک سے حدیثیں بیان کرتے تو لوگ امام مالک کی حدیثوں کے شوق میں اس کثرت سے آپ کی خدمت میں آتے کہ آپ کے یہاں آنے کے راستے بند ہو جاتے اور جب امام مالک کے سوا کسی اور کی حدیثیں

لے تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۵۹ - لے تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲

لے الانتصار ص ۵۳ لے نیل الایمانی

بیان کرتے تو خواص ہی خواص آتے آتے

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس دور میں جب گھر گھر حدیث کا چرچا تھا محدثین کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد حیرت انگیز نہیں ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت امام اعظم کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد کیسے پیدا ہو گئی جبکہ علم حدیث کی ابھی صبح صادق ہی طلوع ہوئی ہے۔ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے سالانہ میں سرکلر جاری کیا گیا کہ احادیث جمع کی جاتیں جیسا کہ آپ انشاء اللہ اساتذہ اوراق میں اس کی تفصیل پڑھیں گے۔ اس سرکلر کے بارے میں حافظ ابو نعیم نے بتایا ہے کہ یہ آفاق یعنی اطراف مملکت میں روانہ کیا گیا۔ اس آفاق سے مراد مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں یہی وہ مقامات تھے جہاں سے علم نبوی کے چشمے ابل ابل کر سائے عالم میں رواں ہوتے چنانچہ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

یہ پانچ شہر مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام ہی ہیں جن سے علوم

نبوت یعنی ایمانی، قرآنی اور شرعی علوم نکلے ہیں

ورنہ علم حدیث کی تدوین فن روایت و اسناد کے لحاظ سے دور تابعین کے آخر میں وجود پذیر ہوئی ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں۔

زمانہ تابعین کے آخر میں تدوین آثار کا کام رونما ہوا ہے۔

الغرض اس دور میں جبکہ روایت و اسناد کی فنی طور پر ابھی صبح صادق ہی طلوع ہوئی ہے۔ اساتذہ کی یہ تعداد کثیر اس بات کی شہادت ہے کہ امام اعظم نے علم حدیث حاصل کرنے میں بہت بڑی محنت، عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ الغرض امام اعظم نے علم حدیث میں اس درجہ کمال پیدا کر لیا تھا اور ایسی محنت کی کہ امام علی بن عاصم جیسا نامور محدث امام اعظم کے بارے میں یہ اقرار چھوڑ گیا۔

اگر ابو حنیفہ کے علم کو دوسروں کے علم کے مقابلے میں تو لا جائے تو ابو حنیفہ کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔

۱۔ نیل الایمانی ۲ منہاج السنہ ج ۲ ص ۱۴۲ کے مقدمہ فتح الباری ص ۴

۲۔ مناقب امام اعظم الذہبی ص ۴۔

امام اعظم کے اساتذہ میں پہلا طبقہ

امام اعظم کے ان اساتذہ میں سب سے پہلا طبقہ صحابہ کرام کا ہے محدثین کے ایک طبقہ نے مثلاً حافظ ولی الدین عراقی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سخاوی نے خالص اسنادی اور روایتی نقطہ نظر سے امام اعظم کے صحابہ کے تلمذ پر لکھ تصحیح روایت صحیح نہیں ہے لکھ دیا ہے۔ اس سے بہتوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ امام اعظم کو صحابہ سے شرف تلمذ ثابت نہیں بلکہ اس کا عدم ثابت ہے اور صحابہ کے نام سے امام کی روایات موضوع ہیں حالانکہ اصول محدثین کی رو سے ایسا سمجھنا خطرناک غلطی ہے اور نہ صرف غلطی بلکہ فن روایت کے مسلمہ اصول و قواعد سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ:

محدثین بسا اوقات لایصح اور لایثبت کا لفظ بولتے ہیں نادان اس کا مطلب یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ حدیث محدثین کے یہاں موضوع ضعیف ہے ایسا سوچنا ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے یہ

مشہور محدث ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ صحیح نہیں ہے، کا مطلب برگزیدہ نہیں ہے کہ بات گھڑی ہوئی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حسن یا ضعیف ہے۔ علامہ نور الدین جوہر العقیدین فی فضل الشرفین، میں فرماتے ہیں کہ امام احمد کے حدیث عاشوراء پر لایصح کے ریمارکس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باطل ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح تو نہ ہو لیکن قابل استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کا درمیان درجہ حسن ہی ہے۔ امام زرکشی نکت علی ابن الصلاح میں فرماتے ہیں کہ محدثین کی دونوں تعبیروں موضوع اور لایصح میں بہت بڑا فرق ہے۔ موضوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا جھوٹ اور بات کا گھڑی ہوئی ہونا ثابت ہو گیا ہے اور لایصح میں صرف صحیح نہ ہونے کی خبر ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا عہد بھی ثابت ہو حافظ ابن حجر عسقلانی "القول المسدود فی الذب عن مسند احمد" میں لکھتے ہیں کہ حدیث کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ علامہ محمد بن عبدالباقی شرح مواہب لدنیہ میں حدیث

يُطْلَعُ اللَّهُ كَيْلَةَ النُّصُفِ مِنْ شُعْبَانَ فَيُخَفِّرُ لِجَمِيعِ خَلْقِهِ إِلَّا
الْمُشْرِكَ أَوِ الْمُشَاقِقَ -

پیر ابن وحیہ کا کلام لسم یصح فی لیلۃ نصف شعبان شیئ نقل کر کے رقمطراز ہیں کہ
شاید ابن وحیہ کی مراد اصطلاحی صحت ہے کیونکہ یہ حدیث حسن ہے اگرچہ
درجہ صحت کو نہیں پہنچی بلکہ
مولانا عبدالحی فرماتے ہیں:

کسی حدیث پر محدثین کا عدم ثبوت اور عدم صحت کا حکم لگانا عرف
محدثین کے مطابق حدیث کے ضعیف اور موضوع ہونے کو لازم نہیں
بلکہ ممکن ہے کہ حدیث حسن لذاتہ یا لغيرہ ہو۔

اسی بنا پر امام ترمذی اپنی جامع میں ایک حدیث لاتے ہیں اور خود اس کی تضعیف بھی کرتے ہیں
لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ والعمل علی هذا عند اهل العلم۔ اس کا مطلب یہی
ہے کہ اسنادی اور روایتی طور پر صحیح نہ ہونے سے اصل بات کا نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل یہاں
حدیث ضعیف بھی دو قسم کی ہیں ایک وہ جس میں شرائط صحت میں سے کوئی شرط نہ ہو اور دوسری
وہ جس میں شرائط قبول میں سے کوئی شرط نہ ہو۔ اس لیے امام اعظم کے صحابہ سے ملحد کے موقعہ پر
محدثین کے یہاں لا یصح دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا کہ ان اکابر کے نزدیک یہ داستان
گویا بناوٹی ہے بہت بڑی جبرأت اور بے باکی ہے۔ مشہور حدیث افراق امت کے متعلق مجدالدین
فیروز آبادی نے سفر السعاده کے خاتمہ میں یہ لکھا ہے کہ لسم یثبت فیہ شیئ (اس موضوع
پر کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے) حالانکہ چند در چند طرق سے آنے کی وجہ سے درجہ صحت
کے قریب قریب ہے جیسا کہ امام حاکم لکھتے ہیں کہ ایک سے زیادہ طرق سے اس حدیث
کا آنا اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ:

صاحب قاموس علامہ مجدالدین نے سفر السعاده میں ایک سے زیادہ
احادیث کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہیں
اس سے ہمارے زمانے کے ناواقفوں کو دھوکا ہو گیا ہے۔ اور

انہوں نے احادیث ثابتہ پر موضوع، ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے کا فتویٰ لگا دیا ہے۔

صحابہ سے روایت کا شرف

ذرا اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ امام اعظم کی صحابہ سے روایت کی حیثیت واقعات کی دنیا اور قانون کی نظر میں کیا ہے؟ یہی نہ کہ امام اعظم کے لیے ایک جزوی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ فضل و بزرگی ہے جس میں ائمہ میں سے امام اعظم کا شریک کوئی نہیں ہے۔ اگر صرف اتنی بات ہے تو اس میں روایتی و اسنادی کمزوریوں سے صرف نظر تو خود محدثین کی طے کردہ پالیسی ہے حلال و حرام میں اسنادی کمزوریوں کو تلاش کرنا محدثین نے ناگزیر بتایا ہے لیکن جہاں تک فضائل اور سیر کا میدان ہے اس میں وہ ضعیف روایات کو بھی شرف قبول عطا کر دیتے ہیں۔ مشہور محدث علی الحلبي "انسان البیون فی سیرۃ الایمن والمامون" میں رقمطراز ہیں کہ — سیرت میں صحیح، ضعیف، موضوع، مرسل، منقطع اور معضل سب اسی قسم کی روایات ہوتی ہیں۔ امام احمد نے فرمایا ہے کہ جب ہم حلال و حرام کو موضوع بحث بناتے ہیں تو ہم متشدد ہوتے ہیں اور فضائل میں ہم قسائل ہوتے ہیں خطیب بغدادی نے اس موضوع پر الکفایہ میں ایک مستقل عنوان قائم کر کے ائمہ کی تصریحات جمع کر دی ہیں علامہ ابن سید الناس نے "عیون الاثر فی فنون المغازی والسير" میں مشہور مؤرخ محمد بن اسحاق کی توثیق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

کلبی سے زیادہ تر روایات انساب ایام عرب اور لوگوں کے احوال سے متعلق ہیں اس موضوع پر علماء چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ان لوگوں سے بھی روایات لے لیتے ہیں جن کی احکام میں احادیث معتبر نہیں ہوتی ہیں اس میں رخصت ہے اور یہ رخصت امام احمد سے منقول ہے یہ ملا علی قاری نے مشہور رسالہ "الحظ الاو فر فی الحج الاکبر" میں اس حدیث پر کہ
أَفْضَلُ الْأَيَّامِ يَوْمُ عَرَفَةَ إِذَا وَافَقَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَهُوَ
أَفْضَلُ مِنْ سَبْعِينَ حَجَّةً
یہ نوٹ لکھا ہے کہ

لہ تحفۃ المکملۃ علی حواشی تحفۃ الطلبہ ص ۵۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والسير ص ۱۵

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث ضعیف فضائل میں تمام علماء کے نزدیک قابل اعتبار ہے یہ حافظ سیوطی نے بھی یہ بات طلوع الشریع، التعظیم والمنہ اور المقامۃ السندیہ میں لکھی ہے۔ حافظ عراقی نے شرح الغیر میں، امام نووی نے تقریب میں اور سیوطی نے اس کی شرح تدریب میں اس بات کو بار بار صاف کیا ہے۔ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر امام اعظم کی اس جزوی فضیلت کے موضوع پر یہ رد و کد کچھ بے معنی سی بات ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے سب سے پہلے دارقطنی نے صدیاں گزرنے پر یہ بات لوگوں کو بتائی ہے کہ :

امام ابو حنیفہ نے کسی صحابی سے ملاقات نہیں کی البتہ انہوں نے حضرت انس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر ان سے کوئی بات نہیں سنی۔

دارقطنی کے بعد خطیب بغدادی نے بھی تاریخ بغداد میں یہی بات دہرا دی ہے چنانچہ سعید بن ابی سعید نیشاپوری کے ترجمہ میں امام اعظم کی ایک حدیث کو بواسطہ امام ابو یوسف بالاسناد نقل کرنے کے بعد کہ جس میں حضرت انس سے امام اعظم کے سماع کی تصریح موجود ہے لکھتے ہیں :

امام ابو حنیفہ کا حضرت انس سے سماع صحیح نہیں ہے یہ

اور امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں :

امام ابو حنیفہ نے انس بن مالک کو دیکھا ہے۔

اس کے بعد شوافع میں زین الدین عراقی اور ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہی ہم زبان ہو گئے۔

رنہ اس سے پہلے اس موضوع پر متقدمین میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا اسی بنا پر ملا علی قاری مزیں سند امام میں فرماتے ہیں ۔

وَالْمُعْتَمَدُ ثَبَوْتُهَا

پائیدار بات یہی ہے کہ امام اعظم کا صحابہ سے تلمذ ثابت ہے

امام اعظم کا حضرت انس بن مالک سے تلمذ

صحابہ میں جن اکابر کے سامنے امام اعظم نے زانوئے ادب نہ کیا ہے ان میں حضرت انس بن

مالک کا مقام سب سے اونچا ہے ان کی کنیت ابو حمزہ ہے۔ انصارِ مدینہ میں بنی سنجار سے تعلق کی وجہ سے سنجاری ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ملکہ بنتِ طحان اور کنیت ام حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہیں۔ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت مدینہ تشریف لائے میری عمر دس سال تھی حضور انور رحلت فرماتے دار بقا ہوئے تو میں بیس سال کا تھا ان کو ان کی والدہ ہی خدمتِ اقدس میں لائی تھیں اور عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! خدمت کے لیے خادم لاتی ہوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرف قبول عطا فرمایا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور انورؐ سے ایک بار دعا کی درخواست کی آپ نے دعا فرمائی اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهُ وَوَلَدَهُ فرماتے ہیں کہ مال کی اتنی فراوانی ہوئی کہ میرے سختان اور ناکستان میں سال بھر میں دو بار پھیل آتا۔ اولاد کا حال یہ ہے کہ میری اولاد اور اولاد کو اولاد کو اگر اس وقت شمار کیا جائے تو ایک سو کے قریب ہیں۔ حضرت ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے ہاتھوں نے حضور انورؐ کے ہاتھوں کو چھویا ہے؟ فرمایا کہ ہاں حضرت ثابتؓ نے فرمایا ذرا ہاتھ دیکھتے ہیں اس کو بوسہ دوں۔ مسند امام احمد میں ہے نصر بن انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ نے روزِ قیامت کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کی حضور انورؐ نے وعدہ فرمایا حضرت انسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ سے قیامت کے روز کہاں ملوں؟ فرمایا پل صراط پر دیکھنا وہاں نہ ملوں تو میزانِ عمل پر دیکھنا وہاں بھی نہ ملوں تو حوضِ کوثر پر ملنا یہ

حافظ ابن کثیر نے ابو بکر بن عیاش کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت انسؓ سے عبد الملک بن مروان کے پاس حجاج بن یوسف ثقفی گورنرِ حجاز کے متعلق ایک شکایتی خط بھیجا اور لکھا کہ یہودی اور عیسائیوں کو اگر کہیں اپنے نبی کا خادم مل جائے تو وہ اس کا عدد درجہ اکرام کریں۔ میں نے پندرہ دس سال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارے ہیں اور آپ کی خدمت کی ہے لکھ ہے کہ عبد الملک نے حجاج کو خط لکھا خط میں یہ درج تھا :

جب میرا خط تم کو ملے تو ابو حمزہ کے پاس جاؤ اُن کو راضی کرو اُن کے ہاتھ اور پاؤں چومو ورنہ تم کو میری جانب سے ایسی سزا ملے گی جس کے تم مستحق ہو رہے

خط پہنچتے ہی حجاج نے حضرت انسؓ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن حجاج ہی کے ایک دوست نے صلح کرادی۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں عرصہ دراز تک رہے آپ بے شمار احادیث کے امین تھے۔ عمر طویل پائی ہے آپ بصرہ میں دنیا روئے ہونے والے صحابہ میں آخری صحابی تھے۔ امام بخاری نے ان سے اسی حدیثیں لی ہیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ۹۲ھ میں بصرہ میں آپ کا انتقال ہوا ہے ہذا هو المشہور و علیہ الجہور۔ اُس وقت امام اعظم کی عمر تیرہ سال تھی۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں، صدر الامہ مکی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبصیر فی تصحیف میں حضرت انس کی یہ حدیث بحوالہ امام اعظم درج کی ہے۔

أَبُو حَلِيفَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ

جیسا کہ امام اعظم کی داستان علم میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام اعظم کا زمانہ طلب علم چھپٹنا اور بچپن سے اور آپ کی علمی طلب گاریوں کا آغاز علم کلام سے ہوا ہے۔ بصرہ اس زمانے میں علم کلام کی منڈی تھی۔ علم کلام کی تحصیل کے لیے امام اعظم کا کوفہ سے بصرہ جانا اور بصرہ میں قیام کرنا مشہور

۱۷ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶۲

۱۷ یہ حدیث حافظ خسرو نے بحوالہ قاضی ابو یوسف عن ابی حنیفہ تین متصل سندوں سے اور قاضی ابوبکر محمد بن عبد الباقی نے اپنے مسند میں دو متصل سندوں سے بیان کی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی حافظ ابومعشر سے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں میری رائے میں یہ حدیث صحیح کے ہم پلہ ہے کیونکہ میرے علم میں یہ حدیث سچاں طرق سے مروی ہے (تبصیر فی تصحیف ص ۶) حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے کچھ طرق کی بعض ائمہ نے تصحیح فرمائی ہے۔ حافظ ابوالحجاج المزنی کا اعتراف ہے کہ کثرت طرق کی وجہ سے یہ حدیث حسن کے درجے میں ہے اس موضوع پر ان اکابر سے احادیث آئی ہیں۔ ابی جابر، حذیفہ، الحسین بن علی، سلمان، سکرة، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، عیاض، معاویہ، نبیط، ابو سعید، ابو ہریرہ، عائشہ، ام ہانی وغیرہ وغیرہ۔

ہے امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں بصرہ میں بیس سے زیادہ بار گیا ہوں۔ اسی زمانے میں آپ کو حضرت انس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ابو نعیم نے بالتصریح لکھا ہے کہ امام اعظمؒ نے حضرت انس کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں سنی ہیں۔

امام اعظمؒ کا حضرت عبداللہ بن الحارث سے تلمذ

یہ بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ان کی بود و باش مصر میں تھی، ارشادات تبیین کے امین تھے۔ اہل مصر نے ان سے ارشادات کو سن کر اُگے نقل کیا ہے۔

حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم و فضلہ میں بسند متصل خود امام اعظمؒ کی زبانی نقل کیا ہے:

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حج کو گیا میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم ہے میں نے والد محترم سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ والد صاحب نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ ان کا نام نامی عبداللہ بن الحارث ہے میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا فرمائیے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنا رہے ہیں۔ میں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بھی آگے لے چلیے تاکہ میں بھی ان کی زبان مبارک سے ارشاد گرامی سنوں۔ والد محترم لوگوں کو چیرتے پھاڑتے آگے آگے ہو گئے تا آنکہ میں حضرت عبداللہ کے پاس پہنچ گیا میں نے سنا کہ آپ فرمائیے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس شخص نے اللہ کے دین میں فقہانیت بہم پہنچائی اللہ اس کو اس کے غم میں کافی ہوگا اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچائے گا جہاں کا اس کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

سبط بن الجوزی نے الانتصار والترجیح میں حافظ ابو نعیم اصفہانی کے حوالے سے جن صحابہ کرام

کے بارے میں امام اعظم کی دید و شنید کو مانا ہے ان میں حضرت عبداللہ بن الحارث بن جہز بھی ہیں نیز اس روایت کو الحافظ الاستاذ ابو محمد حارثی، الحافظ ابو عبد اللہ الحسین بن محمد اور حافظ ابو بکر محمد بن عبد الباقی نے اپنے مسانید میں باسانید متصلہ درج کیا ہے۔ تاج الاسلام حافظ عبد الکریم سمعانی فرماتے ہیں کہ حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں بسند متصل اس کی تخریج کی ہے یہ

حافظ ابن عبد البر جو خطیب بغدادی کے معاصر بھی ہیں جامع بیان العلم میں حضرت عبداللہ کی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد جس میں امام اعظم نے اپنے سماع کی تصریح کی ہے سماع کے ثبوت میں لکھا ہے کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ امام اعظم نے حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن الحارث کو دیکھا ہے اگرچہ حضرت عبداللہ کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے اور اختلاف کی وجہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے جو حافظ ذہبی نے اپنی تاریخ کبیر کے مقدمہ میں بتائی ہے کہ متقدمین نے ضبط تاریخ ہائے وفات کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے صرف اپنے حافظ پر ہی بھروسہ کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے صحابہ کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی اور یہی صورت حال زمانہ شافعی تک تابعین کے بارے میں رہی ہے لیکن حضرت عبداللہ کی اسی حدیث کو حافظ ابو بکر الجعابی نے نقل کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن الحارث کی تاریخ وفات مسلمہ ہے۔ واضح ہے کہ حافظ ابو بکر الجعابی علل حدیث اور تاریخ رجال میں بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابو عبد اللہ الحاکم اور حافظ دارقطنی نے فن حدیث میں ان کے سامنے زائے شاگردی کیا ہے

لے یہ حدیث اگرچہ متعدد سندوں سے آتی ہے لیکن ہم نے جو روایت نقل کی ہے اس کی تخریج حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں بطریق یوسف ابن احمد المسکی از ابی جعفر القسطلی ابی علی الرازی و محمد بن سماعہ از قاضی ابی یوسف امام اعظم سے کی ہے۔ حافظ ابو الحسن علی بن محمد الکفانی نے اس کو ابو العباس احمد بن الصلت بن القلس والی روایت کا تابع قرار دیا ہے بلاشبہ احمد بن الصلت پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ کلام کیا ہے مگر حافظ ابو زرہ حافظ ابو حاتم جیسے ائمہ فن رجال نے ان کی صداقت اور ثقاہت کو سراہا ہے دراصل بعد میں آنے والوں کی برہمی کا باعث یہ ہے کہ احمد صاحب نے ایک ضخیم کتاب امام اعظم کے مناقب پر کیوں لکھی یہ کتاب بعض ارباب ظلم کے لیے ان کے خلاف برہمی کا باعث ہو گئی حتیٰ کہ دارقطنی کو تو ان پر اس قدر غصہ آیا کہ ان کی اس کتاب ہی کو موضوع قرار دے دیا لیکن حافظ دارقطنی کو جو امام اعظم سے سو عقیدت ہے اس کی موجودگی میں ان سے کچھ اور توقع ہی بیکار ہے۔ لے الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰

چار لاکھ حدیثوں کو نوک زبان کیے ہوئے تھے حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

كَانَ بَارِعًا فِي مَعْرِفَةِ الْجُلَلِ وَثِقَاتِ الرِّجَالِ وَتَوَارِيخِهِمْ

حدیثوں کی عمل شناسی رجال اور ان کی تاریخ میں بڑے ہی ماہر تھے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے۔ الحافظ البارع فریذ زمانہ۔ اگرچہ

حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں صرف ان دو صحابہ ہی کا تذکرہ کیا ہے مگر امام ابو معشر عبدالمکرم نے ان دو کے ساتھ چار کے اور نام بھی بتائے ہیں۔ صدر الامر مکی بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ حافظ ابونعیم اصفہانی نے جن کے آگے فن حدیث میں خطیب بغدادی نے بھی زانوئے شاگردی طے کیا ہے لکھا ہے کہ امام اعظم نے صحابہ میں سے حسب ذیل حضرات کو دیکھا اور ان سے حدیثیں سنی ہیں حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن الحارث اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ۔ ملک الحفاظ یحییٰ بن معین جو فن جرح و تعدیل میں مسلم الثبوت امام اور علم حدیث کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں اپنی تاریخ میں رقمطراز ہیں:

إِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ صَاحِبَ الرَّايِ سَمِعَ عَائِشَةَ بِنْتَ عُمَرَ وَتَقُولُ

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْثَرَ حَبْنَدِ اللَّهِ

فِي الْأَرْضِ الْجَزْأُ لَا أَكُلُهُ وَلَا أَحَرِمُهُ

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے امام اعظم کا تلمذ

ان کی کنیت کچھ کی گئی ہے ابو معاویہ اور کچھ کہتے ہیں کہ ابو ابراہیم ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۳۷۷ھ میں کوفہ تشریف لائے اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے صحابہ میں یہ آخری صحابی ہیں اور امام بخاری کے حوالے سے ان کی تاریخ وفات ۳۷۹ھ بتائی ہے۔ اگر ان کی تاریخ فی الواقع ۳۷۹ھ ہے تو اس وقت امام اعظم کی عمر نو سال ہے اس عمر میں نہ دیکھنا مستبعد ہے اور نہ سننا۔ اور جب کہ امام اعظم کے خاندان میں اس کا مزید اہتمام بھی تھا کہ بچوں کو صحابہ کی خدمت میں لے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے والد ماجد ثابت بھی بچپن میں حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ان کے 'وران کی اولاد کے حق میں دُعا بھی فرمائی تھی۔ ایسی صورت میں اگر

امام اعظم نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی نو سال کی عمر میں زیارت کی اور حدیثیں سُنی ہیں تو اس میں انکا کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں جہاں تک روایت سننے کا معاملہ ہے وہ محدثین کے یہاں اتفاقی ہے۔

تحمّل روایت کی عمر اور محدثین

تحمّل روایت کے لیے نو سال تو بڑی عمر ہے امام بخاری نے کتاب العلم میں مثنیٰ یصح سماع اصغیر کا عنوان قائم کر کے محمود بن ابریح کی زبانی ایک واقعہ نقل کیا ہے اس واقعہ میں خود ان صحابی کا بیان ہے کہ میری عمر پانچ سال تھی اور الخطیب نے بھی لکھا ہے کہ محمود کی عمر حضور انور کی وفات کے وقت پانچ سال تھی اے حافظ ابن عبدالبر نے اس عمر میں روایت لینے پر محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے اور حفظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں محمود کی اس روایت کی وجہ سے پانچ سال پر محدثین کا عمل بتایا ہے۔
وَهُوَ الَّذِي اسْتَقَرَّ عَلَيْهِ اهْلُ الْحَدِيثِ يَه
اسی پر محدثین کا عمل ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی عمر حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کے دنیا سے رحلت فرماتے وار بقا ہونے کے وقت نو سال تھی اور یہ محدثین کی قائم کردہ اس تحدید سے کہیں زیادہ ہے جو انہوں نے تحمّل روایت کے لیے ضروری قرار دی ہے جیسا کہ حافظ ابن الصلاح نے قاضی عیاض کے حوالے سے بتایا ہے۔

محدثین نے اس میں ضابطہ یہی بتایا ہے کہ تحمّل روایت کی کم از کم عمر محمود کی ہے۔ اس لیے اس کی پذیرائی ہر شک و شبہ سے قطعی طور پر بالا ہے فَاذَنْ لَا يُنْكِرُ سَمَاعُ الْإِمَامِ مِنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى يَه
اس لیے امام اعظم کا سماع حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے ناقابل انکار ہے۔

حافظ ابو معشر عبدالمکرم نے اپنے رسالہ میں ان کے حوالے سے امام اعظم کی یہ روایت نقل کی ہے امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

جس نے مسجد بنائی خواہ وہ پھیل کے آشیانے جتنی ہو اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بناتے گا۔

ان مذکورہ صحابہ کے علاوہ حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ اور ابوالطفیل عامر بن واثلہؓ ۱۲؎ مکہ میں بقید حیات تھے۔ محدثین نے ان سے بھی امام اعظم کی دید و شنید بتاتی ہے۔ اگر امام اعظم نے ان سے بھی کچھ حدیثیں سُنی ہیں اور ان کے سامنے بھی چھپنے میں زانوئے ادب اٹھایا ہو تو اس میں انکار کی کیا بات ہے؟

اتصالِ روایت کی شرط

اتصالِ روایت کی حد تک امام بخاریؒ تو اگرچہ ایک بار ملاقات کو ضروری بتاتے ہیں لیکن امام مسلمؒ کے خیال میں اتصال کے لیے ملاقات ضروری نہیں وہ تو صرف ہم عصر ہونا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ہم عصری ثابت ہو جانے کے بعد روایت کو بلفظ عن پیش کرنا درست ہے بلکہ امام مسلمؒ تو معاصر کے ساتھ ملاقات کی شرط کو من گھڑت اور من مانی بات قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

إِنْ أَشْتَرَا طَلَقًا قَوْلَ "مُخْتَرَعٌ لَمْ يُتَّبَقْ قَائِلُهُ إِلَيْهِ"
ملاقات کی شرط ایک من گھڑت بات ہے اس سے پہلے اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

اور پھر امام مسلمؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دعوے کے پیچھے اجماع کی طاقت ہے۔ یاد ہے کہ امام مسلمؒ کا یہ اختلاف صرف حدیث معنیٰ میں ہے۔ بہر حال ایسی حالت میں امام اعظمؒ کی احادیث معنیٰ کو جو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں دراصل وہ فن کا منہ چڑاتے ہیں کیونکہ اگر یہ روایات پایہ ثبوت کو نہ پہنچیں تو امام سیبکی بن معینؒ، حافظ ابوالنعیم شافعیؒ، حافظ ابن عبد البر مالکیؒ جو حدیث و روایت کے اراکین خیال کیے جاتے ہیں ہرگز اس بات کی تصریح نہ کرتے کہ امام اعظمؒ نے صحابہ سے حدیثیں سُنی ہیں۔

الغرض میں اس داستان کو یہیں ختم کرتا ہوں اور بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ نے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے سب سے پہلے اپنے شہر کوفہ کے اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آئیے پہلے سراپے کچھ کوفہ میں علم حدیث کا حال سن لیجئے۔

لَقَدْ تَرَكْتُ ابْنَ أُمِّ عَبْدِ هَاشِمٍ لَدَى مُرَجِّ الْكُوفَةِ يَلِّهُ

جب فقہ یعنی علم قانون جو علوم شرعیہ کا آخری درجہ ہے اس کے طلبہ کی تعداد یہ تھی تو ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کے طلبہ کی تعداد تو اس سے کئی گنا زائد ہوگی۔ چنانچہ امام ابو بکر الجصاص رازی نے احکام القرآن میں حجاج کے خلاف عبدالرحمن بن الاشعث کی قیادت میں اٹھی ہوئی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اس تحریک میں نکلنے والوں میں چار ہزار قاریوں کی تعداد تھی۔

اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں امام ابن سیرین سے جو اکابر تابعین سے ہیں حدیث کے طالب علموں کے بارے میں یہ بیان نقل کیا ہے کہ

قَدِمْتُ الْكُوفَةَ وَبِهَا أَرْبَعَةُ آلَافٍ يَطْلُبُونَ الْحَدِيثَ يَلِّهُ

میں کو فہ آیا تو وہاں چار ہزار حدیث کے طالب علم تھے۔

طبقات ابن سعد کی ایک پوری جلد میں کو فہ کے علماء کا تذکرہ ہے۔ ان میں صحابہ، تابعین، اشباع تابعین کے علماء کا ایک طویل تذکرہ ہے ہم نے سرسری طور پر طبقات میں کو فہ کے علماء کو شمار کیا۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ نکلی جبکہ اسی کتاب میں دوسرے شہروں کے علماء کا شمار اس کے عشر عشر بھی نہیں ہے۔

مشہور محدث حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں اسلامی شہروں کے نامور محدثین کا تذکرہ کیا ہے مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ تمام شہروں میں یہ شرف صرف کو فہ ہی کو حاصل ہے کہ اس کے ائمہ حدیث کا تذکرہ کتاب کے پورے ساڑھے سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے جبکہ دوسرے شہروں میں سے کسی بھی شہر کے محدثین کا تذکرہ اسی کتاب میں ایک صفحہ سے زائد نہیں ہے۔ حافظ ابو محمد راہر مزنی نے اپنی کتاب "المحدث الفاضل" میں کو فہ میں علم حدیث کے موضوع پر مشہور محدث عفان بن مسلم سے بسند متصل نقل کیا ہے:-

عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم فلاں کتابیں نقل کر چکے ہیں۔ اس پر فرمانے لگے کہ ہماری ساتھی میں اس قسم کے لوگ کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ ہمارا دستور تو یہ تھا کہ جب ایک استاد کے

پاس جاتے تو اس سے وہ روایتیں سنتے جو کسی اور سے نہ سنی ہوتیں اور
 دوسرے سے وہ سنتے جو پہلے سے نہ سنی ہوتیں۔ چنانچہ جب ہم کوفہ
 آئے تو چار ماہ ٹھہرے اگر ہم چاہتے کہ ایک لاکھ حدیثیں لکھ لیں تو
 لکھ سکتے تھے مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔ ہم نے
 کوفہ میں کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو عربیت میں غلطی کرتا ہو بلکہ
 اور علامہ تاج الدین سبکی نے الطبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں حافظ ابو بکر بن ابی داؤد کی زبانی یہ
 بیان لکھا ہے کہ :

میں جب کوفہ میں آیا تو میرے پاس ایک ہی درہم تھا میں نے اس درہم
 سے تیس درہم خریدا لیا۔ ایک درہم کھانا اور اشیاء سے ایک ہزار حدیثیں
 لکھتا۔ اس طرح ایک ماہ میں میں نے تیس ہزار حدیثیں جن میں مقطوع
 اور مرسل بھی شامل تھیں لکھ لیں۔
 ذرا غور فرمائیے اس شہر میں حدیث کی بہتات کا کیا حال ہو گا عفان بن مسلم جیسا امام عالم حافظ

۱۔ مقدمہ علی نصب الراية ص ۳۵ - ۲۔ طبقات ص ۱۳۰ -

۳۔ عفان بن مسلم امام احمد اور امام بخاری کے استاد ہیں علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ ان کی عادت تھی کہ اگر
 حدیث کے کسی بھی لفظ میں ان کو ذرا شبہ ہوتا تو اسے سر سے ہی سے چھوڑ دیتے (تقریب) حدیث میں ان کی
 جلال شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مشہور محدث یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ جب کسی حدیث میں مجھے
 عفان کی بمنوائی حاصل ہو جائے تو پھر مجھے کسی کی بھی مخالفت کی پرواہ نہیں۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ محدثین
 پانچ ہیں، مالک بن جریر، ثوری، شعبہ اور عفان (مذکرۃ الحفاظ ص ۳۴۵) امام احمد فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں عبد الرحمن بن مہدی
 سے زیادہ رسول اللہ کے مالک ہیں کتاب الجرح والتعديل ج ۳ ص ۳۰) ابن ابی حاتم نے ان کے اساتذہ میں حماد بن زید، حماد بن سلمہ اور
 امام شعبہ کو شمار کیا ہے اور حافظ ابن عبد البر نے الانقاء میں حماد بن زید کے بارے میں انکشاف کیا ہے، روای حماد بن زید عن
 ابی حنیفۃ احادیث کثیرہ (ص ۱۳) حافظ ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون الرشید کی جانب سے ان کو سرکاری وظیفہ ملتا تھا۔
 خلق قرآن کے مسئلہ میں یہ بھی امام احمد کے بمنوا تھے۔ سرکار ہارون نے ان کو اپنانے کی کوشش کی اسی سلسلے میں ان کا سرکاری وظیفہ
 بند کرنے کی دھمکی دی گئی تو فرمایا وفی السماء رزقکم واللہ غنیب نے وظیفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کان المامون بھری علی
 عفان خمساً مائۃ درہم کل شہر امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۲۲ھ میں ہوئی۔ بخاری ابو داؤد کی بھی یہی رائے ہے

چار ماہ میں سچا پس ہزار حدیثیں لکھ لے۔ کیا حدیث کی اس بستی کو کوئی ذہین آدمی قلیل الحدیث بستی کہہ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ جب ان کے صاحبزادے عبداللہؒ نے دریافت کیا کہ آپ کی سوتے میں طالب علم کو کیا کرنا چاہیے؟ یا ایک ہی استاد کی خدمت میں برابر حاضر رہ کر اسی سے حدیثیں لکھتا ہے یا ان مقامات کا رخ کرے جہاں علم کا چرچا ہے اور وہاں جا کر علماء سے استفادہ کرے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اسے سفر کرنا چاہیے اور دوسرے مقامات کے علماء سے حدیثیں لکھنی چاہئیں اور ان علماء میں سب سے پہلے امام احمدؒ نے کو فیتن ہی کا ذکر کیا۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

يَرْحَلُ وَيَكْتُبُ مِنَ الْكُوفِيِّينَ وَالْبَصَرِيِّينَ وَاهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَكَّةَ لَهٗ

سفر کرے اور کو فیوں، بصریوں اور مدینہ اور مکہ والوں سے احادیث لکھے۔ امام بخاریؒ نے طلب حدیث میں بخارا سے لے کر مصر تک تمام اسلامی شہروں کا سفر کیا تھا۔ دو دفعہ جزیرہ گئے چار بار بصرہ جانا ہوا چھ سال تک حجاز میں مقیم رہے مگر اس کے باوجود مکہ و بغداد کو اتنی اہمیت تھی کہ فرماتے ہیں:

میں شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کی ہر کابی میں کوفہ اور بغداد کتنی بار مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

آج بھی اگر آپ رجال کی کتابیں کھول کر بیٹھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے جن کی روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں۔ صرف بخاری شریف کو اٹھا لیجئے اور اس میں جس قدر صحابہ سے احادیث منقول ہو کر آتی ہیں ان پر ایک سمری نظر ڈالئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بترتیب حروف تہجی مقدمہ فتح الباری میں تمام صحابہ کو نام بنام لکھ دیا ہے۔ ان صحابہ میں سے جو خاص کوفہ میں آکر جاگزین ہوتے وہ ان کے نام پڑھ لیجئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ امام بخاریؒ کے ان گنت بار کوفہ جانے کا کیا باعث تھا اور پتہ لگ جائے کہ کوفہ کا حدیث میں کیا مقام ہے۔

۱۔ حضرت اشعث بن قیس الکندیؒ، ۲۔ حضرت عدی بن حاتمؒ، ۳۔ حضرت وہبان بن اوس السلمیؒ، ۴۔ حضرت عقبہ بن عمروؒ، ۵۔ حضرت بريدہ بن الحصیبؒ، ۶۔ حضرت علی بن ابی طالبؒ، ۷۔ حضرت جابر بن سمرہؒ، ۸۔ حضرت عمران بن الحصینؒ، ۹۔ حضرت جریر بن عبداللہؒ، ۱۰۔ حضرت عمرو بن حریثؒ، ۱۱۔ حضرت

جندب بن عبد اللہؓ، ۱۲۰۔ حضرت مرداس بن مالکؓ، ۱۳۰۔ حضرت حارثہ بن وہبؓ، ۱۴۰۔ حضرت مسیب بن حزنؓ،
 ۱۵۰۔ حضرت خدیفہ بن الیمانؓ، ۱۶۰۔ حضرت معن بن یزیدؓ، ۱۷۰۔ حضرت خباب بن الارتؓ، ۱۸۰۔ حضرت میسرہ
 بن شعبہؓ، ۱۹۰۔ حضرت زید بن ارقمؓ، ۲۰۰۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ، ۲۱۰۔ حضرت سلمان بن مرثدؓ، ۲۲۰۔ حضرت
 نعمان بن مقرنؓ، ۲۳۰۔ حضرت سمرہ بن خبابہؓ، ۲۴۰۔ حضرت نفیع بن الحارثؓ، ۲۵۰۔ حضرت سنین ابو جمیدؓ،
 ۲۶۰۔ حضرت وہب بن عبد اللہؓ، ۲۷۰۔ حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیؓ، ۲۸۰۔ حضرت عبد اللہ بن یزیدؓ،
 ۲۹۰۔ حضرت عبد الرحمن بن انبرئؓ۔

یہ ان کو فی صحابہ کے اسمائے گرامی ہیں جن کے حوالے سے امام بخاری نے صحیح میں ارشادات نبوت
 لیے ہیں اسی پر تمام صحاح ستہ کو قیاس کر لیجئے۔
 ذرا ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور بخاری شریف ہی کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے راویوں
 میں سب سے زیادہ تعداد جس شہر کے راویوں کی ہے وہ کوفہ ہی ہے۔ راقم الحروف نے اس ارادے سے
 بخاری شریف کے راویوں کا جائزہ لیا تو صرف شہر کوفہ کے راویوں کی تعداد صحیح بخاری میں تین سو سے
 زائد ملی ہے۔ اگر کتاب کی ضخامت کے زائد ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کے نام بدریہ ناظرین کرتے۔
 علماء محدثین نے حفاظ حدیث کے حالات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں صرف ان لوگوں کا
 تذکرہ ہے جو اپنے وقت میں حفاظ حدیث تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب تذکرۃ الحفاظ ہے
 یہ حافظ شمس الدین الذہبیؒ کی تصنیف ہے، حافظ موصوف نے اس کتاب میں کسی ایسے شخص
 کا تذکرہ نہیں کیا ہے جس کا شمار حفاظ حدیث میں نہ ہو۔ چنانچہ علامہ ابن قتیبہ کے متعلق لکھتے ہیں۔
 ابن قتیبہ علم کا خزانہ ہیں لیکن حدیث میں ان کا کام غور ہے اس لیے ہیں
 نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

اور خارج بن زید اگرچہ فقہاء سبعہ میں سے ہیں مگر ان کے بارے میں صاف تصریح کر دی ہے کہ
 چونکہ وہ قلیل الحدیث تھے اس لیے ہیں نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار
 نہیں کیا ہے۔

ایسے ہی اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے جو حفاظ حدیث تو ہیں مگر محدثین کے
 یہاں پایہ اعتبار سے ساقط ہیں چنانچہ امام ذہبی نے واقعہ میں اور ہشام کلبی کو اسی لیے حفاظ حدیث

میں شمار نہیں کیا۔

- اس کتاب میں سے صرف ۲۵۶ تک کے ان محدثین کا تذکرہ پڑھ لیجئے جن کو امام ذہبی نے کوئی کہا ہے ہم یہاں صرف ان محدثین کا ذکر کریں گے جن کے لیے امام ذہبی نے کتاب میں مستقل عنوان قائم کیا ہے۔
- ۱۔ علقمہ بن قیس الامام ۶۳ھ، ۲۔ مسروق الہمدانی ۶۳ھ، ۳۔ الاسود بن یزید النخعی ۶۲ھ، ۴۔ عبیدہ بن عمرو السملانی ۶۵ھ، ۵۔ سوید بن غفلة الکوفی ۶۵ھ، ۶۔ زبیر بن جہش ابو مریم الاسدی ۶۲ھ، ۷۔ ربیع بن خثیم ابو یزید الثوری ۶۳ھ، ۸۔ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ ۶۳ھ، ۹۔ ابو عبد الرحمن السلمی ۶۳ھ، ۱۰۔ ابوامیہ شریح بن الحارث ۶۵ھ، ۱۱۔ ابو مقدم شریح المقرحی ۶۵ھ، ۱۲۔ ابو داؤد شقیق بن سلمہ ۶۲ھ، ۱۳۔ قیس بن ابی حازم ۶۹ھ، ۱۴۔ عمرو بن میمون ابو عبد اللہ ۶۵ھ، ۱۵۔ زبیر بن وہب ابو سلیمان ۶۵ھ، ۱۶۔ معمر بن سوید ابوامیہ الاسدی ۱۲۰ھ، ۱۷۔ ابو عمرو سعد بن ایاس الشیبانی ۹۸ھ، ۱۸۔ ربیع بن حراش ۱۰۱ھ، ۱۹۔ ابراہیم بن یزید القیمی ۹۲ھ، ۲۰۔ ابراہیم بن یزید ابو عمران ۹۵ھ، ۲۱۔ سعید بن جبیر ۹۵ھ، ۲۲۔ عامر بن شراحیل الہمدانی ۱۰۴ھ، ۲۳۔ عمرو بن عبد اللہ ابواسحق ۱۰۴ھ، ۲۴۔ حبیب بن ابی ثابت ۱۱۹ھ، ۲۵۔ الحکم بن عتیبہ ابو عمرو الکندی ۱۱۵ھ، ۲۶۔ عمرو بن مرہ ابو عبد اللہ ۱۱۶ھ، ۲۷۔ القاسم بن مخیمر ابو عروہ ۱۱۸ھ، ۲۸۔ عبد الملک بن عمیر ۱۲۶ھ، ۲۹۔ منصور بن المعتمر ۱۲۲ھ، ۳۰۔ میسرہ بن مقسم ۱۲۶ھ، ۳۱۔ حصین بن عبد الرحمن ۱۲۶ھ، ۳۲۔ سلیمان بن فیروز ۱۳۸ھ، ۳۳۔ اسمعیل بن ابی خالد ۱۴۵ھ، ۳۴۔ سلیمان بن مہران الاعمش ۱۴۸ھ، ۳۵۔ عبد الملک بن سلیمان ۱۴۵ھ، ۳۶۔ نھان بن ثابت ۱۵۰ھ، ۳۷۔ محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ ۱۴۸ھ، ۳۸۔ حجاج بن ارطاة ۱۴۹ھ، ۳۹۔ مسعر بن کدام الہمدانی ۱۵۵ھ، ۴۰۔ عبد الرحمن بن عبد اللہ المسعودی ۱۶۰ھ، ۴۱۔ سفیان بن سعید الثوری ۱۶۱ھ، ۴۲۔ اسرائیل بن یونس البیعی ۱۶۲ھ، ۴۳۔ زائدہ بن قدامہ ۱۶۱ھ، ۴۴۔ الحسن بن صالح ۱۶۴ھ، ۴۵۔ شیبان بن عبد الرحمن ۱۶۴ھ، ۴۶۔ قیس بن ابرہیم ابو محمد ۱۶۴ھ، ۴۷۔ ورقہ بن عمر ۱۶۸ھ، ۴۸۔ شریک بن عبد اللہ القاضی ۱۷۵ھ، ۴۹۔ زبیر بن معاویہ ابو خثیمہ ۱۷۵ھ، ۵۰۔ القاسم بن معن ۱۷۵ھ، ۵۱۔ ابو الاحوص سلام بن سلیم ۱۹۷ھ، ۵۲۔ بشر بن القاسم ۱۷۵ھ، ۵۳۔ سفیان بن عیینہ ابو محمد ۱۹۸ھ، ۵۴۔ ابوبکر بن عیاش ۱۹۳ھ، ۵۵۔ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ۱۹۲ھ، ۵۶۔ عبد السلام بن حرب ۱۹۷ھ، ۵۷۔ جبریر بن عبد الحمید ۱۹۷ھ، ۵۸۔ سلیمان بن حبان الاحمر ۱۹۸ھ، ۵۹۔ ابراہیم بن محمد الغزالی ۱۹۵ھ، ۶۰۔ عیسیٰ بن یونس البیعی ۱۹۵ھ، ۶۱۔ عبد اللہ بن ادريس ۱۹۲ھ، ۶۲۔ یحییٰ بن یحییٰ ابو زکریا ۱۹۹ھ، ۶۳۔ حمید بن عبد الرحمن البغوی ۱۹۹ھ

۶۴۔ علی بن مسهر الوالحسن ۹۶ھ، ۶۵۔ عبدالرحیم بن سلیمان ۹۵ھ، ۶۶۔ یعقوب بن ابراہیم الانصاری ۲۰۸ھ، ۶۷۔ ابو معاویہ محمد بن حازم ۹۵ھ، ۶۸۔ مروان بن معاویہ ۹۳ھ، ۶۹۔ حفص بن غیاث النخعی ۹۲ھ، ۷۰۔ وکیع بن الجراح ۹۶ھ، ۷۱۔ عبیدہ بن حمید ۹۰ھ، ۷۲۔ عبید اللہ الاشجعی ۸۲ھ، ۷۳۔ عبیدہ بن سلیمان ۸۷ھ، ۷۴۔ عبدالرحمن بن محمد ۹۵ھ، ۷۵۔ محمد بن فضیل ۹۵ھ، ۷۶۔ حماد بن اسامہ ۲۰۳ھ، ۷۷۔ محمد بن بشر ۲۰۳ھ، ۷۸۔ یحییٰ بن سعید القرشی ۹۲ھ، ۷۹۔ یونس بن بکر ۹۹ھ، ۸۰۔ عبداللہ بن نمیر ۹۹ھ، ۸۱۔ شجاع الولید البودری ۲۰۳ھ، ۸۲۔ محمد بن عبید الایادی ۲۰۴ھ، ۸۳۔ عبداللہ بن داؤد ۲۰۹ھ، ۸۴۔ الحسین بن علی ابو علی ۲۱۲ھ، ۸۵۔ زید بن الجہاب ۲۰۳ھ، ۸۶۔ عبید اللہ بن موسیٰ ۲۱۳ھ، ۸۷۔ اسحاق بن سلیمان ۲۰۳ھ، ۸۸۔ محمد بن عبداللہ ۲۰۳ھ، ۸۹۔ یحییٰ بن آدم ۲۰۳ھ، ۹۰۔ داؤد بن یحییٰ ۲۰۳ھ، ۹۱۔ عبداللہ بن نیرید ۲۱۳ھ، ۹۲۔ ابو نعیم الفضل بن وکین ۲۱۸ھ، ۹۳۔ قبیصہ بن عقیبہ البوعامر ۲۱۵ھ، ۹۴۔ موسیٰ بن داؤد ۲۱۴ھ، ۹۵۔ خلف بن یحییٰ بن داؤد ۲۱۶ھ، ۹۶۔ یحییٰ بن ابی بکر ۲۰۳ھ، ۹۷۔ عبید اللہ ۲۰۳ھ، ۹۸۔ زکریا بن عدی ۲۱۳ھ، ۹۹۔ احمد بن عبداللہ ۲۱۴ھ، ۱۰۰۔ مالک بن اسماعیل ۲۱۴ھ، ۱۰۱۔ خالد بن مخلد ۲۱۳ھ، ۱۰۲۔ یحییٰ بن عبد الحمید ۲۲۵ھ، ۱۰۳۔ عبداللہ بن محمد البکر ۲۳۴ھ، ۱۰۴۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر ۲۳۳ھ، ۱۰۵۔ عثمان بن ابی شیبہ ۲۳۹ھ، ۱۰۶۔ علی بن محمد بن اسحاق ۲۳۳ھ، ۱۰۷۔ احمد بن حمید الوالحسن ۲۲۲ھ، ۱۰۸۔ الحسن بن الربیع ۲۲۱ھ، ۱۰۹۔ محمد بن العلاء ۲۴۸ھ، ۱۱۰۔ نہاد بن السری ۲۴۳ھ۔

ان حفاظ کے علاوہ دوسرے بھی کوفہ کے لاتعداد محدثین ہیں لیکن ہم نے صرف تذکرۃ الحفاظ سے ان حفاظ حدیث کا ذکر کیا ہے۔ جو ۲۴۸ھ تک ہوئے ہیں۔

بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس بستی میں سب سے پہلے امام اعظم نے طلب حدیث کے میدان میں قدم رکھا وہ بستی حدیث کی نعمت سے مالا مال تھی اور اس وقت اس میں دُنیا سے علم حدیث کے وہ آفتاب و مانتاب تھے جو اپنی تابانیوں سے دُنیا کو محو حیرت کر رہے تھے اور جو امام اعظم کے علم حدیث میں اساتذہ ہیں۔ یہاں سب کا استقصاء تو از بس دشوار ہے مگر گلے از گلزار چند گرامی قدس ہستیاں پیش کرتا ہوں۔

علامۃ التاجین امام شعبی سے تلمذ

خطیب بغدادی نے امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کا علم

تین پر ختم ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، اور زید بن ثابتؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سائے علوم چھ حضرات کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ علقمہ، اسود، عبیدہ، الحارث، مسروق، عمرو، اور ان اکابر کی علمی میراث صرف دو کو ملی ہے۔ ابراہیم نخعی اور امام شعبی۔ (تلیق فہوم اہل الاثر ص ۲۳۶ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ

حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بعد لوگوں میں محدث کی حیثیت سے صرف دو ہیں امام شعبی اور سفیان ثوریؒ۔
حافظ ذہبی نے خود امام شعبی کی زبانی یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:
أَدْرَكْتُ خَمْسًا مِّنَ الصَّحَابَةِ
میں نے پانچ سو صحابہ سے ملاقات کی ہے۔

ان کی علمیت کا اندازہ کرنا ہو تو عبدالملک بن عمیر کا وہ بیان پڑھیے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے۔

ایک بار امام شعبی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان فرما رہے تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ پاس سے گزرے سن کر فرمایا کہ میں خود ان غزوات میں شریک ہوا ہوں۔ لیکن شعبی کو غزوات زیادہ محفوظ ہیں اور مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔

امام شعبی کا دور حدیث کی زبانی یادداشت کا زمانہ ہے اس عہد میں حدیثوں کو سن کر زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی رواج تھا جیسا کہ اس گئے گزرے آج کے زمانے میں مسلمانوں میں قرآن کو یاد کرنے کا معمول ہے اس دور کے لوگوں کا فیشن ہی یہ تھا کہ سب کچھ زبانی یاد ہو کتابت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ امام شعبی بھی کتابت حدیث کے قائل نہ تھے خود فرماتے ہیں،
مَا كَتَبْتُ سِوَا دَائِي بَيْحَنَاءَ إِلَى يَوْمِي هَذَا
میں نے کبھی بھی روشنائی اور کاغذ سے کام نہیں لیا۔

قوتِ حافظہ اس قدر غضب کی تھی کہ جو کچھ بھی سنتے فوراً یاد ہو جاتا۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ روایات شری مجھے کم یاد ہیں مگر کم یاد ہونے کے باوجود حال یہ ہے۔

اِنْ شِئْتُ لَأَنشُدَنَّكُمْ شَهْرًا وَلَا أُعِيدُ إِلَيْهِ
 اگر میں چاہوں تو ایک ماہ تک اشعار پڑھتا رہوں اور تکرار نہ ہو۔
 ابن شبرمہ کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبی فرماتے تھے :
 اے شیاک میں تم سے دوبارہ حدیث بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے
 کبھی کسی سے حدیث سن کر تکرار کی درخواست نہیں کی۔
 لَا أَحْبَبْتُ أَنْ يُعِيدَهُ عَلَيَّ مَجْهَرًا مِمَّنْ لَا أُحِبُّ أَنْ يَكُونَ
 علم حدیث میں اس قدر اوسنچا مقام رکھتے تھے کہ عاصم احوال فرماتے ہیں کہ :
 میں نے بصرہ، کوفہ اور حجاز والوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ
 عالم کوئی نہیں دیکھا ہے یہ
 خطیب نے لکھا ہے کہ حدیث کے مشہور امام زہری کا کہنا ہے :
 علماء چار ہیں مدینے میں سعید بن المسیب، کوفہ میں شعبی، بصرہ میں
 حسن بصری اور شام میں مکحول یہ

امام اعظم نے شعبی کے سامنے زانو تے ادب نہ کیا ہے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ امام اعظم
 سنہ میں ہجری میں سال امام شعبی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوتے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرے
 میں امام شعبی کے تلامذہ میں امام اعظم کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور صرف نام ہی نہیں لیا بلکہ
 یہ بتایا ہے کہ :

هُوَ أَكْبَرُ شَيْخٍ لِأَبِي حَنِيفَةَ ۝

اور تو اور دور جدید کے بہت بڑے محقق ڈاکٹر فلیپ حتی نے بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب
 تاریخ العرب میں اس کا اقرار کیا ہے کہ
 كَانَ مِنْ أَكْبَرِ الَّذِينَ تَخَوَّلُوا عَلَى الشَّيْبِيِّ الْإِمَامُ أَبُو
 حَنِيفَةَ الْمَشْهُور ۝

امام شعبی کے بلند پایہ تلامذہ میں سے مشہور امام ابو حنیفہ ہیں۔

۱۔ ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷،

عبداللہ بن داؤد الخریزی کہتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ کبر ارتابین میں سے آپ نے کس کس سے استفادہ کیا ہے؟ فرمایا

قاسم بن محمد، طاؤس، عکرمہ، عبداللہ بن دینار، حسن بصری، عمرو بن دینار، ابوالزبیر، عطاء بن ابی رباح، قتادہ، ابراہیم، شعبی اور امام نافع اور ان جیسوں سے ملا ہوں۔

مسند امام میں خود ان کے حوالہ سے احادیث آتی ہیں۔ چنانچہ خوارزمی نے جامع المسانید کے نام سے جو مجموعہ ترتیب دیا ہے اس میں بحوالہ امام شعبی ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں اور علامہ حنفی نے اس مسند میں امام شعبی کے حوالہ سے روایات درج کی ہیں جس کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے:

أَبُو حَنِيفَةَ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ
بَرَأْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَى
الْخُفَّيْنِ -

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم موزوں پر مسح فرماتے تھے۔

اس روایت کی تخریج بحوالہ امام اعظم الحافظ الحارثی کے علاوہ حافظ ابو محمد بخاری، حافظ طبرانی، حافظ حسین بن محمد، حافظ ابوبکر بن عبدالباقی اور خود امام محمد نے کتاب الآثار میں کی ہے ویسے تو جیسا کہ حافظ بزاز فرماتے ہیں اس حدیث کو روایت کرنے والے حضرات کی تعداد ساٹھ ہے مگر اسی روایت کو جو امام بخاری نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّهُ خَرَجَ لِحَاجَتِهِمْ فَاتَّبَعَهُ الْمُغِيرَةُ بِأَدَاوَةٍ فِيهَا
مَا لَا فَصَبَ عَلَيْهِ حِينَ فَرَغَ مِنْ حَاجَتِهِ فَتَوَضَّأَ
وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ -

آپ ضرورت سے گئے منیرہ پانی کا برتن پیچھے سے لے کر آئے
پانی آپ نے ضرورت سے فراغت کے بعد استعمال کیا۔ وضو فرمایا
اور خفین پر مسح فرمایا۔

اسی روایت کو امام مسلم نے بھی اپنے مخصوص انداز میں کئی طریقوں سے بیان کیا ہے ان میں سے ایک طریق میں حضرت امام شعبی نے بھی حدیث بحوالہ عروۃ بن مفرہ اپنے شاگرد عمر بن زائدہ سے بیان کی اس طرح ہے۔

عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ رَضِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ

وَمَسَحَ عَلَى الْخُضَيْنِ فَقَالَ لَنَا إِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ لِي

حضرت مفرہ نے حضور النور کو وضو کرایا۔ آپ نے وضو فرمایا خضین پر

مسح فرمایا اور فرمایا کہ میں نے موزے سجالت طہارت پہنے تھے۔

وضوح ہے کہ حافظ ذہبی نے امام شعبی کو حفاظ حدیث کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے اس طبقے میں کم و بیش تیس حفاظ حدیث ہیں۔ امام ذہبی کی تصریح کے مطابق امام اعظم حضرت شعبی کے شاگرد ہیں اور یہ بھی ذہبی نے ہی لکھا ہے کہ وکیع بن الجراح، امام یزید بن ہارون، امام ابو عاصم النبیل، امام عبدالرزاق، امام عبید اللہ بن موسیٰ، امام ابو نعیم فضل بن وکین اور امام ابو عبد الرحمن المقرئ جیسے ائمہ حدیث نے امام ابو حنیفہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ شجرہ علم حدیث کے تمام برگ و بار ان ہی اکابر سے نکلے ہوئے ہیں۔ امام عبدالرزاق، امام عبید اللہ بن موسیٰ، امام ابو نعیم اور امام ابو عبد الرحمن المقرئ کے تلامذہ ہیں آپ کو امام احمد اور امام بخاری ملیں گے چنانچہ حافظ ذہبی نے جہاں امام مقرئ کے ترجمہ میں یہ بتایا ہے کہ

سَمِعَ مِنْ ابْنِ عَوْنٍ وَآبِي حَنِيفَةَ

وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ مروی عنہ البخاری و احمد۔ امام مقرئ بخاری اور احمد کے استاد ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ جیسے مسلم اور ابوداؤد امام احمد کے شاگرد ہیں ایسے ہی ترمذی اور ابن خزمیہ حضرت امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام شعبی کی ذات گرامی بواسطہ امام اعظم علم حدیث میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

امام حماد بن سلیمان سے تلمذ

والد کا نام مسلم اور کنیت ابوسلیمان ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حماد حدیث میں حضرت

انس بن مالکؓ، زید بن وہبؓ، سعید بن المسیبؓ، سعید بن جبیرؓ، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، ابو وائلؓ، ابراہیم نخعیؓ، عبد اللہ بن بریدہ اور عبد الرحمن بن سعد کے شاگرد ہیں اور مشہور محدث عاصم الاحولؓ امام شعبہؓ، امام سفیان ثوریؓ، امام حماد بن سلمہؓ، امام مسعر بن کدامؓ، امام ابو حنیفہؓ اور سلیمان بن مہران کے اُستاد ہیں۔ امام مسلمؓ، ابو داؤدؓ، ترمذیؓ اور ابن ماجہؓ نے اپنی کتابوں میں ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ حافظ عسقلانیؒ اور حافظ ذہبیؒ دونوں اس پر متفق ہیں کہ حماد ابراہیم نخعی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔

ابو الیشخ نے تاریخ اصفہان میں لکھا ہے کہ ایک روز ان کو اُن کے اُستاد ابراہیم نخعی نے ایک درہم کا گوشت لانے کے لیے روانہ کیا۔ زبیل ان کے ہاتھ میں تھی اور اُن کے والد کہیں سے گھوڑے پر سوار اُسے تھے۔ صورت حال دیکھ کر حماد کو ڈانٹا اور زبیل لے کر پھینک دی جب ابراہیم نخعی کی وفات ہو گئی تو حدیث کے طالب علم ان کے گھر آئے، دستک دی اُن کے والد چورخ لے کر باہر آئے، طلبہ نے دیکھ کر کہا کہ ہمیں آپ کی نہیں آپ کے صاحبزادے کی ضرورت ہے۔ یہ شرمندہ ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حماد سے کہا کہ جاؤ باہر جاؤ۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زبیل کے صدقے میں ملا ہے۔

علامہ خوارزمی نے امام بخاری کے حوالہ سے سند متصل نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ:

لَقَدْ سَأَلْتُ هَذَا يَعْزِي حَمَادًا مِثْلَ مَا سَأَلْتُ بَنِي جُمَيْعٍ النَّاسِ بِهٖ

حافظ عبد اللہ بن وہب دینوری کہتے ہیں کہ:

ایک بار حافظ ابو زرعمہ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ ایک خراسانی ان کے سامنے موضوع حدیثیں بیان کر رہا ہے اور یہ ان روایات کو غلط بتا رہے ہیں۔ وہ شخص ان کی باتوں پر ہنس رہا ہے کہ واہ کیا خوب! جو روایت تم کو یاد نہیں اس کو غلط بتا رہے ہو۔ اس پر میں نے اس شخص سے پوچھا ما اسند ابو حنیفہ عن حماد؟ بتاؤ امام ابو حنیفہ کی بواسطہ حماد کیا روایات ہیں؟ بیچارہ چپ ہو گیا۔ پھر میں نے حافظ ابو زرعمہ سے دریافت کیا ما تحفظ لابی حنیفہ؟ آپ کو حماد کی سند سے

امام ابو حنیفہ کی کتنی حدیثیں یاد ہیں؟ اس پر حافظ ابو زرعہ نے حدیثوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔

یاد ہے کہ امام حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ امام اعظم چار ہزار حدیثیں روایت کرتے تھے جن میں دو ہزار حماد کی تھیں۔ چنانچہ امام حافظ زکریا نیشاپوری بسند متصل امام موصوف سے ناقل ہیں؛ امام ابو حنیفہ کی کل روایات چار ہزار تھیں ان میں دو ہزار حماد کی اور دو ہزار تمام اساتذہ کی ہیں۔

نقد و رجال کے امام حضرت شعبہ امام حماد کی صداقت کا لوہا مانتے ہیں اور سید الحفاظ یحییٰ بن معین ان کی ثقاہت کو سراہتے ہیں۔ امام ابو عبد اللہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں جہاں ان ائمہ حدیث کا تذکرہ کیا ہے جن کی علم حدیث میں امامت مسلم ہے اور جن کی ثقاہت پر فن حدیث میں اعتماد ہے ائمہ حدیث کی اس فہرست میں حماد بن ابی سیمان کا بھی ان میں تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں ارباب فتویٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حماد کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا تذکرہ باوجود عدالت، صداقت اور ثقاہت کے اس معذرت کے ساتھ کیا ہے۔

لَوْلَا ذِكْرُ ابْنِ عَدِيٍّ فِي الْكَامِلِ لَمَّا أُوْثِقَتْ - ۱۴

اگر ابن عدی ذکر نہ کرتا تو میں میزان میں ان کا ترجمہ نہ لکھتا۔

در اصل بتانا یہ چاہتے ہیں کہ امام حماد اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس قدر اونچے مقام پر ہیں کہ ان کا ذکر میزان میں نہ آنا چاہیے کیونکہ یہ امام ذہبی کی اس پالیسی کے خلاف ہے جس کا تذکرہ خود امام ذہبی نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔

میزان الاعتدال میں ائمہ متبوعین کا ذکر

میرا اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جو امام موصوف نے میزان کے مقدمہ میں کیا ہے کہ:

لَا أَذْكَرُ فِي كِتَابِي مِنَ الْأُمَّةِ الْمُتَّبُوعِينَ فِي الْفُرُوعِ

۱۴ تذکرۃ الحفاظ ص ۲۵۸ - ۱۵ مناقب الموفق ج ۱ ص ۹۶ - ۱۶ معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۱۰

۱۷ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۷۹ -

أَحَدًا لِّجَلَالَتِهِمْ فِي الْإِسْلَامِ وَعَظَمَتِهِمْ فِي النَّفُوسِ مِثْلُ
أَبِي حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِي لَهُ

میں اپنی کتاب میں ان اماموں کا ذکر نہ کروں گا جن کی فروع میں تقلید
کی جاتی ہے کیونکہ اسلام میں ان کی جلالت اور لوگوں میں ان کی عظمت
موجود ہے جیسے ابو حنیفہ اور شافعی۔

ظاہر ہے کہ امام حماد صرف امام نہیں بلکہ امام الائمہ ہیں پھر ان کا میزان میں تذکرہ اس وعدہ
کی خلاف ورزی ہے۔ امام ذہبی نے اسی سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے میزان میں ان کا
تذکرہ ان کی ثقاہت، صداقت اور عدالت کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ صرف اس
لیے کیا ہے کہ امام عدوی نے الکامل میں ان کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ کا المناک حادثہ

شاید آپ غلش محسوس کریں کہ خیر امام حماد کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن اس سے زیادہ
حیرت کی بات یہ ہے کہ جن کا نام لے کر کہا جا رہا ہے کہ ان جیسوں کا میزان میں ذکر نہ ہو گا خود ان
کا بھی میزان میں ذکر ہے اور ذکر بھی کوئی طویل نہیں بلکہ صرف ایک سطر ہی۔

یہ تاریخ صحافت کا بڑا ہی المناک اور دردناک حادثہ ہے دراصل میزان الاعتدال اولاً جب ہندوستان
میں چھپی تو امام صاحب کا تذکرہ تقطیع نون کتاب کے اندر نہیں بلکہ کتاب کے حاشیہ پر پریس
والوں نے چھاپ دیا اور خود پریس والوں نے ایسا کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ میزان کے کئی نسخوں
میں سے ایک کے حاشیہ پر چونکہ ایسا ہی درج تھا اس لیے اس کو اصل کتاب میں جگہ نہیں دی گئی
اس کے بعد مصر کے پریس سے جو میزان چھپ کر آئی تو یار لوگوں نے کتاب کے اندر داخل کر دیا۔
واقعہ یہ ہے کہ میزان میں امام اعظم کا کوئی ذکر نہ تھا غالباً کسی نے مطالعہ میں اپنی یادداشت حاشیہ
میں درج کر دی تھی اور بعد کو مطابع والوں نے اسے اصل کتاب ہی میں داخل کر دیا۔

مولانا عبدالحی صاحب غیث النعمان میں فرماتے ہیں کہ میزان کے جن نسخوں کا میں نے مطالعہ
کیا ہے ان میں اس عبارت کا نام تک نہیں ہے اور نہ ہونے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حافظ

عراقی بشرح الفیہ میں فرماتے ہیں کہ ابن عدی نے کامل میں ان سب حضرات کا تذکرہ کیا ہے جن پر کسی نہ کسی درجے میں کام ہے چاہے وہ ثقہ ہی ہوں لیکن امام ذہبی نے میزان اس التزام کے ساتھ لکھی ہے کہ اس میں کسی صحابی اور ائمہ مقبوعین میں سے کسی امام کا ذکر نہ ہو گا۔ حافظ سخاوی نے شرح الفیہ میں بھی یہ بات لکھی ہے کہ امام ذہبی نے ائمہ مقبوعین کے ذکر نہ کرنے کا التزام کیا ہے اور حافظ سیوطی نے بھی تذریب الراوی میں میزان کی اسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ ان اکابر کی تصریحات کھلے بندوں کہہ رہی ہیں کہ میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہیں ہے۔ مشہور محدث علامہ محمد بن اسماعیل ایمانی توضیح الافکار میں رقمطراز ہیں کہ امام ذہبی نے میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہیں لکھا ہے لیکن امام نووی نے تہذیب الاسماء میں امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لسان المیزان میں امام اعظم کا کوئی ترجمہ نہیں لکھا حالانکہ لسان المیزان الاعتدال ہی کا چرہ ہے۔ یہ اس بات کی صریح شہادت ہے کہ میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہ تھا۔ غیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ بتایا رہا تھا کہ امام حماد کی ذات گرامی اپنی ثقاہت کی وجہ سے بہت اونچے مقام پر ہے۔ قلم کو روکنا چاہتا ہوں مگر کیا کروں رکتا نہیں ہے۔ بزرگان دین کی عدالت و ثقاہت تو اپنی جگہ ہے افسوس تو اس پر اتنا ہے کہ لوگ اکابر کے منہ سے نکلی ہوئی بات کا منشا خود نہیں سمجھتے اور بات کا خواہ مخواہ تبنگ کر بنا دیتے ہیں۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک بار امام حماد حج کر کے کوفہ واپس آتے لوگ ملاقات کی خاطر حاضر ہوئے۔ آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے کوفہ والو! انتم اللہ سبحانہ کا شکریہ ادا کرو میں عطاء بن ابی رباح، طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں لیکن تمہارے بچے اور بچوں کے بچے بھی علم میں ان سے آگے ہیں اس میں کون سی ٹوہین کی بات ہے یہ تو کوفہ میں علم کی بہتات پر تحدیثِ نہمت ہے۔

امام حماد و ارجار کی تہمت

ظلم بالائے ظلم یہ کہ ان کے متعلق رجال کی کتابوں میں یہ فقرہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

تکلم فیہ للارجاء

حالانکہ امام حماد کا دامن اس تہمت سے بالکل پاک ہے صرف امام حماد نہیں بلکہ ان کی طرح بخاری اور مسلم کے کتنے ہی راویان حدیث ہیں جن کی ثقاہت اور عدالت مسلم ہے مگر ان پر صرف فکری اختلاف کی وجہ سے ارجار کی تہمت جڑ دی ہے۔ خدا بھلا کرے الشہرستانی کا کہ انہوں

رجال المرتبة کے عنوان سے مختلف اکابر مثلاً الحسن بن محمد، سعید بن جبیر، طلق بن حبیب، محارب بن دثار، حماد بن ابی سلیمان، امام اعظم، قاضی ابویوسف، امام محمد وغیرہ کا نام لکھ کر یہ بات لکھ دی ہے کہ:

هَذَا كُلُّهُمْ أُمَّةٌ الْحَدِيثُ لَهُ

حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں جہاں بخاری و مسلم کے ان راویوں کی فہرست دی ہے جن کو کہنے والے مرتبہ کہہ گئے ہیں وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی طرف جس ارجاء کی نسبت کی گئی ہے اس سے مقصود مرتبہ کا وہ ارجاء نہیں ہے جو اہل السنۃ کی اپوزیشن ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے:

تَاخِيرُ الْقَوْلِ فِي الْحُكْمِ عَلَى مَرْتَبِ الْكِبَارِ لَهُ

اگر ارجاء یہی ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہے لیکن اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ بخش دے خواہ سزا دے۔ تو سب اہل السنۃ ہی ارجاء کے شکار ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں:

مَرْجِيٌّ أَمْرٌ وَمُفَوَّضٌ مَصِيرُهُ إِلَى رَبِّهِمْ إِنْ شَاءَ عَذَابُهُ
وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ - ۱۲

امام اعظم، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد سب کا یہی مسلک ہے۔ ابن الجوزی نے مناقب میں امام احمد کی یہی رائے لکھی ہے کہ

اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا چاہے اس نے کبائر
ہی کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو۔ ۱۳

خود امام بخاری نے صحیح میں یہ عنوان قائم کر کے کہ
الْمُعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَكْفُرُ صَاحِبَهَا بِرْتِكَابِهَا
إِلَّا بِالشَّرْكَ ۱۴

یہی بتایا ہے کہ شرک کے سوا گناہ خواہ کیسا ہی سنگین ہو مگر گنہگار کافر نہیں ہوتا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ حافظ بدر الدین عینی نے امام بخاری کے دعویٰ اور دلائل کی توضیح

۱۲ الملل والنحل ج ۱ ص ۲۳۴ - ۱۳ تدریب الراوی ص ۲۱۹ - ۱۴ تدریب الراوی ص ۱۱۲

۱۵ مناقب ابن الجوزی ص ۹۶ - ۱۶ صحیح بخاری ج ۱ ص ۴ -

کے بعد لکھا ہے :

هَذَا هُوَ مَذْهَبُ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ بِه

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مرجعہ جو کہتے ہیں کہ گناہ سے کچھ نہیں ہوتا اور خوارج جو کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ کی رائے میں مرتکب کبیرہ کی ہرگز بخشش نہ ہوگی ان میں سلامتی کی راہ وہی ہے جو اہل السنۃ نے اختیار کی ہے اور جس کی قانونی تعبیر یہ ہے کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی اور اقرار زبانی کا۔ جس طرح ایک تندرست آدمی بیمار ہو سکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔

اگر اسی کا نام ارجاء ہے جو آپ حافظ سیوطی کی زبانی سن آتے ہیں تو پھر مرجعہ ہونے کی پھبتی کیوں ہے؟ اور زبان و قلم کے یہ سارے ہنگامے کیوں ہیں؟ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ غصہ صرف اس پر ہے کہ ایمان کے بارے میں قانونی تعبیر فقہاء محدثین نے الگ کیوں اختیار کی ہے۔ اور فقہائے اس موضوع پر وہی زبان کیوں اختیار نہیں کی جو بعد میں محدثین نے کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے فقہاء کو مرجعہ کہا ہے اس نے عقائد کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف ان الفاظ کی وجہ سے کہا ہے جن سے مرجعہ کی موافقت کی جاتی ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آئندہ اوراق میں آئے گی۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے استاد فقہ ہونے کے ساتھ استاد حدیث بھی ہیں۔

قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار میں امام حماد کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ کی روایا موجود ہیں۔

عَنْ أَبِي يُوسُفَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ ابْنِ أَبِي هَيْمٍ
أَنَّهُ قَالَ لَمْ يَجْمَعْ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ عَلَى شَيْءٍ كَمَا اجْتَمَعُوا عَلَى التَّوْبِ بِالْفَجْرِ
وَالْتَّكْبِيرِ بِالْمَغْرِبِ وَلَمْ يَثَابِرُوا عَلَى شَيْءٍ مِنَ
التَّطَوُّعِ كَمَا ثَابَرُوا عَلَى أَرْبَعِ قَبْلِ الظُّهْرِ وَرَكَعَتِي
الْفَجْرِ بِه

ابراہیم کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا کسی کام پر اتنا ایک نہیں ہوا جتنا صبح کی نماز کو چاندنا کر کے پڑھنے اور مغرب کی نماز کو سویرے پڑھنے پر ہوا ہے اور کسی بھی نفل پر اتنی ہمیشگی نہیں کی جتنی کہ ظہر سے پہلے چار سنتوں اور صبح کی نماز سے پہلے دو سنتوں پر کی ہے۔

امام محمد نے مؤطا میں امام مالک کے ساتھ کچھ امام اعظم کی روایات بھی درج کی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مُحَمَّدٌ أَخْبَرَنَا أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ إِبْرَاهِيمَ
أَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ سُئِلَ عَنِ الْوُضُوءِ مِنْ كَثَرِ
الذِّكْرِ فَقَالَ إِنْ كَانَ قَاطِعَةً لِه
حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا گیا کہ پیشاب گاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو کا حکم کیا ہے؟ فرمایا اگر ناپاک ہے تو کاٹ دو۔

سے مؤطا امام محمد ص ۵۴۔ نوٹ:- آج مؤطا امام مالک کے دو ہی نسخے متداول ہیں ایک امام سیحی بن یحییٰ لیشی کا۔ اور دوسرا امام محمد کا، جن کے متعلق امام ذہبی نے لکھا ہے کان من بحور العلم والفقہ قویانی مالک (میزان الاعتدال) علم اور فقہ کے سمندر تھے اور امام مالک سے آمدہ بیانات میں یہ قابل اعتماد ہیں۔ امام مالک کے سارے تلامذہ میں امام محمد کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے امام مالک کی ساری حدیثوں کو امام مالک کی زبان سے سنا ورنہ عام طور پر امام مالک کے شاگرد پڑھتے اور وہ سنتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام محمد کو امام مالک سے مؤطا سننے میں پوئے تین سال لگے نیز جتنے لوگوں نے امام مالک سے مؤطا کی روایت کی ہے ان میں کوئی بھی جلالت نشان میں امام محمد کا ہمسر نہیں بلاشبہ امام شافعی مؤطا کے رواۃ میں داخل ہیں لیکن قطع نظر اس بات کے کہ ان سے مؤطا کا کوئی نسخہ مروی نہیں ہے ان کو امام محمد سے وہی نسبت ہے جو امام مالک سے ہے کیونکہ امام شافعی نے دونوں اماموں سے یکساں استفادہ کیا ہے اور گواہوں نے امام محمد سے حدیث کا علم بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے اور الشافعی فاضل مجاہد بن الحسن فی الحدیث (ص ۵۹) لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ فقہ میں وہ خاص طور پر امام محمد ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور یہی وجہ کہ وہ حد زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں امام شافعی سے نقل میں من الناس علی فی الفہم محمد بن الحسن اور حافظ معانی نے بویعلیٰ کی زبانی امام شافعی کے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ اعانی اللہ برجلین بابن عیینہ فی الحدیث و محمد فی الفہم (برخ ۱۰، فی ص ۲۳)

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ إِلَّا عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ وَلَا يُعَوِّدُ لَشَيْءٍ مِّنْ ذَلِكَ إِلَيْهِ

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صرف تکبیر تحریمیہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

۱۔ شرح مسند ملا علی قاری ص ۴۰۔ نوٹ: یہ حدیث مختلف الفاظ میں دوسرے محدثین ابو داؤد، ترمذی، اور نسائی نے بھی روایت کی ہے ابو داؤد کی روایت میں اس حدیث کو بیان کرنے والے چھ راوی ہیں عثمان، وکیع، سفیان، ثوری، عاصم، عبدالرحمن اور علقمہ۔ اور اسی سند کے ساتھ یہ حدیث ترمذی میں موجود ہے مگر اس میں ہناد کی جگہ محمود بن غیلان ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو ان روایت کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ وکیع، سفیان، عاصم، عبدالرحمن اور علقمہ۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ یہ حدیث ابن مسعود۔ دراصل یہ ایک سنگین مغالطہ ہے حدیثیں دو ہیں اور دونوں ابن مسعود کی ہیں ایک یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار کے علاوہ نماز پر رفع یدین نہیں کیا۔ دوسری یہ کہ عبداللہ کہتے ہیں کہ کیا میں تم کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز نہ پڑھاؤں۔ عبداللہ نے نماز پڑھائی اور تکبیر تحریمیہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔ دونوں میں فرق ہے۔ پہلی حدیث میں حضور کے بارے میں ہے کہ آپ نے نہیں کیا اور دوسری میں آپ کے عمل کا نہیں بلکہ خود عبداللہ کے عمل کا ذکر ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں پہلی مرفوع ہے اور دوسری موقوف ہے۔ کچھ راویوں نے دونوں کو محفوظ کر دیا تھا۔ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ روایتی حیثیت سے پہلی بات ثابت نہیں ہے اور ثابت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس اسناد سے پہلی روایت عبداللہ بن المبارک کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ثابت نہ ہونے سے مطلقاً ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف اس اسناد کی صحت کی نفی ہے۔ علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے نزدیک کسی حدیث کا ثابت نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اور بھی کسی کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ شہور محدث یحیی القطان اسے صحیح کہتے ہیں۔ حافظ ابن حزم کی رائے میں صحیح ہے اور امام ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے صرف اتنی بات یاد رکھئے کہ حدیثیں دونوں طرح آئی ہیں رفع یدین کرنے اور نہ کرنے کی۔ امام اعظم نے تکبیر تحریمیہ کے علاوہ نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی سنت کو اولیٰ و افضل قرار دیا ہے کیونکہ صحابہ کی زیادہ تعداد اسی پر عمل پیرا تھی اور محدثین کا بتایا ہوا ضابطہ ہے کہ إِذَا تَنَزَّعَ الْجُحُورُ عَنِ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَظَرُوا إِلَى مَا عَمِلَ عَلَيْهِ أَصْحَابُهُ - (ابوداؤد)

بطور نکلے از گلزار چند روایات ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے اُستاد حدیث ہیں اور اُستاد بھی ایسے شفیق کہ حافظ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے والد بزرگوار نے امام حماد سے ایک مسئلہ دریافت کیا حماد نے جواب دیا۔ امام صاحب نے جواب پر ایک سوال کر دیا۔ بات لمبی ہو گئی۔ حضرت حماد خاموش ہو گئے۔ امام صاحب جب مجلس سے رخصت ہو گئے تو امام حماد نے فرمایا:

هَذَا مَعَ فَتَاهِ يَحْيَى اللَّيْلُ - ۱۷

یہ صرف فقیہ نہیں بلکہ شب زندہ دار بھی ہیں۔

امام حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک بار میرے والد محترم سفر میں تشریف لے گئے واپسی پر میں نے دریافت کیا کہ اس دوران میں زیادہ کون یاد آیا؟ میرا خیال تھا کہ وہ یہی فرمائیں گے کہ تو! لیکن انہوں نے امام ابو حنیفہ کا نام لیا اور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابو حنیفہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔ ۱۸

ابو اسحاق السبعی سے تلمذ

ان کا نام عمرو بن عبد اللہ اور کنیت ابو اسحاق ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ان کو علم حدیث میں امام اعظم کا اُستاد لکھا ہے یہ خود علم حدیث میں صحابہ کرام یعنی زید بن ارقم، عبد اللہ بن عمرو، عدی بن حاتم طائی اور براء بن عازب کے شاگرد ہیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ:

حَدَّثَ عَنْ ثَلَاثِ مِائَةِ شَيْخٍ - ۱۹

ان کے تین سو اُستاد ہیں۔

ان میں اڑتیس صحابہ کرام ہیں۔ امام ابو داؤد طیالسی کہتے ہیں کہ حدیث ہمیں چار شخصوں سے ملی ہے۔ زہری، قتادہ، ابو اسحاق السبعی اور امام اعمش۔ پھر سب کے بائیس میں ایک ایک فن کی امامت کا ذکر کرتے ہوئے ابو اسحاق کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ

أَعْلَمُهُمْ بِحَدِيثِ عَلِيٍّ وَابْنِ مَسْعُودٍ - ۲۰

انہوں نے قرآن حکیم امام ابو عبد اللہ رحمٰن السلمی سے پڑھا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ

امام اُتش فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ان کو دیکھتے تو پکار اُٹھتے۔
هَذَا عَمْرُو الْقَارِي لَهُ

ابو عبدالرحمن اسلمی حضرت عبداللہ بن مسعود کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں،

ابو عبدالرحمن اسلمی اور ان کے علاوہ کوفہ کے دوسرے علماء جیسے علقمہ، اسود،
حارث اور زربن جیش نے قرآن عزیز عبداللہ بن مسعود سے حاصل کیا ہے۔
صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ مدینہ جا کر حضرت عمر، حضرت عائشہ سے بھی استفادہ
کرتے تھے۔

ابو اسحاق السبئی کی وفات ۲۸ھ میں ہوئی ہے۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ امام ابو اسحاق السبئی
مجھ سے سال یا دو سال بڑے ہیں ان سے امام اعظم نے بہت احادیث روایت کی ہیں۔ چنانچہ
کتاب الآثار میں قاضی ابویوسف فرماتے ہیں:

أَبُو يُونُسَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ السَّبْيِيِّ عَنْ شُرَيْحٍ
أَنَّهُ قَالَ إِذَا مَضَتْ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ بَانَ بِلَالٌ -

شریح کہتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے پر عورت ایلا سے بانتہ ہو جائے گی یہ
حافظ ابو محمد حارثی اپنے مسند میں فرماتے ہیں:

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ السَّبْيِيِّ عَنْ الْأَسْوَدِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ
لَمْ يَكُنْ بَيْنَ أَذَانِ بِلَالٍ وَابْنِ أُمِّ مَكْتُومٍ إِلَّا قَدْ رَمَا يَنْزِلُ
هَذَا وَيُصْعَدُ هَذَا -

بلال اور ابن ام مکتوم کی اذانوں میں صرف دونوں مؤذنوں کے اترنے
اور چڑھنے کا فرق ہوتا تھا۔

حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنے مسند میں بھی بحوالہ ابو اسحاق السبئی بہت روایات لکھی ہیں۔
أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ السَّبْيِيِّ عَنِ الْبَرَاءِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعَلِّمُنَا التَّشْدِيدَ كَمَا يُعَلِّمُ السُّورَةَ مِنَ الْقُرْآنِ
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشدد ایسے ہی سکھاتے تھے جیسے قرآن کی سورتیں
 امام ابواسحاق السبئی کو حافظ ذہبی نے حفاظ کے چوتھے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ امام شعبہ، امام حماد
 اور امام سفیان ثوری جیسے اجتہاد حدیث ان کے شاگرد ہیں۔

الامام الحافظ شیبان سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔ الامام، الحافظ، المجتہد، صل
 میں بصرہ کے رہنے والے ہیں مگر کوفہ میں اقامت فرمائی تھی۔ حکم بن عقیبہ، زیاد بن حلقہ، منصور بن المعتمر،
 عبد الملک بن عمیر، سماک بن حرب، سلیمان بن مہران اور حسن بصری سے حدیث کی تعلیم پاتی ہے سید الحفاظ
 یحییٰ بن معین سے ان کے باپ سے میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ ہر پہلو سے ثقہ ہیں۔ تمام ائمہ نقد و جرح ان کی
 ثقاہت و صداقت پر متفق ہیں۔ حافظ عسقلانی نے جن ائمہ فن سے ان کی ثقاہت و صداقت نقل
 کی ہے ان میں ابو القاسم البغوی، یعقوب بن شیبہ، ابو حاتم، العجلی، النسائی اور یحییٰ بن سعید خاص طور پر
 قابل ذکر ہیں۔ زائدہ بن قدامہ، ابو داؤد و طیالسی، الحسن بن موسیٰ، عبد الرحمن بن مہدی علم حدیث ہیں ان کے
 شاگرد ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کے شاگردوں کی فہرست میں امام اعظم کا بھی ذکر کیا ہے
 اور حافظ ذہبی نے امام صاحب کی شاگردی کا ان نکتوں میں تذکرہ کیا ہے۔
 حَدَّثَنَا الْإِمَامُ أَبُو حَنِيفَةَ عَنْهُ يَهُ

حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ عبد الرحمن بن مہدی کو ان کے سامنے زانوئے ادب کرنے پر بڑا ہی
 ناز تھا منجملہ اور شاگردوں کے مشہور امام المسند علی بن الجعد جو ہری بھی ان کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری،

۱۔ شرح مسند احمد ص ۱۲۰۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ شیبانی۔

۳۔ علی بن الجعد حدیث کے مشہور امام ہیں۔ امام بخاری اور ابو داؤد کے استاد ہیں اور حدیث میں جیسے ابن ابی ذئب
 اور شعبہ کے شاگرد ہیں ایسے ہی قاضی البری سلف سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے اور قاضی صاحب کے اصحاب میں
 سے ہیں۔ ان کا پورا نام ابو الحسن علی بن الجعد جو ہری ہے ان کی حدیث دانی کا اندازہ کرنا بہت مشہور محدثین جزیرہ احمد
 اسحاق بن۔ ہویہ اور یحییٰ بن معین کا یہ اتفاق فیض پڑھیے۔ امام جزیرہ کہتے ہیں۔ ہم چاروں ایک روز ان کے

امام مسلم، ابو داؤد اور امام ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان سے کافی روایات لی ہیں اور امام اعظم کے مسابہ میں بھی ان کے حوالہ سے احادیث آتی ہیں۔

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ شَيْبَانَ عَنْ يَحْيَى عَنْ الْمُهَاجِرِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ
قَالَ تَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مَسْئَلِ
الْعَمْتِ وَالْوَصَالِ -

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے چپ رہنے اور ہمیشہ کے روزے سے منع فرمایا ہے۔

یہی روایت بحوالہ عکرمہ الحافظ الحارثی بخاری نے بھی اپنے مسند میں بیان کی ہے۔

الحکم بن عتیبہ سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کو شیخ الکوفہ لکھا ہے۔ قاضی شریح، ابو وائل، ابراہیم نخعی، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اور سعید بن جبیر سے علم حدیث پڑھا ہے۔ خلاصہ میں ان کو احداً لا اعلام بتایا ہے۔ امام ابو داؤد، امام مسعر بن کدام، حمزہ الزیاتی، امام شعبہ اور ابو حواری نے خلاصہ میں امام اعظم کو ان کا شاگرد قرار دیا ہے ان کے بارے میں سفیان بن عیینہ کا تاثر یہ تھا کہ حکم اور حماد جیسا کوئی نہیں ہے۔ امہ اربع حدیث نے اپنی کتابوں میں ان کی سند سے حدیثیں لی ہیں۔ امام اعظم نے بھی ان کے حوالہ سے ایک سے زیادہ روایات لی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سے احادیث میں حکم سے زیادہ پائیدار

ص ۳۱۱ کا بقیہ حاشیہ :- در دولت پر حاضر ہوتے آپ اپنی کتابیں لے آتے اور واپس اندر چلے گئے ہمیں خیال ہے کہ کھانا لینے گئے ہیں ہمیں ان کی کتابوں میں کوئی غلطی نہیں ملی، کھانے سے فراغت کے بعد کتابوں میں در شدہ ساری احادیث ہمیں زبانی سنا دیں۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ امام اعظم جب حدیثیں پیش کرتے ہیں وہ موتی کی طرح ابدار ہوتی ہیں (ج ۲ ص ۳۰۸) اگرچہ بخاری، ابو داؤد، اور مسلم سب ہی کو ان کے سامنے زانوئے ادب کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے مگر انیسویں کہنا پڑتا ہے کہ امام مسلم اپنی صحیح میں حدیث ان سے لیے نہیں لی ہے کہ بزرگان لوگوں میں سے تھے جو خلق قرآن کے مسئلہ میں متشددین میں سے تھے امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کا کہنا تھا کہ مَنْ قَالَ الْقُرْآنُ مَخْلُوقٌ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ اسی بنا پر ان پر بدعتی ہونے کی تہم لگائی گئی ہے۔ لے کتاب الآثار

کوئی نہیں ہے۔ امام ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ حکم یہ روایت درج کی ہے :

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنِ الْحَكَمِ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مَخْجَمَةَ عَنْ شَرِيحٍ
أَنَّهُ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْمَسْحِ فَقَالَ سَلْ عَلَيْهَا فَإِنَّهُ
كَانَ يُسَافِرُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلْتُ عَلَيْهَا
فَقَالَ امْسَحِي -

شریح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے موزوں پر مسح کے بارے میں
پوچھا فرمایا کہ حضرت علیؓ سے پوچھو وہ حضورؐ کے رفیق ہوتے تھے۔
میں نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا فرمایا کہ مسح کر لو۔

الامام الحافظ ابو محمد عارفی اپنے مسند میں ایک سے زیادہ حدیثیں لاتے ہیں :

أَبُو حَنِيفَةَ عَنِ الْحَكَمِ بْنِ عَتِيبَةَ عَنِ الْقَاسِمِ عَنِ
شَرِيحٍ عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ
قَالَ يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ -

حضورؐ نے فرمایا کہ رضاعت سے وہ سب رشتے
حرام ہیں جو قرابت سے حرام ہیں۔

کوفہ کے سب اساتذہ کا استقصا منظور نہیں ہے صرف بطور گلے از گلزار چند کا تعارف
بدیہ ناظرین ہے ان کے علاوہ کوفہ کے جن محدثین سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے۔ ان میں
خاص خاص کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ اسماعیل بن خالدؒ، بیان بن بشر، جامع بن ابی راشدؒ،
جامع بن شداد الحارثیؒ، الحسن بن سعد بن معبدؒ، زید بن ابی انیسہؒ، زیاد بن علاقہؒ،
۳۵ھ، زیاد بن حذیر الاسدیؒ، ابو عبد الرحمنؒ، سعید بن مسروقؒ، سلمہ بن کہیلؒ،
سلیمان بن ابی سلیمانؒ، سماک بن حربؒ، عبد الملک بن عمیرؒ، ابو الحارث علقمہؒ،
بن مرثدؒ، البوردق عطیہ بن الحارث الہمدانیؒ، عبد الرحمن بن عبد اللہؒ، ابو عبد اللہؒ،
عون بن عبد اللہؒ، عتبہ بن عبد اللہ بن عتبہؒ، قاسم بن عبد الرحمنؒ، منصور بن
المعتمرؒ، منصور بن دینارؒ، یزید بن عبد الرحمن الوداودیؒ، خالد بن علقمہؒ،

تذکرہ ابن ابی زائدہؒ

حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان سب کا ترجمہ لکھا ہے۔ مسند امام اعظم میں ان سب سے روایات موجود ہیں۔

امام اعظم کا طلب علم کے لیے سفر

اس میں شک نہیں ہے کہ امام اعظم کے اپنے گھر میں اتنا ذخیرہ وافر تھا کہ اگر صرف اسی جگہ کا علم حاصل کرتے تو علم میں کمی نہ آتی۔ امام یحییٰ بن معین جو سید الحفاظ اور ناقد فن کہلاتے ہیں۔ کوفہ کے مشہور امام مسعر بن کدام کے متعلق فرماتے ہیں کہ

لَمْ يَزُحَلْ مِسْعَرٌ فِي حَدِيثٍ قَطُّ ۱؎

لیکن اس کے باوجود صرف کوفہ ہی رہ کر علم حدیث میں ان کی معلومات کا حال یہ تھا کہ امام شعبہ جیسا امام حدیث ان کو علم حدیث کی ترازو کہتا تھا اور محمد بن بشر کہتے ہیں کہ میں نے ان کے دس کم ایک ہزار حدیثیں لکھی ہیں یکہ صحابہ و تابعین اگرچہ تمام اسلامی شہروں میں گتے ہیں مگر روایت و حدیث کے باب میں جو مرکز بیت کوفہ اور مکہ و مدینہ کو حاصل تھی وہ دوسرے شہروں کو نہ تھی۔ حافظ ابن عبد البر نے بسند متصل امام ابن وہب کی زبانی نقل کیا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ پوچھا۔ آپ نے اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کے منہ سے نکل گیا کہ شام والے تو اس مسئلہ میں کچھ اور ہی بتاتے ہیں اور آپ کے خلاف ہیں۔ آپ نے فرمایا مَتَى كَانَ هَذَا الشَّانُ فِي الشَّامِ؟ شام والوں کو یہ مقام کب سے ملا ہے؟ ۱؎ ثُمَّ هَذَا الشَّانُ وَقَفَّ عَلَى أَهْلِ الْمَدِينَةِ وَأَهْلِ الْكُوفَةِ يَهْ شَانُ تَوْصِرُفُ كُوفَةٍ أَوْ مَدِينَةٍ كَيْ سَهْ ۲؎ شاید اسی لیے امام مالک نے بھی کبھی طلب علم کے لیے سفر نہیں کیا کیونکہ مدینہ دارالعلم تھا۔ اس کے باوجود امام اعظم نے حدیث کی خاطر رختِ سفر باندھا تا کہ آپ کے خزانہ علمی میں صرف مقامی نہیں بلکہ بیرونی معلومات کا بھی سرمایہ ہو۔

۱؎ تہذیب التہذیب۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ

۳؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۸

۴؎ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۸

علم کی خاطر اسلام میں سفر کی اہمیت

علم دین حاصل کرنے کے لیے جو سفر کیا جاتا ہے اسے رحلہ کہتے ہیں۔ قرآن و سنت میں اس مبارک سفر کی بہت زیادہ ترغیب ہے۔

ارشاد ہے :

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا
فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ .
پھر کیوں نہ نکلیں ان کی ہر جماعت میں سے چند لوگ تاکہ تفقہ پیدا
کریں دین میں اور تاکہ لوگوں کو بیدار کریں جب پٹ کر جائیں یہ

لے یہ آیت قرآنی مہجات معارف میں سے ہے اس میں صرف یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ علم دین حاصل کرنا بھی بات ہے اور اس کے لیے سفر کی سختیوں برداشت کرنا ایک امر مستحب ہے کیونکہ یہ تو اس آیت کا ظاہر ہے چنانچہ ابو بکر بن العربی لکھتے ہیں انما يقتضي ظاهر هذه الآية الحث على طلب العلم والندب اليه، واستحباب الرحلة (ج ۱ ص ۴۷۱) یعنی آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ علم کی طلب گامی میں ہر شادی ہونی چاہیے اور اس کی خاطر سفر مستحب ہے اور ساتھ ہی اس آیت کے منطوق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں دین سیکھنے کا کام ضرور ہونا چاہیے فی هذه الآية دليل على طلب العلم (ج ۱ ص ۱۹۸) لیکن دین سیکھنے کا یہ بوجھ سب پر نہیں ہے ان الخرج في طلب العلم لا يلزم الاعيان - طلب علم کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا سب کے ذمہ نہیں ہے بلکہ کچھ کے ذمہ ہے۔ سیکھنے کے بعد جو سیکھ کر آئیں ان کا کام اس آیت میں لوگوں کو بیدار کرنا و انذار بتایا ہے یعنی پوری جماعت کی پیش پا افتادہ شہری زندگی میں رہنمائی کا فرض انجام دیں اور جن کی دینی زندگی میں رہنمائی کریں۔ وہ ان کی طاعت کریں الانذار يقتضي فعل المأمور به واللام يكن انذاراً انذار حکم کی تعمیل چاہتا ہے ورنہ انذار ہی نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۹۹) اسی آیت سے دین آشنائوں کے لیے صدر اول ہی میں فقہاء کی تعبیر پیدا ہو گئی تھی۔ امام ترمذی نے لکھا ہے کہ الفقهاء اعلم بعافی الامة حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ طائفہ لغت میں ایک شخص کو بھی کہتے ہیں ابو بکر بن العربی نے شیخ ابو الحسن اور قاضی ابو بکر کی بھی یہی رائے لکھی ہے اگر یہ صحیح ہے تو آیت کے مدلول سے نہ صرف تقلید شخصی کا جواز بلکہ وجوب بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حدیث خبر واحد ہونے کی صورت میں دین میں حجت اور واجب العمل ہے۔ الجصاص کہتے ہیں فیہ دلالة على لزوم خبر الواحد (ج ۳ ص ۱۹۸)

قرآن کی اس آیت میں جس مقصد کی خاطر رختِ سفر تیار کرنے اور گھر سے گھر ہونے کا حکم دیا گیا ہے وہ دین میں تفقہ ہے اسی کو علم الشریعہ، علم الفقہ اور علم قانون کہتے ہیں علوم شرعیہ میں علم فقہ کا مقام بالکل انتہائی اور آخری ہے۔ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں کہ یہ آیت فقہانیت کی تلاش کے لیے ہے۔ قرآن میں جس موقع پر یہ آیت آئی ہے وہاں جہاد کا تذکرہ ہے جہاد اور طلبِ فقہ میں مناسبت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ طالبِ فقہ اور مجاہد دونوں کا نکلنا اللہ کی راہ میں نکلنا ہے اور دونوں کا مقصد اللہ کے دین کی برتری ہے چنانچہ ترمذی میں ارشاد گرامی ہے۔

مَنْ حَاجَّ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى يَرْجِعَ
جَوْشَخْصِ عِلْمٍ كِي تَلَّاشَ فِي نَكَلَاتِهِ وَهِيَ تَلَّاشُ تِلْكَ تِلْكَ رَاهِ فِي هِيَ -

حدیث اور فقہ کا باہمی تعلق

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی زبان میں اور صحابہ کرام کے محاورات میں علم نام ہی فقہ کا ہے یعنی صدرِ اول میں علم کے نام پر جو چیز معروف تھی وہ روایتِ حدیث نہیں بلکہ فقہانیت تھی بحافظ ذہبی نے ”مذکرۃ الحفاظ“ میں صحابہ و تابعین کا علمی تعارف زیادہ تر فقہانیت ہی سے کر لیا ہے چنانچہ حضرت امام ربانی حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں لکھتے ہیں مِنْ نُبَلَاءِ الْفُقَهَاءِ (ج ۱ ص ۱۲) حضرت معاذ بن جبلؓ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں مِنْ نُبَلَاءِ الصَّحَابَةِ وَفُقَهَائِهِمْ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے ترجمہ میں ہے أَقْوَدُ أَهْلِ الْبَصُورَةِ وَافْقَهُهُمْ، حضرت ابو الدرداءؓ کے متعلق لکھا ہے مُقَرَّبِي أَهْلِ دِمَشْقٍ وَفِقِيهِمْ، حضرت عائشہ کے بارے میں تصریح ہے مِنْ أَكْبَرِ فُقَهَاءِ الصَّحَابَةِ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق ہے۔ الْفَقِيهُ الْمَدَنِي، حضرت جابرؓ کے ترجمہ میں لکھا ہے الْفَقِيهُ الْمَدَنِي۔ اس طبقہ اولیٰ میں سارے صحابہ میں دو کو مستثنیٰ کر کے کسی ایک کا بھی تعارفِ حدیث و روایت کے ذریعے نہیں کرایا۔ دوسرے میری مراد حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ رَوَى حَدِيثًا كَثِيرًا، ورنہ کسی بھی صحابی کا علمی چہرہ پیش کرتے ہوئے حدیث کا نام تک نہیں لیا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ فقہ علوم شرعیہ کا آخری درجہ ہے۔

فقہ اور حدیث میں باہمی ربط کیا ہے؟ یہ بات شاہ ولی اللہ محدثؒ کی زبانی سنئے۔ شاہ صاحب علم الحدیث کا تعارف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

علم الحدیث کے کچھ طبقات اور اس میں فن کاروں کے کچھ مراتب ہیں۔
 علم حدیث کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ چھلکے اور سیپی کا ہے اور دوسرا
 درجہ مغز اور موتی کا ہے۔ علماء نے دونوں کی خدمت کی ہے۔ علم حدیث
 میں چھلکے اور سیپی کے درجے کی چیز حدیثوں کو صحت و ضعف، غرابت
 اور شہرت کی حد تک جاننا ہے یہ خدمت محدثین نے سرانجام دی ہے
 علم حدیث ہی کا ایک فن یہ بھی ہے کہ اس کے معافی شرعیہ کو سمجھا جائے
 اس سے احکام جزئیہ مستنبط کیے جائیں۔ عبارت، دلالت، اشارہ و مفہوم
 کی بنا پر منصوص حکم پر غیر منصوص کو قیاس کیا جاتے غسوخ و محکم، مرجوح
 و مبرم کا پتہ لگایا جاتے حدیث کا یہ فن موتی اور مغز کی حیثیت رکھتا
 ہے اس فن کی خدمت کرنے والے فقہاء اور مجتہدین ہیں۔

علامہ خطابی نے حدیث وفقہ میں اس سے بھی زیادہ لطیف ربط بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ
 حدیث وفقہ میں باہم وہی تعلق ہے جو مکان کی دیواروں اور اس کی بنیاد میں ہوتا ہے۔ وفقہ
 حدیث کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے، لکھتے ہیں،

حدیث کی حیثیت مکان کی اساس و بنیاد کی ہے اور وفقہ اس بنیاد
 پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے جو عمارت بغیر بنیاد کے بنائی جاتے
 اس میں استحکام نہیں ہوتا اور صرف بنیادیں بغیر عمارت کے خراب
 اور چٹیل میدان ہوتا ہے۔

ابوبکر الحارمی نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ :

احادیث میں ایک دوسری کو باہم ترجیح دینا یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ
 ان کا پیش نہاد احادیث میں احکام کو ثابت کرنا ہوتا ہے اور اس
 موضوع پر ان کی جولانگاہ کی وسعتیں اور پہنائیاں بے حد ہیں۔

الغرض اس آیت میں علم کی خاطر رخت سفر باندھنے کا حکم ہے اور اس کا جیسا مجتہد

اور فقیہہ مخاطب ہے ایسا ہی محدث بھی ہے کیونکہ قرآن و حدیث ہی فقہ کا سرچشمہ اور مرکز ہیں۔
قرآن میں علم کی خاطر حضرت موسیٰ کے سفر کا تذکرہ ہے چنانچہ امام بخاری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے سفر علمی کے لیے اپنی صحیح میں ایک مستقل عنوان قائم کیا اور عنوان کی بنیاد ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام
کی اس درخواست پر رکھی ہے جو اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں نقل کی ہے۔

هَلْ أَتَيْتُكَ عَلَىٰ أَنْ تُلَمِّنَ مِنَّا عَلِمْتَ رُشْدًا ۖ

کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے
کچھ جو تجھ کو سکھلاتی ہے بھلی راہ۔

صرف اسی باب پر امام بخاری نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد امام صاحب نے ایک اور باب
الخروج فی طلب العلم کے عنوان سے قائم کیا ہے اور دونوں میں ایک حدیث یعنی حضرت موسیٰ
علیہ السلام کا بھی واقعہ کہ آپ نے طلب علم کے لیے مجمع البحرین کا سفر کیا نقل کیا ہے۔ اور ان دو بابوں
کے بعد پھر اقتباط در علم و حکمت کا عنوان لاتے ہیں گویا ان دونوں عنوانوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے سفر علمی کا تذکرہ چھیڑ کر امام بخاری یہ ترغیب دے رہے ہیں کہ طلب علم کی راہ میں کسی حال میں
کسی مشقت سے منہ نہ پھیرنا چاہیے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سیادت و نبوت کے مقام اعلیٰ
پر پہنچنے کے باوجود بھی طلب علم کے لیے سفر کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

لَاَنَّ مُوسَىٰ لَمْ يَنْفَعَهُ بُلُوْعُهُ مِنَ السَّيَادَةِ الْمَحَلِّ الْأَعْلَىٰ
مِنْ طَلَبِ الْعِلْمِ وَرُكُوبِ الْبَحْرِ وَالْبَرِّ لِأَجْلِهِ ۖ

اے لیکن یاد رہے کہ حدیث اور روایت حدیث دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسے قرآن اور روایت قرآن الگ الگ
ہیں فقہ کی بنیاد قرآن ہے نہ کہ روایت قرآن۔ ایسے ہی اساس و بنیاد کی حیثیت میں فقہ کا مدار و مرکز حدیث
ہے نہ کہ روایت حدیث۔ یہی مطلب ہے۔ امام ابن الما جشتون کے اس بیان کا جو حافظ ابن عبد البر نے جامع
بیان العلم میں عبد الملک بن حبیب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب علم کا فیصلہ یہ ہے کہ فقہ میں وہ شخص
امام نہیں ہو سکتا جو علم قرآن اور حدیث و آثار کے متون نہ جانے اور ان کے معانی پر قابو نہ پائے جتنوں
انور کے ایک ارشاد کے مختلف طرق چند در چند سنیوں محفوظ رکھنا روایت و اسناد ہے اور زمانہ فتن میں
ضرورت کے تحت رونما ہوتی ہے۔ حدیث پہلے سے بھی موجود تھی اور آج بھی موجود ہے۔

۱۵ پارہ ۱۵، سورۃ کہف - کہ فتح الباری ج ۱ ص ۸۷۔

حضرت موسیٰ کا امامت کے بزرگترین مقام پر پہنچنا طلب علم اور اس کی خاطر
بحری و بری سفر سے مایوس نہیں ہوا ہے۔

امام مسلم نے صحیح میں حضرت ابو ہریرہ کی زبانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے
مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ بِهِ طَرِيقًا
إِلَى الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ

ترمذی میں حضرت انس بن مالک کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے
مَنْ خَاجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى يَرْجِعَ -

جو بھی طلب علم کے لیے نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے
ابوداؤد میں کثیر بن قیس کی زبانی یہ واقعہ آیا ہے :

کثیر بن قیس کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک
شخص آیا اور بولا کہ اے ابوالدرداء! میں آپ کے پاس مدینۃ الرسول
سے آیا ہوں اور آیا بھی صرف اس لیے ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بیان کرتے ہیں۔

میرے آنے کا مقصد صرف یہ ارشاد گرامی سننا ہے اور کوئی ضرورت
نہیں ہے۔ ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

لے حافظ ابن رجب فرماتے ہیں کہ تلاش علم کی خاطر چلنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الواقع چلے اور
علمی مجلسوں میں شرکت کرے اور دوسرے یہ کہ وہ راہ اختیار کرے جو حصول کا ذریعہ ہو مثلاً یاد کرے باہم مذاکرہ
کرے، مذاکرہ اور مطالعہ میں مشغول رہے، لکھے اور سمجھے اور اس کے علاوہ جو بھی علم کے حصول کا طریق
ہو اسے اپناتے۔ پہلے چلنے کو حقیقی اور دوسرے کو معنوی کہتے ہیں۔ ارشاد نبوت میں دونوں داخل
ہیں (جامع العلوم والحکم ص ۲۹۹) اور یہ جو فرمایا ہے کہ اللہ پاک اس کی برکت سے جنت کا راستہ آسان فرمادے گا تو اس کا
مطلب بھی یہی ہے کہ طلب علم میں اگر رضائے الہی مقصود ہوگی تو اللہ پاک طالب علم کے لیے علم سے استغفار اور اس پر
عمل آسان فرمائے گا اور یہی اس کے مدلول میں داخل ہے کہ اس کی برکت سے دوسرے علوم بھی آسان ہو جائیں گے
اور یہ علوم بھی جنت کا ذریعہ ہوں گے قرآن عزیز میں اس کی شہادت ہے وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْهُمْ هُدًى
وَأَتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ - (جامع العلوم والحکم ص ۳۰)

سے سنا ہے کہ جو شخص طلب علم کی خاطر راہ چل کر آئے اللہ پاک اس کو جنت کے راستہ پر چلائے گا اور اللہ کے فرشتے طالب علم کی خاطر اپنے بازو بچھاتے ہیں اور آسمان وزمین فٹے تا آنکہ سمندر کی گہرائی میں مچھلیاں اس کے لیے دھاتے مغفرت کرتی ہیں۔ عالم عابد پر ایسی ہی برتری رکھتا ہے جیسے چودھویں رات کا چاند عام ستاروں پر، اور عمار انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑے ہیں بلکہ انبیاء کی میراث تو علم ہے جو اسے لیتا ہے خوب لیتا ہے یہ

امام بخاری نے اپنی مشہور کتاب الادب المفرد میں امام احمد نے اپنے مسند میں اور حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں بحوالہ عبد اللہ بن محمد بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ ت حابر بن عبد اللہ کا طلب علم کے لیے سفر اختیار کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے :

مجھے ایک صاحب کے متعلق اطلاع ملی ہے۔ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے۔ میں نے فوراً اونٹ خریدا اس پر کجاوہ کسا اور ان صاحب کی طرف ایک ماہ کا سفر اختیار کر کے سیدھا ملک شام پہنچا۔ یہ صاحب عبد اللہ بن انیس تھے۔ میں نے ان کے دربان سے کہا کہ جا کر کہو جابر دروازے پر کھڑا ہے۔ انہوں نے سنتے ہی پوچھا کیا ابن عبد اللہ! میں نے کہا کہ ہاں فوراً باہر تشریف لائے اور مجھ سے بغلیگر ہوئے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک حدیث کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ آپ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری زندگی ایسی حالت میں ختم نہ ہو جاتے کہ میں حضور انور کے ارشاد گرامی سے محروم رہوں۔ اس کے بعد عبد اللہ بن انیس نے وہ حدیث بیان کی۔ یہ حدیث آخرت میں قصاص سے متعلق ہے۔

ابوداؤد میں حضرت عبد اللہ بن بریدہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ :

ایک صحابی ایک حدیث کی خاطر سفر کر کے فضالہ بن عبید کے پاس گئے
یہ اس وقت اپنی اونٹنی کو چارہ ڈال رہے تھے دیکھتے ہی بولے مرحبا!
مسافر صحابی نے کہا میں ملاقات کے لیے نہیں بلکہ ایک حدیث کی خاطر
آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے وہ حدیث سنی ہے۔ فضالہ
نے پوچھا وہ کون سی حدیث ہے؟ میں نے کہا کہ فلاں حدیث جس
میں یہ ہے۔

امام دارمی نے بسند صحیح بسیر بن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ میں صرف ایک حدیث کی خاطر
شہر شہر کا سفر کرتا تھا حضرت سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ میں ایک ایک حدیث کے لیے دن رات
چلتا تھا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اسلام میں علمی سفر کا مقام بہت بلند ہے اور اس کے فضائل بے شمار
ہیں اور قرآن حکیم کی اس ترغیب کی وجہ سے اس کا رواج صد اقل میں ہو چکا تھا۔ امام شافعی کے
حدود سفر میں حافظ ابن حجر نے توالی التابیس میں حسب ذیل مقامات بتاتے ہیں۔ مدینہ، یمن،
عراق اور مصر، امام احمد نے طلب حدیث کے لیے کوفہ، بصرہ، شام اور جزیرہ کا سفر کیا ہے۔
امام ابو یوسف نے عراق، حجاز، شام اور دیگر ممالک کے بہت سے اساتذہ کے سامنے زانو سے
اذب تر کیا ہے۔ امام محمد نے کوفہ، بصرہ، مکہ، شام اور بلاد عراق میں جا کر حدیث سنی تھی۔
حافظ ذہبی نے مناقب میں خود امام محمد کی زبانی نقل کیا ہے کہ والد محترم نے تیس ہزار درہم چھوڑے
تھے ان میں سے میں نے پندرہ ہزار سحر اور شعر کی تحصیل پر خرچ کیے اور باقی پندرہ ہزار حدیث و
فقہ کی تکمیل پر۔

بہر حال علم حدیث کے لیے سفر کرنا اور اس کی دھن میں ملک ملک پھرنا سلف کا معمول تھا۔
اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے خلف بن ایوب سے ایک مسئلہ دریافت کیا وہ کہنے لگے،

لے مناقب احمد ص ۲۲، ۲۳ حسن التقاضی ص ۵۴، ۵۵ نیل الامانی ص ۶، ۷ مناقب ذہبی ص ۵۴
۵۵ حضرت خلف بن ایوب اہل بلخ کے امام اور بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے حافظ ذہبی نے آپ کا تذکرہ
ان الفاظ سے شروع کیا ہے احداً لفقہاء الاعلام محدث حاکم نے ان کو فقیہ بلخ اور حافظ خلیلی نے
صدوق مشہور لکھا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ سلطان بلخ آپ کی زیارت کے لیے آئے تو آپ نے منہ
(باقی ص ۲۲۲ پر)

مجھے تو معلوم نہیں ہے نووارد نے کہا کہ پھر کسی ایسے شخص کا مجھے پتہ بتائیے جسے یہ مسئلہ معلوم ہو، فرمایا
ایسے تو حسن بن زیاد ہیں جو کوفہ میں ہیں۔ اس پر پوچھنے والے نے کہا کہ کوفہ تو بہت دور ہے۔ امام
خلف بن ایوب نے فرمایا کہ مَنْ هُمُ الدِّينَ قَانُكُوفَةُ اَلَيْسَ قَرِيبَةً یعنی جسے دین
کی فکر ہو اس کے لیے کوفہ نزدیک ہے اسی بنا پر اصول حدیث کی کتابوں میں اس علمی سفر کے لیے
خاص خاص ہدایات آئی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

رحلت یہ ہے کہ اپنے شہر کی حدیثوں کو پہلے معلوم کرے اور ان کو
یاد کرے پھر دوسرے شہروں کا سفر کرے سفر میں وہ کچھ حاصل کرے
جو اس کے پاس نہ ہو۔

امام اعظم نے جب علم حدیث پر توجہ کی تو اسی قاعدے کے مطابق سب سے پہلے اپنے شہر کے

لے شرح الفکر ص ۴۰۔

ص ۲۲۱ کا بقیہ حاشیہ:- پھر لیا۔ امام حاکم نے لکھا ہے کہ آپ نے فقہ کی تعلیم قاضی ابویوسف اور ابن ابی لیلیٰ سے
حاصل کی اور زہد و تصوف حضرت ابراہیم بن ادہم سے حاصل کیا امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں خلف
بن ایوب کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى خَلْفَ إِمَامٍ
فَانْتَفَعَتْ لَهُ قِدْرًا لَا يَمْلَأُ

حافظ ابن حبان نے کتاب التقات میں ان کا ذکر کیا ہے اور حاکم نے تاریخ نیشاپور میں ان کا مفصل ترجمہ
لکھا ہے۔ حدیث کا سماع آپ کو امام ابویوسف، امام محمد، امام زفر اور ابن ابی لیلیٰ کے علاوہ عوف اعرابی، قیس بن
البریع، اسرئیل بن یونس، اسد بن عمرو، جریر بن عبد الحمید اور دیگر علماء کی ایک جماعت سے حاصل ہے۔ امام ذہبی
نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل، ابوکریب اور بہت سے اکابر محدثین نے آپ کے سامنے زانوے ادب طے کیا ہے
امام حاکم لکھتے ہیں کہ آپ سلسلہ میں نیشاپور تشریف لائے تو ہمارے یہاں کے مشائخ نے آپ حدیثیں لکھیں۔ آپ کے شاگردوں
میں امام احمد کے علاوہ ربیع بن یحییٰ بن معین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امام ترمذی نے بھی اپنی سنن میں ابوکریب
محمد بن العلاء کے حوالہ سے حدیث نقل کی ہے مگر افنوس کہ امام ترمذی کو حضرت خلف کے حالات کا علم نہ ہو سکا اور یہ کوئی حیرت کی بات
نہیں ہے حافظ ابن حزم اپنی جملات قدر کے باوجود امام ترمذی سے ناواقف ہیں حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوہیح میں لکھا ہے
کہ ابن حزم صرف ترمذی سے نہیں بلکہ مشہور امام ابوالقاسم بغوی، اسماعیل الصغار، ابوالعباس الاصم سے بھی نا آشنا ہیں جیسا امام
ترمذی کو ابن حزم کا نہ جانا کوئی قیمت نہیں رکھتا ایسے ہی ترمذی کی خلف بن ایوب سے ناواقفیت بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔

ساتھ فن کے سامنے زانوے ادب نہ کیا اور ایک عرصہ تک وطن عزیز ہی میں تحصیل علم میں مصروف رہے اور جن جن اساتذہ سے کوفہ میں استفادہ کیا اس کا ایک دھندلا سا خاکہ آپ کے سامنے اچکا ہے جب آپ کوفہ سے سیراب ہو چکے تو دوسرے مقامات کا رخ کیا۔

رحلتِ علمیہ کی تاریخ

امامِ اعظم کی رحلتِ علمیہ کی تاریخ تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ جامع بیان العلم و فضلہ میں حافظ ابن عبد البر نے خود امام صاحب کا جو بیان درج کیا ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلا سفر اپنے والد محترم کی معیت میں مکہ کا کیا ہے اور اسی سفر میں آپ کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارث سے ملاقات ہوئی ہے اس میں تصریح ہے، میری عمر سولہ سال تھی کہ میں نے سلسلہ میں اپنے والد کی ہمرکابی میں حج کا سفر کیا۔

حج اس زمانے میں افادہ و استفادہ کا سب سے بڑا ذریعہ تھا کیونکہ ممالک اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال حرمین میں آکر جمع ہوتے تھے اور درس و افتاء کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ابوالحسن مرغینانی نے بند منقل نقل کیا ہے کہ امام اعظم نے ایک بار نہیں بلکہ ۵۵ بار حج کیا، نیز آپ نے طلب علم کی خاطر بصرہ کا بیس مرتبہ سے زیادہ سفر کیا ہے اور اکثر پورا پورا سال وہاں قیام بھی کیا ہے۔

ان تاریخی روایات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طلب علم کی خاطر مکہ، مدینہ اور بصرہ کا سفر کیا ہے لیکن آغاز سفر کے بارے میں جامع بیان العلم کی روایت کے علاوہ کوئی مثبت تصریح نہیں ہے اس لیے قیاس یہی ہے کہ آغاز اگرچہ سلسلہ میں ہو چکا تھا مگر ان علمی سفروں میں باقاعدگی اور تسلسل سلسلہ کے بعد ہوا ہے۔ الیافعی کی تصریح کے مطابق امام شعبی کا سال وفات ۱۷۸ھ ہے۔ اسی کے بعد آپ نے سفر کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا ہے کیونکہ آپ یہ پہلے سن چکے ہیں کہ امام صاحب امام حماد کے پاس علم الشرائع کی خاطر اٹھارہ سال رہے ہیں امام حماد کی تاریخ وفات ۱۷۸ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم نے ۱۷۸ھ سے

مسلل علمی سفر کیے ہیں اور آخر عمر تک حج سے تو کوئی سال بھی خالی نہیں ہے کیونکہ اگر آپ نے ۵۵ حج کیے ہیں جیسا کہ امام ابو الحسن مرغینانی نے بیان کیا ہے تو پہلا حج ۹۶ھ میں ہی آتا ہے اور یہ وہی حج ہے جب آپ اپنے والد محترم کے ساتھ پہلی بار حج کو تشریف لے گئے ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارث کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اس کے بعد آپ کی عمر کا کوئی سال بھی حج سے خالی نہیں ہے ۔

اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے امام لیث بن سعد کی ملاقات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ :

امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظم کی شہرت سنتا تھا ملنے کا بے حد مشتاق تھا۔ حسن اتفاق سے مکہ میں اس طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص پر ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں۔ مجمع میں میں نے ایک شخص کی زبان سے کلمہ سنا کہ اے ابو حنیفہ! میں نے جی میں کہا کہ لو تمنا برآتی یہی امام ابو حنیفہ ہیں !

تذکرۃ الحفاظ میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ امام لیث بن سعد انیس سال کی عمر میں حج کو تشریف لے گئے اور یہ بھی بتایا ہے کہ امام لیث کی اکاسی سال عمر تھی۔ ۱۵۷ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ یہ یہ ان کا ملاقاتی حج ہے ورنہ اس کے بعد بھی صرف امام اعظم کی ملاقات ہی کے لیے لیث بن سعد حج کو گئے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ الحافظ ابو محمد الحارثی بسند متصل فقیہ مصر عبدالرحمن بن القاسم کی زبانی نقل کرتے ہیں :

میں نے لیث بن سعد سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ مجھے ایک بار امام اعظم کا برائے حج ارادے کا علم ہوا میں صرف امام اعظم سے ملاقات کی خاطر حج کو گیا۔ مکہ میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے آپ سے مختلف عنوانوں پر بہت سے مسائل دریافت کیے۔ میں نے آپ سے دیوانی و فوجداری مسائل میں قتل خطا اور شبہ عمد کے بارے میں پوچھا۔ یہ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انیس سال کی عمر میں یعنی ۱۵۷ھ میں امام لیث نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ

امام ذہبی نے لکھا ہے یہ اور امام اعظم کو اس موقع پر اس طرح پایا کہ
النَّاسُ مُتَقَفِّضِينَ عَلَيْكَ، لوگ اُن پر لڑتے پڑے ہیں۔

اور بعد کو نام لینے پر معلوم ہوا کہ یہی امام اعظم ہیں۔
۳۱۰ھ میں ہجوم کا یہ ٹوٹا پڑنا بتا رہا ہے کہ یہ امام اعظم کا پہلا سفر نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے
متعدد بار آچکے ہیں اور ذات گرامی جانی پہچانی ہے ورنہ ایک اجنبی کے گرد یہ ہجوم کہاں ہوتا ہے
اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد حجوں کا لگاتار سلسلہ شروع
کر دیا تھا اور امام لیث نے تو یہ بات جلوت کے متعلق بتاتی ہے کہ:
سَأَيُّتُ النَّاسَ مُتَقَفِّضِينَ عَلَيْكَ۔

مگر امام ابو عاصم النبیل نے جو مکہ ہی کا واقعہ بتایا ہے اس میں تو بات یہاں تک کھول دی
ہے کہ لوگوں کی عقیدت امام اعظم کو مکہ میں صرف جلوت ہی میں نہیں بلکہ گھر کی خلوت میں بھی چین
سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور صرف اصحاب حدیث نہیں بلکہ ارباب فقہ کا بھی آپ کے ارد گرد ہجوم
رہتا تھا چنانچہ امام ابو جعفر طحاوی نے بکاذ بن قتیبہ کے حوالہ سے امام ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ
ہم مکہ میں امام اعظم کے پاس رہتے تھے آپ کے پاس ارباب فقہ اور
اصحاب حدیث کا ہجوم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص نہیں
ہے جو صاحب خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو ہٹواتے ہے

اس سے ایک طرف اگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امام اعظم مستقل طور پر مکہ جاتے تھے اور وہاں آپ
نے بود و باش بھی اختیار کی تھی تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں امام اعظم سے دونوں
مدرسے یکساں فائدہ اٹھاتے تھے اور امام صاحب کی علم الفقہ اور علم الحدیث دونوں فنون میں
لوگوں کو جلالت قدر کا یکساں اقرار تھا اس مقصد کی خاطر لوگ دور دور سے چل کر آتے۔
حج کے عام سفروں کے علاوہ اموی حکومت کے آخری دور میں حکومت کے جو روستم اور ظلم و

تعدی سے تنگ اگر آپ نے حجاز کا رخ کیا۔ کروری رقم طراز ہیں،
فَهَرَبَ إِلَى مَكَّةَ وَآقَامَ بِعَاسَنَةِ جَائَةٍ وَثَلَاثِينَ۔^{۳۱}
مکہ روانہ ہو گئے اور وہاں ۳۱۰ھ تک قیام فرمایا۔

اسی زمانے میں اموی حکومت کے خلاف سازش ہوئی ہے عباسیوں کے اٹھانے سے ابو مسلم نے بغاوت کرائی جب تک عباسی تحریک اموی حکومت کا خاتمہ کر کے عباسیوں کو تختِ حکومت دلانے میں کامیاب نہیں ہوتی، امام اعظم حجاز ہی میں ہے اور بالآخر

قَدِمَ أَبُو حَنِيفَةَ الْكُوفَةَ فِي رَمَضَانَ مِنْ أَبِي جَعْفَرٍ الْمَنْصُورِ عَلَيْهِ

امام ابو حنیفہ ابو جعفر منصور کے زمانے میں کوفہ آئے۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ سفلح کی حکومت کا پورا زمانہ چار سال نو ماہ امام اعظم نے کوفہ سے باہر حجاز میں گزارے۔

حجاز میں امام اعظم کے مشاغل

امام اعظم کو اس زمانے کے دستور کے مطابق حجاز کے علماء محدثین سے فائدہ اٹھانے کا یہ زیریں موقع ملا اور صرف استفادے کا نہیں بلکہ حجاز میں لوگوں نے امام کو افادے کی مجلسیں قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ وزیر بن عبد اللہ کا بیان ہے :

میں نے مکہ میں یاسین زریات کو دیکھا کہ سامنے ایک جماعت ہے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں لوگو! ابو حنیفہ کے پاس آیا جایا کرو اور ان کی مجلس کو غنیمت سمجھو، ان کے علم سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ ایسا آدمی پھر بیٹھنے کے لیے نہیں ملے گا اور حلال و حرام کے ایسے عالم کو پھر نہیں پاؤ گے اگر اس شخص کو تم نے کھو دیا تو علم کی بہت بڑی مقدار کھو دو گے یہ

اسلام کے اس سب سے بڑے مرکز میں ایک ممتاز عالم، محدث یاسین الزریات کی طرف سے اس قسم کے اعلان کا اس کے سوا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا کہ امام اعظم پر مکہ میں دنیا ٹوٹ پڑے۔ الموفق نے ان کی یہ روایت نقل کی ہے :

ابو حنیفہ حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان پر خلعت کا ہجوم تھا ہر علاقے کے لوگ ہوتے تھے سب کو جواب دیتے اور فتویٰ بتاتے۔

امام عبد اللہ بن المبارک نے امام اعظم کے اس علمی افادے کے تلمذ کو مکہ میں اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے ان کا خود بیان ہے :

میں نے حرم کعبہ میں ابو حنیفہ کو دیکھا کر بیٹھے ہوئے ہیں اور مشرق و مغرب کے باشندوں کو فتویٰ دے رہے ہیں۔

امام اعظم کی اس مجلس میں کس قسم کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ یہ عبد اللہ بن المبارک ہی کی زبانی سنئے :
وَالنَّاسُ يَوْمُ مَبْدِ نَاسٍ

صدر الامہ نے عبد اللہ بن المبارک کے اس جملے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ

يَعْنِي اَلْفُقَهَاءَ اَلْكِبَارَ وَ خِيَارَ النَّاسِ

عبد اللہ کی مراد یہ ہے کہ بڑے بڑے فقہاء اور بہترین لوگوں کا مجمع تھا

الغرض حجاز میں امام اعظم کی ذات گرامی سے دونوں مدرسے محدثین اور فقہاء مستفید ہو رہے تھے۔ یہ دونوں مدرسے الگ الگ ہیں دونوں میں بڑا جوہری فرق ہے۔

محدث اور فقیہ میں فرق

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث کی زبانی آپ فقہ اور حدیث کا باہمی فرق سن چکے ہیں لیجئے۔
سرا ہے محدث اور فقیہ کا فرق بھی شاہ صاحب ہی کی زبانی معلوم کر لیجئے۔

محدث اور فقیہ میں فرق ہے۔ محدث کا کام صرف حدیث کی روایت

ہوتا ہے اور اس سلسلے میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف،

محرف ہے یا غیر محرف، عربی زبان میں الفاظ غریبہ کے معانی کیا ہیں؟

راویوں کی لڑی عدالت کی ترازو میں پوزی اترتی ہے یا نہیں، حدیث

کے توابع و شواہد کیا ہیں۔ حدیث اپنے بیان کرنے والوں کے لحاظ

سے شہرت اور غرابت میں کیا مقام رکھتی ہے۔ جو محدث علم حدیث

میں یہ باتیں جانتا ہے وہ ضابطہ، حافظ اور متفق کہلاتا ہے۔

فقیہ کا کام مشتبہ الفاظ کی تحدید اور حدیث میں رکن، شرط اور ادب

کی تعین کرنا ہے۔ وہ امر کے صیغوں کو دیکھ کر استحباب اور وجوب

کافیصلہ کرتا ہے۔ اور نواہی میں مکروہ اور حرام کے درجات مقرر کرتا ہے۔ وہ پیش پا افتادہ مسائل کی علتیں اور دلائل جانتا ہے اور علتوں کے لحاظ سے کسی حکم کے مطلق اور مقید ہونے کی نشاندہی کرتا ہے وہ اپنی فقہیت کے زور سے احترازی اور اتفاقی قیود واضح کرتا ہے اور اطلاق و تقیید کی روشنی میں وہ زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں ہر موضوع پر قوانین و ضوابط کلیہ بتاتا ہے اور پھر ان قوانین سے حالات و کوائف میں اٹھتے ہوئے سوالات کا جواب دیتا ہے دلائل میں تعارض ہو تو تطبیق دینا، باہم مفاہمت کرنا، منسوخ بنانا اور تعارض کے وقت ترجیح دینا فقیہ کا کام ہے۔

اس پر تفصیلی گفتگو آئندہ اوراق میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مکہ میں آپ سے استفادہ کرنے والے دونوں فنون حدیث اور فقہ میں استفادہ کرتے تھے۔ یہی حال آپ کا کوفہ میں بھی تھا کہ آپ دونوں فنون میں ایک امام کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے تھے۔ صدر الامر نے اسی سلسلے میں مکی بن ابراہیم کے متعلق لکھا ہے کہ

أَتَتْهُ دَخَلَ الْكُوفَةَ وَكَانَ أَبَا حَنِيفَةَ وَ سَمِعَ مِنْهُ الْحَدِيثَ
وَالْفِقْهَ بِلَهُ

کوفہ آئے اور امام ابو حنیفہ کے پاس رہ کر ان سے حدیث و فقہ کی سماعت کی۔ اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے الرد علی البکری میں امام اعظم کو امام المحدثین والفقہاء لکھا ہے۔ بہر حال امام اعظم کے اسفار علمیہ میں سب سے اونچا مقام مکہ کا ہے اور آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد شام میں رخت سفر باندھا ہے۔

حدیث اور روایت حدیث

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ تدوین حدیث کے لیے امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے شام میں باقاعدہ سرکلر جاری ہوا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ ابھی حدیث میں روایت و اسناد

کا عام چرچا نہ تھا کیونکہ صحابہ اور تابعین موجود تھے اور سنن عام شہری زندگی میں رائج تھیں۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ خامسہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اسلام اور مسلمانوں میں عزت و شوکت اور علم اپنے اوج کمال پر تھا
دین کی خاطر جدوجہد اور محنت ہو رہی تھیں اور سنتیں برسر عام تھیں۔
بدعات سرنگوں تھیں اور اعلان حق کرنے والے کافی تھے۔

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیے ”والسنن مشہورۃ“، کہ اس دور میں سنن شہری زندگی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھیلی ہوئی سنتوں کو سمیٹنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس کے لیے اسناد و روایت کا سلسلہ حیدر اور کار نہ تھا۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن حزم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم کی تعمیل میں ایک نہیں بلکہ متعدد کتابیں لکھیں۔ حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین حدیث کے کام پر سرکاری طور پر مامور کیا گیا تھا۔ امام زہری کا خود اپنا بیان ہے:

أَمَرَ نَاعِمَةُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ بِجَمْعِ السُّنَنِ فَلَكَبْنَا هَذَا فُتْرًا وَفُتْرًا۔

ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے جمع سنن کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھنے والے

امام زہری کے ان دفاتر کا معمر نے بھی تذکرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ولید بن یزید قتل ہوا تو امام زہری کی لکھی ہوئی تصانیف کو ولید کے خزانہ سے جانوروں پر لا کر لایا گیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایت و اسناد کا فن رونما ہونے سے پہلے علم حدیث یا السنن کا اندازہ کیا تھا؟ کیونکہ حدیث تو دراصل نبوت کے اقوال، افعال اور احوال کا نام ہے اس کے سوا روایت و اسناد پر حدیث کا اطلاق محدثین کی اپنی اصطلاح ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں،

بخذا طلب حدیث، حدیث سے الگ ہے کیونکہ طلب حدیث تو چند

در چند امور زائدہ کے لیے ایک عرفی نام ہے اور یہ امور زائدہ ماہیت

حدیث سے الگ ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ اس موقع پر بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں:

لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا

ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی روایت کی وجہ سے صحیح ہوئی ہے نہیں ہرگز نہیں بلکہ بخاری و مسلم کی احادیث کو روایت کرنے والے اور بھی بے شمار علماء محدثین ہوتے ہیں بخاری و مسلم سے پہلے اور بعد میں ان احادیث کو بیان کرنے والے روایت کرنے والے ان گنت لوگ ہوتے۔ اگر بخاری و مسلم پیدا نہ ہوتے تو نہ دین میں کوئی کمی آتی اور نہ احادیث کے وجود پر کوئی سحر آتا جب ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تو اس کی حیثیت اس سے کوئی مختلف نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ قرآن کو قرارِ سبعہ نے روایت کیا ہے۔ قرآن بتواتر منقول ہے، قرآن کا قرآن ہونا قرارِ سبعہ پر موقوف نہیں ہے۔ ایسے ہی احادیث کا صحیح ہونا اور ان کا حدیث ہونا بخاری و مسلم کی روایت پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ احادیث بخاری و مسلم کے وجود پذیر ہونے سے پہلے ہی صحیح اور اُمت میں مقبول تھیں یہ

اسی بنا پر روایت و اسناد کے رد و ما ہونے سے پہلے زمانہ تابعین میں ایسی تمام روایات جنہیں تابعی حضور انور کے نام سے پیش کرے قابل قبول سمجھی جاتی تھیں۔ اور حافظ ابن جریر کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ تابعین کا ایسے ارشادات اپنانے پر اتفاق رہا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں۔

ابو عمر بن عبد البر نے تہمید کے آغاز میں تصریح کی ہے کہ امام بن جریر کہتے ہیں کہ مرسل روایات کے قبول کرنے پر تابعین کا اجماع ہے بلکہ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسناد و روایت کے وجود میں آنے سے پہلے بھی حدیث موجود تھی اصل تو حدیث ہی ہے روایت و اسناد تو حدیث کی حفاظت کی خاطر فتنوں کے زمانے کی پیداوار ہے۔ چنانچہ امام مسلم مقدمہ میں امام ابن سیرین کے حوالہ سے رقمطراز ہیں :

لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الْأَسْنَادِ فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ

قَالُوا اسْمُوا النَّارَ جَانِكُمْ فَيَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ
حَدِيثُهُمْ وَيَنْظُرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدْعِ فَلَا يُؤْخَذُ مِنْهُمْ
لوگ اسناد کے بارے میں پوچھ گچھ ہی نہ کرتے تھے۔ جب فتنے رونے
ہوئے تو لوگوں نے کہا شروع کیا کہ اپنے آدمی بتاؤ۔ اگر راوی اہل
السنۃ ہوتا تو روایت لیتے اور اگر بدعتی ہوتا تو روایت اس سے نہ لیتے۔

جوں جوں زمانہ صحابہ و تابعین سے دوری ہوتی گئی اسناد و روایت کے فن میں وسعت آتی
گئی حتیٰ کہ جو حدیث زمانہ تابعین میں امام اعظم کو صرف ایک واسطہ اور دو واسطوں سے ملتی تھی
وہی بخاری و مسلم کے زمانے میں اسناد و روایت کے بازار میں چھ واسطوں کی محتاج ہو گئی۔ مثلاً
امام اعظم فرماتے ہیں :

عَنْ عَطَاءٍ عَنْ جُمُرَانَ أَنَّ عُثْمَانَ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا وَقَالَ هَكَذَا
رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ ۚ
حمران کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے وضو میں ایک ایک عضو کو تین تین
بار دھویا اور فرمایا کہ میں نے ایسے ہی حضور انور کو وضو کرتے دیکھا ہے۔

آئیے یہی حدیث امام بخاری کی زبانی بھی سن لیجئے :

حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْأَدِيسِيُّ قَالَ حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ
بْنُ سَعْدٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَزِيدٍ أَخْبَرَنَا أَنَّ
حَمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ بْنِ عَمَانَ أَخْبَرَنَا أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ
وَعَايَا نَائِمٍ فَافُورَعٌ عَلَى كَفِّهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَعَسَلَهَا ثُمَّ
أَدْخَلَ يَمِينَهُ فِي الْإِنَاءِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَشْشَقَ ثُمَّ غَسَلَ
وَجْهَهُ ثَلَاثًا وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلَاثًا ثُمَّ مَسَحَ ثُمَّ
غَسَلَ رِجْلَيْهِ ثَلَاثًا إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُولُ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ مَحْوً وَضُوءِي
هَذَا ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ

مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذُنُبِهِ يَلَهُ

جیسے آج تدوین کتب کے بعد ان کتابوں کے مصنفین پر حد درجہ اعتماد ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ
 أَنَّ تَسْبِيَةَ الْكِتَابِ إِلَى مُصَنِّفِهِ مَعْلُومَةٌ فِي الْجُمْلَةِ بِالْمُتَّفِقَةِ
 فَإِنَّا نَعْلَمُ أَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيَّ أَلْفَ كِتَابًا فِي الْحَدِيثِ
 وَأَنَّ هَذَا الْمَوْجُودُ فِي أَيْدِي الْمَحْدِثِينَ يَلَهُ

کتاب کی نسبت مصنف کی طرف بڑا بہتہ معلوم ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے
 کہ امام بخاری نے حدیث میں ایک کتاب لکھی ہے اور وہی محدثین کے
 ہاتھوں میں موجود ہے۔

ایسے ہی دور اسناد و روایت سے پہلے صحابہ اور تابعین پر ان ائمہ دین کو اعتماد تھا۔ ہم بھی آج جو
 حدیثیں ان کتابوں سے بیان کرتے ہیں اور برملا کہہ دیتے ہیں کہ امام بخاری و مسلم اور ابو داؤد وغیرہ
 نے فرمایا ہے تو یہ اصول محدثین کے مطابق روایات مرسلہ ہیں کیونکہ نہ ہم نے بخاری سے سنا ہے
 اور نہ مسلم سے بلکہ ہمارے اور امام بخاری کے درمیان ایک سے زیادہ وسائط ہیں جن کے نام
 سے بھی ہم واقف نہیں سب کے سب مجاہیل ہیں جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے لکھا ہے،
 إِنَّ أَقْصَى مَا فِي الْبَابِ أَنْ يُرْوَى الْحَدِيثُ عَنِ الْمَجَاهِيلِ
 مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَالْمَجَاهِيلِ مِنَ الْعُلَمَاءِ يَلَهُ
 زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حدیث مجاہیل مسلمان اور مجاہیل علماء
 سے روایت کی جا رہی ہے۔

لیکن ہمیں اس پر کوئی قلعہ نہیں کیونکہ ہمیں ان بزرگوں کی دیانت، صداقت اور ثقاہت و
 عدالت پر پورا پورا اعتماد ہے ٹھیک ٹھیک ایسا ہی اعتماد روایت و اسناد کا سلسلہ پیدا ہونے
 سے پہلے اس دور کے لوگوں کو تابعین کرام پر تھا۔ اس اعتماد کی وجہ سے آج ہم ان علماء کے مراسیل
 کو قوی نہیں بلکہ قوی تر بتاتے ہیں:

لہ اس روایت کو امام مسلم اپنی صحیح میں نو طریقوں سے لائے ہیں ہر طریق میں سات افراد ہیں اور وارثین
 نے سات طریقوں سے درج کیا ہے مگر کوئی طریق آٹھ افراد سے خالی نہیں ہے۔

لہ، لہ، الروض الباسم ص ۱۸

إِنَّا أَقْبَوُا الْمَرْءَ إِسْبِيلَ مَا أُرْسَلَهُ الْعُلَمَاءُ مِنْ أَحَادِيثِ هَذِهِ
الْكِتَابِ ۱۷

مراہیل میں قوی تر ان کتابوں کی حدیثوں میں علماء کے مراہیل ہیں۔

اور جیسے ان بزرگوں کی کتابوں کو آج ترجیح، دوسری کتابوں کے مقابلے میں شہرت اور قبول کی بنا پر ہے اور اس لیے یہ کتابیں بجائے خود ایک دلیل صحت بن گئی ہیں ایسے ہی دوسری صدی کے لوگ تابعین کو دوسروں کے مقابلے میں ان کی علمی شہرت اور قبول کی بنا پر ترجیح دیتے تھے اور اس لیے تابعین کی ہستی بجائے خود ان کے یہاں صحت کی ضمانت تھی۔ بہت بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم تو اپنے بزرگوں کی دیانت کے اتنے متوالیہ ہوں کہ ان کی راہ سے آتی ہوئی حدیثوں کو قطعی قرار دیں اور تابعین کے مقام پر ہم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں فانا للہ والی اللہ المشتکی۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث اور ہے اور روایت حدیث اور۔ امام اعظم کے زمانہ طالب علمی میں فن روایت و اسناد شاہراہ عام پر نہ آیا تھا اور نہ اس کے تیسری صدی کی طرح عام شہروں میں دفاتر کھلے تھے اور نہ ہی اس دور میں کبار تابعین کا دور ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں:

وَلَا يَكَادُ يُوجَدُ فِي الْقَرْنِ الْأَوَّلِ الَّذِي الْقَرْنُ فِي الصَّحَابَةِ
وَكِبَارِ التَّابِعِينَ ضَعِيفٌ ۱۸

وہ قرن اول جس میں صحابہ اور بڑے تابعین ہیں اس میں ضعیف کوئی نہیں ہے
۱۸۔ سید یحییٰ بن سعید القطان کی تاریخ ولادت ہے جن کے بارے میں حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے کہ فن رجال میں سب سے پہلے مصنف یہی ہیں اور کوفہ میں امام شعبہ موجود تھے جن کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں:

كَانَ شُعْبَةُ أُمَّةً وَحْدًا فِي هَذَا الشَّانِ ۱۹

اس فن میں حضرت شعبہ یگانہ امام ہیں۔

الغرض امام اعظم نے علم کی خاطر سفر کیا اور آپ کے اسفار علمیہ میں مرکزی حیثیت مکہ مکرمہ کو حاصل ہے۔

مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت

وہ حرم پاک جہاں سے علم وحی و نبوت کا آغاز ہوا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول ہونے کے بعد تیرہ سال کا عرصہ گزارا۔ امام اعظم کے زمانہ میں یہ بھی کوفہ کی طرح دارالعلم تھا۔ حافظ ذہبی لایمہ ذوات الآثار میں فرماتے ہیں :

عہد صحابہ میں یہاں علم کم تھا پھر صحابہ کے آخری دور میں علم کی کثرت ہوئی اور اسی طرح عہد تابعین میں مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر اور ابن ابی ملیکہ اور پھر ان کے شاگردوں کے دور میں عبد اللہ بن ابی بنجی، قاری ابن کثیر، حنظلہ بن ابی سفیان اور ابن جریر سج اور ہارون رشید کے وقت میں مسلم زنجی، فضیل بن عیسیٰ، ابو عبد الرحمن ازرقی، حمیدی اور سعید بن منصور جیسے علماء ہوئے ہیں۔

امام بخاری کو حرمین کے عمل پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے اپنی صحیح میں اس موضوع پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

باب ما ذکرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحصن علی اتفاق
اہل العلم و ما اجمع علیہ الحرمان مکة والمدینۃ
علامہ کرماتی شارح صحیح بخاری لکھتے ہیں :
امام بخاری کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ اہل حرمین کا اتفاق و اجتماع
حجت ہے۔

مگر حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ
لَعَلَّہٗ اَرَادَ التَّوَجُّعَ لَا الْاِجْمَاعَ۔
غالباً مراد توجع ہے اجماع نہیں۔

امام بخاری کی عبارت کا خواہ مطلب کچھ ہو مگر اتنا معلوم ہے کہ اختلافی مسائل میں ان کے نزدیک

وہی مسئلہ قابل ترجیح ہے جس پر علماء حرمین متفق ہوں گے۔
 بہر حال دوسری صدی کے آغاز میں اور پہلی صدی کے آخر میں مکہ مکرمہ علم کی منڈی تھا اور تمام
 بلاد اسلامیہ میں مکہ کے علمی جلال کا لوہا مانا جاتا تھا اتنا کہ علامہ سخون نے تصریح کی ہے کہ اگر ابن عباس
 اہل مدینہ سے کسی مسئلہ میں اختلاف کر جائیں تو مدینہ کی اجماعی طاقت علمی بھی بے جان ہو جاتی تھی۔
 إِذَا خَالَفَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَهْلَ الْمَدِينَةِ لَمْ يَنْعَقِدْ لَهُمُ
 إِجْمَاعٌ ۖ ۱۷

جب اہل مدینہ کی ابن عباس مخالفت کریں تو اہل مدینہ کا اجماع منعقد
 نہیں ہوتا۔

مکہ میں امام اعظم نے جن حفاظ حدیث سے علمی استفادہ کیا ہے ان کی تفصیل بتانا تو دشوار ہے
 یہاں صرف چند گرامی قدر ہستیوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مکہ کے گلستان کی بارغ و
 بہار کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

امام اعظم کا عطاء بن ابی رباح سے تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ کا آغاز مفتی اہل مکہ، محدث مکہ، القدوہ اور المعلم کے زریں لقا
 سے کیا ہے اور ان کو علم حدیث میں امام اعظم کا استاد بتایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
 عَنْهُ الْيُوبُ وَحُسَيْنُ الْمَعْلَمُ وَابْنُ جُرَيْجٍ وَابْنُ اسْحَاقَ وَالْأَوْزَاعِيُّ
 وَالْبُحَيْفِيُّ ۳۷
 عطاء کے تلامذہ میں یوب، حسین ابن جریر، ابن اسحاق اور البوحیفہ ہیں۔

۱۷ یہ مسئلہ بھی مہمات مسائل میں سے ہے۔ اہل مکہ کا دوسرے اسلامی شہروں کے مقابلے میں اپنی قوت
 اجماع سے قابل ترجیح ہونا بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جس پائے کے علماء یہاں موجود تھے دوسرے
 مقامات پر بھی موجود تھے نیز مہاجرین جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم صحبت یافتہ تھے ان میں سے پھر کسی ایک
 نے بھی مکہ میں آکر دوبارہ قیام نہیں کیا ان کو اس کی شرعاً اجازت نہ تھی۔ مکہ کی جو علمی رونق تھی وہ عبداللہ
 بن عباس کے تلامذہ کے دم ختم سے تھی اور بس۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔
 ۳۷ عمدۃ القاری ج ۲۵ ص ۲۰۲۔ ۳۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲۔

بلکہ امام ذہبی نے اپنی مشہور تاریخ کے خلاصہ میں بالتصریح یہ بھی لکھا ہے کہ :

أَكْبَرُ شَيْئِهِ عَطَاءُ بْنُ أَبِي رِبَاحٍ - ۱۷

ابو حنیفہ کے اساتذہ میں سب سے بڑے عطاء بن ابی رباح ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حیثیت امام مالک کی اسانید میں مالک عن نافع عن ابن عمر کی ہے جسے امام بخاری وغیرہ اجل الاسانید اور اصح الاسانید کہتے ہیں۔ یہی حیثیت امام اعظم کی اسانید میں ابو حنیفہ عن ابن عباس کی ہے۔ چنانچہ امام شعرائی نے اس کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے مناقب میں لکھا ہے۔

وَسَمِعَ الْحَدِيثَ مِنْ عَطَاءِ بْنِ رِبَاحٍ - ۱۸

حضرت عطاء بن ابی رباح کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہوتا تو ان اکابر کے یہ بیانات پڑھیے حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اے اہل مکہ تم میرے پاس بھیڑ رکھتے ہو حالانکہ تمہارے پاس تو عطاء موجود ہیں۔ بعینہ یہی الفاظ حافظ ذہبی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی نقل کیے ہیں۔ حضرت سعید فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مکہ میں تشریف لائے۔ لوگوں نے ان سے مسائل دریافت کیے آپ نے فرمایا کہ مسائل کی خاطر تم میرے پاس جمع ہوتے ہو حالانکہ تم میں عطاء موجود ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ اس شخص کی جلالت علمی کا کیا حال ہو گا جس کی علمیت کا لوہا ابن عباس اور ابن عمر جیسے جلیل القدر اور اساطین حدیث صحابہ مانتے ہوں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ :
عطاء بن ابی رباح نے سترچ کیے ہیں۔ اموی دور حکومت میں زمانہ حج آتا تو سرکاری طور پر منادی ہوتی۔

لَا يَفْتِي النَّاسَ فِي الْحَجِّ إِلَّا عَطَاءٌ - ۱۹

حافظ ابن کثیر ہی نے سعید بن سلام البصری کے حوالہ سے ان سے امام اعظم کی پہلی ملاقات کا پورا حال لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ :
میں نے خود امام اعظم سے سنا ہے کہ جب امام موصوف سے ان کی ملاقات

ہوتی تو انہوں نے عطار سے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ دریافت کرتے ہی جواب دینے سے پہلے امام صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولے بتاؤ کہاں کے رہنے والے ہو۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کوفہ کا شہری ہوں۔ فرمایا کہ اس بستی کے جہاں دینی فرقہ بندی کی بنیاد پڑی۔ امام صاحب نے جواباً فرمایا جی ہاں! فرمایا اچھا بتاؤ کہ کن لوگوں سے تعلق رکھتے ہو؟ یعنی کس مدرسہ خیال کے ہو۔ امام صاحب نے جواباً کہا کہ الحمد للہ ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں جو سلف کو برا نہیں کہتے یعنی نہ رافضی ہوں نہ خارجی اور نہ قدری۔ اور اہل قبلہ کی بر بنائے معصیت تکفیر نہیں کرتے یعنی نہ مرجئیہ ہوں نہ جہمی اور نہ مضرلی، حضرت نے جواب باصواب سن کر فرمایا عَرَفْتُ خَالَتُکُمْ پہچان گیا ہوں رہو یہ

الغرض امام عطار بن ابی رباح اپنے وقت میں جلال علمی کا سب سے بڑا نمونہ تھے۔ محدثین میں نہ حفاظ حدیث کو ان کی بارگاہ علمی میں زانوئے تلمذتہ کرنے کا شرف حاصل ہے مثلاً امام بکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری، قتادہ بن دعامہ، یحییٰ بن کثیر، مالک بن دینار، سلیمان مہران اور امام ایوب السختیانی، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

كَانَ مِنْ سَادَاتِ الثَّانِيَيْنِ عِلْمًا وَفِقْهًا يَلُحُّ

صرف علم و فقہ ہی میں نہیں بلکہ زہد و تقویٰ، پاکبازی اور پارسائی میں بھی آپ کی زندگی ایک مالی نمونہ تھی۔ اور ہر شخص کے لیے آپ کا یہی وعظ ہوتا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے یعلیٰ بن عبید کے لہ سے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعلیٰ بن عبید کہتے ہیں کہ:

ہم محمد بن سوہ کے پاس گئے انہوں نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا اؤ میں تمہیں ایک مفید بات سناؤں مجھے عطار بن ابی رباح نے بتایا ہے کہ عزیز من! بزرگان سلف لا یعنی اور فضول باتوں کو بہت ہی ناپسند کرتے تھے بلکہ فضول کو گناہ سمجھتے تھے۔ صرف اللہ کی کتاب

کی تلاوت، نیکی کا پرچار، بُرائی پر روک ٹوک یا پھر اپنی ضروریات
معیشت سے متعلق باتیں کہتے تھے۔ کیا تم اللہ پاک کے اس ارشاد
گرامی کو نہیں مانتے وَ اِنْ عَلَيْكُمُ لِحَافِظَيْنِ كِرَامًا كَاتِبَيْنِ
اور مَا يُلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔ اگر
تمہارے سامنے تمہارا وہ اعمال نامہ آجاتے جس میں وہ باتیں درج
ہیں جو نہ دنیا سے متعلق ہیں اور نہ دین سے کیا تمہیں اس پر شرم
نہ آئے گی بلکہ

امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ اور امام نسائی نے اپنی کتابوں
میں ان سے روایات لی ہیں۔

قاضی ابویوسفؒ نے بحوالہ امام اعظم ان سے احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً
عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ عَطَاءٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ
لَيْسَ فِي الْقُبْلَةِ الْوُضُوءُ۔

بوسہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ عَطَاءٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ مِثْلَهُ

ایسے ہی امام موسیٰ بن زکریا الحنفی نے اپنے مسند میں، حافظ ابو محمد حارثی نے اپنے مسند میں
اور امام محمد نے موطا اور کتاب الآثار میں حضرت عطاءؓ سے بحوالہ امام اعظم روایات کی تحریر
کی ہے۔

ایک ضروری تنبیہ

یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ امام عطاء بن ابی رباح کو حافظ ذہبی نے حفاظ حدیث کے طبقہ
ثالثہ میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بات پہلے صاف ہو چکی ہے کہ موصوف مکہ میں حضرت امام اعظمؒ
کے علم الحدیث میں سب سے بڑے اور مہربان شفیع استاد ہیں۔ شفقت کا اور شفقت کے ساتھ
اکرام و اجلال کا اندازہ کرنا ہو تو وہ واقعہ پڑھیے جو حافظ ابن عبد البر نے بسند متصل بحوالہ حارث

لکھا ہے :-

ہم عطاء بن ابی رباح کے پاس جوتے کچھ ہم میں سے کچھ کے پیچھے جوتے
جب امام ابوحنیفہ مجلس میں تھے تو حضرت عطاء امام صاحب کے لیے
جگہ بناتے اور ان کو اپنے قریب کر لیتے۔

عطاء بن ابی رباح نے کن صحابہ کے علوم سے خوشہ چینی کی ہے اس کی ایک معمولی سی جھلک حافظ
ابن حجر کی تہذیب التہذیب کے مطالعہ سے نظر آتی ہے۔ حافظ صاحب موصوف نے پورے ایک
صفحہ پر ان کے اساتذہ میں اجماع صحابہ کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں
اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں حضرت عطاء کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ :
أَذْرَكْتُ مَا ثَنَى صَحَابِي عَلَيْهِ

اس کا مطلب یہ ہے کہ حرم پاک میں صحابہ کا پھیلا ہوا علم حضرت عطاء کے ذریعے امام ابوحنیفہ میں
منتقل ہوا ہے۔ اسی بنا پر امام خلف بن ایوب کا امام اعظم کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ علم کی
دولت اللہ سبحانہ کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی۔ حضور انورؐ سے یہ دولت صحابہ
کو وراثت میں ملی اور صحابہ سے تابعین کو اور تابعین سے امام ابوحنیفہ کو ملی ہے۔ راز اللہ العالی
فسر۔

حافظ عمرو بن دینار سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کا تعارف لکھتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ الامام، الحافظ، عالم الحرم،
حافظ جلال الدین السیوطی نے حافظ جلال الدین المزنی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ عمرو بن دینار امام
اعظم کے علم حدیث میں شاگرد ہیں۔ حافظ ذہبی، حافظ کردی اور صدر الائمہ نے بھی تصریح کی ہے
میں نے ان کو خلاصہ میں احاد الاعلام لکھا ہے۔ مشہور محدث سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ
ان کے بارے میں رائے یہ تھی کہ بجائے نزدیک عمرو بن دینار سے زیادہ فقیہ زیادہ عالم اور
ادھ حافظ کوئی نہیں ہے۔

امام عمرو بن دینار ان لوگوں میں سے ہیں جو وقت کی ناپسندیدہ حکومت سے کسی دُور ہیں

تعاون نہ کرتے تھے یعنی ان کے نزدیک حکومت میں عدالت ضروری تھی۔ چنانچہ اموی حکومت کے سربراہ ہشام کا واقعہ حافظ کردی نے لکھا ہے کہ سرکاری طور پر ان کو یہ پیش کش کی گئی کہ منصب افتا سنبھال کر سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملے گی۔ صاف اور کھلے طور پر انکار کر دیا۔^۱

حکومت اور عدالت

یہ موضوع بہت طویل الذیل ہے مگر یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ الامام ابو بکر الجصاص نے احکام القرآن میں زیر آیت لَا يَمُنُّ بِالْعَهْدِ الظَّالِمِينَ، سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس آیت کے منطوق اور مدار سے اس مسئلہ کے دونوں مثبت و منفی پہلو واضح کیے ہیں۔ مثبت پہلو کے بارے میں فرماتے ہیں

أَفَادَتِ الْآيَةُ أَنَّ شَرْطَ جَمِيعِ مَنْ كَانَ فِي مَحَلِّ الْإِهْتِمَامِ بِهِ
فِي أَمْرِ الْعَدَالَةِ وَالصَّلَاحِ۔^۲

آیت نے بتایا ہے کہ ایسے تمام عہدوں کی جن کا تعلق قیادت سے ہو بنیادی شرط امیدوار میں صلاحیت اور عدالت کا ہونا ہے۔

اور منفی پہلو کو اسی آیت کے مدلول سے ثابت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

فَقَبُتْ بِدَلَالَةِ هَذِهِ الْآيَةِ بَطْلَانُ إِمَامَةِ الْفَاسِقِ وَ
أَنَّهُ لَا يَكُونُ خَلِيفَةً۔^۳

اس آیت سے فاسق کی امامت کا غلط ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی کہ فاسق تحت خلافت کا اہل نہیں ہے۔

اسی سلسلے میں الجصاص نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے جو بعض معتزلہ کی جانب سے امام اعظم کے بارے میں پھیلائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ

لَا فَرْقَ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ بَيْنَ الْقَاضِي وَبَيْنَ الْخَلِيفَةِ فِي أَنَّ
شَرْطَ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الْعَدَالَةُ۔^۴

ابو حنیفہ کے نزدیک خلیفہ اور قاضی کے درمیان بلحاظ عدالت شرط ہونے

^۱ مناقب ابی بکر در ج ۲ ص ۹۷۔ ^۲ احکام القرآن ج ۱ ص ۷۰

^۳ احکام القرآن ج ۱ ص ۷۰۔ ^۴ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۷

میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے بہر حال امام عمرو بن دینار نے سرکاری منصب اقامت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ انکار اقامت سے نہیں اقامت کا کام تو وہ پہلے بھی کرتے تھے انکار تو حکومت کا حیر بننے سے ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں اجلہ صحابہ کو ان کا استاد بتایا ہے مثلاً ابن عباس، ابن الزبیر، ابن عمر، ابن عمرو بن العاص، ابو ہریرہ، جابر بن عبد اللہ، ابو الطفیل اور سائب بن یرید۔ اور تابعین کی ایک بڑی تعداد کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں امام اعظم کے ساتھ امام شعبہ، امام ابن جریر، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔

امام عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ مجھ سے خود امام شعبہ نے بتایا ہے کہ میں نے عمرو بن دینار جیسا کوئی نہیں دیکھا ہے۔ امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ میں کو فہ آیا تو امام ابو حنیفہ نے میرے تعارف میں یہ جملہ بول کر مجھے معاشقہ میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا کہ

هَذَا آخِئْتُهُ بِحَدِيثِ عُمَرَ بْنِ دِينَارٍ يَه

لوگوں نے میرے پاس آمد و رفت شروع کر دی۔ امام اعظم نے عمرو بن دینار سے دو حدیثیں بلا واسطہ روایت کی ہیں۔ امام علی بن المدینی کے حوالہ سے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس کی علمی وراثت چھ حضرات کو ملی ہے۔ سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، جابر، زید، طاووس۔ اور ان چھ اکابر کا علم حضرت عمرو بن دینار کو وراثت میں ملا ہے۔ ائمہ ستہ نے ان سے روایات لی ہیں۔

عمرو بن دینار مکی اور عمرو بن دینار بصری

مشہور محدث ملا علی قاری حدیث و رجال میں معلوماتی شخصیت ہونے کے باوجود ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں :

عمر بن دینار کی کنیت ابو یحییٰ ہے۔ سالم بن عبد اللہ وغیرہ کے شاگرد ہیں
حماد بن زید، حماد بن سلمہ اور معمر نے ان کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا
ہے اور محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے۔

یہ غلط ہے اور بہت بڑا سہو ہے۔ غلط فہمی کا سرچشمہ یہ ہے کہ ملا علی قاری نے امام عمرو بن دینار
مکی کو، دینار بصری سمجھ لیا ہے۔ اولیٰ الذکر صحاح کے راویوں میں سے ہیں۔ امام اعظم کے شیخ
اور کہا تا بعین میں سے امام اور مجتہد ہیں۔ اور مؤخر الذکر طبقہ سادس میں سے ہیں اور ان کا شمار ضعیف
میں ہوتا ہے۔ الغرض امام کے شیوخ میں عمرو بن دینار مکی ہیں۔ عمرو بن دینار بصری نہیں ہیں۔ قاضی
ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظم ان سے روایات لی ہیں۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ عُمَرَ بْنِ دِينَارٍ عَنْ جَابِرٍ عَنْ زَيْدِ آثَةَ
قَالَ إِذَا خَيَّرَتِ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا فَقَامَتْ مِنْ مَجْلِسِهَا قَبْلَ أَنْ
تُخْتَارَ فَلَيْسَ بِشَيْءٍ ۚ

حضرت زید فرماتے ہیں کہ جب عورت اپنے لیے اختیار کرے پھر وہ اپنی
جگہ سے اختیار ملنے سے پہلے کھڑی ہو جاتے تو کچھ نہیں ہے۔

حافظ ابو الزبیر محمد بن مسلم سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کو حافظ حدیث کے طبقہ رابعہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ جلال الدین اسعاف المبط
میں، سید القدر، علامہ جزری اور امام ذہبی نے مناقب میں ان کو امام اعظم کا علم حدیث میں استاد قرار دیا ہے۔
یعنی بن عطاء فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مسلم حدیث بیان کرتے تھے ہمارا اندازہ ان کے باسے
ہے۔ تھا کہ سب سے زیادہ زیرک اور سب سے زیادہ قوتِ حافظہ کے مالک ہیں۔ عطاء بن ابی رباح یہ
کہ ان کو خراجِ تحسین ادا کرتے تھے کہ ہم سب حضرت جابر بن عبد اللہ کے پاس جا کر حدیثیں سنتے،
سننے کے بعد با ہم مذاکرہ کرتے تو حضرت ابو الزبیر کو سب سے زیادہ احادیث یاد ہوتی تھیں۔ امام ابو یوسف
السنیانی جب ان کے حوالے سے کوئی ارشادِ نبوت نقل کرتے تو فرماتے کہ ہم سے ابو الزبیر نے بیان
ابو الزبیر تو ابو الزبیر ہی ہیں۔

سب ائمہ حدیث نے ان سے روایات لی ہیں۔ قاضی ابویوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظم ان کی روایات کو پیش کیا ہے۔

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ عَنْ جَابِرَ أَنَّ سَرَّاقَةَ بِنَ مَالِكٍ
قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ عُمُرُ تَنَا هَذِهِ لِعَامِنَا أَمْ لِلدَّيْرِ
قَالَ لِلدَّيْرِ

سراقہ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ یہ عمرہ ہمارا اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے فرمایا ہمیشہ کے لیے ہے۔

حافظ ابو الزبیر کے اسناد میں عبادہ اربعہ، حضرت عائشہ، حضرت جابر، ابو الطفیل صحابہ ہیں۔ ان کے علاوہ باقی جلیل القدر ائمہ تابعین ہیں۔ ان کے شاگردوں میں امام اعظم کے علاوہ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام زہری، امام عثمٰش، امام یحییٰ بن سعید الانصاری، امام ابراہیم بن طہمان، امام حماد بن سلمہ، امام ہشیم، امام سفیان ثوری، امام سفیان بن عیینہ شامل ہیں۔

امام مالک نے بھی ان سے روایات لی ہیں۔ امام اعظم نے ان سے جس قدر احادیث سنی ہیں ان سب کا مرکز حضرت جابر بن عبد اللہ ہے۔ سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ امام شعبہ نے حافظ محمد بن مسلم کو رکن و مقام کے درمیان اس بات پر قسم دی تھی کیا تم نے یہ احادیث حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنی ہیں؟ فرمایا:

وَاللَّهِ إِنِّي سَمِعْتُهَا مِنْ جَابِرٍ

بخدا میں نے یہ احادیث حضرت جابر سے سنی ہیں۔ ایک بار نہیں بلکہ یہی جملہ آپ نے تین بار دہرایا۔

مکہ میں امام اعظم کے دوسرے شیوخ کو ان ہی پر قیاس کر لیجئے کچھ کے اسماء یہ ہیں۔ عبد اللہ بن ابی زیاد، ابو الجحین المکی ۱۵۱ھ، حمید بن قیس الاعرج البوصفوان القاری المکی ۱۳۳ھ، ابو عثمان عبد اللہ بن عثمان القاری المکی ۱۲۴ھ، عبد اللہ بن عبد الرحمن النوفلی المکی، ابراہیم بن میسر، الطائی نزیل مکہ ۱۳۲ھ، اسماعیل بن اُمیہ بن عمرو بن سعید الامری ۱۴۴ھ، اسماعیل بن مسلم البواسحاق المکی، ابو عبد اللہ عبد العزیز بن رفیع الاسدی المکی ۱۳۳ھ، حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات

میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے حوالہ سے حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے۔

المَدِیْنَةُ الْمَكْرَمَةُ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دارالہجرت اور آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ علوم نبوت کا اصلی مخزن اور منبع ہونے کا اسی شہر کو فخر حاصل ہے۔ مکہ کے ساتھ اس کو بھی حرم کہا جاتا ہے وہ بنائے خلیل ہے یہ بنائے حبیب ہے۔ عہد نبوی سے لے کر حضرت علی مرتضیٰ کے ابتدائی زمانے تک ساری دُنیا نے اسلام کا علمی مرکز ہی تھا۔ ساتھ تک مدینے کی علمی بہار پر فقہاء سبعہ آفتاب و ماہتاب بن کرتا ہاں ہے ہیں۔ یہ سات شخصیتیں یعنی سعید بن ابی سب، عروہ بن الزبیر، قاسم بن محمد، خارج بن زید، عبید اللہ بن عبد اللہ، سلیمان بن یسار، ساتویں شخصیت کی تعیین میں علماء کا قدرے اختلاف ہے۔ حافظ عبد القادر قرشی اور علامہ نووی نے تین شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

سالم بن عبد اللہ، ابوبکر بن عبد الرحمن، ابوسلمہ بن عبد الرحمن۔

مدینہ کے فقہاء سبعہ

امام ذہبی نے ابوبکر بن عبد الرحمن کو ہی احد الفقہاء السبعہ لکھا ہے یہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہم زبان ہیں یہ اسی لئے کے مطابق محمد بن یوسف شاعر نے ان ساتوں کو دو شعروں میں جمع کر دیا ہے۔

الا کل من لا یقتدی بآئمہ

فقتدہ ضیئزوا عن الحق خارجہ

فخذہم عبید اللہ عروہ قاسم

سعید ابوبکر و سلیمان خارجہ

ابن العماد حنبلی نے ان کو ہی قابل اعتماد قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی نے ان ہی اکابر کو ابوبکر کے ساتھ فقہاء سبعہ بتایا ہے فرماتے ہیں:

هؤلاء هم الفقهاء السبعة المشهورون في المدينة

حافظ ابن القیم الجوزی نے مدینہ کے مفسیوں کے تذکرے میں ان اکابر کا ذکر کرنے کے بعد

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۹۔ ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۱۲۔ ۳۔ الجواہر المصنیۃ ص ۴۲۲

۴۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۱۴۔ ۵۔ الاحکام فی اصول الاحکام ج ۵ ص ۲۶۸۔

لکھا ہے :

هَؤُلَاءِ هُمُ الْفُقَهَاءُ - ۱۷

فقہاء سبعہ کے نام پر تو تاریخ میں شہرت کا شرف ان ہی اکابر کو حاصل ہے لیکن مؤرخین میں سے ابوالقدار نے فقہاء مدینہ کی تعداد دس بتائی ہے۔ جبرجی زیدان مؤرخ ابوالقدار کے حوالے سے رقمطراز ہے:-

وَبَعْضُ الْمُؤَرِّخِينَ يُحْسِبُهُمْ عَشْرَةً - ۱۸

لیکن یہ محض اختلاط ہے اور شاید اس اختلاط والتباس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ ابو حنیفہ دینوری نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے زمانہ گورنری میں مدینہ میں جن اکابر پر مشتمل مشاورتی کونسل بنائی تھی۔ اس کے اراکین کی تعداد دس تھی اور اس میں ان فقہاء میں سے چھ کو رکن بنایا گیا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے اس مشاورتی کونسل کے ارکان کے نام یہ بتائے ہیں:-

عروۃ بن الزبیر، عبید اللہ بن عبد اللہ، ابوبکر بن عبد الرحمن، ابوبکر بن سلیمان، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد، سالم بن عبد اللہ، عبید اللہ بن عمر، عبید اللہ بن عامر، خارجہ بن زید۔ ۱۹

ان کا کام پیش یا افتادہ معاملات میں مشورہ دینا اور شہریوں کی پیدا شدہ شکایات کو گورنر تک پہنچانا تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان سے کہا تھا کہ

إِنِّي كَأُفِيدُ أَنْ أَقْطَعَ أَمْرًا إِلَّا بِرَأْيِكُمْ - ۲۰

میں نہیں چاہتا کہ تمہارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کروں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ مشاورتی کونسل کے افراد ہیں۔ تاریخ میں فقہاء مدینہ کے نام سے جو مشہور ہوئے ہیں وہ صرف سات ہی ہیں۔

ابن العباد حبیبی نے ان اکابر کو فقہاء سبعہ کہنے کی وجہ یہ لکھی ہے:

یہ فقہاء سبعہ ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی دور میں ہوئے ہیں۔ مدینہ میں ان کے ذریعے علم و فتویٰ کی بیش از بیش نشر و اشاعت ہوتی ہے حالانکہ

۱۷ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۹ - ۱۸ ابوالقدار ج ۱ ص ۲۰ بحوالہ تاریخ المغتفر العربیہ ج ۱ ص ۹۰ -

۱۹ الاخبار الطوال ص ۳۳۶ - ۲۰ البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۷۱ -

ان کے ہی زمانے میں دوسرے فقہاء تابعین بھی موجود تھے۔ لیکن ان کا علم کی اشاعت میں وہ حصہ نہیں ہے جو فقہاء سبعہ کا ہے۔ یہ حافظ سخاوی نے ان ہی سات کے بارے میں عبداللہ بن المبارک کا یہ بیان نقل کیا ہے:

جب کوئی مسئلہ درپیش آتا ہے سب ایک ساتھ مل کر اس پر غور کرتے اور جب تک وہ ان کے سامنے پیش ہو کر طے نہ ہو جاتا تھا اس کی بابت کوئی فیصلہ صادر نہ کرتی تھے۔

اس دور میں مدینہ کی علمی بہار ان ہی فقہاء کے دم قدم سے قائم تھی۔ علم حدیث کا سارا دار و مدار یہی فقہاء سبعہ ہیں۔ ان میں خارجہ بن زید کو چھوڑ کر کہ ان کو امام ذہبی نے قلیل الحدیث لکھا ہے باقی چھ کا نام سرفہرست ہے۔ امام ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ مشہور استاد علامہ ابو منصور عبدالقاسم بغدادی نے فقہاء سبعہ کو ائمہ حدیث بتایا ہے فرماتے ہیں:

وَالْفُقَهَاءُ السَّبْعَةُ مِنَ التَّابِعِينَ مِنْ هَذِهِ الْجُمْلَةِ فَإِنَّهُمْ كَانُوا مَعَ فُقَهَائِهِمْ أُمَّةً فِي الْحَدِيثِ۔^{۱۰۴}

اس دور میں مختلف شہروں میں حدیث کے مدرسے کھل گئے تھے ان مدرسوں کا اجمالی خاکہ یہ ہے:

مدینہ میں مدرسہ حدیث کے مشہور امام سعید بن المسیب^{۹۴ھ}، عروہ بن الزبیر^{۹۴ھ}، ابو بکر بن عبدالرحمن^{۹۴ھ}، عبید اللہ بن عبد اللہ^{۱۰۶ھ}، سلیمان بن یسار^{۹۳ھ}، قاسم بن محمد^{۱۱۲ھ}، نافع مولیٰ ابن عمر^{۱۱۵ھ}، امام زہری^{۱۱۲ھ}، ابوالزناد^{۱۱۳ھ}، مکہ میں حدیث کے مشہور امام عکرمہ^{۱۰۵ھ}، عطاء بن ابی رباح^{۱۱۵ھ}، ابوالزبیر^{۱۱۶ھ}، کوفہ میں امام شعبی، عامر بن شراحبیل^{۱۰۴ھ}، ابراہیم بن سفیان^{۹۶ھ}، علمتہ^{۱۱۲ھ}، بصرہ میں حسن بصری^{۱۱۵ھ}، ابن سیرین^{۱۱۰ھ}، شام میں عمر بن عبدالعزیز^{۱۰۵ھ}، مکحول^{۱۱۵ھ}، اور قبیصہ^{۱۱۶ھ}۔

^{۱۰۴} تذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۴۔ ^{۱۰۵} فتح المغیث ص ۳۹۹۔ ^{۱۰۶} أصول الدین ص ۳۱۳۔
^{۱۰۷} الحدیث والمحدثون ص ۱۲۲۔

مدینے کے علم و عمل پر اعتماد

مدینے کے علم و عمل پر کتنا اعتماد ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حافظ ابن القیم نے لکھا ہے کہ
 عَمَلُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ الَّذِي يُحْتَجُّ بِهِ مَا كَانَ فِي نَرٍّ مِنَ الْخُلَفَاءِ
 السَّائِدِينَ لَمْ

زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کا عمل دین میں حجت ہے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اہل مدینہ کا کسی مسئلہ پر جمع ہونا یقیناً تمام مسلمانوں کے نزدیک
 اس مسئلہ کو بخاری بنا دیتا ہے لیکن بحث اس میں ہے کہ جب صحابہ کرام بڑی کثرت کے ساتھ دوسرے
 شہروں میں جا بسے اس وقت بھی کسی مسئلہ کے متعلق مدینے والوں کا عمل حجت ہے یا نہیں۔
 اس موضوع پر امام بخاری کی رائے پہلے بتائی جا چکی ہے کہ بقول حافظ ابن حجر امام بخاری کے نزدیک
 حرمین کے اتفاق سے ترجیح ہو سکتی ہے حافظ صاحب فرماتے ہیں :
 وَفَضْلُ الْمَدِينَةِ ثَابِتٌ لَا يَحْتَاجُ إِلَى إِقَامَةٍ وَلَيْلٍ خَاصَّةٍ
 مدینہ کی بزرگی اور فضیلت کے ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت
 نہیں ہے۔

یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ :

اگر مقصد صرف یہ ہے کہ مدینہ والوں کی علمی برتری دوسروں پر ثابت
 ہو تو اگر کسی خاص زمانے میں ان کی فوقیت مقصود ہے تو اس میں کوئی
 شک نہیں کہ زمانہ نبوت اور صحابہ کے اس دور میں جب کہ صحابہ
 مدینہ سے دوسرے شہروں میں نہ گئے تھے مدینے کو یہ شرف حاصل
 ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہر زمانے میں علمی
 لحاظ سے فوقیت حاصل ہے تو یہ بات محل تامل ہے اور اس قسم کے
 جذباتی نعروں کی تحقیق کے بازار میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔
 حافظ ابن القیم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

جمہور کی رائے میں مدینہ اور دوسرے شہروں کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے
اصل یہ ہے کہ جن کے پاس سنت ہے اس ہی مقام کا عمل بھی قابل اتباع
ہے ورنہ اختلاف کے وقت ایک کا عمل دوسروں کے لیے حجت نہیں ہے
حجت تو صرف اتباع سنت ہے سنت کو صرف اس لیے نہیں چھوڑا جاتا
گا کہ کسی شہر کا عمل اس کے خلاف ہے اگر اسے مان لیا جاتا تو بہت
سی سنتیں متروک ہو جاتیں گی اور سنت کی معیاری حیثیت ختم ہو جاتے
گی۔ کسی بھی شہر کو عظمت کا مقام حاصل نہیں ہے۔ دیواروں، مکانوں
اور زمینوں کا کسی بات کے راجح قرار دینے میں کوئی لائق نہیں ہے۔ مؤثر تو
شہروں کے مکین ہیں اور معلوم ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام
ہی دوسروں پر علم و عمل میں مقدم ہیں جیسا کہ وہ فضیلت اور دین میں
مقدم ہیں۔ اور صحابہ کا عمل ہی ناقابل مخالفت ہے اور صحابہ کرام کی
اکثریت مدینہ سے رخت سفر باندھ کر دوسرے شہروں میں چلی گئی
بلکہ صحابہ کے اکثر علماء کوفہ، بصرہ اور شام چلے گئے مثلاً علی بن ابی طالب،
ابی موسیٰ اشعری، عبد اللہ بن مسعود، عبادة بن الصامت، ابی الدرداء،
عمر بن العاص، معاویہ بن ابی سفیان اور معاذ بن جبل۔ بلکہ کوفہ، بصرہ
میں تقریباً تین سو سے زائد صحابہ آ گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اکابر
جب تک مدینہ میں رہے ان کا عمل حجت تھا اور جب یہی لوگ
وہاں سے رخصت ہو گئے تو ان کا عمل حجت نہ رہا۔

بہر حال زمانہ نبوت سے لے کر خلافت راشدہ تک مدینہ کو علم میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔
حضرت علی مرتضیٰ کے زمانے میں دار الخلافہ کے کوفہ اور پھر دمشق منتقل ہو جانے پر گو اس کی وہ علمی شان
باقی نہ رہی تھی تاہم امام مالک کے زمانے تک مدینہ کی علمی رونق برقرار تھی۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:
مدینہ طیبہ در زمان او بیشتر از زمان متاخر مرجع علماء و محط رجال علماء است بلکہ
حافظ ذہبی کے حوالہ سے حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ،

مدینہ دارالہجرتہ میں عہدِ صحابہ میں قرآن و سنت کا علم بہت زیادہ تھا اور
زمانہ تابعین میں فقہاء سیدھے جیسے حضرات موجود تھے اور صغار تابعین کے
دور میں بھی قرآن و سنت کا علم تھا۔ عبداللہ بن عمر، ابن ابی ذئب، ابن
عجلان، جعفر صادق، مالک، امام نافع قاری، ابراہیم بن سعد، سلیمان بن
بلال اور اسماعیل بن جعفر سب کے سب مدنی ہیں۔

اس کے بعد امام ذہبی فرماتے ہیں کہ :
پھر ان کے بعد وہاں علم بہت کم ہو گیا اور بعد ازیں تو بالکل ہی ناپید ہو گیا۔
مدینہ طیبہ میں علم کب ناپید ہوا، یہ بھی امام ذہبی کی زبانی سن لیجئے :
خصوصاً اس وقت جبکہ روافض کی ایک جماعت نے مدینہ میں ڈیر لگا
لیا اور مدینہ پران کی حکومت ہو گئی یہ

امام عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں :
اَلْسَنَةُ الْمُتَقَدِّمَةُ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ خَيْرٌ مِنَ الْحَدِيْثِ يَه
مدینہ کی علمی و سنتوں کی اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ امیر المومنین
عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ میں قاضی ابوبکر بن حزم کو جمع سنن کے کام پر مامور کیا۔ اس وقت مدینہ میں
علمی شخصیتیں موجود تھیں جن کے بارے میں امیر المومنین نے خصوصی ہدایات دی تھیں۔
حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں لکھا ہے کہ امیر المومنین نے لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمن،
اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم ہے اسے قلم بند کر کے روانہ کیا جاتے اور ابن سعد نے طبقات میں
لکھا ہے :

كَتَبَ عُمَرُ إِلَى ابْنِ حَزْمٍ اَنْ يَكْتُبَ لَهٗ اَحَادِيْثَ عُمَرَ
عمر نے ابوبکر بن حزم کو عمرہ کی احادیث قلم بند کرنے کے لیے لکھا۔

قاضی ابوبکر بن حزم مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ امام مالک فرماتے
ہیں کہ ہمارے یہاں قضا کے بارے میں جس قدر ان کو علم تھا اتنا کسی کو نہ تھا۔ بڑے عابد شہ نڈ
تھے۔ صرف قاضی ابوبکر نہیں بلکہ ان کے علاوہ مدینہ ہی کے دوسرے اکابر کو بھی عمر بن عبدالعزیز

نے یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے یہاں تو میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مدینے میں علمی و سنتوں کی وجہ سے عمر نے یہ حکم روانہ کیا تھا۔ بہر حال امام اعظم کے زمانہ طالعلمی تک مدینہ کا علمی جلال ماندہ ہوا تھا اور امام اعظم کو فقہائے سبعہ کی علمی بہاروں سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے کیونکہ فقہائے سبعہ میں سے قاسم بن محمد کی وفات ۱۱۲ھ میں ہوئی اور امام اعظم نے جوں کا سلسلہ ۹۶ھ سے شروع کیا ہے۔ واضح رہے کہ امیر المومنین عمر نے تدوین حدیث کے لیے سرکلر ۱۱۲ھ میں جاری کیا تھا اور امام اعظم نے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے اسفار علمی کا آغاز ۱۲۷ھ میں کیا تھا۔

امام مالک کو مدینے کے علم پر اس قدر اعتماد تھا کہ ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ مستقل حجت ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مدینہ اسلامی آبائیوں کی روح اور شہروں کا دل تھا علماء یہاں آتے بہتے تھے اور اپنے علوم کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کر کے استصواب کرتے تھے کیونکہ اب تک مدینہ کے علوم بیرونی معلومات کی آمیزش سے بالکل صاف تھے یہ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس دور روایت میں اطمینان چاہتا ہے اسے مدینہ والوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

امام اعظم حج کے علمی سفروں میں مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے تھے۔ آپ نے اگر پچپن حج کیے ہیں تو پچپن ہی بار مدینہ طیبہ تشریف لے گئے ہیں۔ اولاً اس لیے کہ چونکہ امام صاحب کے یہ سفر علمی ہوتے تھے اور مدینہ اپنی علمی بزرگی میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ایوب بن زید سے حافظ سخاوی نے نقل کیا ہے کہ علم کو مدینے میں رسوخ حاصل ہوا ہے اور یہیں سے اس کا ظہور ہوا ہے بلکہ

خوابگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبوی میں عبادت

مدینہ طیبہ میں خوابگاہ نبوت کی زیارت اور مسجد نبوی میں نماز کو اسلام میں بہت بڑی اہمیت ہے۔ وفاء الوفاء میں ہے کہ

عمر بن عبدالعزیز صرف سلام کی خاطر دمشق سے مدینہ قاصد روانہ کرتے

تھے علامہ السبکی فرماتے ہیں کہ یہ بات امیر المومنین سے روایتی لحاظ سے
درجہ شہرت کو پہنچی ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے۔
مَنْ جَاءَنِي نَزَائِرًا لَا يَهْمُهُ إِلَّا نَزَائِرَتِي كَانَ حَقًّا عَلَيَّ أَنْ
أَكُونَ لَهُ شَفِيعًا۔

جو شخص میری زیارت کو آیا اور میری زیارت اس کا مقصد ہو۔ مجھ پر حق
ہے کہ میں اس کی شفاعت کروں۔

یہ حدیث طبرانی میں ہے۔ علامہ عراقی نے حافظ ابوالسکن کے حوالہ سے اس کی تصحیح فرمائی ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمر سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد آیا ہے۔
مَنْ نَزَّائِرَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي۔

جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت کا وہ حقدار ہو گیا۔

علامہ شوکانی نے اس حدیث کی تصحیح حافظ عبدالحق، حافظ تقی الدین السبکی اور حافظ ابن السکن
سے نقل کی ہے۔

۱۔ وفاء الوفا۔ ص ۴۰۹۔ ۲۔ شرح الاحیاء، العلامة العراقي ج ۴ ص ۴۱۶۔

۳۔ نیل الاوطار ج ۴ ص ۳۲۵۔ اس حدیث کے راویوں میں موسیٰ بن بلال العبیدی کو دارقطنی نے مجہول قرار
دیا ہے مگر حافظ شہادی نے دارقطنی کی طرف نسبت کر کے یہ لکھا ہے کہ من روخی عنہ ثقتان فقد ارتفعت جهالتہ
(فتح المغنی ص ۱۳۷) الرقع والکسل میں ہے کہ موسیٰ سے صرف دو ثقہ ہی نے روایت نہیں کی بلکہ ان سے ایک سے
زیادہ ثقات نے روایت کی ہے حافظ تقی الدین السبکی نے یہاں ایک مفید بات لکھی ہے وہ بھی گوش گزار فرمائیے۔ جہالت
و طرح کی ہوتی ہے جہالت عین جہالت وصف۔ اگر مجہول کہنے سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ میں جہالت عین ہے تو یہ
سزا سزا غلط ہے کیونکہ موسیٰ سے روایت کرنے والے احمد بن حنبل، محمد بن جابر، المحاربی، محمد بن اسماعیل الاحسی، ابوالامیہ
محمد بن ابراہیم، عبید بن محمد وراق، الفضل بن سہل اور جعفر بن محمد بزدوی جیسے اکابر ثقہ ہیں۔ جہالت تو دو
کی روایت سے پامال ہو جاتی ہے اور یہ تو یکدم دو نہیں سات ہیں۔ اور اگر جہالت سے جہالت وصف مراد ہے
تو یہ بھی بے بنیاد ہے کیونکہ احمد بن حنبل جیسا فنکار اور ناقد رجال جس سے روایت کرے اس کی شان کے کیا کہنے
ہیں۔ (تفسار السقام فی زیارة خیر الانام) اس پر مبسوط بحث الرفع والتکمیل میں ہے۔

حافظ طلحہ بن محمد نے مسند ابی حنیفہ میں زیارت کا مسنون طریق بھی حضرت عبداللہ بن عمر سے بحوالہ امام اعظم روایت کیا ہے،

أَبُو حَنِيفَةَ عَنْ نَارِجٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مِنَ السُّنَنِ أَنْ
تَأْتِيَ قَبْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قِبَلِ الْقِبْلَةِ
وَتَجْعَلَ ظَهْرَكَ إِلَى الْقِبْلَةِ وَتَسْتَقْبِلَ الْقَبْرَ لِوَجْهِكَ
ثُمَّ تَقُولَ السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ
اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ -

زیارت کا مسنون طریق یہ ہے کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر
آؤ قبلہ کی جانب سے اور پشت قبلہ کی طرف کر کے چہرہ قبر کی طرف
کر دو اور یوں کہو سلام علیک... الخ
مشہور محدث ملا علی قادری لکھتے ہیں -

إِعْلَمُوا أَنَّ نَيْرَ يَارَةَ سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ بِاجْمَاعِ الْمُسْلِمِينَ
مِنْ أَعْظَمِ الْقُرْبَاتِ وَأَفْضَلِ الطَّامَاتِ وَالْحُجَّ
السَّاعِي لِنَيْلِ الدَّرَجَاتِ قَرِيبَةً مِنْ دَرَجَةِ الْوَاجِبَاتِ
لِمَنْ لَهُ سَعَةٌ وَتَرَكَهُ غَفْلَةً وَجَفْوَةً كَبِيرَةً
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مسلمانوں کے متفقہ فیصد کے
مطابق بہت بڑی قربت بزرگترین طاعت حصول درجات کی بہترین
کوشش ہے بشرطیکہ اس کی گنجائش ہو اسے چھوڑنا غفلت ہے۔

بہر حال امام اعظم حج کے موقع پر مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے اور امام مالک سے بھی
ملاقات آپ کی ہوتی چنانچہ انتصار السالک للامام البکیر مالک میں ہے کہ جب امام اعظم سے
مدینہ کی علمی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس بستی میں
علم پھیلایا اور بکھرا ہوا دیکھا ہے اگر اسے کوئی سمیٹے گا تو یہ سرخ و سپید رنگ کا لڑکا ہے
یعنی امام مالک رحمہ اللہ

اس بستی میں جس میں علم پھیلا ہوا ہے امام اعظم نے جن مشائخ حدیث کے سامنے زانوئے
ادب تکیا ہے ان کی تفصیل تو از بس دشوار ہے لیکن میں یہاں بطور کھلے از گلزار چند گرامی قد
ہستیوں کا تعارف ہدیہ ناظرین کرتا ہوں تاکہ اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکیں۔

الحافظ ابو عبد اللہ نافع العدویؒ

آپ علم حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ام سلمہ،
حضرت رافع بن خدیج اور حضرت ابولبابہ کے شاگرد ہیں اور آپ کے سامنے الشقات النبلا
اور الامۃ الاجلۃ مثلاً امام اعظم، امام مالک، امام لیث بن سعد، قاضی ابوبکر بن حزم اور
امام زہری نے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے آپ کے شاگردوں کی ایک
طویل فہرست دی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی پورے تیس سال خدمت کی ہے۔ حضرت
عبداللہ امام نافع کو اپنے لیے اللہ سبحانہ کا انعام فرماتے تھے کہ ان کی علم میں جلالت قدر کا
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو بھی امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ حکومت
میں سنن کی تعلیم کے لیے سرکاری طور پر مصر روانہ کیا تھا۔ سید الحافظ امام سیحی بن معین سے
جب دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک نافع عن ابن عمر اور سالم عن ابن عمر میں کون سا طریق
دلربا ہے؟ تو آپ نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی راجح نہ بتایا۔ حافظ ابن الصلاح
اور حاکم کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے امام بخاری کے متعلق تو تفتیح الانظار میں
حتمائے دعویٰ کیا ہے کہ امام بخاری کی رائے ہے کہ جس قدر اسانید موجود ہیں ان میں سب سے
زیادہ صحیح صرف وہ سلسلہ سند ہے جو بحوالہ امام مالک از نافع از عبداللہ بن عمر آتا ہے۔ علامہ
محمد بن اسماعیل ایمانی نے توضیح الافکار میں حافظ ابن الصلاح کی بیان فرمودہ قیادہ صحیح الاسانید
کلمہ سے یہ بات پیدا کر لی ہے کہ ”کل سند فی الدنیا، یعنی دنیا میں جس قدر روایتی اور
تاریخی سلاسل موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ معتبر نافع از ابن عمر ہے۔ حافظ ذہبی نے
یونس بن یزید کی زبانی نقل کیا ہے کہ امام نافع کو امام زہری سے یہ شکایت تھی کہ زہری بھی

۱۔ اسعاف المطار ص ۶۹۔ ۲۔ تہذیب ج ۱۱ ص ۴۱۲۔ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۹۴۔ ۴۔ تہذیب

ج ۱۰ ص ۴۱۴۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۹۴۔ ۶۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۴۔

عجیب شخص ہیں میرے پاس آتے ہیں اور بحوالہ ابن عمر مجھ سے احادیث سنتے ہیں اور یہاں سے سالہ ابن عمر کے پاس جاتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ نے اپنے والد سے یہ بات سنی ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہاں۔ ان سے تصدیق کے بعد میری بیان کردہ حدیثوں کو ان کے نام سے پیش کرتے ہیں اور مجھے درمیان سے حذف کر دیتے ہیں۔ امام غیلی فرماتے ہیں نافع ائمہ تابعین میں سے ہیں علم میں ان کی امامت پر اتفاق ہے۔

ائمہ ستہ کے علاوہ امام مالک نے مؤطا میں امام محمد نے کتاب الآثار میں اور قاضی ابو یوسف نے ان سے روایات کی تخریج کی ہے۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ يَقْتُلُ الْمُحْرِمُ
الْفَارَةَ وَالْعُقْرَبَ وَالْحِدَاةَ وَالْكَلْبَ الْعَقُورَ وَالْحَيَّاتَ
إِلَّا الْجَانَّ

ابن عمر کہتے ہیں کہ احرام والا چوہے، بچھو، چیل، ہر کے کتے اور سانپوں کو علاوہ شک کے مار سکتا ہے۔

امام محمد نے کتاب الآثار میں یہ روایت درج کر کے لکھا ہے کہ وہ ناخذ وھو قول ابی حنیفہ اور مؤطا میں بھی امام موصوف نے یہ روایت بحوالہ مالک عن نافع ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ لَيْسَ عَلَى الْمُحْرِمِ فِي قَتْلِهِنَّ جُنَاحٌ
الْفَرَّابُ وَالْفَارَةُ وَالْعُقْرَبُ وَالْحِدَاةُ وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ

یہی روایت بالکل ان ہی الفاظ کے ساتھ بروایت یحییٰ مؤطا امام مالک میں بھی موجود ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں اسی روایت کا بحوالہ مالک عن نافع صرف اس قدر حصہ پیش فرمایا ہے۔

خمس من الدواب ليس على المحرم في قتلهن جناح

اور بحوالہ یونس بن شہاب از سالم پوری روایت نقل کی ہے اور پھر اسی کی تائید میں

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۹۴۔ ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰۔ ۳۔ کتاب الآثار ص ۸۲

۴۔ مؤطا امام محمد ص ۲۱۰۔

امام ابو بکر محمد بن شہاب الزہری از عائشہ سے بھی یہی حدیث اس طرح نقل کی ہے ۔
 خمس من الحوایب کلھن فاستی یقتلن فی الحرم

روایت میں راویوں کا تعبیری اختلاف

یہاں عموماً یہ غلط محسوس کی جاتی ہے کہ جن الفاظ میں محدثین کی معروف کتابوں میں روایات ہوتی ہیں امام اعظم کی روایات میں وہ الفاظ نہیں ہوتے۔ لوگ تعبیر کے اس اختلاف کو دیکھتے ہیں تو بدک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بات نبوت کی ہے اور تعبیری جامہ بیان کرنے والوں کا اپنا اپنا ہے امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ :

میں دس شخصوں سے حدیث سنتا تھا بات ایک ہوتی تھی مگر الفاظ مختلف ہوتے تھے المعنی واحد واللفظ مختلف ہے

حافظ ذہبی نے سفیان ثوری جیسے امام المحدثین کا قول نقل کیا ہے کہ

ہم اس کا ارادہ کریں کہ جس طرح ہم نے حدیث سنی ہے بعینہ وہ ہی تم کو سنا دیں تو شاید ہم ایک حدیث بھی بیان نہ کر سکیں۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ثوری کی حدیث میں روایت لفظی نہیں ہے بلکہ معنی شیخ کے ہیں اور الفاظ ان کے۔ ابو حاتم جیسا امام تصریح کرتا ہے میں نے کسی محدث کو نہیں دیکھا کہ وہ حدیث کو ایک لفظ میں ادا کرتا ہو بجز قبضہ کے۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں ۔

وَذَا لِكَ نَادِرٌ جَدَّادٌ إِنَّمَا يُوجَدُ فِي الْأَحَادِيثِ لِقِصَاصٍ

عَلَى قِلَّةٍ أَيْضًا فَإِنَّ غَايِبَ الْأَحَادِيثِ رُويَ بِالْمَعْنَى يَهْ

روایت باللفظ سے بالکل نادر ہے چھوٹی چھوٹی حدیثوں میں بھی بہت

کم ہے احادیث کا زیادہ حصہ روایت بالمعنی پر مشتمل ہے ۔

شاید اسی بنا پر حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ الباقی میں یہ فرما گئے :

كَانَ اهْتِمَامُ مُجَهِّزِ السُّوَالِ وَاقِفٍ عِنْدَ السُّوَالِ وَآيَةٍ بِالْمَعْنَى بِرُؤْسِ

الْمَعْنَى دُونَ الدُّعْتِبَارَاتِ الَّتِي يُعْبَرُ فِيمَا الْمُتَعَمِّقُونَ ۔

عام راوی روایت بالمعنی کے وقت میں صرف معافی کا اہتمام کرتے تھے۔
 ان حیثیات کو پیش نظر رکھتے جن کو تعمق پسند ملحوظ رکھتے ہیں۔
 اور اسی لیے روایات سے استدلال کرتے وقت صرف مدلول کلام پر نظر ہوتی ہے اسلوب کلام
 سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:-
 فَاسْتِزِلْ لَأَسْمَاءَ بَنِيهِ الْفَارِ وَالْوَادِ وَتَقْدِيمُ بَعْدَ دَاخِرِهَا وَ
 مَخْرُوجِهَا مِنَ التَّحْقِيقِ لَهُ
 اس لیے حدیث میں فاء، واو حرف کی تقدیم و تاخیر اور اس قسم کی چیزوں
 سے استدلال کرنا سراسر تعمق ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین جب روایت بالمعنی کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ بقول حافظ سیوطی احادیث
 کا زیادہ ذخیرہ روایت بالمعنی ہی کی حیثیت رکھتا ہے تو ایسی صورت میں الفاظ کے اختلاف
 سے بدک کر کسی حدیث کا انکار کرنا فن حدیث کی کوئی خدمت نہیں ہے بلکہ میں یہاں تک
 کہتا ہوں کہ محدثین کے یہاں جن روایات کو مرفوع کہا جاتا ہے وہ سب فقہاء کے یہاں سنن
 اور فتاویٰ کی شکل میں موجود تھیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے یہ بات لکھ کر سمجھنے والوں کے
 لیے کچھ اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ:

أَصْلُ مَذْهَبِهِمْ فَتَاوَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ وَقَضَايَا عَلِيٍّ
 وَفَتَاوَاهُ وَقَضَايَا شُرَيْحٍ لَهُ

ابو حنیفہ کے مذہب کی اساس عبد اللہ کے فتاویٰ اور حضرت علی کے فیصلے ہیں۔

احادیث فقہ اور روایات حدیث

اسی بنا پر محمد بن سہاء کا کہنا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں بیان کی ہیں۔ یعنی
 فقہ کے وہ سارے مسائل جو امام صاحب کے شاگردوں نے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ان
 سب کا مقام فتاویٰ صحابہ ہونے کی وجہ سے روایات حدیث کا ہے اور ان کا نام احادیث فقہ
 ہے۔ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں جس دفتر کا پتہ دیا ہے کہ اس میں فاروق عظیم، علی بن ابی طالب

ابن مسعود کی مرویات صحیحہ مدون ہیں وہ فقہ کے سوا اور کون سا ہے بلکہ قرۃ العینین میں شاہ صاحب جو یہ بات لکھ دی ہے کہ:

قرآن حکیم کے بعد اصل دین اور سرِ مائتہ یقین علمِ حدیث ہے جیسا کہ خود قرآن میں ہے وَ یُعَلِّمُہُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ اور علمِ حدیث جو کچھ بھی امت کے پاس موجود ہے یہ ابو بکر و عمر کی محنتوں کا نتیجہ ہے کیونکہ جن جن جررگوں نے ان دونوں سے حدیثیں روایت کی ہیں اور ان کے نام روایات بیان کی ہیں وہ صرف اسی قدر نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مکثرین کی بیشتر احادیث مرفوعہ ابو بکر و عمر کی حدیثیں ہیں۔ عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس اور ابو ہریرہ نے ان کی بیان کردہ روایات کو مرفوعاً پیش کیا ہے اور اہل مسانید نے ظاہرِ حال کے پیش نظر ان بزرگوں کے مسانید میں جمع کر دی ہیں۔ یہ بات فنِ حدیث کے ماہر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ احادیث دراصل ان بزرگوں کے فتاویٰ ہیں احادیث اور روایات حدیث کے فرق پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے صرف یہ بتانا ہے کہ اگر آیاتِ فقہ اپنے مصنفین سے متواتر ہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں لکھا ہے تو پھر

۵۔ قرۃ العینین ص ۵۵۔ ۲۔ منہاج السنہ میں ہے قد نقل ذالک سائر اصحابہ و ہم خلق کثیر علون مذہبہ بالتواتر درج ۴ ص ۵۷، امام اعظم سے مسائل فقہ بتواتر منقول ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے غیۃ الاسلام ملک العلماء عز الدین بن عبد السلام سے ایک سوال کا جواب کتبِ فقہ کے بلے میں یہ نقل کیا ہے کہ کتب نہ پر اعتماد کرنا علماء میں متفق ہے اور اس بلے میں کبھی دو رائے نہیں ہوتی ہیں کہ روایاتِ فقہ بالکل صحیح ہیں۔ ریب الراوی ص ۵۸، استاد ابو اسحاق اسفرائینی فرماتے ہیں کہ معتد کتابوں سے نقل کرنا درست اور اس پر اجماع ہے۔ اس کے لیے ان کے مصنفین تک اتصالِ سند شرط نہیں ہے خواہ یہ کتابیں حدیث کی ہوں یا فقہ کی (ندریب ۸۵۷) اسی بنا پر علماء کے مراسیل کو سب سے زیادہ قوی اور معتبر بتایا ہے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں علماء اقوی المراسیل ما ارسلہ العلماء من احادیث هذا الکتاب اور یہ بھی لکھا ہے اجتمع الامۃ علی بوانہ اسناد ما فی الکتاب الصحیحۃ الی اہلہا بعد سماعہا اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس معاملہ میں حدیث اور دوسری (باقی صفحہ پر)

احادیث فقہ قوت و وثاقت میں بہت زیادہ قوی اور قابل اطمینان ہیں کیونکہ فقہ کے نام پر جو کچھ ہے وہ امام اعظم کا خود ساختہ نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو کچھ علقمہ نے سنا اور علقمہ سے جو کچھ ابراہیم نخعی نے سنا اور ابراہیم سے جو کچھ حماد نے اور حماد سے جو کچھ امام اعظم نے سنا اسی کا نام فقہ ہے۔ بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ راویوں کی اصل نظر روایت میں مدلول کلام پر ہوتی ہے۔ اسی لیے کتاب الآثار میں جو بات حضرت ابن عمر کی جانب سے بصورت فتویٰ تھی وہ ہی چیز کتب روایت میں حدیث مرفوع بن کمر آئی ہے اور بس ورنہ بات ایک ہے۔ خیر یہ تو درمیان میں ایک جملہ مقررہ تھا یہ اس کتاب کا موضوع نہیں اللہ نے توفیق دی اور انفس حیات باقی رہے تو انشاء اللہ اس کی تفصیلات امام اعظم اور علم الفقہ میں آئیں گی۔

الحافظ ابو بکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہریؒ

یہ بھی صحابہ کرام اور کبار تابعین کے شاگرد ہیں اور بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام اوزاعی، امام لیث، امام مالک وغیرہ ان کے شاگرد ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے اسعاف المبطایین، حافظ جمال الدین ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں اور حافظ ذہبی نے مناقب میں تصریح کی ہے کہ یہ امام اعظم کے استاد ہیں۔ حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ان کا تعارف ان لفظوں میں پیش کیا ہے :

احد الاعلام من امۃ الاسلام تابعی جلیل۔^۱

حاشیہ ۱: کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے لا فرق فیما ذکرنا من علم الحدیث و بین سائر علوم الاسلام و مصنفات العلماء الاعلام (الروض الباسم ص ۱۷۰-۱۷۱) اس لیے جیسے آج ائمہ حدیث کی کتابوں کو بے اصل بتانا جہل اور حق ہے ایسے ہی فقہ کی کتابوں کو غیر معتبر کہنا علم کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ امام محمد کی چھ کتابوں جامع صغیر، جامع کبیر، زیادات، مبسوط، السیر الصغیر، السیر الکبیر اور قاضی ابویوسف کی کتابوں الروض علی سیر الاوزاعی، اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ، الامالی اور کتاب الخراج میں یہی مسائل ہیں بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن المبارک اور امام دکیع کی تصانیف میں بھی یہی مسائل ہیں اور امام سفیان ثوری کی جامع کا بھی یہی ماخذ ہے حافظ ابن عبد البر نے الانتقاء میں لکھا ہے کہ قاضی ابویوسف فرماتے ہیں سفیان الثوری اکثر

اور امام زہری فرماتے ہیں،

اعلم الحفاظ المدنی الامام

قوت حافظہ اللہ پاک کی جانب سے بے پایاں ارزانی ہوتی تھی۔ صرف اسی روز میں قرآن عزیزی
نوک زبان کر لیا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ:

اموی خاندان کے مشہور سربراہ ہشام بن عبد الملک نے امام زہری سے
درخواست کی کہ میرے لڑکوں کے لیے کچھ حدیثیں قلم بند کر دیجئے۔ امام زہری
نے منشی کو چار سو حدیثیں املا کرائیں، باہر تشریف لائے، اور محدثین کو
ان کا درس دیا۔ کچھ روز کے بعد ہشام نے امام زہری سے کہا کہ وہ آپ
کی چار سو حدیثوں والی دستاویز تو ضائع ہو گئی ہے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں
ہے پھر وہی تمام حدیثیں منشی کو بلا کر املا کرائیں۔ ہشام پہلی کتاب
نکال کر لایا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ واقعہ نگار کہتا ہے کہ فاذا هولہ
یغادر حرفاً ایک حرف کا بھی دونوں میں فرق نہ تھا۔

ان کی علمی جلالت قدر کا یہ حال تھا کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز فرماتے تھے کہ امام زہری سے استفادہ
کرو اور وجہ یہ بتاتے تھے کہ امام زہری سے زیادہ سنت کا عالم کوئی نہیں رہا۔ سفیان بن عیینہ کہتے
ہیں کہ محدثین تین ہیں۔ زہری، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن جریر۔

سب سے صحیح سند

فن روایت و اسناد میں سب سے معتبر، سب سے مستند اور سب سے زیادہ صحیح اسناد کے متعلق آپ امام
بخاری کی رائے سن چکے ہیں۔ لیجئے دوسرے علماء کے خیالات بھی سن لیجئے۔ امام عبدالرزاق جو امام
بخاری کے استاد الاساتذہ ہیں فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ صحیح طریق الزہری عن علی بن الحسین عن
الحسین عن علی ہے۔ مشہور محدث محمد بن سلیمان نے امام اسحاق بن ابراہیم کے حوالہ سے بتایا ہے
کہ اصح الاسانید الزہری عن سالم عن ابن عمر ہے۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں عن عبدالرحمن عن
القاسم عن عائشہ کو سب سے زیادہ پایدار اور معیاری سند کہتے ہیں۔ فضیل بن عیاض منصور عن ابراہیم

عن علقمہ عن عبد اللہ بن مسعود مقرر کرتے ہیں اور امام بخاری کے مشہور استاد عبد اللہ بن المبارک سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ کی سند کو اتنی پائیدار اور صحیح قرار دیتے ہیں کہ اس طریق سے روایت کا آنا گویا ذات نبوت سے سننے کے مترادف ہے۔ اور بھی علماء کے اس موضوع پر خیالات ہیں یہ

ایک لطیف نکتہ

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کے کام پر زہری کو بھی مقرر کیا تھا اس کی وجہ خود امام زہری کے بیان سے معلوم ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے ان کے حوالے سے لکھا ہے کہ مجھے قاسم بن محمد نے کہا کہ میں تم کو علم کا سونپیں دیکھتا ہوں کیا میں تم کو علم کا مرکز نہ بتا دوں زہری نے فرمایا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھر عمرہ بنت عبدالرحمن کے پاس جاؤ کیونکہ یہ حضرت عائشہ کی آغوش میں پرورش پائی ہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں ان سے ملا ہوں میں نے ان کو علم کا دریا پیداکنار پایا ہے^۱

عمرہ بنت عبدالرحمن اور قاسم بن محمد یہ دونوں حضرت عائشہ کے شاگردوں میں سے تھے۔

قاسم بن محمد کی شان علمی

قاسم بن محمد تو حضرت عائشہ کے برادر زادے اور فقہا و سابعہ میں سے ہیں۔ امام بخاری نے ان کے متعلق تصریح کی ہے:

قتل ابوہ فرقی یتیمًا فی حجر عائشۃ ففقہ بہا۔^۲

ان کے والد قتل ہو گئے۔ انہوں نے یتیمی کا عرصہ حضرت عائشہ کی آغوش میں گزارا اور ان سے علم حاصل کیا۔

قاسم بن محمد مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہترین عالم شمار کیے جاتے ہیں۔ امام سیحی بن سعید انصاری نے اپنا اور اس دور کے دوسرے علماء کا ان کے بارے میں یہ تاثر بتایا ہے کہ:

ہم نے اپنے زمانے میں مدینہ میں علم و فضل میں قاسم سے بڑھ کر

^۱ الکفایہ فی علوم الروایۃ ص ۳۹۷، ^۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶، ^۳ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۲۴

کوئی نہیں دیکھا ہے

مشہور فقیہ حضرت ابو الزنادان کے متعلق فرماتے تھے :
میں نے کسی نوجوان کو فقہ و سنت کا اتنا بڑا عالم اور ذہنی طور پر نکمہ رس
نہیں پایا جتنا قاسم بن محمد کو ہے

خالد بن نزاد اور ابن عیینہ کا متفقہ بیان ہے کہ :
دنیا میں حدیثِ عائشہ کے سب سے بڑے عالم تین ہیں قاسم، عروہ،
اور عمرہ ہے

امام ابن عون بصرہ کے مشہور امام اور حفاظ میں سے ہیں اور جن کو حضرت قاسم سے شرفِ تلمذ
حاصل ہے اور جن کے بارے میں عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں پورے عراق میں ابن عون سے زیادہ
دانتے سنت کوئی نہ تھا (تذکرۃ الحفاظ) وہ اپنے استاد کے بارے میں فرماتے ہیں :

تین آدمی ایسے ہیں کہ مجھے ان جیسا کوئی نہیں ملا۔ میں تو یہ محسوس کرتا
ہوں کہ انہوں نے اکٹھے ہو کر علم و فضل کو سمیٹا ہے عراق میں ابن سیرین
حجاز میں قاسم بن محمد اور شام میں رجاء بن حیوہ ہے

حافظ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں ثناء اقرانہ علیہ بالعلم کا عنوان
قائم کر کے ان کی علمی حیثیت کے بارے میں ان کے معاصرین کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان
کو دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

علوم میں قاسم بن محمد کو صرف فضل و کمال ہی حاصل نہ تھا بلکہ اللہ سبحانہ نے ان کو خاص مجتہد
شان سے بھی نوازا تھا۔ الذہبی نے ابن عیینہ کی طرف نسبت کر کے ان کے متعلق جو بات لکھی ہے
کہ کان القاسم اعلما ھل زمانہ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنے دور کی بے مثال
علمی شخصیت تھے ان کی علمیت کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ :
زمانہ ابو بکر و عمر ہی سے عائشہ مسند افتاء پر فائز تھیں میں ان
کے پاس ہی رہا۔ عبداللہ بن عباس سے میں نے استفادہ کیا

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۱ - ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۳۴

۳۔ تہذیب الاسما ج ۱ ص ۵۵ - ۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۷

ابن عمر اور ابو ہریرہ کے علوم سے بہت زیادہ بہرہ یاب ہوا ہوں۔
الغرض ان کی علمی جلالت اور شانِ امامت پر سب یک زبان ہیں۔

عمرہ بنت عبد الرحمن کا علمی مقام

عمرہ بنت عبد الرحمن قاضی ابوبکر بن حزم کی والدہ کبشہ کی بہن تھیں اس لیے قاضی صاحب کی خالہ ہوتی ہیں یہ بھی فقہت میں بہت بڑی شانِ جلالت کی مالک تھیں۔ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کا ان کے بائے میں تاثر یہ تھا کہ مَا بَقِيَ أَحَدًا عِلْمًا بِحَدِيثِ عَائِشَةَ مِنْ عُمَرَ فَحَضَرَتْ عَائِشَةَ كِي حَدِيثِهَا كِي عُمَرُ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ قاسم بن محمد نے امام زہری کو عمرہ سے استفادے کا مشورہ دیا تھا امام زہری کا ان سے ملاقات کے بعد ان کے بائے میں تاثر یہ تھا۔

فَوَجَدْتُهَا بَحْرًا لَا يَنْزِفُ يَمُّهُ

میں نے ان کو بحر بیکراں پایا ہے۔

چونکہ امام زہری کے پاس قاسم اور عروہ دونوں کا علم تھا اور حدیثِ عائشہ کا ان دونوں سے بڑھ کر عالم کوئی نہ تھا اس لیے عمر بن عبد العزیز نے امام زہری کو بھی قاضی ابوبکر کے ساتھ تدوینِ سنن کا حکم دیا تھا۔

امام زہری صرف احادیثِ مرفوعہ ہی نہیں بلکہ آثارِ صحابہ بھی قلم بند فرماتے تھے۔ چنانچہ مہم کہتے ہیں کہ مجھے صالح بن کیسان نے بتایا ہے کہ میں اور امام زہری طلبِ علم میں دونوں ہم سفر تھے۔ ہم دونوں مرفوع حدیثیں لکھتے تھے مجھے امام زہری نے کہا کہ آثارِ صحابہ بھی لکھیں کیونکہ وہ بھی سنت ہیں میں نے کہا کہ نہیں لیکن امام زہری نے آثارِ صحابہ بھی لکھے اور میں نے نہیں لکھے حکمِ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ :

ان کی مرویات ۲۲۰۰ ہیں جو کچھ سنتے تھے قلم بند کرتے جاتے تھے۔

ارشاداتِ نبوت پر ان کا لکھا ہوا قلمی سرمایہ کس قدر تھا اس کا اندازہ امام مہم کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بحوالہ امام عبد الرزاق نقل کیا ہے کہ

ولید بن یزید کے قتل ہونے کے بعد امام زہری کا علمی سرمایہ جانوروں پر لا کر سرکاری کتب خانہ سے نکالا گیا۔ علمی توجہ اور طلب علم میں ذوق و لگن اور شوق کا حال یہ تھا کہ امام لیث بن سعد کہتے ہیں۔

ایک بار کھانے میں امام زہری کے سامنے پلیٹ رکھی گئی کھانے کے لیے
ہاتھ بڑھایا۔ اس اثنا میں کوئی حدیث یاد آگئی اس قدر محو ہوئے کہ آپ
کا ہاتھ پلیٹ میں رہا اور صبح ہو گئی۔

ان کا بھی قلمی سرمایہ ان کے شاگردوں کی وساطت سے آج ذخیرہ حدیث کی زینت ہے گویا علم حدیث کا زمانہ تابعین یعنی پہلی صدی کے آخر میں کتابی ذخیرہ ہے۔

قاضی ابویوسف نے کتاب الآثار میں حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنی مسند میں ان سے روایات لی ہیں۔

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنِ التَّهْهِي عَنِ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

لہ امام لیث بن سعد کو اکثر اہل علم نے علماء احناف میں شمار کیا ہے چنانچہ قاضی ابن خلکان نے دلیات الاعیان میں اور شیخ الاسلام زکریا انصاری نے شرح بخاری میں ان کے حنفی ہونے کی تصریح کی ہے امام لیث امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ اکثر حج کے موقع پر امام اعظم کی خدمت میں استغاثے کی غرض سے حاضر ہوتے اور فقہ کی تحصیل کرتے چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ امام ابو محمد عارفی نے فقیہ مصر عبد الرحمن بن القاسم کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے لیث بن سعد سے سنا فرماتے تھے کہ مجھے اطلاع ملی کہ امام اعظم کا حج کا ارادہ ہے میں بھی امام صاحب سے استغاثے کے خیال سے حج کے لیے چل پڑا۔ آخر مکہ مکرمہ میں میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے مختلف ابواب کے بہت سے مسائل دریافت کیے مفتی حجاز علامہ ابن حجر مکی نے المیزان الحسان میں امام اعظم کے فضائل میں لکھا ہے کہ مشائخ ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین میں سے بڑے بڑے لوگوں نے امام اعظم کے سامنے زانوئے ادب کر لیا ہے جیسے امام عبد اللہ بن المبارک جن کی جلالت شان پر اتفاق ہے اور امام لیث بن سعد اور امام مالک بن انس امام اعظم کی جلالت قدر کو سمجھنے کے لیے یہی ائمہ کافی ہیں۔ امام لیث نے امام اعظم کی بعض حدیثوں کو امام ابویوسف کے حوالہ سے روایت کیا ہے چنانچہ امام طحاوی نے مشہور حدیث من کان لہ امام فقہ الامام لہ قرآن کو شرح معانی الآثار میں اسی طریق سے روایت کیا ہے اس حدیث کو امام حاکم نے معرّفۃ عدم الحدیث میں بھی ذکر کیا ہے اس سند کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں چار ائمہ مجتہدین جمع ہیں۔ عبد اللہ بن وہب، لیث بن سعد، ابویوسف اور ابو حنیفہ۔ لے البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۴۳۔

وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْمُتَعَتَةِ -

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ سے منع فرمایا ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے :

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنِ الرَّهْزِيِّ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَذَبَ عَلَىَّ مُتَعِدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

جو شخص مجھ سے جھوٹ بولتا ہے جان کر اسے اپنا ٹھکانا دوزخ بنالینا چاہیے۔

یہ روایت امام اعظم نے یحییٰ بن سعید کے حوالہ سے بھی روایت کی ہے۔ اس حدیث کو عشرہ مبشرہ اور ستر صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ شیخین، امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ حضرت انس، امام احمد، امام بخاری، امام ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ زہبیر، امام ترمذی نے بحوالہ حضرت علی مرتضیٰ اور دوسرے محدثین نے مختلف صحابہ سے یہ روایت کی ہے حتیٰ کہ امام نووی نے اس کے تواتر کا دعویٰ نقل کیا ہے۔

ان کے علاوہ مدینے کے باقی شیوخ جن کے سامنے امام اعظم نے زانوئے تلمذتہ کیا ہے یہ ہیں۔ ابو عبد اللہ محمد بن المنکدر رحمۃ اللہ علیہ، الحافظ یحییٰ بن سعید الانصاری رحمۃ اللہ علیہ، ہشام بن عروہ رحمۃ اللہ علیہ، واصل بن داؤد، ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص، موسیٰ بن طلحہ بن عبید اللہ رحمۃ اللہ علیہ، ابو عبد اللہ عکرمہ مولیٰ ابن عباس رحمۃ اللہ علیہ، عبد اللہ بن دینار، عطایہ بن یسار، عبد الرحمن بن ہرمز رحمۃ اللہ علیہ، عطاء بن السائب رحمۃ اللہ علیہ، عدی بن ثابت، عبد اللہ بن علی بن الحسین، سالم بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔

امام اعظم نے امام مالک سے روایت لی ہے

مدینہ طیبہ کے مشائخ میں بعض علماء نے امام مالک کے شاگردوں میں حضرت امام اعظم کو بھی شمار کیا ہے اور بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ بھی امام مالک کے تلامذہ ہیں۔ اس موضوع پر نیز میں امام مالک میں حافظ سیوطی کو بہت زیادہ اصرار معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے کچھ شہادتیں بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ :

امام مالک کے استاد ہونے کا ذکر دارقطنی نے کتاب المذہب میں ،

ابن خسر و بلخی نے مسند ابی حنیفہ میں اور خطیب بغدادی نے کتاب الروایت میں کیا ہے یہ

در اصل حافظ سیوطی نے دارقطنی اور خطیب بغدادی کی جن دو روایتوں کا حوالہ دیا ہے۔ یہ دونوں خود روایتی نقطہ نظر سے محدثین کے نزدیک محل نظر ہیں۔ دونوں روایتیں یہ ہیں:-

عن محمد بن مخزوم عن جده محمد بن ضحاک ثنا عمران بن عبد الرحیم ثنا بکار بن الحسن ثنا حماد بن ابی حنیفۃ عن ابی حنیفہ عن مالک بن انس عن عبد اللہ بن الفضل عن نافع بن جبیر عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الیم احق بنفسها من ولیہا والیکر تستامر وصمتھا اقرارھا۔

انرجہ ابن الشاہین والد دارقطنی۔ رائڈ عورت اپنی زیادہ حق دار ہے اپنے ولی کی نسبت اور نوجوان سے دریافت کیا جائے اس کی خاموشی اقرار ہے۔ خطیب کی روایت یہ ہے :

عن محمد بن علی الصلی الواسطی ثنا ابو زرعۃ احمد بن الحسین ثنا علی بن محمد بن مہر و یہ ثنا المجبر بن الصلت ثنا القاسم بن الحکم العرفی ثنا ابو حنیفۃ عن مالک عن نافع عن ابن عمر قال اتی کعب بن مالک النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسأله عن راعیتہ کانت ترعى فی غنمہ فتخوفت علی شاة الموت فذبحتها لھجر فامر النبی باکلھا۔

اقوم المساک میں ہے کہ تمام دفتر حدیث میں ان مذکورہ بالا دو روایتوں کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے جس سے امام اعظم کا امام مالک سے تلمذ ثابت ہو لیکن ان دونوں کی تاریخی حیثیت محدثین کے یہاں ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان دونوں روایتوں کی روایتی حیثیت کو محل کلام قرار دیتے ہوئے انکت علی ابن الصلاح میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ :
لَمْ تَثْبُتْ رِوَايَةُ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ مَالِكٍ وَ إِنَّمَا

أَوْ رَدَّهَا الدَّارَ قُطْنِي ثُمَّ الْخَطِيبُ لِي وَبَيْتَيْنِ وَقَعْتَا لِهَمَّا
بِأَسْنَادَيْنِ فِيهِمَا مَقَالٌ۔

امام اعظم کی امام مالک سے روایت ثابت نہیں ہے۔ دارقطنی اور
خطیب نے اس بات کا دعویٰ ان دو روایتوں کی وجہ سے کیا ہے جن
کی اسناد مٹل کلام سے ہے۔

حافظ صاحب نے ان روایات کی جس اسنادی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ
ہے کہ دارقطنی کی روایت میں عمران بن عبدالرحیم راوی ہے۔ یہی شخص اس من گھڑت کہانی کا ذمہ دار
ہے۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں حافظ سلیمانی کے حوالہ سے اس کا نام لے کر یہ انکشاف کیا ہے
هُوَ الَّذِي وَضَعَ حَدِيثَ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ مَالِكٍ يَكُونُ
یہی شخص ہے جس نے ابو حنیفہ از مالک کی حدیث بنائی ہے۔

در اصل روایت صرف اس قدر تھی کہ حماد بن ابی حنیفہ نے امام مالک سے سنا مگر عمران نے درمیان میں ابو حنیفہ
کا اپنی جانب سے اضافہ کر دیا۔ چنانچہ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن مخلد نے اپنے رسالہ نامی "مارواہ الاکابر عن
مالک" میں اس کا سند اس طرح بیان کی ہے :

حدثنا ابو محمد القاسم بن هارون ثنا بكار بن الحسن الاصمغاني
ثنا حماد بن ابی حنیفہ ثنا مالک بن انس الحديث يَكُونُ

یہ بھی اس کی تائید ہے کہ اصل مسند میں حماد بن ابی حنیفہ عن مالک ہے۔ ابو حنیفہ عن مالک
نہیں ہے اور جامع المسانید میں بھی سند اس طرح ہے۔ حافظ سیوطی نے اسی سلسلے میں مسند ابی
حنیفہ لابی الضیاء کا بھی حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

ثُمَّ وَقَفْتُ عَلَى مُسْنَدِ أَبِي حَنِيفَةَ لِأَبِي الضَّيَّاءِ الَّذِي
جَمَعَهُ مِنْ خَمْسَةِ عَشَرَ مُسْنَدًا وَفِيهِ مِنْ رِوَايَةِ
أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ مَالِكٍ يَكُونُ

مجھے مسند ابی حنیفہ ابن الضیاء کا نسخہ ملا ہے اسے مؤلف نے پندرہ

مسندوں سے جمع کیا ہے اور اس میں ابو حنیفہ از مالک کی روایت ہے۔

یہ مسند ابی حنیفہ دراصل جامع المسانید کا خلاصہ ہے۔ جامع المسانید اب زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس میں کتاب الآثار کے حوالہ سے بیروایت ضرور ہے مگر اسے امام محمد بحوالہ امام اعظم عن نافع عن ابن عمر روایت کرتے ہیں۔ البتہ امام محمد نے اپنے موطا میں یہی روایت بحوالہ مالک عن نافع عن ابن عمر پیش فرماتی ہے۔

دوسری روایت خطیب کی ہے اس میں مجرب بن اہلک کو غلط فہمی ہوئی۔ اس نے عبد الملک کی جگہ مالک کہہ دیا کیونکہ اس روایت کی جن محدثین نے تخریج کی ہے اس کی تفصیل علامہ خوارزمی نے دی ہے ان تمام روایات میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں ہے جس میں ابو حنیفہ از مالک آیا ہو۔ اس میں اول تو محمد بن المغیرہ بحوالہ قاسم از ابی حنیفہ ہے اور قاسم کے علاوہ دوسرے طرق میں بحوالہ امام محمد اور قاضی ابویوسف ابو حنیفہ از عبد الملک بن عمیر آیا ہے کسی بھی طریق میں ابو حنیفہ از مالک نہیں ہے۔

اشتبہ کی روایت سے غلط فہمی

زیادہ تر غلط فہمی اشتبہ کی اس روایت سے ہوئی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے اس طرح دیکھا ہے جیسے بچہ باپ کے سامنے۔ اشتبہ کا یہ بیان بھی اصول روایت کے مطابق صحیح نہیں ہے کیونکہ اشتبہ کا سن ولادت حسب بیان ابن یونس ۱۴۵ھ ہے یعنی امام اعظم کی وفات والے سال ان کی عمر صرف پانچ سال کی ہے۔ اس عمر میں ان کا مصر سے مدینہ جانا اور امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سامنے دیکھنا انسانی عقل باور نہیں کرتی۔ کوثری لکھتے ہیں :

امام ذہبی نے امام مالک کے ترجمہ میں جو واقعہ بیان کیا ہے صحیح نہیں ہے ہاں اگر امام ابو حنیفہ کے صاحبزادے حماد کے متعلق ہو تو شاید درست ہو کیونکہ اشتبہ کی تاریخ پیدائش ۱۴۵ھ ہے۔
تعلیقات میں ہے :

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اشہب کی زبانی جو کہانی بیان کی ہے وہ تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ اشہب امام شافعی کی عمر کے لگ بھگ ہیں یا محتاط سے محتاط انداز سے کے موافق امام ابو حنیفہ کی وفات کے وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ دس سال ہوتی ہے ان کی ملاقات امام مالک سے اس دور میں ثابت نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے امام مالک معلم الاطفال نہ تھے کہ اس عمر کے بچے ان کے پاس ہوں۔ دراصل واقعہ کا تعلق ابو حنیفہ سے نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے حماد سے ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت حدیث محتاج ثبوت ہے اور جن راہوں سے اسے ثابت کرنے کی کوشش سیوطی اور دارقطنی نے کی ہے وہ محدثین کے یہاں ناقابل اعتبار ہیں۔ ورنہ امام اعظم کے لیے یہ خبر قطعاً قابل عار نہیں ہے کہ وہ امام مالک سے حدیثوں کا سماع کریں بلکہ محدثین کا کہنا ہے کہ ایک محدث اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ اعلیٰ، ہم سر اور کتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے۔ امام مالک تو امام اعظم کے اقران میں سے ہیں۔ امام اعظم نے تو اپنے تلامذہ تک حدیثیں بیان کی ہیں چنانچہ امام خراسان ابراہیم بن طہمان کے متعلق امام ذہبی نے تصریح کی ہے کہ:

حَدَّثَ عَنْهُ أَبُو حَنِيفَةَ

ابن ابی حاتم نے تقدیمۃ الجرح والتعديل میں ابراہیم کے حوالہ سے امام مالک سے روایات سننے کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ابراہیم بن طہمان کہتے ہیں میں مدینہ آیا اور حدیثیں لکھی ہیں۔ وہاں سے کوفہ گیا اور امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا سلام کیا آپ نے پوچھا مدینہ میں کس سے استفادہ کیا؟ میں نے نام بتایا۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا مالک بن انس سے بھی کچھ لکھا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ دکھاؤ۔ بعد ازیں آپ نے قلم دوات

منگا کر نقل کیا۔

لیکن روایت اقران کے لیے حلقہ درس میں شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ مذاکرے کے ضمن میں بھی روایت ہو سکتی ہے۔ پھر یہاں خود امام ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت کرنا محققین سے ثابت نہیں ہے۔

حافظ مغلطائی کی تحقیق

اگر تاریخی طور پر یہ صحیح ثابت ہو جاتے اور حافظ دارقطنی، خطیب بغدادی اور حافظ سیوطی کی بات ہی اپنالی جاتے تو پھر حافظ علاء الدین مغلطائی کا یہ دعویٰ صحیح ہو جائے گا کہ اسانید و روایت کی دنیا میں سب سے زیادہ جلیل القدر یہ سلسلہ سند ہے ابو حنیفہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر، آپ اصح الاسانید کے سلسلہ میں امام بخاری کی جاتے پہلے پر مٹھ چکے ہیں کہ مالک عن نافع عن ابن عمر کا طریق سلسلہ الذہب ہے۔ اسی پر قدم جماتے ہوئے حافظ ابو منصور عبد القادر عینی نے شافعی از مالک از نافع از ابن عمر کو اجل الاسانید لکھا ہے اس پر حافظ مغلطائی نے حافظ عبد القادر کا تعاقب کیا اور بتایا کہ اگر صحت روایت کا مدار جلالِ شان اور عظمتِ قدر پر ہے تو پھر تاریخ کی دنیا میں اجل الاسانید

ابو حنیفہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہا ہے اور اگر جلالِ شان نہیں بلکہ اس کا مدار اتقان و ضبط ہے تو پھر ابن ورمہ عن مالک الخ یا القعنبنی عن مالک کا طریق بزرگترین ہونا چاہیے۔ حافظ بلقینی نے محاسن الاصطلاح میں

۱۔ تقدیر الجرح والتعديل ص ۳۰ - ۲۔ نام عبد اللہ بن ورمہ بن مسلم اور کنیت ابو محمد ہے۔ ان کا مولد و مکن مصر ہے چار سو آئمہ حدیث کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ ابن عدی، ابن یونس ان کی جلالت علمی کا لوہا مانتے ہیں فقہ، حدیث اور عبادت کا ایک مثالی نمونہ تھے ۳۔ میں پیدا ہوئے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۰ھ میں وفات پائی ان کے حالات استخاف النبلاء میں ہیں۔

۴۔ نام عبد اللہ بن سلمہ بن قعب الحارثی ہے مشہور قعنبنی ہے اصلاً مدنی ہیں مگر بود و باش بصرے میں تھی آخر عمر میں مکہ تشریف لے آئے بہت سے شیوخ وقت سے استفادہ کیا۔ موٹا کے راویوں میں سے ایک ہیں۔ استخاف میں ہے کہ از جملہ اصحاب مالک و فضلاء وثقات و خیاریہ شاہ ابو سعید بن معین (باقی صفحہ ۲ پر)

حافظ مغلطائی کے اس فیصلہ کی صحت اور قوت کو مانتے ہوئے لکھا ہے کہ
 اما ابو حنیفۃ فہو وان روٰی عن مالک کما ذکرہ الدائرۃ القطنی
 لکن لم یشترکہ روایتہ عند کاشتہار روایت الشافعی
 یعنی اگر ابو حنیفہ عن مالک کو شافعی عن مالک جیسی شہرت ہوتی تو پھر امام بلیغینی کے
 خیال میں امام ابو حنیفہ کی جلالت قدر کی وجہ سے ابو حنیفہ عن مالک الخ ہی سب سے صحیح اور
 سب سے بزرگتر سلسلہ سند ہوتا اور دنیا نے روایت میں اسی کو سلسلۃ الذہب کہا جاتا۔
 حافظ عراقی نے حافظ مغلطائی اور حافظ بلیغینی دونوں کے بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے
 لکھا ہے۔

امام اعظم کی امام مالک سے روایت جو دارقطنی نے غرائب میں
 لکھی ہے اس کا سلسلہ سند نافع عن ابن عمر نہیں ہے یہ
 یعنی اگر روایت کا سلسلہ فی الواقع یہ ہو کہ ابو حنیفہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر اور
 روایتی نقطہ نظر سے اس کی صحت ثابت ہو جائے تو پھر حافظ عراقی کی رائے میں اسے ہی
 اصح الاسانید اور اجل الاسانید ہونا چاہیے۔ یہی بات حافظ عسقلانی نے فرمائی ہے۔

اما اعتراضہ بابی حنیفۃ فلا یحسن لان اباحنیفۃ لم
 تثبت مروایتہ عن مالک

حافظ مغلطائی کا یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ امام اعظم کی امام مالک سے روایت
 ثابت نہیں ہے یہ

اس کا مدلول بھی یہی ہے کہ اگر ابو حنیفہ کی امام مالک سے روایت ثابت ہو جائے تو پھر

ص ۲۶۹ کا بقیہ حاشیہ: کہتے ہیں کہ حدیث میں تلہت میں نے صرف دو میں دیکھی ہے وکیع بن الجراح
 اور ثعلبی۔ س ۳۸۶ تاریخ ولادت ہے اور س ۲۲۲ میں وفات پائی۔

اے قاضی القضاۃ علم الدین صالح بن سراج الدین البلیغینی پورا نام ہے اپنے زمانے میں مذہب
 شافعی کے زعم میں اصول میں عزالدین بن جامعہ کے شاگرد ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی ان سے
 اجازت حدیث لی ہے ان کا سن ولادت ۳۹۱ھ ہے اور وفات ۴۶۸ھ میں ہوئی ہے۔

اے التعلیق المجدد ص ۱۶۔ اے مقدمہ فتح الملہم ص ۳۰

تاریخ و اسناد کی دنیا میں حافظ عسقلانی کے خیال میں اصح الاسانید یہی ہے۔ اس تمام تفصیل اور رد و کد سے ضمنی طور پر یہ بات بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے کہ بابر کا و محدثین اور روایت و اسناد کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کی نظر میں امام اعظم کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آنا اونچا کہ محدثین کے یہاں آپ کی ذات کو اصح الاسانید کے موقع پر بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ اگر معاذ اللہ حضرت امام کی ذات گرامی کسی وجہ سے میں بھی محدثین کے نزدیک مجروح و مقدوح ہوتی یا کوئی بات بھی آپ میں قابل گرفت ہوتی تو اصح الاسانید جیسے نازک ترین موقع پر نہ کوئی آپ کا نام لیتا اور نہ بلفیضی، عراقی اور عسقلانی جیسے اساطین حدیث ایسے مقام پر خاموش رہتے۔ دراصل یہ ان لوگوں کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے جو امام موصوف کی شان جلالت پر حرف گیری ہی کو پروانہ محدثیت قرار دیتے ہیں۔

امام مالک کی نظر میں امام اعظم کا مقام

اصل یہ ہے کہ امام مالک امام اعظم کا غایت درجہ اکرام کرتے تھے۔ چنانچہ محمد بن اسماعیل بن فاریک کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک اور امام اعظم دونوں کو مدینہ میں دیکھا ہے۔ دونوں باہم ہاتھ پکڑے جا رہے تھے جب دونوں مسجد نبوی کے دروازے پر پہنچے تو امام مالک نے اوبابا امام اعظم کو آگے کر دیا۔ امام اعظم یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے **بسم اللہ ہذا موضع الامان فآمنی من عذابك ونجني من عذاب النار**۔

حافظ ابن ابی العوام نے عبد العزیز بن محمد درادری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ امام اعظم نے فرمایا ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ میں علم پھیلا ہوا دیکھا ہے اگر کوئی سمیٹ سکتا ہے تو یہ سرخ و سفید لڑکا ہے یعنی امام مالکؒ۔

ظاہر ہے کہ یہ بات امام اعظم نے امام مالک کے بارے میں اس وقت کہی ہے جبکہ عمر چودہ پندرہ سال ہے۔ اس وقت لامحالہ امام اعظم کی عمر پچیس سال کی ہوتی ہے گویا یہ بات امام اعظم نے ۵۰ سالہ میں فرماتی ہے اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہی سال امام اعظم کے اسفار علمیہ کا پہلا سال ہے۔ خود امام مالک امام ابو حنیفہ کا بیحد اکرام کرتے تھے اور اکرام اس لیے نہیں کرتے تھے کہ عمر

میں بڑے تھے بلکہ اس لیے کہ امام مالک کو امام اعظم کی فقہیت اور مجتہدانہ شان کا اقرار تھا۔ اور اتنا اقرار تھا کہ اپنے اعمال میں امام اعظم کے کردار کی کاپی کو اپنے لیے فخر محسوس کرتے تھے چنانچہ امام لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ:

میں مدینہ میں امام مالک سے ملا۔ ان سے میں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ اپنی پیشانی سے پسینہ پونجھتے ہیں فرمایا کہ امام ابو حنیفہ کے سامنے عرق آلود ہو جاتا ہوں کیونکہ وہ فقیہ ہیں۔ امام لیث کہتے ہیں کہ بعد ازیں میں امام ابو حنیفہ کے پاس گیا میں نے ان سے عرض کیا کہ امام مالک کی نظر میں آپ کا مقام بہت بلند ہے امام اعظم نے فرمایا کہ میں نے سچے اور کھرے جواب میں مالک سے زیادہ تیز اور گھرا کوئی نہیں دیکھا ہے

الغرض امام مالک امام اعظم کے استاد نہیں چنانچہ جمال الدین المزی نے تہذیب الکمال میں اور امام ذہبی نے اپنی تصانیف میں امام اعظم کے مشائخ میں امام مالک کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضمیۃ میں، علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں اور حافظ ابن حجر نے امام صاحب کے تلامذہ میں شمار کیا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ حضرت امام شافعی نے عبد العزیز بن محمد در اور دی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ

كَانَ مَالِكٌ يَنْظُرُ فِي كُتُبِ ابْنِ حَنِيفَةَ وَ يَنْتَفِعُ بِهَا

امام مالک امام اعظم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے استفادہ فرماتے۔

بصرہ

مشہور اسلامی شہر جو تیسری صدی تک علوم اسلامیہ کا گہوارہ رہا اور وسعت علم، کثرت حدیث اور دوسری خوبیوں کے لحاظ سے اس کا ایک امتیازی مقام تھا۔ امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں بصرے کے اندر سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کی ایک فہرست دی ہے اور ایسے ہی کتاب کی نوع ۴۹ میں جہاں امام حاکم نے مختلف شہروں کے ان ائمہ ثقافت کا تذکرہ کیا ہے

جن کی احادیث پر حفظ و تذکرہ کی حدود میں اعتماد کیا جاسکتا ہے بصرہ کے ائمہ ثقافت اور حفاظ حدیث کا بھی ایک طویل تذکرہ کیا ہے اور تقریباً نصف صد سے زیادہ حفاظ حدیث کے نام بتائے ہیں حافظ ذہبی فرماتے ہیں :

بصرے میں حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عمران بن حصین، حضرت ابن عباس اور متعدد صحابہ اکبر و کبر و کثرت ہوئے ان میں سب سے آخری حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص، ان کے بعد حسن بصری، ابن سیرین، ابو العالیہ، پھر قتادہ، ایوب، ثابت البنانی، یونس بن عون، پھر حماد بن سلمہ، حماد بن زید اور ان کے تلامذہ ہوئے۔ اس کے بعد امام ذہبی نے لکھا ہے :

ما زال هذا الشأن واخرا الى راس المائة الثالثة و ناقص جدا الى ان تلاشي له

بصرے میں حدیث کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ حافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ بصری کے تذکرے میں حافظ ابن المدینی کے حوالے سے لکھا ہے :

كان عند يحيى بن خريس عن حماد عشرة آلاف حديث
بصرے میں محدثین کی اس قدر فراوانی تھی کہ مسند وقت حافظ مسلم بن ابراہیم بصری کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے حدیثیں قلم بند کیں اور وجہ کاپل جو بصرہ سے دس میل سے اتر کر نہیں گیا کہ ائمہ مجتہدین میں سے امام حسن بصرہ ہی کے رہنے والے ہیں جن کے متعلق امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں ہے یہ اور الامام الربانی محمد بن سیرین جو علم الرویا کے امام ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے ہیں اور جن کے پاس امام اعظم نے اپنے ایک خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے ایک دوست کو روانہ فرمایا۔ چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں :

امام ابو يوسف فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے خواب میں دیکھا کہ

لے الاعلان بالتونج بحوالہ الامصار ذوات الآثار۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حماد بن سلمہ۔ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ ترجمہ مسلم

بن ابراہیم۔ ۴۔ کتاب الآثار ص ۲۰۹۔

آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھود رہے ہیں۔ کھود کر آپ کی ہڈیوں کو جمع کر رہے ہیں اور ان کو جوڑ رہے ہیں۔ اُنکے کھلی تو آپ بہت گھبرائے۔ آپ نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بصرہ جاؤ تو امام ابن سیرین سے خواب کی تعبیر دریافت کرنا اور جا کر خواب کی تعبیر پوچھنی آپ نے فرمایا کہ یہ خواب دیکھنے والا شخص احیائے سنت کا کام کرے گا۔

امام اعظم ابو حنیفہ طلبِ علم حدیث کے لیے بصرہ تشریف لے گئے ایک بار نہیں بلکہ بیس مرتبہ سے زیادہ آپ کو بصرہ جانے کا اتفاق ہوا ہے اور وہاں سال بھر قیام کیا ہے۔ چنانچہ حافظ عبد القادر قرشی نے بحوالہ یحییٰ بن شیبان خود امام صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے :-

میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں اور اکثر سال سے زیادہ وہاں قیام بھی کیا ہے۔

حضرت امام اعظم کے اسفارِ علمیہ میں بصرہ ابتدائی اور آخری منزل ہے جیسا کہ آپ پہلے حافظ ابن نمیرہ کی زبانی سن چکے ہیں کہ اسلامی مملکت میں علومِ نبوت کے لیے پانچ شہروں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کوفہ میں عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد، بصرہ میں عبد اللہ بن عباس کے شاگرد، مکہ و مدینہ میں فاروق اعظم کے تلامذہ علومِ نبوت کے حامل تھے۔ بصرہ میں عبد اللہ بن عباس کے علوم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خود ابو بکر بصری کا بیان ہے کہ :

ابن عباس بصرہ تشریف لائے تو تمام عرب میں جسم، علم، بیان، جمال اور کمال میں کوئی ان کی مثال نہ تھا۔

علامہ کمال الدین البیاضی نے امام اعظم کے علوم کی سند اور ان کے علمی سفر نامے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

فہو اخذ عن اصحاب عمر عن عمرو عن اصحاب ابن مسعود

عن ابن مسعود عن اصحاب ابن عباس عن ابن عباس ممتن

یبلغ العدد المذكور بالکوفۃ والبصرۃ والحجاز فی حجۃ سنت

ست وتسعین و بعدہ

امام اعظم کے علوم کا ماخذ بواسطہ اصحابِ عمر، حضرت فاروق اعظم اور
بواسطہ اصحابِ ابنِ مسعود، خود حضرت عبداللہ بن مسعود اور بحوالہ
تلامذہ ابن عباس حضرت عبداللہ بن عباس ہیں ان ہی لوگوں کی
مذکورہ بالا تعداد سے امام اعظم نے کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ میں ۹۶ھ
اور اس کے بعد علوم حاصل کیے۔

بصرہ میں جن حفاظِ حدیث سے امام اعظم نے علمِ حدیث حاصل کیا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں

الامام ابو بکر الیوب بن ابی تمیم السخیتی

علمِ حدیث کے مشہور امام ہیں۔ امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ نے ان کو سید العلماء کہا ہے۔ امام
مالک دہلتے ہیں کہ ہم ان کے پاس جاتے تھے جب ان کے سامنے حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کا
کوئی ارشاد گرامی بیان کیا جاتا تو بے اختیار رو پڑتے۔ امام ذہبی نے ان کو الحافظ، احد الاعلام
لکھا ہے۔ امام اشعث ان کو حبیب العلماء فرماتے ہیں۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ میں نے بصرہ
میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ ہشام بن حسان کہتے ہیں کہ انہوں نے ۴۵ حج کیے ہیں۔ علمِ حدیث
میں جن اساتذہ کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب تہ کیا ہے وہ بڑے بڑے جلیل القدر
ائمہ ہیں۔ مثلاً عمرو بن سلمہ، القاسم بن محمد، نافع، عطاء، عکرمہ، عمرو بن دینار، اور جن تلامذہ نے
ان سے علمی استفادہ کیا ہے ان میں سے حماد بن زید، حماد بن سلمہ، امام احمد، امیر المومنین فی الحدیث
امام شعبہ، امام مالک اور حضرت امام اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام شعبہ نے ایک بار ان کی طرف نسبت کر کے حدیث بیان کی تو فرمایا حدیثی الیوب وکان
سید الفقہاء۔ ابو یحمر کہتے ہیں کہ ایک بار آپ حج کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں رفقا سفر کو
پیاس کی سختیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت الیوب نے فرمایا کہ دوستو! کسی سے نہ کہنا، وعدہ کرو
سب نے ہاں کی۔ ہاتھ سے زمین پر گول دائرہ بنایا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے دیکھتی آنکھوں
پانی کا چشمہ رُل پڑا۔ خوب پیا، جانوروں کو سیراب کیا۔ بعد ازیں حضرت الیوب نے اس پر ہاتھ بھر
دیازمین ہموار ہو گئی اور پانی ختم ہو گیا۔ ابو الریح کہتے ہیں کہ میں نے ابو یحمر کی زبانی یہ واقعہ سنی

سنا تھا۔ بصرہ آیا تو حماد بن زید سے بیان کیا۔ حماد کہتے ہیں کہ میرے لیے عبدالواحد بن زیاد نے یہی اس طرح بیان کیا ہے۔

حافظ ابن المدینی فرماتے ہیں کہ حدیث کے ذخیرے میں ان کی آٹھ سو حدیثیں ہیں۔ حافظ ابوالبرکات لکھتے ہیں کہ امام حماد بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے حج کا ارادہ کیا حج کی خاطر رخصت ہونے لیے امام ایوب کے پاس گیا۔ آپ نے مجھے بتایا کہ معلوم ہوا ہے کہ امام اعظم بھی حج کو جاسے تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان سے میرا سلام کہنا۔

علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں لکھا ہے کہ امام ایوب کی علمی جلالت، امام حافظہ، ثقاہت، علمی مہبتات، فہم و فراست اور سیاحت پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ امام نے ان سے جو حدیثیں سنی ہیں وہ قاضی ابویوسف نے کتاب الآثار میں اور اصحاب مسانید میں حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ ابوعبداللہ الحسین نے درج کی ہیں۔ مثلاً

ابو حنیفۃ عن ابی بکر ایوب البصری ان امرأۃ ثابت بن قیس بن شماس اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت لا یجعی و ثابتاً سقف ابداً فقالت اختلفین منہ یحد یقتہا التي اصعد قلک قالت اجل و زیادة قال صلی اللہ علیہ وسلم اما لزیادة فلا و اشار الی ثابت ففعل۔^۳

امام ایوب کا تذکرہ امام حاکم نے ان ائمہ حدیث میں کیا ہے جن پر حدیث کے معاملے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

مجھے تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی علمی طلبگاری کے وقت ان شہروں کی رونق کا کیا حال تھا۔

امام ایوب کے علاوہ بصرہ کے جن محدثین سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان نام یہ ہیں بہز بن حکیم، یحییٰ بن عبداللہ المزنی، عطاء بن عجلان، قتادہ بن دعامہ، مبارک بن فہ

۱۔ الانتقار۔ ۲۔ الانتقار ص ۱۲۵۔ ۳۔ کتاب الآثار

۴۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۹۲۔

یزید بن ابی یزید، محمد بن الزبیر، شداد بن عبد الرحمن، ابوسفیان طریف بن سفیان، نصر بن سعد، یزید بن ابی حبیب۔

حدیث میں امام اعظمؒ کا نمایاں مقام

امام اعظمؒ کی علمی رحلتوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ امام موصوف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی شینقتگی اور آپؐ کی حدیثوں کے فراہم کرنے میں محنت اور جانفشانی اس وقت کی جبکہ ابھی تدوین حدیث یعنی تاریخِ سنت کی صبح صادق ہی ہوئی تھی اور اس کے لیے کوفہ، کوفہ سے باہر جو تک و دو کی ہے اس کا اندازہ امام صاحب کے اساتذہ سے ہو سکتا ہے۔ امام اعظمؒ کوفہ سے باہر تلاش حدیث کے لیے اس وقت تشریف لے گئے جبکہ پہلے اپنے گھر کی تمام حدیثیں سمیٹ چکے تھے اور کوفہ میں پھیلا ہوا سارا علمی سرمایہ آپؐ کی ذات گرامی میں جمع ہو چکا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن القیم الجوزی نے مشہور محدث یحییٰ بن آدم کے حوالے سے لکھا ہے۔

كان فنان قد جمع حديث بلده كله،

اور علمی سفروں سے فراغت کے بعد بھی بائیں وسعتِ نظر ہمیشہ اس بات کے متلاشی رہتے تھے کہ کوفہ میں کوئی نامور محدث آئے تو اس کی محدثانہ معلومات سے اپنے علم میں اضافہ کریں۔ چنانچہ مشہور محدث امام النضر بن محمد مروزی جو امام عبد اللہ بن المبارک کے گھر سے دوست ہیں فرماتے ہیں :

لے ان کا پورا نام نضر بن محمد کنیت ابو عبد اللہ ہے مرد کے ہمنے والے ہیں ابواسحاق اشیبانی عبد العزیز بن رفیع العلّاء بن المسیب، محمد بن المنکدر، امام عکرم، امام مسعر بن کدام، ابو حنیفہ، یزید بن ابی زیاد اور ابی جناب الکلبی کے شاگرد ہیں اور مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ، حسان بن موسیٰ اور علی بن الحسن کے استاد ہیں۔ محمد بن سعد کہتے ہیں کہ نضر بن محمد علم، فقہ، عقل اور فضل میں پیش پیش تھے۔ امام عبد اللہ بن المبارک کے گھر سے دوست تھے امام نسائی اور دارقطنی نے ان کی ثقافت کو مانا ہے افسوس ہے کہ ایسے بلند پایہ حافظِ حدیث اور امام وقت بھی اہل ظاہر کے حملوں سے نہ بچ سکے اور بعض محدثین نے محض اختلافِ خیال کی بنا پر ان پر جرح کر ڈالی۔ ان کی تاریخ وفات ۱۸۳ھ ہے۔ تقریباً تہذیب اور الجواہر المصنیۃ میں ان کا ترجمہ ہے۔

لما در جلد الزم للاثر من ابی حنیفۃ قدم علینا یحییٰ
بن سعید و ہشام بن عروہ و سعید بن ابی عروہ
فقال لنا ابو حنیفۃ انظروا اتجدون عند
ہؤلاء شیئا نسمن

میں نے امام ابو حنیفہ سے زیادہ حدیث سے وابستہ کوئی نہیں دیکھا
ہے۔ ایک بار کوفہ میں یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور سعید
بن عروہ تشریف لائے تو ہم سے امام صاحب نے فرمایا دیکھو
ان حضرات کے پاس کوئی حدیث ایسی ہے جو ہم سنیں

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگرچہ مستقل طور پر آپ تکمیل حدیث بصرہ، مدینہ
اور کوفہ کے اساتذہ سے کرچکے تھے اور تکمیل کے بعد مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے
تھے لیکن گاہ گاہ دوسرے شیوخ حدیث بھی سے استفادہ اس خیال سے کرتے تھے کہ
ممکن ہے ان کے علمی سرمایہ میں کوئی چیز ایسی ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ امام النضر بن محم
جو نام بتاتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی یہ تلاش و جستجو ان اساتذہ فن حدیث
تک ہوتی تھی جو فن روایت اور جمع حدیث میں ممالک اسلامیہ کے اندر شہرت علمی کے مد
طے کرچکے تھے۔ اس کا صحیح اندازہ حافظ عبد العزیز بن ابی رزمہ کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے
جو حافظ حارثی نے داود بن ابی العوام کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

لہ الجواب لمضیۃ للحافظ عبد القادر القرشی ج ۲ ص ۸۲۔ اور امام ابو محمد عبد اللہ حارثی بخاری ہے فقہ کی تحصیل
آپ نے امام ابو حفص صغیر سے کی تھی اور انہوں نے اپنے والد ماجد امام ابو حفص کبیر سے جو امام محمد کے شاگرد
علم حدیث کے لیے آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا تھا اور بہت سے شیوخ سے آ
فن کی تحصیل کی تھی حافظ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ خراسان، عراق اور حجاز گئے اور اساتذہ
علم حاصل کیا۔ حافظ خلیلی فرماتے ہیں کہ اساذ کے لقب سے مشہور ہیں اور علم حدیث میں معرفت کے ماک
ہیں۔ سمعانی نے مکثر من الحدیث لکھا ہے۔ حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں ان کا ذکر
نقصوں میں کیا ہے ماورالنہر کے عالم، محدث امام، علامہ ابو محمد عبد اللہ جو الاساذ کے لقب سے مشہور ہیں
ان کی تاریخ وفات ۳۴۷ھ ہے۔

عبدالغزیز بن ابی رزمہ نے ایک بار امام ابو حنیفہ کے علم کا تذکرہ چھڑا
اور اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا کہ ایک بار کوفہ میں محدث آئے تو امام
ابو حنیفہ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے دیکھو تو ان کے پاس حدیث
میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے عبدالغزیز فرماتے
ہیں دوبارہ ایک اور محدث ہمارے پاس آئے آپ نے پھر اپنے
اصحاب سے یہی فرمایا۔ لے

حافظ ابن ابی العوام قاضی مصر نے امام ابو یوسف کے حوالہ سے امام اعظم کی دستوریہ کا ضابطہ
بتایا ہے کہ :

امام اعظم کے سامنے جب کوئی بھی مسئلہ درپیش آتا تو اپنے اصحاب سے
سب سے پہلے یہ فرماتے تھا تو اس موضوع پر احادیث و آثار کیا کہتی ہیں لے
ان تصریحات سے ایک معمولی فہم کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ امام اعظم نہ صرف حدیث
لے دافر سرمایہ اور تاریخ السنۃ کے عظیم الشان ذخیرے کے مالک تھے بلکہ تمام اجتہاد پر فائز
و نہ اور باوجود تمام علمی پہنائیوں کے آپ ارشادات کے جو یا بہتے تھے اور اپنے اصحاب
و ہر نوادر و محدث کے علوم سے خوشہ چینی کی ہدایت فرماتے تھے اور اس دعوے کے
ساتھ فرماتے کہ دیکھو شاید ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ اس سے
س طلب و جستجو کا اندازہ کہہ سکتے ہیں۔ جو قدرت کی سبحانشتوں نے امام صاحب میں ولایت
رہائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی کو اپنے زمانے میں ان تمام احادیث کے لیے
جن کا تعلق احکام و فقہ اور اجتہاد ہے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ مشہور مؤرخ خطیب
بغدادی حافظ اسرائیل بن یونس کے حوالہ سے رقمطراز ہیں :

لخص الرجل لغمان ما كان احفظ لكل حديث

فیہ فقہ کلیہ

گویا وقت کے حفاظ حدیث اس معاملے میں امام اعظم کے علمی جلال کا لوہا مانتے تھے اور
صرف اسرائیل بن یونس ہی نہیں بلکہ یگانے اور بیگانے امام صاحب کے بارے میں یہی

لے صدر الائمہ مکی ج ۱ ص ۸۳۔ لے تازیہ ص ۱۵۲۔ لے تاریخ بغداد ترجمہ امام اعظم

تاثر رکھتے تھے حافظ محمد بن یوسف الصالحی شافعی مؤلف السیرۃ الکبریٰ اپنی مشہور کتاب عقود الجمان میں رقمطراز ہیں :

امام ابو حنیفہ کبار حفاظ اور ناموروں میں سے تھے اگر آپ کی علمی توجہ کا مرکز حدیث نہ ہوتی تو مسابلی فقہیہ کا استنباط ہی ممکن نہ تھا بلکہ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ آئندہ ادراک میں یہ بات آپ کے سامنے کھل کر آئے گی۔

مجہول اور ضعیف راویوں کی روایت

شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ امام اعظم نے جن سے روایات لی ہیں ان میں کچھ مجہول ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کی بعد میں آنے والے محدثین نے تضعیف کی ہے اسے بنیاد بنا کر کہنے والوں نے مختلف باتیں بنائی ہیں۔

آج سے بہت پہلے شعبی حلقوں کی جانب سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ چونکہ امام اعظم ضعیف راویوں سے روایت کرتے ہیں اس لیے ان کی ذات گرامی حدیث و روایت کے بازار میں کوئی معیاری حیثیت کی مالک نہیں ہے اور یہ امام موصوف کی قلت حدیث کی دلیل ہے۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں :

اما لحدیث فلانہ کان یروی عن المضعفین وما ذلک الا لقلۃ علمہ بالحدیثؒ

چونکہ یہ دعویٰ جس بنیاد پر کیا گیا ہے وہ بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے اس لیے میں پہلے اس فریب کا دامن چاک کر کے ناظرین کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ راویوں کی تضعیف و توثیق ایک اجتہادی چیز ہے۔ ایک شخص ایک کی رائے میں ضعیف ہے اور دوسری دوسرے کے خیال میں ثقہ ہے۔ اسی بنا پر حافظ بخاری نے حافظ ذہبی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے۔

اس فن کے علماء میں دو کا کبھی کسی ایک ضعیف کے ثقہ ہونے پر یا ایک ثقہ کے ضعیف ہونے پر اتفاق نہیں ہوا ہے۔ؒ

بہاوی النظر یہ ایک مبالغہ آمیز دعویٰ ہے لیکن دو سے عدد مراد نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ
 ب کا اتفاق مشکل ہے اور یہ ایسا ہے جیسے ہم اردو میں بولتے ہیں کہ اس مسئلہ پر کبھی دو رائے
 میں ہوتی ہیں۔ یہاں دو سے عدد مراد نہیں اختلاف کی نفی ہے۔ تضعیف و توثیق کے اجتہادی
 نے کی وجہ سے حافظ ذہبی نے اس فن میں لب کشائی کرنے والوں کی ایک سے زیادہ
 میں قرار دی ہیں۔ فرماتے ہیں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو تخریج میں تشدد ہیں مگر توثیق
 معتدل ہیں۔ ایک دو غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں یہ لوگ جب کسی شخص کی توثیق کریں تو
 سے دانتوں سے دبالینا چاہیے اور اگر کسی کی تضعیف کریں تو دیکھنا چاہیے کہ اس معاملہ میں
 ناکا کوئی ہمنوا ہے اگر ہے اور اہل فن میں سے کسی نے اس کی توثیق نہ کی ہو تو یہ راوی بہر حال
 بے فائدہ ہے اور اگر کسی نے توثیق کی ہے تو پھر ایسے شخص کے بارے میں جرح مبہم ہرگز قبول
 لی جلتے لیے اور اسی بنا پر حافظ سخاوی نے امام نسائی کا یہ زریں فیصلہ نقل کیا ہے۔

لا یترک حدیث الرجل حتی یجتمع الجميع علی ترکہ۔^۱

بتنا یہ چاہتا ہوں کہ تضعیف و توثیق اگر مخصوص نہیں بلکہ اجتہادی ہیں تو اس میں اختلاف
 سے کی گنجائش ہے اور جب امام اعظم کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ آپ فن جرح و
 دلیل کے امام ہیں جیسا کہ آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے۔ تو یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا
 ہے کہ امام اعظم کا علم حدیث میں پایہ اس لیے کم ہے کہ ان کی روایت کردہ حدیثوں میں کچھ راوی
 بے فائدہ بھی ہیں۔ یہ تو فکر و نظر کا اختلاف ہے ایک شخص ایک محدث کی نظر میں اگر ضعیف
 تو ضروری نہیں ہے کہ وہ سب کی نظر میں ضعیف ہو۔ یہ رجال کا سارا دفتر موجود ہے۔ اسے
 لکھا لیے اور دیکھ لیجئے کہ راویوں کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کیسے کیسے مختلف خیال
 رکھتے ہیں۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں کہ :

امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ روایت مجہول قابل پذیرائی ہے اور
 یہ صرف امام اعظم کا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے اکابر کما بین مسلک
 ہے۔^۲

علم اسناد و روایت میں مجہول کا مسئلہ

مجہول کا مسئلہ علم اسناد و روایت کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے اس لیے ہم اس کے بارے میں اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کی خاطر ذرا سی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ مجہول کی تعریف خطیب بغدادی نے یہ کی ہے کہ:

محدثین کی زبان میں مجہول وہ شخص ہے جو علمی طلبگاریوں میں کوئی شہرت نہ رکھتا ہو، جس سے اہل علم و شناس نہ ہوں اور اس کی حدیث صرف ایک آدمہ راوی کی وساطت سے آئی ہو۔ اگر ایک کی جگہ اس سے روایت کرنے والے دو ہوں تو جہالت تو ختم ہو جائے گی مگر عدالت ثابت نہ ہوگی یہ۔

حافظ ابن الصلاح نے خطیب کی اس تعریف پر اعتراض کیا ہے کہ اگر مجہول وہی ہے جس سے روایت کرنے والا ایک آدمہ راوی ہو تو پھر صحیح بخاری میں ایک سے زیادہ ایسی حدیثیں ہیں جن کا راوی ایک کے سوا کوئی نہیں ہے مثلاً مرد اس اسلمی کہ ان سے قیس بن حازم کے سوا کوئی اور راوی نہیں ہے۔ مسلم میں بھی ایسی بے شمار حدیثیں ہیں کہ ایک کے علاوہ ان کا راوی کوئی نہیں صحیحین کے مؤلفین کا یہ طرز عمل بتا رہا ہے کہ اگر ایک بھی روایت کنندہ ہو تو مجہول مجہول نہیں رہتا۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے خطیب کی تعریف پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محدثین نے راوی کی ذات اور اس کی عدالت کے بارے میں نہ علم کی شرط لگائی اور نہ وہ یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ عدالت کو بتانے والوں کی تعداد درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہو۔ اگر وہ ایسی کوئی شرط لگاتے تو دلائل ان کا قطعاً ساتھ نہ دیتے اور یہ شرط بے دلیل ہوتی۔ کیونکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے اور طبقات میں علمی مقدمات کی شرطیں بے سود اور بے محل ہیں۔ قوتِ دلیل کی روح تو یہی ہے کہ اگر اس سے ایک بھی روایت کرے اور وہ اس کی توثیق کرے تو راوی سے جہالت کا دھبہ ہٹ جائے گا اور یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ خطیب نے مجہول کی تعریف میں دو چیزیں بلا دلیل اضافہ کر دی ہیں۔ ایک مجہول کی طلب علم میں شہرت اور دوسرے اہل علم میں سے دو کا اس سے روایت کرنا حافظ جلال الدین السیوطی نے خطیب اور ابن الصلاح کے اختلاف کا تذکرہ

کر کے خطیب کی ہم نوائی کی ہے اور ابن الصلاح کی بات کو یہ کہہ کر بے وقار کر دیا ہے کہ جن حضرات کو ابن الصلاح نے مثلاً پیش کیا ہے وہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت اتفاقی ہے۔ علامہ نووی بھی سیوطی کے ہم زبان ہیں۔ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ سیوطی اور نووی نے جس تار پر انگلی رکھی ہے یعنی یہ کہ یہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت مسلم ہے۔ یہ خود ایک مستقل مسئلہ ہے کہ کیا صحبت کے ثبوت کے لیے صرف ایک کاروائیت کرنا کافی ہے یا اس کے لیے ضروری ہے کہ روایت کرنے والے دو ہوں۔ اس سے ہٹ کر پھر بھی بات اپنی جگہ رہتی ہے یعنی اگر غیر صحابی سے روایت کرنے والا ایک ہو تو پھر بھی راوی معروف ہے یا مجہول۔ صحیح بخاری میں خود غیر صحابہ کی ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن سے روایت کرنے والے ایک ہیں۔

اگر خطیب ہی کی بات صحیح ہو تو پھر بھی بخاری و مسلم جیسی شخصیتیں بھی اس سے محفوظ نہیں حافظ عسقلانی نے اصل اعتراض کی طرف توجہ نہیں فرماتی صرف عراقی کی مثالوں کی توجہ کر کے خاموش ہو گئے۔

مجہول کی دو قسمیں

در اصل مجہول کی دو قسمیں ہیں مجہول العین اور مجہول الوصف۔
مجہول الوصف دو طرح کا ہوتا ہے۔

ایک وہ جو ظاہر و باطن میں مجہول العدالتہ ہو۔ دوسرے وہ جو باطن میں مجہول اور ظاہر میں معروف ہو۔ ان میں ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔

حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں — مجہول محدثین کے یہاں چند قسموں پر منقسم ہے۔

مجہول العدالتہ ظاہر و باطناً۔ اس کی روایت جمہور محدثین کے نزدیک ناقابل قبول ہے دوسرا وہ جو باطن میں مجہول العدالتہ ہو مگر ظاہر میں معروف ہو اسی کا نام محدثین کی زبان میں مستور ہے۔ اس کی روایت قابل قبول ہے۔ امام سلیم رازی کی بھی یہی رائے ہے اور حدیث کے مشہور مؤلفین کا راویوں کے بارے میں اسی رائے پر عمل بھی ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ اگر راوی ظاہراً و باطناً مجہول العدالتہ ہو تو جمہور کے نزدیک اس کی روایت ناقابل قبول ہے مگر محدثین ہی کی ایک جماعت اسے قبول کر لیتی ہے۔ روایت مستور کچھ محدثین کے یہاں قابل قبول ہے۔ ابن الصلاح نے اسی کو اپنا ہے اسے اور نووی نے شرح المہذب میں اسی کی تصحیح کی ہے۔

جمال الدین رسنوی فرماتے ہیں جب کسی شخص کے بارے میں بلوغ اور اسلام کا علم ہو جائے اور اس کی عدالت کا پتہ نہ ہو تو اس کی روایت قابل اعتماد نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی فرماتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کا فیصلہ ہے کہ ایسے شخص کی روایت قابل پذیرائی ہے لیکن ضروری ہے کہ وہ اپنے فسو میں معروف نہ ہو کیونکہ معروف الفسق بالاجماع مردود ہے۔

ابن السبکی نے جمع الجوامع میں لکھا ہے کہ مستور کی روایت امام ابو حنیفہ کے نزدیک قابل قبول ہے اور دوسرے محدثین کا خیال اس کے برعکس ہے۔

صاحب فوائج الرحموت فرماتے ہیں کہ مستور کی روایت جمہور کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے لیکن امام ابو حنیفہ نے غیر ظاہر روایت میں اس کو قبول کیا ہے یہی ابن خلدان کا مختار ہے۔

اختلاف عصر و زمان

اگرچہ ہماری رائے میں یہ مسئلہ اختلاف عصر و زمان سے تعلق رکھتا ہے جن کے زمانے میں مسئلہ میں عدالت غالب ہے وہ مستور کی روایت کو قبول کرتے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے امام اعظم کے دور کے بارے میں لکھا ہے :

ولا شك ان الغالب على حملة العلم النبوي في ذلك الزمان
العدالة۔

اسی لیے موصوف نے العواصم، اروض الباسم اور تنقيح الانظار میں اور امجد بن اسماعیل بیانی نے توضيح الافكار میں اسے پوری وساحت اور دلائل سے ثابت کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس مسئلہ کی اساس یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں عدل اصل ہے یا فسق؟ اور اگر عدل ہی اصل ہے تو پھر عدالت کیا ہے؟ حافظ ابن تیمیہ نے عدالت کو بھی اختلاف عصر و زمان کا مسئلہ قرار دیا ہے جیسا کہ الجزائری نے ان سے نقل کیا ہے ان کا پہلا فقرہ ہی یہ ہے۔

العدل في كل زمان ومكان وقوم بحسبه

الغرض یہ موضوع بڑا طویل الذیل ہے کچھ ہوائی بات اتفاقی ہے کہ راوی کے لیے عدالت شرط ہے اور کفر مانع روایت ہے۔ کلام صرف اس میں ہے کہ جن کی عدالت کا علم نہ ہو اس پر فیصلہ کن بات یہی ہے کہ اگر راوی اس دور سے تعلق رکھتا ہو جس میں عدالت غالب ہو تو اس

کی روایت قابلِ اعتماد ہوگی۔ فخر الاسلام لکھتے ہیں:

لأن العدالة اصل في ذالك الزمان

امام اعظم کا زمانہ عدالت کا زمانہ ہے حافظ محمد بن ابراہیم وزیر فرماتے ہیں:
یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ زمانہ امام اعظم میں راویوں پر عدالت
غالب تھی اور اس کی شہادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اس ارشاد سے ملتی ہے خیر القرون قر فی شہ الذین
یلونہم شہ الذین یلونہم

امام اعظم کی ضعف سے روایت ان کی تعدیل ہے

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام احمد کو اگر کسی مسئلہ پر حدیث صحیح نہ ملتی تھی تو ضعیف ہی پر عمل کرتے
تھے اور اپنے مسند میں بھی اس قسم کی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ امام موصوف کا یہ طرز عمل حدیث
سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ غایت احتیاط کی وجہ سے ہے۔ حافظ ابن منذر فرماتے ہیں کہ
امام ابو داؤد کو جب کسی موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ملتی تو ضعیف راویوں سے روایت لیتے ہیں
(الروض الباسم) ان محدثین کا یہ طرز عمل اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ضعیف راویوں سے
روایت لینا علم حدیث سے ناواقف ہونے کی نہیں بلکہ فن کار ہونے کی علامت ہے۔ جس
حدیث کو یہ اکابر روایت کرتے ہیں اور جن کے راویوں کو ضعیف کہا جاتا ہے۔ یہ راوی کذاب
اور فاسق نہیں ہیں اور نہ ان کی روایات کا درجہ باطل، موضوع، ساقط اور متروک کا ہے۔
ضعیف وہ کہلاتی ہے جس کا راوی صادق ہو مگر حافظہ اور ضبط کا دولت سے مالا مال نہ ہو
یا روایت کے رفع میں یا اسناد میں اضطراب ہو۔ یہی وہ حدیث ہے جس کے بارے میں
علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ اس میں ضعیف کا مدار راوی کا حافظہ ہے اس لیے امام اعظم کا
ضعف سے روایت لینا فن نا آشنا فی نہیں بلکہ فن کار ہونے کی دلیل ہے۔

بات آئندہ اوراق میں تفصیل سے آئے گی کہ امام اعظم صرف فقہ و حدیث کے امام نہیں
بلکہ امام الجرح والتعدیل بھی ہیں اس لیے جن راویوں سے امام اعظم روایت کرتے ہیں۔ یہ ان

راویوں کی تبدیلی ہے بعد میں آنے والے لوگوں نے اگر امام موصوف سے اپنے علم کی بنا پر ان راویوں کے بارے میں جرح کر کے اختلاف کیا ہے تو یہ ایسی کوئی وزنی بات نہیں ہے جس کو حدیث ناواقفیت کی بنیاد قرار دیا جاتے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے اسے ذرا کھول کر سمجھایا ہے۔

جن راویوں سے امام اعظم نے روایات لی ہیں اور ان میں سے جن کی تضعیف کی گئی ہے ان کا ضعف اختلافی ہے اور ان کے بارے میں امام اعظم کا مسلک یہ ہے کہ یہ ضعیف نہیں ہیں اس لیے ان سے روایت میں کوئی قباحہ نہیں اور اس معاملے میں امام اعظم منفرد نہیں ہیں دوسرے محدثین کا بھی طرز عمل کچھ ایسا ہی ہے اور تو اور امام بخاری اور مسلم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ امام احمد کی حدیث میں جلالتِ شان کے کون واقف نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ضعیف راویوں سے حدیثیں روایت کرتے ہیں بلکہ

بلکہ خود امام بخاری بھی ایسے حضرات سے روایت کرتے ہیں جن کی توثیق و تضعیف خود ائمہ کے نزدیک اختلافی ہے۔ حسن بن علی رحمہ کے حوالہ سے صحیح بخاری کی کتاب المناقب میں حدیث موجود ہے حالانکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ:

اطبقوا علی ترکہ۔^۱

ایک اور راوی اسید بن الجمال ہیں۔ ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں ایک حدیث روایت کی ہے مگر ان کا حال یہ ہے کہ نسائی متروک کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معین نے ان پر تھوٹی بنانے کی تہمت لگائی ہے۔ حافظ ابن حبان کا دعویٰ ہے کہ یہ نہ صرف مناکیر لاتا ہے بلکہ اہل کی چوری بھی کرتا ہے حتیٰ کہ مقدمہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے صاف لکھ دیا ہے کہ:

لہذا لا حد توثیقاً۔^۲

اور امام مسلم اپنی صحیح میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے حدیث لاتے ہیں۔ بنیاد پر کیا کوئی عقل مند امام بخاری اور امام مسلم کو علم حدیث سے بے بہرہ اور نا آشنا فتنہ ہے؟ نہیں بے گنہ نہیں بے گنہ نہیں۔ انصاف۔ انصاف۔

۱۔ اروض الباسم ج ۱ ص ۱۶۲۔ ۲۔ مقدمۃ فتح الباری۔ ۳۔ مقدمۃ فتح الباری۔

ذرا معاملے کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ امام اعظم کے یہاں قرآن کے بعد اصل چیز سنت ہے
سائل کے اثبات کے لیے وہ سنت ہی کو استعمال کرتے ہیں اور سنت ہی کو وہ احادیث کی
ت کا معیار قرار دیتے ہیں اور جو حدیث سنت کے خلاف ہو اسے وہ شاذ قرار دیتے ہیں۔
بہ امام ابو یوسف ایک مقام پر اس معیار کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں :

احادیث میں بہتات ہو رہی ہے اور ایسی روایات نمایاں ہو رہی
ہیں جو نہ معروف ہیں نہ ان کو فقہاء جانتے ہیں اور نہ وہ قرآن و
سنت کے موافق ہیں اس لیے ایسی شاذ روایات سے بچ کر رہو
اور ان حدیثوں کو اپنا و جن کی پشت پر جماعتی عمل کی تائید ہو جو فقہاء
کے یہاں معروف ہوں اور جو کتاب و سنت کے موافق ہوں لیے

روایات کا درجہ شواہد اور توابع کا ہے

اگر ایک مسئلہ امام اعظم کے یہاں سنت سے اس دور میں ثابت ہے جبکہ امام ذہبی کی تصریح کے
ت السنن مشہورۃ و البدع مکسوبۃ۔ سنتیں معاشرے میں عام ہیں تو پھر ان
یت کی حیثیت امام اعظم کے یہاں صرف توابع اور شواہد کی ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری
نے ہیں :

امام اعظم نے ضعیف سے جو روایات لی ہیں ان کا درجہ شواہد اور منہات
کا ہے ورنہ نفس مسئلہ تو قرآنی عموم، سنت یا قیاس سے ثابت ہے
ثابت شدہ مسائل کے لیے ان روایات کو بطور شواہد پیش فرمایا
ہے۔ یہی طرز عمل امام مالک کا بھی ہے۔ چنانچہ امام موصوف نے
عبد الکریم بن ابی المنہار ق البصری کی روایت سے استدلال کیا ہے۔
حافظ ابن عبد البر متہید میں رقمطراز ہیں کہ عبد الکریم کا مجروح ہونا اتفاقی
ہے۔ ایسے ہی امام شعبہ نے باوجود جلالت قدر کے ابان بن ابی
عیاش سے روایت لی ہے حالانکہ موصوف نے خود ابان کی پوزیشن

یہ بیان کی ہے کہ ابان کی روایت کے مقابلے میں مجھے گدھے کا پیشاب
 پی لینا گوارا ہے۔ امام سفیان ثوری نے بعض لوگوں کے ہاں سے یہ
 فیصلہ کیا تھا کہ ان سے روایت نہ لی جاتے اور جب ان سے پوچھا گیا
 کہ آپ تو ان سے روایت لیتے ہیں۔ فرمایا میں ان ہی احادیث کی
 ان سے روایت کرتا ہوں جن سے میں خود واقف ہوں۔ امام مسلم
 کی صحیح کو اٹھا کر دیکھتے وہ گاہ گاہ علو اسناد کی خاطر صحیح سند کو
 چھوڑ کر ضعیف سند سے روایت لیتے ہیں۔ یہ اس بات کا کھلا
 ثبوت ہے کہ علم حدیث کے فن کاروں کا ضعف اسے روایت لینا
 نا آشنا تھے فن ہونے کی منہیں بلکہ امام فن ہونے کی علامت ہے یہ
 مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس بنیاد پر امام اعظم کو نا آشنا تھے فن قرار دیتے ہیں۔ وہ خود علم حدیث
 کی گہرائیوں سے نا آشنا ہیں اگر ان کو فنی واقفیت ہوتی تو ان کی زبان قلم پر ایسی غیر ذمہ دارانہ
 بات ہرگز نہ آتی۔ یہاں بھی حافظ محمد بن ابراہیم وزیر پتے کی بات فرما گئے ہیں :
 امام اعظم اس فن کے مشہور حفاظ میں سے تھے۔ صرف اتنی بات ہے
 کہ عمر رسیدہ ہونے کے بعد آپ کے حافظہ میں پہلے جیسی قوت نہ
 تھی اور آخر عمر میں حافظہ میں قوت نہ رہنا صرف امام اعظم کی خصوصیت
 نہیں ہے اس میں دوسرے ائمہ بھی امام اعظم کے سر یک ہیں۔ یہ
 نہ کوئی عجیب ہے اور نہ ان کی شان اجتہاد اور محدثانہ مقام پر
 کوئی حرف ہے۔ امام الحسن البصری، ابو قتادہ، ابو العالیہ اور امام
 عطاء کے مقابلے میں سعید بن المسیب، محمد بن سیرین اور ابراہیم نخعی
 کی حدیثیں زیادہ صحیح ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے
 سوا اوروں کا علم محدث ہے امام اعظم کی احادیث پر جن محدثین
 نے کلام کیا ہے اس کا منشا بھی قوت حفظ ہے۔ نادان سمجھتے ہیں
 کہ یہ ان کے علم حدیث اور اجتہاد پر حرف گیری ہے۔ زیادہ سے زیادہ

یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مقابلے میں فلاں کا حافظہ تیز ہے لے
لیکن صرف حافظہ کی قوت نہ سرمایہ فضیلت ہے اور نہ علمی تفوق و
برتری کی نشانی ہے آخر صحابہ میں ابو ہریرہ سے زیادہ حافظہ، حدیث
کون ہو گا لیکن صحابہ میں علم، افتخار اور افضل حضرت ابو ہریرہ نہ تھے لے
حافظہ پر حافظ ابن القیم نے الوابل الصیب میں ایک مفید اور کارآمد نصیحت لکھی ہے
فرماتے ہیں:

حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ کا باہم فتاویٰ میں کیا مقابلہ
— حضرت ابو ہریرہ بے شک حافظ حدیث ہیں اور تمام امت
میں علی الاطلاق حافظ ہیں حدیث کو جیسے سنا بیان کر دیا۔ ان کی
ساری تنگ و دو کا مرکز صرف حفظ روایات تھا۔ برخلاف حضرت
ابن عباس کے کہ ان کی تمام تر ہمت تفقہ اور استنباط مسائل پر
مرکز تھی لے

اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس جبر الامۃ اور ترجمان ہیں مگر ان کی ساری ان
حدیثوں کی تعداد جن میں دید و شنید کی تصریح ہے شاید بیس سے زیادہ نہ ہو لیکن حدیث و
قرآن سے ان کے فقہ و استنباط کا حال یہ ہے کہ ان کے علم و فقہ سے دنیا بھر لوہے۔ حافظ
ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے۔

لے واضح ہے کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کے اس فکر کی بنیاد کہ عمر رسیدہ ہونے پر حافظہ میں پہلے جیسی
قوت نہ رہی تھی اس پر ہے کہ موصوف کی تحقیق میں امام اعظم نے نوے سال سے زیادہ عمر پائی ہے
چنانچہ لکھتے ہیں وقد جاوز السبعین فی العمر، شاید حافظ صاحب موصوف امام اعظم کی ولادت ابن زود کی روایت
کے مطابق ۱۷۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ انساب میں ۱۷۰ھ لکھا ہے۔ ابن حبان کی کتاب المجرع والتعديل
اور ابوالقاسم سمّانی کے روضۃ الصفاء میں بھی یہی تاریخ ولادت ہے بلاشبہ ولادت اگر ۱۷۰ھ اور
وفات ۱۷۰ھ ہے تو عمر نوے سال ہوتی ہے۔ بعض محدثین کے نزدیک راجح یہی ہے۔

لے الروض الباسم ج ۱ ص ۱۶۹۔

لے الوابل الصیب ص ۲۸۔

جمعت فتاواہ فی سبعة اسفار کبار

حالانکہ جس طرح اور لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا حضرت ابن عباس نے بھی سنا یہاں الجزائری نے جو امام ترمذی سے اسی موضوع پر نقل کیا ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے فرماتے ہیں :

کچھ محدثین نے اجتہاد اہل علم پر کلام کر دیا ہے اور صرف حافظہ کی بنا پر

ان کی تصنیف کی ہے اگرچہ اوروں نے ان کی جلالت شان اور صداقت

کے پیش نظر ان کی توثیق کی ہے یہ

الجزائری نے یہ نقل کرنے کے بعد جو اسی کے متعلق آخری بات بتائی ہے وہ بھی سن لیجئے :

لَمْ يَسْلَمْ مِنَ الْخَطَايَا وَالْغَلَطِ أَحَدٌ مِنَ الْأُمَّةِ مَعَ حِفْظِهِمْ يَهْ

خطا اور غلطی سے کوئی پاک نہیں

یہ واقعہ ہے کہ علم و تحقیق کے میدان میں غلطی اور خطا کے دھبے کچھ نہ کچھ سب کے دامنوں پر ہیں حافظ ذہبی نے سچ لکھا ہے :

انما لا ندعى العصمة من السهو والخطا في الاجتهاد في غير الانبياء

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ امام ابو زرہ اور امام ابو حاتم نے تاریخ و رجال کے سلسلے میں امام بخاری کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ابی حاتم نے امام بخاری کے تاریخی ادبام پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام کتاب خطا البخاری ہے۔ اس کتاب میں ابن ابی حاتم نے ان دونوں حضرات سے بیشتر استفادہ کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

جمع فيه ادھامہ فی التاريخ

علامہ سخاوی فرماتے ہیں :

لابن ابی حاتم جزء کبیر عندی انتقد فيه علی البخاری

۱۔ توجیہ النظر ۲۔ میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۔ ایسے ہی خطیب نے لکھا ہے لم یکنوا معصومین من الزلل و

۱۴ صینین مفارقة الخطا والخطا (موضع ادبام الجمع والتفريق ج ۱ ص ۱)

۱۵ التقييد والايضاح لما اطلق واغلق من مقدمة ابن الصلاح ص ۱۳۳ کے الاعلان بالتوبيخ ص ۱۱۰۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں :

قد جمع عبدالرحمن بن ابی حاتم الرازی الاوهام التي اخذ ابو
نصر عنة في كتاب مفرد له

وہ یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب بالکل نو عمری میں مرتب کی تھی جب کہ امام موصوف کی
وفات اٹھارہ سال تھی اس لیے اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے
موصوف کو ایسے نوشتوں سے نقل کرنے پڑے کہ جن پر نہ نقطے لگے ہوئے تھے۔ اور نہ
ضبط کیا گیا تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے ابوعلی صالح بن محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ :

ایک بار ابو زر عمر رازی نے ان سے فرمایا کہ اے ابوعلی! اسماء الرجال پر
محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب میری نظر سے گزری اس میں تو بڑی
غلطیاں ہیں میں نے ان سے عرض کیا مصیبت یہ ہے کہ ان کے پاس
بخارا کا جب کوئی شخص عراق سے ہو کر آتا تھا یہ اس کی کتاب لے کر
دیکھتے تھے۔ اہل بخارا کی عادت ہے کہ نہ تو وہ اسماء کو ضبط کرتے ہیں
اور نہ ان پر نقطے لگاتے ہیں۔ لہذا جب ان کی نظر سے کوئی ایسا نام گزرتا
کہ جس سے یہ پہلے واقف نہ ہوتے اور نہ وہ ان کی اپنی کتابوں میں
موجود ہوتا تو یہ اسے غلط طور پر اپنی کتاب میں نقل کر دیتے۔ ورنہ
خراسانیوں میں ان سے زیادہ سمجھدار میں نے کسی کو نہیں پایا۔

خطیب بغدادی نے موضع اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کے ان اوہام و اغلاط کا تفصیلی
رہ کیل ہے۔ اور کتاب مذکور میں ۲۱۲ صفحات اسی تذکار پر مشتمل ہیں۔ مگر نہایت افسوس ہے
امام بخاری کے بعض حامیوں نے بجائے اس کے کہ ان تنقیدات و تعصبات کا کوئی علمی اور تحقیقی جواب
دے۔ امام ابو زر عمر، امام ابو حاتم اور امام مسلم پر نہایت ہی گری ہوئی زبان میں حملے کیے اور الزامات
دئے۔ چنانچہ کہنے والے یہاں تک کہہ گئے۔

”تاریخ میں محمد بن اسماعیل کی کتاب ایسی ہے کہ اس پر کوئی کتاب سبقت
نہ لے جاسکی اور ان کے بعد جس نے بھی تاریخ یا اسماء الرجال پر کچھ

لکھا ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں ہے کچھ لوگوں نے اس کتاب کو اپنی ہی بنالیا ہے جیسے ابو زرہ، ابو حاتم اور مسلم۔ اور کچھ نے ان کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

یہ حاکم کبیر کی رائے ہے جسے علامہ تاج الدین السبکی نے الطبقات الشافعیۃ البکری میں ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ حاکم کبیر کو زیادہ غصہ امام مسلم پر ہے وہ فرماتے ہیں :
جو شخص بھی امام مسلم کی کتاب الاسماء و النکح کا غور سے مطالعہ کرے گا۔
اسے پتہ لگ جائے گا کہ امام مسلم کی کتاب بالکل امام بخاری کی کتاب کی کاپی ہے۔

لیکن یہ حاکم کبیر کی غلطی اور محض بدگمانی ہے جو ستر تا ستر واقعہ کے خلاف ہے۔ تعجب ہے کہ کچھ بزرگوں نے خود امام بخاری پر بھی یہی الزام لگایا ہے چنانچہ ان ہی حاکم کبیر کے معاصر حافظ مسلمہ بن قاسم اندلسی کتاب الصلہ میں لکھتے ہیں کہ :

امام بخاری نے اپنے استاد علی بن المدینی کی کتاب العلل کو ان کی غیر حاضری میں ان کے صاحبزادے کو مال کی طبع دے کر حاصل کیا اور پھر اسی کتاب کی عبارتوں کو اپنی طرف سے علی بن المدینی کے سامنے پیش کرتے رہے اور آخر اسی کی وجہ سے درس سے بے نیاز ہو کر خراسان کی راہ لی۔

یہ واقعہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔

فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال میں امام ابو زرہ، ابو حاتم اور امام مسلم کا جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان بزرگوں کی نسبت اس قسم کی خیانت علمی اور سرقہ کا کون گمان کر سکتا ہے غور فرمائیے تاریخ و رجال میں راویوں کے نام ان کے شیوخ و تلامذہ، اوطان، سنین و ولادت و وفات اور جرح و تعدیل کا بیان ہوتا ہے۔ اب راویوں کے نام وہی، شیوخ و تلامذہ وہی، وطن وہی، سنین و ولادت و وفات وہی اور جرح و تعدیل میں اکثر و بیشتر اتفاق رائے۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ یہ سب امور یکساں اور متحد ہیں معاصرین ائمہ فن کی تصنیفات میں اکثر و بیشتر معلومات کا ایک جیسا ہو جانا کون سے تعجب کی بات ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ ان ائمہ نے اپنی تصانیف میں امام بخاری کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھا،

ورنہ ظاہر ہے کہ اگر کتاب سامنے نہ ہوتی تو تنقید کس پر کرتے بلکہ ترتیب بھی وہی اختیار کی ہے اور اسی لیے حاکم کبیر کو شبہ ہو گیا کہ امام مسلم وغیرہ امام بخاری کی کتاب کو اپنے نام سے منسوب کر رہے ہیں چنانچہ خلیب بغدادی ان ہی حاکم کبیر سے ناقل ہیں :

مجھ سے حاکم کبیر ابو احمد محمد بن محمد نیشاپوری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اسے میں تھا کہ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ ابو محمد بن ابی حاتم کے پاس کتاب الجرح والتعديل پڑھ رہے ہیں پھر جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوتے تو میں نے ابن عبد وہب وراق سے کہا کہ یہ کیا مہنسی کر رکھی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب التاریخ کو اس کتاب کی شکل میں اپنے استاد کے سامنے پڑھ رہے ہو حالانکہ تم اسے ابو زرعمہ اور ابو حاتم کی بتاتے ہو اس پر وراق نے کہا کہ اے ابو احمد تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس وقت ابو زرعمہ اور ابو حاتم کے پاس یہ کتاب لائی گئی تو ان بزرگوں نے کہا کہ یہ علم خوب ہے اس سے بے پروائی نہیں برتی جاسکتی اور ہم لوگوں کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہم اسے دوسرے سے نقل کریں اس لیے ان دونوں حضرات نے ابو محمد عبد الرحمن رازی کو بٹھایا۔ وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک راوی کے متعلق ان سے پوچھتے گئے اور پھر یہ دونوں حضرات کہیں اس کتاب سے زیادہ اور کہیں اس سے کم بیان کرتے چلے گئے اور اسے عبد الرحمن نے ان دونوں کی طرف منسوب کر دیا۔

حاکم کبیر کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امام بخاری کی تاریخ امام ابو زرعمہ اور امام ابو حاتم کے سامنے آئی ان بزرگوں کے علمی جلال نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے وطن کا علمی معاشرہ اس فن میں باہر کا دست نہ لگ رہے۔ انہوں نے اسی ڈھنگ اور اسی اسلوب پر عبد الرحمن رازی کو ایک مستقل کتاب املاء کرائی جو معلومات کے سرمایہ میں امام بخاری کی کتاب سے زیادہ ہے۔

اسی کتاب کا نام الجرح والتعديل ہے۔ امام ذہبی رقمطراز ہیں :
 کتابہ فی الجرح والتعديل یقضى له بالمرتبۃ العلیا فی الحفظ
 بہر حال خطا اور غلطی سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے اور خطا اور غلطی سے فنِ اُثنائی پر کوئی حرف
 نہیں آتا۔

خیر یہ بات تو ضمنی تھی۔ گفتگو تو امام اعظم کے اساتذہ کے متعلق ہو رہی تھی اور درمیان میں یہ
 بات اُگتی تھی کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ :

- ۱۔ امام اعظم نے مجاہیل سے روایت کی ہے۔
 - ۲۔ امام اعظم نے ضعیف سے روایت کی ہے۔
 - ۳۔ امام اعظم کے حافظہ میں قوت نہ رہی تھی۔
- اس لیے امام اعظم کا علم حدیث میں کوئی مقام نہیں ہے ان ہی وساوس اور ہوا جس کو دور
 کرنے کی میں نے ان صفحات میں کوشش کی ہے۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظم کے مشائخ

آئیے اب امام اعظم کے مشائخ میں ان اکابر پر ایک نظر ڈال لیجئے جن کو حافظ ذہبی نے حفاظ حدیث
 میں شمار کیا ہے۔

۱۳۱ھ	طبقة رابعة	۱۔ ایوب بن ابی تمیمہ البکری السخنیانی
۱۱۵ھ	"	۲۔ المحکم بن عتیبہ ابو محمد الکوفی
۱۳۶ھ	"	۳۔ ربیعہ بن عبد الرحمن
۱۲۵ھ	"	۴۔ زید بن ابی انیسہ
۱۰۶ھ	طبقة ثالثة	۵۔ سالم بن عبد اللہ
۱۶۴ھ	طبقة خامسة	۶۔ ثیبیان بن عبد الرحمن ابو معاویہ
۱۰۶ھ	طبقة ثالثة	۷۔ طاؤس بن کيسان ابو عبد الرحمن الیمانی
۱۱۰ھ	"	۸۔ عامر الشعبي ابو عمر الہمدانی

۱۲۷ھ	طبقة رابعة	۹۔ عبد اللہ بن دینار ابو عبد الرحمن
۱۱۷ھ	طبقة ثالثة	۱۰۔ عبد الرحمن بن ہرمز
۱۳۶ھ	"	۱۱۔ عبد الملک بن عمیر
۱۱۴ھ	"	۱۲۔ عطاء بن ابی رباح
۱۱۳ھ	"	۱۳۔ عطاء بن یسار
۱۰۷ھ	"	۱۴۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس
۱۲۶ھ	طبقة رابعة	۱۵۔ عمرو بن دینار الحافظ ابو محمد
۱۲۷ھ	"	۱۶۔ عمرو بن عبد اللہ ابو اسحاق
۱۷۵ھ	طبقة خامسة	۱۷۔ القاسم بن معن بن عبد الرحمن
۱۱۷ھ	"	۱۸۔ قتادة بن دعامة
۱۶۴ھ	"	۱۹۔ مبارک بن فضالة القرشي
۱۳۰ھ	"	۲۰۔ محمد بن المنکدر ابو عبد اللہ القرشي
۱۲۸ھ	طبقة رابعة	۲۱۔ مسلم بن قدوس ابو الزبير المکی
۱۲۴ھ	"	۲۲۔ محمد بن مسلم بن شهاب الزہری
۱۳۲ھ	"	۲۳۔ منصور بن المعتمر ابو غناب الکوفی
۱۱۷ھ	طبقة ثالثة	۲۴۔ نافع مولیٰ ابن عمر ابو عبد اللہ
۱۴۶ھ	طبقة رابعة	۲۵۔ ہشام بن عروہ القرشي
۱۴۳ھ	"	۲۶۔ یحییٰ بن سعید الانصاری

یہ وہ حفاظ حدیث ہیں جن کے تراجم حافظ ذہبی نے تذکرة الحفاظ میں لکھے ہیں۔

تذکرة الحفاظ کا مقام

یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔
یہ صحابہ سے لے کر امام ذہبی کے زمانے تک کے حفاظ حدیث کا تذکرہ ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

هذه تذکرة باسعاد معدی حملة العلم النبوی ومن يرجع الی

اجتادهم فی التوثیق والتضعیف والتصحیح والتزییف۔

یہ ان حاملانِ علم نبوی کا تذکرہ ہے جن کی بارگاہِ علم سے راویانِ حدیث کو ثقاہت اور عدالت کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے اور جن کی رائے راویوں کے ثقہ ہونے، ضعیف ہونے، کھرا ہونے اور کھوٹا ہونے میں فیصلہ کن ہے۔

حافظ صاحب نے اس کتاب میں یہ اصول پیش نظر رکھا ہے اور اس کتاب میں کسی ایسے شخص کا تذکرہ نہیں کیا جس میں ان کی بیان فرمودہ حیثیت موجود نہ ہو بلکہ کم از کم درجے میں کسی ایسے شخص کا بھی ترجمہ نہیں لکھا جو عالمِ فقیہ ہونے کے باوجود حافظ نہیں ہے۔ چنانچہ خارجہ بن زید اگرچہ فقہاءِ سبعہ میں سے ہیں مگر ان کے متعلق صاف لکھ دیا۔

إِنَّهُ قَلِيلُ الْحَدِيثِ فَلِهَذَا السَّمَاذُكُرُ لَا فِي الْحِفَاطِ لَهُ

یہ قلیل الحدیث ہیں اسی لیے میں نے ان کا حفاظ میں تذکرہ نہیں کیا۔

اسی طرح امام ذہبی نے اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی تذکرہ نہیں کیا جو اگرچہ حافظِ حدیث تھے مگر بابِ حدیث کی بارگاہ میں متردک الروایت خیال کیے جاتے تھے چنانچہ ہشام بن محمد کلبی کے بارے میں جو بہت بڑے محدث اور حافظ تھے لکھتے ہیں :

هشام بن محمد الكلبی الحافظ أحد المتردكين ليس بثقة فلهمذا
لما أدخله بين حفاظ الحديث له

یہ متردک ہیں، ثقہ نہیں ہیں اسی لیے میں نے ان کو حدیث کے حفاظ میں داخل نہیں کیا۔

ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ نتائج خود بخود آجائیں گے۔

الف : امام اعظم کے تمام اساتذہ ان ائمہ حدیث میں سے ہیں جن کی حیثیت صرف محدث کی نہیں بلکہ ان معدلین کی ہے جن کی گرامی قدر رائے راویانِ حدیث کی توثیق و تضعیف میں محدثین کے یہاں میزان و معیار ہے۔

ب : یہ قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہیں۔ اگر یہ قلیل الحدیث ہوتے تو پھر امام ذہبی ان کا ذکر نہ کرتے۔

ج۔۔۔ یہ وہ حفاظ ہیں جن کا مقام علم حدیث میں اعتباری اور استدلالی ہے اگر وہ متردک ہوتے تو ہٹام کی طرح تذکرۃ الحفاظ ان کے تراجم سے خالی ہوتا۔ اور اگر ایک طرف ان تصریحات سے امام اعظم کے اس تذکرہ کے متعلق یہ ثابت ہو رہا ہے تو دوسری طرف خود امام اعظم کے بارے میں بھی یہ حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آگئے۔

امام اعظم کا حفاظ حدیث میں مقام

اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ امام اعظم کا ترجمہ تذکرۃ الحفاظ میں موجود ہے تو پھر امام ذہبی کے اصول کے مطابق امام اعظم کی ذات گرامی ارباب حدیث کے نزدیک ان محدثین روادہ کی ہے جن کی رائے پر راویوں کی ثقاہت، عدالت اور صداقت کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ عمل کی دنیا میں امام ذہبی نے اسے واقعہ بنا کر پیش کیا ہے چنانچہ فقیر مدینہ حضرت عبداللہ بن ذکوان مدنی کے متعلق تذکرہ میں جہاں سفیان ثوری نے امام احمد سے توثیق کے الفاظ نقل کیے ہیں وہاں سب سے پہلے امام اعظم کے الفاظ کو نمایاں طور پر پیش کر کے فقیر مدنی کی تعدیل کی ہے۔

قال ابو حنیفہ رایت ربیعہ وابالزناد والی نادافقہ
الرحلین -

ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ میں نے ربیعہ اور ابوالزناد دونوں کو دیکھا ہے لیکن ابوالزناد زیادہ فقیہ ہیں۔

امام جعفر الصادق کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں ہے نامی گرامی شخصیت ہیں۔ امام مالک، سفیان ثوری جیسے اساطین حدیث کے استاد ہیں۔ امام ذہبی نے جہاں ان کی توثیق بعد کے محدثین سے نقل کی ہے تو وہاں پہلے امام اعظم کی جانب سے ان کو عدالت کا سرٹیفکیٹ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

عن ابی حنیفۃ قال ما رایت افقہ من جعفر بن محمد

بالفاظ دیگر امام ذہبی نے امام اعظم کی معدلانہ حیثیت کو خود اپنے عمل سے علی رؤس الاشہاد ثابت کر دیا اور بتا دیا کہ یہ صرف فکر و نظر کا تراشا ہوا پیمانہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ اور اگر حقیقت ہے کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں غیر ثقہ اور متردکین میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا جیسا کہ

خود آپ امام ذہبی سے سن چکے ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ امام ذہبی کی میزان الاعتدال میں امام اعظمؒ
 تذکرہ الحاقی ہے جیسا کہ پہلے آپ تفصیلاً پڑھ چکے ہیں۔ اور امام ذہبی کے تذکرۃ الحفاظ میں
 التزام نے کہ قلیل الحدیث کو تذکرے میں جگہ نہ دی جائے گی یہ بات بھی صاف کر دی اور اسے
 بنادیا کہ حافظ ذہبی کے نزدیک امام اعظمؒ کی ذات گرامی قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہے
 خارجہ کی طرح جو فقہاء سب سے ہیں۔ امام اعظمؒ بھی فقیہ ہونے کے ساتھ قلیل الحدیث ہو۔
 تو ذہبی ان کا تذکرۃ الحفاظ میں ذکر نہ کرنے۔ اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ذہبی کی نگاہ
 امام اعظمؒ کی ذات گرامی محدث، حافظ، امام الحدیث، کثیر الروایت، امام تبوع، الامام انا قد عاھا
 ثبت، متفق، حجة، معتدل ہونے کے ساتھ مجتہد اور فقیہ تھے۔ اسی بنا پر حافظ محمد بن ابراہیم الو
 نے یہ کھلا اقرار کیا ہے۔

۱۔ خارجہ بن زید قلیل الحدیث ہیں یہ امام ذہبی کی رائے ہے ان کے الفاظ تذکرۃ الحفاظ میں یہ ہیں۔ ^{الفقہ}
 السبعة من كبار العلماء۔ الآلة قلیل الحدیث (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۶) ابن سعد نے طبقات میں ذہبی سے
 اختلاف کیا ہے اور ابن سعد ذہبی سے مقدم ہیں وہ فرماتے ہیں کان کثیر الحدیث (طبقات ج ۵ ص ۲۶۲) انہ
 رقمطراز ہیں کان بارعاً فی العلم (تہذیب الاسماء ص ۱۷۲) امام ذہبی کے خارجہ کو قلیل الحدیث کہنے کی وجہ یہ معلوم
 ہے کہ خارجہ نے دوسرے تابعین کی طرح روایت کا زیادہ کام نہیں کیا اس لیے وہ قلیل الروایت ہیں اور قلت رو
 کی بنا پر ان کو ذہبی نے قلیل الحدیث کہہ دیا ہے ورنہ نفس حدیث کی حد تک وہ کثیر الحدیث ہیں جیسا کہ ابن سعد کی رائے
 ہے۔ حدیث نبوت کے علم اور حدیث نبوت کی روایت میں جو ہری فرق ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ جسے ارشادات
 کا علم ہو اس حدیث کی روایت بھی ہو صحابہ میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ہیں جن سے روایت حدیث کم ہے وجہ ار
 کی یہی ہے کہ ان کو اس کا موقع ہی نہیں ملا ہے جیسا کہ ابن سعد رقمطراز ہیں انا قلت الروایت عن الکابر من صحب رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانہم لم یکنوا قبل ان یحتاج الیہم (ج ۲ ص ۳۷۶) اس لیے امام ذہبی کا یہ کہنا کہ خارجہ قلیل الحدیث
 ہیں بلحاظ روایت حدیث ہے اور ابن سعد کا یہ بتانا کہ خارجہ کثیر الحدیث بلحاظ علم حدیث ہے۔ ان دونوں باتوں میں
 کوئی تعارض نہیں ہے حافظ ابو نعیم نے ان کے قلیل الروایت ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ تفقہ لم یفردوا ثرا لغزلة
 ولم ینتشر عنہ من کلام کثیر شئی (حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۹۰) اس عزلت گزینی، افراد اور خلوت پسندی کو
 خارجہ نے ان سیاسی حالات کی بنا پر اختیار کیا جو اس وقت پوری امت اسلامیہ کو درپیش تھے تفصیل کے لیے
 طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۶۴ دیکھو۔

جلیل القدر مستیاں ہیں جو اسلامی علوم میں مرکزی حیثیت کی مالک ہیں ان مشائخ کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر قرب امام اعظم کو حاصل ہے بعد کے محدثین اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کو نہیں ہے۔ بڑے بڑے محدثین آخر عمر تک سند عالی کی جستجو میں رہے اور اس کی تلاش میں بہتوں نے سفر کی بڑی بڑی محنتیں اور قربانیاں گوارا کیں۔ حافظ ابن حزم نے ایک قابل قدر تحقیق فرمائی ہے جس میں اقوام دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کی اسنادی خصوصیت پر ایک جامع تبصرہ کر کے بتایا ہے :-

نقل و روایت کا یہ سلسلہ صرف مسلمانوں کی خصوصیت ہے اور زمانے کی ساری کردلوں کے باوجود اللہ نے مسلمانوں میں یہ سلسلہ باقی رکھا ہے کتنے اللہ کے بندے اس کی خاطر کتنی مسافرتیں طے کرتے ہیں یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے

جیسے روایت و تاریخ میں اسناد مسلمانوں کی خصوصیت ہے ایسے ہی اسناد میں اسناد عالی و ممتاز سنت ہے جس کی علماء ہمیشہ جستجو کرتے رہے ہیں کیونکہ سند جس قدر عالی ہوگی اسی قدر خطا اور علت کے شائبہ سے پاک ہوگی۔ امام ابو عبد اللہ الحاکم نے جو سب سے پہلی قسم بتائی ہے اس کا عنوان ہی معرفۃ عالی الاسناد ہے اور لکھا ہے کہ:

طلب الاسناد العالی سنة صحیحة

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ:

طلب العلوفیہ سنة

لے الفصل فی المل والنخل ج ۲ ص ۶۲۔ ابو علی الجبالی کہتے ہیں کہ اللہ نے اس اُمت کو تین خصوصیتوں سے نوازا ہے ایک اسناد و دوسرے انساب تیسرے اعراب اسناد بلاریب دین ہے اور یہ سنن میں سنت مؤکدہ ہے عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اسناد سترامرو دین ہے اگر اسناد نہ ہوتی تو اس کے منہ میں جو آنا کہہ دیتا سفیان ثوری کا کہنا ہے کہ اسناد مومن کا ہتھیار ہے سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ایک روز امام زہری نے ایک حدیث بیان کی میں کہا کہ بغیر سند کے ہے فرمایا کیا تم کو بٹھے پر بغیر سیڑھی کے چڑھنا چاہتے ہو تعلیقات علی توضیح الافکار

محمد نجی الدین عبد الحمید ج ۱ ص ۲۹۶ - لے تقریب ص ۱۸۶ -

حافظ سیوطی کہتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ
اسناد عالی کی تلاش سلف کی سنت ہے کیونکہ اصحاب ابن مسعود کوفہ سے
مدینہ جاتے تھے اور حضرت عبداللہ کی پیش فرمودہ احادیث کو حضرت عمر
سے سنتے تھے یہ

امام نووی فرماتے ہیں کہ:
اسی بنا پر اس کے لیے سفر کرنا مستحب ہے یہ
امام حاکم نے اس کے مستحب ہونے کا اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو صحیح مسلم میں بحوالہ حضرت
انس بن مالک اس طرح آئی ہے -

حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات
کی اجازت نہ تھی ہمیں یہ بات بھی بھلی معلوم ہوتی تھی کہ کوئی بیرونی
شخص آئے اور آپ سے پوچھے اور ہم سنیں۔ چنانچہ ایک روز ایک
شخص آیا اور یوں گویا ہوا -

نورود: ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا اس نے آپ کی جانب سے بتایا ہے کہ آپ کو اللہ سبحانہ
نے رسول بنایا ہے -

حضور انور: ہاں یہ ٹھیک ہے واقعی میں اللہ کا رسول ہوں -

نورود: آسمان کس نے بنایا ہے؟

حضور انور: اللہ سبحانہ نے -

نورود: اور زمین کس نے بنائی؟

حضور انور: اللہ سبحانہ نے -

نورود: آسمان و زمین اور پہاڑوں میں منافع کس نے رکھے؟

حضور انور: اللہ پاک نے -

نورود: اچھا بتائیے آپ کو اس اللہ کی قسم جس نے آسمان و زمین اور پہاڑ بنائے کیا آپ

کو اس نے رسول بنایا ہے؟

حضور انور: ہاں۔

نورود: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں؟

حضور انور: میرے قاصد نے ٹھیک بتایا ہے۔

نورود: آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا ہے؟

حضور انور: ہاں۔

نورود: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہمارے مالوں میں صدقہ ضروری ہے؟

حضور انور: ٹھیک ہے۔

نورود: آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا یہ حکم آپ کو اسی نے دیا ہے؟

حضور انور: ہاں اسی نے دیا ہے۔

نورود: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہم پر سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں؟

حضور انور: ہاں ٹھیک ہے۔

نورود: آپ کو آپ کے روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو روزہ کا اس نے حکم دیا ہے؟

حضور انور: ہاں مجھے روزے کا اسی نے حکم دیا ہے۔

نورود: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ بشرط استطاعت حج فرض ہے؟

حضور انور: ہاں ٹھیک ہے۔

نورود: آپ کو روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو اسی نے حج کا حکم دیا ہے؟

حضور انور: ہاں۔

نورود: قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق سنے کر روانہ کیا میں اس میں کمی نہ کروں

گا اور نہ زیادتی۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا حضور انور نے فرمایا کہ اگر سچا ہے تو ضرور

جنت میں جائے گا۔

امام ابو عبد اللہ الحاکم نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے یہ

فیس، دلیل علی طلب اجازۃ المرأ لعلو من الاسناد

اور استدلال کی توضیح کرتے ہوتے لکھتے ہیں کہ دیہاتی کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی زبانی فرائض اور اسلامی زندگی کا علم ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود بدوی سفر کی تکلیف برداشت کر کے بالمشافہ دریافت کرنے کے لیے خدمت گرامی میں آیا۔ اگر بدوی کا یہ عمل ناپسندیدہ ہوتا تو حضور انور اس پر ضرور گرفت فرماتے۔

حافظ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ حضرت ابویوب انصاری مدینہ سے عقبہ بن عامر کے پاس صرف ایک حدیث کی خاطر مصر تشریف لے گئے چنانچہ جب وہ مصر پہنچے۔ لوگوں نے ان کی آمد سے عقبہ بن عامر کو مطلع کیا۔ اطلاع ملنے پر فوراً باہر تشریف لاتے۔ ملے حضرت ابویوب نے فرمایا وہ حدیث سنائیے جو مسلمان کی پردہ پوشی کے بارے میں حضور انور سے سُنی ہے کیونکہ اس ارشاد کا حضور سے سننے والا میرے اور آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ حضرت عقبہ نے فرمایا ہاں میں نے حضور سے سنا ہے۔

من ستر مسلماً علی خزیۃ سترہ اللہ یوم القیامۃ

حضرت ابویوب انصاری حدیث سنتے ہی سواری پر سوار ہو گئے اور مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے اور واپسی میں اتنی جلدی کی کہ اونٹنی کا کجاوہ تک نہ کھولا۔

امام ابو عبد اللہ الحاکم بسند متصل بیان فرماتے ہیں کہ ایک خراسانی حضرت امام شعبی کے پاس آیا اور بولا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کے پاس کنیز ہو اس نے آزاد کی اور پھر اس نے نکاح کر لیا۔ امام شعبی نے فرمایا کہ ہم سے ابو بردہ نے اپنے والد کے حوالہ سے بتایا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس کنیز ہو اس نے اس کو باادب اور باسیقہ بنایا ہو اور تعلیم دی اور خوب تعلیم دی ہو۔ پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کیا ہو اسے دگنا اجر ملے گا اور جس غلام نے اللہ سبحانہ اور اپنے آقا کا حق پورا کیا اسے دوہرا اجر ملے گا۔ امام شعبی نے یہ حدیث بیان فرماتے کے بعد نووارد خراسانی سے کہا تمہیں حدیث مفت ہی بتادی ورنہ اس سے بھی کمتر کے لیے مدینہ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔

۱۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۔ ۲۔ اللہ سبحانہ اس شخص کی قیامت کے دن پردہ پوشی کرے گا جو کسی رسوائی پر مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا۔ ۳۔ جامع بیان العلم و فضلہ۔ ۴۔ معرفۃ علوم الحدیث۔

الغرض محدثین نے علو اسناد کو ہمیشہ ایک قابلِ فخر چیز سمجھا ہے کیونکہ روایت میں جس قدر وسائط کم ہوں گے اسی قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب ہوگا حافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں:

لَا تَقْرُبَ إِلَّا سُنَادَ قُرْبٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَالْقُرْبُ إِلَيْهِ قُرْبٌ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ - ۱۷

یہی علو اسناد کی پانچ قسموں میں سے سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ چنانچہ حافظ عبد اللہ السیوطی فرماتے ہیں:

أَجَلُّهَا الْقُرْبُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حَيْثُ
الْعَدَدُ وَبِاسْتِثْنَاءِ صَحِيحِ نَظِيفٍ - ۱۸

اسی لیے اہل فن کے نزدیک صحت اور علو اسناد کا جس قدر اہتمام ہوتا ہے اور کسی چیز کا نہیں ہوتا بلکہ امام مسلم تو علو سند کی خاطر گاہ گاہ سند صحیح چھوڑ کر سند ضعیف سے حدیث لاتے ہیں۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں:

رَبِّمَا أَخْرَجَ مُسْلِمٌ الْأَسْنَادَ الضَّعِيفَ وَاقْتَصَرَ عَلَيْهِ
بَعْلُوهُ وَتَرَكَ الْأَسْنَادَ الصَّحِيحَ لِمَرْوَلِهِ - ۱۹

اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث کے تذکرے میں ان کے علو اسناد کا ذکر خصوصیت سے ملتا ہے بلکہ خاص خاص اسانید عالیہ کو علمائے مستقل اجزاء میں علیحدہ مدون کر دیا ہے۔

امام اعظم کی احادیات

ائمہ اربعہ میں چونکہ تابعی ہونے کا فخر امام اعظم کو حاصل ہے اور یہ وہ فخر ہے کہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی امام صاحب کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہے نہ امام اوزاعی کو شام میں، نہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ کو بصرہ میں، نہ سفیان ثوری کو کوفہ میں، نہ امام مالک کو مدینہ میں، نہ امام مسلم بن خالد کو مکہ میں اور نہ امام لیث بن سعد کو مصر میں۔ اچھے اور اس کے نتیجے میں امام اعظم ابو حنیفہ ائمہ اربعہ میں اس شرف خاص میں ہی امتیازی مقام رکھتے ہیں کہ ان کو بارگاہِ رسالت

۱۷ مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۰۶ - ۱۸ تدریب الراوی ص ۱۸۳ - یعنی علو اسناد کی بزرگترین قسم یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلحاظ عدد بسند صحیح نزدیک حاصل ہو۔ ۱۹ الرد فی الباسم ص ۱۶۵ - ۲۰ المحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۲۲ -

سے بڑھ راست صرف بیک واسطہ ملتا حاصل ہے۔ امام صاحب کی ان روایات کو جو آپ نے صحابہ سے سُنی ہیں احادیات یا وحدان کہتے ہیں یعنی وہ روایات جو آنحضرت سے بیک واسطہ منقول ہوئی۔ چنانچہ علامہ سخاوی فتح المغیث میں فرماتے ہیں :-

وَالشَّائِبَاتُ فِي الْمَوْطَأِ لِلْإِمَامِ مَالِكٍ وَالسُّوْحَدَانُ فِي حَدِيثِ
الْإِمَامِ أَبِي حَنِيفَةَ۔^۱

امام اعظم کے یہ وحدان مندرجہ ذیل صحابہ سے آئے ہیں :
حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن الحارث بن جبر، حضرت
عبداللہ بن ابی اوفی، حضرت واثلہ بن الاسقع، حضرت عبداللہ بن انیس
حضرت عائشہ بنت عجرہ۔

اس لیے ان روایات کی تعداد چھ ہے :

- ۱۔ عن ابی حنیفہ عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۲۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن الحارث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۳۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن ابی اوفی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۴۔ عن ابی حنیفہ عن واثلہ بن الاسقع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۵۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن انیس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۶۔ عن ابی حنیفہ عن عائشہ بنت عجرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

متقدمین میں سے بہت سے علماء نے امام صاحب کی ان احادیات پر رسالے لکھے ہیں۔ علامہ زاید کوثری نے اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ رسائل تصنیف کرنے والوں میں حافظ ابو حامد محمد بن ہارون الحضرمی جو فن حدیث میں حافظ دارقطنی کے استاد ہیں حافظ ابو الحسین علی بن احمد بن عیسیٰ، النہیقی، حافظ ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد الطبری الشافعی، اور حافظ ابو بکر عبد الرحمن بن محمد السرخسی کے رسائل خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور حفاظ کی روایات میں داخل ہیں۔ چنانچہ حافظ حضرمی، حافظ النہیقی اور حافظ طبری کے رسالے حافظ ابن حجر عسقلانی نے المعجم المفہرس میں اور حافظ ابن طولون نے الفہرست الاوسط میں پورے روایت

روایت کیے ہیں۔ اور حافظ ابوبکر السرخسی کا رسالہ مشہور محدث سبط بن الجوزی نے الانتصار والترجیح میں اپنی مرویات میں شمار کیا ہے یہ
حافظ ابو معشر طبری کے رسالہ کو حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی تبیض الصحیفہ میں نقل کیا ہے

اسنادِ عالی کی دوسری قسمیں

اسنادِ عالی کی قسم اعلیٰ تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس کی چار قسمیں اور بتائی گئی ہیں۔

الف: یہ کہ مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو چاہے اس امام کے بعد راویوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

ب: حدیث کی معتمد کتابوں میں سے کسی سے قرب حاصل ہو۔ حافظ عسقلانی نے اس کی چار صورتیں بتائی ہیں۔ موافقت، بدل، مساوات اور مصافحہ۔

ج: یہ کہ علو کا سبب کسی راوی کی وفات کا تقدم ہو خواہ دوسری سندوں اور راویوں کی تعداد برابر ہی کیوں نہ ہو۔

د: یہ کہ ایک راوی حدیث سننے میں دوسرے راوی سے پہلے ہو دونوں نے ایک حدیث ایک ہی استاد سے سنی ہو مگر ایک نے پہلے دوسرے نے بعد میں سنی ہو۔

در اصل علو حقیقی تو پہلی ہی قسم ہے۔ ان قسموں میں اسنادی علو صرف نسبتی اور اضافی ہے۔ ان چار قسموں میں سے امام ابو عبد اللہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں پہلی قسم کو جس میں کسی مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو راجح قرار دیا ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے ان مشہور ائمہ حدیث میں شیخ، اوزاعی، مالک، اعمش، ابن جریر، اور شعبہ کے نام بتاتے ہیں یہ اور الجزائری نے امام حاکم کے حوالے سے یہ ضابطہ لکھا ہے کہ:

کل اسناد بقرب من الامام المذكور منه فاذا صحت الروایۃ

الی ذالک الامام بالعدد الیسیر فانہ عالی۔^{۳۵}

ہر اسناد جس میں امام مذکور سے قرب ہو جائے جب عدد یسر کے

۱۔ التعلیقات ص ۲۱، التانیب ص ۲۱، تدریب الراوی ص ۳۶۳۔ ۲۔ توجیہ النظر للجزائری۔

ذیلے اس امام تک روایت صحیح ہو جاتے تو بس یہی اسناد عالی ہے۔

اس کے بعد اسی ضابطہ کی مثال میں یہ روایت پیش کی ہے۔

حدثنا علي بن الفضل حدثنا الحسن بن عرفة حدثنا
هشيم بن عمار عن يونس بن عبيد عن نافع عن ابن عمر قال
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مطلق الفتي ظلم
یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

یہ ہم جیسوں کے لیے تمام اسانید میں عالی ہے۔ اس کی سند میں
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک سات راوی ہیں اور اس کے عالی
ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ہشیم بن بشیر امام حدیث سے
قریب تر ہے۔

مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جن کے قرب سے محدثین کے یہاں اسناد عالی ہوتی ہے
اور جس علو پر ان کو فخر ہے ان کا حال یہ ہے کہ ان میں بیشتر امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ دور کیوں
جاتے ہو یہی امام ہشیم بن بشیر جن کے قرب سے یہ اسناد عالی ہوتی ہے امام اعظم کے مشہور
تلامذہ ہیں چنانچہ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظم کے ترجمہ میں جن ائمہ حدیث کے
بالے میں تصریح کی ہے کہ وہ حدیث میں امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ ان میں ان کا نام بھی ہے
یہ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ امام ذہبی نے ان کو الحافظ الکبیر، محدث العصر لکھا ہے
ہشیمؒ میں پیدا ہوتے انہوں نے تابعین سے علم حدیث حاصل کیا مثلاً امام ابو حنیفہؒ امام
عمر بن دینار اور زہریؒ، حضرت ابن عمر اور ابن عباس کے فتاویٰ پر ان کی نظر وسیع تھی۔ درس
میں تہلیل، تسبیح اور تہجد و روزانہ ہوتی تھی جب وہ لا الہ الا اللہ کہتے تو فوراً اثر سے ان کی
آواز بلند ہو جاتی۔ حافظ ہشیم بخاری کے رہنے والے تھے ان کے والد واسط میں مقیم تھے۔ واسط
میں قاضی وقت حافظ ابوشیبہؒ ابراہیم بن عثمان کے درس میں پابندی سے حاضر ہوتے

۱۔ ۲۔ ترجیہ النظر للجزائری۔ ۳۔ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہؒ اگرچہ ائمہ جرح و تعدیل نے ان کو جرحی تیروں
سے بڑی طرح زخمی کیا ہے لیکن یحییٰ بن معین نے یزید بن ہارون کی طرف نسبت کر کے یہ انکشاف بھی کیا ہے
کہ ابراہیم سے زیادہ اپنے زمانے میں عادل کوئی نہ تھا۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ یزید ابراہیم کے اس وقت
(باقی صفحہ ۳۰۷ پر)

اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کرتے تھے۔ ایک بار ہشتم بیمار ہو گئے اور مجلس درس میں حاضر نہ ہوئے

ص ۳۰۸ کا بقیہ حاشیہ)۔ منشی تھے جبکہ وہ واسط میں حکم قضایں مقرر تھے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ احادیثہ صالحہ و تہذیب
ص ۳۰۹ یہ ابواسحاق اسمعیلی، ولید بن مسلم، زید بن الجباب، یزید بن ہارون، علی بن الجعد اور اپنے ماموں حکم بن عتبہ
کے شاگرد ہیں۔ ائمہ نقد و رجال نے ان کو خواہ کچھ کہا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ ابن ماجہ اور ترمذی کے راویوں
میں سے ہیں اسی بنا پر عافنا عسقلانی نے ابن المیران میں ان کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ ان کا ذکر تہذیب و تہذیب
میں کیا ہے تہذیب میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ امامتہ موثقون و امامتات مقبولون و امام
قوم ساد حفظہم و لم یطرحوا و اما قوم ترکوا ہو جرحوا۔ حافظ صاحب نے تقریب میں ان کو متروک الحدیث
کہہ کر طبقہ سابقہ میں شمار کیا ہے اور معلوم ہے کہ متروک حافظ صاحب اسے کہتے ہیں من لم یوثق البتہ و ضعف مع ذلک
بقادح (ص ۳) اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم حافظ صاحب کے نزدیک اس لیے ضعیف نہیں کہ ان پر جھوٹکی تہمت ہے ان پر
دوسرے ناقدین کی جانب سے اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ضعیف ہیں اور منکر الحدیث ہیں یہ ایک مبہم جرح ہے حافظ
عسقلانی نے لکھا ہے کہ کذبہ شعبۂ فی قصۃ۔ یہ قصہ کیا ہے حافظ ذہبی نے اسے بھی بے نقاب کیا ہے۔ وہ
لکھتے ہیں کہ ابراہیم نے بحوالہ حکم عن ابی یسٰی بتایا ہے کہ صفین کی جنگ میں ستر بدری شریک تھے امام شعبہ کہتے ہیں
کہ ابراہیم جھوٹ کہتے ہیں کیونکہ میں خود ابراہیم کے استاد حکم سے ملا ہوں انہوں نے مجھے بتایا کہ صفین میں بدر والوں
میں سے صرف حضرت خزیمہ شریک تھے۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم کا یہ کہا غلط ہے کہ صفین میں ستر بدری
شریک تھے تو امام شعبہ کا یہ بتانا بھی ستر غلط ہے کہ صفین میں حضرت خزیمہ کے سوا کوئی بدری تھا کیا حضرت علی
اور حضرت عمار بدری نہیں ہیں۔ اس لیے ابراہیم کے جھوٹا ہونے کی کہانی صرف ایک افسانہ ہے جس کی تاریخ
کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہے اور صرف ضعیف ہونے کی بنا پر اگر ابراہیم کی روایت قابل قبول نہیں ہے
تو پھر اسی روایت تو بخاری میں بھی موجود ہیں جن کے راویوں کے بارے میں بالاتفاق متروک ہونے کا اعلان ہے مثلاً بخاری
کی کتاب المناقب میں حسن بن عمارہ کے حوالہ سے حدیث آئی ہے جن کے بارے میں لکھا ہے کہ طبعوا علی ترکہ۔ ایک اور
راوی اسید بن الجمال ہے ان سے امام بخاری نے کتاب ارقاق میں حدیث روایت کی ہے حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ
لما رلاہم قد وثقوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم بافتن کے یہاں صرف راوی کا ضعیف ہونا ہی روایت کے ضعیف ہونے
کا معیار نہیں ہے روایت ضعیف ہونے کے باوجود بھی مقبول ہوتی ہے۔ اگر بخاری کی یہ روایات ضعیف ہونے کے باوجود
مطلقاً امت بالقبول کی وجہ سے صحیح ہیں تو ابراہیم کی ابن عباس والی وہ روایت جس میں تراویح کی تعداد میں بتائی ہے تعلق الخلفاء
بالقبول، تعلق العمد بالقبول، تعلق الامۃ بالقبول اور تعلق الامۃ بالقبول کی وجہ سے بھی صحیح ہے۔

ابوشیبہ کو فکر ہوئی انہوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بیمار ہو گئے ہیں اپنے شاگردوں سے کہا چلو مشیم کی عیادت کو چلیں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحب کے ساتھ مشیم کی عیادت کو ان کے والد بشیر کے گھر پہنچے۔ جب قاضی صاحب فرض عیادت سے فارغ ہو کر اپنے شاگردوں کے ساتھ چلے تو بشیر نے اپنے بیٹے سے کہا بیٹا! میں تمہیں طلبِ حدیث سے روکتا تھا لیکن آج سے اپنی ممانعت واپس لیتا ہوں۔ قاضی ابوشیبہ جیسا شخص اور میرے دروازے پر آئے یہ واضح ہے کہ واسط میں امام اعظم کے تلامذہ میں سے صرف مشیم نہیں بلکہ کمرہ درہی نے صرف واسط میں امام اعظم کے تلامذہ بتاتے ہیں ان کی تعداد تیس ہے ان میں سے ایک امام مشیم ہیں۔ امام احمد بن حنبل پانچ سال تک ان کے درس حدیث میں شریک رہے اور فنی حدیث میں عبور حاصل کیا۔

امام اعظم کی شائیات

امام ابو حنیفہ اگرچہ خود تابعی ہیں مگر ان کو بڑے بڑے تابعین سے حدیث پڑھنے کا موقع ملا ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام شعبی کو الامام، علامۃ التابعین کہہ کر بتایا ہے کہ ابو اکبر شیخ الامام ابی حنیفہ امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ امام شعبی کے پاس رہو۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لوگ ان سے مسائل پوچھتے تھے اور الصحابۃ متوافرون حالانکہ صحابہ بہت تھے۔ خود امام شعبی فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ سو صحابہ کو پایا ہے۔ ایسے ہی امام ذہبی نے دول الاسلام میں مشہور تابعی عطاء بن ابی رباح کے متعلق تصریح کی ہے کہ اکبر شیوخہ عطاء بن ابی رباح۔ امام اعظم کے سب سے بڑے استاد ہیں۔ اس لیے احادیث کے بعد امام اعظم کی مرویات میں شائیات کا درجہ ہے یعنی وہ حدیثیں جو آپ نے تابعین سے سنی ہیں اور تابعین نے صحابہ کرام سے۔ امام مالک چونکہ تابعی نہیں ہیں اس لیے ان کی مرویات میں سب سے حالی مرویات شائیات ہی ہیں۔

امام محمد کی کتاب الآثار میں شنائی روایات حسب ذیل اسانید سے آتی ہیں۔

۱۔ ابو حنیفہ عن ابی الزبیر عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

۲۔ ابو حنیفہ عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

- ۳۔ ابو حنیفہ عن عبد اللہ بن ابی جبیۃ قال سمعت ابا الدرداء قال قال رسول اللہ
 ۴۔ ابو حنیفہ عن عبد الرحمن عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۵۔ ابو حنیفہ عن عطیۃ عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۶۔ ابو حنیفہ عن شداد عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۷۔ ابو حنیفہ عن عطاء عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۸۔ ابو حنیفہ عن عاصم عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۹۔ ابو حنیفہ عن عون عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۱۰۔ ابو حنیفہ عن محمد بن عبد الرحمن عن ابی امامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۱۱۔ ابو حنیفہ عن مسلم الاغور عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
 ۱۲۔ ابو حنیفہ عن محمد بن قیس عن ابی عامر انہ کان یمہدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

امام اعظم کی ثلاثیات

امام شافعی، امام احمد کی کسی تابعی سے ملاقات نہ ہو سکی اس لیے ان کی مرویات میں سب سے
 اونچی مقام ثلاثیات کا ہے یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن کو ان بزرگوں
 نے اتباع تابعین سے۔ انہوں نے تابعین سے اور تابعین نے صحابہ کرام سے سنا ہے۔
 صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے امام بخاری، امام ابن ماجہ، امام ابو داؤد، امام ترمذی نے
 بعض اتباع تابعین کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں اس لیے اسناد عالی کے
 بازار میں یہ اکابر بھی امام شافعی اور امام احمد کے ہم پلہ ہیں۔ حالانکہ امام شافعی کی وفات کے
 وقت امام بخاری کی عمر دس سال تھی اور امام ابو داؤد صرف دو سال کے تھے اور امام ابن ماجہ
 تو ابھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ امام بخاری کی ثلاثی روایات کی تعداد صرف اکیس ہے
 اور یہ ان کی مرویات میں سب سے اونچی روایات ہیں۔ امام بخاری کو جن ذرائع سے یہ روایات
 ملی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

گیارہ احادیث

پانچ احادیث

تین احادیث

۱۔ امام مکی بن ابراہیم

۲۔ ابو عاصم النبیل

۳۔ محمد بن عبد اللہ الانصاری

ایک حدیث

۴۔ خلا دین سیکھی

ایک حدیث

۵۔ عصام بن خالد

ان میں سے دو اہل الذکر حضرت مکی بن ابراہیم اور امام ابو نعیم النبیلی جن سے ثلاثیات کی تعداد بالترتیب گیارہ اور پانچ ہے اور جو امام بخاری کے مشائخ میں طبقہ اولیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں دونوں امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ ہم اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے یہاں ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔

امام مکی بن ابراہیم

مکی بن ابراہیم بلخ کے رہنے والے ہیں حافظ ذہبی سے علامہ سخاوی ناقل ہیں :
بلخ میں دوسری صدی کے اواخر میں علماء پیدا ہوتے جیسے کہ عمر بن یارون، مکی بن ابراہیم، خلف بن ایوب، قتیبہ بن سعید، محمد بن ابان، عیسیٰ بن احمد، محمد بن علی بن طرخان۔ پھر وہاں علم حدیث گھٹ کر ناپید ہو گیا۔

موصوف امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں چنانچہ صدرالائمہ مکی رقمطراز ہیں کہ :
مکی بن ابراہیم بلخی بلخ کے امام ہیں سنیہ میں کوفہ میں آئے اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں ملازمت اختیار کی اور آپ سے حدیث و فقہ کا سماع کیا اور بکثرت روایتیں کی ہیں۔

امام مکی فن حدیث کے بہت بڑے امام گزرے ہیں حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ذکر ان نقطوں میں کیا ہے۔

مکی بن ابراہیم لحافظ الامام شیخ خراسان ابوالسکن التیمی ہے

بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام بیہقی اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ امام بخاری نے بیشتر ثلاثی روایتیں ان ہی سے روایت کی ہیں۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ چھ کیے دس سال حرم محترم میں ڈیرہ رکھا اور سترہ تابعین سے احادیث لکھیں۔ ان کا بیان ہے کہ اگر مجھے

علم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پڑے گی تو سوائے تابعین کے اور کسی سے حدیثیں نہ لکھتا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوا اور سترہ سال کی عمر میں حدیث کی تحصیل شروع کی۔
 مکی بن ابراہیم کو تحصیل علم کی طرف امام ابو حنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا چنانچہ امام حارثی عبد الصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ:

میں بخارا میں تجارت کرتا تھا ایک بار امام صاحب کی خدمت میں آنا ہوا تو فرمانے لگے، مکی! تم تجارت کرتے ہو لیکن تجارت میں جب تک علم نہ ہو بڑی خرابی رہتی ہے علم تم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث قلم بند کیوں نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہ مجھے برابر اس طرف متوجہ کرتے رہے تاکہ میں تحصیل علم میں مشغول ہو گیا۔ آخر اللہ سبحانہ نے مجھے بہت کچھ عطا کیا۔ اسی لیے میں ہر نماز میں اور جب بھی ان کا ذکر آتا ہے ان کے حق میں دعا کرتا ہوں لان اللہ تعالیٰ جزلتم فتح لی باب العلم

مکی بن ابراہیم کو امام اعظم سے خاص عقیدت تھی ایک بار امام صاحب کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ کان اعلم منہ مانہ۔^۱

اسماعیل بن بشیر ناقل ہیں کہ ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے۔ انہوں نے روایت شروع کی حد ثنا ابو حنیفہ حاضرین میں سے ایک اجنبی شخص نے چلا کر کہا کہ حد ثنا عن ابن جریج ولا تحد ثنا عن ابی حنیفہ اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا فرمانے لگے:

اما لا تحدث السفهاء مت علیک ان تکتب عنی قم من مجلسی ہم بیوقوفوں سے حدیث نہ بیان کریں گے مجھ سے حدیثیں نہ لکھو میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ جب تک اس شخص کو مجلس سے نہیں اٹھایا گیا آپ نے حدیث بیان نہیں کی اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حد ثنا ابو حنیفہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔^۲

الضحاک بن محمد ابو عامر النبیل

مشہور ائمہ حدیث میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ علامہ صمیمی نے ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبد القادر قرشی نے الجواهر المضية میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ نام تو ان کا الضحاک ہے کنیت ابو عامر اور نبیل ان کا لقب ہے۔ نبیل کے معنی معزز کے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کو اس لقب سے کیوں پکارا گیا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس سلسلے میں بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔ امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ امام زفر کے یہاں اکثر ان کی حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں اسی نام کے ایک شخص اور بھی آیا کرتے جن کی وضع قطع بالکل گری ہوئی تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی۔ نوٹڈی نے آکر پوچھا کون ہے جواب ملا ابو عامر۔ نوٹڈی نے اندر جا کر اطلاع دی کہ ابو عامر دروازے پر ہیں۔ امام زفر نے دریافت کیا کہ کون ہے ابو عامر؟ لڑکی نے بے ساختہ کہہ دیا کہ النبیل منہما۔ ابو عامر اجازت لے کر اندر آئے تو امام زفر نے کہا کہ اس نوٹڈی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہوگا۔ ابو عامر کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا۔ حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل بیان کیا ہے ابو عامر کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوے سال تھی۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ فقہاء میں بھی بڑے نامور تھے۔ ابن سعد رقمطراز ہیں کہ کان ثقتہ فقیماً۔ امام عجمی کہتے ہیں ثقتہ کثیر الحدیث وکان لہ فقتہ۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ ابو عامر کو ایک ہزار حدیثیں نوک زبان تھیں۔

الغرض ان ہی دونوں مکی بن ابراہیم اور ابو عامر النبیل کے حوالے سے امام بخاری کو بالترتیب گیارہ اور پانچ ثلاثیات ملی ہیں۔

دوسرے محدثین میں ابو داؤد اور ترمذی کی ثلاثیات میں صرف ایک ایک روایت ہے مگر ابن ماجہ کی ثلاثی روایات کی تعداد پانچ ہے۔

حضرت امام اعظم کی روایات میں ثلاثیات کا مقام تیسرے درجے پر ہے یعنی جو روایات امام

بخاری، امام ابن ماجہ، امام ابو داؤد اور امام ترمذی کی درجہ اول میں ہیں وہ امام اعظم کے یہاں بلحاظ مقام تیسرے درجہ پر ہیں۔ اس قسم کی روایات کا امام صاحب کے یہاں وافر ذخیرہ ہے مثلاً۔

عن ابی حنیفہ عن بلال عن وہب عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن ابی حنیفہ عن موسیٰ بن ابی عاتکہ عن عبد اللہ عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن ابی حنیفہ عن عبد اللہ عن ابی یحییٰ عن عبد اللہ بن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام اعظم کی رباعیات

امام مسلم اور امام نسائی کی کسی تسبیح تابعی سے بھی ملاقات نہ ہو سکی اور اس وجہ سے ان کو ان سے کوئی حدیث سننے کا موقعہ نہیں ملا اس لیے ان دونوں امان حدیث کی سب سے عالی روایات رباعیات ہیں جن کو ان کے اساتذہ نے اتباع تابعین سے اور انہوں نے تابعین سے اور انہوں نے صحابہ کرام سے سنا ہے مثلاً امام مسلم کی رباعیات میں ہے :

حدثنا سوید بن سعید قال حدثنا مروان الفزاری عن ابی
مالک سعد بن طارق عن ابیہ قال سمعت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم یقول من قال لا الہ الا اللہ وکف
بما کان یعبد من دون اللہ حرم ماله ودمه وحسابہ علی اللہ

اور امام نسائی کی رباعیات میں ہے :

اخبرنا حمید قال حدثنا عبد الوارث قال حدثنا شعیب عن
انس بن مالک ۔

امام اعظم کی مرویات میں رباعیات بالکل آخری درجہ پر ہیں جو روایات نبوت سے قرب میں امام مسلم اور امام نسائی کے یہاں درجہ اول پر ہیں ان کی امام اعظم کے یہاں آخری درجہ کی حیثیت ہے چنانچہ امام محمد نے کتاب الآثار میں ایسی روایات نقل کی ہیں مثلاً :

ابو حنیفہ عن حماد عن ابراہیم عن الاسود بن یزید عن عمر بن الخطاب
ابو حنیفہ عن حماد عن ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ

اس ساری تفصیل کو پڑھ کر یہ بات پورے طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ ارشادات اور حدیث نبوت کے سلسلے میں ائمہ اسلام میں سے قرب کا جو شرف خاص بارگاہ رسالت سے امام اعظم کو حاصل ہے

ہ کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ وعدائیات میں ان کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ثنائیات میں امام
 ملک کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ان کا ہمسر کوئی نہیں۔ ثلاثیات اور رباعیات تو ان کے یہاں ایک
 ام درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک تدوینِ حدیث

آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں کہ حدیث تاریخِ سنت کا نام ہے تاریخِ سنت یا حدیث پر تین دور
 زبے ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اپنے استاد حدیث شیخ عبداللہ بن سالم کے تذکرے میں
 لکھا ہے :

صحت حدیث میں جس ضبط کا اعتبار ہے اُمتِ مرحومہ اس میں تین دوروں
 سے گزر کر آئی ہے۔

صحابہ و تابعین کے زمانے میں ضبطِ حدیث کی صورت یہ تھی کہ زبانی یاد
 کرتے تھے۔ اتباعِ تابعین اور اوائلِ محدثین کے زمانے میں ضبطِ
 حدیث کی یہ صورت تھی کہ لکھتے تھے۔ اس کے بعد حفاظِ حدیث نے
 اسماء الرجال غریب احادیث اور ضبطِ الفاظ کے لیے تصانیف کیں
 اور تشریحات کا دور شروع ہو گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے تک حدیثوں کو سن کر زبانی یاد رکھنے کا
 رواج تھا اور اہل علم میں یہی چیز باعثِ فخر سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ رواج ٹھیک اسی طرح تھا جیسا
 آج کل ہماری سوسائٹی میں قرآنِ حکیم کے لیے ہے بلکہ ان علماء پر جو کتاب وغیرہ پاس رکھتے تھے
 رکھی ہوئی حدیثیں بیان کرتے تھے ان پر ایک طرح کی راجل صحیفی کی پھبتی کسی جاتی تھی۔
 یہاں اس معاشرے میں علمِ صحیح کا اصلی دار و مدار ہی حفظ اور زبانی یادداشت تھا۔ اساتذہ کی
 انب سے تلامذہ کو ہدایت ہوتی تھی کہ لکھو مت بلکہ جیسے ہم نے احادیث زبانی یاد کی ہیں تم بھی
 زبانی ہی یاد کرو۔ چنانچہ ایک بار حضرت ابو موسیٰ اشعری نے دریافت کیا کہ کیا تم لکھتے ہو؟ شاگردوں
 نے کہا جی ہاں! فرمایا حفظوا عنا کا حفظنا زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کی ہیں۔ بہر حال یہ

واقعہ ہے کہ جیسے اس وقت تک قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو گھوٹنے اور نوک بیان کرنے کا رواج مسلمانوں میں باقی ہے۔ اتباع تابعین کے زمانے تک قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی دستور رہا ہے۔

طرق واسانید حدیث کی تعداد

اگر یہ صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ امام احمد فرماتے ہیں کہ احادیث کی کل تعداد سات لاکھ سے کچھ زائد ہے تو یہ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہیں ہیں بلکہ آپ کے افعال، اخلاق، احوال اور آپ کی موجودگی میں لوگوں کے کیے ہوئے وہ کام جن پر آپ نے گرفت نہیں فرمائی اور اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال، ان کے مفتیوں کے فتاویٰ، زمانہ خلافت میں ان کی عدالتوں کے فیصلے بلکہ تابعین کے فتاویٰ اور حج ہونے کی حیثیت میں ان کے فیصلے اور قرآنی آیات پر تشریحی نوٹس بھی ان سات لاکھ میں شمار کیے گئے ہیں۔ یہ خیال بالکل عامی ہے کہ صرف ارشادات نبوت ہی کا نام حدیث ہے۔ الجزائری لکھتے ہیں :

إِنْ كَثِيرًا مِّنَ الْمُتَقَدِّمِينَ كَانُوا يُطْلِقُونَ اسْمَ الْحَدِيثِ عَلَى مَا
يَشْمَلُ أَثَرَهُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ وَتَابِعِيهِمْ وَفَتَاؤَهُمْ۔

متقدمین کی اکثریت آثار صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین اور ان کے فتاویٰ پر لفظ حدیث بولتی ہے۔

اور یہ تعداد بھی سات لاکھ متون حدیث کی نہیں بلکہ طرق کی ہے یعنی سات لاکھ ان اسانید کی تعداد ہے جن کے ذریعے احادیث کے یہ متون ہم تک پہنچے ہیں۔ ایک حدیث اگر چار سندوں سے آئے تو یہ محدثین کی اصطلاح میں چار حدیثیں ہیں چنانچہ علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں :

وَلْيَعْدُ ذُنُ الْحَدِيثِ الْمَرْوِيُّ بِأَسْنَادَيْنِ حَدِيثَيْنِ۔

علامہ ابن جوزی نے تمام ذخیرہ حدیث کے متعلق کھلے لفظوں میں لکھا ہے کہ

الْمَرْوِيُّ إِذَا دُبِهُدَا الْعَدَدِ وَالطَّرُقُ لَا الْمُسْتَوْنَ۔

نواب علامہ صدیق حسن خاں نے الحطہ میں میر سید شریف سے بھی یہی جملہ نقل کیا ہے کہ

واضح رہے کہ محدثین کے متعلق جو اصول کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ الجامع الصحیح کی موجودہ احادیث چھ لاکھ حدیثوں کا انتخاب ہے یا امام مسلم فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کی حدیثوں کو میں نے تین لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں ان کا انتخاب سنن ابو داؤد میں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ مسند احمد سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ارشادات نبوت کی یہ تعداد ہے بلکہ یہ ارشادات جن طرق اور اسانید سے آتے ہیں ان کی تعداد ظاہر کرنی مقصود ہے اور تاریخ حدیث میں یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ جہاں تک طرق و اسانید کا معاملہ ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں یہ تو صرف وہ ہیں جو ان بزرگوں نے اپنی عرق ریزیوں اور دست پیمائیوں کے بعد فراہم کیے ہیں ان کے علاوہ اگر دوسرے محدثین کی محنتوں اور یادداشتوں کو یکجا کیا جائے تو یہ سلسلہ بے حد بے حساب ہے۔ کیونکہ تابعین کے زمانے میں اگر طرق و اسانید کی تعداد صرف چالیس ہزار تھی تو تابع تابعین کے دور میں یہی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو مثلاً دس شاگردوں سے بیان کیا اب وہ محدثین کی اصطلاح میں دس اسانید اور طرق ہو گئے۔

احادیث صحیحہ کی اصلی تعداد

شاید آپ بے چین ہوں اور ذہنوں میں یہ غلش محسوس کر رہے ہوں کہ اگر یہ طرق و اسانید کی تعداد ہے تو پھر احادیث صحیحہ کی تعداد کیا ہے ؟ محدثین و حفاظ حدیث کی بدولت ہم کو طرق و اسانید کے ساتھ متون احادیث صحیحہ کی تعداد کا بھی علم ہو گیا ہے۔ امام ابو جعفر محمد بن الحسین بغدادی نے کتاب التمیز میں امام سفیان ثوری، امام شعبہ بن الحجاج، امام یحییٰ بن سعید القطان، امام عبد الرحمن بن مہدی اور امام احمد بن حنبل جیسے اکابر کا متفقہ بیان نقل کیا ہے :

ان جملة الاحادیث المسندة عن النبي صلى الله عليه وسلم
یعنی الصحیحة بلا تکریر اربعۃ الاف واربعمائة حدیث

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند اور صحیح بلا تکرار ارشادات کی تعداد
صرف چار ہزار چار سو ہے یہ

یہی وجہ ہے کہ ارباب صحاح میں سے ہر ایک نے اپنی کتابوں میں اسی تعداد کے لگ بھگ احادیث
کی تخریج کی ہے۔ چنانچہ حافظ زین الدین عراقی نے مکررات کو نکال کر صحیح بخاری میں آتی ہوئی حدیثوں
کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر فرماتے ہیں:

عدد احادیث البخاری باسقاط المكر اربعة آلاف ۲۰

اور امام نووی نے صحیح مسلم کی حدیثوں کی تعداد بھی صرف چار ہزار ہی بتائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ومسلم باسقاط المكر نحو اربعة آلاف ۳۰

امام زرکشی نے سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی تعداد چار ہزار آٹھ سو بتائی ہے امام محمد بن اسماعیل یافعی
فرماتے ہیں:

قال الزركشي ان عدة احاديث ابی داؤد اربعة آلاف وثمانمائة ۴۰

خود امام ابو داؤد نے اس خط میں جو انہوں نے اہل مکہ کے نام لکھا ہے تصریح کی ہے کہ سنن
میں احادیث کی تعداد صرف چار ہزار آٹھ سو ہے اور ان میں چھ سو مراسل ہیں۔

ابن ماجہ کے متعلق علامہ یافعی نے ابوالحسن بن القطان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

عدته اربعة آلاف حدیث ۵۰

موطا امام مالک جو ذخیرہ حدیث میں قدیم ترین کتاب ہے ابوبکر الاہمری فرماتے ہیں کہ اس
میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین کے تمام آثار صرف ایک ہزار سات سو بیس ہیں ان
میں ارشادات نبوت کی تعداد چھ سو ہے مرسل ۲۲۰ موقوف ۶۱۳ اور تابعین کے فتاویٰ ۲۸۵
ہیں یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا ہے۔

قرآن کی ۶۲۳۶ آیتیں اور ۴۴۰۰ احادیث

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جو لوگ قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو زبانی یاد کر سکتے ہیں ان کو چار ہزار

۱۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲۔ ۲۔ تنقیح الانظار ج ۱ ص ۵۶۔ ۳۔ التقریب ص ۵۱

۴۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۱۔ ۵۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲۔ ۶۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲۔

چار سو حدیثوں کو یاد رکھنا کون سی مشکل بات ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں یاد کیا جاتا؟ کیا صرف اس لیے کہ ہم اے معاشرے میں قرآن کے ساتھ صحابہ اور تابعین کی طرح سنت کی تاریخ کو زبانی یاد کرنے کا رواج نہیں ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں:

اگلے لوگ لکھتے نہ تھے صرف زبانی یاد کرتے تھے اور اگر کوئی لکھتا تو یاد کرنے ہی کیلئے لکھتا تھا اور جب زبانی یاد کر لیتا تو اسے مٹا دیتا۔^۱

قرآن کی طرح حدیث کے یاد کرنے کے جس رواج کا میں نے ذکر کیا ہے یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ اکابر سے اس موضوع پر ایسی مثبت تصریحات منقول ہیں جن کی بنا پر میں نے یہ دعویٰ کیا ہے چنانچہ حافظ ابن عساکر نے اسماعیل بن عبیدہ محدث سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَحْفَظَ حَدِيثَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا نَحْفَظُ الْقُرْآنَ^۲

حافظ ابن عبد البر نے معتمر بن الربیع کے حوالے سے لکھا ہے:

ابونضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید خدری سے حدیث لکھنے کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ ہم نہیں لکھائیں گے تم ہم سے ایسے ہی لو جیسے ہم نے نبی سے لی ہے یعنی زبانی یاد کرو۔^۳

ایک دوسری روایت میں صریح الفاظ ہیں کہ:

ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم یحدثنا فنحفظ فاحفظوا کما کنّا نحفظ^۴

سید بن بلال نے ابو بردہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

حضرت ابو موسیٰ اشعری ہم سے حدیثیں بیان کرتے ہم ان کو لکھنے کے لیے جاتے آپ نے فرمایا کہ کیا مجھ سے سن کر قلم بند کرتے ہو ہم نے کہا جی ہاں۔ فرمایا میرے پاس لاؤ آپ نے پانی سے سب کو دھو دیا اور فرمایا کہ زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کیا ہے۔^۵

^۱ جامع بیان العلم و فضلہ۔ ۲ تذکرۃ الحفاظ۔

^۳، ^۴، ^۵ جامع بیان العلم و فضلہ۔

امام ذہبی نے اسرائیل بن یونس کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دادا ابو اسحاق کی روایات کے بارے میں کہتے تھے۔

كنت احفظ حديث ابي اسحاق كما احفظ السورة من القرآن^۱

حافظ ابن حجر عسقلانی نے شہر بن حوشب کے حالات میں لکھا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ تہر بن حوشب کو عبد الحمید بن بہرام کے حوالہ سے ساری حدیثیں اس طرح زبانی یاد تھیں گویا کوئی قرآن کی سورت پڑھ رہا ہے^۲ اور امام ابو داؤد طیالسی کے متعلق مشہور محدث عمر بن فلاس کا مشاہدہ بتایا ہے کہ میں نے محدثین میں ابو داؤد سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا۔ خود ان کو کہتے سنا ہے کہ فخر نہیں مگر تیس ہزار حدیثیں نوک زبان ہیں۔ مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ کے بارے میں امام معمر فرماتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن ابی عروبہ سے کہا کہ قرآن کھول کر بیٹھ جاؤ میں سورہ بقرہ سناتا ہوں۔ سعید کہتے ہیں کہ میں نے اول سے آخر تک سنا ایک حرف کی بھی غلطی نہ تھی۔ پھر قتادہ نے کہا کہ:

لانا لضعيفة جابر احفظ من سورة البقرة^۳

یاد رہے کہ جابر کا صحیفہ وہ ہی ہے جس کا تذکرہ آپ آغاز کتاب میں پڑھ چکے ہیں۔ حضرت قتادہ قرآن کے ساتھ اس کے بھی حافظ تھے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صدر اول میں قرآن کی طرح سنت کو بھی زبانی یاد کرنے کا رواج تھا۔ اور اس رواج کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو اپنی خداوند قوت حافظ پر ناز تھا۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر نے اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

كانوا مطبوعين على الحفظ مخصوصين بذلك^۴

صرف یہی نہیں بلکہ ان کو قوت حافظہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ لکھنا تو بڑی بات ہے وہ سن کر دوبارہ نہ پوچھنے کو بڑے مطمئن اور ناز سے بیان کرتے تھے چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں خود امام زہری کا بیان ہے کہ:

ما استعدت علما قط

^۱ تذکرۃ الحفاظ۔ ۲ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۷۱۔ ۳ تہذیب ص ۱۸۳

^۴ تہذیب ج ۸ ص ۳۵۳۔ ۵ جامع بیان العلم و فضلہ۔

سنن دارمی میں ابن شبرمر کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبی فرمایا کرتے تھے کہ اے شباک! میں تم سے حدیث دوبارہ بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے کبھی کسی حدیث کے دوبارہ احاطے کی درخواست نہیں کی۔ تذکرے ہی میں امام شعبی کا یہ بھی بیان ہے کہ ما کتبت سوا دافی بیاض میں نے کبھی لکھی نہیں ہے ولا استعدت حدیثاً من الانسان اور نہ کبھی کسی شخص سے حدیث سن کر تکرار کی درخواست کی ہے۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ حدیث نبوی پر قرآن ہی جیسا ایسا دور گزرا ہے جس میں سارا زور صرف زبانی یاد پر ہی تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس موضوع پر کراہیۃ کتابۃ العلم کے نام سے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور ساری بحث کا اس پر خاتمہ کیا ہے۔

جن حضرات نے کتابت کو ناپسند فرمایا ہے جیسے حضرت ابن عباس، امام شعبی، امام زہری، امام نخعی اور قتادہ وغیرہ یہ سب کے سب وہ ہیں جو طبعی طور پر قوت حافظہ رکھتے تھے ان میں سے ایک ایک شخص صرف ایک بار سننے پر اکتفا کرتا تھا۔ امام زہری سے منقول ہے کہ میں جب بقیع سے گزرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں کہ شاید کہیں کوئی بُری بات اس میں نہ پڑ جائے کیونکہ خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات میرے کان میں پڑی ہو اور اس کو بھول گیا ہوں۔ امام شعبی سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ یہ سب لوگ عرب تھے اور یہ مشہور ہے کہ عربوں کو زبانی یاد رکھنے میں خاص خصوصیت حاصل ہے ان میں سے ایک ایک شخص اشعار کو ایک بار سن کر ہی یاد کر لیتا تھا۔ حضرت ابن عباس کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے عمر بن ربیعہ کے پورے قصیدے کو ایک ہی بار سن کر یاد کر لیا تھا اور آج کوئی شخص بھی اس قسم کا حافظہ نہیں رکھتا۔

تدوین حدیث اور عمر بن عبدالعزیز

خلافت راشدہ میں اگرچہ حضرت فاروق اعظم نے سنت کی تدوین کا کام حکومت کی جانب سے

لے جامع بیان العلم وفضلہ۔

کرتے کا ارادہ کیا صحابہ سے مشورہ لیا اور ان سب نے تدوین ہی کا مشورہ دیا لیکن آپ نے کچھ مصلوٰہ کی بنا پر یہ کام یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ :

میں سنن لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مجھے اس قوم کا خیال آگیا جو ہم سے پہلے ہوتی ہے اور جس نے خود کتابیں لکھیں اور اس کی طرف ہم تن اس قدر متوجہ ہو گئے کہ اللہ کی کتاب ہی کو چھوڑ بیٹھے سجدا میں اللہ کی کتاب میں کسی چیز کی آمیزش نہ کروں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ لے

یہاں بھی التباس اور اختلاط کا وہی اندیشہ بول رہا ہے جو حدیث ابی سعید خدری میں بیان ہوا اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

جمع قرآن اور صحابہ

دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوتے تو قرآن لوگوں کے سینوں میں عرب رواج کے مطابق محفوظ تھا آج کے رواج کے موافق کتابی شکل میں نہ تھا۔ امام خطابی رقمطراز ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مرتب اس لیے نہ تھا کہ ہمہ وقت حضور انور کو نسخ کا انتظار رہتا تھا۔ زمانہ

نزول ختم ہونے پر یہ کام خلافت راشدہ نے کیا لے

حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ کتابی صورت میں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن خاص کتابی شکل میں ایک جگہ بترتیب سورۃ مرتب نہ تھا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ :

قد كان القرآن كتب كله في عهد رسول الله صلى الله عليه

وسلم لكن غير مجموع في موضع واحد ولا مرتب السور لے

دراصل قرآن کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر موجودہ شکل و صورت تک پہنچنے کے لیے تین کروٹیں آئی ہیں۔ اول زمانہ نبوت، دوم زمانہ صدیق و فاروق، سوم زمانہ عثمان غنی۔ زمانہ نبوت میں قرآن لکھا ہوا تھا مگر ایک جگہ نہ تھا اور نہ سورتوں میں ترتیب تھی۔ زمانہ صدیق میں

فاروق اعظم کے کہنے پر قرآن کو یکجا کیا گیا اور اس کے لیے زید بن ثابت کو مقرر کیا حضرت زید کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ صرف زبانی یادداشت کے سہارے قرآن کو جمع نہ کیا جائے جب تک آیت سنانے والا مکمل ہوئی آیت نہ سناوے۔ علامہ ابو شامہ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے:

وكان غرضهم الا يكتب الا من ما كتب بين يدي النبي لا من مجرد اللفظ^۱

بلکہ حضرت ابو بکر نے زید اور عمر سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ:

من جاء بشاهدین علی کتاب اللہ فاکتبوا^۲

علامہ ابو عبد اللہ الزنجانی نے تاریخ القرآن میں اس شہادت کا پس منظر بتایا ہے:

گواہ اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ قرآن کا جو حصہ پیش کر رہے ہیں اس کو انہوں نے حضور انور کے سامنے وفات والے سال پیش کیا ہے اور آپ کے سامنے لکھا گیا ہے۔^۳

اس طرح قرآن عزیزی نے اوراق میں کتابی صورت اختیار کی۔ امام زہری سے حافظ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں نقل کیا ہے:

جميع علی عهد ابی بکر فی السورق
اور حضرت سالم بن عبد اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

جمع الموبکر فی قراطیس

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا جو مجموعہ زمانہ نبوت میں کاغذوں اور اوراق میں نہیں بلکہ عُسْب یعنی کھجور کی ٹہنیوں، لحاف چھوٹے چھوٹے پتھروں یعنی ٹھیکروں، رقاع کھال کے ٹکڑوں، اکتاف اونٹ کی پٹیوں اور آفتاب کجائے کی ٹکڑیوں میں لکھا ہوا تھا وہ زمانہ ابو بکر میں کاغذ کے اوراق میں اکٹھا ہو کر کتاب کی صورت میں سرکاری طور پر محفوظ کر دیا گیا۔ چونکہ قرآن کے نسخے عام شائع نہ ہوئے تھے ادھر اسلام دور دراز ممالک میں پھیلتا جا رہا تھا اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اس لیے الفاظ قرآن کے اعراب اور وجوہ قرأت میں کچھ اختلاف رونما ہوا اور یہ اختلاف بڑھنے لگا۔ حضرت حذیفہ نے اس معاملہ کی صورت حال

سے حضرت عثمان کو آگاہ کیا۔ حضرت ابو بکر کا مرتب کردہ قرآن حضرت حفصہ کے گھر میں موجود تھا۔ حضرت عثمان نے منگایا۔ زید بن ثابت، عبداللہ بن الزبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث سے اس کی نقلیں کرائیں اور مختلف صوبوں میں یہ قرآن روانہ کیے گئے۔

جامع القرآن کا حضرت عثمان کے لیے لقب

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عثمان کا لقب جامع القرآن مشہور ہو گیا حالانکہ ان کا جمع قرآن میں کوئی دخل نہیں ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ صدیق اکبر کے مرتب کردہ قرآن کی چند نقلیں کرائیں اور ملک کے مختلف حصوں میں روانہ کر دیں۔ الاتقان میں ہے :

المشہور عند الناس ان جامع القرآن عثمان و ليس كذا لك

انما حمل الناس عثمان على القراءة لبوجه واحد

لوگوں میں مشہور یہی ہے کہ عثمان جامع القرآن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے عثمان نے تو صرف یہ کام کیا ہے کہ لوگوں کو ایک طرز پر پڑھنے کی راہ بتائی۔

بہر حال قرآن نہ صرف تو اتر کتابت کے ذریعے آج اُمت میں حضرت زید بن ثابتؓ کے صدقے موجود ہے بلکہ تو اتر اسناد، تو اتر حفظ، تو اتر روایت، تو اتر قرأت اور تو اتر تعلیم کے ذریعے بھی محفوظ ہے۔

اس تمام تفصیل سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس اندیشے کی وجہ سے حضرت فاروق اعظم نے

۱۔ تاریخ الاسلام سیاسی ج ۲ ص ۳۸۷۔ ۲۔ یہ بات کہ اس کام کے لیے زید بن ثابت ہی کو کیوں منتخب کیا اس سوال کا جواب عثمان بن سعید دانی نے اپنی کتاب المقفص میں جو دیا ہے اور جسے ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے تاریخ الاسلام سیاسی ج ۱ ص ۳۸۸ پر نقل کیا ہے وہ ہی پیش کرتا ہوں۔ زید بن ثابت کو اس کام کے لیے چند وجوہ سے منتخب کیا گیا۔ اول یہ کہ زید حضور انور کے کاتب وحی تھے دوم یہ کہ آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن پڑھ کر سنایا تھا۔ سوم یہ کہ آپ نے ہی حضور انور کی زندگی میں آخری طور پر جامع قرآن کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ یہ تین خوبیاں زید بن ثابت کے سوا کسی دوسرے صحابی میں نہ تھیں اس لیے دونوں بار زمانہ صدیق اور زمانہ عثمان میں کام کے لیے زید ہی کے نام پر قرعہ فال نکلا۔

تدوین سنن کا کام ملتوی کر دیا تھا وہ اندیشہ حضرت عثمان کے قرآن کی متعدد نقلیں کرانے اور اطراف مملکت میں روانہ کرنے کے بعد بالکل ختم ہو گیا۔ اب قرآن کتابی شکل میں آنے کے بعد اس خطرے سے بالا ہو گیا کہ غیر قرآن کی قرآن سے آمیزش ہو جاتے۔

۹۹۔ تک سنت تین راہوں سے مسافت طے کرتی رہی۔ ایک سینہ دوسرے محدود اور خاص سفینہ اور تیسرے عمل کا محسوس پیمانہ۔

فرق صرف یہ ہے کہ حفظ و روایت اور عمل اس وقت معاشرے میں عام اور کتابت کا کام خاص خاص تک محدود تھا۔ ایک بار اس خاص کام پر جو زمانہ نبوت اور زمانہ خلافت راشدہ میں خدمت سنت کے نام پر ہوا ہے اس پر پہلے ایک مجموعی نظر ڈال لیجئے تاکہ اس سلسلے میں آئندہ اقدامات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

سہ سے ۹۸ تک موضوع حدیث پر علمی سلسلہ

۱۔ کتاب عمرو بن حزم عمرو بن حزم نے اپنی دستاویز کے ساتھ حضور انور کے اکیس فرامین یکجا کیے ہیں۔

۲۔ کتاب الصدوق یہ نوشتہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے پاس تھا۔

۳۔ صحیفہ صادق عبد اللہ بن عمرو نے زمانہ نبوت میں احادیث قلم بند کی ہیں۔

۴۔ صحیفہ جابر یہ جج کے موضوع پر جابر بن عبد اللہ کا لکھا ہوا رسالہ ہے۔

۵۔ صحیفہ علی قصاص حرم، زکوٰۃ، قیدیوں کی رہائی پر حضرت علی کا رسالہ ہے۔

۶۔ صحیفہ صدیق یہ صدیق اکبر کی لکھی ہوئی صدقات کی تفصیل ہے۔

۷۔ رسالہ سمرہ بن جندب کا ترتیب دادہ رسالہ ہے۔

۸۔ صحیفہ صحیحہ بروایت ہمام بن منبہ ابو ہریرہ کی تالیف ہے۔

نبوت اور خلافت کے زمانے میں انفرادی طور پر کچھ حضرات نے حدیث کا کتابی سرمایہ جو چھوڑا ہے اس کا خاکہ آپ کے سامنے ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ تدوین حدیث کے لیے خلافت راشدہ میں ان خاص وجوہ و اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل صفحات بالا میں دی گئی ہے وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو قرآن عزیز کے لیے عمل میں آیا ہے۔ اور ان کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ شروع ہی سے دونوں میں فرق مراتب کو

مخوڑ رکھا گیا ہے۔ اور سوچا گیا ہے کہ سنت کا سرمایہ لمبا طبع ثبوت قطعیت میں قرآن کے برابر نہ ہو تاکہ کلام الہی اور کلام رسول کا وہ جوہر ہی فرق قائم ہے جسے خود وحی الہی نے روزِ اول ہی سے قائم رکھا ہے۔ اسی بنا پر اصولیین نے سنت کا مرتبہ قرآن کے بعد رکھا ہے۔ شاطبی لکھتے ہیں:

مرتبۃ السنة المتأخر عن الكتاب في الاعتبار

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر بظاہر قرآن اور حدیث میں معارضہ ہو جائے تو قرآن کو مقدم اور حدیث کو مؤخر کیا جائے گا۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن سے ثابت شدہ احکام کا درجہ فرض کا اور سنت سے معلوم شدہ مسائل کی حیثیت وجوب، سنت، استحباب اور مذہب سے زیادہ نہیں ہوتی۔

آپ ایک لمحہ کے لیے سوچتے کہ اگر سارا سرمایہ قرآن ہی کی طرح قطعیت رکھتا تو اسلام میں ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی حیثیت بھی فرض سے کم نہ ہوتی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ترک فرض کی عقوبت کا اندیشہ ہوتا۔ پوری زندگی اجیرن ہو جاتی اور اس کے نتیجے میں وہ اسلامی معاشرہ وجود میں نہ آسکتا جو آج اسلام کے نام پر موجود ہے اور وہ سہولت اور آسانی یکسر ختم ہو جاتی جو قرآن نے قائم کی تھی۔

یرید اللہ بکمالہ العسر ولا یرید بکمالہ العسر

افراط و تفریط کے درمیان راہ اعتدال یہی ہے کہ نہ تو سارے علمی سرمایہ کی قطعیت قائم کر کے ایک ایک چیز کو فرض قرار دیا جائے اور نہ سارے ہی کو بالکل ختم کر کے فکر و عمل کی ایسی آوارگی اور آزادی پیدا کی جائے کہ اسلامی زندگی ناپید ہو کر رہ جائے اس لیے ارادۂ حدیث کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا کہ اس کا درجہ قرآن سے دوسرا ہو گیا۔ بہر حال حدیث نے اسی طرح سینہ اور سفینہ سے گزر کر قرنِ اول کو عبور کیا اور صفر ۹۹ھ میں خلیفہ صالح حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ سریرِ آرائے خلافت ہوئے۔ آپ نے اپنے ممالکِ محروسہ میں سرکار جاری کیا کہ حدیث نبویؐ کو جمع کیا جائے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے صرف اہل مدینہ کو نہیں بلکہ تمام اطرافِ مملکت میں حکماء روانہ کیا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ ابو نعیم اصفہانی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

کتب عمر بن عبدالعزیزؓ الی الافاق النظر و احادیث رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوا

حضرت عمرؓ نے اطراف میں خطر روانہ کیا کہ حدیث کو تلاش کرو اور یکجا کرو۔
 مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکرؓ کو جو سرکاری حکم اس سلسلے میں ملا تھا اس کا اجمالی تذکرہ آپ پہلے
 پڑھ چکے ہیں امام بخاریؒ نے اگرچہ قاضی ابوبکرؓ کے اس حکم کا صرف اتنا ہی حصہ درج کیا ہے کہ :
 انظر ما كان من حديث رسول الله ﷺ فاكتبه فاني خفت
 دروس العلم وذهاب العلماء^۱

لیکن ابن سعد نے طبقات میں یہ اضافہ بھی کیا ہے :
 انظر ما كان من حديث رسول الله ﷺ وسلم
 او سنة ماضية او حديث عمر فاكتبه فاني خفت
 دروس العلم وذهاب العلماء^۲
 حدیث رسول اللہ ﷺ، سنت ماضیہ، حدیث عمر کو لکھو کیونکہ مجھے علم کے
 مٹنے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔
 امام محمدؒ نے مؤطا میں یہ خط اس طرح درج کیا ہے کہ

انظر ما كان من حديث رسول الله ﷺ وسلم
 او سنة او حديث عمر او نحو هذا فاكتبه لي فاني
 قد خفت دروس العلم وذهاب العلماء^۳

بعض روایات میں عمرہ کے ساتھ قاسم بن محمد کا نام بھی آیا ہے۔ چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں
 حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکرؓ کو یہ بھی لکھا ہے کہ عمرہ اور قاسم کے پاس جو علم ہے
 اس کو لکھ کر بھیجیں۔

ان تمام بیانات کو پڑھ کر تاریخ کا طالب علم اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ
 الف، امیر المومنین نے صرف ایک ابوبکرؓ کے نام ہی نہیں بلکہ تمام ممالک محروسہ میں
 شلف اطراف میں ایک سے زیادہ حضرات کے نام یہ پیام بھیجا۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ امام زہریؒ
 سے ناقل ہیں کہ :

^۱ بخاری شریف جلد اول - ^۲ طبقات ابن سعد - ^۳ مؤطا امام محمد ص ۳۹۱ -
^۴ تہذیب التہذیب -

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سالم بن عبداللہ کو لکھا تھا کہ صدقات کے
بائے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو معمول رہا ہے وہ ان کو لکھ
کر بھیجیں چنانچہ سالم نے جو کچھ انہوں نے پوچھا تھا وہ ان کو لکھ بھیجا۔

اور امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر
نے امام زہری کا یہ بیان نقل کیا ہے -

ہم کو عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے
دفتر لکھ ڈالے اور پھر انہوں نے ہر اس زمین پر کہ جہاں ان کی حکومت
تھی ایک دفتر بھیج دیا۔

ان کے علاوہ دمشق میں اس وقت شام کے مشہور امام اور فقیہ مکحول دمشقی موجود تھے۔
ابن النذیم نے الفہرست میں ان کی تصانیف کے سلسلے میں کتاب سنن کا ذکر کیا ہے۔ غالباً
یہ کارنامہ بھی امام مکحول نے امیر المومنین کے حکم ہی کی تعمیل میں انجام دیا ہے۔ نیز علامۃ التالیف
امام شعبی کے متعلق جو حافظ سیوطی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

امام شعبی حدیث الی مثله، فقد سبق الیہ الشَّعْبِيُّ فَانتهى روى

عنه انه قال هذا باب من الطلاق جسيم

چونکہ امام شعبی بھی قاضی ابوبکر کی طرح کوفہ میں عمر بن عبدالعزیز ہی کے زمانے میں منصب
قضا پر تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن معین کے حوالہ سے تصریح کی ہے
اس لیے خیال ہے کہ امام شعبی نے کوفہ میں احادیث جمع کرنے کا کام سرکاری حکم کے تحت کیا ہوگا
امام موصوف چونکہ بالغ النظر بیکانہ روزگار فاضل تھے اس لیے آپ نے اس تالیفی کارنامہ
میں صرف احادیث جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو ابواب پر بھی تقسیم کیا۔ امام زہری
امام سالم، امام مکحول اور امام شعبی کے علمی کارناموں کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ آئیے اب
قاضی ابوبکر کے کارنامے کا بھی کچھ حال سن لیجئے۔

اتنی بات تو آپ سن چکے ہیں کہ قاضی ہونے کی حیثیت میں آپ کے نام بھی سرکاری حکم آیا تھا۔
آپ نے اس حکم کی پابجائی کس حد تک کی؟ -

حافظ ابن عبد البر نے تمہید میں امام مالک کی زبانی یہ انکشاف کیا ہے کہ
فتو فی عمر وقد کتب ابن حزم کتبا قبل ان یبعث الیہ۔^۱
عمر بن عبد العزیز کی وفات کے وقت ابن حزم کتابیں لکھ چکے تھے لیکن
ابھی روانہ نہیں کی تھیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل میں حدیث کی
ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں مگر قاضی صاحب کا یہ علمی کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو عمر بن عبد العزیز اللہ
کو پیارے ہو چکے تھے۔

ب: دوسری بات اس خلافت کے فرمان میں یہ سمجھنے کی ہے کہ فرمانِ خلافت میں صرف نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کرنے کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ سنت ماضیہ اور فاروق
اعظم کے فیصلے بھی لکھنے کا حکم دیا تھا سنت سے مقصود اسلام کا وہ محسوس نظام عمل ہے جو
مضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں چھوڑا تھا اور جس پر امت عمل پیرا تھی۔
السنة هي الطريقة السلوكية للجماعة المسلمين المتوارثة عن
النبي صلی اللہ علیہ وسلم۔^۲

حدیث سے روایتِ سنت کا وہ سرمایہ مراد ہے جو لوگوں نے بڑی محنتوں اور عرق ریزیوں
کے بعد فراہم کیا۔ یاد رہے کہ اسناد و روایت کی باتیں اسلام کے علمی سرمایہ میں سنت کے لیے
نہیں بلکہ تاریخِ سنت حدیث کے لیے ہیں۔ سنت تو تواتر اور توارث کے ذریعے ہمیشہ سے
موجود ہے۔ فخر الاسلام بزدوی نے دین کے اسی جھتے یعنی سنت کے متعلق لکھا ہے:
اس کی ایسی حالت ہے جیسے خود کسی معائنہ اور براہِ راست شنیدگی
ہوتی ہے۔

انہوں نے اس راہ سے آنے والی چیزوں کو گناتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں
پیش کیا ہے۔

مثل نقل القرآن والصلوات الخمس واعداد الکعات ومقادیر
الزکوٰۃ۔

تواتر کا علم الاسناد کے مباحث سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ملا محبت اللہ فرماتے ہیں:

ان التواتر لیس من مباحث علم الاسناد
بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھا کر مولانا بحر العلوم نے یہ انکشاف کیا ہے:
التواتر کا لمشافہة فی افادۃ العلم

حافظ ابن حزم نے اس موقع پر ایک تفصیلی بیان قلم بند فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں۔
اسلام کا علمی سرمایہ جو نبوت سے اُمت کو ملا ہے صرف یہ ہے۔

۱۔ قرآن، نمازیں، رمضان کے روزے، حج اور زکوٰۃ اور سارے اسلامی شرائع، یہ سب
بطور تواتر منقول ہو کر اُمت کو ملا ہے۔ اس کو بیان کرنے والے اور پیش کرنے والے ہمیشہ زمانہ
نبوت سے مشرق و مغرب میں اس قدر ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔

۲۔ نقل عام جیسے آیات و معجزات جو خندق اور تبوک میں نمایاں ہوئے۔ احکام حج اور مقادیر زکوٰۃ
ان کو نبوت سے نقل کرنے والے اتنی تعداد میں ہوتے ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں کہ ہر دور کے علماء اور
اہل تحقیق نے اسے قبول کیا ہے اسے مشہور کہتے ہیں۔

۳۔ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کے فیصلے اور تابعین کے فتاویٰ۔ یہ اُمت
کو خبر واحد کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں ان کے نقل کرنے والے ذات نبوت تک ثقہ اور معتبر اشخاص
ہیں۔ ان کا نام و نسب معلوم اور ہر ایک کا حال، زمان، مکان اور عدالت معروف ہے۔ اس طریق
سے جو معلومات آتی ہیں ان میں بیان کرنے والے متعدد ہوتے ہیں گاہ واسطہ بواسطہ اور نام بنام
بات ذات نبوت تک پہنچتی ہے کبھی صحابہ تک اور کبھی کسی ایسے تابعی تک جسے صحابی کی دید کا شرف
حاصل ہوا ہو یا نہ

اس ساری تفصیل کو ہم اپنے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا علمی سرمایہ جو اُمت کو نبوت سے
وراثت میں تواتر، شہرت اور خبر واحد کے ذریعے ملا ہے یہ ہے۔ قرآن، سنت، حدیث، قرآن و سنت
دونوں متواتر ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کا تواتر علمی اور سنت کا تواتر عملی ہے اور سنت کی تاریخ
جس ذریعے سے ہم کو پہنچی ہے یعنی خبر واحد یا خبر خاصہ اس کا نام حدیث ہے۔ حافظ سیوطی نے حدیث
کی یہ تعریف کی ہے۔

نقل السنة ونحوها واسناد ذالك الى من عني اليه بتحديث
او اخبار او غير ذالك له

بان خلافت میں حدیثِ عمرؓ کا اضافہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں حدیثِ عمرؓ کا اضافہ یہ سمجھانے کے لیے کیا گیا ہے کہ پورے
سلام کی تاریخِ نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے جیسا کہ اس کے متعلق کچھ اشارات پہلے ہو
چکے ہیں۔ حدیثِ عمرؓ کے ساتھ اس فرمان میں او نحو هذا کا اضافہ پورے نظامِ خلافت کی طرف
بمقامی کر رہا ہے۔ مولانا عبداللہ لکھنوی نے التعلیق المجد میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ چنانچہ
ماتے ہیں کہ:

من احادیث بقية الخلفاء له

سلام میں خلفاءِ راشدین کی سنت

یہاں ذہنوں میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے کہ خلفاءِ راشدین کی سنت دین میں حجت اور دلیل
ہیں سب کیونکہ امام بخاری نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں یہ بات صراحتاً بتائی ہے
چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں۔

وكتب عمر بن عبدالعزيز الى ابي بكر بن حزم انظر ما كان من
حدیث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه لي فاني
خشيت دروس العلم وذهاب العلماء ولا يقبل الا حدیث
النبي صلى الله عليه وسلم وليفشوا وليجلسوا حتى يعلم من
لا يعلم فان العلم لا يهلك حتى يكون سراً۔^۱

یہ دوسرا اس لیے پیدا ہوا کہ اس پوری عبارت کو عمر بن عبدالعزیز کی عبارت تصور کر لیا گیا حالانکہ
مان کی عبارت صرف ذہاب العلماء تک ہے۔ حافظ ابونعیم اصفہانی نے مستخرج میں اس کی
تصریح کی ہے اور لا يقبل سے امام بخاری کی اپنی عبارت شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ عینی

۱ تدریب الراوی ص ۲۲۔ ۲ التعلیق المجد ص ۳۹۲۔ ۳ صحیح بخاری۔

سے رقمطراز ہیں۔

فاذا كان كذلك يكون هذا من كلام البخاری اور ردء عقیب کلام
عمر بن عبدالعزیز بعد انتہائے یہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبارت مذکورہ کے بعد جب اس فرمان کی سند پیش کی تو تصریح کر دی کہ یہ
تعلیق صرف ذہاب العلماء تک ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

حدثنا الحلاء بن عبد الجبار حدثنا عبد العزيز بن مسلم عن
عبد الله بن دينار بذلك يعني حديث عمر بن عبد العزيز الى
قوله ذهاب العلماء

علامہ کرمائی فرماتے ہیں کہ :

والمقصود منه ان العلماء روى كلام عمر بن عبد العزيز الى قوله
ذهاب العلماء فقط

اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فرمان میں حدیث رسول کے سوا کچھ اور لکھنے سے منع کیا گیا تھا
ایک سنگین غلط فہمی ہے۔ اس موضوع پر جمہور اُمت کی ہمیشہ سے برے طے شدہ پالیسی رہی ہے جیسا
کہ آپ پیچھے پڑ چکے ہیں کہ خلافت راشدہ کی حیثیت دین میں معیار حق اور حجت و دلیل کی ہے
اور اسلام میں سنت کا اطلاق نبوت اور خلافت دونوں کے اعمال پر ہوا ہے۔ قرآن میں یہ بات
دلالت اور ارشادات نبوت میں صراحت آئی ہے۔ قرآنی آیات آپ پہلے سن چکے ہیں۔ آئیے خاص
اسی موضوع پر ارشادات نبوت بھی گوش گزار فرمائیے :

حضرت عراب بن ساریہ کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا :

فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ
واياکم ومحدثات الامور فان کل محدثة بدعة یثم

تم میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم جانو اور اس کو دانتوں سے

۱۔ عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۳۰۔ ۲۔ صحیح بخاری۔ ۳۔ عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۳۰

۴۔ مستدرک حاکم ج ۱ ص ۹۶۔

دباؤ۔ نئی نئی باتوں سے بچ کر رہو۔ یاد رکھو کہ ہر نئی بات بدعت ہے۔
 ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں :
 اس لیے کہ خلفاء راشدین نے دراصل آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے اور
 ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل
 کیا اور یا اس لیے کہ انہوں نے خود قیاس اور استنباط کر کے اس کو اختیار
 کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین نے جو کام اپنے تفقہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے سمجھ کر
 اختیار کیا ہے وہ بھی سنت ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے تحت امت
 کو اس کے تسلیم کرنے سے بھی چارہ نہیں ہے۔

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ خلفاء راشدین کی سنت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہ
 جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو اور جو چیز آپ سے مروی نہ ہو اور خلفاء راشدین
 میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا اس کے متعلق حکم دیا ہو تو وہ سنت نہ کہلاتے گی چنانچہ مشہور
 عالم امیر میانی محمد بن اسماعیل لکھتے ہیں :

قواعد شرعیہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے
 کا حق نہیں ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عامل نہ تھے۔

لیکن یہ تحقیقی بات نہیں ہے کیونکہ

خلفاء کی سنت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے
 موہوموافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالف نہ ہو کیونکہ جو حکم انہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے
 جاری کیا ہے وہ بھی سنت ہے حالانکہ یہ ایک یقین حقیقت ہے کہ ان کا اپنا ذاتی قیاس و استنباط
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ اگرچہ اصل مقیاس علیہ منقول ہو۔ مثلاً دیکھتے
 کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکر نے شرابی کو چالیس چالیس کوڑے سزا دی
 اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں ہے مگر حضرت عمر نے اتنی کوڑے سزا دی ہے یہ بھی سنت
 ہے حضرت علی فرماتے ہیں کہ :

جلد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اربعین و ابوبکر اربعین و عمر
ثمانین و کل سنة ۱۰

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان کا بھی ذکر کیا ہے۔
و اتحما عثمان ثمانین و کل سنة ۱۰

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور
کہنے والے حضرت علی خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس
میں حضرت عمر، حضرت عثمان کے اس فعل کو بھی وہ سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر حضور انور صلی اللہ
وسلم کے عمل کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں :

هذا دليل ان علياً كان معظماً لا تار عمر وان حكمه وقوله سنة
وامرأه حق وكذلك ابوبكر ۱۰

اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ :

قول الشيخين حجة اذا اتفقا لا يجوز العدول عنه وان اتفقا
الائمة الاربعة ايضا حجة ۱۰

ابوبکر و عمر کا قول حجت ہے جب دونوں متفق ہو جائیں تو اس سے ہٹنا
جائز نہیں ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

عمل اهل المدينة الذي يحتج به ما كان في زمن الخلفاء الراشدين ۱۰

اہل مدینہ کا وہ عمل حجت ہے جو زمانہ خلفاء راشدین میں ہوا ہو۔

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ اسلام کا پورا نقشہ نبوت اور خلافت سے مل کر بنتا ہے۔ خیر یہ
بات تو حدیث و سنت میں فرق بتانے کے لیے ضمناً آگئی ہے بتایہ رہا تھا کہ امیر المؤمنین عمر
بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث کا حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا ان میں مدینہ کے قاضی
ابوبکر، امام زہری، امام سالم اور کوفہ میں امام شعبی، دمشق میں امام مکحول کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگرچہ

۱۰ صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۲ - ۱۰ معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۸۱ - ۱۰ شرح مسلم ج ۲ ص ۷۷ -

۱۰ منہاج السنہ ج ۳ ص ۱۶۲ - ۱۰ زاد المعاد ج ۱ ص ۱۶۸ -

تاریخ میں امام نافع کے بارے میں کوئی مثبت تصریح نہیں ہے لیکن اگر ہم ان دو باتوں کو ملا لیں کہ آپ نے یہ حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا تھا۔

اور ساتھ ہی امام نافع کے بارے میں امام ذہبی کی یہ تصریح بھی پڑھیں کہ
بعث عمر بن عبد العزیز نافعاً الى اهل مصر ليعلمهم السنن
عمر نے حضرت نافع کو مصر والوں کے لیے معلم سنن بنا کر روانہ فرمایا۔

تو پھر یہ یقین آجاتا ہے کہ امام نافع کو بھی مصر میں یہ حکم ضرور پہنچا ہو گا اور انہوں نے بھی اس حکم کی تعمیل میں ضرورتاً دوین سنن کا کام کیا ہو گا بلکہ میں تو جزیرہ کے مشہور قاضی میمون بن مہران کو بھی اسی میں داخل کرتا ہوں۔

ان تمام تصریحات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۹۸ھ سے ۱۰۱ھ تک حدیث کے نام پر امیر المومنین کے اس فرمان کے نتیجے میں یہ علمی سرمایہ منقذہ شہود پر آگیا۔
۱۔ کتب قاضی ابوبکر بن حزم۔

۲۔ وفاتہ امام زہری

۳۔ ابواب امام شعبی

۴۔ کتاب السنن امام مکحول

۵۔ کتاب الصدقات امام سالم

حضرت عمر بن عبد العزیز نے ۲۵ رجب ۱۰۱ھ کو رحلت فرمائی۔ آپ کی مدت خلافت کل دو سال پانچ ماہ ہے۔ یہ تصانیف اسی زمانہ کی یادگار ہیں صحابہ کی تصانیف کو بھی اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰۱ھ تک خالص حدیث کے موضوع پر تیرہ کتابیں منقذہ صحت پر آچکی تھیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانے میں جن بزرگوں نے کتابیں تالیف کی ہیں۔ یہ سب کبار تابعین ہیں۔ ان میں امام نافع، امام سالم، امام زہری اور امام شعبی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے اساتذہ ہیں اور امام شعبی کے متعلق تو حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ یہ فن حدیث میں امام اعظم کے شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں چنانچہ امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ فن حدیث میں امام ابو حنیفہ کا نام لیا ہے ساتھ ہی یہ لکھ دیا ہے۔

وهو اکبر شيخ لابي حنيفة۔

جمع قرآن - بیان قرآن پر ایک اہم نکتہ تفسیری

یہاں یہ سرچنے کی بات ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ کام کیوں کیا۔
یہ بات تو آپ سُن چکے ہیں کہ دورِ خلافت میں جمع قرآن، قرأت قرآن کے ساتھ تدوینِ سنن کا کام کیوں نہیں ہوا۔

در اصل جہاں تک میں سمجھا ہوں جمع قرآن، قرأت قرآن یا تدوینِ سنن تینوں کام اپنے اپنے وقت میں منشاءِ الہی کے مطابق منصبہ شہود پر آتے ہیں۔

منشاءِ الہی سے میری مراد یہ ہے کہ جو کچھ اور جیسا کچھ ہوا ہے یہی قرآن کا وعدہ تھا۔ آپ پڑھ آتے ہیں کہ سورۃ قیامہ کی آیت

إِنَّا عَلَيْنَا جُمُعُهُ وَقرآنہ فَاذَا قَرَأْنَاكَ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ
خُبْرًا بَيَّانًا۔

میں ان عَلَيْنَا بَيَّانہ سے قرآن کی دوسری آیت

أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ

کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان مراد ہے کیونکہ سورۃ قیامہ کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور انور کو نزولِ وحی کے وقت یہ حکم دیا ہے۔

لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ

اس کا منشاء یہ ہے کہ آپ نزولِ وحی کے وقت سنا کریں حضرت جبریل کے ساتھ پڑھانہ کریں اور مستقبل میں قرآن کے بارے میں تین وعدے فرمائے ایک جمع قرآن دوم قرأت قرآن۔

سوم بیان قرآن۔ چنانچہ ارشاد ہے :

إِنَّا عَلَيْنَا جُمُعُهُ وَقرآنہ فَاذَا قَرَأْنَاكَ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ
عَلَيْنَا بَيَّانًا۔

اللہ سبحانہ نے اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ قرآن کے بارے میں بالکل مطمئن رہیں اس کو جمع کرنا، پڑھوانا اور پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔ اس

آیت کی تفسیر میں اگرچہ حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ تشریح آئی ہے :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کے وقت بڑی مشقت سے

دو چار ہوتے اور آپ ہونٹوں کو ہلاتے تھے یعنی وحی سننے جاتے اور پڑھتے جاتے مگر باؤز بلند نہیں بلکہ صرف ہونٹوں کو ہلاتے تھے اس پر اللہ پاک نے یہ حکم نازل کیا لا تحرک بہ۔۔۔ الخ جمع سے مراد سبب میں جمع کرنا ہے اور قرآن سے مراد حضور کا پڑھنا ہے۔ خاتم قرآن کا مطلب یہ ہے کہ چپ رہو اور کان لگا کر سنو شہد ان علینا بیانا میں بیان کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ہم تمہیں پڑھا دیں گے۔

اس روایت کے بائے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :
اس روایت میں مرفوع حدیث صرف اسی قدر ہے جس قدر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کے متعلق ہے باقی آیت کی تفسیر حضرت ابن عباس کی رائے ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر ابن عباس پر یہ تنقید کی ہے :
فقیر کہتا ہے کہ یہ تفسیر محل نظر ہے کیونکہ اس تفسیر پر تینوں الفاظ جمع، قرآن اور بیان کا مٹنا ایک ہے تینوں الفاظ کو ایک ہی معنی کا جامہ پہنانا شان بلاغت نہیں ہے۔ پھر شہد ان علینا بیانا کا ایسا مطلب بتانا جو بغیر معقول تاخیر کے واقع ہوا ہو اور بھی شان بلاغت کے منافی ہے کیونکہ لفظ ثم کلام عرب میں تراخی کے لیے آتا ہے یہ اس کے بعد شاہ صاحب نے اس آیت کی جو تشریح فرمائی ہے وہ بھی ان ہی کی زبان سے سن لیجئے :

زیادہ دیکھی تفسیر یہ ہے کہ ان علینا جمعہ کا یہ مطلب لیا جاتے کہ قرآن کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کا وعدہ ہمارے ذمہ ہے۔ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ امت کے قاریوں کو اور نیز رائے عامہ کو تلاوت کی توفیق دینا ہمارا کام ہے تاکہ سلسلہ تواتر قائم رہے بالفاظ دیگر حق سبحانہ کا ارشاد ہے کہ اے پیغمبر تم فکر نہ کرو اور اس کے یاد کرنے کی مشقت نہ اٹھاؤ

دیکھو ہم نے قرآن کے لیے وہ بات اپنے ذمہ کر لی ہے جو تمہارے فرض منصبی سے بھی کسی درجہ پیچھے ہے یعنی قرآن کو مصاحف میں جمع کرا دینا اور اس کو اُمت سے پڑھا دینا۔ لہذا تم اپنا دل اس کے یاد کرنے میں نہ لگاؤ بلکہ جب ہم بزبان جبریل پڑھیں اسے سنو۔ پھر ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح۔ ہم ہر زمانے میں قرآن کی تشریح اور اس کے شان نزول کو بیان کرنے کی ایک جماعت کو توفیق دیں گے تاکہ وہ لوگ قرآن کا مصداق بنائیں۔

جمع قرآن اور قرأت قرآن دونوں ایک وقت میں ہوتے ہیں اور تاریخی لحاظ سے یہ شیخین زمانہ ہے کیونکہ قرآن میں ان دونوں کو دار و عطف کے ذریعے جمع کیا گیا ہے ان علینا جمعہ وقرآنہ، جیسے جت کا کام فاروق اعظم کے مشورے سے صدیق اکبر کے زمانے میں ہوا ایسے پورے قرآن کے حفظ و قرأت کا سلسلہ بھی فاروق اعظم کے زمانے میں ہوا۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں :

اول شروع حفظ آل از جانب ابی بن کعب و عبداللہ بن مسعود بودہ است
در زمان عمر۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جمع قرآن یعنی قرآن کو کتابی صورت میں کر کے بعد حفظ و قرأت قرآن کی طرف فاروق اعظم نے رمضان میں قرآن کی سالگرہ مناکر اقد فرمایا تھا بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ فاروق اعظم نے حفظ ہی کی خاطر سرکاری خزانے سے وظائف اور معلمین قرآن کی تنخواہیں مقرر کیں جیسا کہ ابن الجوزی نے سیرۃ العمرین میں لکھا ہے۔ خا بدوش بدوول کے لیے قرآن حکیم کی جبری تعلیم کا قانون نافذ کیا۔ چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا چند آدمیوں کے ساتھ اس کام پر لگایا کہ قبائل میں پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جسے قرآن حکیم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اسے سزا دے۔

ظاہر ہے کہ امتحان کی منزل اسی وقت درپیش آتی ہے جبکہ پہلے اس مقصد کی خاطر پوری آبادی میں تعلیم قرآن کا ایک ہمہ گیر نظام قائم کر دیا گیا ہو۔ جن صحابہ کو پورا قرآن یاد ہو گیا تھا۔

فاروق اعظم نے ان کو بلا کر فرمایا۔ شام کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداء حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبادہ بن الصامت کو اس مشن پر روانہ کیا۔ حضرت عمر نے ان کو ہدایت کی کہ پہلے حمص جاتیں وہاں کچھ روز قیام کر کے جب قرآن کی تعلیم عام ہو جائے تو ایک اسی جگہ قیام کر لے۔ باقی دو میں سے ایک دمشق اور ایک فلسطین جاتے۔ حافظ ذہبی نے طبقات القراء میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالدرداء کا دمشق میں معمول یہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تشریف فرما ہوتے ارد گرد قرآن پڑھنے والوں کا ہجوم ہوتا۔ حضرت ابوالدرداء دس دس آدمیوں کی الگ الگ جماعت بنادیتے اور ہر جماعت پر ایک قاری مقرر کر دیتے اور خود ٹہلتے پڑھتے جب طالب علم پورا قرآن یاد کر لیتا تو حضرت ابوالدرداء اسے اپنی شاگردی میں لے لیتے۔ ایک بار حضرت ابوالدرداء کی خاص کلاس کے طلبہ کا شمارہ کیا گیا تو ان کی تعداد سولہ سو حفاظ پر مشتمل تھی۔

حضرت عمر نے قرآن کے حفظ و قرات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے اور بہت سے وسائل اختیار کیے ضروری سورتوں مثلاً البقرہ، الفار، المائدہ، الحج اور النور کی نسبت حکم دیا کہ سارے عامہ کو اس قدر قرآن ضروری یاد ہونا چاہیے۔

سرکار جاری کر دیا کہ جو لوگ قرآن سیکھ لیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں فوجیوں کو ہدایت تھی کہ قرآن شریف یاد کریں۔ گاہ گاہ دفاتر سے قرآن خواں حضرات کے رجسٹر منگاتے پڑھتے تھے ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان گنت لوگ قرآن پڑھ گئے اور حافظوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ایک بار فوجی افسروں کو خط لکھا کہ حفاظ قرآن کو میرے پاس روانہ کیا جائے تاکہ میں ان کو قرآن کی تعلیم کے لیے مختلف جگہ روانہ کروں تو حضرت سعد نے جواب دیا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ ہیں۔

الغرض کتابی صورت میں جمع کے ساتھ فاروق اعظم نے حفظ و قرات کا ایک بندھا ٹکانہ قائم کر دیا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے صحیح فرمایا ہے:-

امروز ہر کہ قرآن می خواند از طوائف مسلمین منت فاروق در گردن اوست۔

آج جو بھی قرآن پڑھتا ہے اس کی گردن پر فاروق اعظم کا احسان ہے۔

بتنا یہ چاہتا ہوں کہ جمع قرآن در مصاحف اور قرات قرآن کا وعدہ الہی زمانہ خلافت راشدہ

میں پورا ہوا۔ اور ان علینا جمعہ و قرآنہ کی علمی تفسیر ہو گئی لیکن آخری وعدہ قرآن کے متعلق جو اسی آیت میں شہد ان علینا بیانہ کے ذریعے کیا گیا ہے وہ خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ دیر کے بعد خلافت عمر بن عبدالعزیز میں پورا ہوا۔ کیونکہ یہ وعدہ تم کے ذریعے آیت میں آیا ہے اور آپ سُن آئے ہیں کہ عربی زبان میں شہد تراخی کے لیے ہی آتا ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے شہد ان علینا بیانہ کی تشریح یہ کی ہے :

ہم اسے ذمہ ہے قرآن کی توضیح یعنی ہر زمانے میں ہم ایک جماعت کو قرآن کی لغوی تشریحات اور اس کی شان نزول بیان کرنے کی توفیق دیں گے تاکہ وہ لوگ احکام قرآنی کا مسداق بیان کریں اور یہ بات یاد کر سنے اور تمہاری تبلیغ کے بعد ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی آیات میں تشابہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن عزیز کے مبتنی ہیں۔ اے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مبتنی ہونے کی حیثیت کو قرآن نے بتایا ہے کہ :

أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَرْفَعُونَ

چونکہ حضور انور قرآن کے مبتنی ہیں اس لیے حضور کی سنت ہی قرآن کا بیان ہے۔ اس بیان کی تدوین کے لیے ضروری ہے کہ حفظ قرآن کے دیر بعد ہو۔ کیونکہ اللہ پاک نے اول توجیع قرآن کے بعد بیان قرآن کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر اس کو تم کے ذریعے پیش کیا ہے جو عربی زبان میں قطعاً تراخی کے لیے آتا ہے۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ بیان قرآن سے مراد بیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور جمع قرآن کی طرح اس بیان کی بھی تدوین ہوئی ہے لیکن ایک عرصہ بعد اور یہ حضور انور کے دنیا سے روانہ ہونے کے پورے ستاسی سال بعد ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

در وعد بیان کلمہ تم کہ برائے تراخی است ذکر نمودن می فہاند کہ در وقت جمع قرآن در مصاحف اشتغال بتلاوت آن شائع شد و تفسیر آن من بعد بظہور آمد و در خارج ہم چنین متحقق شد۔

لہذا تدوین سنن یعنی بیان قرآن کا کام زمانہ خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ قانونی طور پر عمر بن عبدالعزیز کے ایام سے خلافت راشدہ کے بعد ہوا۔

عمر اول اور عمر ثانی کے عمل میں ہم آہنگی

اللہ اکبر! دونوں کے عمل میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ جنگ یمامہ میں صحابہ کی ایک جماعت جام شہادت نوش کر گئی۔ قرآن کے حافظوں کے اس قدر اچانک نقصان سے قرآن کی حفاظت میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہوا۔ فاروق اعظم نے اس خطرے کو محسوس کیا اور فرمایا۔

یمامہ کے دن قاری قرآن جام شہادت نوش کر گئے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر قرآن قرآن ایسے ہی جام شہادت نوش کرتے رہے تو قرآن کا زیادہ حصہ چلا جائے گا اس لیے جلد ہی قرآن کو یکجا کرنے کا حکم دیجئے۔

یہ تو یمامہ کے دن قاریوں کی شہادت سے حضرت عمر کو اندیشہ ہوا۔ ایسے اب دنیا سے وہ نصرت ہو رہے ہیں جنہوں نے قرآن کے بیان کو مدینے کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے اور جنہوں نے قرآن کی ہدایات پراٹھی ہوئی کامل ترین، موثر ترین اور محبوب ترین زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے قرآن مجید سے اقامت صلاۃ کا حکم سنا تھا مگر انہوں نے اس کی عملی تصویر اور اس کی صحیح کیفیت اسی وقت معلوم کی جب آپ کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور آپ کے رکوع و سجود کی کیفیت دیکھی جس کو انہوں نے

سمع لہ ازیرا کا زید المرہل

کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے اور اب ان کی جگہ وہ آ رہے ہیں جنہوں نے جمال جہاں آرا کو نہیں دیکھا اس لیے عمر بن عبدالعزیز کو نبوت کی اوداؤں اور اعمال کے حافظوں کو جانا دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں محبوب عالم کی ادائیں ان کے رخ نور کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہونے سے داستان تاریخ بن کر نہ رہ جائیں اور اس اندیشے کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا۔

خشیت دروس العلم و ذہاب العلماء

حضرت عمر کو قاریوں کے اور عمر ثانی کو علماء کے اٹھ جانے کا یکساں اندیشہ ہوا۔ دونوں کے تاثرات کو ایک ترازو میں رکھ کر تو ایسے۔ آپ کو محسوس ہو گا کہ دونوں جگہ ایک ہی روح کام کر رہی ہے۔

تدوین حدیث کی اولیت کا شرف

امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جمع حدیث کا جو حکم دیا اور جن جن اکابر نے اس حکم کی تعمیل میں کام کیا اس کی داستان تو آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان میں قاضی ابوبکر کے علاوہ زہری، شعبی اور مکحول بھی ہیں چونکہ یہ چاروں معاصر ہیں اس لیے یقین سے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ سب سے پہلے اس موضوع پر کس نے تدوین کا کام انجام دیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں عمر بن عبدالعزیز کے اس خط کی شرح کرتے ہوئے جو قاضی ابوبکر کے نام امام بخاری نے درج کیا ہے لکھا ہے۔

يستفاد منه ابتداء تدوين الحديث۔

علامہ عسقلانی نے بھی شرح بخاری میں اس کی تہنوتی کی ہے۔ اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ابوبکر مدونِ اول ہیں لیکن چونکہ قاضی صاحب کا کارنامہ شاہراہِ عام پر نہیں آیا اس لیے ان کا نام مدونین میں زیر بحث نہیں آتا۔ تہذیب التہذیب میں امام مالک سے منقول ہے کہ میں نے ان کتابوں کے بارے میں قاضی صاحب کے صاحبزادے عبدالرحمن بن ابی بکر سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ضائع ہو گئیں۔ اس لیے حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں جلال الدین السیوطی نے الفیہ اور تدریب میں اور امام مالک اور عبدالعزیز در اور دی نے مدونِ اول کی حیثیت سے امام زہری کا نام پیش کیا ہے۔ لیکن اولیت کا یہ شرف امام زہری کو صرف تدوین میں ہے ورنہ جہاں تک حدیث کی ترویج کا تعلق ہے اس کی اولیت کا شرف کوفہ میں امام شعبی کو حاصل ہے۔ بالفاظِ دیگر حدیث کی تدوین کا شرف اگر اہل مدینہ کو حاصل ہے تو اس کی ترویج پر کوفہ والوں کو فخر ہے۔

دوسری صدی ہجری میں علم حدیث

پہلی صدی کے آخر میں خلیفہ راشد کے حکم سے جمع و تدوین حدیث کی جو صبح صادق طلوع ہوئی اسے دوسری صدی میں اتنی ترقی ہوئی کہ تصنیف و تالیف کا آفتاب نکل آیا اور احادیثِ مرفوعہ کے

ساتھ صحابہ کے آثار و تابعین کے فتاویٰ بھی اس دور کی تصانیف میں مرتب و مدقن کر دیے گئے۔
 دوسری صدی میں جن اکابر نے موضوع حدیث پر تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے یہ تو ممکن
 نہیں ہے کہ ہم سب کا ذکر کریں لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ ہم بالکل ان کو نظر انداز کر دیں کیونکہ یہی وہ
 اکابر ہیں جو دو راویوں کے مصنفین کے جانشین اور ترکہ علم حدیث کے وارث ہوئے ہیں۔ تحریر و
 تالیف کے لحاظ سے بھی اور اپنی جلالت علمی کے اعتبار سے بھی۔
 اس لیے ہم یہاں چند گرامی قدر ہستیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ محدثین اور مؤرخین نے اس دور
 کے مصنفین میں ایک سے زیادہ اکابر کا نام لیا ہے ان کے متعلق تصریح ہے کہ ان اکابر نے اپنے
 اپنے وقت میں تصنیف کا کام کیا ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اولیت کا شرف
 دوسری صدی میں کسے حاصل ہے؟

امام اعظم کے بارے میں حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے:
 انه اول من دون الشریعة ورتبہ ابواباً^۱
 سعید بن ابی عروبہ کے متعلق حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:
 هو اول من صنف الابواب بالبصرة^۲
 ربیع بن صبیح کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے راہر مزنی کی مشہور کتاب المحیث الفصل
 کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ:
 انه اول من صنف بالبصرة^۳
 امام عبدالملک بن عبدالعزیز کو امام ذہبی نے صاحب التّصانیف لکھ کر بتایا ہے کہ امام احمد
 کا بیان ہے کہ:
 اول من صنف الكتب^۴
 امام معمر بن راشد کا حافظ ذہبی نے تعارف پیش کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ:
 كان اول من صنف باليمن^۵
 آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ اولیت چسپاں ہے۔ ان تصریحات

۱۔ تبیین الصغیر ص ۳۶۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۷۔ ۳۔ تہذیب ج ۲ ص ۲۴۸

۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۹۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۹۔

کو دیکھ کر ایک ناواقف حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بہتوں نے یہ کہہ کر اس مشکل کا یہ حل تلاش کیا ہے کہ مدونین کے نام میں جن جن کا نام لیا جاتا ہے سب صحیح ہے اور اس کا تعلق مختلف ائمہ اور شہروں سے ہے۔ مگر شہر میں تالیف کا کام ابن جریر نے شام کے شہر یربوت میں امام اوزاعی نے کوفہ میں سفیان ثوری نے بصرہ میں حماد بن سلمہ نے، واسط میں ہشیم نے یمن میں معمر نے خراسان میں عبداللہ بن المبارک نے، رے میں جریر بن عبد الحمید نے انجام دیا ہے لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں،

یہ سب اکابر ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں اس لیے حتماً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع اولیت کا شرف کسے حاصل ہے یہ

در اصل بات یہ ہے کہ یہاں تدوین اور تصنیف میں کچھ اختلاط ہو گیا ہے۔ ان دونوں کو اگر الگ الگ رکھ کر عقدہ کو حل کیا جائے تو آسانی سے معاملہ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مدونین کی فہرست میں تو آپ امام زہری، امام شعبی، امام مکحول اور قاضی ابوبکر کے اسماء گرامی سن چکے ہیں۔ یہ دور دور تدوین ہے اور اس کا آغاز ۱۵۰ھ سے شروع ہو کر ۲۰۰ھ کے ختم پر ہے۔ اس کے بعد دور تصنیف شروع ہوا ہے۔ دور تصنیف میں پہلے کا سہرا کس کے سر ہے اس سلسلے میں عبدالملک بن جریر ۱۵۰ھ، ابو حنیفہ ۱۵۰ھ، محمد بن اسحاق ۱۵۰ھ، سعید بن ابی عروبہ ۱۵۶ھ، الربیع بن صبیح ۱۶۰ھ، امام مالک ۱۶۹ھ، حماد بن سلمہ ۱۶۶ھ، سفیان ثوری ۱۷۰ھ، اوزاعی ۱۷۰ھ، ہشیم ۱۷۰ھ، عبداللہ بن مبارک ۱۷۰ھ، معمر بن راشد ۱۷۰ھ، جریر بن عبد الحمید ۱۷۰ھ، سفیان بن عیینہ ۱۹۰ھ، یث بن سعد ۱۹۰ھ اور شعبہ بن الحجاج ۱۹۰ھ۔ یہ اکابر اگرچہ معاصر ہیں مگر ان کا تعلق مختلف ائمہ سے ہے اور یہ اسلامی مملکت میں متفرق شہروں مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ، دمشق، واسط، خراسان، یمن، رے اور مصر میں کام کر رہے ہیں اور ان کا یہ کام ایک منہج پر نہیں بلکہ مختلف منابج پر ہوا ہے۔ جمع حدیث کی حد تک اس دور کے مصنفین میں اولیت بلاریب مکہ میں ابن جریر، بصرہ میں ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ مختلف احادیث کو صرف کتاب کا لبادہ پہنا دیا جائے۔ ڈاکٹر السباعی نے درست لکھا ہے کہ :

ان کا کام حضور انور کے ارشادات، احوال صحابہ، فتاویٰ تابعین کو یکجا کرنا تھا۔
حافظ ابن حجر نے یہ بھی انکشاف کیا کہ
كانوا يصنفون كل باب على حدة ۱۵

امام اعظم شرائع کے مدونِ اول ہیں

لیکن ابھی تک کسی ترتیب اور بتویب کے ساتھ یہ کام نہیں ہوا۔ چونکہ تصنیف کی بالکل ابتدا تھی اس لیے کیف مآلفق حدیثوں کو سمیٹنا ہی ان بزرگوں کے پیش نظر تھا اور اس اولیت کا شرف حتماً ابن جریر، ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے لیکن جہاں تک احکام کو پیش نظر رکھ کر بتویب اور ترتیب فقہی کا تعلق ہے اس میں اولیت کا شرف یقیناً امام اعظم کو حاصل ہے جیسا کہ حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

انه اول من دون الشریعة ورتبہ البواب ۱۶
اور یہ بھی سیوطی نے بتایا ہے کہ ابو حنیفہ صرف مدونِ اول ہی نہیں بلکہ اس میں وہ یگانہ بھی ہیں۔ لکھا ہے :

الفرد بها ولم يسبق ابا حنيفة احده ۱۷
چونکہ دورِ اول میں بتویب کا سہرا بھی کوفہ میں امام شعبی کے سر ہے اس لیے اس دورِ ثانی میں بھی بتویب و ترتیب احکام کا سہرا کوفہ ہی میں امام شعبی کے شاگرد ابو حنیفہ کے سر رہا۔
حافظ عسقلانی فرماتے ہیں :

اما جمع حديث الى مثل في باب واحد فقد سبق اليه الشعبي

فانه روى عنه انه قال هذا باب من الطلاق جسيم ۱۸

مدینہ میں اس کا آغاز امام مالک سے ہوا ہے چنانچہ سیوطی رقمطراز ہیں :

ثم تبعه مالك بن انس في ترتيب الموطأ ۱۹

یعنی تدوین شرائع اور ان کی ترتیب و بتویب میں امام اعظم مدونِ اول ہیں بلکہ وہ اس میں

۱۵ مقدمہ فتح الباری ص ۴ - ۱۶ تبیض الصغیر ص ۳۶ - ۱۷ تبیض الصغیر ص ۳۶

۱۸ السنہ ص ۱۲۴ - ۱۹ تبیض الصغیر ص ۳۶ -

یگانہ ہیں اور موٹا میں امام مالک ان کے مقتدی ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے۔

۱۔ حافظ ابن خزم نے تصریح کی ہے کہ امام مالک نے موٹا کی تالیف یقیناً یحییٰ بن سعید انصاری کی وفات کے بعد کی ہے اور یحییٰ کی وفات ۱۴۳ھ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ان الموطا الفہ مالک بعد موت یحییٰ بن سعید الانصاری
بلا ثلث وکانت وفاتہ یحییٰ فی سنۃ ثلاث واربعین ومانۃ

۲۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن فرحون نے ابو مصعب احمد بن عوف الزہری سے جو امام مالک کے شاگرد ہیں اور امام مالک سے موٹا کے راوی ہیں نقل کیا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے امام مالک سے فرمائش کی تھی کہ:

ضع للناس کتاباً أحملہ علیہ

امام مالک نے اس سلسلے میں کچھ کہا تو ابو جعفر منصور نے جواب دیا کہ

ضع فما أحدم یوم أعلم منک

آخر امام موصوف نے موٹا کی تصنیف شروع کی مگر ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ ابو جعفر سربراہ مملکت عباسی کا انتقال ہو گیا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ موٹا کی تصنیف منصور کی فرمائش پر خود اس کے زمانے میں شروع ہوئی اور اس کی وفات کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچی۔ منصور کی وفات ۶ رذی الحجہ ۱۵۸ھ میں ہوئی ہے اور اس کی جگہ اس کا فرزند محمد المہدی مسند خلافت پر متمکن ہوا اور اسی کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں موٹا کی تصنیف مکمل ہوئی۔

۳۔ امام اعظم کی تصانیف سے امام مالک کے استفادے کا ذکر کتب تاریخ میں صراحت سے مذکور ہے۔ قاضی ابوالعباس احمد بن محمد بن عبد اللہ بن ابی العوام اخبار ابی حنیفہ میں بسند متصل عبدالعزیز بن محمد دراوردی سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالک امام اعظم کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔

یہ شہادتیں کہہ رہی ہیں کہ موٹا بعد میں تصنیف ہوا ہے اور موٹا سے پہلے یعنی ۱۴۳ھ

اور شاہ کے درمیانی عرصہ میں امام اعظم کی تصانیف منقہ شہود پر اچکی تھیں اس لیے البواب احکام کے موضوع پر تصنیف کے میدان میں اولیت کا شرف امام اعظم ہی کو حاصل ہے۔

حدیث میں امام اعظم کی تصنیف

امام اعظمؒ میں جامع کوفہ کی اس مشہور علمی درسگاہ میں جلوہ افروز ہوتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعود کے زمانے سے باقاعدہ چلی آرہی تھی تو آپ نے جہاں فقہ کا عظیم الشان فن اجتماعی نعمت سے مدون کیا وہیں فقہ کے البواب پر مشتمل حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی صحیح اور معمول پر روایات سے انتخاب فرما کر مرتب کیا اور اس کو اپنے تلامذہ کے سامنے لیکچرز کی صورت میں پیش کیا اسی کا نام کتاب الآثار ہے اور آج امت اسلامیہ کے علمی سرمایہ میں احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم کتاب یہی ہے جو دوسری صدی کے ربیع ثانی کی تالیف ہے۔ امام اعظم سے پہلے حدیث نبوی کے جتنے مجموعے اور صحیفے تھے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے کینما افق حدیثوں کے مجموعے تیار کیے تھے۔ گویا جس کام کی ابتدا بقول حافظ ابن حجر عسقلانی، امام شعبی نے کی تھی اسی کو امام اعظم نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل فرمایا اور بعد کے آنے والوں کے لیے ترتیب و تبویب کی شاہراہ قائم کر دی۔

کتاب الآثار اس دور کی تمام تصانیف سے پہلے کی تصنیف ہے اس دور کے تمام مصنفین ابن جریر کو چھوڑ کر امام اعظم کے بعد ہیں۔ سب اگرچہ قرن ثانی کی پیداوار اور معاصر ہیں۔ مگر امام اعظم سے کسی نہ کسی درجے میں متاخر ہیں اور صرف متاخر نہیں بلکہ امام اعظم کی جلالت علمی کے قدردان ہیں۔

کتاب الآثار کا طریق تالیف

کتاب الآثار کا طریق تالیف، تعلیم کتب اور تعلیم روایات کا نہیں بلکہ تعلیم علوم و فنون کا ہے۔ یعنی بذریعہ درس و املا شیوخ سے علم حاصل کرنا، تمام علوم اور مہمات فنون عربیہ کے لیے صدرا قول میں یہی طریق رائج تھا۔ آغاز میں اس طرز تالیف کی بنیاد یوں پڑی کہ تلامذہ اپنے حفظ و یادداشت کے لیے اساتذہ کے تمام امالی یا ان کا خلاصہ لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ چیز اس قدر مقبول ہوتی کہ اقسام تصنیف میں ایک خاص قسم بن گئی اور

خود اساتذہ اور علماء بر فن اپنی مرویات بطور تصنیف مرتب کرنے لگے اس طرح کہ حلقہ درس میں مطالب و مسائل املا کرتے اور ساتھ ساتھ خود بھی لکھتے جاتے یا پہلے مجموعہ مرتب کر لیتے اور پھر اسی کو املا کرتے۔ حدیث میں یہ طریق تمام علوم سے زیادہ رائج اور مقبول ہوا اور محدثین کے یہاں اسے ایک خصوصی مقام حاصل ہو گیا چنانچہ محدثین نے سماع من لفظ الشیخ کی دو مختلف صورتوں میں سے ایک قسم املا کو قرار دیا ہے اور یہ محدثین کی بیان کردہ ان تمام قسموں میں سے جو تحمل روایت کے لیے مشہور ہیں ایک اور اعلیٰ قسم ہے۔ چنانچہ علامہ میمانی نے توضیح الافکار میں حافظ زین الدین عاقی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

سواء احدث من کتابہ او من حفظہ باصلا و بغير

املاء و هو ارفع الاقسام

محدثین نے اس انداز تالیف کی خاطر تلامذہ کے لیے جو تعبیری زبان مقرر کی ہے ان میں سب اعلیٰ و ارفع اگرچہ خطیب بغدادی کے خیال میں تو سماع ہی ہے لیکن ابن الصلاح حدیثاً کو اور ابن کثیر حدیثی کو ارفع بتاتے ہیں۔ حافظ محمد بن ہر اسیم الوزير فرماتے ہیں کہ عبد الملک بن عبد العزیز شاہ جو ابن جریر کے نام سے مشہور ہیں اور جن کے بارے میں حافظ عسقلانی نے انکشاف کیا ہے کہ حدیث کے پہلے مصنف یہی ہیں ان سے حجاج بن محمد مصیسی نے ان کی کتابیں اسی طرح روایت کی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

لا سيما من عرف انه لا يروى الا ما سمع كحاج بن محمد فريدي

كتب ابن جرير بلفظ قال ابن جرير فحملها الناس عنه
واجتوا بها

علامہ محی الدین عبد الحمید نے اس طریق کو بے حد سراہا ہے اور اسے تالیف و تدریس میں سب اعلیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

حدیث حاصل کرنے کے طریقوں میں سب سے اوسنچا، ترقی یافتہ اور قوی ترین طریق یہ ہے کہ راوی شیخ کے الفاظ سے خواہ شیخ کسی دستاویز سے املا کر رہا ہو یا زبانی یادداشت سے، املا کرنا تحدیث من غیر املا

اور سچا ہے۔

حافظ ابن الصلاح نے بھی نقلِ حدیث اور تحملِ روایات میں اسے سب سے اونچی قسم قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

هَذَا الْقِسْمُ اَرْفَعُ الْاَقْسَامِ عِنْدَ الْجَاهِلِیِّیْنَ

کتاب الآثار بھی اسی قسم کا املاتی مجموعہ ہے اور امام اعظم کا قائم کردہ یہ طریق تصنیف کچھ ایسا مقبول ہوا ہے کہ بعد کو امام کے تلامذہ نے بھی اپنی تصانیف میں اسے ہی اپنایا ہے۔ چنانچہ حافظ قاسم بن قطلوبغا منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں :

ان المتقدمین من علمائنا کالتوا یحسون المسائل الفقہیۃ و

اولتها من الاحادیث النبویۃ باسانید ہم کابی یوسف فی

کتاب الخراج والامالی ومحمد فی کتاب الاصل والسیرو کذا

الطحاوی والمصنف والرائز والکشی۔

کتاب الآثار کے نسخے

جیسے موطا کو امام مالک سے ایک سے زیادہ اصحاب مالک نے روایت کیا ہے ایسے ہی کتاب الآثار کو بھی امام اعظم سے ان کے ایک سے زیادہ اصحاب نے روایت کیا ہے اور اس روایت کے ایک سے زیادہ ہونے کی وجہ سے جیسے موطا اور حدیث کی دوسری کتابوں کے نسخے متعدد ہو گئے ایسے ہی کتاب الآثار کے بھی راویوں کے متعدد ہونے کی وجہ سے نسخے ایک سے زیادہ ہو گئے ہیں۔

کتاب الآثار کو امام اعظم سے جن تلامذہ نے روایت کیا ہے ان کی تعداد تو زیادہ ہے لیکن ان میں مشہور چار ہیں :

بروایت امام محمد
بروایت امام ابو یوسف
بروایت امام زفر

۱۔ کتاب الآثار
۲۔ کتاب الآثار
۳۔ کتاب الآثار

۴۔ کتاب الآثار
بروایت امام حسن بن زیاد
یہ چاروں امام اعظم سے کتاب الآثار کے راوی ہیں ۔

کتاب الآثار بروایت امام محمدؒ

یہ امام محمد کا روایت کردہ نسخہ ہے اور یہ نسخہ تمام نسخوں میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہے۔ اسی کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے تعجیل المنفعة بزوائد رجال الاربعہ کے مقدمہ میں لکھا ہے ۔
والموجود من حدیث ابی حنیفہ مفرداً انما هو کتاب الآثار
التي رواها محمد بن الحسن عندہ

اس نسخے میں جن راویوں سے حدیثیں مروی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے حالات پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی تصنیف جو مستقل طور پر رجال کتاب الآثار سے متعلق ہے اس کا نام الاثیر بمعرفۃ رواۃ الآثار ہے۔ اس کا ذکر نواب علامہ صدیق حسن خاں نے استخاف المتعین میں کیا ہے مگر نام غلط درج ہو گیا۔ الاثیر بمعرفۃ معانی الآثار نہیں بلکہ الاثیر بمعرفۃ رواۃ الآثار ہے۔ استخاف میں مصنف کا بھی ذکر نہیں ہے اس کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ اس کتاب کا ذکر خود حافظ عسقلانی نے تعجیل المنفعة کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے کتاب الآثار کے رجال پر علیحدہ مستقل کتاب لکھی ہے کیونکہ بعض حنفی ماہر بزرگوں میں سے ایک بزرگ نے میرے سے درخواست کی کہ میں کتاب الآثار کے رجال پر مستقل کتاب لکھوں۔ میں نے ان کی یہ درخواست قبول کی اور کتاب الآثار کے رجال پر کتاب لکھی اس میں جو اکابر تہذیب میں آچکے ہیں ان کا تو صرف نام ہی ذکر کر دیا اور تہذیب کا حوالہ دے دیا ہے اور ان کے علاوہ کے حالات لکھے ہیں۔ دوسری تصنیف کتاب تعجیل المنفعة بزوائد رجال الاربعہ ہے۔ یہ کتاب اب حیدر آباد میں چھپ چکی ہے۔ اس میں حافظ ابن حجر نے صرف ان راویوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے ائمہ الاربعہ امام اعظم، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے اپنی اپنی تصانیف میں حدیثیں نقل کی ہیں مگر صحاح ستہ میں ان کے حوالے سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے دراصل حافظ ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے ایک کتاب التذکرہ

برجال العشرہ کے نام سے لکھی تھی اور اس میں حافظ ابو عبد اللہ نے ائمہ ستہ بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے ساتھ ائمہ اربعہ ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی تصانیف کے راویوں اور رجال کا تذکرہ لکھا اور اس کا نام التذکرہ برجال العشرہ رکھا اور ائمہ ستہ کے ساتھ ائمہ اربعہ کے رجال لکھنے کی وجہ خود ہی یہ بتاتی ہے کہ :

ذکرت رجال الأئمة الأربعة المقدي بهم لان عمدتهم
في الاستدلال لهم لهذا هبهم في الغالب على ما روي في
مسانيدهم باسانيدهم فان الموطأ للمالك هو مذهب
الذي يدين الله به اتباعه ويقلدون مع انه لم يرو فيه
الا الصحيح عنده وكذلك مسند الشافعي موضوع لادلته على
ما صح عنده من مروياته وكذلك مسند ابی حنيفة واما مسند
احمد فانه اعم من ذلك واشمل له

علامہ ابو جعفر الکتانی نے ائمہ ستہ فی الحدیث اور ائمہ اربعہ فی المذہب کی کتابوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :

فهذه هي كتب الأئمة الأربعة وباضافتها إلى الستة الأولى
تكمل الكتب العشرة التي هي اصول الاسلام وعليها مدار
الدين

حافظ ابن حجر عسقلانی نے چونکہ تہذیب التہذیب اور تقریب کے نام سے ائمہ ستہ کی کتابوں کے رجال پر دو کتابیں لکھی ہیں اس لیے حافظ عسقلانی نے ائمہ اربعہ کی تصانیف کے راویوں کے لیے ایک مستقل کتاب تعجیل المنفعة کے نام سے اور اس میں جیسا کہ خود حافظ صاحب نے تصریح کی ہے صرف ان اشخاص کے حالات لکھے ہیں جو ائمہ اربعہ کی کتابوں میں آئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :

فلذلك اقتضت على رجال الأربعة وسميته تعجیل المنفعة
بذوات رجال الأئمة الأربعة

حیرت ہے کہ مشہور علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاد النبلاء المتقین میں علامہ شوکانی کے حوالہ سے کتاب کا نام تعجیل المنفعة برجال الاربعہ لکھ کر الاربعہ کو سنن الاربعہ کا مصداق قرار دیا ہے اور صاحب کشف الظنون کی اس بات میں تغلیط کی ہے کہ الاربعہ سے ائمہ اربعہ مجتہدین مراد ہیں۔ چاہئے فرماتے ہیں۔
کشف الظنون کشفہ بروایت رجال الاربعہ الاربعہ یعنی المذاهب وایں مسامحت
است از دے لے

حالانکہ خود حافظ صاحب کی تصریح سے یہ بات معلوم ہے کہ الاربعہ سے مراد ائمہ اربعہ ہیں یعنی ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور احمد نہ کہ ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ۔ علامہ ابو جعفر الکتانی نے مسند امام ابوحنیفہ پر تبصرہ کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:

والذی اعتبره المحافظ ابن حجر فی کتابہ تعجیل المنفعة بذوالدرجال
الاربعۃ هو ما اخرجہ الامام الذی المحافظ ابو عبد اللہ الحسین بن
محمد بن خسر و لے

غالباً نواب صاحب نے خود تعجیل المنفعة کا مطالعہ نہیں فرمایا ورنہ زبان قلم پر یہ بات نہ آتی۔ الغرض بتنا یہ چاہتا ہوں کہ حافظ عسقلانی نے رجال ائمہ اربعہ کے ذیل ہی میں کتاب الآثار کے بھی رجال لکھے ہیں۔ مشہور محدث حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوزیع میں کتاب الآثار کے رجال پر ایک اور کتاب کی بھی نشان دہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

وللذین قاسم الحنفی رجال کل من الطحاوی والموطا لمحمد بن الحسن
والآثار ومسندا بی حنیفہ لابن المقرئ لے

حافظ زین الدین قاسم بن قطلوبغا کی اس کتاب کا علامہ الکتانی نے الرسالة المستطرفہ میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ ملا کاتب چلبی نے کشف الظنون میں کتاب الآثار امام محمد پر حافظ ابو جعفر طحاوی کی شرح کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ سخاوی نے السنو اللامعہ میں علامہ تفتی الدین احمد بن علی مقریزی کی کتاب العقود فی تاریخ الہود کے حوالہ سے حافظ قاسم کی تصانیف میں تعلیقات علی کتاب الآثار بھی لکھی ہے۔

امام محمد سے اس کتاب کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے مطبوعہ نسخہ امام ابو حفص کبیر اور ابوسلیمان جوزجانی کا روایت کردہ ہے۔

کتاب الآثار بروایت امام ابویوسفؒ

کتاب الآثار کا یہ نسخہ قاضی ابویوسف سے ان کے صاحبزادے یوسف بن یعقوب نے روایت کیا ہے اس نسخہ کے راوی قاضی ابویوسف کی جلالیت قدر کا حدیث میں اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل حدیث شرمش کی تھی تو سب سے پہلے قاضی ابویوسف ہی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے احادیث لکھیں حافظ ابن الجوزی مناقب میں بسند متصل ناقل ہیں:

اخبرنا ابو منصور عبد الرحمن بن محمد القزاز قال اخبرنا ابو بكر احمد بن علي بن ثابت قال اخبرنا الازهری قال ثنا عبد الرحمن بن عمر قال ثنا محمد بن يعقوب قال حد ثنا جدي قال سمعت احمد بن حنبل يقول اول من كتبت عنه الحديث ابویوسفؒ

اور حافظ ذہبی مناقب ابی حنیفہ میں حافظ عباس دوری سے نقل کرتے ہیں:

سمعت احمد بن حنبل يتناول اول ما كتبت الحديث اخلفت بعد

لے ان کا نام موسیٰ بن سلیمان اور کنیت ابوسلیمان ہے حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ مامون نے ان کے سامنے عہدہ قضا کی پیش کش کی فرمایا امیر المومنین عدالتی معاملہ میں حقوق الہی کی نگرانی کیجئے۔ اور اپنی امانت مجھ جیسے کو سپرد نہ فرمائیے۔ مجھے عہدہ میں رہنے پر قابو نہیں رہتا۔ میں اپنے اللہ کے بندوں میں فیصلہ کرنے کے کام کو پسند نہیں کرتا۔ مامون نے یہ سن کر کہا کہ آپ درست کہتے ہیں۔ امام محمد اور قاضی ابویوسف کے تلامذہ میں سے ہیں اور ان سے ان کی کتابوں کے راوی بھی ہیں۔ دینداری پارسائی، فقہ و حدیث میں معلیٰ بن منصور کے رفیق رہے ہیں۔ معلیٰ بن منصور امام مالک، لیث بن سعد، حماد اور ابن عیینہ کے شاگرد ہیں۔ ان کی تصانیف میں السیر الصغیر، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الرہن جیسی کتابیں ہیں۔ شیعہ کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے حماد بن زید سے سنا ہے وہ فرماتے تھے میں ابوحنیفہ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ ایوب سختیانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایوب سختیانی امام اعظم کے اساتذہ میں سے ہیں۔ لے مناقب ابن الجوزی ص ۲۲۔

الی الناس اے

یہ واقعہ ۱۱۵۰ھ کا ہے جب امام احمد کی عمر سولہ سال تھی اے

امام احمد نے امام ابو یوسف اور امام محمد سے تین قسط درود جس میں کتابیں رکھی جاتی ہیں بھر کر علم دین کی کتابت کی تھی۔ چنانچہ حافظ ابو الفتح بن سید الناس یحمری شافعی لکھتے ہیں:

قال ابراہیم بن جعفر حدثنی عبد اللہ بن احمد بن حنبل قال کتب

ابی عن ابی یوسف و محمد ثلاثہ قماطر قلت لہ کان یُنظر فیہا

قال کان یربما نظر فیہا اے

امام احمد بن حنبل کا خود قاضی صاحب موصوف کے متعلق حسب تصریح علامہ سمعانی یہ تاریخی اقرار موجود ہے:

ابو یوسف الامام یسئل فیہ احمد بن حنبل اشد بصر الناس
بالآثار اے

ن تصریحات کی موجودگی میں خدایا کی اس رائے کی کوئی قیمت نہیں کہ
امام احمد نے پہلے پہل اہل الرائے کی کتابیں لکھیں اور پڑھیں اور ان کے
مسائل ازبر کیے لیکن پھر ان کی طرف کوئی التفات نہیں رہا۔

یہ ایسی بات ہے جسے باور کرنے کی ہمیں مذکورہ تصریحات اجازت نہیں دیتی ہیں۔ الغرض
کتاب الآثار کے امام اعظم سے دوسرے راوی قاضی ابو یوسف، امام احمد بن حنبل کے استاد ہیں
ان کے اس نسخہ کا ذکر حافظ عبد القادر قرشی نے الجواهر المضیئہ میں کیا ہے۔ چنانچہ امام یوسف
بن ابی یوسف کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

روی کتاب الآثار عن ابيه عن ابی حنیفۃ

پروفیسر الشیخ محمد البرزہ لیکچرر نوادیونیورسٹی نے ابو حنیفہ نامی کتاب میں اس پر جو علامہ تبصرہ
کیا وہ بھی پڑھ لیجئے:

یہ کتاب علمی طور پر تین درجہ سے قیمتی ہے۔ اول یہ کہ امام ابو حنیفہ کی

۱۔ مناقب ذہبی ص ۴۰۔ ۲۔ مناقب ابن الجوزی ص ۳۳۔ ۳۔ عیون الاثر ج ۱ ص ۲۰۔

۴۔ التعلیق المجدد ص ۲۲۔

مرویات کا ذخیرہ ہے اور اس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف نے استخراج مسائل میں احادیث کو کیسے دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دوم یہ کہ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ امام موصوف کے یہاں مواقع استدلال میں فتاویٰ صحابہ اور احادیثِ مرسلہ کا کیا مقام تھا۔ سوم یہ کہ اس کتاب کے ذریعے تابعین فقہاء کوفہ کے خصوصاً اور فقہاء عراق کے عموماً فتاویٰ تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے بلکہ

کتاب الآثار بروایت امام زفرؒ

پورا نام زفر بن الہذیل العنبری ہے ان سے کتاب الآثار کی روایت ان کے تین شاگردوں نے کی ہے۔ ابو وہب محمد بن مزاحم، شداد بن حکیم، حکیم بن ایوب۔ محمد بن مزاحم اور شداد بن حکیم کے حوالہ سے جو کتاب الآثار مروی ہے اس کا مشہور محدث ابو عبد اللہ الحاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

نسخۃ لزفر بن الہذیل الجعفی تفرد بہا عنہ، شداد بن حکیم
البلخی و نسخۃ ایضا لزفر بن الہذیل الجعفی تفردا ابو وہب
محمد بن مزاحم المروزی علیہ

ایک نسخہ زفر کا جسے ان سے شداد نے صرف روایت کیا ہے۔ ایک نسخہ زفر کا اور جسے ان سے صرف ابو وہب محمد بن مزاحم نے روایت کیا۔ حدیث کے مشہور امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب قیام لیل و قیام رمضان و کتاب التمر میں امام اعظم کی جس کتاب کا

نزعہ النعمان فی کتابہ امام ابو حنیفہ کا اپنی کتاب میں خیال ہے:-

کے پیرائے میں تذکرہ کیا ہے وہ بھی ابو وہب محمد بن مزاحم والی کتاب الآثار ہے جو امام مروزی کو ان کے شاگرد ابو نصر محمد بن محمد کے حوالہ سے ملی ہے۔ یہ نیشاپور کے نامی گرامی قاضی ہیں ان سے حافظ ابو عبد اللہ الحاکم نے حدیث پڑھی ہے۔ امام حاکم نے تاریخ نیشاپور میں لکھا ہے

کہ ان کے لیے ۲۲۵ھ میں حرمین میں باقاعدہ مجلس درس لگتی تھی۔ ان کی وفات ۳۳۵ھ میں ہوئی ہے۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں ابودہب محمد بن مزاحم کو احمد بن بکر بن یوسف کا استاد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

یروی عن ابی وھب محمد بن مزاحم المروزی عن زفر عن ابی حنیفۃ
کتاب الآثار

کتاب الآثار احمد بن بکر اپنے استاد محمد بن مزاحم سے بحوالہ زفر از ابی حنیفہ روایت کرتے ہیں۔

حکیم ابن ابوب کی کتاب الآثار کا ذکر حافظ ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی کتاب طبقات المحدثین میں احمد بن رستہ کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

احمد بن رستہ بن بنت محمد بن المغیرۃ کان عندہ السنن عن محمد
عن المحکم عن زفر عن ابی حنیفۃ

احمد بن رستہ کے پاس بحوالہ محمد از حکم از زفر از ابی حنیفہ کتاب السنن تھی۔
امام طبرانی نے معجم صغیر میں اس نسخہ کی ایک حدیث روایت کی ہے۔

حدثنا احمد بن رستہ بن عمر الاصفہانی ثنا المغیرۃ المحکم بن
الیوب عن زفر بن الھذیل عن ابی حنیفۃ

حافظ ابن ماکولانے بھی الاکمال میں احمد بن بکر کے تذکرے میں لکھا ہے :

احمد بن بکر بن سیف البکر الجصبینی ثقۃ یمل میل اھل النظر وروی

عن ابی وھب عن زفر بن الھذیل عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار

ان تصریحات کی موجودگی میں شیخ محمد البزہرہ لیکچرر فواد یونیورسٹی قاہرہ کا ابوحنیفہ نامی کتاب میں یہ کہنا درست نہیں ہے :

زفر لم یوثق عند کتب ولم تعرف لہ روایۃ لمذھب شیخ

امام زفر سے کتاب میں مروی نہیں ہیں اور ان کی اپنے استاد سے کوئی روایت

۱۔ لمحات النظر، الجواب المصنیع ج ۱ ص ۶۲۔ ۲۔ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۷۳۔

۳۔ معجم صغیر طبرانی ص ۳۳۔ ۴۔ امام ابن ماجہ اور علم الحدیث ص ۱۷۲۔ ۵۔ ابوحنیفہ ص ۱۱۸۔

مشہور نہیں ہے۔

کتاب الآثار بروایت امام حسن بن زیاد

کتاب الآثار کے تمام نسخوں میں یہ نسخہ غالباً سب سے بڑا ہے کیونکہ امام حسن بن زیاد نے امام اعظم کی احادیث مرویہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ چنانچہ امام حافظ ابویسعی زکریا بن یسعی نیشاپوری اپنی اسناد کے ساتھ امام حسن سے ناقل ہیں کہ:

کان ابو حنیفۃ یروی اربعۃ الاف حدیث الفین لحداد والفین
لسائر المشیختۃ ۱۰

قرین قیاس یہی ہے کہ امام لؤلؤی نے امام اعظم کی ان تمام حدیثوں کو اپنے نسخہ میں روایت کیا ہوا۔

اس نسخہ کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ محمد بن ابراہیم بن جمیش بغوی کے ترجمہ میں رقمطراز ہیں۔

محمد بن ابراہیم جمیش البغوی روی عن محمد بن شجاع الثلجی
عن الحسن بن زیاد عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار ۱۱

محدث علی بن عبدالحسن دو ایسی حنبلی نے اپنے مثبت میں اس نسخہ سے ساٹھ حدیثیں نقل کی ہیں جن کو محدث شیخ محمد زاہد کوثری نے الامتاع میں نقل کیا ہے۔

محدث خوارزمی نے جامع مسانید میں اس نسخہ کو مسند ابی حنیفہ الحسن بن زیاد کے نام سے پیش کیا ہے۔ خوارزمی نے اس نسخہ کی اسناد میں امام حسن تک اپنے چاروں اساتذہ یعنی شیخ ابو محمد یوسف بن عبد الرحمن، شیخ ابو محمد ابراہیم بن محمود، شیخ ابو نصر الاغر بن ابی الفضائل اور شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے :-

اخبرنا المحافظ ابو المفرج عبد الرحمن بن علی الجوزی قال خیر
البواقاسم، سماعیل بن احمد السمرقندی قال اخبرنا البواقاسم
عبد اللہ بن الحسن قال اخبرنا ابو الحسن عبد الرحمن بن عمر قال

اخبرنا ابو الحسن محمد بن ابراہیم بن جبیش البغوی قال حدثنا
ابو عبد اللہ محمد بن شجاع البلیخی قال حدثنا الحسن بن زیاد
الثؤلوی عن ابی حنیفۃ

خوارزمی کی طرح دیگر محدثین بھی اس کو مسند ابی حنیفہ کے نام سے روایت کرتے ہیں۔ خود حافظ
ابن حجر عسقلانی کی مرویات میں بھی یہ نسخہ موجود تھا۔ اس نسخہ کی اسانید اجازت کو محدث علی بن عبد الرحمن
الدوالیبی حنبلی نے اپنے مثبت میں، محدث ایوب الخلوئی نے اپنے مثبت میں اور خاتمة الحفاظ
محمد عابد سندھی نے حصر الشارح فی اسانید الشیخ محمد عابد میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور
شیخ محمد زاہد کوثری نے ان کو الامتاع بسیرۃ الابانین الحسن بن زیاد و محمد بن شجاع میں نقل کر دیا ہے

ایک ضروری توضیح

جامع المسانید اور لسان المیزان میں اس روایت کے ناموں میں کچھ تصحیف ہو گئی اصل سند
تو اس طرح ہے کہ:

محمد بن ابراہیم بن جبیش البغوی روى عن محمد بن شجاع الثلبی عن الحسن
بن زیاد عن ابی حنیفہ کتاب الآثار۔

لیکن جامع المسانید میں خوارزمی نے محمد بن ابراہیم بن جبیش اور لسان المیزان میں حافظ
ابن حجر نے محمد بن ابراہیم بن حسن لکھا ہے دونوں غلط ہیں۔ اسی طرح جامع المسانید میں محمد
بن شجاع البلیخی اور لسان المیزان میں محمد بن یحییٰ البلیخی طبع ہو گیا ہے یہ بھی غلط ہے —
اور لسان المیزان میں عن الحسن بن زیاد عن محمد بن الحسن عن ابی حنیفہ میں محمد بن الحسن کا اضافہ
یقیناً غلط ہے۔ محمد بن ابراہیم بن جبیش بغوی اور امام محمد بن شجاع الثلبی دونوں نہایت
معروف و مشہور عالم ہیں۔ دونوں کا بیسوط حال خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے
حافظ بدر الدین عینی نے شرح بدایہ میں لکھا ہے کہ محمد بن شجاع الثلبی میں نسبت نسب کی
ہے اور محمد بن شجاع کو ثلج بن عمرو بن مالک بن عبد مناف سے نسبی تعلق کی وجہ سے ثلجی کہتے
ہیں۔ امام ذہبی نے سیر النبلاء میں ان کے اساتذہ میں ابن علیہ، دکیع، یحییٰ بن آدم اور حسن

بن زیاد کا نام لیا ہے۔ اور حافظ عبد القادر قرشی نے یحییٰ بن اکثم کو ان کا شاگرد لکھا ہے۔
حافظ ابن القیم جوزی نے اپنی مشہور کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین میں ایک موقعہ
پر امام حسن بن زیاد کی اسی کتاب الآثار کی حدیث سے استدلال کیا ہے ان کا موقعہ استدلال
میں اس کا ذکر نہ صرف اس بات کی دلیل نہیں کہ کتاب الآثار کا نسخہ ان کے مطالعہ میں رہا
ہے بلکہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کتاب کا ابن القیم کے یہاں اعتبار رہی اور استدلالی
مقام ہے وہ فرماتے ہیں:

قال الحسن بن زیاد المؤمني ثنا ابو حنيفة قال كنا عند محارب
بن وثار فتقدم اليه رجلان فادعى احدهما على
الاخر ما لا نجد المدعى عليه فساله البينة فجاد رجل
فشهد عليه فقال المشهود عليه لا والله الذي لا اله
الا هو ما شهد على بحق وما علمته الا رجلاً صالحاً غير
هذه الذلّة فانه فعل هذا الحق كان في قلبه على و
كان محارب متكئاً فاستوى جالساً ثم قال يا ذالرجل
سمعت ابن عمر يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم
يقول يا ايها الناس ليوم تثيب فيه الولدان وتضع
العوامل ما في بطونها وتضرب الطير باذانها وتضع ما
في بطونها من شدّة ذلك اليوم ولا ذنب عليها وان
شاهد النور لا يقار قدماه على الارض حتى يقذف
به في النار فان كنت شهدت بحق فالتق الله اقم على
شهادتك وان كنت شهدت بباطل فالتق الله وعظ
راسه واخرج من ذلك الباب

ان چار بزرگوں کے حوالے اور وساطت سے امام اعظم کی کتاب الآثار آج امت کے ہاتھوں
میں ہے۔ ان کی شخصیتیں امت میں معروف و مشہور ہیں۔

کتاب الآثار کی روایتی صحت

امام ابو حنیفہ سے احادیث کو اگرچہ ہزاروں آدمیوں نے روایت کیا ہے لیکن امام موصوفی کے جن تلامذہ سے کتاب الآثار کی روایت کا سلسلہ چلا ہے وہ یہ مذکورہ بالا چار بزرگ ہیں۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں اپنا سلسلہ سند ان چاروں حضرات تک بیان کر دیا ہے۔ ایسے ہی علامہ مسند محمد سعید نے اوائل السنبلیہ میں یہی اپنا سلسلہ سند بتایا ہے۔ ہم ان بزرگوں کے علاوہ چند اور محدثین کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ سے کتاب الآثار کا باقاعدہ سماع کیا ہے۔

امام عبداللہ بن المبارک کے بارے میں مشہور محدث خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں حمیدی شیخ بخاری کی زبانی نقل کیا ہے۔

سمعت عبداللہ بن المبارک یقول کتبت عن ابی حنیفۃ امریعاۃ
حدیث ۱۶

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہ سے چار صد حدیثیں لکھی ہیں۔
امام حفص بن غیاث سے حافظ حارثی نے بسند متصل نقل کیا ہے،

سمعت من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً ۱۷

میں نے امام ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔
شیخ الاسلام عبداللہ بن یزید مقرئ کے بارے میں علامہ کردری فرماتے ہیں :
سمع من الامام تسعاً وثمانین حدیث ۱۸

انہوں نے امام ابو حنیفہ سے نو سو و اسی حدیثیں سنی ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام وکیع بن الجراح کے متعلق سید الحفاظ یحییٰ بن معین کی زبانی انکشاف کیا ہے :

ما رأیت احداً اقدم علی وکیع وکان یفتی برائی ابی حنیفۃ وکان
یحفظ حدیثہ کلمہ وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً ۱۹

میں دیکھ کر کسی کو مقدم نہیں کرتا و کیع امام ابو حنیفہ کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے اور ان کو ابو حنیفہ کی ساری حدیثیں یاد تھیں و کیع نے ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔

حافظ موصوف ہی نے اپنی ایک دوسری کتاب میں امام حماد بن زید کے بارے میں لکھا ہے :
 ردی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً۔^۱

حماد بن زید نے امام ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔
 حافظ ابن عبد البر نے خالد الواسطی محدث کے متعلق انکشاف کیا ہے کہ :
 ردی عنہ خالد الواسطی احادیث کثیرۃ۔^۲

خالد نے ابو حنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔

یہ وہ اکابر محدثین ہیں کہ جن میں سے ہر ایک علم حدیث و فقہ کا آفتاب و ماہتاب ہے۔ یاد ہے کہ ہجر موٹا امام مالک کے اور کسی کتاب کے راوی اس قدر جلالت علمی کے مالک نہیں ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے امام اعظم سے کتاب الآثار کا سماع کیا ہے ورنہ امام اعظم سے احادیث روایت کرنے والے تو اس قدر زیادہ ہیں کہ بقول حافظ ذہبی۔

ردی عنہ من المحدثین والفقہاء عدۃ لا یحصون۔^۳

امام ابو حنیفہ سے محدثین و فقہاء میں سے بے شمار نے روایت کی ہے۔

کتاب الآثار کی علمی حیثیت

علمی طور پر کتاب الآثار کا مقام اور اس کی مرویات کی فنی حیثیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابوالعباس محمد بن عبد اللہ بن ابی العوام اپنی کتاب اخبار ابی حنیفہ میں بند متصل لکھتے ہیں :

حدثنی یوسف بن احمد المکی ثنا محمد بن حازم الفقیہ ثنا محمد

بن علی الصائغ بکۃ ثنا ابراہیم بن محمد عن الشافعی عن

عبد العزیز الدر اور ردی قال کان مالک ینظر فی کتب ابی

حنيفة و ينتفع بها -

امام مالک امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے -

غور فرمائیے کہ جب امام مالک موٹا کی تالیف میں امام اعظم کی کتابوں سے استفادہ فرماتے ہیں تو پھر کتاب الآثار کی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا - اگر یہ واقعہ ہے اور واقعہ نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ شاہ عبدالعزیز لکھ رہے ہیں کہ موٹا کا درجہ صحیحین کے لیے بمنزلہ ماں کے ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس لحاظ سے کتاب الآثار کا مقام بھی موٹا امام مالک کے لیے یہی ہے یعنی جو نسبت بخاری و مسلم کی کتابوں کو موٹا امام مالک سے ہے وہ ہی نسبت موٹا کو کتاب الآثار سے بھی ہے -

تنویر الحوالک میں ہے :

حافظ مغلطائی فرماتے ہیں کہ پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ مالک ہیں حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ مالک کی کتاب خود ان کے نزدیک اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے بلکہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ مغلطائی کے نزدیک اس بارے میں اولیت کا شرف امام مالک کو حاصل ہے لیکن کتاب الآثار موٹا سے پہلے کی تصنیف ہے جس سے خود موٹا کی تالیف میں استفادہ کیا گیا ہے - چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں :

من مناقب ابی حنیفۃ التي انفرد بها انت اقل من دون الشریعۃ
ورتبہ ابوابا ثم تبعہ مالک فی ترتیب الموطا و لہ
یسبق ابی حنیفۃ احدہما

ابو حنیفہ کی ان بزرگیوں میں سے جن میں وہ یگانہ روزگار ہیں یہ ہے کہ قانون اسلامی کے اولین مدقن اور مرتب ہیں امام مالک ان کے تابع ہیں -

کتاب الآثار میں جو حدیثیں ہیں وہ موٹا کی روایات سے قوت و صحت میں کم نہیں ہیں -

جس طرح مؤطا کے مراسیل کے توابع و شواہد موجود ہیں اسی طرح اس کے مراسیل کا حال ہے اس لیے صحت کے جس معیار پر حافظ مغلطائی اور حافظ ابن حجر کے نزدیک مؤطا صحیح ہے ٹھیک اسی معیار پر کتاب الآثار صحیح اترتی ہے۔ مؤطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔

کتاب الآثار کا تاریخی مقام

اسناد و روایت کے لحاظ سے کتاب الآثار کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کتاب الآثار چالیس ہزار حدیثوں کے مجموعہ کا انتخاب ہے۔ امام بخاری کا زمانہ چونکہ تابع تابعین کے بعد ہے زمانے کی دوری کی وجہ سے ایک ایک حدیث کے ہزاروں طرق رونما ہو چکے تھے اس لیے ان کی کتاب خود ان کے اقرار کے مطابق

آخر جتہ من نحو ست مائۃ الف ہے

چھ لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ انتخاب کیا ہے

لیکن امام ابو حنیفہ کا زمانہ صحابہ اور کبار تابعین کا زمانہ ہے اس لیے یہاں طرق میں اتنی وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہے اس کے باوجود چالیس ہزار حدیثوں سے کتاب الآثار کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ چنانچہ امام ابو بکر بن محمد زریں جرمی فرماتے ہیں۔

انتخب ابو حنیفۃ الآثار من اربعین الف حدیث ہے

امام ابو حنیفہ کی کتاب الآثار ۴۰ ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے

امام حافظ ابویسحیٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری جو ارباب صحاح ستہ کے معاصر ہیں۔ امام اعظم سے بالسدنا نقل ہیں :-

میرے پاس حدیث کے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں مگر میں نے

ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اندوز ہوں گے

اور حافظ ابونعیم اصفہانی نے مسند ابی حنیفہ میں بسند متصل یحییٰ بن نصر کی زبانی نقل کیا ہے کہ

میں امام ابو حنیفہ کے یہاں ایسے مکان میں داخل ہوا جو کتابوں سے اٹا

ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے فرمایا کہ یہ سب احادیث ہیں

اور میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں بیان کی ہیں۔
 امام اعظم کی حدیث میں احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اقرار کیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابو محمد عبد اللہ
 عارثی بسند متصل امام دیکھ سے جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں نقل کرتے ہیں،
 جیسی احتیاط امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے حدیث میں پائی گئی کسی دوسرے
 سے نہیں پائی گئی۔

اسی طرح علی بن جعد جو ہری سے جو حدیث کے بہت بڑے حافظ اور امام بخاری و ابو داؤد
 کے شیخ ہیں نقل کیا ہے،

قال علی بن الجعد ابو حنیفۃ اذا جاء بالحديث جاء به مثل الدرر
 ابو حنیفہ جب بھی حدیث پیش کرتے ہیں تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے۔
 اور امام یحییٰ بن معین جن پر فن جرح و تعدیل کا دار و مدار ہے فرماتے ہیں :
 ابو حنیفہ ثقہ ہیں جو حدیث ان کو یاد ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں اور جو
 حفظ نہیں ہوتی اس کو بیان نہیں کرتے۔

امام عبد اللہ بن المبارک جن کی جلالتِ شان پر محدثین کا اتفاق ہے انہوں نے امام اعظم کی
 شان میں جو مدحیہ اشعار کہے ہیں ان میں بھی کتاب الآثار کی نہایت شان کا ذکر ہے۔
 مروی آثارہ فاجاب فیہا کطیران الصقور من المنیفة
 انہوں نے آثار کو روایت کیا تو اتنی تیزی سے چلے جیسے بلندی سے پرندے
 شکاری اڑتے ہوں۔

فلم یك بالعراق لم نظیر ولا بالمشریق ولا بکوفۃ
 نہ تو عراق میں ان کی نظیر تھی نہ مشرق و مغرب میں اور نہ کوفہ میں جہے
 اسی طرح مشہور امام ابو یحییٰ غسان بن محمد نے اپنی ایک نظم میں بھی کتاب الآثار کا ذکر کیا ہے جو انہوں
 نے امام ابو حنیفہ کی شان میں لکھی ہے :
 و بنی علی الآثار اس بناؤ فانت غوامض علی الاساس

۱۔ عقود الجواهر النیفۃ ج ۱ ص ۲۳۔ ۲۔ المناقب لموفق ج ۱ ص ۱۹۷۔ ۳۔ جامع المسانید ج ۲ ص ۳۰۔
 ۴۔ تاریخ بغداد، تہذیب التہذیب۔ ۵۔ المناقب ج ۲ ص ۱۹۰۔

واناس يتبعون فيهما قوله لا استبان ضياده للناس ليه

اسی طرح امام اہل سمرقند ابو مقاتل سمرقندی اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں :

روى الآثار عن نبل ثقات غرار العلم مشيخة حصيفة - ۱۷

کتاب الآثار کی امتیازی حیثیت

چونکہ کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث ہیں جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے اور جن کی حیثیت سنن کی ہے اس لیے وہ سینکڑوں ابواب جو صحیحین اور جامع ترمذی جیسی حدیث کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں وہ کتاب الآثار میں نہیں ہیں کیونکہ ان ابواب کا تعلق فقہیات سے نہیں ہے اس لیے بعض محدثین نے کتاب الآثار کو کتاب السنن کے نام سے پکارا ہے۔ کتاب الآثار کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس کی مرویات اس دور کی دیگر تصانیف کی طرح اپنے ہی شہر اور اقلیم کی روایات میں محدود نہیں بلکہ اس میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرض کہ حجاز، عراق دونوں جگہ کا علم تحریر و تدوین میں یکجا موجود ہے۔

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں :-

دین وفقہ و علم کی اشاعت اُمت میں اصحاب عبد اللہ بن مسعود، اصحاب زید بن ثابت، اصحاب عبد اللہ بن عمر اور اصحاب عبد اللہ بن عباس سے ہوتی ہے اور لوگوں کا عام علم ان چار ہی کے ساتھیوں سے لیا ہوا ہے چنانچہ مدینہ والوں کا علم زید بن ثابت اور عبد اللہ بن عمر کے اصحاب سے اور مکہ والوں کا علم عبد اللہ بن عباس کے اصحاب کا اور عراق والوں کا علم عبد اللہ بن مسعود کے ساتھیوں اور شاگردوں کا ہے۔ ۱۸

امام مالک نے موطا کی تالیف مدینے میں کی ہے اور اس میں مدنی شیوخ کے علاوہ اور لوگوں سے برائے نام روایتیں ہیں لیکن کتاب الآثار کے راویوں میں حجازی یا عراقی کی کوئی تخصیص نہیں ہے

۱۷ تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۵ - امام اعظم نے اپنی عمارت کی بنیاد آثار پر رکھی تو آپ کے دقیق مسائل درست ہو گئے۔ لوگ ان مسائل میں آپ کی بات کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے آپ کے ارشادات کی تابانی آگئی ہے۔ ۱۸ المناقب ج ۲ ص ۱۹۰ - ۱۹۱ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸ -

بلکہ حجاز، عراق اور شام جملہ بلاد اسلامیہ کے علماء سے اس میں روایتیں موجود ہیں۔ آپ صرف امام محمد کے حوالہ سے آئی ہوئی کتاب الآثار کا مطالعہ کیجئے۔ اور امام اعظم کے تمام شیوخ کو پڑھ لیجئے تو آپ کو ایک سو پانچ میں سے تیس کے قریب ایسے مشائخ ملیں گے جن کا وطن کوفہ، بصرہ یا یہاں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے کہ صحابہ میں جن بزرگوں میں سے مسائل منقول ہیں ان کی تعداد حافظ ابن القیم نے یہ بتائی ہے۔

والذین حفظت عنہم الفتویٰ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مائتہ و نيف و ثلاثون نفساً ما بین رجل وامرأة۔
اصحاب میں سے ارباب فتویٰ مرد و زن تقریباً ایک سو تیس سے کچھ اوپر نفوس قدسی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان میں فرق مراتب بھی تھا۔
ان میں کثیر الفتاویٰ، قلیل الفتاویٰ اور متوسط بھی تھے یہ سب زیادہ کثیر الفتاویٰ یہ حضرات ہیں :

كان الملکثرون منهم سبعة عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود، عائشة ام المومنین و زید بن ثابت و عبد اللہ بن عمر، و عبد اللہ بن عباسؓ
کثیر الفتاویٰ سات بزرگ ہیں عمر، علی، عبد اللہ، عائشہ، زید بن ثابت، عبد اللہ بن عمر۔ عبد اللہ بن عباس۔

ان سات میں بھی چار بزرگ بہت زیادہ ممتاز گزرے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :
واکابر هذا الوجه عمر و علی و ابن مسعود و ابن عباسؓ
ان میں بزرگترین عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس ہیں۔

حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک بزرگ کے فتاویٰ کو اگر جمع کیا جائے تو مستقل ایک ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے اور ابو بکر محمد بن موسیٰ کے بارے میں حافظ ابن القیم کی تصریح ہے کہ احدا مئة الاسلام في العلم والحديث۔ انہوں نے حضرت

ابن عباس کے فتاویٰ کو لکھا گیا تو

جمع فی عشرین کتاباً۔^۱ بیس کتابوں میں جمع کیا

موطا میں حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت ابن عباس سے بہت کم روایات ہیں۔ شاہ ولی اللہ مصنفی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

امام مالک نے حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت ابن عباس سے کم روایات لی ہیں۔ ہارون الرشید نے امام مالک سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ لسم یکنو نا ببلدی ولہذا لقا رجالہما یعنی یہ دونوں بزرگ میرے شہر میں نہ تھے اور میری ان کے اصحاب سے ملاقات نہیں ہوئی۔^۲

اس کے برعکس کتاب الآثار میں جس مقدار میں حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایات ہیں اسی کے قریب قریب حضرت عمر، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس کی بھی روایات ہیں۔

کتاب الآثار کی مقبولیت

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ
مسند ابی حنیفہ و آثار محمد بنائے فقر خفیہ است۔^۳

اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمت مرحومہ کا سوا و اعظم جس کی تعداد تمام عالم کے مسلمانوں میں دو تہائی ہے اس کے مذہب کا علمی سرمایہ امام ابو حنیفہ کی کتاب الآثار ہے اور اسے امت کی اکثریت کی تعلق بالقبول کا شرف حاصل رہا ہے صرف اور صرف احناف ہی کی نہیں بلکہ ہر دور میں مشروع ہی سے ائمہ نے بھی اس کتاب کی جلالت کو مانا ہے۔

امام مالک کے بارے میں آپ پہلے پڑھ آتے ہیں کہ عبدالعزیز در اور دی فرماتے ہیں کہ امام موصوف امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے امام شافعی نے تصریح کی ہے کہ:

من لم ينظر في كتب ابی حنیفۃ لم يتبحر فی الفقہ۔^۴

خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ایک بار ابو مسلم مستملی نے شیخ الاسلام یزید بن ہارون جبکہ وہ بغداد میں منصور بن المہدی کے پاس فروکش تھے ہم بالا خانے میں پہنچ گئے۔ ابو مسلم نے ریاست کیا کہ

ما تقول یا ابا خالد فی ابی حنیفہ والنظر فی کتبہ
لے ابو خالد تمہاری ابو حنیفہ اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بارے میں
کیا رائے ہے۔

آپ نے فرمایا:

نظر فیہا ان کنتم تریدون ان تفقہوا فانی ما رأیت احدا من
الفقہاء یکرہ النظر فی قولہ لے
اگر تم فقیہ بننا چاہتے ہو تو ان کا مطالعہ کرو میں نے کسی بھی فقیہ کو ان سے
بے نیاز نہیں دیکھا۔

ایک اور موقع پر جب یزید بن ہارون حدیث کا درس دے رہے تھے طلبہ کو خطاب کر کے
کہنے لگے:

تمہارا پیش منہا تو بس حدیث سننا اور جمع کر لینا ہے اگر علم تم لوگوں کا
مقصد ہوتا تو حدیث کی تفسیر اور اس کے معانی کی تلاش کرتے اور
ابو حنیفہ کی تصانیف اور ان کے اقوال میں غور کرتے تب حدیث کی حقیقت
تم پر واضح ہوتی لے

اور حافظ عبد اللہ بن داؤد الخریسی فرماتے ہیں:

جو شخص چاہتا ہے کہ نابینائی اور جہالت کی ذلت سے نکلے اور فقہ کی لذت
سے آشنا ہو اس کو چاہیے کہ ابو حنیفہ کی کتابیں دیکھے لے

ان ہی حافظ عبد اللہ بن داؤد الخریسی کا بیان خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے:
عبد اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی نمازوں میں امام ابو حنیفہ
کے لیے دعا کیا کریں کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے فقہ اور سنن کو

محفوظ کر دیا ہے یہ

حافظ ابو یعلیٰ خلیلی نے کتاب الارشاد میں امام مرفی کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ امام مرفی، امام شافعی کے بڑے تلامذہ میں سے ہیں اور امام طحاوی کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہیں۔ ایک بار ان سے محمد بن احمد شریطی نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے ماموں کے خلاف ابو حنیفہ کا مذہب کیوں اختیار کیا۔ امام طحاوی نے فرمایا اس لیے کہ :

میں اپنے ماموں کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ ہمیشہ ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے ہیں لہذا میں نے بھی ان کے مذہب کو اختیار کر لیا۔

یہ ائمہ فقہ و حدیث کی تصریحات اور امام اعظم کی تصانیف کے بارے میں ان کے طرز عمل کی داستان ہے۔ اس سے آپ کتاب الآثار کی ان ائمہ میں جلالتِ قدر اور مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کتاب الآثار کا محدثین پر اثر

کتاب الآثار نے محدثین پر کیا اثر ڈالا اور امام اعظم کے بعد آنے والے محدثین امام اعظم سے اس فن کی تدوین میں کس قدر اثر پذیر ہوئے اس کا ایک معمولی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روایات کی ترتیب اور تنویب کے سلسلے میں امام اعظم نے کتاب الآثار میں جو طریقہ اختیار کیا تھا۔ بعد کے تمام مؤلفین نے اسی کو اپنایا۔ السیوطی کی تصریح کے مطابق مؤطا کی ترتیب اسی کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔ اسی طرح روایات کی صحت کے بارے میں امام اعظم نے جو معیار قائم کیا تھا بعد کے ارباب صحاح نے اختلاف مذاق کے باوجود اس کا پورا پورا خیال رکھا۔ حافظ ابن عدی نے بسند متصل امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ :

ما دخلت فی کتابی الا ما صح یہ

امام مسلم نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ میں نے صحیح میں وہ ہی حدیثیں درج کی ہیں جن کی صحت پر اور مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا۔ چنانچہ خود ان کا بیان ہے ۔

انما وضعت ہلہنا ما اجمعوا علیہ یہ

لے تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۴۴۔ لے وفيات الاعیان۔ لے مقدمہ فتح الباری ص ۵۔ لے صحیح مسلم۔

امام اعظم نے روایت سے احتجاج کے بارے میں ان بزرگوں سے پہلے یہ طرز عمل بنایا تھا کہ:
انی اخذ بکتاب اللہ اذا وجدته فما لم اجدہ اخذت بسنتہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والاثار الصحاح عنہ
التي فشت فی ایدی الثقات۔

میں مستند کو جب کتاب اللہ میں پاتا ہوں تو وہاں سے لیتا ہوں اگر وہاں نہ
ملے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی صحیح حدیثوں سے
لیتا ہوں کہ جو ثقات کے ہاتھوں شائع ہو چکی ہیں۔

امام سفیان ثوری نے امام اعظم کے اس طرز عمل کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے۔
یاخذ بما صح عندہ من الاحادیث التي كان يحملها الثقات و
بالآخر من فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور جن کو ثقہ روایت کرتے
ہیں اور جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے وہ ہی لیتے ہیں۔
کتاب الآثار میں ان ہی آثار صحیحہ کو جن کی اشاعت ثقات کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے
جمع کر دیا ہے۔ امام اعظم نے اس کتاب میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا بعینہ وہی طرز عمل امام اعظم
کی پیروی میں السیوطی کی تصریح کے مطابق امام مالک نے مؤطا میں اختیار فرمایا ہے جیسا کہ پیچھے
اشارہ پڑھ آئے ہو کہ مؤطا کو شاہ عبدالعزیز نے اصل و ام صحیحین قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب
نے عجلہ نافعہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ

صحیح بخاری و مسلم اگرچہ تفصیل کے لحاظ سے مؤطا سے دس گنی ہے
لیکن روایت احادیث کا طریقہ، رجال کی تمیز اور اعتبار و استنباط کا
ڈھنگ مؤطا ہی سے سیکھا ہے۔

اگر بخاری و مسلم نے مؤطا سے سیکھا ہے تو امام مالک نے مؤطا میں امام اعظم کی کتاب الآثار کی
پیروی کی ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ روایات کی ترتیب و بتویب اور صحت کے
بارے میں جو معیار امام اعظم نے قائم کر دیا تھا اس کی سب نے پیروی کی ہے۔ اس لحاظ سے کتاب الآثار

نحین کی ام الام ہوئی ہے۔

تہذیب اور ترتیب تو بڑی بات ہے محدثین نے نام تک تجویز کرنے میں امام اعظم کی تقلید کی ہے۔ چنانچہ امام طبری نے اپنی کتاب کا نام تہذیب الآثار، حافظ ابو جعفر طحاوی نے معانی الآثار، کل الآثار، امام شلبی نے تصحیح الآثار رکھا۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ کتاب الآثار سے پہلے حدیث کی کوئی کتاب ابواب پر مرتب نہیں تھی۔ کتاب الآثار تصنیف ہوئی تو حدیث کی تہذیب کا رواج شروع ہوا اور چونکہ اس میں تہذیب کے ساتھ صحیح روایات درج کرنے کا التزام تھا اس لیے بعد میں ابواب پر تصنیف کے لیے بھی ضروری ہو گیا کہ صحیح روایات درج کتاب کی جائیں۔ چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں :

ان المصنف علی الابواب انما یورد اصح ما فیہ لیصلح الاحتجاج

ابواب پر تصنیف کرنے والا اس مضمون کی صحیح تر وہ روایات لاتا ہے

جو لائق استدلال ہوں گے

ان تصریحات سے آپ کو اتنی بات کا ضرور اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حسن ترتیب، جودت تالیف، صحت روایات اور ان کے انتخاب میں کتاب الآثار نے بعد میں آنے والے مصنفین کے لیے یسا اچھا نقش قدم چھوڑا ہے۔

کتاب الآثار کی علمی خدمت

حدیث کی دوسری کتابوں کی طرح کتاب الآثار کی بھی علمی خدمت کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام اعظم کے اساتذہ میں سے ہر استاد کی مرویات کو یکجا کر کے اس کو مسند بنی فیفہ کے نام سے موسوم کر دیا ہے اور علامہ خوارزمی نے ان سب مسانید کو یکجا کر کے جامع المسانید ام رکھا ہے ورنہ یہ مسانید امام اعظم کی تصنیف نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن علی بن مرہ الحسینی نے التذکرہ برجال العشرہ میں لکھا ہے کہ

مسند الشافعی موضوع بلا دولة علی ما صح عندہ من مروایاتہ و

کذا لک مسند ابی حنیفۃؒ

مسند امام شافعی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام موصوف کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں اور یہی حال مسند ابی حنیفہ کا ہے۔

یعنی مسند شافعی کی طرح مسند ابی حنیفہ بھی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام ابو حنیفہ کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ یہ حسینی حنفی نہیں بلکہ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں اور ان کا شمار محدثین میں نہیں بلکہ حفاظ وقت اور ناقدین فن میں ہے۔ ان کا مبسوط ترجمہ حافظ ابن فہد نے لفظ الالحاظ میں اور حافظ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں لکھا ہے۔ حافظ ابن فہد نے لکھا ہے۔

كان رضى النفس حسن الاخلاق من الثقات الاثبات اماماً مؤرخاً
حافظاً له قدر كبير له

حافظ مغلطائی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن رافع اور حافظ حسینی معاصر ہیں۔ حافظ حسینی کی کتاب التذکرہ برجال العشرہ بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ اس میں جن دس کتابوں کے رجال مذکور ہیں وہ ائمہ اربعہ فقہ مجتہدین اور ائمہ ستہ حدیث کی کتابیں ہیں۔ چنانچہ حافظ سیوطی فرماتے ہیں۔
الف المتذکرۃ فی رجال العشرۃ الکتب الستۃ والموطا والمسند
ومسند شافعی وابی حنیفہ۔

مشہور محدث محمد بن جعفر الکنانی رقمطراز ہیں:

فهذه كتب الائمة الاربعة وباضافتها الى الستة الادنى تكمل
الكتب العشرة التي هي اصول الاسلام وعليها مدار الدين

الغرض مسند امام اعظم کی تالیف نہیں بلکہ ان کی حیثیت وہی ہے جو فی الواقع محدثین کے عرف میں مسند کی ہوتی ہے جیسے مسند ابی بکر، مسند فاروق اعظم۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ بتان المحدثین میں فرماتے ہیں۔

پس نسبت ایں مسند بحضرت امام اعظم ازیں باب است کہ مثلاً مسند ابی بکر
را از مسند احمد نسبت بحضرت ابی بکر مائیم

۱۔ لفظ الالحاظ ص ۱۵۔ ۲۔ ذیل طبقات الحفاظ ص ۶۵۔ ۳۔ الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۸
۴۔ بتان المحدثین ص ۴۳۔

البواب اور مسانید میں فرق

البواب اور مسانید میں فرق یہ ہے کہ تہذیب کی صورت میں احادیث کو مضامین کی رعایت سے بابوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نماز کی جدا گانہ، روزہ کی علیحدہ، زکوٰۃ کی الگ حدیثیں الگ بابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ اور مسانید میں حدیث کا تعلق خواہ کسی موضوع سے ہو ہر صحابی کی ساری روایات کو بلا لحاظ مضمون ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکر کی ساری حدیثیں مسند ابی بکر میں درج کی جاتی ہیں۔ چاہے ان حدیثوں کا کسی بھی موضوع سے تعلق ہو۔

البواب و مسانید میں ایک یہ بھی لطیف فرق ہے۔ مصنفین البواب کے پیش نظر وہ روایات ہوتی ہیں جن کی حیثیت روایتی طور پر اعتباری اور استدلالی ہو یعنی عموماً ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جو مسئلہ کے لیے احتجاج یا استشہاد کے قابل ہوں۔ اس کے برعکس ارباب مسانید کا کام صرف روایات کو جمع کرنا ہوتا ہے اس لیے وہ بہ نسبت مصنفین البواب کے میدان تصنیف میں ذرا آزاد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسانید میں صحیح اور غیر صحیح روایات کا انبار نظر آتا ہے۔ محدث حاکم نیشاپوری لکھتے ہیں:

البواب و مسانید میں فرق یہ ہے کہ مسانید کی صورت میں شرط یہ ہے کہ مصنف اس طرح عنوان قائم کرے۔ ذکر ما ورد عن ابی مکہ عن النبی۔ اس صورت میں مصنف کا فرض ہے کہ حضرت ابو بکر کی ساری حدیثوں کی تخریج کرے چاہے وہ صحیح ہوں یا ضعیف۔ اور البواب کا مصنف عنوان اس طرح لکھے گا۔ ذکر ما صح و ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الطہارۃ او الصلوٰۃ او غیر ذلک۔^۱

حافظ ابن حجر عسقلانی ارقام فرماتے ہیں:

البواب پر حدیث کی تصنیف کا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف ان روایات تک محدود رکھا جائے جن میں احتجاج و استشہاد کی صلاحیت ہو۔ برخلاف مسانید کے کہ ان میں پیش نہاد صرف احادیث کی فراہمی ہوتا ہے۔^۲

^۱ المدخل فی اصول الحدیث ص ۵۴۔ ^۲ تجلil المنفعة ص ۲

بہر حال یہ شرف امام اعظم ہی کو حاصل ہے کہ صحابہ اور تابعین کے انداز پر ان کے مسانید ترتیب دیے گئے ہیں یوں تو محدثین اور حفاظ حدیث بہت گزرے ہیں مگر بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کی احادیث و روایات توجہ کا ایسا مرکز رہی ہوں اور اس کثرت سے ان کی مرویات پر قلم حرکت میں آئے ہوں۔ اسی حقیقت کی طرف جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اشارہ کیا ہے:-

ایں مسند در حقیقت تالیف اونیست بلکہ دیگر اں بعد ایشاں مرویات
ایشاں راجع نمودہ اندیلہ
در حقیقت یہ مسند ان کی تصنیف نہیں ہے بلکہ آپ کے بعد اوروں نے
ان کی مرویات کو یکجا کیا ہے۔

جن محدثین و حفاظ حدیث نے امام اعظم کی مرویات کو یکجا کیا اور ان کے نام سے مسانید ترتیب دیے ہیں وہ خود اپنی جگہ اتنا ادب و سچا مقام رکھتے تھے کہ ان کی سندیں لکھی جاتیں مگر اس کے باوجود انہوں نے امام اعظم کی مرویات کو جمع کرنے کا کام سنبھالا۔
انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو مشہور عارف عیدالوہاب کا مسانید امام کے بارے میں یہ بیان پڑھیے:-

مجھ پر اللہ سبحانہ کا بڑا ہی احسان ہے کہ مجھے امام اعظم کے مسانید کا ان کے صحیح نسخوں سے مطالعہ کرنے کی توفیق ملی۔ ان نسخوں پر حفاظ حدیث کے قلم سے تحریریں تھیں جن میں آخری شخص حافظ دمیاطی ہیں، مطالعہ میں میں نے محسوس کیا کہ امام ممدوح ان تابعین کبار سے حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اپنے وقت کے برگزین عادل اور ثقہ تھے اور جو حدیث نبوی کی تصریح کے مطابق خیر القرون کے لوگ تھے مثلاً اسود، علقمہ، عطاء، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ اس لیے وہ تمام حضرات جو امام ابو حنیفہ اور حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں سب کے سب عادل اور برگزیدہ ہیں ان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کذاب ہو

یا جس پر کذب کی تہمت ہو۔ اے برادر! ان کی عدالت کے لیے تو یہی کافی ہے کہ امام ممدوح نے باوجود بے حد ورع و احتیاط ان کے حضرات کو اس غرض کے لیے منتخب کیا ہے کہ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ :-

اذ کل حدیث وجدناہ فی مسانید الامام الثلاثۃ فهو صحیح۔
 امام اعظم کے مسانید سے گانہ کی ہر حدیث ہمارے نزدیک صحیح ہے یہ
 ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسانید امام کا محدثین و حفاظ کے یہاں کیا مقام ہے اور خود امام اعظم حدیث میں کس حیثیت کے مالک ہیں ؟
 آئیے کچھ ان حفاظ حدیث کو بھی پڑھ لیجئے جنہوں نے امام اعظم کی مرویات کو مسند کی صورت میں مدون کیا ہے ۔

۱۔ حافظ محمد بن مخلد دوری

ان کی کنیت ابو عبد اللہ اور والد کا نام مخلد ہے تذکرۃ الحفاظ میں مخلد کی جگہ احمد غلط طبع ہو گیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اور حافظ ذہبی نے دول الاسلام میں مخلد ہی بتایا ہے۔ عطاء کی نسبت سے مشہور ہیں۔ حدیث میں ابو خذافہ السہمی، الحسن بن عرفہ، یعقوب دورقی، امام مسلم اور دوسرے محدثین کے سامنے زانوائے ادب تر کیا ہے بہت زیادہ صاحب التصانیف ہیں۔ منجملہ دیگر تصانیف کے امام اعظم کی مرویات کو مستقل کتابی صورت میں علیحدہ جمع کیا ہے اور اس کا نام بھی ”جمع حدیث ابی حنیفہ“ رکھا ہے۔ اس تالیفی کارنامہ کا تذکرہ محدث خلیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

مدونی عنہ محمد بن مخلد الدوری فی جمعه حدیث ابی حنیفہ۔^۱

ان سے محمد بن مخلد نے اپنے مجموعہ میں حدیث ابی حنیفہ روایت کی ہے یہ مشہور محدث امام دارقطنی کے استاد حدیث ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کی شہرت

۱۔ لہ، لہ المیزان البکری ج ۱ ص ۶۸۔ لہ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۸۸۔

کا بار بار اعلان کیا ہے اور لکھا ہے کہ فی تاریخ بغداد، ترجمۃ ملیحۃ تاریخ بغداد میں ان کا شاندار ترجمہ ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ صرف کثیر التصانیف محدث ہی نہیں بلکہ تین چیزوں میں خاص شہرت رکھتے ہیں :

کان معروفاً بالشقة والصلاح والاجتهاد في الطلب -

ثقافت، صلاحیت اور تلاش و جستجو کے لیے محنت میں مشہور تھے۔

امام ابو داؤد کے بھی بلا واسطہ شاگرد ہیں سنن ابو داؤد کے بارے میں ان کا ایک بیان حافظ عسقلانی نے تہذیب میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ :

امام ابو داؤد کی ایک لاکھ حدیثوں کا مذاکرہ کرتے کے لیے جب آپ نے کتاب السنن تصنیف کی اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھا تو محدثین کے لیے ان کی کتاب قرآن کی طرح قابل اتباع ہو گئی اور اس دور کے سب ہی محدثین نے امام موصوف کو حافظ وقت مانا ہے بلکہ

ان کی تاریخ وفات حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور دول الاسلام میں اور حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں ۳۳۱ھ لکھی ہے۔ ستانوے سال کی عمر پائی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسناد حدیث میں اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے۔

۲۔ حافظ ابو العباس احمد بن محمد بن سعید

حافظ ابن عقدہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا بسوط ترجمہ لکھا ہے اور ان کے چہرے کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے -

اليہ المنتہی فی قوتہ الحفظ و کثرة الحدیث

قوت حافظ اور حدیث کی بہتات میں بس ان پر حد ہے -

ان کے حافظ ہونے کے بارے میں حافظ دارقطنی کا تاثر یہ تھا کہ کوفہ کے تمام شہری اس پر متفق ہیں کہ زمانہ ابن مسعود سے آج تک ابن عقدہ سے زیادہ حافظ کوئی نہیں ہوا ہے

۱۔ تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن مخلد - ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰ - ۳۔ تہذیب ج ۲ ص ۷۲

۴۔ تہذیب ج ۲ ص ۷۲ - ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۵ -

حافظ ابن الجوزی رقمطراز ہیں کہ ابن عقدہ اکابر حفاظ میں سے تھے اور ان کے سامنے اکابر محدثین حافظ ابو بکر الجعفی، حافظ عبد اللہ بن عدی، امام طبرانی، ابن المظفر، دارقطنی اور ابن شاپین نے زانوائے ادب نہ کیا ہے بلکہ حافظ عسقلانی رقمطراز ہیں کہ امام ابو علی الحافظ فرماتے ہیں۔ میں نے ابو العباس سے زیادہ کوفیوں میں کوئی حافظ نہیں دیکھا ہے آپ سے دریافت کیا گیا کہ لکچھ لوگ تو ادھر ہی کچھ کہتے ہیں فرمایا ابن عقدہ اس سے کہیں بالا ہیں وہ امام ہیں۔ ان کا مقام یہ ہے کہ ان سے تابعین اور اتباع تابعین کے بارے میں دریافت کیا جاتے ہیں ان کے متعلق کسی کو یارائے سخن نہیں ہے بلکہ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ زعفرانی کا بیان ہے کہ ابن عقدہ کے زمانے میں بغداد میں ابن صاعد نے ایک حدیث غلط سند سے پیش کر دی۔ حافظ ابن عقدہ نے اس پر گرفت کی ابن صاعد کے ساتھیوں نے ہلڑ مچا دیا۔ حکومت تک پہنچ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابن عقدہ نذرندان ہو گئے۔ لیکن علی بن عیسیٰ زیر نے دونوں فریق کو اس پر راضی کر لیا کہ اس معاملہ میں کسی کو جج تسلیم کر لیا جائے فریقین کی ضماندی سے ابن ابی حاتم تجویز ہو گئے معاملہ کی پوری روداد لکھ کر ابن ابی حاتم کو بھیج دی گئی وہاں سے جو فیصلہ آیا وہ وہی تھا جو حافظ ابن عقدہ فرماتے تھے۔ معاملہ رفع دفع ہوا اور رہائی ہوئی بلکہ امام بخاری کی کتاب تاریخ کے اس قدر دلدردہ تھے فرماتے تھے کہ اگر ایک شخص تیس ہزار احادیث بھی لکھ لے پھر بھی وہ محمد بن اسماعیل کی کتاب تاریخ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا بلکہ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری درمسلم میں زیادہ حافظ کون ہے۔ فرمایا دونوں ہی عالم ہیں۔ پھر یہی بات بار بار دہرائی گئی۔ فرمایا کہ امام بخاری سے شام والوں کے باسے میں غلطیاں ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی کتابوں سے مدد لی ہے اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص کا ذکر ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو امام موصوف اس کو وہ شخص سمجھ لیتے ہیں لیکن امام مسلم کے علل میں غلطی بہت ہی کم ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں لکھی ہیں حافظ بدر الدین عینی نے تاریخ کبیر میں ان کے باسے میں یہ نقبھی انکشاف کیا ہے۔

۱۔ المنتظم تاریخ الملوک والامم ج ۲ ص ۳۳۷۔ ۲۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۱۶۵۔ ۳۔ تاریخ بغداد ترجمہ ابن عقدہ
۴۔ الاعلان بالتوہیح ص ۲۱۸۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۰۔

ان مسند ابی حنیفہ لا بن عقدہ یحتوی وحدہ علی ما یزید علی
الف حدیث۔

صرف ابن عقدہ والے مسند ابی حنیفہ کی احادیث ایک ہزار سے زیادہ ہیں۔
ان کی تاریخ وفات حافظ ذہبی نے دول الاسلام تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن الجوزی
المستظلم میں ۳۳۲ھ قرار دی ہے۔

۳۔ حافظ عبد اللہ الحارثی

امام علامہ حافظ الحدیث حارثی بخاری جن کو دربار علم سے فن حدیث میں عبد اللہ الاستاذ کا ممتا
خطیب ملا تھا۔ علم حدیث کے لیے آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا
اور بہت سے شیوخ وقت سے علم حاصل کیا۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں لکھا ہے کان شیخ
مکثراً من الحدیث بڑے کثیر الحدیث شیخ تھے اور حافظ خلیل فرماتے ہیں یعرف بالاستاد
لہ معرفۃ بهذا الشان استاد سے مشہور ہیں اور علم الحدیث کی ان کو معرفت حاصل ہے۔ او
حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبح کے ترجمہ میں بضمن و قیات ۳۴۲ھ ان کا ذکر شاندار لفظوں میں
کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

فیہا مات عالم ولاء النہر ومحدث الامام العلامة ابو محمد
عبد اللہ بن محمد بن یعقوب الحارث الحارثی البخاری المقلب
بالاستاد جمع مسند ابی حنیفۃ الامام ۳۵

یہ کس شان کی سند ہے؟ اس کے متعلق خوارزمی جامع المسانید میں لکھتے ہیں :
من طالع منہ الذی جمعہ للامام ابی حنیفۃ علم تجربہ فی
علم الحدیث و احاطتہ بعرفۃ الطرق والمکتون ۳۶
جس شخص نے ان کی مسند ابی حنیفہ کا مطالعہ کیا ہے اسے ان کے علمی تجربہ کا اندازہ
ہو جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس مسند کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۔ تانیب الخطیب ص ۱۵۹۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ۲ ترجمہ قاسم بن اصبح۔ ۳۔ جامع المسانید خوارزمی

قد اعتنى المحافظ ابو محمد الحارثي وكان بعد الثلاثمائة بحديث ابى حنيفة فجمع في مجلدات ورتبها على شيوخ ابى حنيفة له
حافظ ابو محمد حارثي۔ نے توجہ فرمائی اور سترہ کے بعد حدیث ابی حنیفہ
جمع کی ہے اور ان کو شیوخ ابی حنیفہ پر ترتیب دیا ہے۔

بڑے بڑے حفاظ جیسے حافظ ابن مندہ، حافظ ابن عقدہ، حافظ جعابی فن حدیث میں آپ
کے شاگرد ہیں حافظ عبد الغفار فرماتے ہیں کہ ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کے ساتھ کشف الآثار
فی مناقب ابی حنیفہ بھی ہے۔ اس دور کی علمی دلچسپیوں کے باوجود یہ بات آج بڑی حیرت سے سنی
جائے گی کہ موصوف جب اپنی مشہور تصنیف کشف الآثار املا کرتے تھے تو آپ کی مجلس املا میں چار سو
مستمل ہوتے تھے۔ خیال فرمائیے کہ جب امام اعظم کے مناقب کے املا میں یہ تعداد ہوتی تھی تو آپ
کی مسند کے درس میں خدا جانے یہ تعداد کہاں سے کہاں جا پہنچی ہوگی۔

امام حارثی کی اس مسند کا شاہ عبدالعزیز نے بستان المحدثین میں ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے
اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اس
مسند کا تذکرہ کیا ہے کہ جمع مسند الابی حنیفۃ۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے مشہور رسالہ الانتباء میں حافظ حارثی کو اصحاب الوجہ
میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانے میں فقہار و اخاف کا مرجع تھے۔ اصحاب الوجہ کا
درجہ مجتہد فی المذہب اور مجتہد منتسب کے درمیان ہوتا ہے۔ فقہ کی تحصیل آپ نے امام ابوحنیفہ
میں سے کی تھی۔

علامہ خوارزمی ان کی مسند کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ۔
روایتی طور پر مجھے باقاعدہ وقت کے چار اماموں کی وساطت سے یہ مسند ملی ہے۔
اول: خطیب جمال الدین ابو الفضائل عبدالکریم بن عبدالصمد الانصاری۔

دوم: شیخ صفی الدین اسماعیل بن ابراہیم۔

سوم: شمس الدین یوسف بن عبداللہ۔

چہارم: شیخ ابوبکر بن محمد بن عمر فرغانی۔

۴۔ حافظ محمد بن ابراہیم الاصفہانی

محمد بن ابراہیم نام اور ابو بکر کنیت ہے۔ ابن المقرئ کمر کے مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو تذکرۃ الحفاظ میں محدث اصفہان الامام الرجال الحافظ الثقة کے القاب سے ان کا ترجمہ شروع کیا ہے بڑے پائے کے محدث ہیں چار مرتبہ مشرق و مغرب کا صرف حدیث کی خاطر سفر کیا ہے۔ اصفہان، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تیسرے مکہ، قدس، دمشق، صیداء، بیروت، عکا، رملہ، واسط، حمص، مصر وغیرہ تمام ہی شہروں میں حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کی نشاندہی کی ہے ان کے سامنے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے مثلاً ابوالشیخ اصفہانی، ابوبکر بن مردویہ، حمزہ اسہمی، ابونعیم الاصفہانی وغیرہ وغیرہ۔ حافظ ابونعیم اصفہانی کی ان کے بارے میں رائے ہے۔

محدث کبیر ثقة صاحب مسانید سنی مالا یحصى کثرۃ ۱۰

حافظ ذہبی نے ان کے طلب علم حدیث کی داستان کا خود ان کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ میں، طبرانی اور ابوالشیخ مدینے میں قیام پذیر تھے۔ تنگ حالی کے ہاتھوں لاچار تھے۔ پورا دن گزر گیا کھانے کو کچھ نہ ملا میں عشا کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! بھوک لگی ہوئی ہے۔ طبرانی نے میرے سے کہا کہ بیٹھ جاؤ اب کھانا آئے گا یا موت آئے گی۔ میں اور ابوالشیخ کھڑے تھے کہ دروازے پر شیخ علومی نے دھک دی ہم نے دروازہ کھولا۔ تو ان کے ساتھ کھانے کے دو ناشتہ دان دولٹ کے لیے ہوتے آئے تھے۔ فرٹانے لگے تم نے میری حضور انور سے شکایت کی ہے۔ میں نے حضور انور کو ابھی ابھی خواب میں دیکھا ہے آپ نے مجھے کھانا پہنچانے کا حکم دیا ہے۔

حافظ ابن مقرئ صاحب بن عباد کے لا تبرین رہ چکے ہیں۔ کسی نے صاحب دریافت کیا کہ آپ ادیب ہو کر ابن المقرئ جیسے محدث سے محبت رکھتے ہیں۔ فرمایا دو وجہ سے۔ اول اس لیے کہ ان کے میرے والد سے دوستانہ تعلقات تھے۔ دوسرے اس لیے کہ میں ایک روز سو رہا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تو سو رہا ہے اور دروازے پر ایک اللہ کا دلی کھڑا ہے۔ میں بیدار ہوا اور ملازم کو آواز دے کر کہا کہ دیکھو

دروازے پر کون ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ابو بکر بن المقرئ ہیں۔ حافظ ذہبی نے ہی یہ بھی بتایا ہے۔
قد صنف مسند ابی حنیفۃؒ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ان کے مسند کا ذکر کیا ہے۔

و کذا اللہ خرج المرفوع منہ الحافظ ابو بکر بن المقرئؒ

اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی یہ مسند حارثی کی مسند سے چھوٹی ہے۔ حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوزیع میں یہ بھی لکھا ہے کہ حافظ زین الدین قاسم بن فطوریح نے حافظ ابن مقرئ کی اس مسند کے رجال پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ماہ شوال ۳۸۱ھ میں بعمر ۵۶ سال ان کا انتقال ہوا ہے۔

۵۔ حافظ ابوالحسن محمد بن المنظر

عراق، جزیرہ، مصر اور شام کے اساتذہ مشائخ سے چودہ سال کی عمر ہی میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کر دیا۔ حافظ ابن شاپین، حافظ دارقطنی، حافظ ابو نعیم، حافظ مالینی اور حافظ کبرقانی جیسے اساطین و ارکان علم حدیث نے ان کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں ایسا نمایاں حصہ لیا کہ حافظ ذہبی نے بھی ان کی فن کاری کا اعتراف کیا۔

جمع و الف عن مطابق هذا الفن لم يختلف

خطیب بغدادی نے ان کی صداقت اور فہم و حفظ کو سراہا ہے۔ دارقطنی نے ان سے ہزاروں حدیثیں لکھی ہیں۔ قاضی محمد بن عمر کا بیان ہے کہ حافظ دارقطنی حافظ ابن المنظر کا بیحد اکرام کرتے تھے ان کی موجودگی میں سہارے سے نہ بیٹھتے تھے۔

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حدیث کے لیے رخت سفر باندھا تو اس سفر میں حافظ ابو جعفر طحاوی سے حدیث کا سماع کیا۔ ابن ابی الفوارس کہتے ہیں کہ ان کی ثقہ مت، امانت اور حسن حافظ ہی قابلِ داد نہیں بلکہ لکھا ہے کہ انتھی الیہ الحدیث وحفظہ و علمہ حدیث حدیث کا علم، حدیث کا حفظ بس ان پر ختم ہے۔ حافظ کا عالم یہ تھا کہ حافظ ابن ابی الفوارس

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۲۔ ۲۔ تجل المنقبہ ص ۶۔ ۳۔ الاعلان بالتوزیع ص ۱۱۴۔

۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۳۔ ۵۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۴۸۔ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔

۷۔ لسان المیزان ج ۵ ص ۳۸۳۔ ۸۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۴۸۔

سنہ ایک بار ان سے ایک روایت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس روایت کا تعلق حدیث یا غزویٰ از ابن زید از عمر بن عاصم سے تھا فرمایا میرے پاس نہیں۔ سائل نے عرض کیا کہ دیکھ لیجئے شاید ہو فرمایا اگر ہوتی تو مجھے یاد ہوتی۔ میرے پاس اس راوی کی صرف ایک لاکھ حدیثیں ہیں لیکن ان میں یہ سلسلہ سند نہیں ہے۔

حافظ عسقلانی نے ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے یہ ان کی تاریخ وفات ۳۷۹ھ ہے۔ علامہ خوارزمی رقمطراز ہیں کہ اس مسند کی مجھے ان مشائخ سے اجازت ملی ہے۔ اول محی الدین ابو محمد یوسف بن عبدالرحمن بن الجوزی، دوم شیخ ابو المنظر یوسف بن علی بن حسین سوم علی بن معالی، چہارم شیخ عبداللطیف، علم حدیث اور حفظ حدیث میں اپنے دور کی ایک مثالی شخصیت تھے۔

۱۶۔ حافظ ابو عبد اللہ حسین بن محمد

پورا نام حسین بن محمد بن خسر و بلخی ہے۔ حافظ ابن عساکر کے اساتذہ میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو محدث مکرر کہا ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حافظ سمعانی نے جو تاریخ بغداد کا ذیل لکھا ہے۔ اس میں ایک بسوط ترجمہ ہے اور بتایا ہے کہ امام موصوف مفید بغداد ہیں۔ بہت سے مشائخ وقت سے حدیث کا استفادہ کیا ہے پھر مشائخ کے نام گنائے ہیں اور تفصیل کے بعد لکھا ہے:

و بالغ فی الطلب حتی سمع من طبقة دون هؤلاء و كتب الكثير
من الكتب لنفسه و لغيره و كان مفيداً للفرج با و جمع مسند
ابی حنیفہ۔

طلب و تلاش میں بڑی محنت کی ہے تا آنکہ ان سے کتر طبقة سے روایت
کیا اور بہت سی کتابیں اپنی اور دوسروں کی لکھیں اور غریب کے لیے
مفید تھا اور مسند ابی حنیفہ جمع کیا۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے ان کے بارے میں ابن النجار کے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اپنے وقت

کے بغداد میں اہل عراق کے فقیہ تھے۔ لے حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ان کی مسند امام حارثی اور حافظ ابن مقرئ کی مسند سے بڑی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وفی کتابہ زیادات علی ما فی کتابی الحارثی وابن المقرئ۔^۱
اور ان کی کتاب میں حارثی اور ابن المقرئ کی کتابوں کے مقابلے میں

زیادتی ہے۔

حافظ شمس الدین ابوالحسن محمد بن علی حسینی نے صحاح ستہ، مسند شافعی، مسند احمد، مسند ابی حنیفہ کے رجال پر جو کتاب لکھی ہے جس کا نام التذکرہ برجال العشرہ ہے اس سلسلے میں حافظ حسینی نے جس مسند کا انتخاب کیا ہے وہ بھی حافظ خسرو بلخی کی مسند ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

اما الذی اعتمدہ الحسینی علی تخریج رجالہ، فهو مسند ابن خشر^۲
جس مسند پر تخریج رجال پر اعتماد کیا ہے وہ مسند ابی حنیفہ ہے
ان کی تاریخ وفات ۵۲۲ھ ہے۔

۱۷۔ حافظ البوسیم الاصفہانی

پورا نام احمد بن عبد اللہ بن احمد الاصفہانی اصفہانی ہے وقت کے مشائخ کے سامنے زانوئے ادب تر کیا ہے جن اساتذہ نے ان کو پروانہ تخریث مرحمت فرمایا ہے ان میں واسط، نیشاپور، شام اور بغداد کے محدثین کرام ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا ہے کہ

اجازلہ مشائخ الدنیا۔^۳

دنیا کے سائے اساتذہ نے ان کو اجازت دی ہے۔
اور اس پر کُطف یہ ہے کہ ان کی تاریخ ولادت اگر ۳۲۶ھ ہے تو یہ اجازت نامے ان کو ۳۵۰ھ سے پہلے ہی چوبیس سال کی عمر میں مل گئے۔ جتنے اکابر سے ان کو ملاقات کا شرف حاصل ہے کسی محدث کو نہیں ہے۔ ان کے سامنے حفاظ حدیث میں سے خطیب بغدادی،

۱۔ الجواہر المضمیۃ ص ۲۱۸۔ ۲۔ تعجیل المنفعہ ص ۶۔ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔

ابو صالح المؤذن، ابو علی الوحشی، ابو الفضل احمد حداد اور ان کے برادر ابو علی الحسن الحداد المقری نے زانوئے شاگردی تکمیل کیا ہے۔ حافظ ابن مردویہ کہتے ہیں ہر سمت سے لوگ سمٹ سمٹ کر حدیث کی خاطر ان کے پاس آتے۔ ان کے وقت میں ان سے زیادہ حافظ دنیا کے کسی گوشہ میں نہ تھا۔ صاحب تصانیف ہیں۔ ان کی کتاب حلیۃ الاولیاء کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ لحد یصنف مثله اس جیسی پہلے کوئی تصنیف نہیں ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے اس مسند کو جو انہوں نے مسند ابی حنیفہ کے نام سے تالیف کیا ہے۔ حافظ ابو علی الحسن المقری الحداد کی وساطت سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابو علی اور ان کے برادر حافظ ابو الفضل کا حافظ ذہبی نے تذکرے میں حافظ ابو نعیم کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابو نعیم کے اس مسند ابی حنیفہ کا مقدمہ میں علامہ زاید کوثری نے تذکرہ کیا ہے۔

۸۔ حافظ ابن ابی العوام

حافظ ابو القاسم عبد اللہ بن محمد بن ابی العوام السعدی ان کا پورا نام ہے۔ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی اور حافظ ابو جعفر طحاوی کے شاگرد ہیں۔ مصر میں عہدۂ قضا پر فائز ہے امام ابو حنیفہ کے مناقب میں ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ مسند ابی حنیفہ اسی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۳۲۵ھ ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے مسند کا تذکرہ کیا ہے اور دوسرے مسانید کے ساتھ اس کی بھی تخریج کی ہے۔

۹۔ حافظ ابن عدی

پورا نام ابو احمد عبد اللہ بن عدی الجرجانی المعروف بابن القطان ہے ۳۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۵ھ میں وفات پائی ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز الامام الحفاظ البکیر کہہ کر کیا ہے۔ فن جرح و تعدیل میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ اس فن میں ان کی کتاب الکامل فی الجرح والتعدیل اس پایہ کی کتاب ہے کہ محدث حمزہ نے ایک بار امام دارقطنی سے درخواست کی کہ آپ ضعیفہ پر ایک کتاب لکھ دیجئے دارقطنی نے کہا کیا تمہارے پاس ابن عدی کی کامل نہیں ہے فرمایا کہ ہے جواب دیا کہ بس اس پر اضافہ نہیں ہو سکتا یہ

جرح و قدح میں ان کے قلم کی بے باکی سے اکثر نالال ہیں اور بہتوں کو ان کی اس باب میں بے انصافیوں کی شکایت بھی ہے۔ مولانا عبدالحی نے المرفع والتکمیل میں اس پر تفصیلی کلام کیا ہے احناف ان کے مذہبی تعصب کے نشتروں کا خاص طور پر نشانہ بنے ہیں چنانچہ امام اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں پر بڑی دلیری سے جو کچھ مٹہ میں آیا ہے لکھ دیا ہے۔ اس کے باوجود امام اعظم کے مسند کے راوی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کا اولین حال یہی تھا لیکن حافظ ابو جعفر طحاوی سے شرف تلمذ کے بعد ان میں انقلاب آگیا۔ شاید اسی کے کفارہ میں مسند ابی حنیفہ تصنیف کی لیے حدیث میں امام نسائی اور امام یعلیٰ موصلی کے شاگرد ہیں اور ان سے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے استفادہ کیا ہے مثلاً حافظ ابن عقیلہ اور حافظ حمزہ السہمی وغیرہ۔ مشہور ملک عیسیٰ بن ابی بکر البزلی نے حافظ ابن عدی کی مسند کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

ذکر ابن عدی صاحب کتاب الجرح والتعديل فی مسند ابی حنیفہ
فی صدر الکتاب فی مناقب ابی حنیفہ باسنادہ ۲۵

۱۰۔ حافظ ابوالحسن اثنانی

قاضی ابوالحسن عمر بن الحسن بن علی پور زمام ہے حافظ اثنانی سے شہرت رکھتے ہیں بڑے پایہ کے جلیل القدر محدث اور حافظ حدیث تھے۔ حافظ ابوالعلیٰ جو دارقطنی کے شیخ تھے۔ ان کی ثقاہت کا لوہا مانتے تھے۔ انہوں نے امام اعظم کی جو مسند لکھی ہے محدث خوارزمی نے اس کے جامع المسانید میں حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۳۳۹ھ ہے۔

۱۱۔ حافظ ابوبکر بن عبدالباقی

قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی بن محمد الانصاری الحلبی ابن ازالمعروف بقاضی المرتسان حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں شیخ الاسلام ابوالقاسم اسماعیل اصغہانی کے تذکرے میں ۵۳۵ھ کی وفیات کے سلسلے میں ان کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ میں کیا ہے۔ طبقات الحنابلہ میں ان کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ حافظ ابن النجار نے تاریخ بغداد کے ذیل میں ان کے حالات لکھے ہیں اور ان کے

اساتذہ کتے مذکورے میں بتایا ہے کہ طلب علم کی خاطر مکر اور مصر بھی تشریف لے گئے اور مکہ میں مشہور محدث ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد المقرئ الشافعی سے بھی حدیث کا سماع کیا ہے۔ یاد رہے کہ ابو معشر عبد الکریم ان محدثین میں سے ہیں جنہوں نے امام اعظم کی احادیث پر مستقل تصنیف چھوڑی ہے چنانچہ الکتانی رقمطراز ہیں:

جزء الاستاذ ابی معشر عبد الکریم بن عبد الصمد المقرئ الشافعی صاحب
التصانیف المجاور بکۃ المستوفی ۴۷۷ ذکر فیہ ما رواہ ابو حنیفۃ
من الصحابۃ ۱۷

اور یہ رسالہ المعجم المفہرس میں حافظ عسقلانی کی مرویات میں سے ہے۔ محدث خوارزمی نے جامع المسانید میں لکھا ہے کہ:

ھو جمع مسند الابی حنیفۃ ۱۷

اگرچہ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں حافظ ابن خسر کے ترجمہ میں اس کے ماننے سے انکار کیا ہے لیکن ان کے نامور شاگرد حافظ شمس الدین السخاوی ان کی مسند کو بسند ذیل روایت کرتے ہیں:

عن المتدمری عن المیدونی عن النجیب عن ابن الجوزی عن جامع
المستدقانی المرستان ۱۷

اور حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضمیۃ میں نصر بن سہار کے تذکرے میں حافظ سمعانی سے نقل کیا ہے:

کتاب الاحادیث التي رواها ابو حنیفۃ جمع عبد اللہ بن محمد
النصارى لجدہ القاضی صاعدیروایتہ عنہ ۱۷

ان کا تاریخ ولادت ۳۲۷ھ اور تاریخ وفات رجب ۴۲۵ھ ہے یعنی آپ دنیا سے ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرماتے دار بقا ہو گئے۔

۱۷ الرسالۃ المستطرفہ ص ۷۴۔ ۱۸ جامع المسانید ج ۲ ص ۲۹۳۔

۱۹ تقدم نصب الراویہ

۲۰ الجواہر المضمیۃ ج ۲ ص ۱۹۱۔

۱۔ حافظ طلحہ بن محمد

پورا نام طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد ابو جعفر ہے۔ مشہور محدث ہیں۔ محدث خطیب بغدادی نے
 تاریخ میں ان کے حالات قلم بند کیے اور ان کے اساتذہ کی لمبی فہرست دی ہے۔ حافظ عسقلانی
 لسان المیزان میں لکھا ہے مشہور فی زمانہ الدارقطنی صحیح السماع ہے ابن ابی الفوارس نے
 ان کی تاریخ وفات ۳۲۶ بتائی ہے۔ لسان المیزان میں ان کی تاریخ وفات مطبع کی غلطی سے
 ۳۲۵ طبع ہو گئی ہے۔ جامع المسانید میں ۳۲۶ ہے اور زمانہ دارقطنی از ۳۲۶ تا ۳۸۵ ہے
 زٹ خوارزمی فرماتے ہیں:

کان مقدم الحدود والشتات الاثبات فی زمانہ۔ صنف
 المسند لابن حنیفةؒ

حافظ تقی الدین السبکی نے ان کی سند سے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے،
 فی مسند الامام ابی حنیفة تصنیف ابی القاسم طلحہ بن محمد
 بن جعفر الشاہد۔ ۳

۱۔ حافظ ابن عساکر دمشقی محدث

ابو القاسم علی بن الحسن بن ہبیشہ النہ نامور محدث، اور مورخ ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام الحافظ
 نیر، محدث الشام، فخر الامم کے القاب سے نوازا ہے۔ تیرہ سو سے زائد اساتذہ سے علم حدیث
 حاصل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ محدث
 زرمی نے حافظ ابن النجار کے حوالہ سے ان کی علمی رحلتوں کے تذکرے میں عراق، مکہ، مدینہ،
 دمشق، خراسان، آذربائیجان، نیشاپور، سرخس، طوس، مرو، اصفہان، ہمدان، بسطام،
 معان، سمنان، رے، زرخان شمار کرائے ہیں۔ علمی سفروں کا آغاز ۵۲۰ھ میں اور اختتام
 ۵۳۰ھ میں بتایا ہے ان کی تصانیف میں تاریخ دمشق، الاثراف اور المعجم قیمتی تصانیف ہیں۔
 اعظم کے مسند کا ذکر ڈاکٹر کریم علی نے تاریخ دمشق کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ نیز علامہ زاہد

کوثری نے تبیض کذب المقری فیما نسب الامام الاشعری لابن عساکر کے مقدمہ میں کیا ہے۔ ان کے تاریخ وفات ۱۱۰۷ھ ہے۔

۱۴۔ محدث امام عیسیٰ جعفری مغربی

یہ عیسیٰ مغربی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد الاساتذہ ہیں۔ متاخرہ میں ان کی وفات ہوئی۔ شاہ صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ ”وے استاد جمہور اہل حریم است۔ متالیف الاسانید کے نام سے ایک معجم تصنیف کیا ہے اور ساتھ ہی امام اعظم کی ایک مسند تالیف کی۔ یہ مسند جس شان سے ہے اور اس میں جن شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس کا اندازہ شاہ صاحب کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔“

مسند برائے امام ابو حنیفہ تالیف کردہ درالجامعۃ متضمنہ ذکر کردہ درحدیث انہوں نے امام ابو حنیفہ کی ایسی مسند تالیف کی ہے جس میں اپنے سے لے کر امام صاحب تک عنعنہ ذکر کیا ہے۔

ذرا غور فرمائیے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جب دیگر محدثین کی حدیثوں سے ایسے کتابوں میں آجانے کے بعد سند ہی اتصال باقی نہیں رہ سکا اور سب کی احادیث سے روایاتِ مرسلہ کی حیثیت اختیار کر لی اور خود محدثین نے اسے ارسال العلماء کہہ کر شرف پذیر بھی دے دیا۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے یہ مان کر کہ فی الواقع حدیث کی کتابوں تک روایتی اتصال نہیں ہے بلکہ ارسال ہے لکھا ہے کہ :

”امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کتابوں میں آتی ہوئی ان سے مصنفین کی طرف نسبت درست ہے کیونکہ علماء کی عادت یہی ہے کہ کتاب کا حوالہ دے دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ انخرجه البخاری۔ اپنا بخاری تک سلسلہ سند بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :

”مراسیل میں قوی تر وہ مراسیل علماء ہیں جو ان کتابوں کے سلسلے میں علماء

کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ صرف امام اعظم ہی کی خصوصیت ہوتی کہ ان کی روایات میں آج تک غنہ متصلہ قائم ہے۔ اس طرح شاہ صاحب ہی کے لفظوں میں ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو گئی جو کہتے ہیں کہ حدیث کے سلسلہ سند میں آج کل اتصال نہیں۔ فرماتے ہیں:

آز اسباب بطلان زعم کسانیکہ گریند کہ سلسلہ حدیث امروز متصل مانده واضح تر سے شود۔

یہاں سے ان لوگوں کا دعویٰ بھی غلط ہونا ثابت ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا سلسلہ آج کل متصل نہیں رہا ہے۔

سوچئے کہ اگر امام اعظم سے حدیث کا سلسلہ جاری نہ ہوتا تو یہ حدیث کا سماع متصل امام صاحب سے لے کر شاہ صاحب تک کیسے وجود میں آ گیا ہے۔

یہ وہ مشاہیر حفاظ اور محدثین ہیں جنہوں نے امام اعظم کی احادیث کو مستقل تصانیف میں اپنی اسانید کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے ہائے میں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظم کے مسند پر قلم اٹھایا ہے۔ مشہور محقق زاید کوثری نے مقدمہ نصب الراية میں اسی سلسلے میں امام دارقطنی اور حافظ ابن شاہین کا بھی نام لیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

وكان مع الخطيب عند ما حل دمشق مسند ابی حنیفة للدارقطنی و مسند ابی حنیفة لابن شاہین

یہ دونوں مسندیں ان مسانید کے علاوہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ محدث خوارزمی نے جن نامور محدثین کے مسانید کو جامع المسانید میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کی تصریح کے مطابق حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسند امام حافظ ابو محمد عبد اللہ الحارثی المدنی۔

۲۔ مسند حافظ ابو القاسم طلحہ بن محمد

۳۔ مسند امام حافظ ابو الحسین محمد بن المنظر

- ۴۔ مسند حافظ ابو نعیم الاصفہانی
 ۵۔ مسند امام ابو بکر محمد بن عبد الباقی
 ۶۔ مسند حافظ عمر بن الحسن الاشثانی
 ۷۔ مسند امام ابو احمد عبد اللہ بن عدی
 ۸۔ مسند امام ابو عبد اللہ حسین بن محمد خسر
 ۹۔ مسند امام ابو القاسم عبد اللہ بن ابی العوام
 اصل میں مسانید تو صرف یہی ہیں ان کے علاوہ جو دوسرے مسانید کا اس مجموعے میں تذکرہ ہے مثلاً

- ۱۔ مسند امام حافظ محمد بن الحسن
 ۲۔ مسند امام حافظ قاضی ابو یوسف
 ۳۔ مسند امام حسن بن زیاد
 ۴۔ مسند امام حماد بن ابی حنیفہ
 دراصل یہ مسانید نہیں بلکہ کتاب الآثار کے نسخے ہیں جس کی تفصیلات آپ پڑھ چکے ہیں۔
 ایسے ہی حافظ ابو بکر کلاعی کی مسند بھی جامع المسانید میں مسند ہی بنا کر داخل کر دی گئی ہے حالانکہ
 یہ کوئی مستقل مسند نہیں بلکہ کتاب الآثار ہی کا ایک نسخہ ہے جس کو وہ اپنے جدا مجید محمد بن خالد سے
 روایت کرتے ہیں۔

اطراف حافظ ابن القیسرانی

محدثین میں اطراف پر کتابیں لکھنے کا پرانا رواج ہے ان کے عرف میں اطراف یہ ہیں کہ متن
 حدیث کے ابتدائی ٹکڑے لکھ کر اس کی ساری اسانید کو یکجا کر دیا جائے۔ انکشافی رقمطراز ہیں:
 ھی التي یقتصر فیہا علی ذکر طرف الحدیث الدال علی بقیہ مع
 الجمع لا سانیدہ ۱۷

جیسے حدیث کی دوسری کتابوں کے محدثین نے اطراف لکھے ہیں مثلاً اطراف صحیحین حافظ ابو نعیم

۱۷۔ الرسالہ المسطرہ ص ۳۷ یعنی اطراف یہ کہ حدیث کا ایک ٹکڑا لکھ کر اس کی ساری سندوں کو یکجا کر دیا جائے۔

اور حافظ ابو محمد خلف بن محمد، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر عسقلانی۔ ایسے ہی امام اعظم کی روایات پر حافظ ابن القیسرانی نے اطراف لکھے ہیں یعنی امام اعظم کے مختلف مسانید سے ان کی حدیثوں کو لے کر جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب الجمع بین رجال الصحیحین جو حافظ قیسرانی کی تصنیف ہے اور حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے اس کے آخر میں حافظ ابن القیسرانی کی تصانیف میں اطراف احادیث ابی حنیفہ کا ذکر ہے۔ موصوف بہت بڑے حافظ حدیث ہیں۔ ابن الجوزی نے المنتظم میں ان پر بہت لے دے کی ہے لیکن سمعانی نے ان کی صفائی بھی پیش کی۔ ابن کثیر نے البیہار میں، ابن الجوزی نے المنتظم میں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے۔ حافظ صاحب نے لکھا ہے دھو فی نفس صدوق لہ یتھمد وہ ذاتی طور پر غیر متہم راست گو ہیں۔ حافظ ابن عساکر کہتے ہیں کہ اسماعیل تیمی کا ان کے پاس سے میں تاثیر تھا کہ میں نے سب سے بڑا حافظ ابن طاہر کو پایا ہے یعنی بن مندہ کہتے ہیں کہ ا

حفاظ میں یگانہ، اچھے کردار والے راست گو، صحیح اور غلط سے واقف اور صاحب تصانیف عالم تھے۔

ان کی تاریخ وفات ۵۰۷ھ ہے۔

مسانید امام اعظم کی شرحیں

چونکہ جامع المسانید میں امام ابو حنیفہ کی متعدد مسانید کی روایتیں موجود ہیں۔ اس لیے متاخرین میں اس کتاب کی بڑی شہرت ہو گئی بڑے بڑے اجلہ محدثین نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں سے مشہور حافظ زین الدین قاسم المتونی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ موصوف نے ایک نہایت ضخیم شرح لکھی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔ اس کا نام التعلیقۃ المنیفۃ علی مسند ابی حنیفہ ہے۔ متعدد محدثین نے جامع المسانید کا اختصار بھی کیا ہے۔

امام شرف ال سن اسماعیل بن عیسیٰ بن دولہ المکی کے اختصار کا نام اختیار اعتماد المسانید فی اختصار اسماء بعض رجال الاسانید ہے۔

امام ابوالبتحا احمد بن ابی الفیاء محمد القرشی نے اس کا جو مختصر لکھا ہے اس کا نام المستند فی

قبصر المسند ہے۔ ایک اور مسند کا مختصر شیخ ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل نے بھی لکھا ہے۔

علامہ حافظ الدین محمد بن محمد الکرم درہی نے زوائد مسند ابی حنیفہ کے نام سے ان روایات کو جو مسند ابی حنیفہ میں صحاح ستہ سے زائد ہیں جمع کیا ہے۔

امام ابو حفص زین الدین عمر بن احمد الشجاع نے بھی ایک اختصار لفظ المرجان من مسند ابی حنیفہ النعمان کے نام سے کیا ہے۔

متاخرین میں علامہ السید مرتضیٰ زبیدی محدث نے جامع المسانید سے امام اعظم کی ان احادیث احکام کا انتخاب کیا کہ جن کی روایت میں مصنفین صحاح بھی امام صاحب کے شریک ہیں اس کتاب کا نام عقود الجواهر المضمیۃ فی اولیٰ مذہب الامام ابی حنیفہ ہے۔ اس کی ترتیب ابواب فقرہ پر ہے۔

بہر حال احادیث ابی حنیفہ کی جو خدمت کی گئی ہے یہ اس کی ایک جھلک ہے جو ناظرین کے سامنے بطور ہدیہ پیش کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سارا ذخیرہ آج آثار قدیمہ کی نظر ہے۔ اللہ کرے کوئی صاحب علم بزرگ اس علمی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں و ما ذالک علی اللہ بعزیز۔

حدیث کا دوسرا مجموعہ موطا امام مالک

کتاب الآثار کے بعد حدیث کا دوسرا مجموعہ جو اس وقت امت کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ امام دار الہجرۃ مالک بن انس کی مشہور تصنیف موطا ہے۔ یہ اہل مدینہ کی روایات اور فتاویٰ کا بہترین مجموعہ ہے۔ موطا میں بھی کتاب الآثار کی طرح مسائل و احکام کے لیے احادیث صحیحہ کو نقش اول اور آثار صحابہ و تابعین کو نقش ثانی قرار دیا ہے۔ حکیم الامت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

جاننا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے چاہے وہ مسند ہو یا

لے حافظ شمس الدین سخاوی کے بارے میں ازہر کے کلیہ شرعیہ کے استاد عبد الوہاب نے المقاصد الحسنہ کے مقدمہ میں بتایا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظم کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ اس مجموعہ کا نام ”التحفة المنیفة فیما وقع لہ من حدیث ابی حنیفہ“ ہے۔ حافظ سخاوی ان مشہور اکابر علماء میں سے ہیں جن کے علم عمل پر خود اہل علم کو اس قدر اعتماد ہے کہ علامہ شوکانی نے قسم کھا کر کہا ہے ولقد والله العظیم لہ من الحفاظ المتأخرین مثلاً۔ (البدر الطالع ج ۲ ص ۱۸۵)۔

مرسل۔ نیز حضرت عمر کے اشراف اور عبداللہ بن عمر کے عمل سے استدلال کرنا اور صحابہ و تابعین مدینہ کے فتاویٰ سے اخذ کرنا خصوصاً جبکہ ان تابعین کی ایک جماعت کسی مسئلہ پر متفق ہو امام مالک کے مذہب کا اصول ہے۔
فتح الباری کے مقدمہ میں حافظ عسقلانی لکھتے ہیں :
پھر امام مالک نے مؤطا تصنیف کیا اور اہل حجاز کی حدیثوں میں سے قوی اور صحیح روایتوں کو تلاش کر کے اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور تابعین اور ان کے بعد والے علماء کے فتاویٰ کو بھی اس میں مدغم کر دیا۔
مؤطا کے بارے میں امام شافعی کی رائے یہ ہے :

ما علی ظہر الارض کتاب بعد کتاب اللہ اصح من کتاب مالک
روئے زمین پر قرآن حکیم کے بعد مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب
نہیں ہے۔

حافظ سیوطی نے تنویر الجواہر کے مقدمہ میں امام شافعی کے اس ارشاد کو مختلف الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ بعد کو شافعی مدرسہ فکر کے کچھ علماء نے امام شافعی کے اس ارشاد کی یہ توجیہ کی ہے :
اما قول الشافعی فذلک قبل وجود الکتابین

در اصل اس توجیہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں چونکہ مؤطا میں مرسل، منقطع اور بلاغات ہیں اس لیے مؤطا کا درجہ اب بخاری و مسلم کے بعد ہے لیکن حافظ مغلطی فرماتے ہیں :
لا فرق بین المؤطا والبخاری فی ذلک لوجودہ ایضاً فی البخاری
من التعالیق ونحوہا۔

اس معاملے میں مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ بخاری میں بھی تعلیقات موجود ہیں۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے حافظ ابن حجر کی زبانی حافظ مغلطی کے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ :

۱۔ مصنفی ج ۱ ص ۱۷۔ ۲۔ ہی ساری ص ۴۔ ۳۔ تزیین الممالک ص ۴۲۔

۴۔ تنقیح الانظار ج ۱ ص ۴۰۔ ۵۔ تزیین الممالک ص ۴۴۔

موطا اور بخاری دونوں کی منقطع روایات میں فرق یہ ہے کہ موطا میں اس قسم کی جو روایتیں ہیں ان میں سے اکثر کا سماع امام مالک نے ایسا ہی کیا ہے اور یہ ان کے خیال میں حجت ہے۔ لیکن بخاری میں اس قسم کی جو روایات ہیں ان کی سندیں ان وجوہ کی بنا پر عمدہ احذث کی گئی ہیں جن کی تعلیقات کے سلسلے میں تشریح کر دی گئی ہے۔

اور اس موضوع پر خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں یہ توضیح فرمائی۔
 کچھ ائمہ نے موطا کے مقابلے میں صحیح بخاری کی اصحیت ثابت کرنے میں گنجشک ڈال دی ہے ان کا کہنا ہے کہ صحت اور احتیاط اور وثوق سے کام لینے میں بخاری اور مالک دونوں برابر ہیں۔ باقی بخاری میں حدیثوں کا زیادہ ہونا تو اس کا نہ صحت سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ یہ صحت کا لازمہ ہے۔ دراصل اس مشکل کا حل یہ ہے کہ بخاری کی اصحیت صرف شرائط صحت کی وجہ سے ہے۔ امام مالک کے خیال میں چونکہ انقطاع اسناد و منافی صحت نہیں ہے اس لیے ان کی کتاب میں مراسیل، منقطعات اور بلاغات آجاتے ہیں۔ اور امام بخاری انقطاع کو چونکہ ایک علت خارجہ قرار دیتے ہیں اس لیے وہ ایسی روایات کو موضوع کتاب سے الگ کر دوسرے سلسلے میں لاتے ہیں مثلاً ترجمہ میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ منقطع روایات اگرچہ کچھ کے نزدیک قابل احتجاج ہیں لیکن پھر بھی روایات متصلہ زیادہ قوی ہیں بشرطیکہ دونوں کے بیان کرنے والے حفظ اور عدالت میں یکساں ہوں۔ بس یہی بخاری کی اصحیت کی وجہ ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ امام شافعی نے موطا کی اصحیت کا دعویٰ اپنے زمانہ میں موجود تالیفات کے مقابلے میں کیا ہے۔ ان کے سامنے جامع سفیان ثوری اور مصنف حماد بن سلمہ جیسی کتابیں تھیں اور ان پر موطا کی فضیلت میں کبھی دو رائے نہیں ہوئی ہیں۔

علامہ محمد بن جعفر الحنفی نے علامہ الشیخ صالح کے حوالہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس تقریر کا یہ جواب دیا ہے :

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بلاغاتِ مؤطا اور تعلیقاتِ بخاری میں جو فرق بیان کیا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ اگر حافظ صاحب مؤطا کا بھی اسی طرح بنظرِ غائر مطالعہ کرتے جیسے انہوں نے صحیح بخاری کا کیا ہے تو ان کو پتہ لگ جاتا کہ واقعی ان دونوں کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ جو وہ فرماتے ہیں کہ امام مالک نے ان روایات کا اسی صورت میں سماع کیا ہے تو یہ ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ مؤطا کی ایک حدیث مثلاً یحییٰ کی روایت اگر بلاغاً ہے تو دوسرے لوگ اسی حدیث کو امام مالک سے مسنداً بھی روایت کرتے ہیں اور حافظ صاحب کی یہ بات بھی قابلِ پذیرائی نہیں ہے کہ مر اسیل امام مالک اور ان کے پیروکاروں کے نزدیک حجت ہیں اس لیے خود امام شافعی اور محدثین کے یہاں بھی مرسل حجت ہے بشرطیکہ اس کی پشت پر کسی مسند کی تائید ہو جیسا کہ ابن عبد البر اور سیوطی وغیرہ نے بتایا ہے اور عراقی کا یہ کہنا کہ بلاغاتِ مالک غیر معروف ہیں درست نہیں کیونکہ ابن عبد البر نے مؤطا کے تمام بلاغات، مر اسیل اور منقطعاً میں صرف چار کو چھوڑ کر وصل ثابت کر دیا ہے اور ان چار کو بھی موصول ثابت کرنے کے لیے ابن الصلاح نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شاہ صاحب محدث دہلوی مؤطا کو حدیث کی تمام کتابوں میں مقدم اور افضل سمجھتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں اس کے دلائل لکھے ہیں۔ حجتہ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ :

امام شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب مؤطا ہے محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مؤطا کا سارا علمی ذخیرہ مالک اور ان کے ہمنواؤں کے خیال میں صحیح ہے اس کا ہر مرسل اور منقطع دوسرے طرق سے متصل السند ہے اس لیے اس حیثیت سے مؤطا بالکل صحیح ہے خود امام مالک کے زمانے ہی میں مؤطا کی روایات کی تخریج کے لیے ان گنت

موطا لکھے گئے مثلاً ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، سفیان ثوری اور معمر وغیرہ نے ان لوگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں جو امام مالک کے شیوخ ہیں۔ پھر موطا سب لوگوں کی علمی و تعلیمی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ فقہاء میں سے امام شافعی، امام محمد بن الحسن، ابن وہب اور ابن القاسم۔ محدثین میں سے یحییٰ بن سعید القطان، عبد الرحمن بن مہدی اور عبد الرزاق، خلفاء و امراء میں سے ہارون رشید، امین، مامون، حتیٰ کہ موطا امام مالک ہی کے زمانے میں درجہ شہرت حاصل کر چکا ہے اور پھر ہر دور میں اس کی شہرت میں اضافہ ہی رہا۔ اسی پر فقہاء مصر نے اپنے مذاہب کو قائم کیا ہے حتیٰ کہ کچھ عراقیوں میں کچھ مسائل میں اسی کو پیش نظر رکھا۔ ہمیشہ سے ہر زمانے میں علماء موطا کی حدیثوں کی تخریج کرتے رہے اس کے توابع اور شواہد بتاتے رہے یہ

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنی شہرۃ آفاق مصنفی شرح موطا کے مقدمہ میں موطا کی ترجیح کے دلائل اور وجوہ کے ساتھ نہایت تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صحت کے لحاظ سے صحیحین اور موطا میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ بعض اور وجوہ سے بھی موطا کو صحیحین پر ترجیح ہے۔

الف :- امام مالک کی زیادہ روایات کا مرکز و منبع اہل مدینہ ہیں۔ علم الفقہ و فتاویٰ کے لیے زمانہ خلافت راشدہ میں مرکزی شخصیت حضرت فاروق اعظم کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس، اور حضرت جابر مدنی علمی دائرے کی اہم شخصیتیں ہیں۔ ان کے علوم کی وراثت مدینہ میں فقہاء سبعہ کو ملی ہے۔ امام مالک کو براہ راست ان فقہاء سبعہ کے تلامذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ امام مالک کے ان اساتذہ میں امام زہری، امام یحییٰ بن سعید انصاری، زید بن اسلم، ابو الزناد اور نافع۔ یہ کبار تابعین ہیں جن سے استفادے کا امام مالک کو موقع ملا ہے۔ امام مسلم اور امام بخاری کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔

ب :- آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ

کسی رافضی سے خواہ وہ کیسا ہی پاکباز کیوں نہ ہو حدیث کی روایت کے روادار نہ تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

سئل مالك عن الرافضة فقال لا تكلمهم ولا ترو عنهم

فانهم يكذبون۔

رافضیوں سے کوئی علمی گفتگو نہ کرو اور نہ ان سے روایت لو کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

بر خلاف اس کے مسلم و بخاری میں ان سے روایات موجود ہیں۔ چنانچہ السیوطی نے صراحتاً لکھا ہے جیسا اس پر آپ آئندہ اوراق میں تفصیلی بحث انشاء اللہ پڑھیں گے۔ یہاں خلاصہ کلام کے طور پر صاحب تعلیقات کے حوالہ سے صرف امام حاکم کا ایک بیان ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

مبتدعین اور اہل اہواء کی روایات اکثر محدثین کے یہاں مقبول ہیں بشرطیکہ

یہ لوگ راستباز ہوں۔ امام بخاری نے عباد بن یعقوب سے حدیث روایت

کی ہے حالانکہ اس کے باپے میں ابو بکر محمد بن اسحاق کی تصریح ہے کہ

دین میں متہم ہے اور محمد بن زیاد اور جریر بن عثمان سے بخاری میں روایتیں

آتی ہیں۔ حالانکہ دونوں ناصبی ہیں۔ بخاری اور مسلم دونوں نے محمد بن حازم

اور عبید اللہ بن موسیٰ سے حدیث لی ہے حالانکہ دونوں غالی شیعہ تھے۔

جہ۔ موطا کے نسخے تیس سے زائد ہیں لیکن ان میں سے قومی تر اور مشہور ترین جن کی روایت

کا سلسلہ امام مالک سے پھیلا ہے بارہ ہیں۔

السند الغافق کتاب الموطا بروایت بخاری عشر من اصحاب مالک

حافظ ابن عبد البر نے اسناد کار اور مقبید میں ان ہی بارہ نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے جبکہ بخاری

کے تلامذہ میں سے جن بزرگوں سے سلسلہ روایت چلا وہ صرف چار ہیں۔ شاہ عبد العزیزؒ نے

بستان المحدثین میں ان کی تعداد سولہ بتائی ہے۔

جن بزرگوں سے موطا کا روایتی سلسلہ دنیا میں پھیلا ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ یحییٰ بن یحییٰ المسعودی الاندلسیؒ - ۲۔ ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن سلمہؒ

۳۔ ابو عبد اللہ عبد الرحمن بن القاسمؒ - ۴۔ معن بن عیسیٰ بن دینار البو یحییٰ المدنیؒ

- ۵۔ ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن مسلم بن قعنب ^{۲۲۲ھ}۔ ۶۔ ابو محمد عبد اللہ بن یوسف الدمشقی ^{۲۱۸ھ}۔
 ۷۔ یحییٰ بن عبد اللہ بن بکر القرشی ابو زکریا ^{۲۳۱ھ}۔ ۸۔ سعید بن کثیر بن عقیق بن مسلم الانصاری ^{۲۲۶ھ}۔
 ۹۔ احمد بن ابی بکر القاسم بن الحارث ^{۲۴۲ھ}۔ ۱۰۔ مصعب بن عبد اللہ الزبیری ^{۲۳۶ھ}۔
 ۱۱۔ محمد بن الحسن الشیبانی الامام ^{۱۸۹ھ}۔ ۱۲۔ سوید بن سعید بن سہل الہروی ^{۲۴۰ھ}۔
 ۱۳۔ یحییٰ بن یحییٰ بن بکر بن عبد الرحمن ^{۲۴۶ھ}۔ ۱۴۔ احمد بن اسماعیل بن محمد ابو حذافہ ^{۲۵۹ھ}۔
 ۱۵۔ محمد بن المبارک بن یعلیٰ القرشی ^{۲۲۵ھ}۔ ۱۶۔ سلیمان بن برد ^{۲۴۶ھ}۔
- الغرض موطا کتاب الآثار کے بعد احادیث صحیحہ کا مجموعہ ہے۔

جامع معمر بن راشد

اسناد و روایت کے بہت بڑے امام ہیں۔ علی بن المدینی اور ابو حاتم نے ان کو اپنے دور میں علم روایت کا مرکز قرار دیا ہے ابھی سبزہ کا آغاز نہیں ہوا کہ علم حدیث کے لیے تنگ و دو شروع کر دی تھی خود ان کا اپنا بیان ہے کہ :

مجھے قنادہ سے چودہ سال کی عمر میں استفادے کا موقع ملا ہے جو کچھ
 بھی سنتا سینہ میں نقش ہو جاتا تھا۔

امام احمد کا بیان ہے کہ جب بھی ہم نے معمر سے کسی کا مقابلہ کیا تو معمر کو طلب علم حدیث میں پیشرو پایا۔ معمر اپنے زمانے میں علم کے بڑے جویا تھے۔ ابن جریر کہتے تھے معمر سے استفادہ کرو کیونکہ اپنے زمانے میں ان سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے۔ معمر بن راشد بھی امام مالک کے معاصر ہیں اور دوسری صدی کے بڑے پائے کے مؤلفین میں سے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے اس دور کے مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

سفیان بن عیینہ، مالک بن انس نے مدینہ منورہ میں، عبد اللہ بن
 وہب نے مصر میں اور محمد بن عبد الرزاق عین میں تصنیف کا کام کیا۔
 حافظ جمال الدین السیوطی لکھتے ہیں :

اسی عہد میں علماء اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کی

چنانچہ مکہ میں ابن جریر نے مدینہ میں مالک نے شام میں، اور اسی نے
بصرہ میں ابی عروہ نے یمن میں معمر نے کوفہ میں سفیان ثوری نے
تصانیف کیں۔

امام ذہبی سے حافظ سخاوی نقل کرتے ہیں کہ :

یمن میں حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعری فروکش ہوتے
یمن سے بہت سے تابعین ائمہ ہوتے۔ اس میں تابعین میں علماء کی
ایک جماعت ہوتی ہے۔ امام منبہ کے دونوں صاحبزادے وہب بن منبہ
اور ہمام بن منبہ ہوتے امام طاؤس اور ان کے صاحبزادے ہوتے
بعد ازیں معمر بن راشد اور ان کے اصحاب ہوتے پھر عبدالرزاق اور
ان کے ساتھی ہوتے۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں :

مکہ میں تصنیف کا کام ابن جریر نے مدینہ میں مالک اور محمد بن اسحاق
نے بصرہ میں ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے کوفہ میں سفیان ثوری
نے شام میں اور اسی نے واسط میں یثیم نے اور یمن میں معمر بن راشد
نے کیا ہے۔

حافظ ابن الجوزی نے تلیح فہوم اہل الاثر میں جہاں مصنفین متقدمین کا تذکرہ کیا ہے
وہاں دوسرے مصنفین کے ساتھ معمر بن راشد کا نام بھی لیا ہے۔

معمر بن راشد نے ۵۵ سال کی عمر میں شہادت میں وفات پائی ہے ان کے شیوخ و اساتذہ
میں ثابت البنانی، قتادہ، زہری، عاصم الاحول، ایوب السختیانی، الجعد، زید بن اسلم، صالح بن
کیسان، عبداللہ بن طاؤس، جعفر بن بہرقان، المحکم بن ابان، اشعث بن عبداللہ، اسماعیل
بن اُمیہ، ہمام بن منبہ، ہشام بن عروہ، محمد بن المنکدر اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ تابعین کے
نام ملتے ہیں۔

معمر بن راشد نے علمی استفادہ یمن میں ہمام بن منبہ سے کیا ہے۔ ہمام کو حضرت ابو ہریرہ

کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان سے حدیثیں سُنی ہیں جو تقریباً ایک سو چالیس ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

معمر کو ان سے استفادے کا موقع ہمام کی کبر سنی کے زمانے میں ملا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی مرویات ان کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے

معمر کو سنا فی مشروع کہیں تو تھک گئے معمّر نے ان سے رسالہ لے لیا

اور باقی خود پڑھ کر سنایا۔

یہ لکھی ہوئی مرویات ابو ہریرہ حدیث کا وہ ہی رسالہ ہے جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے ہمام سے اس رسالہ کے راوی معمّر بن راشد ہیں۔ الذہبی لکھتے ہیں۔

لہمام عن ابی ہریرۃ نسخة مشہورة رواها عنہ معمّر

معمّر نے نہ صرف یہ کہ ہمام کی ان حدیثوں کو بعینہ محفوظ رکھا بلکہ الجامع نامی ایک کتاب خود بھی تصنیف کی ہے :

ابو طالب مہی نے قوت القلوب میں لکھا ہے :

ثم کتاب معمّر بن راشد باليمن فیہ سنن

دوسرے مقام پر الکحافی لکھتے ہیں :

جامع معمّر بن راشد الازدی مولدہم البصری نزلی الیمن

المتوفی ۱۵۳ھ

جیسا کہ نام بتا رہا ہے اس میں آپ نے وہ تمام احادیث یکجا کی ہیں جو آپ نے مختلف اساتذہ سے سُنی ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا اہل علم کو تشکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے جامع معمّر کا نسخہ ترکی سے بڑی تگ و دو اور تحقیق و جستجو کے بعد نکالا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :

علم کی خوش قسمتی ہے کہ یہ کتاب اب تک محفوظ ہے اور حال ہی میں ترکی

دستیاب ہو گئی ہے اس کا ایک نسخہ جامعہ انقرہ کے شعبہ تاریخ کے

کتب خانے میں محفوظ ہے اور ناقص و دریدہ لیکن بہت قدیم ہے

یعنی ۳۶۴ میں اندلس کے شہر طلیطلہ میں لکھا گیا ہے دوسرا نسخہ مل
ہے اور استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے اور ۶۷۶ کا
لکھا ہوا ہے اس کتاب پر استنبول یونیورسٹی کے نوجوان فاضل استاد
ڈاکٹر فواد نے ”ترکیات مجموعہ سی“ نامی رسالے کی بارہویں جلد میں
ص ۱۱۵ تا ص ۱۳۴ پر ایک دلچسپ مقالہ بھی لکھا ہے لیکن ترکی زبان
میں ہے اس کا عنوان یہ ہے ”حدیث مصنفات تک مبدئی و معمر بن
راشدک جامع“ یہ کتاب راوی وار نہیں بلکہ موضوع وار مرتب ہوتی ہے
سہ سہی مطالعہ پر اس میں ہمام بن منبہ کا بھی آٹھ دس بار ذکر آیا ہے
لیکن معمر کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ تکرار نہ ہو۔ چنانچہ صحیفہ ہمام
کی روایت کو بھی خود ہی سے متعلق ہونے کی وجہ سے کتاب الجامع
میں مکرر نقل نہیں کیا۔ البتہ ہمام کے رسالہ کی حدیثیں ہمام کے علاوہ
کسی اور راوی سے ملیں تو اس جدید سند کے ساتھ ان کو الجامع میں
ضرور ذکر کیا ہے اس طرح ایک ہی حدیث چند در چند ماخذوں سے
معلوم ہونے کی وجہ سے معتبر سے معتبر ہو جاتی ہے جامع معمر و صنفیات
سے کچھ زائد پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کی اشاعت کی جلدی ہی نوبت
آجاتے ہیں

مشہور امام یحییٰ بن معین زہریات میں ابن عیینہ، صالح بن کیسان کے مقابلے میں معمر کو
بہت زیادہ سراہتے تھے یہ

امام معمر کو امام اعظم ابو حنیفہ سے خاص عقیدت تھی اور آپ امام اعظم کی جلالت علمی کے بہت
گن گاتے تھے چنانچہ حافظ عبدالقادر لکھتے ہیں :-

امام اسفرائینی نے امام علی بن المدینی حافظ ابوالحسن کے حوالے سے جو امام
بخاری کے استاد ہیں اور حدیث ثقلین کے ناقد ہیں لکھا ہے کہ
ابن المدینی کہتے ہیں کہ امام عبدالرزاق فرماتے تھے کہ امام معمر کہا کرتے

ہفتے کہ حسن بصری کے بعد فقر میں حسن معرفت ابو حنیفہ جیسی میرے علم میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔

جامع سفیان الثوری

امام سفیان ثوری کو فقہ کے پہلے والے ہیں فقہ میں ان کا اور امام اعظم کا عموماً ایک مذہب ہے امام ترمذی اپنی سنن میں اکثر امام سفیان ثوری کا مذہب نقل کرتے ہیں جو اکثر امام ابو حنیفہ کے موافق ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں۔

سفیان الثوری اکثر متابعۃ لابی حنیفۃ منیٰ

امام زفر جب بصرہ تشریف لائے اور ان کے سامنے جامع سفیان لائی گئی تو اسے مطالعہ کے بعد امام زفر کا تاثیر تھا۔

هذا كلامنا ينسب الى غيرنا

یہ بات تو ہماری ہے لیکن منسوب اوروں سے ہے

امام زفر نے جامع سفیان کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس کے فقہی مسائل سے متعلق ہے۔ بعض ان فقہی مسائل کو جو ائمہ کے مابین اختلافی ہیں اور جن میں اختلاف محض افضلیت اور اہمیت کا ہے ان کو اہمیت دیتے تھے اور اتنی اہمیت کہ ان کو اہل سنت ہونے کا معیار قرار دیتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو حافظ ذہبی نے لالکائی کی السنۃ کے حوالے سے لکھا ہے۔

شعیب بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے عرض کیا کہ السنۃ کے موضوع پر کوئی بات ایسی بتائیے جو میرے لیے نفع بخش ہو اور ایسی پختہ ہو کہ جناب الہی میں اگر آپ کے حوالہ سے کہوں تو پرکجاؤں اور آپ کی گرفت ہو جاتے فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے اللہ ہی اس کا مبداء اور معاد ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کہے وہ کافر ہے اور ایمان قول و عمل اور نیت کا نام ہے بڑھتا اور گھٹتا ہے اور شیخین کو مقدم رکھو۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ شعیب! صرف اتنی

بات سے فائدہ نہ ہو گا جب تک تم مسح علی الخنین کو نہ مانو گے اور جب تک نماز میں بسم اللہ کے آہستہ پڑھنے کو بلند آواز سے پڑھنے کے مقابلے میں افضل نہ مانو گے اور جب تک تقدیر پر ایمان نہ لاؤ گے اور جب تک ہر نیک و بد کے پیچھے نماز نہ پڑھو گے اور جب تک جہاد کو قیامت تک ضروری اور ہر ظالم و عادل حکومت کے تحت نہ رہو گے۔ شعیب نے دریافت کیا کہ سب نمازیں ان لوگوں کی امامت میں پڑھنی ضروری ہیں فرمایا جمعہ اور عیدین تو ہر ایک کی امامت میں پڑھ لو ان کے علاوہ میں تمہیں اختیار ہے صرف اس کے پیچھے پڑھو جسے تم جانتے ہو کہ اہل سنت سے ہے۔ جب تم خدا کی جناب میں جاؤ اور تم سے دریافت کیا جائے تو کہہ دینا خداوند مجھ سے یہ بات سفیان ثوری نے کہی ہے یہ

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظم کی مجلس درس میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے حدیث روایت کی ہیں مگر امام صاحب کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے جو امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ امام سفیان ثوری نے اپنی جامع کی تصنیف میں زیادہ تر ان ہی سے مدد لی ہے خود علی بن مسہر کا بیان ہے کہ:

امام سفیان میرے پاس عشاء کی نماز کے بعد آتے اور میرے سے امام اعظم کی کتابیں عاریتہ لے گئے۔

امام سفیان کی جامع ایک زمانے میں محدثین کے یہاں بڑی مقبول اور متداول رہی ہے امام بخاری نے جب علم حدیث کی تحصیل شروع کی تو سب سے پہلے جن کتابوں کی طرف توجہ کی وہ سفیان ثوری کی جامع اور عبد اللہ بن المبارک اور وکیع بن الجراح کی تصانیف تھیں۔ امام بخاری نے جامع ثوری کا سماع اپنے وطن ہی میں امام ابو حفص کبیر سے کیا تھا خطیب بغدادی رقمطراز ہیں:

محمد بن اسماعیل البخاری فرماتے ہیں کہ میں امام ابو حفص کبیر کے پاس جامع سفیان کا سماع کر رہا تھا کہ ایک حرف کتاب میں جو میرے یہاں نہ تھا میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے وہی بتایا میں نے ان سے

پھر پوچھا انہوں نے پھر وہی بتایا آخر میں نے تیسری بار مراجعت کی تو ذرا
چپ ہوئے اور دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اسماعیل
کالٹر کا محمد ہے فرمایا اس نے صحیح بتایا ہے یاد رکھو یہ لٹر کا ایک روز مرد
میدان ہو گا۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جامع سفیان اور مؤطا
میں کون سی کتاب زیادہ اچھی ہے فرمایا کہ کتاب مالک ہے۔ لیکن امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ لوگوں نے
اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں جامع سفیان سب سے اچھی ہے۔

اس دور کی اور کتابیں

اس دور میں ان کے علاوہ دوسرے ارباب علم نے میدان علم میں دائر تحقیق دی ہے۔ مؤرخین
نے اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ مختلف علوم و فنون میں اتنا علمی سرمایہ اُمت کے لیے
وراثت میں چھوڑا ہے کہ اُمت ان کے اس احسانِ عظیم سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ حافظ ذہبی
فرماتے ہیں :-

علماء کبار نے سنن کی تدوین، فقہ کی تالیف اور زبان و ادب پر کتابیں لکھی
ہیں۔ ہارون رشید کے زمانے میں اس کی مہمات ہوئی اور بکثرت تصانیف
مدون ہو گئیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ

امام مالک نے حدیث اہل حجاز اقوال صحابہ و فتاویٰ تابعین پر مشتمل مؤطا، ابن
جریر نے مکہ میں امام اوزاعی نے شام میں، امام سفیان ثوری نے کوفہ میں
حماد بن سلمہ نے بصرہ میں کتابیں لکھی ہیں۔

حافظ سیوطی تاریخ الخلفاء میں شہداء کے حوادث میں حافظ ذہبی کی اعلام سے نقل کرتے ہیں
قال المذہبی شرع علماء الاسلام فی هذا العصر فی تدوین الحديث

۱۔ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۱۔ ۲۔ ترمذیین الممالک ص ۴۴۔ ۳۔ رسالہ ابی داؤد ص ۷۔

۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۱۔ ۵۔ الہدی الساری ص ۵۔

والفقه والتفسير فصف ابن جرير بکمة ومالك الموطا بالمدينة
والاوزاعي بالشام وابن ابی عمرو بن حماد بن سلمه وغيرهما بالبصرة
ومعمر باليمن وسفيان الثوري بالكوفة وصنف ابن اسحاق
المغازي وصنف ابو حنيفة الفقه والراي ثم بعد يسير
صنف هيثم والليث وابن لهيعة ثم ابن المبارك والوكيع
وابن وهب وكثير تدوين العلم وتبويب ودونت كتب
العربية واللغة والتاريخ : امام الناس ۔

علماء اسلام نے اس زمانے میں حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی، آداب عربیہ، لغت اور تاریخ کی
تدوین شروع کی ۔
مورخین نے اس اجمال کی کچھ شرح فرمائی ہے ۔

کتاب السنن ابن جریر

یہ کتاب محدثین کے یہاں سنن ابی الولید کے نام سے مشہور ہے ۔ اسکا فی نے اس نام سے
اس کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

نیز سنن کی کتابوں میں سے سنن ابی الولید ہے ۔ لوگ ان کو ابو خالد بھی
کہتے ہیں ان کا نام عبد الملک بن عبد العزیز بن جریر ہے کہا جاتا ہے کہ
اولین مصنف ہیں ان کی وفات ۱۵۸ھ یا ۱۵۹ھ میں ہوئی ۔

حافظ ذہبی نے ان کا چہرہ لکھتے ہوئے تذکرۃ الحفاظ میں بتایا ہے کہ صاحب التصانیف ،
احد الاعلام اور علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس ایک کتاب تھی خالد بن نزار کہتے ہیں کہ ۱۵۸ھ
میں میں ابن جریر کی کتابیں لے کر ان کی خدمت میں بالمشافہ قرأت کے لیے حاضر ہوا مگر افسوس
کہ ان کی وفات ہو چکی تھی یہ ابن النذیم نے ان کی کتاب السنن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے
لہذا من الكتب كتاب السنن ويحتوي مثل ما يحتوي عليه كتب السنن

۱۔ تاریخ الخلفاء ص ۲۶۳ ۔ ۲۔ الرسالة المستطرفة ص ۳۰ ۔

۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰ ۔

ان کی کتابوں میں کتاب السنن ہے اس کے مضامین بھی سنن جیسے ہیں۔

امام حسن بن زیاد کو بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ کبیرہ میں خود امام حسن کی زبانی نقل کیا ہے۔

میں نے ابن جریر سے بارہ ہزار حدیثیں وہ لکھی ہیں جن کی فقہاء کو ضرورت ہوتی ہے۔

ابن جریر کے اس بیان سے جو حافظ ذہبی نے روح بن عبادہ سے نقل کیا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے امام اعظم سے کس قدر استفادہ کیا ہے حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ :
روح بن عبادہ کہتے ہیں کہ جب ان کو امام اعظم کی وفات کی خبر ملی تو ان کے تعزیتی کلمات یہ تھے واللہ لقد ذهب علم کثیر بخدا و دنیا سے
بہت بڑا علم کوچ کر گیا۔

کتاب الفرائض لابن مقسم ۸۶

مغیرہ بن مقسم کوفہ کے نامور محدثین سے ہیں۔ امام شعبہ جیسے رئیس المحدثین کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ حماد سے زیادہ حافظ ہیں۔ امام احمد ان کو ذکی، حافظ اور صاحب سنت فرماتے تھے۔
رواۃ صحاح ستہ میں سے مشہور امام حدیث و فقہ ہیں۔ ابو بکر بن عیاش کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ افقہ کسی کو نہیں دیکھا اس لیے ان ہی کی خدمت میں رہ پڑا۔ خود فرماتے تھے کہ جو چیز میرے کان نے سن لی کبھی بھولا نہیں ہوں۔ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام ذہبی نے ان کو امام اعظم کا شاگرد بتایا ہے۔ حمیر بن عبد الحمید کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا مقسم مسائل میں گفتگو کرتے تھے اور جب کسی مسئلہ پر ان سے کوئی اختلاف کرتا تو فرمادیتے کہ امام ابو حنیفہ یہی فرماتے ہیں۔

الذکیر: علم ابی حنیفہ اکتنی جدالت قدر ہے کہ اختلاف کے وقت ان کو بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ ابن النذیم نے لکھا ہے کہ

لے من المکتب کتاب الفرائض لے

کتاب السنن لزائده بن قدامہ

زائده بن قدامہ کوفہ کے مشہور محدث ہیں۔ امام ذہبی نے ان کو امام شعبہ کا ہمسرہ بتایا ہے۔ ان کی علمی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ترجمہ میں امام احمد کا یہ بیان پڑھیے۔

ابو اسحاق کی حدیث کے سوا جب تم زائده اور زہیر سے کوئی حدیث سن لو تو اسے دوسرے سے سننے کی فکر ہی نہ کرو۔

علامہ ابن النذیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن، کتاب القراءات، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا پتہ دیا ہے۔

حافظ ذہبی نے زائده بن قدامہ کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبد القادر نے الجواهر المضية میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔

کتاب السنن یحییٰ بن زکریا

ان کو بھی حافظ ذہبی نے کان اماما صاحب التصانیف لکھا ہے اور ابن النذیم نے ان کی لیفات میں کتاب السنن کا تذکرہ کیا ہے۔

ان کی کنیت ابو سعید اور نام یحییٰ بن زکریا بن ابی زائده ہمدانی ہے۔ حافظ حدیث، ثقہ، فقیہ، مذہب، متورع اور ان اکابر اہل علم و فضل میں سے تھے جنہوں نے فقر و حدیث پر نمایاں کام کیا ہے۔ فظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام ابو الحسن علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ مسیان ثوری کے بعد کوفہ میں آپ سے زیادہ ثبت کوئی نہ تھا۔ خطیب بغدادی رقمطراز ہیں کہ آپ پورے سال تک روزانہ ایک قرآن حکیم ختم کیا۔ بغداد میں ایک مدت دراز تک درس حدیث دیتے رہے۔ آپ کے تلامذہ میں امام احمد، ابن معین، قتیبہ اور ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں۔ امام ابن المدینی کہتے ہیں کہ علم یحییٰ پر ان کے زمانے میں ختم تھا۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ کوفہ میں ابن زکریا سے

۵ فرست لابن النذیم ص ۳۳۰۔ ۶ تذکرۃ الحفاظ۔ ۳ فرست ص ۳۳۰۔

۷ فرست ص ۳۳۰۔ ۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶۶۶۔

زیادہ کسی کی مخالفت مجھ پر بجا رہی نہیں ہے۔ یحییٰ بن زکریا امام اعظم کے صرف ان تلامذہ میں سے نہیں جنہوں نے امام اعظم کی نگرانی میں تدوین کتب کا کام کیا ہے بلکہ ان دس اشخاص میں سے ہیں جن کا شمار تلامذہ متقدمین میں ہوتا تھا۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر طحاوی نے بسند متصل اسد بن الفرات سے روایت کی ہے۔

كان اصحاب ابی حنیفۃ الذین دونوا الکتب اربعین رجلاً کان فی النشرة المتقدمین ابو یوسف و نر فر و داؤد الطائی و اسد بن عمر و یوسف بن خالد السمئی و یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ۔

امام اعظم کے وہ اصحاب جنہوں نے تدوین کتب کا کام کیا وہ چالیس تھے اور ان میں جو درجہ قیادت رکھتے تھے وہ دس تھے۔

بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یحییٰ بن زکریا ہی اس مجلس تدوین میں پورے تیس سال تک کتابت کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں چنانچہ اسد بن فرات ہی فرماتے ہیں:-
وهو الذی کان یکتبها لیسلم ثلاثین سنة ۱۰

کتاب السنن و کیح بن الجراح ۹۷ھ

ابن الذیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے ۱۱۔ الکتانی نے بھی اس سنن کے مصنف کا وکیح کے نام سے تعارف کرایا ہے ۱۲۔ حافظ ذہبی نے ان کی تصانیف کے بارے میں امام احمد کا یہ اعتباری ارشاد نقل کیا ہے کہ:
علیکم بمصنفات وکیح ۱۳

اور ان کا چہرہ امام ذہبی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ الامام الحافظ، الثبت، محدث العراق، احد الائمة الاعلام۔ وکیح بن الجراح اصحاب صحاح ستہ کے شیوخ و رواۃ میں ہیں۔ فقہ و حدیث کے امام، عابد، زاہد، اکابر اتباع تابعین، امام شافعی و امام احمد کے شیخ۔ ابوسفیان کنیت تھی۔ امام اعظم سے فقہ میں درجہ تخصیص حاصل کیا اور حدیث میں امام اعظم، امام

۱۰ الجواهر المضیة ج ۲ ص ۲۱۱۔ ۱۱ الفہرست ص ۳۳۰۔ ۱۲ الرسالة المستنیرہ ص ۳۲

۱۳ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۶۔

ابو یوسف، امام زفر، ابن جریج، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اوزاعی، اعمش وغیرہ ان کے اساتذہ ہیں اور عبداللہ بن المبارک، امام احمد، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، اسحاق بن راہویہ، احمد بن منیع اور یحییٰ بن اکثم جیسے کبار محدثین آپ کے تلامذہ ہیں۔ یحییٰ بن اکثم فرماتے ہیں کہ میں سفرو حضر میں آپ کی رفاقت میں رہا آپ ہمیشہ روزہ رکھتے ہر رات قرآن حکیم ختم کرتے تھے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ میں نے ان سے افضل کوئی نہیں دیکھا یہ امام اعظم کی خدمت میں کافی عرصہ رہے ہیں اور علم کا بہت بڑا حصہ ان سے حاصل کیا ہے امام اعظم کی مجلس تدریس فقہ کے رکن بھی ہیں۔ الصیمری نے لکھا ہے کہ فتویٰ میں امام ابو حنیفہ ہی کی رائے کو اپناتے تھے بلکہ عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیتے اور امام اعظم سے بہت زیادہ حدیثوں کا سماع کیا ہے۔

کتاب السنن سعید بن ابی عروبہؒ

امام ذہبی نے ان کو بصرہ میں اولین مصنف بنایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

ادل من صنف الالبواب بالبصرة یلع

علامہ ابن الندیم نے ان ہی البواب کو ان کی تصانیف میں کتاب السنن لکھا ہے حافظ ابن عبد البر نے بسند متصل ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ کے یہاں امام اعظم کا کیا علمی مقام تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

سعید بن ابی عروبہ سے ایک بار ایک مسئلہ دریافت کیا گیا۔ مسئلہ کا تعلق طلاق سے تھا جواب دیا اور فرمایا بکذا قال ابو حنیفہ امام ابو حنیفہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بعد ازیں ارشاد فرمایا کہ امام ابو حنیفہ تمام عراق کے عالم ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سعید امام اعظم کے علوم سے کیسے استفادہ کرتے تھے اور یہ کہ امام اعظم کی شخصیت صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی ہے۔ حافظ ابن عبد البر بھی نے بسند متصل سعید بن ابی عروبہ کی زبانی جو دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ امام اعظم کے درس میں شریک ہو کر ان

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۷۔ ۲۔ الجواہر المصنیعہ ج ۲ ص ۲۰۸۔ ۳۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۳۹۔
 ۴۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۷۔ ۵۔ فہرست ص ۳۳۱۔ ۶۔ الانتقاء ص ۱۴۰۔

کے سامنے زانوئے ادب نہ کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

میں کو فرمایا تو امام اعظم کے درس میں حاضری دیتا تھا ایک روز امام اعظم نے حضرت عثمان کے ذکر پر رحمہ اللہ فرمایا۔ میں چونکہ گیا عرض کیا کہ آپ پر بھی اللہ رحم کرے میں نے تو اس بستی میں آپ کے سوا حضرت عثمان کے لیے دُعائے رحمت کرنے والا نہیں دیکھا یہیں سے مجھے امام اعظم کا مقام فضل معلوم ہو گیا۔^۱

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ سعید بن ابی عروبہ نے امام اعظم سے کس قدر علمی استفادہ کیا ہے بحافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ کو بھی ان کا رفیق تصنیف بنا کر پیش کیا ہے :

هو اقل من صنف مع سعيد۔^۲

ابن النذیم نے بھی حماد کے موافقات میں کتاب السنن کا نام لیا ہے غالباً یہ ایک ہی کتاب ہے چونکہ کام دونوں نے ایک جگہ کیا ہے اس لیے ایک ہی کتاب دونوں کی طرف منسوب ہے۔

کتاب التفسیر، ہیثم بن بشیرؒ

امام بخاری نے ان کو بھی امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

رادی عنه عباد بن العوام و ابن المبارک و ہیثم

ان کی تصانیف میں علامہ ابن النذیم نے مندرجہ ذیل تین کتابیں بتائی ہیں۔ کتاب السنن، کتاب التفسیر اور کتاب القراءت۔^۳

امام حماد بن زید نے فرمایا کہ میں نے محدثین میں ان سے زیادہ بلند مرتبہ نہیں دیکھا۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ ہیثم امام اعظم کے تلامذہ حدیث میں ہیں۔ عبد الرحمن بن مہدی فرماتے تھے کہ ہیثم سفیان ثوری سے بھی زیادہ حافظ تھے۔ ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے جلیل القدر محدثین ہیں۔

کتاب الزہد عبد اللہ بن المبارک

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ میں ان کو صاحب التصانیف النافعہ لکھا ہے۔ علامہ ابن النذیم نے

۱۔ الانتصار ص ۱۴۰۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۱۔ ۳۔ الفہرست ص ۳۲۱۔

ان کی تصانیف میں متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کتاب النہد، کتاب السنن، کتاب التفسیر، کتاب التاریخ
کتاب البر والصلة

مشہور محدث امام یحییٰ بن آدم کہنے ہیں کہ جب مجھے دقیق اور مشکل مسائل سے سابقہ پڑتا ہے تو تلاش و
تجو میں اگر ابن المبارک کی کتابوں میں یہ نہ ملیں تو مجھ پر مالوسی چھا جاتی ہے۔ یحییٰ بن معین نے
ان کی کتابوں میں مندرج احادیث کی تعداد بھی بتائی ہے فرماتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں مندرج
بیٹوں کی تعداد بیس ہزار تھی

یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہو گا کہ ابن الندیم نے عبد اللہ بن المبارک کا ذکر کرتے ہوئے ان کے وہ
نثار بھی درج کیے جو انہوں نے امام اعظم کی مدح میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

لقد ران البلاد من عليها	امام المسلمین ابا حنیفہ
بأثار و فقه في حديث	کامات الزبیر علی الصنفہ
فما في المشرقيين له نظير	ولا بالمغربین ولا بکوفہ
رایت العاصيين له سفاها	خلاف الحق مع حج ضعیفہ

حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں کہ ایک بار عبد اللہ بن المبارک کے کچھ تلامذہ ایک مجلس میں
جہتے باہم گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آؤ ابن المبارک کی خوبیاں شمار کریں۔ سب کا فیصلہ یہ تھا
عبد اللہ بن المبارک، فقہ، ادب، نحو، لغت، زہد، شعر، فصاحت، پارسائی، انصاف، شب بیداری،
لامت رات، تفصیل کلام اور ساتھیوں سے قلت اختلاف جیسی ساری خوبیاں جمع تھیں۔
بلیب بغدادی نے عباس بن معصب کا بھی ایسا ہی تاثر لکھا ہے۔

باوجود ان مناقب و مآثر کے عبد اللہ بن المبارک امام اعظم کے اصحاب اور تلامذہ میں سے
نہ۔ فرماتے ہیں اگر اللہ سبحانہ میری ابو حنیفہ اور سفیان ثوری سے مدونہ فرماتے تو میں بھی عام لوگوں
طرح ہوتا اور ان کا اقرار ہے۔

تعلمت الفقه الذي عندي من ابي حنیفہ

امام اعظم کے تلمذ پر فخر کرتے ان کی مدح فرماتے تھے

۱۔ الفہرست ص ۳۳۱۔ ۲۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۶۴۔ ۳۔ الجواب المضية ج ۱ ص ۲۸۱

۴۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۳۶۵۔

سیرت و منغازی

ان کے علاوہ بھی دوسرے محدثین نے حدیث کے موضوع پر کتابیں مدون کی ہیں اور ساتھ ہی دوسرے موضوعات پر بھی علمی سرمایہ منصفہ شہود پر آیا مثلاً سیرت و تاریخ، فقہ و شرائع، ادب و شعر پر اس دور میں کتابیں لکھی ہیں۔
ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن لکھتے ہیں کہ:

سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے عروہ بن الزبیر نے قلم اٹھایا۔ بعد ازیں ابان بن عثمان شامی نے کام کیا۔ ابان کی علمی تحقیقات کو ان کے شاگرد عبد الرحمن بن المغیرہ نے سیرۃ الرسول کے نام سے یکجا کیا اور محمد بن شہاب الزہری، موسیٰ بن عقبہ نے ان کے بعد منغازی لکھے ہیں۔ بالآخر محمد بن اسحاق نے ان سب کو سیرۃ الرسول کا نام رکھ کر یکجا کیا ہے۔

الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور ابن الندیم نے الفہرست میں ان کا جستہ جستہ مذکور کیا ہے

فقہ و شرائع

اس موضوع کی تفصیلات ہم یہاں نہیں پیش کر سکتے۔ اس پر سیر حاصل مباحث کے لیے آپ کو ہماری دوسری کتاب ”امام اعظم اور علم الشرائع“ کا انتظار کرنا چاہیے لیکن ہم یہاں تاریخی ربط قائم رکھنے کے لیے چند اشارات کریں گے۔

علمی حیثیت سے کتاب و سنت اگر دلائل ہیں تو فقہ ان دلائل سے پیدا شدہ نتائج کا نام ہے۔ یا جیسا کہ الخطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے کہ قرآن و سنت اگر اساس اور بنیاد ہیں تو فقہ ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے یا جیسا حکیم الامت نے بتایا ہے کہ قرآن و سنت اگر سیپی ہیں تو فقہ کی حیثیت اس سیپی کے اندر موقی کی ہے۔

زمانہ نبوت میں خود ذات نبوت فقہ و فتاویٰ کا مرکز تھی آپ کے بعد اکابر صحابہ جو شریعت کے رازواں اور احکام اسلامی کے محرم تھے فقہ و فتاویٰ میں آپ کے جانشین تھے حافظ ابن عبد البر

اور حافظ ابن القیم نے امام مزنی سے نقل کیا ہے۔

فقہاء زمانہ نبوت سے آج تک فقہ میں اور تمام احکام میں قیاس سے کام لیتے
سب سے پہلے

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں، حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن حزم
نے احکام الاحکام میں فقہ کی تاریخ پر جامع تبصرہ کیا ہے۔
مشہور جبرمن مؤرخ بروکلیمان نے اقرار کیا ہے:

اسلام کا دامن جزیرہ عرب سے باہر پھیلا۔ تو علمائے زمانہ نے زندگی کے اس مرحلے پر
ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے اجتہاد شروع کیا۔ اس طرح اسلام میں فقہ کا
ظہور ہوا۔ یعنی اس عقل تصرف و عمل نے جو معاشرے میں مختلف فیصلے معلوم
کیے ان کا نام فقہ و تشریع ہو گیا۔
گو لڈ زیہر کی رائے ہے۔

فقہ واجتہاد پر اسلام کے شروع ہی سے کام شروع ہو گیا تھا لیکن اس دور کی
علمی حیثیت کچھ نمایاں نہ تھی۔

ان تصریحات سے مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ فقہ و شرائع کا تاریخی رشتہ ذات نبوت اور صحابہ سے
وابستہ ہے بلکہ جیسا کہ ڈاکٹر فیلیپ حتی نے کہا ہے کہ فقہ اسلامی کا ستویں ضابطہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم نے حضرت معاذ کو یہ کہہ کر بتایا تھا کہ

اے معاذ! پیش پا افتادہ معاملات کو حل کیسے کر دگے؟ بولے کہ قرآن سے،
حضور نے دریافت فرمایا اگر قرآن میں تمہیں معاملہ کا حل نہ ملے تو پھر کیا کر دگے؟
بولے کہ حضور آپ کی سنت سے، حضور نے پھر پوچھا کہ اگر سنت میں بھی
نہ ملے تو پھر کیا کر دگے؟ بولے کہ اجتہاد کروں گا۔ حضور نے یہ سن کر فرمایا
الحمد للہ الذی وفق رسولہ رسول اللہ لما یرضاه۔

یہ درست ہے کہ جیسے سارے صحابہ حفاظ حدیث نہ تھے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ میں سے

حدیث نبوت کو نقل کرنے والے صحابہ مرد و زن کی تعداد کے بارے میں امام حاکم نے المدخل میں لکھا ہے کہ:
 قد روى عنه صلى الله عليه وسلم من الصحابة اربعة الاف
 رجل وامرأة يله

یعنی صرف چار ہزار مرد و زن صحابہ نے احادیث روایت کی ہیں ایسے ہی سارے صحابہ فقہاء بھی تھے
 بلکہ ان کی تعداد جیسا کہ حافظ ابن القیم نے اعلام میں بتائی ہے۔

والذى حفظت عنهم الفتوى من اصحاب رسول الله صلى الله عليه
 وسلم مائة ونيّف وثلاثون نفساً ما بين رجل وامرأة يله

یعنی صرف ایک سو تیس مرد و زن سے کچھ زائد ہے اور یہ تعداد بھی ایک جگہ نہیں بلکہ حضرت عمر
 کے زمانے میں حضرت عمر کی کوششوں کے صدقے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی بنا پر
 زمانہ صحابہ ہی میں مختلف شہروں میں فقہ کے ایک سے زیادہ علمی ادارے قائم ہو گئے تھے۔ ان
 شہروں میں مشہور ترین شہر یہ ہیں۔ مدینہ، کوفہ، دمشق، مکہ — مدینہ کے فقہاء کا حافظ ابن خرم
 نے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

مدینہ میں صحابہ کے بعد فقہاء میں سعید بن المسیب ہیں۔ ان کا ازدواجی
 تعلق ابو ہریرہ کی صاحبزادی سے ہوا۔ انہوں نے ابو ہریرہ اور سعد بن
 ابی وقاص سے علمی استفادہ کیا۔ دوسرے عروہ بن الزبیر بن العوام تیسرے
 القاسم بن محمد۔ یہ دونوں حضرت عائشہ کے تلامذہ خاص ہیں سے ہیں چوتھے
 عبد اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود۔ یہ ابن مسعود کے خاص شاگرد ہیں
 پانچویں خارجہ بن زید۔ انہوں نے اپنے والد زید بن ثابت سے علمی استفادہ
 کیا۔ چھٹے ابو بکر بن عبد الرحمن۔ ساتویں سلیمان بن یسار۔ یہ حضرت عائشہ
 اور حضرت ام سلمہ کے خاص شاگرد ہیں۔ یہی لوگ فقہاء سبعہ کے نام سے
 مدینہ میں مشہور ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے فقہ کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے مدینہ کی فقہی اکادمی کا اس
 طرح تعارف کرایا ہے۔

علم الفقہ اور فتاویٰ کا دار و مدار خلفاء راشدین کے زمانے میں حضرت فاروق اعظم کی ذات گرامی تھی۔ پھر فقہاء صحابہ حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر وغیرہ اس دائرہ علمیہ کے مرکز تھے۔ صحابہ کے بعد اس عمل جلیل کی ذمہ داری کا بار فقہاء تبعہ کے کاندھوں پر تھا۔ ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس دائرہ علمیہ میں کام کیا جیسے امام زہری، یحییٰ بن سعید الانصاری، زید بن اسلم وغیرہ۔ ان سب کی علمی وراثت امام مالک کو ملی انہوں نے ان کی حدیثوں اور فتاویٰ کو سینوں سے نکال کر صحیفوں میں جمع و مدون کر دیا۔

مدینہ کی طرح کوفہ میں بھی فقہ کا دائرہ علمیہ زمانہ صحابہ ہی سے کام کر رہا تھا۔ عہد مرتضیٰ سے لے کر بغداد کی تعمیر تک وسعت اور کثرت فقہ و حدیث میں تمام بلاد اسلامیہ میں کوفہ ممتاز تھا۔ علامہ نووی نے اسے دار الفضل والفضلار، مجد الدین فیروز آبادی نے قبۃ الاسلام لکھا ہے حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

اہل کوفہ نے حضرت علی کے آنے سے پہلے سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر اور ابو موسیٰ اشعری سے علم حاصل کیا تھا۔ نیز کوفہ والوں نے قرآن کا عبداللہ بن مسعود سے استفادہ کیا ہے۔ یہ لوگ مدینہ جا کر حضرت عائشہ اور حضرت عمر سے بھی علم حاصل کرتے تھے۔

کوفہ کا یہ دائرہ علمیہ صحابہ کے بعد جن حضرات پر مشتمل تھا حافظ ابن القیم اور حافظ ابن حزم نے ان کے نام لکھے ہیں:

علقمہ بن قیس النخعی، اسود بن یزید النخعی، عمرو بن شراحیل الہمدانی، مروق بن الاجدع الہمدانی، عبیدۃ السلمانی، شریح بن الحارث القاضی، سلیمان بن ربیعہ الباہلی، زید بن صوحان، سوید بن غفلہ، الحارث بن قیس الجعفی، عبدالرحمن بن یزید النخعی، عبداللہ بن عقبہ بن مسعود القاضی، خثیم بن عبدالرحمن سلمہ بن صہیب، مالک بن عامر، عبداللہ بن سجرہ زہری، جیش، خلاص

بن عمرو، عمرو بن میمون الاودی، ہمام بن الحارث، الحارث بن سويد، یزید بن معاویہ النخعی، الرزیح بن خثیم، عتبہ بن فرقہ، صلتہ بن زفر، شریک بن خثیم، ابو وائل شقیق بن سلمہ، عبید بن نضدہ۔

یہ نام مکھننے کے بعد حافظ ابن خزم اور حافظ ابن القیم نے ان سب کے بارے میں لکھا ہے کہ
هو لاد اصحاب علی وابن مسعود

اور ان میں اکثر کے بارے میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ:
اکثرهم اخذ عن عمرو وعائشہ وعلی

ان کے بعد کوفہ ہی کے فقہاء میں ابراہیم نخعی، امام شعبی، سعید بن جبیر، القاسم بن عبد الرحمن، ابو بکر بن ابی موسیٰ، محارب بن دثار، حکم بن عتبہ اور جبکہ بن سجم کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ کوفہ میں فقہ و افتاء میں ان کی جانشینی کا شرف

حماد بن ابی سلیمان، سلیمان بن المعتمر، سلیمان بن الاعمش، مسعر بن کدام کو حاصل ہے اور پھر حماد و سلیمان کی وراثت علمی اس شہر میں ابن ابی لیلیٰ، عبد اللہ بن شبرمہ، سعید بن اشوع، قاضی شریک، القاسم بن معن، سفیان ثوری اور ابو حنیفہ اور الحسن بن صالح کو ملی ہے اور امام ابو حنیفہ کے بعد ان کے اور سفیان ثوری کے جانشین یہ ہیں:

حفص بن غیاث، وکیع بن الجراح، قاضی ابو یوسف، زفر بن الہذیل، حماد بن ابی حنیفہ، الحسن بن زیاد، محمد بن الحسن عافیہ، اسد بن عمرو، نوح بن دراج اور امام ثوری کے ساتھی الشیخ معانی بن عمران، سیحی بن آدم لے

یہ گویا کوفہ میں علماء کوفہ کا وہ فقہی نسب نامہ ہے جو حافظ ابن خزم اور حافظ ابن القیم نے درج کیا ہے۔ شاید اسی نسب جلالہ قدر کی وجہ سے امام اعظم نے برسرِ دربار عباسی حکومت کے سربراہ ابو جعفر منصور کے اس پوچھنے پر کہ اے ابو حنیفہ تم نے کن لوگوں سے علم حاصل کیا ہے؟ امام اعظم نے سربراہ مملکت کو جواب دیا تھا کہ میرا علمی نسب نامہ یہ ہے کہ بحوالہ حماد و ابراہیم میں فاروق اعظم، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس کے علمی چشموں سے سیراب ہوا ہوں۔ امام اعظم کا یہ جواب سن کر ابو جعفر نے کیا کہا۔ یہی سنا نا چاہتا ہوں۔ بولا واہ

تم نے تو ابو خنیفہ اپنا علمی رشتہ الطیبی بنایا اور المبارکین صلوات اللہ علیہم اجمعین سے مضبوط
قام کیا ہوا ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے دوسرے شہروں کے مدارس فقہ کا بھی
تذکرہ کیا ہے لیکن ہم نے مدینہ اور کوفہ کو خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان دونوں شہروں
کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں بسند متصل امام
ابن وہب کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا آپ نے
اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کی زبان سے نکل گیا کہ شام والے تو آپ سے اس مسئلہ میں
اختلاف کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ

متی كان هذا الثامن بالثام؟ انما هذا الثامن وقف على اهل
المدينة والكوفة

یہ شان شام والوں کی کب سے ہوتی؟ یہ شان تو صرف مدینہ اور کوفہ
والوں کی ہے۔

ان دونوں شہروں کے فقہاء سب سے مدینہ اور فقہاء کوفہ اصحاب ابن مسعود کے دور کا کوئی
قلمی سرمایہ ہماری معلومات میں نہیں ہے اور بروکھمان کی یہ بات درست ہے :-
ہم اسے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جس کی مدد سے ہم اس دور

میں فقہ کی کتابی خدمت کا پتہ لگنا سکیں۔
لیکن موصوف نے ابن سعد کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ :-
فقہاء سب سے عروہ نے فقہ و تشریع کے موضوع پر قلمی کام کیا ہے
عروہ کے صاحبزادے ہشام کا بیان ہے کہ :-

میرے والد کی حرہ والے دن فقہ کی کتابیں نذر آتش ہو گئیں۔ ہشام
افسوس سے کہتے ہیں کہ اگر میرے پاس یہ کتابیں ہوتیں تو مجھے اپنے
مال اور اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہوتیں۔

۱۔ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۲۲۲۔ ۲۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۸
۳۔ ۴۔ تاریخ الادب العربی ج ۲ ص ۲۳۲۔ ۵۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۹، جامع بیان العلم ج ۱ ص ۵۵
واضح رہے کہ ہم نے کتاب میں جامع کی روایت لی ہے۔ یہ زیادہ واضح اور صاف ہے۔

علامہ ابن النذیم نے عبد الرحمن بن ابی الزنادکؒ کے بارے میں پتہ دیا ہے کہ انہوں نے۔
 راسی الفقہاء السبعہ کے نام سے کتاب لکھی ہے لیکن یہ دو تصنیف ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ
 اور حافظ عسقلانی نے تہذیب میں اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ یہ کتاب ہج
 ان پر امام مالک کی گرفت کا باعث بنی ہے لیکن عبد الرحمن کے اس کارنامے کی حیثیت اس سے
 زیادہ کچھ مختلف نہیں ہے جو ابو بکر محمد بن موسیٰ نے عبد اللہ بن عباس کے فتاویٰ کتابی صورت میں
 جمع کر کے انجام دی ہے یہ اس دور کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ بعد کا ہے۔

فقہ و شرائع میں امام اعظمؒ کی تصانیف

دو زبانیں ہیں فقہ و شرائع پر جیسا کہ آپ پہلے سن چکے ہیں سب سے پہلے کام امام اعظمؒ نے کیا ہے
 ڈاکٹر فلیپ حتی نے علم حدیث میں امام اعظمؒ کے بارے میں یہ بتانے کے بعد کہ
 کان من ابرز الذین تخرجوا علی الشیعی الامام ابو حنیفۃ المشہور۔
 امام شعبی کے تلامذہ میں سے مشہور امام ابو حنیفہ ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں تک فقہ و شرائع کی تاریخ کا تعلق ہے اس کی اساس و بنیاد قائم کرنے کا
 سہرا امام اعظمؒ ابو حنیفہ کے سر ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

الامام ابو حنیفۃ المتوفی ۱۵۰ھ الذی وضع الاساس لاول مدارس
 الشرع الاربع فی الاسلام۔

ابو حنیفہ ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے فقہ و شریعت کی اسلام میں اولین
 اساس رکھی ہے بلکہ

فقہ کے موضوع پر ابو حنیفہ کے نام سے اگرچہ کوئی تالیف نہیں ہے اور اس سے کچھ کو یہ غلط فہمی
 ہو گئی ہے کہ فی الواقع اس موضوع پر امام اعظمؒ کا کوئی سرمایہ علمی نہیں ہے لیکن دراصل امام اعظمؒ کے
 مذاق تالیف پر غور نہ کرنے کی وجہ سے دوستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ تالیف میں
 امام اعظمؒ کا مذاق کیا تھا تو وہ یہ کہنے کی جرات نہ کرتے۔ ان کا طریقہ املائی تھا۔ زبانی بولتے تلامذہ لکھتے۔
 امام محمد کے نام سے جو کتابیں ہیں ان کی اصل امام اعظمؒ ہی کا سرمایہ علمی ہے۔

فقہ کے موضوع پر امام اعظم کی قدیم ترین کتاب کتاب السیر ہے۔ آپ نے اسے اپنے تلامذہ الحسن بن زیاد، محمد بن الحسن، ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو، حفص بن غیاث، عافیہ بن یزید وغیرہ کو املا کرائی۔ امام اعظم کی یہ کتاب جب امام عبدالرحمن الاوزاعی کے مطالعہ میں آئی تو امام اوزاعی نے اس کا جواب لکھا۔ قاضی ابو یوسف نے امام اوزاعی کی کتاب کا رد لکھا جو الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے مشہور ہے اور طبع ہو چکی ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں قاضی ابو یوسف کی کتاب الرد علی سیر الاوزاعی کو روایت کیا ہے۔

امام اعظم نے فقہ میں اختلاف اصحابہ کے نام سے بھی کتاب تالیف کی ہے۔ امام اعظم کی اس تالیف کے بعد ان کے شاگردوں نے اس میدان میں جو علمی خدمت انجام دی ہے وہ سب کے سامنے عیاں ہے۔ ان میں قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج، کتاب الامالی، الرد علی سیر الاوزاعی مشہور ہیں۔ امام محمد کی تصانیف میں السیر الصغیر، السیر الکبیر، الجامع الکبیر، کتاب الرد علی اہل المدینۃ، الجامع الصغیر، زیادات، مبسوط مشہور ہیں۔

امام حسن بن زیاد کے بارے میں علامہ ابن الندیم نے طحاوی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک سے زیادہ کتابیں تالیف کی ہیں مثلاً کتاب آداب القاضی، کتاب الخصال، کتاب معانی الایمان، کتاب النفقات، کتاب الفرائض، کتاب الخراج۔ ابن ابی لیلیٰ کے بارے میں ابن الندیم نے انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے کتاب الفرائض لکھی ہے نیز محمد بن عبدالرحمن جو ابن ابی ذئب کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی فقہی تالیفات میں بھی کتاب السنن کا ذکر آیا ہے۔

الفرض اس دور میں تصنیف و تالیف کے کام میں کافی ترقی ہوئی اور بہت سے علماء نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں مدون کیں۔

دو صحابہؓ سے ۲۰۰ تک حدیث

یہ تو آپ پہلے سن آئے ہیں کہ علم حدیث کے نام سے جو علمی ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ حسب تصریح امام حاکم۔

قد روى عنه صلى الله عليه وسلم من الصحابة اربعة الاف
رجل وامرؤة يله

یعنی صرف چار ہزار مرد و وزن صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ جن تابعین نے صحابہ کرام سے یہ علم حاصل کیا اور بعد کی تسکون کی طرف منتقل کیا ہے ان کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

مدینہ	۴۸۴	کوفہ	۴۱۳
مکہ	۱۳۱	بصرہ	۱۶۴

شاید کوفہ اور مدینہ میں ائمہ تابعین کی اس کثرت تعداد پر آپ حیران ہوں لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں ان دو شہروں کو ہی فقہ و حدیث میں مرکزیت حاصل تھی۔ آپ پیچھے امام مالک کا بیان پڑھ چکے ہیں کہ علم کی دنیا میں صرف ان ہی دو شہروں کو یہ حق حاصل ہے کہ علمی مباحث میں ان کا ذکر کیا جائے۔ علامہ یاقوت حموی نے سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ :

خذوا القرأة عن اهل المدينة وخذوا الحلال والحرام عن
اهل الكوفة يله

قرأت مدینہ والوں سے اور حلال و حرام کی باتیں کوفہ والوں سے لو۔
یہی دو شہر ہیں جہاں کے اتفاق کو کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے جیسے اہل مدینہ کے اتفاق مسان کا تذکرہ امام مالک مؤطا میں اس طرح کرتے ہیں السنة التي لا اختلاف فيها عندنا ایسے دو اہل کوفہ کے اجماعی مسائل کو بتانے کے لیے ایسے مواقع پر امام محمد یہ فرماتے ہیں هو قول ابي حنيفة والعامّة من فقهاءنا۔ اور اگر مدینہ والوں کو کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو امام مالک فرماتے ہیں هذا احسن ما سمعت۔ اور امام محمد اہل کوفہ کے اختلاف کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرماتے ہیں هو احب الينا۔ الغرض مدینہ اور کوفہ میں ائمہ تابعین کی یہ کثرت کوئی جہ والی بات نہیں ہے۔ ان ائمہ تابعین کے حالات کتابوں میں پڑھیں آپ کو پتہ لگ جائے گا ان لوگوں نے صحابہ کے زمانے کا بہت بڑا حصہ پایا ہے ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنہوں نے صوفیوں کے گھروں اور صحابیات کی گود میں پرورش پائی ہے۔

مدینہ میں تابعین میں حدیث و آثار کا سرچشمہ اگر سعید بن المسیب، عروہ بن الزہر اور قاسم بن محمد ہیں تو کوفہ میں مسروق، علقمہ اور اسود بن یزید نخعی ہیں۔

سعید کو حضرت ابو ہریرہ جیسے راوی کبیر کے داماد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ عروہ حضرت عائشہ کے بھانجے اور قاسم ان کے بھتیجے ہیں اور ان دونوں کی حضرت عائشہ نے ہی پرورش کی ہے کوفہ کے مسروق بن الاعدع حضرت عائشہ کے متبنی اور سہ پاک ہیں۔ علقمہ کی حضرت عبداللہ بن مسعود نے علمی تربیت فرمائی ہے اور ان کو براہ راست فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، ابوالدرداء اور عثمان غنی سے استفادے کا موقع ملا ہے۔ اسود بھی علقمہ کے بھائی اور ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں۔ یہ ایک فوہ ہے، ورنہ سارا گلستان ہی سدا بہار ہے۔ ان تابعین کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے صحابہ سے مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ کے ارشادات، خلفاء راشدین کے عدالتی فیصلوں اور فتاویٰ کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ احادیث کا اکثر و بیشتر ذخیرہ ان ہی تابعین کی وساطت سے ان کے تلامذہ کے ذریعے امت کو وراثت میں ملا ہے یہ ان ہی کے تلامذہ ہیں جنہوں نے اپنے ان اساتذہ کے علوم کو سینوں سے صحیفوں میں منتقل کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ جن کی تفصیل ہم اوپر سے چکے ہیں ذرا ایک نظر اس نقشہ پر بھی ڈال لیجئے تاکہ اس دور کی تالیفات کا پورا اندازہ ہو سکے۔ یہ نقشہ ہم نے اکتافی کی کتاب الرسائل المستطرفہ سے تیار کیا ہے ہم یہاں صرف مصنفین کے اسماء گرامی پیش کرتے ہیں۔

۱۵۰ھ	امام اعظم ابو حنیفہ	کتاب الآثار
۱۷۹ھ	امام مالک بن انس	موطأ
۱۵۱ھ	عبدالملک بن عبدالعزیز	کتاب السنن
۱۹۶ھ	دکین بن الجراح	کتاب السنن
۱۶۶ھ	حماد بن سلمہ	کتاب السنن
۱۶۱ھ	سفیان الثوری	جامع
۱۹۸ھ	سفیان بن عیینہ	جامع
۱۵۳ھ	معمر بن راشد	جامع
۱۸۹ھ	محمد بن الحسن الشیبانی	کتاب الآثار

کتاب الجہاد	عبداللہ بن المبارک	۱۸۲ھ
کتاب الذکر والدعاء	قاضی ابو یوسف	۱۸۳ھ
کتاب السیرت	محمد بن اسحاق	۱۵۳ھ
المغازی	موسیٰ بن عقبہ	۱۸۱ھ
المغازی	المعتمر بن سلیمان	۱۸۰ھ
ان کے علاوہ علامہ ابن الندیم نے جن مؤلفین کی نشاندہی کی ہے ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے		
کتاب السنن	محمد بن عبدالرحمن ابن ابی ذئب	۱۵۹ھ
کتاب النسخ والمسنوخ	عبدالرحمن بن زید بن اسلم	۱۶۰ھ
کتاب المغازی	عبدالملک بن محمد بن ابی بکر الانصاری	۱۷۶ھ
کتاب السنن	محمد بن الفضل بن غزوان	۱۹۵ھ
کتاب التفسیر	اسماعیل بن علیہ	۱۱۶ھ
کتاب السنن	عبدالرحمن الاوزاعی	۱۵۹ھ
کتاب السنن	الولید بن مسلم القرشی	۱۹۴ھ
کتاب القرآت	اسحاق الازرق	۱۹۵ھ
کتاب السنن، کتاب التفسیر	ابراہیم بن طہمان	۱۶۳ھ

انفرض اس دوسرے صدی میں علم حدیث میں بکثرت تصانیف مدون ہو کر عالم اسلامی میں پھیل چکی تھیں اور امام اعظم ۱۰ امام مالک کے تلامذہ نے تمام عالم اسلامی کو فقہ و حدیث سے معمور کر دیا تھا۔ اسی صدی میں فقہ حنفی اور مالکی کی تدوین ان احادیث و آثار کی روشنی میں مکمل ہوئی کہ جن پر فقہاء صحابہ و تابعین اور ارباب فتویٰ کا عمل درآمد چلا آ رہا تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

اور جو شخص کہ ان مذاہب کے اصول پر مطلع ہے وہ اس بارے میں کوئی شک نہیں کرے گا کہ ان مذاہب کی اصل فاروق اعظم کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان مذاہب میں ایک امر مشترک ہے۔ اس کے بعد اہل مدینہ میں سے فقہاء صحابہ جیسے کہ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ ہیں اور کبار تابعین فقہاء سبعہ اور صفارہ تابعین مدینہ میں سے نہ ہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالک کے مذاہب کی بنیاد ہے اور اسی طرح حضرت

عبداللہ بن مسعود کے اکثر حالات میں اعتماد اور حضرت علی کے فیصلوں پر بعض حالات میں بشرطیکہ ان فیصلوں کو حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب و اہل بیت کرتے اور مانتے ہوں اور اس کے بعد ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریجات پر اعتماد امام ابو حنیفہ کے مذہب کی بنیاد ہے۔

مصنفین اور تلامذہ امام اعظمؒ

آپ اس صدی میں علم حدیث پر مصنفین کے حالات رجال کی کتابوں میں پڑھیں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں بیشتر امام اعظمؒ کے تلامذہ ہیں یا پھر وہ ہیں جو امام اعظمؒ کے علمی جلال سے بے حد متاثر ہیں کیونکہ اس زمانے میں امام اعظمؒ کے تلامذہ اسلامی دنیا کے چہرہ چہرہ پر پھیلے ہوئے تھے اور ہر جگہ علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کر رہے تھے۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے کتاب التعلیم کے حوالہ سے امام اعظمؒ کے تلامذہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے اور امام حافظ الدین محمد بن محمد الحکمری نے امام اعظمؒ کے خاص تلامذہ کا ذکر کرنے کے بعد من ردی عنہ الحدیث والفقه کا عنوان قائم کر کے ان کا شہرہ و ارتداد ذکر کیا ہے۔ ان شہروں کو آپ فیہ ہوئے نقشہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔

امام طحاوی نے ان چار ہزار میں سے چالیس کو مدین اور مصنفین کتب میں شمار کیا ہے حافظ عبدالقادر نے اسد بن عمر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

کان من اصحاب ابی حنیفۃ الذین دوتوا الکتب اربعین رجلاً^۱

اصحاب ابو حنیفہ میں جو ارباب تصنیف ہیں ان کی تعداد چالیس ہے۔

اسد بن عمر کا بھی شمار ان چالیس میں ہے ان کے بارے میں حافظ ابونعیم کی تصریح ہے کہ — اول من کتب کتب ابی حنیفۃ اسد بن عمر د^۲ — حافظ ابو جعفر طحاوی نے چالیس کی جو تعداد بسند متصل اسد بن الفرات^۳ کے حوالہ سے بتائی ہے ان میں سے قاضی ابویوسف، امام

^۱ قرۃ العینین ص ۱۱۱۔ ^۲ الجواہر المنیۃ ج ۱ ص ۱۲۰۔ ^۳ ابوزاد ج ۲ ص ۲۴۰۔

^۴ یہ بزرگ قیردان کے مشہور قاضی ہیں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے دورانِ درس پوچھتے بہت زیادہ تھے امام مالک نے ان کو کوفہ جانے کا مشورہ دیا۔ کوفہ میں امام ابویوسف اور امام محمد سے استفادہ کیا۔ علامہ (باقی ص ۴۲۴ پر)

محمد، امام زفر، وکیع بن الجرح، یحییٰ بن زکریا، اور عبداللہ بن المبارک کے بارے میں تو آپ پر چکے ہیں کہ یہ ارباب تصنیف ہیں۔ — باقی کے حالات پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ آپ کو امام اعظم اور علم الشرائع میں ملے گا۔ یہ اوراق اس کے متحمل نہیں ہو سکتے مگر اسے صرف ان کے اسماء گرامی پیش کرتا ہوں۔

امام داؤد نصیر الطافی ^{۱۶۰}، امام حفص بن غیاث ^{۱۹۲}، امام یوسف بن خالد القیمی ^{۱۸۹}، امام عافیہ بن یزید ^{۱۸۸}، امام حبان بن علی ^{۱۶۲}، امام مندل بن علی ^{۱۶۸}، امام علی بن مسہر ^{۱۸۹}، امام القاسم بن معن ^{۱۵۵}، امام اسد بن عمرو ^{۱۸۶}، امام فضل بن موسیٰ السنیانی ^{۱۹۲}، امام علی بن نجیان ^{۱۹۲}، امام ہشام بن یوسف ^{۱۹۵}، امام یحییٰ بن سعید القطان ^{۱۹۸}، امام شعیب بن اسحاق دمشقی ^{۱۹۸}، امام حفص بن عبد الرحمن بلخی ^{۱۹۹}، امام حکم بن عبداللہ بلخی ^{۱۹۹}، امام خالد بن سلیمان بلخی ^{۱۹۹}، امام عبد الحمید بن عبد الرحمن ^{۲۰۴}، امام ابو عامر ضحاک ^{۲۰۴}، امام محمد ^{۲۱۲}، امام مکی بن ابراہیم ^{۲۱۵}، امام حماد بن دلیل ^{۲۱۵}، امام عبداللہ بن ادریس ^{۲۱۵}، امام فضیل بن عیاض ^{۲۱۵}، امام متیم بن بشیر ^{۲۱۵}، امام نوح بن دراج الجامع ^{۲۱۵}، امام زبیر بن معاویہ ^{۲۱۵}، امام شریک بن عبداللہ قاضی ^{۲۱۵}، امام نصر بن عبد اکرم ^{۲۱۹}، امام مالک بن مقول ^{۲۱۹}، امام جریر بن حازم ^{۲۱۹}، امام جریر بن عبد الحمید ^{۲۱۹}، امام الحسن بن زیاد ^{۲۲۲}، امام حماد بن ابی حنیفہ ^{۲۱۶}، امام ابو عصمہ نوح بن مریم ^{۲۱۶}۔

بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں علم حدیث کی کتابی خدمت کی گئی ہے اور اس خدمت کا فرض امام اعظم اور امام مالک کے تلامذہ نے انجام دیا ہے۔ تیسری صدی میں آنے والے محدثین بخاری و یحییٰ بن ابی حنیفہ اور سانیہ نے ان ہی سے علم حدیث حاصل کیا ہے۔

ص ۴۲۳ کا بقیہ حاشیہ، ابواسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ موصوف مصر تشریف لے گئے اور مالکی مذہب کے ترجمان عبداللہ بن وہب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہذا کتب ابی حنیفہ یہ امام اعظم کی کتابیں ہیں مجھے کچھ سوالات کے جوابات مذہب مالک کے مطابق درکار ہیں۔ ابن وہب طرح فے گئے وہاں سے ابن القاسم کے پاس آئے اور پھر قیروان واپس آگئے۔ لکھا ہے کہ قیروان میں ابو حنیفہ کی کتابوں کے صدقے ہی ان کو علمی جلال ملا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی ایک نقل ابن القاسم کی درخواست پر موصوف نے ابن القاسم کو بھی دی (الانتقام ص ۵۰)

تیسری صدی میں علم حدیث

کتاب الآثار سے پہلے پہلی صدی میں جس قدر صحیفے اور مجموعے تیار ہوئے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے تفسیر، سیرت، مناقب، احکام، منازعی سب قسم کی حدیثوں کو یکجا کرنے اور بیٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش کا اولین سہرا یقیناً ان کے سر ہے۔ امام شعبی نے بے شک حسب تصریح حافظ سیوطی بعض مضامین کی حدیثوں کو ایک ہی باب کے تحت لکھا تھا لیکن یہ کوشش بالکل ابتدائی تھی اس لیے احادیث کو کتابوں اور بابوں پر پوری طرح مرتب کرنے کا کام ابھی باقی تھا جسے امام اعظم نے کتاب الآثار تصنیف کر کے نہایت خوش اسلوبی سے مکمل فرمایا اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے ترتیب و تبویب کی ایک عمدہ مثال قائم کر دی۔ نیز دوسری صدی تک حدیث وفقہ یکجا تھے اور احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور فتاویٰ سے بھی استدلال کیا جاتا تھا۔ مسند و مرسل اور صحیح و حسن کی کوئی تقسیم نہ تھی۔ چنانچہ اسی اساس پر دوسری صدی میں ساری کتابیں مرتب ہو کر منصفہ صحافت پر آئیں۔

علم حدیث میں کثرت طرق

تیسری صدی میں علم حدیث کو فنی ترقی ہوئی اور اس فن کے ایک سے زیادہ شعبے رونما ہو گئے محدثین نے طلب حدیث میں دنیا سے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں میں پہنچ کر تاریخ سنت کو اس قدر مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا ایک ایک حدیث کے لیے ایک سے زیادہ سندیں تلاش کیں تا آنکہ فن کے لحاظ سے وہ حافظ حدیث فن حدیث میں یتیم شمار ہونے لگا جسے ایک حدیث کم از کم سو سندوں سے معلوم نہ ہو۔ چنانچہ ابواسحاق جوہری جو امام مسلم اور دوسرے محدثین صحاح کے استاد ہیں فرماتے ہیں :

کل حدیث لا یکون عندی من مائۃ طرق فانافیہ یتیم

حدیث اگر میرے پاس سو طریقوں سے نہ ہو تو میں حدیث میں یتیم ہوں

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے الروض الباسم میں بعض حفاظ حدیث کی طرف نسبت کر کے

لکھا ہے کہ واقع میں ابو بکر الصدیق کی حدیثیں تو پچاس سے زیادہ نہیں ہیں مگر حفاظ حدیث کے پاس ابو بکر کی حدیثوں پر مشتمل ضخیم کتاب دیکھ کر ان سے دریافت کیا گیا کہ ابو بکر کی حدیثیں تو زیادہ سے زیادہ پچاس ہیں مگر یہ کتاب مسند ابی بکر کے نام سے کیسی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک حدیث مجھے کم از کم سو طریقوں سے دستیاب نہ ہو تو اپنے آپ کو حدیث میں یتیم سمجھتا ہوں۔ دوسری صدی کے مؤلفین براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تبع تابعین کے شاگرد تھے۔ بدیں وجہ ان کے یہاں کثرت طرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور امام اعظم نے زمانہ صحابہ پایا ہے اس لیے ان کی ذات کے بارے میں طرق و اسانید کی بہتات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس کثرت طرق کا نتیجہ یہ نکلا کہ میسری صدی میں ایک ایک شخص حفظ حدیث میں ترقی کے آخری مقام پر پہنچ گیا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں نے مسند کو سات لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے امام ابو زرہ رازی کہتے ہیں کہ امام احمد کو ایک کروڑ حدیثیں نوک زبان تھیں۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ میں نے ایک کروڑ حدیثیں اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث زبانی یاد ہیں۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ میں نے صحیح تین لاکھ حدیثوں سے لکھی ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ میں نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں اور سنن اسی کا انتخاب ہے۔ امام حاکم نے مدخل میں لکھا ہے کہ ایک ایک حافظ پانچ لاکھ حدیثیں یاد رکھتا تھا۔ ابو بکر محمد بن عمر رازی کہتے ہیں کہ حافظ ابو زرہ رازی کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

محدثین و حفاظ کے مراتب

کثرت طرق کی وجہ سے علم حدیث میں حدیث کے فن کاروں کے مراتب قائم ہوئے، مسند، شیخ، حافظ، محدث، حجتہ اور حاکم کی اصطلاحیں رونما ہو گئیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے منظومہ علم الاثر میں، حافظ زین الدین عراقی نے الغیہ میں اس پر بحث فرمائی ہے لیکن دوسری صدی کے مؤلفین میں یہ مراتب نہ تھے ان کے یہاں محدث اور حافظ کو ایک ہی معنی میں بولتے ہیں چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں :-

قد كان السلف يطلعون المحدث والمحافظة لمعنى
سلف کے نزدیک محدث اور حافظ کے ایک ہی معنی تھے۔

تیسری صدی میں اہل حدیث، صاحب حدیث یا محدث اس وقت تک کسی کو نہ کہا جاتا جب تک بیس ہزار حدیثیں قلم بند نہ کرے چنانچہ حافظ ابو سعد اسحاقی نے حافظ ابو زرعہ الرازی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

جو شخص بیس ہزار احادیث نہیں لکھتا اس کا شمار اہل حدیث میں نہیں ہو سکتا۔

جب کہ تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے صرف حفظ حدیث ہی کافی تھا چنانچہ عظیم بن بشیر امام احمد کے استاد فرماتے ہیں:

جو شخص حفظ حدیث نہیں کرتا وہ ہرگز محدث نہیں ہے یہ

بالآخر ترقی کر کے تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے اہل حق سے ہونے کی گرفت بھی ڈھیلی کر دی گئی اور اہل حدیث صرف فن کاروں کے لیے استعمال ہونے لگا حتیٰ کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے اعلان کر دیا کہ:

هؤلاء هم اهل الحديث من اى مذهب كانوا وكذا لك

اهل العربية واهل اللغة فان اهل كل فن هم اهل

المعرفة فيه۔

خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوں اہل حدیث ہیں جیسے اہل لغت

اور اہل عربیت، اہل فن وہ ہی کہلاتے ہیں جو اس میں فنکار ہوں یہ

جب کہ دوسری صدی کے مؤلفین احادیث لینے میں تدبیر کو پیش نظر رکھتے تھے۔ امام مسلم نے مقدمہ میں سیدنا تابعین امام ابن سیرین کے بارے میں بتایا ہے کہ:

یہ علم دین ہے یہ دیکھو کہ نے کس سے لے لیا ہے ہوا پنا دین۔

امام بیہقی نے ابراہیم نخعی کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں،

ہم اے یہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی سے حدیث لینا ہوتی تو اس

کے اخلاق دیکھتے، اس کی نماز دیکھتے، اس کے احوال کی چھان بین کرتے
پھر اس سے حدیث لیتے یہ

حدیث میں موفات کا توسع

علم حدیث کی اسی پہنائی اور وسعت کا تصنیف و تالیف پر بھی تیسری صدی میں اثر پڑا اور اس کے نتیجے میں جوامع اور سنن کے ساتھ تصنیف و تالیف کی بے شمار انواع و اقسام منقذہ صحافت پر آگئیں مثلاً -

مسانید، مصنفات، صحاح، مستخرجات، اجزاء، معاجم، طبقات، موضوعات،
مشینات، العلل، العوالی، الاطراف، الزوائد، استخراجات، الافراد، الغرائب
وغیرہ وغیرہ۔

دوسری صدی کے مؤلفین چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تابعین کے فیض یافتہ تھے۔ اس لیے ان کو اسناد کے بائے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت پیش آتی تھی لیکن تیسری صدی میں اسنادی وسائل پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اس لیے تیسری صدی میں محدثین کو اس سلسلے میں ایک سے زیادہ فنون سے دوچار ہونا پڑا۔ اور جمع روایات، تنقید احادیث اور اصول روایت کے سلسلے میں بہت سی ایسی نئی چیزیں پیدا ہو گئیں جن کی بنا پر اس دور کے مصنفین کو حدیث کی تدوین اپنے اپنے مذاق کے مطابق کرنی پڑی اور تصنیف و تالیف میں یہ گونا گوں انواع و اقسام رُفعا ہوئے۔

علم حدیث میں مسانید کی تالیف

سب سے پہلے تیسری صدی کے مؤلفین نے حدیث کو آثار صحابہ سے علیحدہ کر کے مسند حدیثیں جمع کیں۔ ہر راوی کی تمام پریشان اور غیر مرتب روایات کو یکجا کیا اور اس طرح مسانید کی تصنیف کا آغاز ہوا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تیسری صدی کے مشاہیر محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے،
تأانکہ کچھ ائمہ کی یہ رائے ہوئی کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مستقل طور پر علیحدہ کیا جائے اور یہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوا چنانچہ عبید اللہ

بن موسیٰ کوئی، مسدد بن مسدد بصری، اسد بن موسیٰ اموی اور نعیم بن حماد خزاعی نے ایک ایک مسند تصنیف کی۔ دوسرے ائمہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے اور حفاظ حدیث میں مشکل ہی سے کوئی امام ہو گا کہ جس نے اپنی احادیث کو مسانید پر مرتب نہ کیا ہو چنانچہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ اور ان جیسے دیگر اکابر نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور بعض محدثین نے جیسے ابو بکر بن ابی شیبہ ابواب و مسانید دونوں عنوانوں پر کتابیں لکھیں۔

امام حاکم المدخل میں رقمطراز ہیں:

یہ مسانید جو اسلام میں تصنیف ہوئے ہیں صحابہ کی مرویات ہیں ان کا سلسلہ سند معتبر اور مجروح ہر قسم کے راویوں پر مشتمل ہے مثلاً مسند عبید اللہ بن موسیٰ اور مسند ابی داؤد و طیالسی۔ یہ دونوں پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسانید لکھی ہیں ان دونوں کے بعد احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، زہیر بن حرب اور عبید اللہ بن عمر قوامی نے مسانید ترتیب دیے۔ بعد ازیں کثرت سے تراجم رجال پر مسانید مرتب ہوئے اور ان سب کے جمع کرنے میں صحیح و سقیم کے امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا ہے

علامہ محمد بن اسماعیل یحییٰ نے مسند کی یہ تعریف کی ہے کہ:

ان يذكر فيه ما ورد عن ذلك الصحابي جميعا فيجمع الضعيف
و غيره ۛ ۛ

المکاتی نے جو مسند کی تعریف فرماتی ہے وہ بھی گوش گزار فرمایا جتے:

وہ کتابیں جن کا موضوع صرف یہ ہے کہ ہر صحابی کی حدیثوں کو الگ الگ بیان کیا جائے چاہے یہ صحیح ہوں یا ضعیف، ان کی ترتیب اسماء صحابہ میں حروف ہجاء کے مطابق ہوتی ہے

گویا مصنفین مسانید کا پیش نهاد صرف یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے تمام منتشر ذخیرے کو یکجا کر دیا جائے اور ایک صحابی کی جس قدر روایتیں مل سکتی ہیں ان کو سمیٹ دیا جائے اور چونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر راوی کی ہر روایت صحیح سند ہی سے منقول ہو اس لیے جس سند سے اور جس طریقے سے بھی وہ روایت مصنف کو پہنچی وہ اسے بالاسند درج کر دیتا ہے۔ بدین وجہ صرف صحیح روایات کی یکجائی ان کے موضوع سے خارج اور ان کی شرط تصنیف کے منافی ہے کیونکہ ان کی شرط تو صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک صحابی کے نام سے تمام کچا پکا، صحیح اور غیر صحیح، قوی و غیر قوی، قابل قبول اور ناقابل قبول سرمایہ ہر طرف سے تلاش اور جستجو کے بعد فراہم کر دیا جائے تاکہ کوئی روایت مدون ہونے سے نہ رہ جائے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں:

و شرط اہلہا ان یفردوا حدیث کل صحابی علیحدۃ من غیر نظر

الی الابواب ویستقصون جمیع حدیث ذالک الصحابی کلمہ سواد

رواہ من یحتج لہام لا فقصد ہر حصہ جمیع ما روی عنہ لہ

اس کا مطلب یہی ہے کہ اہل مسانید کے پیش نظر ہر قسم کے سرمایہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ شاید آپ غلط محسوس کریں کہ اس فراہمی سے ان بزرگوں کا مقصد کیا تھا وہ ایسا کیوں کر ہے؟ دراصل ان بزرگوں کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ سارا ذخیرہ یکجا ہو کر آجائے گا تو اہل فن اصول تنقید اور قواعد روایت کے مطابق ان تمام روایات کی جانچ پڑتال کر کے ہر روایت کے بارے میں رائے قائم کر سکیں اور ساتھ ہی ایک ایک حدیث کے لیے طرق و اسانید کا بیش بہا ذخیرہ جمع ہو کر حدیث کے روایتی اسنادی استحکام کا ذریعہ ہو جائے۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری فرماتے ہیں:-

ہذا المسانید الکبار التي یذکر فیہا طرق الاحادیث لہ

ان مسانید سے حدیث کے طرق اور اسانید کا علم ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث اگر متعدد صحیح طرق سے آئی ہے تو وہ روایتی نقطہ نظر سے قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے اور اگر ضعیف طرق و اسانید سے بھی آئے تو یہ ضعیف طرق صحیح حدیث کے لیے توابع اور شواہد کا کام دیتے ہیں۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں:

مالہا من المناہات والشواہد

اس دور میں اگرچہ مسانید بہت لکھے گئے ہیں مگر ہم اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند مؤلفین کا ذکر کرتے ہیں۔

مسند مسدد بن مسرہ	۲۲۴ھ	مسند امام ابی داؤد طباطبائی	۲۰۴ھ
مسند ابی جعفر عبداللہ بن محمد	۲۲۶ھ	مسند عبید اللہ بن موسیٰ کوفی	۲۱۳ھ
مسند ابی جعفر محمد بن عبداللہ کوفی	۲۲۶ھ	مسند یحییٰ بن عبد الحمید حمانی کوفی	۲۲۸ھ
مسند ابی یعقوب التستوخی	۲۵۲ھ	مسند ابی اسحاق ابراہیم بن سعید	۲۴۹ھ
مسند ابی الحسن محمد بن مسلم	۲۴۲ھ	مسند ابی الحسن علی بن الحسن	۲۵۱ھ
مسند ابی یاسر عمار بن رجاہ	۲۶۶ھ	مسند ابی زرہ رازی	۲۹۲ھ
مسند ابی سعید عثمان بن سعید	۲۸۰ھ	مسند ابی بکر احمد بن منصور	۲۶۵ھ
مسند ابی عبدالرحمن نعیم بن مطوسی	۲۹۰ھ	مسند ابی الحسن علی بن عبد الغزیز	۲۸۶ھ
مسند ابی جعفر احمد بن منیع	۲۴۴ھ	مسند ابی یعقوب اسحاق بن ابراہیم	۲۳۸ھ
مسند ابی الحسن عثمان بن محمد	۲۳۹ھ	مسند ابی الحارث بن محمد	۲۸۲ھ
مسند عبد بن حمید	۲۴۹ھ	مسند ابی عبداللہ محمد بن یحییٰ	۲۴۳ھ
مسند محمد بن یوسف الفرغیابی	۲۱۲ھ	مسند ابی بکر عبداللہ بن الزبیر	۲۱۹ھ
مسند الحسین بن داؤد المصیصی	۲۲۶ھ	مسند احمد بن سنان	۲۵۸ھ
مسند احمد بن حازم	۲۶۶ھ	مسند ابی بکر احمد بن عمرو البصری	۲۹۳ھ
مسند اسحاق بن منصور نیشاپوری	۲۵۱ھ	مسند احمد بن محمد بن الاعمشانی	۲۶۲ھ
مسند یعقوب بن ابراہیم الاذقی	۲۵۲ھ	مسند محمد بن ابراہیم بن مسلم	۲۶۳ھ
مسند یعقوب بن شیبہ بصری	۲۶۲ھ	مسند محمد بن الحسن ابی عبداللہ	۲۶۶ھ
مسند الحسین بن محمد نیشاپوری	۲۸۹ھ	مسند ابراہیم بن اسماعیل	۲۸۸ھ
مسند ابراہیم بن معقل نسفی	۲۹۵ھ	مسند احمد بن علی المرزوقی	۲۹۲ھ
مسند یحییٰ بن محمد	۲۶۶ھ	مسند احمد بن حنبل	۲۴۱ھ

مسانید میں اولیت

ان تمام مسانید میں تاریخی طور پر اگرچہ اولیت کا مرتبہ جیسا کہ الحاکم نے لکھا ہے کہ :

اول من صنف المسانید علی تراجم الرجال فی الاسلام عبید اللہ بن موسیٰ
العبسی والبوداؤد الطیالسیؒ

عبید اللہ بن موسیٰ کوفی کے مسند کو اولیت حاصل ہے کیونکہ مسند طیالسی درحقیقت البوداؤد طیالسی کی تصنیف نہیں بلکہ اس کے جامع خراسان کے کچھ محدثین ہیں۔ امیر میانی فرماتے ہیں کہ اس کی حیثیت مسند شافعی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے علامہ بقاعی کہتے ہیں کہ مسند طیالسی کو جن بزرگوں نے اولین مسند قرار دیا ہے ان کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ مصنفین مسانید میں زمانی لحاظ سے البوداؤد کا زمانہ سب سے پہلے ہے اور یہ مسند البوداؤد کی تصنیف ہے مگر یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ

انہ لیس من تصنیف ابی داؤد انما جمعه بعض الحفاظ الخراسانیینؒ

یعنی یہ امام البوداؤد کی تصنیف نہیں بلکہ بعض خراسانی محدثین نے بعد میں یہ کام انجام دیا ہے۔ اور عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں محدثین کی تصریح کہ مسند خود ان کا تصنیف کردہ ہے۔ عبید اللہ پر تشیع کی تہمت ہے۔ البوداؤد نے ان کو شیعہ لکھا ہے۔ الذہبی نے العابد من کبار علماء الشیعہ سے ان کا چہرہ شروع کیا ہے مگر یاد ہے کہ اس دور میں شیعہ ہونے کا مفہوم آج کے مطابق نہ تھا۔ اس دور میں شیعہ ہونے کا صرف مطلب ہوتا ہے کہ حضرت علی کو باقی صحابہ پر مقدم کیا جائے چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ:

التشیع دھو تقدیم علی علی الصحابۃ رضی اللہ عنہم اجمعینؒ

اور شیعہ محرق یا غالی ہونے کا مطلب دوسری صدی میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ بتایا ہے کہ:

التشیعی الغالی فی زمان السلف و عرفہم ہو من تکلم فی عثمان والزبیر وطلحہ و طائفة ممن حارب علیاً و تعرض بسہرۃ

اس لیے عبید اللہ بن موسیٰ کا تشیع بھی اس دور میں اس نوع کا تھا۔ ان کو امام اعظم سے استفادے کا بھی موقع ملا ہے۔ چنانچہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو دوسرے محدثین کے ساتھ امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے ۵۵

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر تبویح حدیث اور تدوین شراہ میں اولیت کا سہرا امام اعظم کے سر ہے ایسے ہی مسانید کی اولیت کا شرف بھی بواسطہ عبید اللہ بن موسیٰ امام اعظم کو ہی حاصل

۱۔ الرسالہ المستطرفہ ص ۵۲ - ۵۳ توضیح الافکار ص ۲۲۹ - ۲۳۰ تدریب الراوی ص ۲۱۹ -
۲۔ سان المیزان ج ۱ ص ۱۴ - ۱۵ - تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۹ -

ہے۔ عبید اللہ بن موسیٰ ایک طرف اگر امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں تو دوسری طرف امام بخاری رحمہ اللہ کے
اساتذہ میں سے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں عبید اللہ بن موسیٰ کو
امام بخاری کے اساتذہ کے پانچ طبقوں میں سے اولین طبقہ میں شمار کیا ہے۔ اس طبقے میں امام بخاری
کے اساتذہ یہ ہیں۔ محمد بن عبد اللہ انصاری، مکی بن ابراہیم، ابو عاصم النبیل، عبید اللہ بن موسیٰ، ابو نعیم،
خلاد بن یحییٰ، علی بن عیاش اور عصام بن خالد۔ اور لکھا ہے شیوخ ہؤلاء کلہم من التابعین
ان کے اساتذہ تابعین ہیں۔

مسند امام احمد بن حنبل کی عظمت

اگرچہ تاریخی لحاظ سے اقدیمیت عبید اللہ بن موسیٰ کو حاصل ہے لیکن اس صدی کے تمام مسانید میں جو تشریف
اور بلندی مسند امام احمد کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں امام موصوف نے جمع و ترتیب کا کام
میں شروع کیا تھا چنانچہ المنہج میں ہے۔

مسند میں مسند کا کام شروع ہوا تھا۔ (ص ۲۱)

اس کی تالیف کا پس منظر خود امام نے یہ بتایا ہے کہ اگر علماء میں کبھی کسی حدیث میں اختلاف ہو تو یہ
کتاب یعنی مسند احمد اس روایت کے استناد و عدم استناد میں دستاویز کا کام دے سکے چنانچہ امام
ممدوح کے صاحبزادے عبید اللہ بن احمد کا بیان ہے۔

میں نے اپنے والد احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ آپ کتاب میں مرتب کرنے سے
کیوں منع کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ نے خود بھی مسند لکھی ہے آپ نے جواب
میں فرمایا۔ یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھی ہے جب سنت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں لوگوں میں کوئی اختلاف رونما ہوگا
وہ اس کی طرف رجوع کریں گے۔

اور آپ کے برادر زادے حنبل بن اسحاق کہتے ہیں کہ
ہم سے امام احمد نے فرمایا کہ اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ
روایتوں سے انتخاب کر کے جمع کیا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تم اس کتاب کی طرف رجوع کرو اگر

اس میں وہ روایت مل جائے تو قہار و زور نہ وہ حجت نہیں ہے

اگرچہ مسند کی تالیف کا کام سلسلہ میں شروع ہوا ہے لیکن امام موصوف اس کی جمع و ترتیب کا کام ساری زندگی کرتے رہے اور یہ کام کچھ اس قدر انہماک کے ساتھ کیا کہ اس کی تبویب تنظیم اور ترتیب کی طرف متوجہ نہ ہو سکے ان کے پیش نظر صرف جمع و تدوین تھی اس کی خاطر انہوں نے پورے زندگی کے شب و روز صرف کر دیے۔ مسودات کی صورت میں اوراق متفرقہ کا یہ مجموعہ ان کے پاس موجود تھا اور ابھی تشنہ تکمیل تھا کہ امام مدوح کو سفر آخرت پیش آ گیا۔ حافظ ابوالخیر شمس الدین جزری المصعد الاحمد فی ختم مسند الامام احمد میں فرماتے ہیں :

امام احمد نے مسند کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا اسے ورقوں میں الگ الگ لکھا پھر اسے جدا جدا اجزائیں تقسیم کیا تا آنکہ اس نے ایک سو سے کی صورت اختیار کر لی۔ بعد ازیں تکمیل سے پہلے ہی پیام موت آ گیا۔ انہوں نے اپنی اولاد اور اہل بیت کو اسے پہلی فرصت میں سنا ڈالا اور قبل اس کے کہ اس کی تنقیح و تہذیب پوری ہوتی، آپ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور مسودہ بھول کاٹوں رہا۔ پھر ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد نے ان روایات کے مشابہ اور مماثل مسوعات بھی اس میں شامل کر دیے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند احمد صرف امام کی محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کے اضافے بھی ہیں۔ اگرچہ جو کچھ اضافہ ہے اس کا اکثر حصہ عبداللہ بن احمد نے امام احمد ہی سے سنا ہے لیکن یہ وہ حصہ ہے جسے مسند کا املا کرتے وقت امام احمد انہیں کرا سکے۔ امام عبداللہ بن احمد کی جلالت شان کا اندازہ کرنا ہو تو طبقات میں ابن یعلیٰ کی شہادت پڑھیے۔

صالح اپنے والد امام احمد سے بہت کم لکھتے ہیں لیکن عبداللہ نے اپنے والد سے اتنی زیادہ روایت کی ہے کہ دنیا میں کوئی ان کا حریف نہیں بن سکتا انہوں نے مسند، تفسیر، ناسخ و منسوخ، تاریخ حدیث، آیات

کتاب اللہ کی تقدیم و تاخیر، جوابات قرآن اور مناسک کبیر و صغیر کا علم حاصل کیا۔ اس کے علاوہ دوسری مصنفات اور حدیث شیوخ کا مطالعہ کیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکابر شیوخ عبد اللہ کی معرفت رجال اور معرفت علل کو مانتے ہیں عبد اللہ طلب حدیث ہیں ہمیشہ سرگرم رہے غرض سلف سے خلف تک عبد اللہ کے علم و فضل اور جلالت شان کا سب کو یکساں اقرار ہے یہ

مسند کا موجودہ نسخہ امام موصوف کے صاحبزادے عبد اللہ ہی کا ترتیب دادہ ہے اس میں انہوں نے اپنے والد کی جمع کی ہوئی حدیثوں کو ایک خاص طریق پر یکجا کیا ہے۔ عبد اللہ کے بعد کچھ محدثین نے اس ترتیب کو بدلنے کی خواہش کی ہے عبد اللہ کی ترتیب پر حافظہ بھی تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اگر امام عبد اللہ مسند کو صحیح مرتب کر دیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ شاید اللہ سبحانہ اپنے کسی بندے کو توفیق دے کہ وہ اس کی خدمت کرے اس پر عنوان قائم کرے اور اس کے رجال پر بحث کرے اس کی وضع و ہیئت بدل دے اس مجموعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا کثیر حصہ موجود ہے اور بہت کم ایسا ہے کہ صحیح حدیث تو ہو لیکن اس مجموعہ میں نہ ہو۔ البتہ حسان کا استیعاب اس میں نہیں ہے گو اکثر یہ بھی موجود ہیں باقی غریب اور ضعیف روایات تو ان کی مشہور روایتیں اس میں موجود ہیں۔ ہاں ان حدیثوں کا بڑا حصہ چھوڑ دیا ہے جو سنن اربعہ اور معجم طبرانی وغیرہ میں موجود ہے یہ

باوجودیکہ اس میں جیسا کہ حافظ شمس الدین الحسینی نے التذکرہ برجال العشرہ میں تصریح کی ہے چالیس ہزار حدیثیں آگئی ہیں پھر بھی احادیث صحیحہ کی بہت بڑی تعداد اس میں درج ہونے سے وہ گنتی ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

امام احمد سے اس کتاب میں بہت سی صحیح حدیثیں چھوٹ گئی ہیں،

باوجودیکہ کہ کوئی اور مسند کثرتِ احادیث اور حسنِ ادائیگی اس کے ہم پلہ نہیں ہے بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جماعتِ صحابہ میں دو سو کے قریب ایسے حضرات کی روایتیں اس میں موجود نہیں کہ جن سے صحیحین میں احادیث آئی ہیں۔
کیا مسند میں موضوع احادیث بھی ہیں؟

یہ سوال بھی اربابِ تحقیق کے یہاں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر محدثین اور محققین نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حافظ عراقی کو اس پر اصرار ہے کہ مسند میں بہت سی حدیثیں ضعیف ہیں اور موضوع بھی ہیں لیکن موضوع کم ہیں۔ حافظ عراقی نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں ان حدیثوں کی نشاندہی کی ہے جن کے بائیں اہل فن کہتے ہیں کہ یہ حدیثیں موضوع ہیں۔ چنانچہ حافظ ابو موسیٰ المدینی نے ان میں سے بعض روایات کا خلاصہ مسند میں تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدوفی الذب عن مسند احمد میں ان احادیث پر پیدائشہ اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مسند میں کوئی حدیث موضوع نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ سے تو تسلیم کرتے ہیں کہ مسند میں کچھ حدیثیں ضعیف ہیں لیکن یہ نہیں ماننے تھے کہ امام احمد کی روایت کردہ کوئی حدیث مسند میں موضوع بھی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مسند میں روایت کی شرط انہوں نے یہ رکھی ہے کہ کسی ایسے راوی سے روایت نہیں لیں گے جو دروغ گوئی میں ان کے یہاں معروف ہو یا ان کے صاحبِ خبر نے عبد اللہ نے مسند میں کچھ اضافے کیے ہیں بعد ازیں عبد اللہ کے شاگرد ابو بکر قطعی نے بہت سی موضوع حدیثیں زیادہ کر دی ہیں بحقیقت حال سے ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ موضوع حدیثیں بھی امام احمد ہی کی روایت کردہ ہیں حالانکہ یہ خیال سراپا غلط ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی بھی حافظ ابن تیمیہ کے اس میں ہم زبان ہیں مگر تین یا چار حدیثوں کے بارے میں ان کو خود تامل ہے۔ چنانچہ تعجیل المنفعة میں فرماتے ہیں کہ:

مسند میں تین یا چار حدیثوں کے سوا کوئی بے اصل یا موضوع نہیں ہے۔

علامہ ابن الجوزی نے ان لوگوں کی بڑی شد و مد سے تردید کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ

مسند میں کوئی حدیث ضعیف نہیں ہے۔ پروفیسر محمد البوزہ نے اپنی مشہور کتاب "احمد بن حنبل میں ابن الجوزی کی کتاب صند النظار سے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں فرماتے ہیں :-

مجھ سے بعض اصحاب حدیث نے دریافت کیا کہ مسند میں کچھ حدیثیں ایسی ہیں جو صحیح نہیں ہیں میں نے کہا کہ ہاں۔ میری یہ بات ان لوگوں پر گمراہ کن گزری جو مذہب حنبلی سے تعلق رکھتے ہیں میں نے ان لوگوں کی حرکت کو اس پر محمول کیا کہ یہ گمراہ عوام ہے اور ان کی بات ناقابل التفات ہے۔ اسی دوران ان لوگوں نے فتوے لکھے ہیں ان کی اس حرکت پر بے حد حیران ہوا اور دل میں کہا کہ کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اہل علم بھی عوام جیسی باتیں کرتے ہیں اور یہ بات صرف اس لیے ہے کہ انہوں نے حدیث کا نام تو سن لیا مگر ان کو صحیح اور مستقیم کی پرکھ نہیں ہے

بہر حال اس موضوع پر علماء کی آراء مختلف ہیں اور یہ بات ہمیشہ سے بحث و نظر کا مرکز رہی ہے کہ مسند میں کوئی روایت موضوع موجود ہے یا نہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں حافظ ابن تیمیہ کا وہ فیصلہ پسند ہے جو انہوں نے اسی سے متعلق اپنی کتاب "التوسل والوسیلہ" میں درج کیا ہے۔

اگر موضوع سے مراد یہ ہے کہ کسی کذاب راوی کی حدیث مسند میں ہے تو یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور اگر مقصود یہ ہے کہ حضور کی کوئی بات کسی ایسے راوی کی راہ سے آئی ہے جو غلط گو یا حافظ کی کمی کا شکار ہے تو یہ بالکل درست ہے مسند اور سنن میں ایسی حدیثیں موجود ہیں۔

کچھ ہو لیکن مسند احمد کی اس خصوصیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسند احمد دوسرے تمام مسانید سے زیادہ صحیح ہے جیسا کہ حافظ نور الدین ہشیمی نے نمایتہ المقصد فی زوائد المسند میں تصریح کی ہے :

مسند احمد اصح صحیحاً من غیرہ

مسند احمد دوسرے مسندوں سے زیادہ صحیح ہے۔

اگرچہ مسند بقی بن مخلد مسند احمد سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کی

راتے ہے کہ:

و من ادسعا مسند بقی بن مخلد^۱

مسانید میں سب سے وسیع مسند بقی بن مخلد ہے

اور اس کی وسعتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس میں تیس سو صحابہ سے زیادہ اکابر کی روایات کا ذخیرہ ہے۔ اور اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بیک وقت مسند بھی ہے اور مصنف بھی۔ اولاً کتاب کو صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے اور پھر صحابی کی روایات کو بترتیب فقہی یکجا کیا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب مسند اور مصنف دونوں کا کام دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مسند احمد جیسی اسے مقبولیت نہیں ہے بہر حال مسند احمد اس دو کے تمام مسانید میں اعلیٰ، اشرف اور احادیث کا بہت بڑا مجموعہ ہے۔ خیر یہ بات تو ایک ضمنی تا کہ تیسری صدی میں سنن اور جوامع کے ساتھ مسانید بھی منصفہ صحافت پر آ گئے۔

آپ ان تمام مسانید کے مصنفین، ان کی تاریخ وفات، ان کے اوطان کو دیکھتے آپ خود محسوس کریں گے کہ اس وقت کے تمام عالم اسلامی کے سارے شہروں میں حدیث کا چرچا عام ہو چکا ہے اور کوئی شے بھی ایسا نہیں ہے جہاں حدیث نبوی نہ پہنچی ہو۔ ۱۹۵ھ میں اس صدی کا آخری مسند ہے۔ اس وقت کی اسلامی فتوحات کے نقشہ کو سامنے رکھ کر بتائیے کون سی جگہ ہے جہاں ارشادات نبویہ کو اپنایا نہ گیا ہو۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب امام اعظم کے تلامذہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ:

روی عنہ من المحدثین والفقہاء عدة لا يحصون

اگر آپ تاریخ میں ان اکابر و باب مسانید کے علمی نسب ناموں کو تلاش کریں گے تو آپ کو ان کے علمی رشتے امام اعظم سے ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ عبید اللہ بن موسیٰ کے باپ سے میں آپ سن چکے ہیں امام احمد بن حنبل جو رئیس المحدثین ہیں ان کے باپ سے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں ان کے اساتذہ کی ایک طویل فہرست دی ہے اور ان میں امام ہشیم بن بشیر، امام جریر بن عبد الحمید، امام عباد بن العوام، یحییٰ بن ابی زائدہ، قاضی ابو یوسف، دکیج بن الجراح، یزید بن ہارون اور عبد الرزاق کا نام نمایاں طور پر لیا ہے اور ان سب کے متعلق امام بخاری نے تاریخ کہ

میں اور حفاظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں شہادت دی ہے کہ یہ سب کے سب امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ امام دکیع بن الجراح کہتے ہیں کہ کوفہ میں اس جیسا نو جوان کوئی نہیں آیا۔ یہی بات امام اعظم کے دوسرے شاگرد حفص بن غیاث نے بھی کہی ہے۔ امام اعظم کی مجلس تدوین کے رکن رکیبن اور یزید سجی القطان بھی امام احمد کے اہل تلامذہ میں سے ہیں۔ امام ذہبی نے ان کا اقرار بھی اس قسم کا نقل کیا ہے۔ الغرض ان ارباب مسانید میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر ایک کا شجرۂ علمی امام اعظم سے ملتا ہے۔

علم حدیث میں مصنفات

اس صدی میں مسانید کے ساتھ مصنفات بھی منصہ صحافت پر آ گئے۔ مصنف سے مراد مطلق محدثین میں وہ کتابیں ہیں جن میں احکام اور ان سے متعلق باتیں ترتیب فقہی یکجا ہوں۔ مصنف اور جامع میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جوامع وہ کتابیں ہیں جن میں عقائد، احکام، رقائق، کھانے پینے، سفر، مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب، تفسیر، تاریخ کی فتن اور مناقب کی روایات ہوں۔ لیکن مصنف میں صرف وہ احادیث فقہ و احکام ہوتی ہیں جن کا تعلق شہری زندگی میں فقہ اور قانون سے ہے۔ دوسری صدی میں سنن سے مصنف کا کام لیا جاتا تھا مگر تیسری صدی میں سنن کے ہی لیے مصنف کا نام وجود میں آ گیا۔ اگرچہ بعد کو سنن میں خصوصاً اور مصنف میں کچھ عموم سا آ گیا۔

تیسری صدی میں مصنف کے نام سے جو کتابیں وجود میں آئی ہیں وہ اگرچہ ہیں تو بہت مگر امکاناً انے الرسائل المستطرفہ میں دو کا ذکر کیا ہے۔

مصنف عبدالرزاقؒ

یہ المصنف نامی ایک ضخیم تالیف دو جلدوں میں ہے اس کی ترتیب فقہی ہے اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ یہ دور تابعین میں بھی ہے اور باتفاق محدثین اس کے مصنف کو تابعین سے شرف تلمذ حاصل ہے اس لیے اس میں اکثر احادیث ثلاثی ہیں یعنی ایسے نبوی ارشادات جو ان کو صرف تین ہی واسطوں سے معلوم ہوتے ہیں جیسا سچا استحاف النبلاء المتعین میں ہے :
اکثرش ثلاثی است۔

کتاب کے آخر میں شمائل نبوی ہیں اور شمائل کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں پر ختم کیا گیا ہے اور آخری حدیث یہ ہے:

حدثنا معمر عن ثابت عن انس قال كان شعر رسول الله صلى الله عليه وسلم الى النصف اذ نبى - (استحاف ص ۱۵۳)

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان کتابوں میں ہے جو اسلام کے علمی سرمایہ میں بہترین شمار کی جاتی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف عبدالرزاق بن ہمام الیمانی ہیں اور اس دور کی پیداوار ہیں۔ جس کے بارے میں تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس دور والوں میں اتباع تابعین کو شرف قبول حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی نے تصریح کی ہے:

ثم اتفقوا ان اخر من كان من اتباع التابعين ممن يقبل قوله عاش الى حدود سنة ۲۲۰ ثم ظهرت البدع -

اس پر اتفاق ہے کہ اتباع تابعین سے آخری شخص جس کی بات قبول کی جاتی ہے ۲۲۰ تک زندہ رہا ہے بعد ازیں بدعتوں کا ظہور ہو گیا۔

امام عبدالرزاق ہی صحیفہ ہمام بن نمیر کے اپنے استاد معمر بن راشد سے راوی ہیں۔ امام عبدالرزاق کے تلامذہ میں رئیس المحدثین امام احمد بن حنبل ہیں۔ ہمام کا یہ صحیفہ بحسبہ آج بھی امام احمد کے مسند میں موجود ہے۔ یاد ہے کہ ہمام اس صحیفے کے مصنف نہیں بلکہ اپنے استاد حضرت ابو ہریرہ سے راوی ہیں اور ہمام سے اس کے راوی معمر اور معمر سے اس کے راوی ان کے شاگرد امام عبدالرزاق ہیں۔

امام عبدالرزاق نے صرف معمر بن راشد ہی سے کسب فیض نہیں کیا بلکہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ عبدالرزاق نے حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظم کے سامنے بھی زانوئے ادب نہ کیا ہے۔ عتود الجمان میں ہے کہ امام اعظم کی خدمت میں زیادہ ہے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے بسند متصل احمد بن منصور مادی کا یہ بیان قلم بند کیا ہے کہ: میں نے امام عبدالرزاق سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے زیادہ بردبار کوئی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو مسجد حرام میں ایسی حالت میں

دیجھا ہے کہ لوگوں کا ان کے ارد گرد حلقہ ہوتا تھا سوالات کی بوچھاڑ ہوتی تھی ایک شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا آپ اس کو جواب دیتے آگے سے کوئی اعتراض کرتا کہ اس مسئلہ میں حسن بصری یوں فرماتے ہیں۔ ابو حنیفہ کہتے کہ حسن بصری سے غلطی ہوتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود یہی فرماتے ہیں۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں نے اصل مسئلہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعود اور ابو حنیفہ میں ہم آہنگی ہے۔ بلکہ اصحاب عبداللہ کی بھی ان کو تائید حاصل ہوتی ہے۔

ان کے مصنف کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنا ہو تو امام بخاری کی تاریخ کبیر میں یہ سائے پڑھئے کہ ان کی کتابی حدیثیں سب سے زیادہ صحیح ہیں۔ امام بخاری نے صحیح میں ان سے بکثرت حدیثیں لی ہیں اور ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ صحیح ہونے کی وجہ سے یہ ان کے مصنف ہی سے امام بخاری کا استفادہ ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی کاوشوں سے معلوم ہوا ہے کہ مصنف عبدالرزاق کے مخطوطے استنبول اور صنعاء میں کامل اور حیدرآباد دکن، ٹونک، حیدرآباد سندھ اور مدینہ منورہ میں ناقص ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اہل علم کو یہ خوشخبری بھی دی تھی کہ

عثمانیہ کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف سے آج کل ایڈٹ کر رہے ہیں اور جنوبی افریقہ کے عالم اور علم دوست تاجر مولانا محمد موسیٰ اس کی اشاعت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ ۲۳۵

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان چند بے مثال کتابوں میں ہے جو اسلام کا کارنامہ فخر خیال کی جاتی ہیں۔ حافظ ابن کثیر دمشقی ابن ابی شیبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
صاحب المصنف الذی لم یصنف احدا مثله قط لا قبلہ ولا
بعده۔

اس مصنف کے مصنف ہیں کہ اس جیسی کتاب نہ پہلے اور نہ بعد میں لکھی گئی ہے۔
حافظ ابن حزم نے اس کتاب کو عظمت کے لحاظ سے موطا امام مالک سے بھی مقدم رکھا ہے چنانچہ

ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کی جانب منسوب کر کے حدیث کی کتابوں کے جو ترتیبی مدارج لکھے ہیں اس میں انہوں نے موطا کو حدیث کی تیسرے درجہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ کو درجہ ثانیہ کی کتابوں میں ظاہر کیا ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق کو بھی اس کا ہم پلہ بتایا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں درجات کی اس تعین میں ان کے پیش نظر صحت نہیں ہے بلکہ احادیث مرفوعہ کی زیادتی ہے چنانچہ درجہ اولیٰ کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ خود فرماتے ہیں:

هذه الكتب التي افردت لكلام رسول الله صلى الله عليه وسلم

درجہ ظاہر ہے کہ از روئے صحت صحیحین، مسند طیبی، اور مسند ابن حنبل کو ایک صف میں کون لاسکتا ہے اور معلوم ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں حدیث نبوی کے پہلو بہ پہلو صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ کا ذخیرہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر حدیث کے متعلق یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو سلف امت میں تعلق بالقبول کا درجہ ملا، یا نہیں اور در صحابہ و تابعین میں اس پر عمل تھا کہ نہیں اور یہ اس کتاب کی وہ خاص افادی حیثیت ہے کہ جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب فقہاء و محدثین میں برابر متداول چلی آئی ہے۔ صاحب کشف الظنون نے اس کا تعارف ہی اس حیثیت سے کرایا ہے وہ فرماتے ہیں:

هو كتاب كبير جدا جمع فيه فتاوى التابعين واقوال الصحابة
واحاديث الرسول صلى الله عليه وسلم على طريقة المحدثين
بالاسانيد من تبا على الكتب والابواب۔

یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جس میں فتاویٰ تابعین، اقوال صحابہ اور احادیث نبوت کو بطرز محدثین بالاسانید جمع کر دیا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے تمام ابواب سے نظر ہٹا کر مصنف نے اس میں صرف احادیث احکام کو لیا ہے یعنی جس سے فقہ کا کوئی مسئلہ نکلتا ہے اور اس کتاب کا خاص امتیاز یہ ہے کہ اس میں فقہی مذہب کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہیں کیا گیا بلکہ اہل حجاز، اہل عراق و دونوں مدرسوں کی جس قدر روایات مصنف کو ملی ہیں ان سب کو نہایت غیر جانبداری

ساتھ بیچا کر دیا ہے اس لیے قدامت کی کتابوں میں یہ کتاب احادیث احکام پر جامع ترین ہے
 مورخہ مزید کوثر میں نے خط لکھا تھا کہ تیسری میں مصنف کے بارے میں یہ بات بڑی ہی قیمتی
 رہتی ہے۔

لمصنف احمد بن حنبل بن ابي اسيد، ليس من ملتب الجامع للمسا
 والمراسيل وفتاوى الصحابة واما بعين رتب على الابواب
 يفتى مطاع على من الاتفاق والاختلاف بسهولة
 مسانيد، واصل در فتاویٰ صحابہ و تابعین پر مشتمل جو کتابیں ہیں ان کتابوں
 میں یہ کتاب سب سے زیادہ ضرورت جس کتاب کی ہے۔ صرف مصنف
 ابن ابی شیبہ ہے۔

اور صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ چونکہ کوفہ میں بھی گئی ہے اس لیے اس میں فتاویٰ ائمہ
 کبار کو سمجھ کر بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے تاکہ مصنف نے ان کتاب میں اپنے خیال کے مطابق
 بے مشعل باب امام ابو حنیفہ کے رو میں ہی لکھا ہے انہوں نے یہ ہے۔
 هذا ما خالف به ابي حنيفة اذ اذى جاء عن رسول الله
 صلى الله عليه وسلم

اس میں ایک سو پچیس مسائل لکھے ہیں اور اس پر حیران نہ ہونا چاہیے کیونکہ اجتہاد میں مسائل
 مختلف ہوتے ہیں اور ہر فرقہ کو دوسرے کے مسائل پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ اگر فن میں
 اور تنقید کے حق پر تو حرجن قائم کر دیا جائے تو فن کبھی بڑی نہیں رہتا۔ زمانہ سلف میں
 امر نے یہ دوسرے کے مسائل پر اپنے علم کے مطابق تنقید کی ہے۔ تنقید تلمذ اور ثواب
 و ثنائی نہیں ہے۔ امام ابن بن سعد نے امام مالک کے شریعت ایسے شمار کیے ہیں جو سب
 سب ماجرا عن رسول اللہ کے خلاف تھے۔ انہوں نے ان کے منطلق امام مالک کو یاد دلا
 کہ ان کی چھانچہ حافظ بن عبد البر نے ان سے بڑی مشعل نقل کیا ہے کہ

احصيت على مالك بن انس سبعين مسألة كنها مخالفت
 لسنة النبي صلى الله عليه وسلم مما قال مالك فيها رأيي

میں نے مالک کے ستر مسئلے شمار کیے ہیں جو حضور کی سنت کے خلاف ہیں اور جو امام مالک نے محض رائے سے لکھے ہیں۔

امام مالک کے نام لیث بن سعد کا وہ خط پڑھیے جو حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین کی تیسری جلد میں پورا نقل کر دیا ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ سلف میں تنقید کا معیار کتنا بلند تھا لیکن بات کو پورے واشگاف انداز میں پیش کرتے اور دایمانِ ادب و احترام کو ہاتھ نہ لگاتے۔ میں یہاں اس خط کے چند اقتباسات ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

اس موضوع پر کہ عملِ اہلِ مدینہ حجت ہے آپ نے جو قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے والسابقون الاولون من المهاجرین... الخ تو اس کے بائے میں عرض ہے کہ ان سابقین اولین کی اکثریت جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر مدینہ چھوڑ کر دوسرے مقامات پر گئی۔ فوج میں داخل ہو کر یہ لوگ مختلف شہروں میں پہنچے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ انہوں نے لوگوں کے روبرو کتاب و سنت کو بلا کم و کاست پیش کیا اور اس میں کوئی بات راز بنا کر نہیں رکھی ہے ہر فوج اور لشکر میں ایسا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا تھا جو دانتے کتاب و سنت تھا اور ضرورت پڑنے پر ان مسائل میں اجتہاد کرتا تھا جو قرآن و سنت میں منصوص نہیں ہیں ان کے سامنے ابوبکر، عمر، عثمان تھے جن کو مسلمانوں نے مقامِ قیادت دیا تھا یہ ہر سہ بزرگ مسلمان فوجیوں سے بے خبر نہ تھے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے میں بھی دین قائم کرنے کی خاطر اور کتاب و سنت میں اختلاف سے بچانے کے لیے فوجیوں سے لگاتار خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے تھے ہر ایسی بات جس کا قرآن کی تفسیر سے سنت کی تشریح اور ان کے فیصلوں سے تعلق ہوتا وہ ان فوجیوں کو بتاتے اور سکھلاتے لہذا اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش آجاتے جس پر حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے مصر، شام اور عراق میں زمانہ ابوبکر، عمر اور عثمان میں عمل کیا ہو اور اس پر عمل کرتے ہوئے وہ دنیا سے رحلت فرمائے وایقا

ہو گئے ہوں تو بعد میں آج کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ عمل کا کوئی ایسا پیمانہ بنائے جس کی دین کی زندگی میں ان بزرگوں سے عملی تائید نہ ہو۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

آپ کو بارش والی رات میں دو نمازوں کے جمع کرنے پر میری گرفت معلوم ہوئی ہے یقیناً میں نے اس پر گرفت کی ہے۔ شام میں نسبت مدینہ کے بارش زیادہ ہوتی ہے مگر یہاں آنے والے صحابہ میں کبھی کسی نے یہ کام نہیں کیا درآں حالیکہ ان میں ابو عبیدہ، خالد بن الولید، بزرہ بن ابی سفیان، عمرو بن العاص اور معاذ بن جبل جیسے اجلہ صحابہ تھے۔ مصر میں ابو ذر، الزبیر بن العوام اور سعد بن وقاص فروکش تھے۔ حمص میں ستر بدری تھے۔ عراق میں عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن الیمان، عمران بن الحصین، علی مرتضیٰ اور ان کے بے شمار رفقاء تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے مغرب اور عشاء کو جمع نہیں کیا ہے۔

یہ نمونہ ہے اس دور میں ان بزرگوں کی آزادانہ تنقید کا جس سے استنباط و اجتہاد کے فن میں باغ و بہار آئی ہے اور اس درجہ اوج کمال پر پہنچ گیا کہ زندگی کے ہر مسئلہ کا حل وہ شریعت کی روشنی میں تلاش کر لیتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یگانے تو یگانے پیگاتے بھی بول پڑے کہ :

دور تابعین میں فقہاء اس کے جو یا بہتے تھے کہ دنیوی مسائل ہوں یا دینی اعمال و اقوال نبوت میں نبوت کا منشا معلوم ہوا اور منشا نبوت معلوم کرنے کا ان کے پاس صحابہ کی زندگی کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا صحابہ سے میری مزدود لوگ ہیں جو حضور انور کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ کے اعمال دیکھے اور کانوں سے ارشادات سنے اس دور میں جو شخص اس روشنی سے جتنا زیادہ قریب تھا اتنا ہی اس کے فقہی نتائج زیادہ وسیع تھے یہ

یہ تو خیر ایک معاصر کی معاصر پر تنقید تھی خود امام شافعی جن کو امام مالک سے شرف تلمذ بھی

تب نہوں نے بھی امام مالک کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ ان کے بہت سے مسائل احادیث کے خلاف ہیں یہ کتاب آج بھی کتاب الام میں اختلاف مالک شافعی کے نام سے موجود ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی اپنی کتاب مراتب الدیانۃ میں لکھتے ہیں کہ مؤطا میں ستر سے اوپر ایسی حدیثیں ہیں کہ جن پر خود امام مالک نے عمل نہیں کیا۔^۱ اور بعض مغاربہ نے ایک مستقل کتاب میں ان مسائل کو جمع بھی کر دیا ہے کہ جن میں امام مالک کا عمل مؤطا کی احادیث کے صریحاً خلاف ہے چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

قد جمع بعض المغاربة کتاباً بما خالف فیہ المالیکیۃ نصوص المؤطا۔^۲

محمد بن عبد اللہ بن المحکم مالکی نے جو مصر کے مشہور فقیہ اور محدث تھے اور امام شافعی کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ امام شافعی کے رد میں کتاب لکھی ہے جس کا نام الرد علی الشافعی وما خالف فیہ الكتاب والسنۃ ہے۔^۳

امام ابو حنیفہ کی کتاب السیر پر امام اوزاعی نے تنقید کی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد قاضی ابو یوسف نے امام اوزاعی کی کتاب پر ناقذانہ نظر ڈالی ہے اس کا نام الرد علی السیر الاوزاعی ہے۔ امام شافعی کتاب الام میں اس کتاب کے راوی ہیں۔

ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں جو امام ابو حنیفہ پر ایک خاص باب میں تنقید کی تھی۔ علمائے اس پر بھی بھرپور تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان مسائل میں ابو حنیفہ کا مذہب حدیث کے موافق ہے۔ جن علمائے ابن ابی شیبہ پر اس موضوع میں تنقید کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ حافظ عبد القادر قرشی۔ ان کی کتاب کا نام الدر المنیفۃ فی الرد علی ابن ابی شیبہ فیما اور وہ علی ابی حنیفہ ہے۔

۲۔ حافظ زین الدین قاسم۔ ان کی کتاب کا نام الاجوبۃ المنیفۃ عن اعتراضات ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔^۴

۳۔ علامہ زاہد کوثری۔ ان کی کتاب کا نام التلک الطریفۃ فی التحدیث عن رواہ ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔

^۱ تدریب الراوی ص ۲۲۔ ^۲ تبجیل المنفقۃ ص ۴۴۔ ^۳ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۲۴۴

^۴ تعلیق لحظ الالنی ط ص ۱۵۸۔

صاحب کشف الظنون ملا کا تب چلیپی نے ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام الروی علی من رو علی ابی خلیفہ ہے۔

حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں رقمطراز ہیں کہ خود انہوں نے بھی ابن ابی شیبہ کے رو میں ایک مستقل کتاب لکھنی شروع کی تھی اور دس حدیثوں تک جواب بھی لکھ لیا تھا مگر بعد کو قلم روک لیا۔

لیکن اس تنقید و تبصرہ سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ

۱۔ ان ائمہ میں باہم اکرام نہیں ہے اور ان کی ناقذانہ تحریروں کا نشان ان کی باہم رنجش ہے۔

۲۔ معاذ اللہ تم معاذ اللہ یہ ائمہ حدیث کی مخالفت کرتے تھے۔

اگر ان باتوں میں سے ایک بات بھی ہوتی تو ان کی اُمت میں امامت کون مانتا؟ بات یہ ہے کہ یہ اجتہادی مسائل ہیں اور ان میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو روایت ایک کے نزدیک قابل قبول ہو وہ حتماً سب کے نزدیک قابل پذیرائی ہو کیونکہ حدیث کی صحت کا مستند منصوص نہیں بلکہ خود اجتہادی ہے ہو سکتا ہے کہ ایک کے علم کے مطابق اس کی سند میں کوئی کمزوری ہو یا پھر اس کے ذہن میں اس کا محمل اور مصداق اور ہو۔ اس موقف پر حافظ ابن عبد البر کیسی پتے کی بات فرماتے ہیں۔

علمائے اُمت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ ایک حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت مانتے ہوئے بلا وجہ رد کر دے۔ یا تو وہ اس حدیث کے نسخ کا دعویٰ کرتا ہے یا اجماع کی تائید کا اعلان کرتا یا اس کا کوئی ایسا محمل تجویز کرتا ہے جس کا اس کے اصول پر ماننا ضروری ہے یا پھر حدیث کی روایتی حیثیت کو وہ مشکوک سمجھتا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے اور پھر وہ حدیث کو رد کرتا ہے تو اس کا امام ہونا تو درکنار اس کی توعدا لیت بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

بہر حال مصنف بہت اونچے درجے کی کتاب ہے اس کے مصنف امام ابو جعفر بن ابی شیبہ ^{۲۳۵} کو فہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے اساتذہ ہیں حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق شریک القاضی، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن المبارک اور جریر بن عبد الحمید ہیں۔ اور حافظ ابن حجر نے ان کے ساتھ ہشیم بن بشیر اور ابو جعفر بن عیاش، ابو اسامہ، ابو معاویہ، وکیع بن الجراح، محمد بن فضیل اور یزید بن ہارون کا اضافہ فرمایا ہے۔ حافظ ذہبی نے سفیان بن عیینہ کو چھوڑ کر سب ہی کو امام اعظم کے

تذکرہ حدیث میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری نے ابن ابی شیبہ سے تیس حدیثیں اور امام مسلم نے ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس حدیثیں روایت کی ہیں۔

آپ اس سے امام عظیم کی جدالتِ قدر کا اندازہ لگائیے یہ ادنیٰ سے ادنیٰ مثال ہے کہ تمام دوڑن علم حدیث اسی گھر کے خوشہ چین ہیں۔

تیسری صدی میں صحاح کی تدوین

صحاح سے مراد وہ کتابیں ہیں جن کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام کیا ہے،

کتب التزم اھلھا الصحتہ فیھا

تیسری صدی میں صحاح کے نام سے جو کتابیں منصہ شہود پر آئی ہیں وہ چھ ہیں صحیح امام بخاری ^{۲۵۷ھ}، صحیح امام مسلم ^{۲۶۱ھ}، جامع ترمذی ^{۲۷۹ھ}، سنن ابی داؤد ^{۲۷۵ھ}، سنن ابی ماجہ ^{۲۷۹ھ}، سنن نسائی ^{۳۰۳ھ}۔ چونکہ صحاح کے نام سے یہ چھ کتابیں مشہور ہیں اس لیے ہم نے ان ہی کو صحاح ستہ لکھا ہے ورنہ حافظ ابن مندہ نے مخرجین صحاح میں صرف امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد اور امام نسائی کو شمار کیا ہے اور بجائے ستہ کے صحیح اربعہ کہا ہے۔ بعد کو حافظ ابوطاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چار کتابوں کے ساتھ شمار کر کے تصریح کی ہے کہ ان پانچ کی صحت پر مشرق اور مغرب کے علماء کا اتفاق ہے لیکن حافظ عراقی نے ان لوگوں پر بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے جو ترمذی، ابو داؤد جیسی کتابوں پر صحیح بولتے ہیں فرماتے ہیں:

و من عبھا اطلق الصحھا فقد قتلھا صریحاً۔

حافظ ابن الصلاح اور علامہ نووی نے قابلِ اعتماد کتابوں کے سلسلے میں صرف پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات کا ذکر کیا ہے اور امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حافظ سخاوی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

ابن ماجہ ان مقاصد سے خالی ہے جن پر مصنفین کتب خمسہ نے توجہ دی ہے

اور جن پر تذکرہ وغور سے محدث کو مشتق ہوتی ہے خاص طور پر جبکہ اس میں نہایت ضعیف بلکہ منکر حدیثیں بھی موجود ہیں۔

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابن ماجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :
ابو عبد اللہ بن ماجہ کی کتاب بہترین ہے کاش اس میں تھوڑی احادیث
وایسی نہ ہوتیں۔

اور خود امام ابن ماجہ کی زبانی حافظ ابو زرہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے :-

میں نے اس کتاب کو حافظ ابو زرہ کی خدمت میں لیجا کر پیش کیا تو فرمایا کہ
میرے خیال میں اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو یہ جوامع یا
ان میں سے اکثر بیکار ہو جائیں گے پھر فرمایا شاید اس میں تیس حدیثیں بھی
ایسی نہ ہوں جن کی اسناد میں ضعف ہو۔

حافظ ذہبی نے حافظ ابو زرہ کی رائے کو تذکرہ میں اگرچہ بلا تبصرہ نقل کیا ہے لیکن سیر اعلام النبلاء
کے حوالہ سے علامہ بیانی لکھتے ہیں کہ :

ابو زرہ کا یہ بیان کہ شاید اس میں تیس حدیثیں بھی ایسی نہ ہوں جن کی سند
ضعیف ہو اگر صحیح ہے تو ان کی مراد ان تیس حدیثوں سے نہایت گری ہوئی
اور ساقط قسم کی روایتیں ہیں ورنہ ناقابل احتجاج روایات کا تو اس میں
ایک ذخیرہ ہے۔ شاید ان کی تعداد ہزار کے قریب ہو۔

غالباً ان ہی تیس حدیثوں کو حافظ ذہبی نے تاریخ میں سنن ابن ماجہ کے ذکر میں قبیل سے تعبیر کیا ہے
فرماتے ہیں :

انما غرض من رتبہ سنتہ ما فیہا من المناکیر و قلیل من الموضوعات
سنن ابن ماجہ کو اپنے مرتبہ میں کمتر بنانے والی منکر روایات اور تھوڑی سی
احادیث موضوعہ ہیں۔

اور یہی وہ تیس حدیثیں ہیں جن کو مشہور محدث ابن الجوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے

۱۔ فتح المغیث ص ۴۷ - ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۹ - ۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۹
۴۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۳۲۳ -

یادیکر محدثین نے ان میں سے بعض کے موضوع ہونے کی قہ یہ کہی ہے۔

یہ سب گفتگو اس منہ و خضہ سے ہے کہ روایتی طور پر حافظ ابو زرعہ کا یہ بیان ثابت ہو رہا ہے حافظ سیوطی حافظ ابو زرعہ کے اس بیان کو تاریخی طور پر صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔
ابن طاہر نے ابو زرعہ سے جو یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو دیکھ کر فرمایا کہ شاید اس میں پوری تیس حدیثیں بھی ایسی نہیں جن میں صنف ہو یہ حکایت درست نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے اور اگر یہ روایت محفوظ ہے تو شاید انہوں نے انتہائی ساقط روایات کو مراد لیا ہے یا پھر کتاب کا صرف ایک ہی حصہ دیکھا ہے جس میں ان کو اسی قدر مل سکا اور یہ واقعہ ہے کہ ابو زرعہ نے اس کی بہت سی حدیثوں کے متعلق باطل یا ساقط یا منکر ہونے کا فیصلہ کیا ہے جو اس ابی حاتم کی عدل میں ہیں۔

لیکن اس کے باوجود منہ ثرین نے سنن ابن ماجہ کو صحیح سند میں شمار کر دیا اور بقول شاہ عبدالحق اس کتاب کو شامل کر کے ان کتابوں کو اصولی کتب سنن صحاح سنن بولا جاتے شمار۔

ابن ماجہ، سنن دارمی یا منوطا صحیح سند میں شمار

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے سنن ابن ماجہ کو منہ ثر کے مقابل جگہ دی وہ حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر منہ ثر ہے۔ ان جنہوں سے منہ ثر نے اس کتاب کے نام سے کتاب تصنیف کی اور اس میں منہ ثر کے ساتھ ابن ماجہ کی حدیث کی سند اور ایک روایت کتاب میں ان کتب سنن کے اطراف کو جمع کیا۔ بعد کو تمام معتمدین نے ان کی سنن اتفاق کیا حافظ سیوطی لکھتے ہیں۔

فتا بعد اصحاب الاطراف والرجال۔

حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث ابن بن معاد یہ عبد بن ماجہ کی حدیثوں کے نام سے اپنی کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کی جگہ منوطا نام کا نام لکھا ہے حافظ عبدالحق

مقدس سنی سند نے الاکمال فی اسماء الرجال میں کتب خمسہ کے ساتھ ابن ماجہ کے رجال کو یک جا مرتب کیا ہے۔

اس بنا پر بعد کے علماء میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ صحاح میں کتب خمسہ کے سوا چھٹی کتاب موطا ہے یا ابن ماجہ؟

علامہ ابن الاثیر نے اپنی مشہور کتاب جامع الاسول میں محدث رزین ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے اور اسی لیے اس کتاب میں ابن ماجہ کے حوالہ سے کوئی روایت درج نہیں ہے۔ اسی طرح حافظ ابو جعفر بن زبیر غناطی کی تصریح ہے کہ:

جو کچھ بتایا گیا ہے ان سب میں اول وہ کتابیں ہیں کہ جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ وہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں اور مرتبہ میں ان سے کم نہیں ہے۔

اور علامہ عبدالغنی نابلسی اپنی مشہور کتاب ذخائر الموارث فی الدلالة علی مواضع الحدیث کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

صحاح میں چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے اہل مشرق کے نزدیک تو ابن ماجہ ہے اور اہل مغرب کے نزدیک موطا ہے۔

لیکن عام متاخرین کا فیصلہ ابن ماجہ کے حق میں ہے محدث ابوالحسن سندھی لکھتے ہیں:

غالب المتاخرین علی انہ سادس السنہ

حافظ سخاوی نے ابن ماجہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس میں بہت سی زائد حدیثوں کی وجہ سے افادیت پیدا ہو گئی ہے ورنہ صحت اور قوت روایات کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ تو کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ کچھ علماء کی رائے میں ابن ماجہ کی جگہ سنن دارمی کو صحاح میں چھٹی کتاب ہونے کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی نے کچھ لوگوں کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ:

بجائے سنن ابن ماجہ کے مناسب یہ ہے کہ دارمی کی کتاب کو چھٹی قرار دیا

جائے کیونکہ اس میں ضعیف راوی کم اور منکر و شاذ حدیثیں نادر ہیں۔

اور اگرچہ اس میں احادیثِ مسلمہ و موقوفہ موجود ہیں تاہم وہ سنن ابن ماجہ سے زیادہ بہتر ہے یہ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس کی تصنیف کی ہے چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں :
شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے بلکہ اس کو اگر کتبِ خمسہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ابن ماجہ کی نسبت یہ زیادہ اچھا ہے کیونکہ وہ سنن ابن ماجہ سے کہیں بڑھ کر ہے بلکہ
لیکن اس تصریح کے باوجود حافظ ابن حجر کا عمل اس کے خلاف ہے چنانچہ محدث محمد بن اسماعیل ایما فی لکھتے ہیں :-

صحاحِ خمسہ کے ساتھ مؤطا بھی ہے جیسا کہ جامع الاصول میں ابن الاثیر نے
کہا اور کچھ لوگوں نے اس کی جگہ ابن ماجہ کو لکھا ہے اسی کے پیش نظر حافظ
ابو الحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں رجال کی ترتیب قائم کی ہے اور
اسی راہ کو اس کتاب کے اختصار میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب
میں اور علامہ خنزرجی نے خلاصہ میں اختیار کیا ہے بلکہ

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تیسری صدی میں یہ چھ کتابیں صحاح کے نام سے منصفہ شہود پر آتی
ہیں۔ آئیے سرسہ خالص محدثانہ نقطہ نظر سے ان کتابوں کے بارے میں محدثین کی کچھ آراء بھی پڑھ لیجئے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم

مسند کے ذریعے جب حدیث کا تمام ذخیرہ یکجا ہو گیا اور احادیث کے سمیٹنے کا کام پورا ہو گیا
تو اس دور کے محدثین نے اس ذخیرے سے انتخاب و اختصار کے لیے قدم اٹھایا اور صحاح کی تدوین
عمل میں آئی۔ حافظ ابو بکر محمد بن موسیٰ الحازمی نے ابراہیم بن معقل نسفی کے حوالہ سے خود امام بخاری
کی زبانی بتایا ہے کہ :

میں بیک روز اسحاق بن راہویہ کے پاس تھا وہاں ہمارے احباب ہیں سے
کسی نے کہا کہ کاش تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن پر مشتمل کوئی مختصر

تیار کرتے یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے حدیث کا ایک مختصر جمع کرنا شروع کر دیا۔

صرف اختصار ہی نہیں بلکہ اس میں صحیح احادیث کے انتخاب کا بھی پورا اہتمام فرمایا چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ :

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب الجامع میں صرف وہی حدیثیں جمع کی ہیں جو صحیح ہیں اور بہت سی صحیح حدیثوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے یہ امام مسلم نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور احادیث کی صحت کے بارے میں صرف اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں جمع کیں کہ جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اجماع تھا چنانچہ ان کا بیان ہے :

لیس کل شیء عندی صحیح وضعہ ہمنا، نعم وضعہ ہمنا ما اجمعوا علیہ^۳

۱۔ شروط الامة الخمسة ص ۵۱۔ ۲۔ مقدمہ فتح الباری ص ۵۔ ۳۔ صحیح مسلم میں جس موقع پر امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ بات فرمائی ہے وہ یہی گوش گزار فرماتے۔ امام مسلم نے باب النشید میں اپنے مشائخ سعید بن منصور، قتیبہ بن سعید، ابو کامل محمد بن عبد الملک کے حوالہ سے یہ سند ابو عوانہ از یونس بن جبیر از حطان بن عبد اللہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی ایک طویل حدیث پیش فرمائی ہے اور پھر اسی حدیث کے بارے میں بتایا ہے کہ مجھے یہ حدیث ان تین طریقوں سے بھی ملی ہے۔ اول ابو بکر از ابو اسامہ از سعید بن ابی عروبہ۔ دوم ابو خسان السبعی از معاذ بن ہشام از ہشام۔ سوم اسحاق بن ابراہیم از جریر از سلیمان۔ ان تینوں طریقوں کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ کل ہذا عن قتادہ یعنی یہ سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ ہم سے قتادہ نے بیان کیا ہے لیکن ان تینوں طریقوں میں سلیمان نے قتادہ کے حوالہ سے اس حدیث میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اذا قرأ فانصتوا اور پوری روایت اسی طرح ہے کہ امام مسلم فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق بن ابراہیم نے بیان کیا ہے کہ ہم سے جریر نے بتایا وہ سلیمان تیمی سے روایت کرتے ہیں، وہ قتادہ سے قتادہ یونس بن جبیر سے اور وہ حطان بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا اور کہ نماز سے پہلے صفوں کو سیدھا کر لو پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے جب وہ تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم چپ رہو اور جب وہ غیر المفضوب علیہم وہ الضالین کہے تو تم

(بقیہ صفحہ ۴۵۴ پر)

حافظ ابن الصلاح، حافظ جلال الدین سیوطی اور علامہ الجزائری نے تصریح کی ہے کہ امام مسلم کی مراد ما اجمعوا علیہ سے یہ ائمہ حدیث ہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام عثمان بن ابی شیبہ اور امام سعید بن منصور خراسانی نے حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے ساتھ امام علی بن المدینی کا بھی اضافہ فرمایا ہے اور حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم صحیح کہہ دیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر اور حقیقت میں بالکل یقینی ہے۔

امام مسلم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ جب کتاب مکمل ہو گئی تو حافظ ابو زرعہ رازی کی خدمت میں لے جا کر پیش کی جو اس دور میں علل احادیث اور فن جرح و تعدیل کے مسلم امام تھے اور جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا اسے کتاب سے خارج کر دیا۔ بالآخر پوری پندرہ سالہ محنتوں اور تقریر یوں کے بعد احادیث صحیحہ کا یہ مجموعہ عوام کے سامنے آیا۔ اس کے بارے میں خود امام مسلم کا یہ دعویٰ ہے :

میں نے تین لاکھ احادیث سے یہ کتاب تالیف کی ہے اگر تمام سوائے زمین

۴۵۴ کا بقیہ جاشیہ) آئین کہو صحیح مسلم جلد اول ص ۱۱۴) اس موقع پر امام مسلم سے ان کے ایک شاگرد ابو بکر نامی نے دریافت کیا کہ سلیمان کی روایت میں یہ اضافہ ہے۔ امام مسلم نے جواب دیا کہ سلیمان حفظ و ضبط میں کامل ہیں پھر ابو بکر نے پوچھا کہ اچھا یہ تو ابو موسیٰ اشعری کی حدیث ہے لیکن آپ، حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں اد افراد فاضلوا آیا ہے۔ امام مسلم نے جواب میں فرمایا کہ ہو عندی صحیح وہ بھی میرے نزدیک صحیح ہے پھر سوال کیا گیا کہ اگر وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو اسے آپ نے اپنی کتاب میں یہاں کیوں درج نہیں فرمایا جواب میں وہ بات ارشاد فرمائی جو ہم نے کتاب میں درج کی ہے یس کل شیئ عندی... الخ یعنی میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے اپنی صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے صرف وہ روایات درج کی ہیں جن پر محدثین کا اجماع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی وہ حدیث جو صحیح مسلم میں بالسد موجود ہے امام مسلم کے نزدیک ہی نہیں بلکہ ان سب محدثین کے نزدیک صحیح ہے جن کے اتفاق کو امام مسلم اپنی صحیح میں اپناتے ہیں۔

۱۔ مقدمہ ابن الصلاح ص ۸، تدریب الراوی ص ۲۸، توجیہ النظر ص ۲۴۰۔ ۲۔ مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۳۔ ۳۔ غایتہ المامول ص ۶۔ اس لحاظ سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اس زیادتی والی حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ ۴۔ المحطہ میں مکی بن عبدان کے حوالہ سے امام مسلم کا یہ بیان سجاوہ خلیب بغدادی نقل کیا ہے دیکھو ص ۹۸۔

کے باشندے دوسو سال تک بھی حدیث کی کتابت کا کام کریں گے پھر بھی ان کا مدار اور سہارا یہی کتاب ہے گی۔ میں نے جو کچھ درج کیا ہے وہ دلیل کی بنی تلی ترازو بر رکھ کر کیا ہے اور جو درج نہیں کیا ہے وہ بھی کسی دلیل ہی کے سہارے نہیں کیا ہے یہ

حافظ مسلم بن قاسم قرطبی نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے بارے میں لکھا ہے کہ
لم یضغ فی الاسلام احد مثله

اسلام میں اس جیسی تصنیف کوئی نہیں ہے
اہل علم ان دونوں کو صحیحین اور ان کے مصنفوں کو شیخین کہتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک صحیحین کا مقام

امام بخاری کی صحیح اور امام مسلم کی صحیح کی صحت میں تو اہل علم میں کبھی دو رائیں نہیں ہونیں لیکن یہ بات ہمیشہ سے علماء میں بحث و نظر کا موضوع رہی ہے کہ ان بزرگوں کے یہاں صحت کا معیار کیا ہے
امام نروعی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ صحیح صرف یہ دونوں کتابیں ہیں اور ائمہ نے ان کو شرف قبول سے نوازا ہے اور امام بخاری کی صحیح بمقابلہ امام مسلم کی صحیح کے زیادہ صحیح ہے اور اس میں زیادہ فائدے ہیں یہ

حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

وہ صفات جن پر صحت کا مدار ہے بخاری میں مسلم سے زیادہ ہیں اور بخاری کی شرطیں مسلم کی شرطوں سے زیادہ قوت والی اور زیادہ سخت ہیں یہ

اس پر تفصیلی گفتگو آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے کہ ان دونوں میں زیادہ صحیح کون سی ہے اور اس موضوع پر مختلف علماء کے کیا خیالات ہیں۔

الغرض اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتابیں صحت کے لحاظ سے تمام کتابوں سے

دریچہ میں چنانچہ امیر یافانی فرماتے ہیں :

قد اتفق الكل على انهما اصح الكتب
ان دونوں کے اصح المکتب ہونے پر اتفاق ہے ۔

صحیحین میں صحت کا معیار

یہاں پہنچ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دعویٰ اتفاقی کی کہ یہ دونوں کتابیں تمام حدیث کی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہیں بنیاد کیا ہے ؟ آخر وہ معیار کیا ہے جس کی وجہ سے از روئے صحت ان کو دوسری تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے ۔

ہماری معلومات کے مطابق اب تک اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تین باتیں ہیں :

ایک یہ کہ ان کتابوں کی سب سے برتر ہونے کی وجہ خود ان بزرگوں کا التزام صحت ہے

دوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کی وجہ ان بزرگوں کی قائم کردہ شرطیں ہیں

سوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کا دار و مدار دراصل اس پر ہے کہ ان دونوں کتابوں کو پوری امت کی جانب سے شرف قبول حاصل ہے ۔

بات اگرچہ طویل ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے اس سلسلے میں کچھ مفید باتیں پیش کریں ۔

التزام صحت اور اس کا مطلب

التزام صحت کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان دونوں کتابوں کے مؤلفین کا اعلان ہے کہ ان کی حدیثیں صحیح ہیں ۔ ہم نے اپنی کتابوں میں صحیح حدیثیں درج کی ہیں ۔ تو یہ اپنی جگہ درست ہے کیونکہ ان دونوں بزرگوں کی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں اور یقیناً مدعیان صحت کا یہی مقصود ہے چنانچہ امام یافانی لکھتے ہیں :

فالاولی عندی فی الاستدلال علی تقدم الصحیحین اخبار مؤلفیہما

بان احادیثہما صحیحة

میرے نزدیک صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کے مؤلفین نے پتہ دیا ہے کہ ان کی احادیث صحیح ہیں ۔

اور احادیث کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ
 رواہ هذه الاحادیث عدول ضابطون ولا شذوذ فیہا ولا علت
 بلاشبہ اگر ان کتابوں کے مؤلفین کے اس دعوے پر ان کتابوں کی صحیحیت کا مدار ہے۔ تو یہ
 شرف یقیناً ان کتابوں کو حاصل ہے۔

بخاری و مسلم کی شرطیں

اگر ان کتابوں کی صحیحیت کی علت ان کتابوں کے مؤلفین کی پیش کردہ شرائط ہیں تو ہمیں افسوس
 سے کہنا پڑتا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی شرائط کو نہ تو کہیں بیان کیا ہے اور نہ ہی اس موضوع پر
 ان سے کوئی علمی سرمایہ منقول ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ متاخرین نے خود ہی چند شرطیں ان کی
 کتابوں کو دیکھ کر مقرر کر لی ہیں۔ بعد ازیں دوسری کتابوں میں آمدہ حدیثوں کو اپنی بنائی ہوئی ان
 شرطوں پر تول تول دیکھنے لگے۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں۔

اعلم ان البخاری لم یوجد عندہ تصریح بشرط معین وانما
 اخذ ذلک من تسمیۃ الكتاب والاستقرار من تصرفہ

علامہ امیر محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا تذکرہ
 کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اعلم انه لم ينقل عن الشيخين شرط شرطاً معيناً
 تتبع العلماء الباحثون عن اسالیبهما طریقتهما حتی تحصل
 لہما ما ظنوا شرطاً لہما۔

شیخین سے ایسی کوئی شرط منقول نہیں ہے صرف علماء نے ان کے
 اسلوب و طریق سے تلاش کر کے اپنے خیال کے مطابق شرطیں
 بنالی ہیں۔

حتیٰ کہ امام نووی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ
 علی شرط الشیخین کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے جال سندان شیخین کی کتابوں

میں آئے ہوئے رجال پر مشتمل ہوں کیونکہ ان کی اپنی کتابوں میں اور کوئی
شرط نہیں ہے بلکہ

اور چونکہ مسئلہ شرائط پر ان بزرگوں سے خود کوئی تصریحی بیان منقول نہیں ہے بلکہ بعد میں
آئے والوں کی تلاش و جستجو کی رہنمائی میں اس لیے ان شرائط کی تعیین و تقدیر میں اختلاف
پیدا ہو گیا ہے :

اختلفوا فی اختلاف افہامہم
آئیے اس موضوع پر مختلف علماء کی قیمتی آراء معلوم کر لیتے۔ محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں
شرط البخاری و مسلم ان یخرجوا الحدیث المجمع علی ثقتہ نقلتہ
الی الصحابی -

بخاری اور مسلم کی شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ان راویوں سے روایت کرنے
میں جن کی ثقاہت اتفاقاً ہو جائے

لیکن راویوں کی ثقاہت پر اتفاق کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ حافظ زین الدین کو ابن
طاہر کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابن طاہر کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ امام
نسائی نے ایسے بہت راویوں کی تصنیف کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے بلکہ حافظ محمد بن
ابراہیم الوزیری نے ایک قدم اور بڑھا کر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ :

صرف نسائی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں ایک سے زیادہ
دوسرے ائمہ جرح و تعدیل امام نسائی کے ہم زبان ہیں -

اگرچہ علامہ وزیر نے یہ کہہ کر کہ

لکنہ تصنیف مطلق غیر صیین السبب

حافظ عراقی کی بات کو بے وزن بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مشہور محدث امیر میانی نے مات
کو واضح کر کے پیش کیا اور حافظ ابراہیم کی تردید کر دی چنانچہ امیر موصوف فرماتے ہیں ،
صحیحین کے راویوں میں سے جن پر جرح ہوتی ہے ان میں ہر ایک پر جرح
مطلق ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جن پر

بھر پور اور مکمل جرح کی گئی ہے کچھ ایسے ہیں جن کو مرحبہ کہا گیا ہے مثلاً ایوب بن عائد بخاری و مسلم کے راویوں میں ہیں ابو داؤد اور نسائی نے ان کو مرحبہ قرار دیا ہے۔ کچھ کو نا صبی بتایا گیا ہے جیسے ثور بن یزید بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ جریر بن عثمان بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ فلاس مشہور ناقد رجال نے بتایا ہے کہ یہ حضرت علی سے بغض رکھتے تھے۔ خالد قسوطانی بھی بخاری کے راویوں میں ہیں مگر ابن سعد کی رائے میں غالی شیعہ تھے۔ علامہ حازمی نے اس موضوع پر شروط الامۃ الخمسہ کے نام سے کتاب لکھی ہے اور اس میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی اور امام نسائی کی شرائط پر تبصرہ کیا ہے۔ حافظ بلال لدین السیوطی نے اس کا خلاصہ یہ لکھا ہے کہ:

شرط بخاری یہ ہے کہ ایسی حدیث روایت کی جائے جس کی سند متصل ہو، جس کے راویوں میں صرف ثقاہت اور اتقان ہی نہیں بلکہ انہوں نے جن سے وہ حدیث لی ہے ان کے ملازم صحبت بھی ہوں اور صحبت بھی طویل ہو لیکن امام بخاری کبھی ان لوگوں کی روایت بھی لے آتے ہیں جو ملازم صحبت نہ ہوں اور امام مسلم کی شرط یہ ہے کہ روایت طبقہ ثانیہ کی ہو اور کبھی کبھار ان سے بھی روایت لیتے ہیں جو ملازم نہ ہوں لیکن ان پر قدسے جرح بھی ہو گئی ہو۔

لیکن علامہ بیانی نے امام بخاری کے متعلق یہ کہہ کر حازمی کی بیان کردہ داستان کو مخدوش کر دیا ہے کہ:

هذا لا يوافق ما نقل عن البخاري من انه يشترط اللقاء ولو مرة -

حازمی کی بات کا امام بخاری کی یہ تصریح ساتھ نہیں دیتی ہے کہ روایت میں راوی کے لیے ملاقات شرط ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔ اور ایسے ہی امام مسلم کی طرف منسوب شرط کو بھی انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ

ان مسلمانوں کو شرائط اللقاء اصلاً کما صرح بہ فی مقدمۃ صحیحہ

امام مسلم ملاقات کو قطعاً شرط قرار نہیں دیتے ہیں

امام حاکم نے بخاری میں بخاری و مسلم کی یہ شرط بتائی ہے کہ

ایسی حدیث جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور صحابی روایت کرے

اور اس صحابی سے دو تابعی ثقہ روایت کریں۔ پھر ان سے ایسا کوئی شخص

جو حفظ و اتقان میں مشہور ہو اور اس کے طبقہ رابعہ میں روایت کرنے والے

ایک سے زیادہ راوی ہوں بعد ازیں بخاری و مسلم کے وہ شیوخ جو حفظ و

عدالت میں مشہور ہوں روایت کریں۔ یہ درجہ اول کی روایات ہیں

یہ شرط اگرچہ بے حد وزنی اور پر شوکت ہے لیکن علامہ ابن طاہر مقدسی نے اسے یہ کہہ کر بے جان بنا دیا ہے کہ،

ان الشیخین لم یشترا هذا الشرط ولا نقل عن واحد انہ

قال ذالمک والمحاکم قد رد هذا التقدير و شرط لهما هذا

الشرط علی ما ظن

شیخین نے نہ یہ شرط لگائی اور نہ ان میں سے کسی سے یہ منقول ہے حاکم

نے خود ہی اپنے گمان سے عمارت سازی کر لی ہے

اور امام حازمی نے حافظ ابو حاتم محمد بن حبان البستی سے اس پر جو تنقید نقل کی ہے وہ کافی

سخت اور سنگین ہے۔ فرماتے ہیں،

احادیث سب اخبار آحاد ہیں۔ ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جو دو عادل

کی روایت کی قید سے آتی ہو اور پھر ہر ایک دوہی سے روایت کر کے

حضور انور تک پہنچی ہو جب یہ صورت ناممکن اور غلط ہے تو ثابت ہو

گیا کہ احادیث اخبار آحاد ہیں اور جو شخص اس قسم کی شرطیں عائد کرتا

ہے وہ تو دراصل اس راہ سے لوگوں کو ترک سنن کی دعوت دے رہا ہے

کیونکہ سنن تو ساری ہی اخبار آحاد ہیں

امام حازمی نے ابو حاتم کی اس تنقید کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے اور پھر خود بھی امام حاکم کے اس خیال کی اپنے انداز پر بھرپور تردید کی ہے۔ — بہر حال یہ شرائط چاہتے ہیں طاہر نے بتائی ہوں یا حاکم اور حازمی نے متاخرین کی بتائی ہوئی ہیں ورنہ صحیحین سے اس سلسلہ میں کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

انما هو تظن وتخمين من العلماء

بنانا یہ چاہتا ہوں کہ بخاری و مسلم کی کتابوں کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اصحیت کا دار و مدار شروط پر نہیں ہے۔

تلقی امت بالقبول اور صحیحین

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں صحیحین کی اصحیت کو ثابت کرنے کے وجوہ و دلائل جو بتائے جاتے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحیحین کو تلقی امت بالقبول کا شرف حاصل ہے صحیحین کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی حافظ ابن الصلاح کی قائم کردہ ہے انہوں نے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

الاتفاق الامت علی تلقی ما اتفقا علیہ بالقبول

صحیحین کے بارے میں یہ موقف ایسا ہے کہ اسے وجہ ترجیح ہونا چاہیے چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری رقمطراز ہیں:

والوجد فی هذا عند اهل الحديث هو تلقی الامت بالقبول ولا

شك الله وجه ترجیح۔

محدثین کے نزدیک اس کی علت تلقی امت بالقبول ہے اور یہ واقعی وجہ

ترجیح ہے

اگرچہ امام نووی نے اس مسئلہ پر حافظ ابن الصلاح کے خلاف بہت بڑا محاذ قائم کر لیا اور بتایا کہ تلقی امت بالقبول کسی چیز کی صحت میں برتر ہونے کی نہیں بلکہ وجوب عمل کی دلیل ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

تلقى امت بالقبول كافتة وجوب عمل ہے اور اس میں کوئی اختلاف

نہیں ہے کیونکہ وہ حدیثیں جو بخاری و مسلم سے باہر ہیں اگر ان کی اسناد صحیح ہوں تو ان پر ہی عمل واجب ہے اور مفید ظن ہیں یہی صحیحین کی پوزیشن ہے بلے

امیر میانی نے حافظ ابن الصلاح کے موقف پر دو سوال قائم کر کے صورتِ حال کو اور بھی سنگین بنا دیا۔

۱۔ تعلقِ اُمت بالقبول میں کیا اُمت کا ایک ایک فرد خاص و عام مراد ہے؟

۲۔ کیا تعلقِ اُمت سے یہ مراد ہے کہ پوری اُمت جانتی ہے کہ یہ کتابیں ان بزرگوں کی تصنیف ہیں یا یہ مراد ہے کہ اُمت کے ایک ایک فرد نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کو اپنا لیا ہے لیکن پوری بات ان کی زبانی سن لیجئے :

جو شخص یہ کہتا ہے کہ صحیحین کو تعلقِ اُمت بالقبول حاصل ہے اسے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ اس دعویٰ پر دو سوال ہوتے ہیں ایک یہ کہ اُمت سے کیا مراد ہے سب کے سب ہر خاص و عام یا صرف مجتہدین۔ ظاہر ہے کہ سب تو مراد نہیں ہیں یقیناً مجتہدین ہی مراد ہوں گے۔ اگر دعویٰ یہ ہے کہ اُمت کے تمام مجتہدین میں سے ایک ایک فرد نے عمل کی دنیا میں اپنا لیا ہے تو یہ خود محتاج دلیل ہے اور معلوم ہے کہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں۔ اس پر دلیل لانا ایسا ہی ہے جیسا کہ اجماع کے دعویٰ پر۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اجماع مدعی کا ذب ہے اور اگر زمانہ احمد میں صحیحین کے وجود پذیر ہونے سے پہلے یہ جھوٹ ہے تو پھر صحیحین کے لیے ان کی تالیف اور شہیر کے بعد اس قسم کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ علماء میں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کو صحیحین کا پتہ بھی نہ ہو گا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود تعلقِ بالقبول سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کہ لوگ مانتے ہیں کہ یہ دونوں کتابیں ان دونوں بزرگوں کا تالیفی کارنامہ ہیں۔ صرف اتنی بات تو کسی کتاب کی صحت کی

ضمانت کے لیے کافی نہیں ہے یا یہ تمام اُمت نے ان کتابوں کی تمام حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث کے بارے میں یہ مان لیا ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس دعویٰ کی صداقت سب احادیث کے بارے میں ناقابل تسلیم ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ امام نووی کی ہمنوائی اور حافظ ابن الصلاح کی مخالفت میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے :
صحیحین کے بارے میں تلمقی الامت بالقبول درست ہے لیکن یہ صحیحین کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ابو داؤد، ترمذی اور نسائی کو بھی یہ مقام حاصل ہے مگر اس کے باوجود ان کتابوں کی اصحیت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اگر اُمت سے پوری اُمت مراد ہے تو اس سے زیادہ کوئی غلط بات نہیں ہے کیونکہ ان کتابوں کی تحسین بخاری اور ائمہ مذاہب کے بعد منصفہ شہود پر آئی ہے اور اگر اُمت سے ساری اُمت نہیں بلکہ وہ حضرات مراد ہیں جو ان کتابوں کے مؤلفین کے بعد ہوئے ہیں تو یہ ساری اُمت نہیں ہے اور کچھ لوگوں کی تلمقی مفید مدعا نہیں ہے بلکہ

غالباً محمد بن اسماعیل بیانی کے اعتراض سے گلو خلاصی کے لیے متاخرین میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے تلمقی الامت بالقبول میں تھوڑی سی ترمیم کر کے تلمقی الامت بالقبول کا عنوان اختیار کیا ہے چنانچہ وہ الحظ فی ذکر الصحاح الستہ میں فرماتے ہیں :
و تلقاھما الامت بالقبول۔

اور اشکاف النبلاء المتقین میں لکھتے ہیں :

امت دین تلمقی کردہ اندازیں ہر دور بالقبول آگے

اور مولانا آزاد نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں ان سے بے پروا ہو کر لکھ دیا ہے کہ :
صحیحین کو ترجیح محض ان کی شروط کی بنا پر نہیں ہے بلکہ شہرت اور

۱۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۹۴ - ۲۔ توجیہ النظر ص ۱۳۱ - ۳۔ الحظ ص ۸۲

۴۔ اشکاف النبلاء ص ۴۸ -

قبول کی بنا پر ہے اور اس پر تمام اُمت کا اتفاق ہو گیا ہے۔

لیکن یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ مولانا نے اس دعویٰ پر کسی دلیل سے بحث نہیں فرمائی ہے اور محققین کو سب مدعیان تلقی سے یہی شکایت ہے کہ وہ نہ تو دعویٰ کی وضاحت کرتے ہیں اور نہ ان کے پاس دلائل کا سرمایہ ہے۔ عقیدت کیشتی کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے مگر سوال عقیدہ کا نہیں ہے بلکہ علم و نظر اور تحقیق کا ہے۔

بہر حال یہ بحث متاخرین محدثین کے یہاں طویل الذیل ہے اصلی بات وہی ہے جو اس میں امیر میانی نے توضیح الافکار میں فرمادی ہے کہ :

فلا دلی عندی فی الاستدلال علی تقدم الصیغین صواباً

مؤلفیہما بان احادیثہما صحیحۃ لہ

صحیح یہی ہے کہ صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ ان کے مؤلفین کا یہ کہنا ہے کہ ان کتابوں کی احادیث صحیح ہیں۔

اور اس بات کا مطلب کہ ان دونوں کتابوں کی احادیث صحیح ہیں یہ بھی علامہ میانی کی زبانی ہی سن لیجئے :-

امام بخاری کا یہ کہنا کہ یہ احادیث صحیح ہیں اس کہنے کے مترادف ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عادل اور ضابط ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی شذوذ اور کوئی علت نہیں ہے۔

اگر واقعہ یہی ہے کہ ان کتابوں کی صحت میں بالا ہونے کی وجہ صرف اتنی بات ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عدالت و ضبط کی صفات سے موصوف اور ان کی بیان کردہ روایات شذوذ اور علت کے داغ سے پاک ہیں اور اس کے علاوہ ان بزرگوں کی نہ قائم کردہ کوئی شرط ہے اور نہ اس کی وجہ تلقی بالقبول ہے تو پھر اصحیت کو ان کتابوں میں محدود کرنا اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ اس بنا پر کسی کتاب کو اصح کہنا کہ اس کے لکھنے والے بڑے بزرگ ہیں کوئی علمی اور تحقیقی بات نہیں ہے اس لیے حافظ ابن الہمام کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ :

یہ خواہ مخواہ کی اُپسج اور تقلید محض ہے کیونکہ اصحیت کا دار و مدار تو صرف

اس پر ہے کہ صحیحین کے راوی ان شرائط کے تحت ہیں جو ان کے مؤلفین کے پیش نظر ہیں۔ بالفرض اگر یہی شرطیں ان کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہوں اور اس کے راوی اسی معیار پر پورے اترتے ہوں تو پھر صحیحین کی حدیثوں کو اصح کہنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اور صرف یہ حافظ ابن الہمام کا ہی خیال نہیں ہے بلکہ اس میں اور بھی حافظ ابن الہمام کے ہم نوا ہیں۔ حافظ ابن الہمام کے شاگرد علامہ ابن امیر الحاج نے یہاں عجیب نکتہ لکھ دیا کہ: بخاری اور مسلم کا اصحیت میں مقابلہ بخاری اور مسلم کے بعد آنے والوں سے ہے۔ ان مجتہدین کی کتابوں سے ہرگز نہیں ہے جو امام بخاری اور امام مسلم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

ہے بھی یہ انصاف کی بات ورنہ بڑی ہی بے انصافی ہوگی کہ سلف مجتہدین کا مقابلہ بعد کے ان محدثین سے کیا جائے جو فضل و کمال، علم و اجتہاد اور تحقیق و تنقید میں ان کے برابر نہ تھے۔ شاید یہی چیز ہے جس نے حکیم الامت شاہ ولی اللہ کو کتب حدیث میں موطا کی اصحیت کے اعلان پر مجبور کر دیا۔ نواب علامہ صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

نزد شاه ولی اللہ محدث دہلوی ومن قال بقولہ اصح کتب در حدیث وفقہ موطا است پستر بخاری پستر مسلم۔

شاہ صاحب نے اس کے تزجیحی دلائل اور وجوہ نہایت شرح و بسط سے اپنی مشہور کتاب مصطفیٰ میں بیان فرماتے ہیں۔ اسی ضمن میں علامہ زاہد کوثری کا ایک بیان بڑا ہی معنی خیز ہے۔ جو انہوں نے شروط الامم الخمسہ کی تعلیقات میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخین ہوں یا اصحاب سنن سب کے سب حفاظ حدیث، باہم معاصر ہیں اور تدوین فقہ اسلامی کے بعد منصفہ شہود پر آتے ہیں اور حدیث کے ایک خاص حصہ پر اپنی توجہات کو مرکوز کیا ہے ان سے پہلے ائمہ مجتہدین کے سامنے حدیث کی ساری انواع مرفوع، موقوف، مرسل اور صحابہ و

تابعین کا وافر ذخیرہ تھا۔ کیونکہ نظر اجتہاد میں حدیث کی تمام انواع ہوتی ہیں چنانچہ اس دور کی جوامع اور مصنفات اس کی شاہد ہیں ان کی حدیث کی ساری قسمیں مذکور ہیں جن کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے اور ان جوامع کے مؤلفین ارباب صحاح ستہ سے پہلے ائمہ مجتہدین کے تلامذہ ہیں یا تلامذہ کے تلامذہ ہیں یہ

بہر حال امام بخاری کی کتاب جس کا پورا نام خود امام بخاری کا تجویز کردہ ”الجامع صحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنتہ و ایامہ“ ہے اپنے دور کی ایک بہترین جامع تصنیف ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امام موصوف نے جہاں احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے اس ساتھ اور جی بہت سے فوائد اور نوادر کی طرف اشارات فرمائے ہیں۔ انہوں نے فقہ کا بے شمار ذخیرہ تراجم میں پھیلایا ہے پھر اس کے مناسب آثار صحابہ اور احادیث مرفوعہ پیش کی ہیں تاکہ حدیث اور فقہ کا ربط نظر ہو جائے پھر ہر باب میں ان احکام کے مناسب قرآنی آیات تلاوت کی ہیں تاکہ فقہ کے تمام ابواب قرآن کریم میں اجمال نظر آجائیں اور ان کے مناسب احادیث دیکھ کر قرآن کی جامعیت کا پورا مشاہدہ ہو جائے اسی کے ساتھ قرآن اور حدیث کا ربط بھی معلوم ہو جائے اور اس طرح ایک ہی تصنیف منکرین فقہ اور منکرین حدیث دونوں کا جواب بن جائے۔ فقہ کو برا کہنے والے احادیث سے مسائل کے اشتباہ کا طریقہ سیکھ لیں اور حدیث کو قرآن کے خلاف کہنے والے قرآن میں احادیث کا ماخذ معلوم کر لیں حافظ ابن حزم فرماتے ہیں :

کل البواب الفقہ یس منها الادلہ اصل فی القرآن تعلیم
والحمد للہ حاشا القراض یہ

فقہ کے تمام موضوعات کے علاوہ قرآن میں اصل موجود ہے اس لحاظ سے گویا امام بخاری کی جامع ان تمام علوم و فنون کا مجموعہ بن کر آئی جو اس دور تک اسلاف کی محنتوں سے منصبہ و جوہر پرانے تھے۔ چنانچہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث فرماتے ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ امام بخاری دو سو سال بعد رونما ہوئے اور ان سے

پیشتر علماء علوم دینیہ میں مختلف فنون کی کتابیں تصنیف کر چکے تھے چنانچہ
امام مالک، سفیان ثوری نے فقہ میں اور ابن جریر نے تفسیر میں، ابو سعید
نے عرب قرآن میں اور محمد بن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ نے سیرت میں،
عبد اللہ بن المبارک نے زہد و مواعظ میں، کسائی نے بذر الخلق میں اور
یحییٰ بن معین نے صحابہ و تابعین کے حالات میں نیز متعدد علماء نے
فن رویا، ادب، طب، شتمائل، اصول حدیث، اصول فقہ اور رد مبتدعین
پر کتابیں تصنیف کی تھیں۔ امام بخاری نے ان تمام مدونہ و مروجہ علوم کا
ایک حصہ کر جس کو انہوں نے بصراحت یا بدلالة ان حدیثوں میں پایا جو
امام بخاری کی شرط پر تھیں اپنی کتاب میں درج کر دیا۔^۱
حافظ ابوبکر بن موسیٰ حازمی فرماتے ہیں کہ :

امام بخاری کا پیش ہند صرف یہ تھا کہ حدیث کا ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے
ہاتھ میں آجائے۔ تمام احادیث کا استیعاب ان کا مقصود نہ تھا ان کی شرط
صرف یہ تھی کہ جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہیں ان کو درج کریں کیونکہ
وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں صرف حدیثیں روایت کی ہیں۔^۲

امام بخاری سے اس کتاب کو اگرچہ نو ہزار لوگوں نے سنا تھا لیکن امام موصوف کے جن تلامذہ
سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا وہ چار بزرگ ہیں ۔

۱۔ ابراہیم بن معقل، ۲۔ حماد بن شاكر، ۳۔ محمد بن یوسف الفریری، ۴۔ ابوطیہ منصور بن محمد البرزوی۔
ان چار میں پہلے دو بزرگ ابراہیم اور حماد مشہور حنفی عالم ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے
شروع میں اپنا سلسلہ سند ان حضرات تک بیان کر دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ،
ومن طریق ابراہیم بن معقل بن الحجاج النسفی وکان من الحفاظ
وله تصانیف - ومن طریق حماد بن شاكر النسوی یہ

ان چاروں میں ابراہیم اور حماد کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ ان کو امام بخاری سے جامع کی
روایت کا سب سے پہلے موقع ملا ہے کیونکہ ابراہیم اور حماد کی وفات بالترتیب ۲۹۲ھ اور ۳۱۱ھ

^۱ مکتوبات شاہ ولی اللہ ص ۱۱۱ شہ شریط الاندلس ص ۴۴ - ۳۵ فتح الباری ج ۱۔

میں ہوئی جب فریری اور ابطلحہ کی وفات ۳۲۰ھ اور ۳۲۹ھ میں ہوئی ہے اور یہ تحقیق ہے کہ اگر یہ دونوں حنفی بزرگ امام بخاری کی کتاب کو ان سے روایت نہ کرتے تو جامع کی روایت کی ضمانت تنہا فریری پر رہ جاتی اور اس طرح روایتی نقطہ نظر سے صورت حال بڑی نازک ہو جاتی۔ علامہ کوثری نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

هذه البخاری لو لا ابراهیم بن معقل الحنفی وحماد بن شاکر الحنفیان

لکاد یفرد الفریری عنه فی جمیع الصحیح سماعاً

بالفاظ دیگر ۳۱۰ھ تک امام بخاری کی صحیح کا روایتی مرکز صرف احناف ہی تھے۔ بہر حال امام بخاری کی کتاب جیسا کہ امام ذہبی نے تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ کتب الاسلام میں ائمتہ اربعہ اور اسنادی نقطہ نظر سے لوگوں کے لیے علم کا بہترین سرمایہ ہے۔

صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں موازنہ

اس پر تو جیسا کہ آپ سن آئے ہیں سب ہی کا اتفاق ہے کہ صحیحین اپنے زمانے اور اپنے بعد کی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہیں چنانچہ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں :

لا ریب فی تقدیم الشیخین علی ائمتہ عصرهما و من بعدهما
فی معرفۃ الصحیح والعلل

اگر کچھ اختلاف ہے تو اس تقدیم کی علت اور بنیاد میں بے کچھ کی باتیں ہیں ان بزرگوں کا ان کتابوں میں التزام صحت ہے اور کچھ کے خیال میں اس کی علت ان بزرگوں کی قائم کردہ شرطیں ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ اس کی علت تلقی الامت بالقبول ہے۔ ان پر علماء کے مختلف خیالات آپ سن چکے ہیں۔ اصل بات سب کے یہاں تقریباً متفق علیہ ہے کہ صحیحین کا پایہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں بلند ہے۔ اس پر اتفاق کے بعد لبتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سے ازروئے صحت خالص محدثانہ نقطہ نظر سے کس کا مقام اونچا ہے ؟

حافظ بن حجر عسقلانی اور عام علماء صحیح بخاری کو ترجیح دیتے ہیں اور امام نووی نے صحت کے برہیلو کو سامنے رکھ کر اس کی تصویب کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحت کی عمدت جن دو ثبت اور

دو منفی ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے وہ تمامہ بخاری میں موجود ہیں۔ یعنی راویوں کی عدالت، اتصالِ سند کے ساتھ عدم تشذوذ اور عدم علتِ قاذرہ، عدالت و ضبط کے لحاظ سے بخاری کا مقام مسلم سے اونچا ہے۔ اتصال کے پیش نظر بھی بخاری کو برتری حاصل ہے کیونکہ بخاری کے نزدیک صرف معاصرت کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔ شاذ نہ ہونے اور علت نہ ہونے کی بنیاد پر بھی بخاری کا پٹرا بھاری ہے کیونکہ نقد و جرح میں بخاری کی روایات بہ نسبت روایات مسلم کے کم ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی اس کی بمنوائی کی ہے اور اس کو متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے لیکن اس کے برعکس مغاربہ کی رائے بجاتے بخاری کے مسلم کے حق میں ہے اور ان مغاربہ میں حافظ ابن حزم، حافظ ابو علی الحسین بن علی نیشاپوری وغیرہ داخل ہیں چنانچہ شیخ ابو محمد القاسم بن القاسم تجیبی نے اپنی فہرست میں امام ابن حزم ظاہری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صحیح مسلم کو امام بخاری کی کتاب پر ترجیح دیتے ہیں اور مشہور مالکی محدث قاضی عیاض نے الاماع میں ابو مردان طہنی سے نقل کیا ہے کہ میرے کچھ شیوخ صحیح مسلم کو ترجیح دیتے تھے۔ علامہ زرکشی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صرف کچھ کا نہیں بلکہ اکثر مغاربہ کا ہے چنانچہ امیر میانی فرماتے ہیں :

لا یخفی ان ما قالہ الزرکشی ان دائرۃ الخلاف اوسع والذاهبون
الی ترجیح مسلم اکثر ممن ذکر

بعض علمائے مغاربہ کے اس میلان کی وجوہ بھی قلم بند کی ہیں چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ امام ابو علی نیشاپوری نے صحیح مسلم کو بخاری پر جو فوقیت دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب خاص اپنے شہر میں اپنے اساتذہ کی موجودگی میں لکھی وہ بیان و تحریر اور الفاظ میں بے حد مختاط تھے۔ بخلاف امام بخاری کے کہ وہ اکثر احادیث کو صرف حافظ کی مدد سے لکھتے اور راویوں کے الفاظ میں امتیاز نہ کرتے اسی وجہ سے آپ کو شک ہو جاتا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سنی ہیں مگر ان کو شام میں پہنچ کر قلم بند کیا ہے۔

حافظ عسقلانی نے مغاربہ کے اس تاثر کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

میری رائے میں اس کا تعلق صحیح مسلم کی اصحیت سے نہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہیں ایک وجہ وہ ہے جو حافظ ابن حزم نے بتائی ہے کہ اس میں خطبہ کے بعد حدیث کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام بخاری روایت بالمعنی کے قائل ہیں۔ نیز وہ ایک حدیث کو کھڑے کر کے پیش کرنے کو درست سمجھتے ہیں۔ بر خلاف امام مسلم کے کہ وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے یہ کتاب ایک جگہ قیام کی حالت میں نہیں بلکہ سفر میں لکھی ہے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سُنی ہیں مگر لکھنے کی نوبت خراسان میں آتی ہے اس وجہ سے بسا اوقات حدیثیں صرف حافظ کے بھروسہ پر قلم بند کرتے اس لیے روایت باللفظ نہ ہوتی تھی بلکہ روایت میں تصرف کر کے اس کے مدلول و مدعا کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے تھے لیکن امام مسلم نے اپنی کتاب قیام کی حالت میں اپنے اساتذہ کے سامنے لکھی ہے وہ الفاظ میں بے حد محتاط اور روایت باللفظ کے پابند تھے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امام بخاری کی حمایت میں امام بخاری کے حامیوں کا لب و لہجہ ناگوار حد تک پہنچ گیا۔ چاہے تو یہ تھا کہ ان مغاربہ کی تنقیدات کا علمی اور تحقیقی جواب دیا جاتا لیکن ہوا یہ کہ امام مسلم اور امام ابو علی نیشاپوری تک پر نہایت رکیک الزام لگاتے اور ایسی زبان استعمال کی جو علمی زبان نہیں ہے اور نہ میدان تحقیق میں محققین کے شایانِ شان ہے چنانچہ حافظ ابو سعید العلانی کو جب امام مسلم کی برتری کے بارے میں امام ابو علی کے تاثرات معلوم ہوئے تو فرمایا کہ امام ابو علی نیشاپوری کو صحیح کا پتہ ہی نہیں ہے۔

اور مشہور حاکم کبیر البواحمی نے اس معاملہ میں حدِ کردی۔ حافظ ابن حجر نے نقل ہیں :

اللہ محمد بن اسماعیل پر رحمتیں برساتے انہوں نے اصول پر کتاب تالیف کی

اور لوگوں کے لیے بیان کیا ہے اور جس نے بھی آپ کے بعد کوئی کام کیا ہے وہ آپ ہی کی کتاب کے ذریعے کیا ہے جیسے امام مسلم انہوں نے امام بخاری کی کتاب کے زیادہ حصے کو اپنی کتاب میں بکھیر دیا اور اس میں ایسی ٹھٹھانی کا مظاہرہ کیا کہ امام بخاری کا نام تک نہیں لیا۔ حافظ ابن حجر نے صرف حاکم کبیر کی بات کو نقل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس سے آگے قدم بڑھا کر حافظ دارقطنی کا وہ جبار خانہ بیان بھی نقل کیا ہے جو امام مسلم کی جلالتِ شان کے مترسّر خلاف ہے۔ لکھتے ہیں:

دارقطنی کہتے ہیں کہ اگر امام بخاری نہ ہوتے تو امام مسلم کا نام تک نہ ہوتا۔

اس پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ:

امام مسلم نے امام بخاری کی کتاب لی ہے اور اسی کا مستخرج بنا کر اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ کر دیا ہے یہ

انا للہ فاللہ المشتکی۔ امام مسلم کا حدیث میں جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوتے یہ دارقطنی کی محض بدگمانی ہے جو مترسّر واقعات کے خلاف ہے۔ اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ امام بخاری کو حدیث کی معلومات جن اساتذہ سے حاصل ہوتی تھیں وہ ہی اساتذہ قریب قریب امام مسلم کے بھی تھے اور حدیث و روایت کا جو مجموعہ امام بخاری کے پیش نظر تھا وہی کم و بیش امام مسلم کے بھی سامنے تھا۔ امام یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی، امام عبد اللہ بن المبارک، امام اعظم، امام محمد، امام ابو یوسف کی جس قدر تصانیف امام بخاری کی نظر سے گزری ہیں۔ امام مسلم کی نظر سے بھی گزری تھیں۔ پھر یہ کہنا کس قدر بے انصافی ہے کہ امام مسلم جیسے امام کبیر نے جو کچھ اس فن میں لکھا وہ امام بخاری سے لے کر نقل کر ڈالا اور اس پر معاذ اللہ ان کی بددیانتی کا عالم یہ تھا کہ امام بخاری کا نام بھی نہیں لیا۔

حدیث میں امام مسلم کا مقام

امام مسلم کا حدیث میں جو درجہ ہے اس کا اندازہ حافظ عصر ابو العباس بن عقدہ کے

اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری و مسلم میں حدیث میں مقام کس کا اونچا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ دونوں عالم ہیں سائل کہتا ہے کہ میں نے بار بار ان سے یہی سوال کیا تو فرمایا کہ :

امام بخاری سے اہل شام کے بارے میں غلطیاں ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی کتاب میں لے کر مطالعہ کیا تھا اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص مذکور ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو یہ اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں لیکن امام مسلم کو عمل میں غلطی بہت ہی کم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں لکھی تھیں اور مقطوع و مرسل روایات نہیں لکھی ہیں۔

یہی بات متاخرین محدثین میں سے جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے ذرا اور وضاحت سے پیش فرمائی ہے :

امام مسلم نے اپنی صحیح میں علم حدیث کے عجائبات کا خزانہ فراہم کیا ہے خصوصاً احادیث کی سندوں اور متون میں ایک بے مثال علمی نمونہ ہے اسی بنا پر صحیح حدیث کو ضعیف حدیث سے ممتاز کرنے میں امام بخاری کی کتاب کے مقابلے میں امام مسلم کی کتاب کو شرف تقدم ہے۔ امام بخاری اہل شام کے بارے میں غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک شخص کو ایک جگہ کنیت سے اور دوسری جگہ نام سے ذکر کرتے ہیں اور اس طرح ایک ہی شخص کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی روایات اکثر اہل شام سے بطور مناولہ ہوتی ہیں۔ برخلاف امام مسلم کے کہ وہ کسی مقام پر ایسی غلطی کا شکار نہیں ہوتے۔ صحیح بخاری کی حدیثوں میں تقدم و تاخير، حذف و اسقاط کی وجہ سے متون احادیث میں پیچیدگی آجاتی ہے لیکن یہ بات صحیح مسلم میں نہیں ہے کیونکہ امام مسلم الفاظ حدیث کو بغیر کسی ترمیم کے اور رجال حدیث کو اس طرح لاتے ہیں کہ

کبھی کوئی تخریف نہیں ہوتی ہے بلکہ
صحیح مسلم کی شہرت اگرچہ مصنف سے تو اتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے لیکن اس کی روایت کا سلسلہ
جس بزرگ کے دم سے قائم رہا ہے وہ مشہور فقیہ حنفی شیخ ابوالسحاق ابراہیم بن محمد نیشاپوری رحمہ اللہ
ہیں۔ چنانچہ امام نووی مقدمہ شرح مسلم میں رقمطراز ہیں :
اسناد متصل کے ساتھ امام مسلم سے اس کی مسلسل روایات کا سلسلہ ان شہروں
اور اس زمانے میں صرف ابوالسحاق ابراہیم بن محمد کی ذات سے وابستہ ہے۔

سنن نسائی اور صحاح میں اس کا مقام

امام نسائی نے اپنی سنن میں امام بخاری اور امام مسلم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور
صرف صحیح روایات ہی کو اپنی کتاب میں روایت کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب بخاری اور مسلم دونوں کے
طریقوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستند ہے اور اس کے ساتھ حسن ترتیب
اور جودت تالیف کا بہترین نمونہ ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے زہر الربیٰ میں حافظ ابو عبد اللہ
بن رشید سے نقل کیا ہے کہ :

علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں یہ کتاب ان سب میں بلحاظ
تالیف انوکھی اور باعتبار ترتیب بہترین اور مثالی ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں
کے طریقوں کی جامع ہے نیز علل احادیث کا بھی ایک معتد بہ حصہ اس میں
آگیا ہے بلکہ

حافظ ابو علی النیشاپوری، حافظ ابن عدی، حافظ دارقطنی، حافظ عبد الغنی اور امام حاکم نے اس
کتاب کی صحت کو سراہا ہے بلکہ حافظ ابن مندہ نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ :
الذین خرجوا الصحيح اربعة البخاري ومسلم واليو داود والنسائي

یعنی جن چار نے صحیح احادیث کو روایت کیا ہے ان میں ایک امام نسائی بھی ہیں اور حافظ
ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ :

ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے سعد بن علی الزہدانی سے ایک شخص کے بارے

میں دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ ثقہ ہے عرض کیا کہ امام نسائی نے اس کی تصنیف کی ہے بولے کہ بر خور دار رجال کے بارے میں امام نسائی کی امام بخاری اور امام مسلم سے زیادہ کڑی شرطیں ہیں۔

لیکن حافظ محمد بن ابراہیم النوریر کو اس دعویٰ کی صحت میں تامل ہے وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن مندہ نے لکھا ہے کہ امام نسائی کی شرط یہ ہے کہ اس شخص سے حدیث روایت کریں گے جس کے ترک پر اجماع نہ ہوا ہو۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اجماع سے اجماع عام مراد نہیں ہے بلکہ طبقات ناقدین میں سے ایک خاص طبقہ کا اجماع مراد ہے۔ حافظ سخاوی کے اس بیان سے جو انہوں نے اس موضوع پر الاعلان بالتویخ میں لکھا ہے۔ اس پر مزید روشنی پڑتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ کسی راوی کی حدیث اس وقت تک نہ چھوڑی جائے گی جب تک اس راوی کے ترک پر سب کا ایک نہ ہو جائے۔ امام نسائی کا مقصود یہ ہے کہ ناقدین میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ متشددین اور متوسطین متشددین میں امام شعبہ اور سفیان ثوری ہیں۔ متدلین میں یحییٰ القطان اور عبد الرحمن بن مہدی ہیں۔ تیسرے طبقے میں یحییٰ بن معین اور امام احمد ہیں۔ چوتھے طبقے میں ابو حاتم اور بخاری ہیں۔ امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ کسی راوی کو اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک سب کا اس کے چھوڑنے پر اتفاق نہ ہو جائے یعنی اگر ایک راوی کو عبد الرحمن بن مہدی ثقہ بتاتے ہیں مگر یحییٰ القطان اس کی تصنیف کرتے ہیں تو اسے نہ چھوڑا جائے گا کیونکہ راویوں کے بارے میں یحییٰ کا تشدد معلوم ہے یہ

اگرچہ صاحب تنقیح النظر نے امام ابوالقاسم سعد بن علی الزنجانی کی اس بات یا بنی ان لا یبقی عبد الرحمن فی الرجال شرطاً اشد من شرط البخاری و مسلم۔

کی صحت سے انکار کیا ہے اور اس کی ایک وجہ تو حافظ ابن مندہ کی بالا روایت کو قرار دیا ہے اور دوسری وجہ یہ بتاتی ہے کہ چونکہ اس روایت کو حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی

نے ذکر نہیں کیا ہے اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہے لیکن حافظ ذہبی نے تاریخ میں تصریح کی ہے کہ امام ابو القاسم سعد بن علی الزنجانی نے جو کچھ کہا ہے صحیح ہے اور حافظ ذہبی کے علاوہ خود حافظ ابو الفضل بن طاہر مقدسی نے شروط الائمہ میں بھی یہ واقعہ لکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ناقدین فن کے نزدیک جلالت علمی کے لحاظ سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم سے بھی اونچا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رقمطراز ہیں :

فن رجال میں ماہرین فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی فوقیت دی ہے اور دارقطنی وغیرہ نے ان کو اس فن میں اور دیگر علوم حدیث میں امام الائمہ ابو بکر بن خزیمہ پر مقدم کیا ہے۔

اور حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں امام نسائی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ :

یہ مسلم، ترمذی اور ابو داؤد سے حدیث، اعلیٰ حدیث اور علم الرجال میں

زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری اور امام ابو زر عہ کے ہم عصر ہیں۔

بہر حال امام نسائی بڑی جلالت قدر کے مالک ہیں ان کی کتاب سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے یہ کتاب دراصل امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی بن بکر النسائی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب کا اختصار ہے حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ ان کے شاگرد حافظ ابو بکر بن السنی کے قلم کار ہیں منت ہے اس کا نام المجتبیٰ ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

اختصر السنن و سماہ المجتبیٰ

کچھ کا خیال ہے کہ مجتبیٰ خود امام نسائی ہی کی تصنیف ہے اس خیال کی تائید میں اس واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ امام نسائی نے جب سنن تصنیف فرمائی تو اس کو امیر رملہ کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا۔ امیر موصوف نے امام ممدوح سے دریافت کیا کہ کیا اس میں جو کچھ ہے سب کچھ صحیح ہے امام نسائی نے جواب دیا نہیں اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لیے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجئے تب امام نسائی نے اس کے لیے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی۔ اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن الاثیر نے جامع الاصول میں کیا ہے لیکن یہ کہانی محققین کے خیال میں صحیح نہیں ہے امیر عیافی نے حافظ ذہبی کی سیر اعلام النبلاء کے حوالہ سے بتایا ہے کہ :

ان هذه الرواية لم تصح بل المجتبى اختصار ابن السني تلميذ
النسائي له

امام نسائی کے اساتذہ میں بزرگ ترین ہستی مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ کی ہے۔ امام سحاق نے حدیث میں امام عبداللہ بن المبارک، جریر بن عبد الحمید، فضل بن عیاض کے سامنے زائونے ادب نہ کیا ہے اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یہ تینوں امام اعظم کے تلامذہ ہیں اور امام نسائی سے جن لوگوں کو شرف تلمذ حاصل ہے ان میں حافظ ابوبشیر الدولابی اور حافظ ابو جعفر الطحاوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حافظ ابوبشیر الدولابی محمد بن احمد حدیث کے مشہور حافظ اور فن جرح و تعدیل کے امام ہیں طلب حدیث میں حسب تصریح حافظ ذہبی حرمین، عراق، مصر اور شام کا سفر کیا اور بہت سے شیوخ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ۔ حدث عن اشیاء فیہ کثرت بکثرة شیوخ سے حدیث بیان کی ہے یہ امام بخاری سے بھی تلمذ حاصل ہے چنانچہ امام بخاری سے ان کی کتاب الضعفاء الصغیر کے راوی بھی ہیں حافظ ابن یونس لکھتے ہیں:

كان الدولابي من اهل الصنعة حسن التصنيف

حافظ مسلم بن قاسم فرماتے ہیں۔

كان مقدما في العلم والرواية ومعرفة الاخبار

دولابی علم وروایت اور معرفت اخبار میں پیش پیش ہیں۔

اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ:

جالس العلماء وتفقه لابی حنیفة

علماء کی ہم نشینی اختیار کی ہے اور ابو حنیفہ کا فقہ حاصل کیا۔

فن حدیث میں جن اکابر حفاظ نے آپ کے سامنے زائونے شاگردی نہ کیا ہے ان میں ابن عدی، طبرانی اور ابن المقرئ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سنن ابی داؤد کا صحیح میں مقام

امام ابو داؤد نے خود اپنی کتاب کا ایک خط میں تفصیلی تعارف کرایا ہے یہ خط اہل مکہ کے خط کا

جواب ہے جس میں انہوں نے کتاب السنن کی حدیثوں کے متعلق امام موصوف سے دریافت کیا تھا ظاہر ہے کہ اس موضوع پر امام موصوف کے بیان کو جو اہمیت ہے وہ کسی اور کے بیان کی نہیں ہو سکتی۔ ہم یہاں اس رسالہ کا اقتباس نواب صدیق حسن خاں کی کتاب الحطہ سے نقل کرتے ہیں۔

آپ لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ کتاب السنن میں جو حدیثیں آتی ہیں کیا وہ میرے علم کے مطابق صحیح ترین ہیں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب حدیثیں صحیح ہیں۔ لیکن ایسی حدیثیں جو دو صحیح طریقوں سے مروی ہوں اور ان میں ایک کا راوی اسناد میں مقدم ہوا اور دوسری کا حفظ میں بڑھا ہوا ہو تو ایسی صورت میں کبھی پہلی کو مکھ دیتا ہوں اور بعض دفعہ میں نے ایک طویل حدیث کو مختصراً ذکر کیا ہے کیونکہ اگر میں اس کو پوری نقل کرتا تو بعض سامعین کو پتہ بھی نہ چلتا اور اس میں جو فقہ کا مسئلہ تھا وہ سمجھ میں نہ آتا۔ اس بنا پر میں نے اختصار کیا اور جب کسی باب میں میں نے کسی حدیث کو دو یا تین طریقوں سے دہرایا ہے تو اس لیے کہ اس میں کوئی بات زیادہ تھی اور کبھی اس میں دوسری احادیث کی بہ نسبت ایک نقطہ زیادہ ہوتا ہے اور جو حدیثیں میں نے اپنی کتاب السنن میں درج کی ہیں ان میں اکثر مشہور ہیں جو ہر اس شخص کے پاس موجود ہیں جس نے تھوڑا بہت حدیث کو لکھا ہے لیکن ان میں تمیز کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ

سنن ابی داؤد کی افادیت کے پیش نظر امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔ مشہور محدث ابویسحٰی ذکر یا ساجی کے الفاظ ہیں۔

کتاب اللہ عز وجل اصل الاسلام و کتاب السنن لابن داؤد
عہد الاسلام۔

حافظ حمیدی کا بیان ہے کہ ایک روز حافظ ابن خرم کی مجلس میں صحیحین اور ان کی رفعت شان کا تذکرہ ہوا تو حافظ ابن خرم نے بتایا کہ حافظ سعید بن سکین کے پاس محدثین کی ایک

جماعت آئی اور انہوں نے کہا کہ علم حدیث میں کتابیں بہت زیادہ ہیں اگر شیخ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کریں اور بتائیں کہ ہم کون سی کتابوں کو اپنائیں تو بس ہم ان ہی پر اکتفا کر لیں۔ حافظ ابن سکن یہ سن کر خاموش ہو گئے اور گھر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کتابوں کے چار گٹھے اُپر نیچے رکھ کر لائے اور فرمایا:

هذه فتاوى الاسلام كتاب مسلم، كتاب البخاري وكتاب ابى داود
وكتاب النسائي

حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ جس حدیث پر امام ابو داؤد کلام نہ کریں وہ ان کے نزدیک صحیح ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ خود امام ابو داؤد کی تصریح یہ ہے کہ میں نے کتاب السنن میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو میرے علم میں ہر موضوع پر سب سے زیادہ صحیح ہیں اس سے حافظ ابن الصلاح اور امام نووی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن حدیثوں پر ابو داؤد نے کوئی کلام نہیں کیا ہے وہ قابل عمل ہیں اور ان کا مقام صحیح نہیں بلکہ حسن ہے لیکن حافظ ابن رشید نے لکھا ہے کہ ابو داؤد کے کلام نہ کرنے سے حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔ بہر حال محدثین کے یہاں یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ وہ حدیثیں جن پر ابو داؤد نے کلام نہیں کیا صحیح ہیں یا حسن؟ علامہ یافعی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

فالصواب انه يحتمل الثلاثة الحسن والصحة والموهن
غير الشدید لا كما قاله ابن الصلاح ولا كما قال ابن رشید
ٹھیک یہ ہے کہ تین باتوں کا احتمال ہے کہ صحیح ہوں، حسن ہوں
یا پھر ضعیف لیکن کم درجے کی۔ نہ ابن الصلاح کے خیال کے مطابق
اور نہ ابن رشید کی رائے کے موافق ہے۔

علامہ خطابی نے سنن ابو داؤد کا تعارف کرتے ہوئے معالم السنن میں لکھا ہے کہ :
امام ابو داؤد کی کتاب السنن بلاشبہ ایسی عمدہ کتاب ہے کہ علم دین میں
ایسی عمدہ کوئی کتاب نہیں ہے اس نے سب کی جانب سے سند قبولیت
حاصل کر لی ہے چنانچہ یہ کتاب علماء کے تمام فرقوں کی جانب سے

اور فقہاء کے سارے طبقوں میں باوجود اختلاف کے حکم مافی جاتی ہے۔
 سب لوگ اسی گھاٹ اُتے ہیں اور یہیں سے میراب ہوتے ہیں۔ اسی
 پر اہل مصر، اہل عراق، بلاد مغرب اور روتے زمین کے بہت سے شہروں
 کے رہنے والوں کو اعتماد ہے۔ البتہ خراسان میں بیشتر لوگ محمد بن اسماعیل
 مسلم بن الحجاج اور ان لوگوں کی کتابوں کے دلدادہ ہیں کہ جو صحیح صحیح
 میں ان دونوں حضرات کے قدم بقدم چلے ہیں اور جنہوں نے جانچ
 پڑتال میں ان کی شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے لیکن ابوداؤد کی کتاب ترتیب
 کے اعتبار سے بہت اچھی اور بلحاظ فقہائیت بہت اونچی ہے۔

فقہائیت میں بہت اونچی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دیگر مصنفین صحاح کے مقابلے میں امام ابوداؤد
 پر ذوق فقہی زیادہ غالب ہے۔ چنانچہ تمام ارباب صحاح میں صرف امام ابوداؤد ہی ایک ایسے بزرگ
 ہیں جن کو علامہ ابواسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے اور امام موصوف نے اسی
 فقہی ذوق کی بنا پر اپنی کتاب میں صرف احادیث احکام پر اکتفا فرمایا ہے اگرچہ اس پابندی کی
 وجہ سے ان کی یہ کتاب احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہو گئی ہے لیکن احادیث فقہ
 کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں ہے چنانچہ حافظ
 ابو جعفر غرناطی کے حوالے سے حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں:

لابی داؤد فی حصر احادیث الاحکام واستیعابها مایس لغیرہ۔
 احادیث احکام کے بیان میں جو مقام ابوداؤد کا ہے وہ کسی اور کا
 نہیں ہے۔

امام ابوداؤد کے اساتذہ بخاری اور مسلم کے ہی اساتذہ ہیں:
 اخذ الحديث عن مشايخ البخاري ومسلم كاحمد بن حنبل
 ابوداؤد نے بخاری و مسلم کے اساتذہ مثلاً امام احمد سے کسب فیض کیا ہے
 ان اساتذہ میں امام احمد کی شخصیت اس صدی کے محدثین میں پدر بزرگوار کی حیثیت رکھتی
 ہے۔ شاید ہی تیسری صدی کے محدثین میں کوئی ہو جس کا علمی نسب نامہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امام

موصوف سے زمت ہو بلکہ امام ذہبی نے امام احمد کے تمام تلامذہ میں ابو داؤد کی یہ خصوصیت بتاتی ہے۔

كان يشبهه باحمد بن حنبل في هديه ودله وسمته

یہ خصوصیت امام ابو داؤد کو امام احمد کے دوسرے شاگردوں سے ممتاز کرتی ہے اور حدیث میں امام احمد کو جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں یحیٰ بن بشیر، امام جریر بن عبد الحمید، امام ابو بکر بن عیاش، عباد بن العوام، وکیع بن الجراح، ابن نمیر، عبد اللہ بن المبارک، یزید بن ہارون، عبد الرزاق بن ہمام اور یحییٰ بن ابی زائدہ وہ گرامی قدر مستبیاں ہیں جن کو حدیث میں امام اعظم کے سامنے زانوئے ادب نہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ امام ابو داؤد امام اعظم کی مساعی جلیلہ کو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بڑے ادب و احترام سے ان کا نام لیتے تھے حافظ ابن عبد البر بسند متصل الانتقاء فی فضائل الثلاثة الامم الفقہاء میں ان سے ناقل ہیں۔

حدثنا عبد الله بن محمد بن عبد المؤمن بن يحيى قال اخبرنا
ابو بكر محمد بن بكر بن عبد الرزاق القادر المعروف بابن داود
قال سمعت ابا داود يقول رحم الله مالكا كان اماما
رحم الله الشافعي كان اماما رحم الله ابا حنيفة كان اماما
ابو داود کہتے ہیں اللہ مالک پر رحمت فرمائے امام تھے اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ
اور شافعی رحمہ اللہ بھی امام تھے

سنن ترمذی کا صحاح ستہ میں درجہ

امام ترمذی کی کتاب سنن ابو داؤد اور امام بخاری دونوں کے طریقوں کی جامع ہے اس کی اس جامعیت کا کچھ اندازہ حافظ ابو بکر بن العزنی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو عارضۃ الاسود میں ہے :

اس کتاب میں حسب ذیل چودہ علوم ہیں۔ احادیث کی اس طرح تدوین جو عمل سے قریب تر کر دیتی ہے۔ بیان اسناد، تصحیح، تصنیف،

تعدد طرق، جرح رواۃ اور تعدیل، راویوں کے نام اور کفایت کا بیان، وصل و انقطاع کا ذکر، معمول یہ اور متروک العمل روایات کی توضیح، احادیث کے رد و قبول کا معیار، اس موضوع پر علماء کے اختلاف کا ذکر۔ احادیث کی توجیہ و تاویل کے بارے میں اختلاف افکار کا بیان — یہ وہ علوم ہیں کہ ان میں سے ہر علم اپنی جگہ مستقل ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے قوت المندھی میں حافظ ابو جعفر بن الزبیر غرناطی سے ترمذی کی خاص محدثانہ خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

وللترمذی فی فنون الصناعة الحدیثیۃ ما لم یشاركه غیرہ۔^۲

فن حدیث میں امام ترمذی کی وہ شان ہے جس میں امام ترمذی کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

دراصل یہ امام ترمذی ہی کی خصوصیت ہے کہ ایک طرف انہوں نے اپنی کتاب میں احادیث احکام میں سے صرف ان احادیث کو لیا ہے کہ جن پر فقہاء کا عمل رہا ہے۔ دوسری طرف اس کو صرف احکام ہی کے لیے خاص نہیں کیا بلکہ امام بخاری کی طرح سب احادیث کو لے کر اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ علوم حدیث کی ایک سے زیادہ انواع کو کتاب میں اس طرح درج کیا ہے کہ وہ علم حدیث کا ایک چمنستان بن گیا چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں:

جامع ترمذی حدیث کی تمام کتابوں میں بعض وجوہ سے سب سے اچھی ہے
اول بلحاظ ترتیب، دوم فقہاء کے مذاہب کا تذکرہ، سوم حدیث کی بلحاظ
اسناد تقسیم صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ، چہارم راویوں کے نام، لقب اور
کنیت وغیرہ اور ان وجوہ کے علاوہ اور بھی علم رجال سے متعلق فوائد ہیں۔

صحیح کے ساتھ حسن اور غریب کی اصطلاح

اب تک متذہبن حدیث کی تقسیم صحیح اور ضعیف میں محصور کرتے تھے امام ترمذی بقول حافظ ابن تیمیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح اور ضعیف کے درمیان حسن کی اصطلاح قائم کی ہے اور حسن

کی تعریف بھی خود امام ترمذی نے کتاب العلل میں یہ بنائی ہے ؛
ہر ایسی حدیث جس کی سند میں کوئی متہم بالکذب نہ ہو اور حدیث شاذ بھی
نہ ہو اور ساتھ ہی کسی طریقوں سے اسے روایت کیا گیا ہو ۔

لیکن اس تعریف کی بنیاد پر یہاں اس سوال کو محدثین کے یہاں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے
کہ اگر امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن کی یہی تعریف ہے اور حسن خود صحیح کی قسم نہیں بلکہ تقسیم ہے
یعنی یہ نہیں کہ صحیح کی دو قسمیں ہیں صحیح حسن اور غریب ۔ تو اس صورت میں ایک ہی حدیث کے بارے
میں یہ فیصلہ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ ہذا حدیث حسن صحیح یا ہذا حدیث حسن صحیح غریب ۔
ظاہر ہے کہ حدیث کی تقسیم اگر فرق مراتب بتانے کے لیے ہوتی ہے تو ایک حدیث میں ایک ہی وقت
میں اعلیٰ اور ادنیٰ مراتب کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے ؟
علمائے اس کے ایک سے زیادہ جوابات دیے ہیں ۔

کچھ کہتے ہیں کہ اگر ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہو تو امام ترمذی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث
ایک سند سے صحیح اور دوسری سے حسن ہے ۔

لیکن جب امام ترمذی ایک حدیث کے بارے میں یہ کہہ کر لا نعرفہ الا من هذا الوجه پھر یہ
فیصلہ فرمادیں کہ ہذا حدیث حسن صحیح تو یہ معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور یہ جواب سوال کو حل
نہیں کرتا ہے ۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ حسن صحیح ایک جگہ کہہ کر امام ترمذی متن اور سند دونوں کے بارے میں اپنی
رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے تجلّہ و مانع میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث
بملاحظہ متن حسن اور بملاحظہ سند صحیح ہے ۔

حافظ ابن کثیر نے اسے بھی محل نظر قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اپنی جو رائے حافظ صاحب نے لکھی
ہے وہ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں کہ :

حسن اور صحیح دونوں سلسلے ہیں اور حسن صحیح کا مقام امام ترمذی کی نظر
میں حسن سے بالا اور صحیح سے کمتر ہوتا ہے اس لیے حکم کے لحاظ سے صرف
صحیح اس حدیث سے زیادہ قوت والی ہے جسے حسن صحیح کہہ دیں گے

لیکن حافظ عراقی نے حافظ ابن کثیر کی رائے کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ :
 والذی ظہر لہما تحکمہ لا دلیل علیہ، وهو بعید من فہم
 معنی کلام الترمذی یہ
 ابن کثیر کی رائے ایک آپسچ ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ترمذی
 کا کلام اس کا ساتھ دیتا ہے۔

ہمیں اس سلسلے میں شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ کی وہ رائے بہت پسند آتی ہے جو جناب علامہ احمد
 محمد شاہ نے الباعث الحثیث میں ان سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں :

در اصل امام ترمذی کی نظر میں حسن ذرا صحیح سے عام ہے ایک حدیث
 کبھی حسن ہوتے ہوئے صحیح ہوتی ہے اور کبھی صحیح منہیں ہوتی ہے
 بلکہ صرف حسن ہی ہوتی ہے کیونکہ حسن کے معنی ان کے نزدیک مقبول
 اور معمول پر کے ہوتے ہیں اسی کے لیے امام مالک کے یہاں علیہ
 العمل ببلدنا کی تعبیر ہے۔ ایسی حدیث جو سند کے لحاظ سے قوی ہو
 اور اس کی پشت پر صحابہ و تابعین کی عملی تائید نہ ہو وہ امام ترمذی کی
 زبان میں صرف صحیح کہلاتی ہے اور ایسی حدیث جو سند کے لحاظ
 سے قوی نہ ہو مگر اسے عملی تائید حاصل ہو اس کو صرف حسن کہتے ہیں بالفاظ
 دیگر امام ترمذی نے حسن صحیح نیز حسن اور صحیح کی تعبیرات یہ بتانے
 کے لیے اختیار کی ہیں کہ کتاب میں لوگوں کے سامنے احادیث اور
 احادیث پر خیر القرون صحابہ و تابعین کا عمل بجا ہو کر سامنے آجائے
 اس لیے امام ترمذی ان تمام حدیثوں کو جن کی پشت پر صحابہ و تابعین
 کی عملی تائید ہو حسن کہتے ہیں خواہ وہ صحیح ہوں یا درجہ صحت سے گری
 ہوتی ہوں۔ اور اگر احادیث کو عملی تائید حاصل نہ ہو تو اسے امام ترمذی
 حسن نہیں کہتے چاہے وہ صحیح ہوں۔

۱۔ شرح المقدمہ ص ۴۷۔

۲۔ الباعث الحثیث ص ۴۴۔

ترمذی کے بارے میں ایک اہم سوال

یہاں اس سوال کو بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ

امام ترمذی ایک حدیث کی تضعیف بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے حالانکہ یہ بات محدثین کے مقررہ اصول و قواعد کے سرنامہ خلاف ہے کیونکہ احکام میں محدثین حدیث صحیح اور حسن کے علاوہ کسی بھی حدیث کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ ترمذی میں ایسے ایک سے زیادہ مقامات ہیں جہاں حدیث کے بارے میں ایک طرف امام ترمذی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دوسری طرف فرماتے ہیں کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں ترمذی میں باب الجمع بین الصلاتین میں یہ حدیث لائے ہیں۔

حدثنا ابو سلمة یحییٰ بن خلف البصری نا المعتمر بن سلیمان
عن ابيه عن حنش عن عكرمة عن ابن عباس عن النبي صلى
الله عليه وسلم قال من جمع بين الصلاتين من غير عذر
فقد اتى باباً من ابواب الكبائر۔

جس نے بغیر عذر کے دو نمازوں کو یکجا کیا ہے اس نے بڑے گناہوں میں
سے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔

اور اس کے بعد اسی حدیث پر یہ نوٹ لکھا ہے :

قال ابو عیسیٰ حنش هذا هو ابو علی الرحبی وهو حسین بن
قیس وهو ضعیف عند اهل الحديث ضعفه احمد وغيره
حنش کی کنیت ابو علی اور نام حسین بن قیس ہے اور یہ محدثین کے نزدیک
ضعیف ہے امام احمد نے اس کی تضعیف کی ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ :

والعمل على هذا عند اهل العلم ان لا يجمع بين الصلاتين الا في
السفر او بعذر فیه

اس قسم کے اور بھی کئی مواقع ہیں۔ اس کے جواب میں اگرچہ بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ امام ترمذی نے اس طرز عمل سے ایک بے حد اہم اور کارآمد محدثانہ نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اپنے مخلصوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ حدیث اگرچہ ہم کو روایتی اور اسنادی طرز پر کمزور طریقہ سے پہنچی ہے لیکن اسے اہل علم کی تائید حاصل ہے۔ اور اہل علم کا کسی حدیث کو اپنالینا بھی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے چاہے روایت کی دنیا میں اسے قابل اعتماد اسناد کی قوت حاصل نہ ہو۔ یہی بات حافظ جلال الدین السیوطی نے امام ترمذی کے اس طرز اور انداز سخن سے سمجھی ہے۔ چنانچہ حافظ صاحب حدیث بالا اور اس کے متعلقہ نوٹ پر رقمطراز ہیں:

اشار بذالك الى ان الحديث اعتضد بقول اهل العلم وقد
صرح غير واحد من اهل العلم بان من دليل صحة الحديث
قول اهل العلم به وان لم يكن له اسناد يعتمد على مثله
امام ترمذی نے یہ بات بتائی ہے کہ حدیث میں اہل علم کے قول سے
قوت آگتی اور اس کی بے شمار علمائے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث کے
صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کتابوں کی صحت میں برتری کا دار مدار ابن الصلاح اور دوسرے
مؤخرین محدثین کے نزدیک ان کے التزام صحت اور شرائط پر نہیں بلکہ اس شہرت اور قبول پر ہے
جو امت کی جانب سے ان دونوں کتابوں کو حاصل ہے تو پھر یہ ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ شہرت
اور قبول میں بذات خود صحت کی ضمانت ہے چنانچہ ایک سے زیادہ محدثین نے اس کی تصریح کی،
حافظ سیوطی تدریب الراوی میں رقمطراز ہیں کہ:

يجزم للحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم يكن له
اسناد صحيح -

حدیث کو صحیح قرار دیا جاتا ہے جب اسے لوگ شرف قبول عطا کر دیں چاہے
اس کی کوئی صحیح سند نہ ہو۔

حافظ ابن عبد البر نے التمهید میں حضرت جابر کی اس مرفوع حدیث پر کہ

الدنیار اربعۃ وعشرون قیراطاً

لکھا ہے کہ علماء کی جماعت کا اسے اپنا لینا اور اسے عامہ کا اس پر مجتمع ہونا اس حدیث کو سند سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الافصاح علی نکت ابن الصلاح میں لکھا ہے کہ: حدیث کے مقبول ہونے کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ علماء اس حدیث کے مدلول پر متفق ہو جائیں کیونکہ وہ قابل ہوتی ہے تا آنکہ اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے ائمہ اصول میں سے ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے۔

حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں:

جب کسی ضعیف حدیث کو اُمت شرف قبول عطا فرمے اس پر عمل کیا جائے گا تا آنکہ اسے حدیث متواتر کا ایسا مقام حاصل ہو جائے گا جس سے قطعی الثبوت کو منسوخ کیا جاسکتا ہے بلکہ

بعینہ یہی سوال علامہ عصر محدث شیخ حسین بن محسن یمانی سے بھی کیا گیا ہے انہوں نے اس سوال کا جواب مفصل دیا ہے اور یہ معجم طبرانی صغیر کے آخر میں التحفۃ المرصیۃ فی حل بعض المشكلات الحدیثیہ کے نام سے ملحق ہے اور تقریباً سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے جواب کا لب لباب یہی ہے کہ ضعیف حدیث وہ ہے۔

حیث لم یکن فی سندہ کذاب۔

بہر حال امام ترمذی نے یہ بات سمجھا دی ہے کہ حدیث مقبول وہ ہے جسے اہل علم کی تائید حاصل ہو اور وہ قابل عمل ہے چاہے وہ ہم تک پہنچنے میں کمزور وسائل کا شکار ہو گئی ہو۔ اس لحاظ سے امام ترمذی کی کتاب کو دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہت اور سچا مقام حاصل ہے۔

امام ترمذی نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے ان میں امام بخاری، قتیبہ بن سعید، محمود بن غیلان، احمد بن منیع، محمد بن المثنی، نہاد اور ابو زرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ امام اعظم کے تلامذہ سے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں

امام بخاری کے متعلق تو آپ سن آئے ہیں کہ قتیبہ بن سعید کے اساتذہ میں امام مالک کے ساتھ لیث بن سعد اور شریک کا ذکر کیا ہے اور لیث بن سعد اور شریک سے امام اعظم کا جو رشتہ ہے وہ تاریخ میں کوئی چھپی بات نہیں ہے۔ احمد بن منیع، ہشیم، عباد بن العوام اور عبد اللہ کے واسطہ سے امام اعظم سے ملتے ہیں اور خود امام ترمذی کے تلامذہ ہیں سرفہرست جن لوگوں کا نام آتا ہے ان میں حماد بن شاگرد اور عبد بن محمد بھی ہیں۔ دونوں نسفی ہیں۔ اول الذکر ان چار میں سے ایک ہیں جن سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا ہے۔ یہ دونوں حنفی بزرگ ہیں۔ محمود بن غیلان کو بیک واسطہ امام اعظم سے تلمذ حاصل ہے۔ چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب العلل میں امام اعظم سے جو روایت کی ہے کہ:

حدثنا محمود بن غيلان حدثنا ابو يحيى الحماني قال سمعت ابا حنيفة
يقول ما رايت احدا الكذب من جابر الجعفي ۷۷ افضل من
عطاء بن ابي رباح

تو اس سے بھی ان کا امام اعظم سے بواسطہ ابویحییٰ تلمذ ثابت ہے۔ ابویحییٰ کے بارے میں حافظ ذہبی نے بھی تصریح کی ہے کہ وہ امام اعظم کے شاگرد ہیں۔

صحاح ستہ میں ابن ماجہ کا مقام

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں یہ کتاب حسن ترتیب میں ممتاز ہے چنانچہ شاہ عبد الغفر فرماتے ہیں:

فی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار و اختصار اپنے کتاب
داروینچ یک از کتب ندارد

فی الواقع اپنی ترتیب اور احادیث کے بغیر تکرار بیان کرنے اور اختصار
میں اس کتاب کی کوئی کتاب بھی ہمسر نہیں ہے۔

اور اس کتاب کی یہی وہ خوبی ہے کہ جس کو دیکھ کر حافظ ابو زرہ رازی کی زبان سے بے ساختہ
یہ الفاظ نکل گئے۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آگئی تو یہ جوامع یا ان میں سے اکثر بیکار ہو جائیں گی۔ لے

ابن الاثیر نے کتاب کی اس افادی حیثیت کو ان لفظوں میں سراہا ہے۔

کتابہ کتاب مفید قوی النفع فی الفقه

صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کا پایہ کتب خمسہ جیسا نہیں ہے۔ کتب خمسہ کے بارے میں اگرچہ آپ حافظ ابوظہر مقدسی کا یہ بیان سن چکے ہیں۔

قد اتفق علی صحتهما علماء الشرق والغرب لے

لیکن حافظ عراقی کو ابوظہر سے اس میں اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں:

جو شخص کتب سنن کو صحیح کہتا ہے جیسے ابوظہر نے کتب خمسہ کی صحت پر اتفاق کا اعلان کیا ہے اور جیسے حاکم کہ ترمذی کی کتاب کو الجامع الصحیح کہتا ہے اور ایسے ہی خطیب۔ یہ تساہل ہے یہ

اور حافظ ذہبی نے بتایا ہے کہ:

ابن ماجہ حافظ، صدوق اور واسع العلم ہے لیکن ان کی سنن کا درجہ کمتر ہونے کی وجہ اس کتاب میں مناکیر اور قدرے موضوعات ہیں لہٰذا حافظ سیوطی نے ابن رشید سے نقل کیا ہے۔

ابن ماجہ میں تفردات ہیں اور یہ ایسے لوگوں کی روایات پر مشتمل ہیں جن پر کذب کی اور احادیث کی چوری کی تہمت ہے۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ:

امام ذہبی نے ابن ماجہ میں کچھ احادیث کے موضوعہ ہونے کا جو پتہ دیا ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ احادیث باطلہ کم ہیں ورنہ جہاں تک احادیث ضعیفہ کا مسئلہ ہے وہ تو ابن ماجہ میں کم از کم ایک ہزار حدیثیں ہیں لہٰذا اسی بنا پر حافظ ابوالحجاج المزنی کا فیصلہ یہ ہے کہ:

۱۔ المعطوفی ذکر الصحاح استہ ص ۱۰۱۔ ۲۔ اختصار علوم الحدیث۔ ۳۔ شرح الالفیہ ص ۱۰۴۔

۴۔ الاجوبۃ الفاضلہ ص ۱۱۔ ۵۔ نہر الربی ص ۴۔

ان الغالب فيما تفرد به المصنف^۱

ابن ماجہ کے تفردات میں زیادہ تر ضعیف ہے۔

لیکن اس کے باوجود علماء متاخرین نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کیا ہے کیونکہ ضعیف روایتوں کا ہونا ابن ماجہ کی ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں کم ہیں اور ابن ماجہ میں زیادہ ہیں۔ اور ان سب کتابوں کو باوجود ضعیف روایات ہونے کے صحاح ستہ تغلیباً کہا جاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی ہر روایت صحیح ہے۔ جناب علامہ فاضل نواب صدیق حسن خاں مسک الختام میں فرماتے ہیں:-

ان چھ کتابوں کو اصول ستہ، صحاح ستہ، کتب ستہ اور امہات ستہ کہتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعۃ اللمعات میں فرمایا ہے کہ چھ کتابیں جو اسلام میں مشہور ہیں یہ ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ۔ اور کچھ کی رائے میں بجائے ابن ماجہ مؤطا ہے اور صاحب جامع الاصول نے مؤطا ہی کو اختیار کیا ہے اور ان کتابوں میں حدیث کی قسمیں صحیح، حسن اور ضعیف سب موجود ہیں اور ان کو صحاح کہنا محض تغلیباً ہے بلکہ

مؤلفین صحاح کے نقطہ نظر کا اختلاف

اگرچہ ایک ہی موضوع پر ان بزرگوں کا یہ تصنیفی کارنامہ ہے ان کے شیوخ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک ہی طبقہ کے لوگ ہیں۔ ان کے سامنے تالیفی سرمایہ بھی ایک ہی تھا۔ اس کے باوجود ان بزرگوں نے جدا جدا میدان تصنیف میں جو داد تحقیق دی ہے اس میں ان کا ایک خاص نصب العین، خاص مطلع نظر اور خاص پیش نہاد ہے۔ ایک ہی موضوع پر ایک ہی قسم کی حدیثوں کو الگ الگ پیش کرنے میں ایک گہری معنویت ہے۔

امام بخاری کا نقطہ نظر

امام بخاری کا مطلع نظر اپنی صحیح میں احادیث صحیحہ کا استنباع نہیں ہے کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں۔

لما خرج في هذا الكتاب الاصحاح وما تركت من الصحيح اكثر
میں نے اس کتاب میں صحیح احادیث روایت کی ہیں اور زیادہ صحیح
احادیث میں نے چھوڑی ہیں۔

امام حازمی نے بھی طور پر لکھا ہے کہ امام بخاری کا مقصد احادیث صحیحہ کا ایک اختصار تیار کرنا
ہے احادیث صحیحہ کا استیعاب ان کے پیش نظر نہیں ہے۔

علامہ زبد کوثری نے امام بخاری کا مطلع نظر وضاحت کے ساتھ سمجھا یا ہے کہ
صحیح میں امام بخاری کی غرض صرف یہ ہے کہ احادیث صحیحہ متصلہ کی تخریج
کی جائے اور اس کے ساتھ ان احادیث سے فقہ، سیرت اور تفسیر کے
مسائل کا استنباط کیا جائے۔ اور استشہاد میں صحابہ، تابعین اور فقہاء
کی آراء سے مدد لی جائے اسی بنا پر وہ متون احادیث میں تقطیع بھی
کرتے ہیں۔

علامہ نواب صدیق خاں نے بھی امام بخاری کا یہی مطلع نظر بتایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں؛
امام بخاری نے صحت احادیث کے ساتھ فقہی فوائد اور حکیمانہ نکاتوں
کے استنباط کا بھی التزام کیا ہے۔
حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں؛

امام بخاری نے محسوس کیا کہ ان کی صحیح فقہی فوائد اور حکیمانہ نکاتوں سے
مالا مال ہو۔ آپ نے اپنی سمجھ کے مطابق متون احادیث سے بہت سے
نت نئے معافی نکالے ہیں اور ان ہی معافی کی مناسبت سے احادیث
کو ایک سے زیادہ بابوں میں الگ الگ کر کے پیش کیا ہے۔
اور امام نووی فرماتے ہیں کہ؛

امام بخاری کا مقصد صرف احادیث کا تعارف نہیں ہے بلکہ کتاب
میں ان کا اصلی پیش نہاد یہ ہے کہ احادیث سے احکام استنباط کیے
جائیں اور زندگی کے مختلف مسائل کے لیے ان سے استدلال کیا جائے

اسی وجہ سے بہت سے ابواب اسناد سے خالی ہیں یہ
بہر حال امام بخاری کا مطلع نظر صحیح میں صرف احادیث صحیحہ کا انتخاب ہی نہیں ہے بلکہ اس کے
ساتھ ان کے پیش نظر دوسرے مقاصد بھی ہیں ۔

امام مسلم کا مطلع نظر

امام مسلم کا بھی اپنی صحیح میں یہ مقصد نہیں کہ ساری صحیح حدیثوں کا کتاب میں استیعاب کیا
جائے بلکہ ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ان حدیثوں کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح طرق کی فراہمی کی
جائے اور صرف صحیح حدیثوں کو یک جا کر دیا جائے۔ چنانچہ خود امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ
میں اس بات کی توضیح کر دی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں :

جمع فیہ طرقہ التي ارتضاہا فاختار ذکرہا وادرد فیہا اسانیدہ
المتعدۃ والفاظہ المختلفۃ۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں ایک حدیث کے اپنی پسند کے سارے طریقوں
کو یکجا کر کے ذکر کر دیا ہے اور اس کو متعدد سندوں اور مختلف الفاظ
کے ساتھ پیش کیا ہے یہ

علامہ زاہد کوثری نے اسے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا ہے :

امام مسلم کا مقصد صرف صحیح حدیثوں کو پیش کرنا ہے ان کے پیش نظر
احادیث سے مسائل کا استنباط نہیں ہے وہ ایک حدیث کے سارے
طرق کو ایک ہی جگہ صرف اس لیے سمیٹ دیتے ہیں تاکہ دیکھنے والے
کے سامنے متون کا اختلاف اور اسانید کی نیرنگی بہترین شکل میں نمایاں
ہو کر آجائے یہ

بہر حال امام مسلم کا پیش نہاد صرف حدیث کی اسنادی اور روایتی حیثیت کو نکھار کر پیش کرنا ہے۔

امام ابو داؤد کا تالیف میں مقصد

امام ابو داؤد کا مطلع نظر اپنی سنن میں صرف ان احادیث کو یکجا کرنا ہے جن سے فقہاء نے استدلال

کیا ہے اور جن پر فقہائے مذاہب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ اسی بنا پر اصول کی کتابوں میں تباہی کیا ہے کہ اجتہاد کے میدان میں صرف ابو داؤد کافی ہے۔

حافظ ابو بکر الخطیب فرماتے ہیں کہ :

ابو داؤد کی سنن علم دین میں بے مثال کتاب ہے اسے فقہاء اور محدثین کے یہاں یکساں قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ عراقیوں، مصریوں اور اہل مغرب کا اسے اعتماد ہے۔ ابو داؤد سے پہلے بے شک علماء نے جوامع اور مسانید تالیف کیے ہیں اور ان میں سنن، اخبار، قصص، مواعظ اور ادب کا علمی خزانہ تھا لیکن سنن کو خالصاً کسی نے بھی ایسا پیش نہیں کیا جیسا کہ ابو داؤد نے یہ۔

امام خطابی ابو داؤد کی شرح میں رقمطراز ہیں :

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام ابو داؤد نے اپنی کتاب میں اصول علم، اہیات السنن اور احکام فقہ پر مشتمل حدیث کا ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں اس کی مثال نہیں ہے یہ۔

حافظ ابن القیم الجوزی فرماتے ہیں کہ :

کتاب ابو داؤد کا اسلام میں ایک خاص مقام ہے اس کی حیثیت مسلمانوں میں ایک حج کی اور نزاع و جدال میں ایک قاضی کی ہے کیونکہ اس میں فقہ کی احادیث کا بھرپور سرمایہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ حسن ترتیب اور حسن نظم یعنی مثال آپ ہے۔ مجروحین اور ضعفا کی حدیثوں کو خوب نکھار دیا ہے۔

امام ابو عیسیٰ ترمذی کا پیش منہاد

امام ترمذی کا پیش منہاد جامع ترمذی میں یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو یکجا کیا جاتے یعنی ابواب کے ذریعہ انتہا ط مسائل کا نمونہ بخاری کے طرز پر ہو اور احادیث صحیحہ کے انتخاب

میں امام مسلم کی ترجمانی کی جاتے اور اس کے ساتھ ابو داؤد کے قدم بقدم چل کر صحابہ، تابعین اور فقہاء کے مذاہب کو پوری وضاحت سے بیان کیا جاتے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ طرق حدیث میں ایک کا تفصیلی اور باقی کا اجمالی خاکہ پیش کر کے حدیث کا محدثین کے یہاں جو مقام ہے اسے معین کر دیا جاتے۔ گویا امام ترمذی کی کتاب ایک معجون مرکب ہے جس میں تینوں کتابوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

علامہ زاد کوثری فرماتے ہیں :

امام ترمذی کا مطلع نظر بخاری اور مسلم کے دو طریقوں کو ایک جگہ پیش کرنا ہے گویا امام ترمذی کو شیخین کا یہ طریق بیان و ابہام میں بھایا ہے اور اس کے ساتھ وہ ابو داؤد کے طریقے کو بھی اپناتے ہیں اور اس پر ان کی جانب سے یہ اضافہ بھی ہے کہ صحابہ، تابعین اور فقہاء اصحاب کے مذاہب کو بیان کرتے ہیں۔ طرق حدیث میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے ایک کو بیان کر کے باقی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور ہر حدیث کے بلے میں بتاتے ہیں کہ صحیح ہے یا حسن اور یا منکر۔ ضعف کی وجہ بتاتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ حدیث مستفیض ہے یا غریب۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس پر کچھ فقہاء نے عمل نہ کیا ہو۔ سوائے ان دو حدیثوں کے۔ فان شرب فی المرابعتہ فاقتلوا اور جمع بین الظہر والعصر بالمدينة من غیر خوف ولا سفر۔

امام نسائی کا کتاب کی تالیف میں مسلک

اس کتاب میں امام نسائی کا مسلک یہ ہے کہ خالص محدثانہ نقطہ نظر سے امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو انوکھے انداز میں پیش کر کے بیان علل میں خاص طریق پیش کیا جاتے۔ شاید اسی بنا پر مغرب کے بعض محدثین صحیح بخاری پر اس کی ترجیح کے قائل ہیں۔ چنانچہ حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں کہ :

بعض مفکرین نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی کی کتاب کو بخاری پر فضیلت ہے۔
اور اسی لیے ناقدین فن کے نزدیک جلال علمی کے اعتبار سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم
سے بھی بڑھا ہوا ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :
فن رجال میں ماہرین فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی توفیق
دی ہے۔

حافظ ابو عبد اللہ بن رشید نے امام نسائی کا اس کتاب میں مسلک یہ بتایا ہے کہ :
یہ کتاب علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان سب میں فضیلت
کے لحاظ سے انوکھی اور بلحاظ ترتیب بہترین ہے اور یہ بخاری اور مسلم و ترمذی
کے طریق کی جامع ہے نیز علل حدیث کا بھی ایک حصہ اس میں بیان کیا
گیا ہے۔

امام ابن ماجہ کا مطمح نظر

امام ابن ماجہ کا مطمح نظر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسائل فقہیہ پر مشتمل چند در چند متنوع عنوانوں کے
ساتھ بغیر تکرار کے ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے سامنے آجائے۔
شاہ عبدالعزیز بستان المحدثین میں فرماتے ہیں۔
فی الواقع ترتیب کی خوبی اور بغیر کسی تکرار کے احادیث کی پیش کش اور
اختصار کا نمونہ جو یہ کتاب رکھتی ہے کوئی کتاب نہیں رکھتی۔

صحاح ستہ کی علمی خدمت

چونکہ علمائے ان چھ کتابوں کی مختلف طریقوں سے علمی خدمت کی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں
کہ آپ کی ضیافت طبع کے لیے اسی سلسلے کی دو اہم کڑیاں پیش کریں۔ ان کا نام مستخرجات اور
اطراف ہے۔

مستخرج جامعین اور استخراج فوائد کے

محدثین کی اصطلاحی زبان میں استخراج جیسا کہ حافظ عراقی اور حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے لکھا ہے کہ

ان باقی المصنف الی الکتاب فیخرج احادیثہ باسناد لنفسہ

من غیر طریق صاحب الکتاب

مصنف کوئی حدیث کی کتاب لے اور اس میں مندرج حدیثوں کو اپنی

سندوں سے روایت کرے اور یہ صاحب کتاب سے الگ ہو۔

اس میں شرط یہ ہے کہ مستخرج خود صاحب کتاب سے کوئی حدیث روایت نہ کرے بلکہ صحیح سند کے ساتھ اوروں سے روایت کرے۔ چنانچہ صاحب تنقیح الانظار فرماتے ہیں:

شرط المستخرج الا یروی حدیث البخاری ومسلم عنہما بل یروی

حدیثہما عن غیرہما۔

محدثین نے استخراج کے فوائد پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ چند فوائد یہ ہیں۔

۱۔ اس کے ذریعے حدیث میں زیادہ الفاظ کی کوئی تشریح یا کسی محذوف کی تعیین ہو جاتی ہے

۲۔ کبھی مستخرج کی حدیث کی سند اصل سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

۳۔ کثرت طرق کی وجہ سے حدیث میں قوت آجاتی ہے اور احادیث میں باہم تعارض کے

وقت یہ قوت ترجیح میں بہت مفید کام کرتی ہے۔ یعنی تعارض کے وقت اس حدیث کو رائج

قرار دیا جاتا ہے جس کے طرق زیادہ ہوں اور کثرت طرق معلوم کرنے کا ذریعہ محدثین کے یہاں

استخراج ہے لہ

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ استخراج کے ان کے علاوہ اور بھی بہت فوائد ہیں۔

اول: مخرجین کی عدالت بھی اس سے صاف اور منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے

دوم: کسی بھی روایت میں سماع کی تصریح مل جائے تو عنعنہ کے ذریعے پیدا شدہ بہام تھیں

کاشبہ دور ہو جاتا ہے۔

سوم: احادیث میں ایک بڑا اور اہم مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو آخر عمر میں اختلاط کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ اختلاط حافظہ کی خرابی، بیماری یا کسی اور افتاد کی وجہ سے ہو جاتا ہے اصل کتاب میں آمدہ روایت کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ قبل از اختلاط ہے یا بعد از اختلاط۔ استخراج یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ روایت کس دور سے متعلق ہے۔

چہارم: اصل کتاب کے متن یا سند کے بارے میں ابہام ہوتا ہے۔ استخراج میں تصریح آجاتی ہے اور اس طرح چہرہ ابہام بے نقاب ہو جاتا ہے۔

پنجم: کبھی اصل کتاب کی حدیث میں راوی کے الفاظ خاص ہوتے ہیں باقی روایتوں کو صواب کتاب مثلاً یا نحوہ کہہ کر آگے چل دیتا ہے۔ استخراج کے ذریعے اس میں امتیاز جاتا ہے۔

ششم: احادیث کی سند یا متن میں گاہ گاہ راوی کی جانب سے ادراج ہوتا ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا۔ استخراج کے ذریعے ادراج منع ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

ہفتم: حدیث بظاہر مرفوع ہوتی ہے لیکن واقعہ میں وہ موقوف ہوتی ہے۔ استخراج اس معاملے میں قاضی کا کام کرتا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں یعنی صحیحین کے جو مستخرجات لکھے گئے ہیں ان میں کچھ یہ ہیں:

- ۱۔ مستخرج حافظ ابو بکر احمد بن ابراہیم الاسماعیلی الجرجانی ^{۳۴۷ھ}
- ۲۔ مستخرج حافظ ابو احمد محمد بن ابی حامد القطری ^{۳۴۷ھ}
- ۳۔ مستخرج حافظ ابو عبد اللہ محمد بن العباس بن ابی ذر ^{۳۴۷ھ}
- ۴۔ مستخرج حافظ ابو بکر احمد بن موسیٰ مروزی الاصبہانی ^{۳۴۶ھ}
- ۵۔ مستخرج حافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائینی ^{۳۴۶ھ}
- ۶۔ مستخرج حافظ محمد بن محمد النیشاپوری ^{۳۴۷ھ}
- ۷۔ مستخرج حافظ ابو الفضل احمد بن سلمہ البزار ^{۳۴۶ھ}
- ۸۔ مستخرج حافظ ابو نعیم الاصبہانی ^{۳۴۳ھ}

احادیث صحیحین کے طرق و اسانید کی تعداد

سارے مستخرجات کا یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا ہے کہ اس سلسلے میں

محدثین نے کس قدر عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ حافظ ابن الدین عراقی، حافظ ابن الصلاح اور حافظ ابن کثیر کی تصریح کے مطابق صحیح بخاری میں آئندہ حدیثوں کی تعداد تکرار کو چھوڑ کر صرف چار ہزار ہے اور امام نووی اور حافظ ابن کثیر کی رائے کے مطابق صحیح مسلم میں حدیثوں کی تعداد بھی صرف چار ہزار ہے۔ لیکن استخراج کی وجہ سے ان چار ہزار حدیثوں کو جن جن طریقوں سے روایت کیا گیا ہے اور حدیثوں کی یہ تعداد جن اسانید کے ذریعے آج اُمت کے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی تعداد صرف چار ہزار نہیں بلکہ پچیس ہزار چار سو اسی ہے چنانچہ محمد بن اسماعیل الیما فی رقمطراز ہیں:

صحیحین کے سائے طرق اور اسانید کی تعداد کے بارے میں حافظ ابن جریر نے حافظ جوزقی کی المتفق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کا استخراج کیا ہے۔ تمام طرق و اسانید کی مجموعی تعداد پچیس ہزار چار سو اسی ہے۔

اللہ اکبر! صرف چار ہزار ارشادات نبوت اُمت کو پچیس ہزار چار سو اسی طریقوں اور اسانید سے ملے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اتنے بڑے انبوہ نے ان ارشادات کو کھنڈ کر کے نہیں کوئی کوتاہی کی ہوگی۔ نظر کو بلند کر لیجئے اور ان لوگوں کی محنتوں اور عرق پریوں کی داد دیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین میں ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ صحیحین کی تمام احادیث قطعیت کو مفید ہیں۔ حافظ ابن حزم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک حدیث کے لیے کتنے راویوں کی ضرورت ہے جس کے بعد حدیث بدایہ علم کا فائدہ دے سکے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی خاص عدد مقرر نہیں ہے۔ اگر دو شخص بھی کوئی خبر دیں اور ان کے بارے میں ہمیں یہ یقین ہو کہ اس سے پہلے نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ اس خبر میں ان کے لالچ یا خوف کو کوئی دخل ہے۔ پھر ایک دوسرے کی لاعلمی میں اس خبر کو ہمارے سامنے بیان کریں وہ بھی از خود نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کے واسطے سے۔ تو ہمیں ان کی سچائی کا بدیہی طور پر یقین آجائے گا۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے حالات سے وابستہ کی زندگی میں دوچار ہوتا ہے ہمارے اس بیان کی شہادت دے سکتا ہے کسی کی موت، ولادت، نکاح، ولایت اور اس قسم کے تمام واقعات کا بدیہی علم ان طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔

بہر حال صحیحین کے طرق و اسانید کی یہ تعداد بتا رہی ہے کہ احادیث صحیحین صحیح ہیں اور صرف صحیحین کی خصوصیت نہیں بلکہ دوسری کتابوں کے بھی مستخرج لکھے گئے ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں:

مستخرج صحیحین ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ محمد بن عبد الملک نے سنن ابی داؤد کا ابو علی الطوسی نے ترمذی شریف کا اور ابو نعیم نے ابن خزمیہ کی کتاب کا مستخرج لکھا ہے۔

صحیحین اور دوسری کتب کے اطراف

محدثین کی زبان میں مسانید اور اطراف دونوں میں مرکزی توجہ روایت کنندہ صحابی پر ہوتی ہے یعنی ہر صحابی کی روایات کو بلا لحاظ مضمون یکجا کیا جاتا ہے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مسانید میں پوری حدیث بیان کرتے ہیں مگر اطراف میں صرف حدیث کا کوئی مشہور حصہ بیان کر کے شیخین اور سنن کے تمام مشترک اور مخصوص طرق کا ذکر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حدیث کے شروع سرے کو اتنا بیان کر کے کہ جس سے باقی حدیث کی یاد دہانی ہو جائے اس کی تمام اسانید کو بالاستیعاب بیان کیا جاتا ہے یا ان کتابوں کا پتہ دے دیا جاتا ہے کہ جن میں یہ حدیث مروی ہے۔ اس موضوع پر بہت سے حفاظ حدیث نے داد تحقیق دی ہے۔ ان میں سب سے پہلے جن بزرگ نے صحیحین پر اطراف لکھے ہیں وہ حافظ ابو مسعود مشقیؒ ہیں ان کے بعد حافظ ابو محمد خلف بن محمدؒ، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر نے بھی یہ علمی خدمت انجام دی ہے۔

صحیحین کے علاوہ کتب خمسہ کے اطراف حافظ احمد بن ثابت ازدی نے بھی لکھے اور کتب سنہ کے اطراف لکھنے والے یہ بزرگ ہیں۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسیؒ، حافظ ابو الحجاج جمال الدین المزنیؒ، حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد بن علی الحسینی دمشقیؒ، حافظ ابو القاسم بن عساکر، حافظ سراج الدین ابو حفص عمر بن نور الدین علی بن احمد الانصاری المعروف بابن الملقن۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابوں کے اطراف لکھے گئے ہیں۔ حافظ ابن طاہر نے امام اعظم کی احادیث پر اطراف لکھے

ہیں جس کا نام اطرافِ احادیث ابی خنیفہ ہے۔

دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین حدیث

ہم نے بالا روئے تیسری صدی کے محدثین میں اربابِ صحاح کے تالیفی کارناموں پر ذرا کچھ تفصیلی تبصرہ کیا ہے کیونکہ اس صدی میں فنِ حدیث کے ارتقاء کا یہ وہ نقطہ کمال ہے جہاں پہنچ کر علمِ حدیث ایک فن کی حیثیت سے ہر قسم کی قوت سے آراستہ ہو کر منصفہ شہود پر آیا اور اس فن کا ایک ایک شعبہ محدثین کی محنتوں سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس صدی کے محدثین اور اربابِ روایت نے حدیث کی خاطر خشکی اور تیری کو چھان مارا اور دنیا سے اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچے ایک ایک شہر اور ایک ایک کاذب میں جا کر تمام منتشر اور پراگندہ روایوں کو جمع کیا اور اس طرح مسانید و جود میں آگئے۔ صحتِ سند کی چھان بین کی گئی۔ اسماء الرجال کی تدوین ہوئی، جرح و تعدیل نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی تا آنکہ صحاح جیسی بیش بہا کتابیں تصنیف و تالیف کے بازار میں آگئیں۔ چونکہ تیسری صدی میں اسنادی وسائط کا دامن زیادہ سے زیادہ وسیع ہو گیا حتیٰ کہ جو حدیث دوسری صدی میں صرف دو واسطوں سے معلوم ہوتی تھی وہ تیسری صدی میں چھ اور سات واسطوں کی محتاج ہو گئی۔ اس دور کے محدثین کو تاریخ رجال کی طرف توجہ کرنی پڑی اور اسماء الرجال کا عظیم الشان فن مدون ہوا۔

ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ کہنا ایک واقعہ اور حقیقت کا اقرار ہے کہ

”کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح

اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت ہم آج پانچ لاکھ

اشخاص کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔“ (ترجمان السنہ ص ۱۷۰)

محدثین نے اس کام کے لیے بڑے جتن کیے اور پاپڑ بیٹے ہیں۔ ہر ہر راوی کے پورے پورے حالات معلوم کیے۔ اس کے نتیجے میں ہر روایت کے بائے میں اسناد کے لیے بلحاظ قوت و ضعف، صحت و بطلان اور اتصال و انقطاع نئی نئی بحثیں پیدا ہو گئیں اور حدیث کے فن میں نئی نئی اصطلاحات منصفہ شہود پر آگئیں۔

بناءً علیہ تیسری صدی کے محدثین کی راہ علمِ حدیث کے سلسلے میں دوسری صدی کے محدثین سے کچھ ممتاز ہو گئی کیونکہ دوسری صدی کے محدثین براہِ راست مشاہیر تابعین یا کبار تابعین

کے تلامذہ تھے اور اس لیے ان کو اسناد کے بارے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت تھی لیکن تیسری صدی میں روایت میں اسنادی وسائل پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گئے تھے اس لیے تیسری صدی کے محدثین کو نئے حالات اور جدید تقاضوں کے تحت اپنی شاہراہ بنانی پڑی۔ علم حدیث کے مختلف گوشوں میں اس کا نمایاں طور پر ظہور ہوا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں اس پر قدرے تفصیل سے بحث کریں تاکہ ناظرین کے سامنے خالص روایتی نقطہ نظر سے دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کے مابین فرق نمایاں ہو کر آجائے اور ان اختلافی حدود کی نشاندہی ہو جائے جس کی بنا پر علم حدیث کو یہ حالات درپیش آئے ہیں۔ سب سے پہلے اس موقع پر نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کا وہ بیان پیش کر دیں جس سے ان دونوں صدیوں کے محدثین کے طرز عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے شاہ صاحب تیسری صدی کے مؤلفین کا چہرہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :

غرض احادیث کی تدوین اور ان کو رسالوں اور کتابوں میں لکھنے کا رواج تمام اسلامی شہروں میں اس قدر عام ہو گیا کہ محدثین میں شاید ہی ایسے حضرات تھے جن کے پاس حدیث کا کوئی مجموعہ، رسالہ یا کتاب نہ ہو۔ ہر شخص ان میں سے حدیث در بغل کا مصداق تھا۔ بڑے بڑے علماء نے حدیث کی خاطر حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کی خاک چھان ماری۔ کتابیں جمع کیں، نسخے تلاش کیے۔ احادیث خریدی اور نوادرو آثار کو بہت محنت سے فراہم کیا اور ان کی توجہ سے وہ احادیث منصفہ شہود پر آگئیں جو پہلے نہ تھیں اور ان کو وہ بات اس علم میں نصیب ہوئی جو پہلے کسی کو نصیب نہ تھی اور احادیث کی سندیں اس کثرت سے وجود میں آگئیں کہ بہت سی حدیثوں کی سینکڑوں سندیں معلوم ہو گئیں۔ اسانید کی کثرت نے بہت سی مستور اسانید سے پردہ ہٹا دیا۔ ہر حدیث کی غرابت اور شہرت کا پتہ لگ گیا۔ متابعات اور شواہد وجود پذیر ہو گئے۔ وہ احادیث سامنے آئیں جن سے پہلے اربابِ فتویٰ باخبر نہ تھے اور باخبر نہ ہونے کی وجہ تھی کہ بہت سی حدیثوں کو خاص خاص شہر والے ہی روایت کرتے رہے، مثلاً شام والے، عراق والے یا پھر خاص گھرانے کے آدمی روایت کرتے ہیں جیسے بریدہ کی کتاب اور عمرو بن شعیب کا رسالہ یا پھر مثلاً کوئی

روایت بیان کرنے والا صحابی غیر مشہور ہے اور اس سے چند حضرات کے سوا کسی نے روایت نہیں سنی ہے۔ تیسری صدی کے محدثین سے پہلے لوگ اسماء الرجال اور مراتب عدالت کے بارے میں صرف اپنے مشاہدے اور قرائن پر اعتماد کرتے تھے لیکن محدثین نے اسی کو موضوع بنا کر خوب چھان بین کی اور بحث و تدوین کے ذریعے اسے مستقل فن بنا دیا اس کے نتیجے میں حدیث کا اتصال و انقطاع واضح ہو گیا ہے

اُسے شاہ صاحب ہی کی زبانی دوسری صدی کے محدثین کا بھی حال سن لیجئے۔ وہ انصاف اور حجتہ اللہ میں رقمطراز ہیں کہ:

اس طبقہ کے علماء کا طرز عمل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا جاتے چاہے وہ مرسل ہو یا مسند۔ نیز صحابہ و تابعین کے اقوال سے استدلال کیا جاتے کیونکہ ان کے علم میں یہ اقوال یا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں جن کو انہوں نے مختصر کر کے موقوف بنا لیا تھا پھر حکم منصوص سے ان کا استنباط تھا یا اپنی آراء سے ان کا اجتہاد تھا اور ہر صورت میں صحابہ و تابعین اپنے طرز عمل کے اعتبار سے بعد میں آنے والوں سے کہیں بہتر تھے اور کہیں زیادہ صائب الرائے تھے۔ نیز زمانے کے لحاظ سے سب مقدم اور علم کے اعتبار سے سب بڑھ چڑھ کر تھے لہذا سوائے اس صورت کے کہ ان میں باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ان کے قول کے صریح خلاف ہو۔ ہر حال میں ان کے اقوال پر عمل کرنا لازم ہے اور جس صورت میں کسی بھی مسئلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مختلف ہوں تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر صحابہ کسی حدیث کے نسخ کے قائل ہوتے یا اس کو ظاہری معنی سے پھیر دیتے یا اس کے بارے میں

کوئی تصریح نہ کرتے لیکن ترک حدیث یا اس پر عمل نہ کرنے میں متفق ہوتے تو ان کے نزدیک یہ بات حدیث کے محلل ہونے یا منسوخ ہونے اور یا پھر موٹوں ہونے کی علامت ہوتی۔ بہر حال ان سب صورتوں میں اس طبقہ کے علمائے صحابہ ہی کا اتباع کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے کتے کے برتن میں منہ ڈالنے والی حدیث کے بارے میں فرمایا کہ جہاد الحدیث دلا دہری ما حقیقتہ؟ حدیث تو ہے مگر مجھے اس کی حقیقت کا پتہ نہیں ہے۔ امام مالک کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس پر فقہاء کو عمل کرتے نہیں دیکھا ہے۔ اور جب صحابہ و تابعین کے مذاہب میں بھی اختلاف ہوتا تو ہر عالم کے نزدیک اپنے ہی اہل شہر اور اپنے اساتذہ کا مذہب اختیار سمجھا جاتا۔ کیونکہ وہ ان کے صحیح اور غیر صحیح اقوال سے باخبر ہوتا اور جو اصول ان اقوال کے مناسب ہوتے ان کو محفوظ رکھتا ہے۔ اسی روشنی میں دوسری صدی کے مؤلفین نے اپنے مسائل کی تدوین کی ہے۔ شاہ صاحب نے یہی بات قرۃ العینین میں پورے زور سے کھول کر سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں:

اور جو شخص ان مذاہب کے اصول سے واقفیت رکھتا ہے اس بارے میں شک نہیں کر سکتا کہ ان مذاہب کی اصل و اساس فاروق اعظم کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان تمام مذاہب کے درمیان ایک مشترک چیز ہے۔ اس کے بعد مدینہ والوں میں فقہاء رصیہ مثلاً عبداللہ بن عمر اور عائشہ ہیں اور کبار تابعین مدینہ میں سے فقہاء سبعمہ اور صفار تابعین میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالک کے مذہب کی بنیاد ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاویٰ پر اعتماد اکثر حالات میں اور حضرت علی مرتضیٰ کے فیصلوں پر کچھ حالات میں بشرطیکہ حضرت علی کے ان فیصلوں کو تسل کرنے والے عبداللہ بن مسعود کے اصحاب ہوں اور اس کے بعد امام ابراہیم سنحی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریج پر

اعتماد امام ابو حنیفہ کے مذاہب کی بنیاد ہے یہ
 آپ نے حکیم الامت کی زبان سے دوسری اور تیسری صدی کے علماء محدثین میں فرق و امتیاز
 اور خطوط اختلاف پر مدلل ہے۔ یقیناً آپ اس موازنہ سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دوسری اور
 تیسری صدی کے محدثین کے مابین ایک سے زیادہ مسائل علم حدیث کی حدود کے اندر روئے ہو گئے
 تھے۔ حدیث کی صحت، تعدیل حدیث، جرح و تعدیل رواۃ، حدیث کے رد و قبول، تحمل و سماع
 حدیث، شہرت و غرابت حدیث، وجوہ ترجیح اور مختلف احادیث میں مفاد ہمت، شرح حدیث
 اور خود حدیث کے آئینی اور قانونی مقام جیسے اہم مسائل میں تیسری صدی کے مؤلفین نے اپنی
 راہ بالکل نئی بنالی۔

دوسری اور تیسری صدی میں صحت حدیث کا معیار

اصول میں حدیث صحیح کی یہ تعریف کی گئی ہے
 الصحيح ما اتصل بسندہ بنقل عدل ضابط عن مثله من غير
 شذوذ ولا علة قاذية له

حدیث صحیح کی یہ تعریف حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی نے کی ہے۔ اگرچہ
 اس تعریف سے امام خطابی صاحب معالم السنن کو اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محدثین کے
 نزدیک صحیح یہ ہے کہ :

ما اتصل بسندہ عدلت نقلتہ
 اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامہ محدثین کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے کے لیے
 ضروری ہے۔

سند میں اتصال ہو، راویوں میں عدالت اور ضبط ہو اور حدیث شاذ
 اور معطل نہ ہو۔

اور امام خطابی راویوں کی عدالت اور سند کے اتصال کے علاوہ کوئی شرط نہیں بتاتے۔ یہ تیسری
 صدی کے محدثین کا فیصلہ ہے اور اسے ہی حافظ ابن الصلاح نے محدثین کا اتفاق موقوف قرار

دیا ہے۔ اس میں تین چیزیں مثبت ہیں اور دو منفی۔ مثبت یعنی اتصال سند، عدالت اور ضبط اور منفی یعنی تشاؤ نہ ہونا اور معتدل نہ ہونا۔ امیر یحیٰی فرماتے ہیں کہ محدثین کے یہاں صحیح کی تعریف میں یہ پانچوں چیزیں بنیادی ہیں۔

ان پانچوں میں سے اتصال کی قید تیسری صدی کے محدثین نے اس لیے اضافہ کی ہے کہ ان کے زمانے میں اسنادی وسائط زیادہ ہو گئے تھے ان واسطوں میں اہم کڑیاں معلوم کرنا اور پھر ان میں باہم اتصال کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ امام بخاری نے اتصال کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ دور اولوں کا صرف معاصر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک بار ہی ہو۔ اگر معاشرت کے ساتھ ملاقات ہو تو پھر وہ عنعنہ سے روایت کو قبول کر لیتے ہیں ورنہ وہ اتصال کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امام بخاری نے اس نظریہ کی توضیح تاریخ میں کی ہے اور صحیح میں ان کا اسی پر عمل ہے۔

قد اظہر لبخاری هذا المذهب في التاريخ وجرى عليه في الصحيح لـ

لیکن امام مسلم نے اتصال کے معاملے کو اس قدر سنگین نہیں بنایا بلکہ وہ اس سنگینی پر امام بخاری پر برہم بھی نظر آتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر دونوں میں معاشرت ہو تو پھر ملاقات کی شرط بے سود ہے۔ معاصر دوسرے معاصر سے اگر روایت عنعنہ سے پیش کرے تو اسے اتصال پر محمول کیا جائے گا اور اس پر صحیح مسلم کے مقدمہ میں ایک بصیرت افروز نوٹ لکھا ہے۔

ان بزرگوں نے اتصال کو اتنی اہمیت اس لیے دی ہے کہ اسانید کے سلسلہ میں وسائط کی بہتات کی وجہ سے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ ایک ایک راوی کے بارے میں ان کو یہ تحقیق کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ جس سے وہ روایت لیتا ہے وہ اس کا معاصر ہے یا نہیں ہے۔ معاصر ہے تو اس سے اس کی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں اور اگر ملا ہے تو اس نے یہ خاص حدیث اس سے سنی ہے یا کسی اور سے سن لی اور اس کا سوال اٹھے دیا ہے ایسے بہت سے امور کی پابجائی میں محدثین کو جان کی بازی لگانا پڑی ہے لیکن دوسری صدی کے متوفین کو چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار اتباع تابعین سے شرف تلمذ تھا اس لیے ان کو نہ اسناد کے بارے میں تحقیقات کی زیادہ ضرورت پیش آتی اور نہ ان کے یہاں اتصال کو اس قدر اہمیت تھی۔ ان کے یہاں سند و سلسلہ

کی کوئی تفریق نہ تھی مرسل بھی مسند کی طرح حجت تھی۔

حدیث مرسل محدثین کی اصطلاح میں وہ حدیث کہلاتی ہے جس میں تابعی اپنے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جو واسطہ ہے اس کو بیان کیے بغیر قال رسول اللہ کہے جیسا کہ عام طور پر کچھول و مشقی، ابراہیم، سعید بن المسیب اور حسن بصری اور دیگر تابعین کا معمول تھا۔ پھر اگر راوی نے دو راویوں کے درمیان جو شخص واسطہ ہے اسے چھوڑ دیا جیسے ایک شخص حضرت ابو ہریرہؓ کا ہم عصر نہ ہونے کے باوجود کہے قال ابو ہریرہؓ تو ایسی روایت محدثین کی زبان میں منقطع کہلاتی ہے اور اگر ایک سے زیادہ واسطے حذف کر دیے تو اسے معضل کہتے ہیں اور فقہاء و اصولیین کے یہاں ان سب کو مرسل کہتے ہیں۔

حدیث مرسل اور دوسری صدی ائمہ حدیث

حدیث مرسل کے بارے میں تیسری صدی میں ارباب روایت نے اپنا موقف دوسری صدی کے مؤلفین سے اتصال کی خاطر الگ بنا لیا ورنہ تیسری صدی سے پہلے اسنادی وسائط کم ہونے کی وجہ سے سب ہی حدیث مرسل کو دین میں مسند کی طرح حجت مانتے تھے اور مسائل و فتاویٰ کی بنیاد اسی پر قائم تھی۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

تابعین سائے کے سائے مرسل کے قبول پر متفق تھے ان سے پہلے
اور ان کے بعد کسی بھی امام سے دوسری صدی کے اختتام تک اس کا
انکار ثابت نہیں ہے۔

علامہ یحییٰ نے حافظ ابن جریر کا یہ فیصلہ حافظ ابن عبد البر اور حافظ بلقینی سے نقل کیا ہے
امام ابو داؤد نے اپنے اس خط میں جو اہل مکہ کے نام لکھا ہے مرسل حدیث کے بارے میں
اقرار کیا ہے کہ:

باتی رہیں احادیث مرسلہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو گزشتہ علمائے مثلاً
سفیان ثوری، امام مالک، امام اوزاعی سب ہی قابل استدلال سمجھتے
تھے تاہم امام شافعی آئے اور انہوں نے اس پر لب کشائی فرمائی اور

امام احمد نے بھی اس موضوع پر ان کا اتباع کیا ہے
بلکہ حافظ ابن جریر تو یہاں تک کہہ گئے کہ یہ کہنا کہ مرسل حجت نہیں ہے
بدعتہ حدث بعد مائتین تیسری صدی کی بدعت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دوسری صدی کے بزرگوں کو غلبہ عدالت کی وجہ سے اپنے زمانے کے بزرگوں
پر ایسا ہی اعتماد تھا جیسا اس زمانے میں ابن حجر اور دارقطنی کو بخاری و مسلم پر ہے کیونکہ اس دور
میں عدالت غالب تھی چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر فرماتے ہیں :
ولا شك ان الغالب على حملة العلم النبوي في ذلك الزمان
العدالة۔

بے شک اس زمانے میں اہل علم میں عدالت غالب تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ ایک متدین، متقی اور پرہیزگار شخص سے امید بھی یہی کی جاسکتی ہے
کہ اس بڑی ذمہ داری کو انہوں نے اطمینان کے بعد ہی اٹھایا ہے کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کی طرف کسی بات کو
منسوب کرنا اور اصل اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کرنا ہے جس کے دین و ایمان، سیرت و کردار پر
بھروسہ کیا جاتا ہو کیا اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ قصد اللہ کے دین میں کسی ایسی چیز کا
اضافہ کر دیں گے جسے وہ جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت درست
نہیں ہے یقیناً ایک حیثیت سے یہ افتراء علی اللہ اور قول علی اللہ بغیر علم ہے اور قرآن میں
ایک سے زیادہ مقامات پر اسے سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے۔ جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو یقیناً
ان سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے۔ اسی بنا پر ان بزرگوں کے
نزدیک حدیث مرسل حجت ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر لکھتے ہیں۔
مرسل الصحابة والتابعين وأئمة الحديث مقبولة۔

سو چاہئے کہ ائمہ حدیث کے مراسیل آج بھی ہمارے یہاں کیا اسی بنا پر مقبول نہیں ہیں ؟
ائمہ حدیث کی جو کتابیں آج رائج ہیں کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اصول حدیث کے مقررہ اصول کے
مطابق ان کا اتصال ثابت ہے ؟ اب ان کتابوں کی مرویات کو ان کتابوں کے مؤلفین تک جن

اسانید تک پہنچاتے ہیں اور جن رجال کے ذریعے ہم تک پہنچ رہے ہیں کیا ان کی عدالت، ثقافت، امانت، حفظ و ضبط کی ہم نے اسی طرح چھان بین کی ہے جس طرح امام بخاری اور امام مسلم نے اپنے اساتذہ سے لے کر صحابہ تک کی ہے۔ ان کتابوں کی مرویات کو ان کی طرف منسوب کرنے کی ہمارے پاس اس کے سوا دلیل ہی کیا ہے کہ

والدلیل علی ذالک ان العلماء ما زالوا ینسبون فی مصنفاتہم
الاحادیث الی من اخرجہا۔

اس بات کی اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہمیشہ سے علماء اپنی تصانیف میں حدیثوں کو ان محدثین کی طرف نسبت کرتے رہے ہیں۔
اس لیے جیسا کہ ہمیں ان ائمہ حدیث کی بیان کردہ حدیثوں پر باوجود اتصال نہ ہونے کے اعتماد ہے ایسا ہی امام مالک کو سعید بن المسیب کے اور امام ابو حنیفہ کو امام شعبی اور ابراہیم نخعی کے روایت کردہ ارشادات پر اعتماد تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

ابراہیم نخعی نے ایک موقع پر جب کہ انہوں نے یہ حدیث روایت کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محافلہ اور مزائنتہ سے منع فرمایا ہے اور ان سے کہا گیا تھا کہ کیا تمہیں اس کے سوا اور کوئی حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد ہی نہیں۔ کہا کہ کیوں نہیں؟ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ قال عبد اللہ، قال علقمہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اسی طرح شعبی جس وقت ان سے ایک حدیث کی بابت سوال کیا گیا اور کہا گیا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا جائے تو یہ جواب دیا تھا کہ نہیں مرفوع نہ کرو ہم کو یہ زیادہ محبوب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص تک اس کو نقل کیا جائے کیونکہ اگر روایت میں کمی و بیشی ہوگی تو وہ بعد کے شخص پر ہی سہے گی۔

بہر حال دوسری صدی کے مؤلفین کے یہاں حدیث کے صحیح ہونے کے لیے مسند ہونا ضروری نہ تھا بلکہ وہ مرسل اور منقطع سب کو یکساں دین میں حجت قرار دیتے تھے۔

اگرچہ مرسل کا انکار تیسری صدی کے محدثین نے اسناد میں زیادتی کی وجہ سے اپنے خیال میں احتیاط کی بنا پر کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو متعدد مسائل میں جہاں مرسل کے علاوہ اور کوئی روایت مسند ان کے علم میں نہ تھی۔ اگلے ائمہ سے اختلاف کرنا پڑا۔ متاخرین میں دارقطنی اور بیہقی بڑے نامور محدث گذرے لیکن ان دونوں کا حال یہ ہے کہ سند پر سند اور روایت پر روایت ذکر کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ضعیف ہونے کی ان کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اسے مرسل ثابت کریں یا موقوف کہہ دیں۔

یہ نہ بھول جاتیے مصنفین صحاح میں سے اگرچہ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ مرسل روایات حجت نہیں ہیں لیکن یہ تمام ارباب صحاح کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔
امام ابو داؤد فرماتے ہیں:

فاذا لم يكن مسنداً للمرسل ولم يوجد مسنداً للمرسل يمتنع به
وليس هو مثل المعضل في القوة۔

جب مسند مرسل کے خلاف نہ ہو اور مسند موجود نہ ہو تو مرسل سے احتجاج کیا جاتے گا اور وہ قوت میں معضل کی طرح نہ ہوگی یہ

مراسل صحابہ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب القراءۃ میں لکھتے ہیں کہ مراسل صحابہ حجت ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ مراسل صحابہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک حجت ہیں۔ اور ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماء کرام کے نزدیک مرسل صحابی حجت ہے یہ
اور علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ

صحابہ کرام کے مراسل حدیث مسند کے حکم میں ہیں تھے
کبار تابعین کے بارے میں بھی امام بیہقی نے تصریح کی ہے کہ:
مراسل کبار تابعین بھی مراسل صحابہ کی طرح حجت ہیں جبکہ ان کے راویوں میں
عدالت اور شہرت ہو اور کمزور و مجہول رواۃ کی روایت سے اجتناب ہو گیا

۱۔ رسالہ ابی داؤد۔ ۲۔ شرح مہذب ج ۴ ص ۸۲۔ ۳۔ نیل الأقطار ج ۱ ص ۲۴۱۔ ۴۔ کتاب القراءۃ ص ۱۴۳
واضح ہے کہ ان تصریحات کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کسی نہ کسی انداز میں
سب مانتے ہیں کہ مراسل دین میں حجت ہیں اختلاف تفصیلات میں ہے نفس مسند میں نہیں ہے۔

اس موقعہ پر حافظ ابوسعید صلاح الدین العلانی نے جامع التحصیل لاحکام المراسیل میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔

جن لوگوں نے احادیث میں عنعنہ سے کام لیا ہے اور ان پر تدلیس کا شبہ ہے وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ کچھ تو اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس زمرہ میں شمار ہی نہیں ہو سکتے مثلاً یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن عقبہ۔ کچھ ایسے ہیں جن کی تدلیس کو ائمہ نے برداشت کیا ہے اور ان کی روایت لی ہے چاہے انہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی ہے اور ایسا صرف ان کی جلالت شان اور امامت کی وجہ سے ہے مثلاً امام زہری، امام عثمٰش، ابراہیم نخعی، الحکم بن عقیبہ، جریر بن عبد اللہ، الثوری، ابن عیینہ، شریک اور یثیم بن بشیر، ان کی روایات صحیحین میں موجود ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ کی صحیح بخاری میں روایت موجود ہے لیکن اسماعیل نے تصریح کی ہے کہ ان کا امام زہری سے سماع ثابت نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ابان بن عثمان کی بحوالہ عثمان بن عفان روایت موجود ہے حالانکہ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابان نے عثمان سے نہیں سنا ہے اس انقطاع کے باوجود ان روایات کا کتابوں میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے یہاں بھی مراسلات کو شرف حاصل ہے۔ اس موقعہ پر ہمیں حافظ ابن رجب حنبلی کی وہ بات پسند آتی ہے جو مشہور علامہ زاہد کوثری نے ان سے نقل کی ہے اور جس کے ذریعے انہوں نے مراسلات کے موضوع پر دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی ہے فرماتے ہیں:

دونوں کے نقطہ نظر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ محدثین کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے محدثانہ اور روایتی نقطہ نظر سے انقطاع اور عام اتصال کی بنا پر اگر کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور وہ مرسل ہے تو وہ درجہ صحت میں آجاتے اور فقہاء یعنی دوسری صدی کے محدثین کی نظر اس کی اسناد پر نہیں بلکہ ان معنی پر ہوتی ہے جو حدیث مرسل میں بیان ہو رہے ہیں اور اس کی پشت پر ایسے قرائن موجود ہیں جو

ان معنی کی صحت کی دلیل میں ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ محدثین کی نظر اسناد پر ہوتی ہے اور دوسری صدی کے محدثین کے پیش نظر صرف معنی ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایسے دور میں ہیں جس میں اسناد کی تحقیق کی چنداں ضرورت ہی نہیں ہے۔

افراد و غرائب اور تیسری صدی کے محدثین

چونکہ تیسری صدی کے محدثین نے اتصال کو صحت حدیث کا معیار بنایا تھا اس لیے انہوں نے ہزاروں نوشتے اور غیر متداول صحیفے کا کھوج لگایا۔ مختلف اسلامی شہروں کے افراد و غرائب فراہم کیے اور تمام پریشان اور غیر متداول روایات جمع کر لیں اور طرق و اسانید کے ذریعے تمام علوم اسلامی جواب تک خاص خاص سینوں اور سفینوں میں منتشر تھے یکجا ہو گئے۔ دوسری صدی کے موفقیین عام طور پر اپنی کتابوں میں ان ہی روایات کو جگہ دیتے تھے جو اہل علم میں متداول تھیں۔ قاضی ابو یوسف نے ایسے موقعہ کے لیے یہ جچا تلا معیار پیش فرمایا تھا کہ :

الرأیة تزاد کثرة و یخرج منها ما لا یعرف ولا یعرفه
اهل الفقه ولا یوافق الکتاب ولا السنة فایاک وشاذ
المحدث وعلیک بما علیہ الجماعة من الحديث و ما
یعرفه الفقهاء و ما یوافق الکتاب و السنة۔

روایات میں بجا نظر کثرت اضافہ ہو گا اور غیر معروف حدیثیں منقذہ شہود پر آئیں گی جن کو نہ اہل فقہ جانتے ہیں اور جو نہ کتاب و سنت کے موافق ہیں۔ تم حدیث شاذ سے بچ کر رہنا اور صرف اس حدیث کو اپنانا جو جماعت پیش کرے جسے فقہاء جانتے ہوں جو قرآن و سنت کے موافق ہو۔

لیکن تیسری صدی کے محدثین میں یہ انداز بدل گیا اور اس کے نتیجے میں افراد و غرائب کے جمع ہو جانے پر ایسی روایات سامنے آئیں کہ جن پر صحابہ، تابعین اور فقہاء مجتہدین کا عمل نہ تھا اور جو فقہاء

میں متداول اور معروف نہ تھیں۔ تیسری صدی میں جن محدثین پر روایتی نقطہ نظر کا غلبہ تھا ان کو ان افراد غائب کی صحت پر اصرار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صحیح سند سے ایک چیز کے ثابت ہو جانے کے بعد اس پر عمل میں چون و چرا کرنا دیدہ و دانستہ حدیث کی مخالفت ہے لیکن دوسری صدی کے محدثین ایسی روایات کو شواذ کہتے ہیں۔ تیسری صدی کے محدثین صحت سند پر زور دیتے تھے۔ اس وجہ سے تیسری صدی کے ارباب روایت نے ایسی تمام روایات کو معمول بہ قرار دیا اور ان مسائل میں دوسری صدی کے مجتہدین سے بالکل جدا گانہ رائے قائم کر لی اور صحابہ و تابعین کے جو فتاویٰ ان روایات کے خلاف تھے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نحن رجال ہمد رجال یعنی جس طرح ان کو اجتہاد کا حق تھا ہمیں بھی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں ہم یہاں آپ کی ضیافت طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ابوداؤد و ترمذی کی حدیث قلتین

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ :

سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن لمار و مایثوبہ من
الدواب والسباع فقال صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان الماء
قلتین لم یحیل الخیث لہ

صرف ابوداؤد میں ہی نہیں بلکہ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ یہ حدیث خواہ کتنے ہی متعدد طرق سے آئی ہو اور خواہ سند کے لحاظ سے کیسی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ یہ حدیث دوسری صدی میں غیر معروف تھی۔ اسے اہل علم و فتویٰ میں سے کوئی بھی قابل عمل سمجھتا تھا اور اس بنا پر قاضی ابویوسف کی زبان میں شاذ تھی۔

حافظ ابن القیم نے تہذیب سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے ہر پہلو پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن اس ساری بحث میں سب سے زیادہ لطیف پہلو وہ ہے جس میں انہوں نے اس حدیث کے شذوذ کو بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

یہ حدیث حلال و حرام، پاک و ناپاک کے بلے میں فیصلہ کن ہے

اور پانیوں کے مسئلہ میں اس کی حیثیت وہی ہے جو زکوٰۃ کے مسئلہ میں مختلف نصاب ہاتھ زکوٰۃ کی ہے۔ اگر اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک یہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ حدیث صحابہ میں مشہور نہیں ہوتی اور گوشہ گنہامی میں پڑی رہی۔ حالانکہ امت کو اس کی نصاب زکوٰۃ سے بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ زکوٰۃ تو ہر کس و ناکس پر فرض نہیں ہوتی مگر پانی تو ہر وضو اور غسل میں اسلامی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے اس لیے ضروری تھا کہ یہ حدیث ایسے ہی ذرائع سے ہمارے پاس پہنچتی جن ذرائع سے پیشاب کی سباحت، اس کے غسل کا وجوب اور نماز کی عدد رکعات نقل ہو کر آتی ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنے والے صرف ایک حضرت عبداللہ بن عمر ہیں اور حضرت عبداللہ سے روایت کرنے والے صرف عبید اللہ اور عبداللہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے دوسرے تلامذہ نافع، سالم، ایوب اور سعید بن جبیر کہاں گئے اور اہل مدینہ اور ان کے علماء اس حدیث سے کیوں بے خبر رہے حالانکہ وہ اس حدیث کے سب سے زیادہ ضرورت مند تھے کیونکہ پانی کی ان کے یہاں قلت تھی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت ابن عمر کو یہ حدیث معلوم ہو اور ان کے اصحاب اور ان کے شہر میں جو اہل علم تھے ان کو خبر نہ ہو اور وہ اس کو روایت نہ کریں۔ لہذا اگر یہ حدیث حضرت ابن عمر کے پاس ہوتی تو ابن عمر کے اصحاب اسے روایت کرتے اور اہل مدینہ کا یہ مسلک ہوتا۔ اس سے بڑھ کر اس حدیث کا شذوذ اور کیا ہوگا؟ اور چونکہ اس کا قائل کوئی نہیں ہے اس لیے اس موضوع پر حضرت ابن عمر کے پاس حدیث کا ہونا ثابت نہیں ہے۔ یہ اس روایت کے شاذ ہونے کا بیان ہے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث نے بھی اس حدیث کے متروک العمل اور شاذ ہونے پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

اس کی مثال حدیث ثلثین ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح ہے اور ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے۔ سب کا دار و مدار ولید بن کثیر عن محمد بن جعفر بن الزبیر عن عبد اللہ یا محمد بن عباد بن جعفر عن عبید اللہ بن عبد اللہ ہے۔ دونوں عبد اللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں اس سند کے بعد اس کے بہت سے طریقے ہیں۔ عبد اللہ اور عبید اللہ کی ثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن ان علماء میں سے نہیں جن پر فتویٰ کا دار و مدار اور لوگوں کا اعتماد تھا۔ اس بنا پر یہ حدیث نہ سعید بن المسیب کے عہد میں ظاہر ہوئی اور نہ زہری کے زمانے میں اور نہ اس پر مالکیہ چلے اور نہ احناف میں سے کسی نے اس پر عمل کیا۔

دیکھ لیجئے کہ شاہ صاحب نے اس روایت کے دونوں مرکز عبید اللہ اور عبد اللہ کے بارے میں یہ کہہ کر

وان کا فامن الثقات لکنہما لیس ممن وسد الیہما الفتویٰ

وعول علیہما الناس۔

لفظ بلفظ اور حرف بحرف وہی بات کہہ دی جو ہم نے بتائی ہے کہ یہ روایت اہل علم اور اہل فتویٰ میں متداول نہ تھی اور یہی بات قاضی ابویوسف نے ما یحرفہ الفقہاء کے زریعے سمجھاتی تھی۔

صرف حدیث ثلثین ہی پر موقوف نہیں ہے اور بھی اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

ابوداؤد کی حدیث تائین

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے :

عن وائل بن حجر قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قرأ
ولا الضالين قال آمين ورفع بها صوته -
مضور النور صلى الله عليه وسلم جب ولا الضالين کہتے تو اونچی آواز سے
آمین کہتے -

حافظ ابن القیم نے اس حدیث پر جو نوٹ لکھا ہے وہ سن لیجئے - فرماتے ہیں :
حدیث وائل کو شعبہ اور سفیان دونوں نے روایت کیا ہے سفیان کی
روایت میں رفع بها صوته ہے اور شعبہ کی روایت میں اس کی جگہ
خفض بها صوته ہے - اس حدیث میں چار چیزیں قابل غور ہیں -
اول یہ کہ شعبہ اور سفیان کا رفع اور خفض میں اختلاف ہے - دوم یہ کہ
دونوں حجر کی شخصیت میں مختلف ہیں - شعبہ کہتے ہیں کہ ابوالعبس حجر
کی کنیت ہے اور سفیان کہتے ہیں کہ نام ہی حجر بن عبس ہے - سوم
یہ کہ حجر کا حال معلوم نہیں ہے - چہارم یہ کہ ثوری اور شعبہ مختلف ہیں
سفیان سے حجر عن وائل کی روایت بتاتے ہیں اور شعبہ سے حجر عن علقمہ
عن وائل کی روایت بتاتے ہیں - اگرچہ امام دارقطنی نے ثوری کی روایت
کی تصحیح کی ہے لیکن یہ محل نظر ہے اور اسی بنا پر امام ترمذی نے
روایت کی تصحیح نہیں کی ہے

اس روایت کے تفسر اور غرابت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے تمام رواۃ چھ ہے
سفیان ہوں یا شعبہ سلمہ بن کہل ہوں یا علقمہ بن وائل یا پھر عبد الجبار بن وائل - سب کوفہ
کے رہنے والے ہیں حتیٰ کہ امام دارقطنی اس کو اپنی سنن میں نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں :
هذه سنة تفرد بها اهل الكوفة

اور اس پر طرہ یہ کہ تمام اہل کوفہ ہیں کوئی بھی آمین بالجہر کا قائل نہیں ہے چنانچہ قاضی شوکانی
رقمطراز ہیں :

كذا روى عن ابى حنيفة والكوفيين -

صحیحین کی حدیث بخیار مجلس

یہ حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صاحب منتهی الاخبار نے شیخین کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے :

عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المتبايعان
بالحیار مالم یتم فانه

خود شیخین نے اسے متعدد پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کاروباری زندگی میں اگر دو آدمیوں میں کوئی سودا ہو جائے اور بات چیت ختم ہو جائے تو جب تک دونوں سودا کرنے والے ایک جگہ بیٹھے ہیں سودا توڑا جاسکتا ہے اور دونوں میں ہر ایک کو ایسا کرنے کا اختیار ہے لیکن شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

فانه حدیث صحیح روئی بطریق کثیرۃ وعمل بہ ابن عمر و
ابو ہریرۃ من الصحابة ولم یظهر علی الفقہاء السبعة
ومعاصر یہم فلم یقولوا یقولون بہ فرای مالک
والبوخیفة هذا علتہ قاذیۃ فی الحدیث

یہ حدیث صحیح ہے متعدد طریقوں سے مروی ہے اس پر صحابہ میں ابن عمر اور ابو ہریرہ نے عمل کیا ہے لیکن یہ حدیث فقہاء سبعہ اور ان کے معاصرین کے دور میں ظاہر نہیں اس لیے فقہاء سبعہ نے اس پر عمل نہیں کیا اور امام مالک اور امام البخاری نے فقہاء سبعہ کے عمل نہ کرنے کو اس حدیث کی صحت میں علت قاذیہ سمجھا ہے بلکہ حافظ ابوبکر الخطیب نے یہ حدیث نقل کر کے امام مالک کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے اس پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ مدینہ والوں کا عمل اس کے خلاف تھا چنانچہ فرماتے ہیں :

رواہ مالک ولم یعمل بہ ومنہ عنہ انما راہی

اہل المدینۃ علی العمل بخلافہ

اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے لیکن اس پر اس لیے عمل نہیں کیا ہے کہ ان کے خیال میں یہ حدیث عمل اہل مدینہ کے خلاف ہے۔ یاد رہے کہ اس کی جو سند خطیب نے بتائی ہے وہ سند زریں ہے جسے علماء نے اہل الاسناد قرار دیا ہے یعنی مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود نافع کا بھی امام مالک کے زمانے میں اس پر عمل نہ تھا۔ اسی لیے خطیب نے لکھا ہے کہ :

فلم یکن ترکہ العمل بہ، قد حالنا نافع یلے
نافع کا اس پر عمل نہ کرنا حدیث میں قاذح نہیں ہے
چنانچہ امام محمد نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :
وبہذا ناخذ۔ ۱

اور امام محمد ہی نے اس کی تفسیر بتائی ہے کہ :

تفسیرہ عندنا علی ما بلغنا عن ابراہیم النخعی انہ قال المتبايعان
بالخيار مالم يتفرقا قال مالم يتفرقا عن منطق البيع اذا
قال البائع قد بعثت فلما ان يرجع مالم يقل الاخر قد
اشتریت فاذا قال المشتري قد اشتریت بكذا وكذا فله
ان يرجع مالم يقل البائع قد بعثت -

اس ارشاد کا مطلب ہمارے نزدیک جیسا کہ ہمیں ابراہیم نخعی سے معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ اس میں تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے جب بائع کہہ دے کہ میں نے بیچ دیا تو بائع کو رجوع کا حق اس وقت تک ہے جب تک خریدار یہ نہ کہے کہ میں نے خرید لیا اور اگر مشتری کہہ دے کہ میں نے خرید لیا تو اسے رجوع کا اس وقت تک حق ہے کہ جب تک بیچنے والا یہ نہ کہے کہ میں نے بیچ دیا۔ ۲

یہی معنی سمجھانے کے لیے امام اعظم نے وہ تعبیر اختیار کی ہے جو حافظ ابن عبد البر نے

سفیان بن عیینہ کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ سفیان کہتے ہیں کہ:
 میں نے امام ابو حنیفہ کے سامنے یہ حدیث پیش کی کہ البیعان بالخیار
 مالم یفرقا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر سودا کرنے والے دونوں شخص
 کشتی میں سفر کر رہے ہوں تو ان میں افتراق کب ہوگا۔
 ایک ہی بات میں حدیث کی روح سمجھا دی اور بتا دیا کہ تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے
 اگرچہ سفیان بن عیینہ نے امام اعظم کی اس بات کو گوارا نہ کیا اور کہہ دیا۔
 کان ابو حنیفۃ یضرب لحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 الامثال فیردہ۔

ابو حنیفہ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے لیے مثالیں بیان
 کرتے تھے۔

یہ سفیان بن عیینہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے اس سے پہلے حفاظ حدیث نے فقہاء پر اسی
 قسم کی پھلتی کسی ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ میں ایک واقعہ آتا ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ اور
 حضرت ابن عباس کا مکالمہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے کہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے
 ارشاد فرمایا ہے کہ:

توضو و ما غیرت النار

حضرت ابو ہریرہ کی زبان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سن کر حضرت
 ابن عباس نے فرمایا کہ:

اتوضا من الحجیم

حضرت ابو ہریرہ نے حضرت ابن عباس سے یہ بات سنی تو فرمایا:
 یا ابن اخی اذا سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حدیثاً فلا تضرب لہ الامثال

اے میرے برادر زادے! جب تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث
 سنے تو اس کے لیے مثالیں نہ بنا۔ اے

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث بخیر مجلس بھی اپنے اس مطلب کے لحاظ سے افراد و غرائب میں سے ہے اسی طرح وہ تمام روایات جن پر عہد صحابہ و تابعین میں اربابِ فتویٰ کا عمل نہ تھا۔ ان سب روایات کے بارے میں دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا نقطہ نظر بالکل جدا تھا۔ تیسری صدی کے محدثین ان کو صرف اسنادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور اتصال و عدالت کے ذریعے ان روایات کو صحیح گردانتے تھے لیکن دوسری صدی کے محدثین فقہاء ان کو مابعد الجماعۃ اور تعامل و توارث اور السنۃ کی روشنی میں جانچتے تھے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ آگے آ رہا ہے۔

امام اعظمؒ اور حدیث کی صحت

محدثین کی زبان سے تو آپ صحیح حدیث کی تعریف پڑھ چکے ہیں۔ ان کے یہاں حدیث صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ راویوں میں عدالت و ضبط ہو، سند میں اتصال ہو اور حدیث شاذ اور معطل نہ ہو۔ حدیث کی صحت میں ان پانچ کی حیثیت اساس اور بنیاد کی ہے۔ چنانچہ امیر میانی ان پانچوں کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

فہذه الخمسة هي المعتبرة في حقيقة الصحيح عند المحدثين

یہی پانچ چیزیں محدثین کے نزدیک صحیح کی حقیقت میں معتبر ہیں۔

لیکن امام اعظمؒ ابو حنیفہؒ محدثین کی بیان کردہ شرطوں کو ضروری قرار دینے کے ساتھ ضبط کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ضبط صدر کو راوی کے لیے اتنا ضروری قرار دیتے ہیں کہ راوی کے لیے حدیث کے بیان کرنے میں یہ بنیادی شرط بتاتے ہیں کہ حدیث کی روایت صرف وہ شخص کرے جو حدیث کے سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک حدیث کا حافظ ہو چنانچہ ابو جعفر طبرانی نے امام اعظمؒ کے بارے میں بند متقل لکھا ہے کہ

قال ابو حنیفہ لا ينبغي للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما

حفظ من یوم سمع الی یوم یحدث بہ

ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے لیے مناسب نہیں ہے کہ حدیث بیان کرے مگر صرف وہ شخص بیان کرے جو سننے کے دن سے بیان کرنے

کے دن تک حدیث کا حافظ ہو جائے
 سید الحافظ سیوطی بن معین فرماتے ہیں کہ امام اعظم کا اپنا بھی یہی معمول تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی
 نے یحییٰ بن معین کا یہ بیان لکھا ہے :
 امام ابو حنیفہ صرف وہ حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کے وہ حافظ ہیں اور
 جن کے وہ حافظ نہیں وہ بیان ہی نہیں کرتے۔
 امام نووی نے تقریب میں اس کو مشددین کا مسلک قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ امام مالک
 اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے چنانچہ فرماتے ہیں :
 فمن المشددین من قال لا حجة الا فيما رواه من حفظه و
 تذکرہ ردی عن مالک و ابی حنیفة ۔
 کوئی حدیث اس وقت تک حجت اور دلیل نہیں ہو سکتی جب تک راوی
 اپنی یاد اور حافظہ سے روایت نہ کرے۔
 اور حافظ سیوطی نے امام اعظم کا روایت حدیث میں یہ ضابطہ بیان کرنے کے بعد دوسرے
 محدثین سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے اس میں شدت محسوس کی ہے اور لکھا ہے کہ :
 هذا مذهب شدید و قد استقر العمل علی خلافه فلعل الرواة
 فی الصحیحین من لم یوصف بالحفظ لا یبلغون النصف
 یہ مذہب بڑا ہی سخت ہے محدثین کا اس کے خلاف عمل ہے کیونکہ
 اگر اس معیار کے پیش نظر صحیحین کا جائزہ لیا جائے تو نصف راوی ایسے
 ملیں گے جو حافظہ کی اس شرط پر پورے نہ اتریں گے۔
 امیر میانی نے توضیح الافکار میں، حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ ابن
 الصلاح نے مقدمہ میں یہی بات بتائی ہے۔ ابن الصلاح کے الفاظ یہ ہیں :
 من مذاهب التثدید مذهب من قال لا حجة الا فيما
 رواه الراوی من حفظه و تذکرہ و ذالک مردی عن

حالت دانی حنیفہ -

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ راوی کا ضبط اس درجہ قوی ہو کہ سننے کے بعد سے بیان کرنے کے وقت تک اسے برابر یاد رہے۔ اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ بعد کے محدثین نے حفظ کی جگہ کتابت کو کافی سمجھ لیا اس لیے ان کے خیال میں اگر راوی کو حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ بھی یاد نہ ہوں تاہم وہ قلم بند صورت میں اس کے پاس موجود ہو تو اس کو روایت کر سکتا ہے چنانچہ محدث خطیب بغدادی لکھتے ہیں :

ابوزکریا یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے قلم سے لکھی ہوئی حدیث پاتے مگر وہ اس کو زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے ؟ کہنے لگے کہ ابو حنیفہ تو یہ کہتے ہیں کہ جس حدیث کا انسان حافظ نہ ہو اسے بیان نہ کرے لیکن ہم یوں کہتے ہیں کہ اپنی کتاب میں جو کچھ اپنے قلم سے لکھا ہوا پاؤے اسے بیان کرے چاہے وہ اس روایت کا حافظ ہو یا نہ ہو۔

بہر حال امام اعظم نے ضبط صدر کو دوسرے محدثین سے الگ ہو کر بے حد اہمیت دی ہے اور اس کو حدیث کی صحت، عدالت، اتصال کے ساتھ بنیادی شرط قرار دیا مگر بعد کو محدثین نے یہ سختی برداشت نہ کی۔ جس قدر زمانہ گزرتا گیا حفظ کی جگہ کتابت رائج ہوتی گئی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حافظ حدیث کی روایت کو غیر حافظ کی روایت پر ترجیح ہے۔ کیونکہ حافظ نہ ہونے کی حالت میں احتمال ہے کہ کوئی خط میں خط ملا کر نوشتہ میں گڑبڑ کر دے۔ بہر حال امام اعظم نے حدیث کے صحیح ہونے کے لیے جو شرط لگائی وہ اگرچہ تیسری صدی کے محدثین کے یہاں ایک تشدید کی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ فخر الاسلام بزدوی ضبط کی دقیق تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ بات کو ایسے طریق پر سنا جائے جیسے سننے کا حق ہے پھر اس کے معنی مراد کو سمجھا جائے۔ امکانی کوشش سے اسے یاد کیا جائے پھر اس کی حدود کی حفاظت کر کے اس کی پابندی کی جائے اور اسے دوسرے

تک پہنچاتے وقت تک اس کے مذاکرات کا اہتمام کرنا چاہیے مبادا وہ
ذہن سے اتر نہ جاتے بلکہ

یہ تصریحات فن حدیث میں امام اعظم کی عظمت نشان اور جلالِ قدر کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں
غالباً جو لوگ امام اعظم کو حدیث میں متشددین میں شمار کرتے رہے ہیں ان کے پیش نظر امام اعظم کی
یہی شرائط ہیں جیسے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ :

شدد فی شروط الروایۃ والتحمل وضعف روایۃ الحدیث
الیقینی اذا عارضها الفعل النفسی -

امام صاحب نے روایت کی شرطوں اور اس کے تحمل میں سختی کی اور اگر
حدیث فعل نفسی کے معارض ہو تو اس کی تضعیف کی ہے یہ

لیکن جسے سختی کہا جا رہا ہے اسی کا نام احتیاط ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ
دین کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتی جاتے۔ امام اعظم کی اس احتیاط کا بڑے بڑے محدثین
نے اقرار کیا ہے چنانچہ حافظ ابو محمد عبد اللہ حارثی بسند متصل امام وکیع سے جو حدیث کے بہت بڑے
امام ہیں نقل کرتے ہیں :

اخبرنا القاسم بن عباد سمعت یوسف الصغار یقول سمعت

دکیعاً یقول لقد وجد الوریع عن ابی حنیفۃ فی الحدیث ما لم

یوجد عن غیرہ -

جیسی احتیاط حدیث میں امام ابو حنیفہ نے کی ہے کسی دوسرے نے نہیں کی تھی

اسی طرح علی بن الجعد سے جو حدیث کے بہت بڑے امام اور حافظ ہیں اور امام بخاری اور
ابوداؤد کے استاد ہیں یہ بیان منقول ہے کہ :

امام ابو حنیفہ جب حدیث بیان کرتے ہیں تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے

اور یہ امام اعظم کی احتیاط ہی کا نتیجہ ہے کہ امام وکیع بن الجراح جیسا شخص جو حدیث میں امام احمد
امام ابن المدینی، امام یحییٰ بن معین اور امام عبد اللہ بن المبارک کا استاد ہے۔ امام اعظم کی ساری حدیثیں

۱۔ اصول فخر الاسلام ج ۲ ص ۱۰۶ برکشف الاسرار - ۲۔ المحطہ ص ۳۴ -

۳۔ المناقب للموفق ج ۱ ص ۱۹۷ - ۴۔ جامع المسانید ج ۲ ص ۳۰۸ -

نوک زبان کرتا ہے اور جسے سید الحافظ سیحی بن معین حفظہ حدیث میں سب سے اونچی بتلاتے ہیں چنانچہ حافظ ابن عبد البر سیحی بن معین سے ناقل ہیں :

میرے علم میں وکیع سے اونچی کوئی نہیں ہے۔ وکیع امام ابو حنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے اور ان کو امام ابو حنیفہ کی ساری حدیثیں یاد تھیں اور انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حدیثیں سنی تھیں۔

امام اعظم اور رد و قبول روایت

محدثین نے روایت کے رد و قبول کے لیے جو شرطیں لکھی ہیں اور جن روایات کو قابل استدلال قرار دیا ہے ان کے نقل کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ بالغ، عاقل ہونے کے ساتھ عدالت اور ضبط کی صفات سے موصوف ہوں۔ حافظ ابن الصلاح نے جمابیر ائمہ حدیث کا فیصلہ یہی بتایا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اس میں تیفظ کا اضافہ کر کے لکھا ہے کہ :

اگر ان شرطوں میں سے ایک شرط بھی مخدوش ہو جاتے تو روایت مردود ہو جاتے گی۔

امام نووی نے تقریب میں اور حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اسی کی توثیق کی ہے لیکن امام اعظم نے کسی بھی روایت کی قبولیت کے لیے ان شرطوں کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا ہے۔ کہ اگر روایت کا تعلق اسلام کی عام عملی زندگی سے ہو تو ضروری ہے کہ اس کا نقل کرنے والا ایک نہ ہو بلکہ صحابی سے اس کو نقل کرنے والی ایک جماعت ہو اور جماعت بھی نیک اور پارسا لوگوں کی ہو۔ چنانچہ امام ربانی عبد الوہاب الشعرانی رقمطراز ہیں :

قد كان الامام ابو حنيفة يشترط في الحديث المنقول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل العمل به ان يرويه عن ذلك الصحابي جمع اقياد عن مثلهم وهكذا۔

جو حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت امام ابو حنیفہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت

اس صحابی سے برابر نقل کرتی آئے۔
 امام شہرانی نے حدیث کی قبولیت کے لیے امام اعظم ابو حنیفہ کی جس شرط کا ذکر کیا ہے وہ بصراحت
 خود امام اعظم سے منقول ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے امام سیحی بن معین کی سند سے امام اعظم کا یہ ارشاد
 نقل کیا ہے۔

میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم اور ان حدیثوں سے کہ جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات کے
 ذریعے شائع ہوتی ہیں۔ پھر اگر یہاں بھی نہ ملے تو آپ کے اصحاب سے
 جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں لیکن جب بات ابراہیم،
 شعبی، حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح پر آ پڑتی ہے تو جس طرح
 ان حضرات نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم اس حدیث کو قبول فرماتے تھے جس کے پہلے طبقہ میں اگرچہ
 راوی ایک ہو مگر اس کے بعد وہ مختلف طبقوں میں پھیلی ہو اور اسے ایسے لوگوں نے نقل کیا ہو
 جو ائمہ اور پارساہوں طبقہ اولیٰ سے صحابہ اور طبقہ ثانیہ سے تابعین مراد ہیں۔
 بعد کو محدثین غرائب و افراد، لو اور آثار جمع ہو جانے پر اس کی پابندی نہ کر سکے بلکہ یہ
 امر واقعہ ہے کہ امام حاکم نے جب صحیح حدیث کی دس قسمیں قرار دیتے ہوئے پہلی قسم کے بارے
 میں یہ اعلان کیا کہ:

ان اخصبار البخاری و مسلم اخرج الحديث عن عدلين
 عن عدلين اثنى النبي صلى الله عليه وسلم۔

بخاری و مسلم کا مسلک یہ ہے کہ وہ حدیث کو دو عادل راویوں سے
 روایت کرتے ہیں اور پھر وہ دو اپنے سے اوپر دو سے تا آنکہ یہ
 سلسلہ اسی طرح دو دو ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔
 تو محدثین نے امام حاکم کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ حافظ ابن حبان نے امام حاکم کے
 اس اعلان کو حدیث کے خلاف سازش قرار دیا اور بتایا کہ:

احادیث سب کی سب اخبار آحاد ہیں جو شخص روایت حدیث میں اس قسم کی شرطیں عائد کرتا ہے دراصل وہ ترک حدیث کی اسکیم بناتا ہے کیونکہ حدیثیں اخبار آحاد کے ذریعے ہی آتی ہیں یہ امام ابو بکر محمد بن موسیٰ حارمی نے امام حاکم کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا اور لکھا کہ: لیس کذا لک لا نھما الخ جافی کتابیہما احادیث جماعۃ من الصحابة لیس لھما الا واحد واحد و احادیث لا تعرف الا من جهة واحدة۔

یہ واقعات کے خلاف ہے کیونکہ امام بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں ایسی جماعت سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی روایات میں صحابہ سے صرف ایک ہی راوی ہے اور ایسی حدیثیں بھی جو ایک ہی طریق سے مروی ہیں۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی نے بھی امام حاکم کے اس دعویٰ کی وائسکاف لفظوں میں تردید کی ہے اور فرمایا:

شیخین نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ ان سے یہ شرط منقول ہے۔ بخدا یہ بہترین شرط ہوتی اگر اس کا صحیحین میں کوئی نام و نشان ہوتا۔ ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ یہ قانون ان کتابوں میں قدم قدم پر پارہ پارہ ہے۔

اور پھر خود امام حاکم کی تردید کے بعد یہ تجویز پیش فرمائی کہ امام بخاری و مسلم کا موقف ان کتابوں میں صرف یہ ہے کہ:

وہ ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جس کے راویوں کی ثقاہت اتفاقی ہو۔

لیکن حافظ زین الدین عاتقی نے حافظ ابن طاہر کی اس تجویز کو یہ کہہ کر بے جان کر دیا کہ: قبول روایت میں امام بخاری و مسلم کا یہ موقف نہیں ہے۔ کیونکہ

امام نسائی نے ایسے راویوں پر حرج کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے۔
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین اپنے دور میں امام اعظم کی عائد کردہ شرائط کی حدیث کے رد و قبول میں پابندی نہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ امام اعظم کے اس بیان کی روشنی میں اگر سنت اصل ثانی ہے تو قرآن اصل اول۔ لیکن سنت کے موضوع پر حدیث اس وقت قبول کی جاسکتی ہے جب وہ بالکل موثق اور مصادر مختلفہ سے ثابت ہو کر آئی ہو اور اس کا صدق و ضبط اور نقل ہر لحاظ سے پایہ تصدیق کو پہنچ چکا ہو۔ آپ صرف ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو اس معیار پر صحیح ہیں۔ اور جن کی ثقات کے ذریعے اشاعت ہوتی ہے۔ امام سفیان ثوری نے بھی حدیث کے متعلق امام اعظم کا یہی موقف بتایا ہے کہ :

ياخذ بما صح عنده من الاحاديث التي كان يجمعها الثقات و
بالاخر من فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہوں۔ نیز جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے یہ اس کو لیتے ہیں۔

اس لحاظ سے امام اعظم کی حدیثوں کا بیشتر حصہ مشہور ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ دور ہے جس میں شہرت کو اعتباری حیثیت حاصل ہے ورنہ اس کے بعد اگر کوئی حدیث شہرت پذیر ہوتی ہے تو آئینی اور قانونی لحاظ سے وہ شہرت نہیں جس سے حدیث کو قوت حاصل ہو سکے۔ علامہ عبدالعزیز بخاری رقمطراز ہیں :

احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم و سوم میں ہو گا۔ قرون ثلاثہ کے بعد شہرت معتبر نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اکثر اخبار احاد مشہور ہو گئی ہیں۔ حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے ہیں۔

شاید آپ کو اس پر حیرت ہو مگر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے ؟ شہرت کا رد و

شعبہ ہی میں لیے یعنی جن کی علم حدیث میں جلال و شان اور عظمت نہ ہو۔ یہ امام شیعہ کو اعتماد و ہوا
 تو کسی کے لیے یا اتنے سخن نہیں ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم انہی کے لیے
 قد کان الحافظ المشہور بعنايتہ فی حدیثہ
 امام ابو حنیفہ علم حدیث میں مشہور حافظ حدیث تھے۔

بہر حال امام اعظم نے صحت حدیث کے لیے ایک بہت اونچا معیار قائم کیا تھا ان کے شرط
 روایت کے لیے معیار تحقیق کی ہڈ تک بقابلہ محدثین زیادہ سخت تشہیم کب گئے ہیں جیسا کہ
 آپ مقدمہ ابن خلدون اور المیزان الکبریٰ کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اپنی شرط
 میں تیسری صدی کے محدثین کی نسبت متشدد تھے۔

امام اعظم اور اہل ہوی سے روایت

روایت کے رد و قبول سے متعلق اس پر تو دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا اتفاق
 ہے کہ قبول روایت کے لیے اسلام اور عدالت شرط ہے اور شرک یا ہونے کا مطلب یہ ہے
 کہ کافر کی حالت کفر میں اور فاسق کی حالت فسق میں رہتا ہے۔ اس موضوع
 پر کبھی دو رائے نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کون کون سے ہوتے ہوئے
 اپنے مخصوص نظریات کے حامل ہیں جن کے نتیجے میں جمہور امت کو شرک و فسق سے بٹ کر انہوں
 نے اپنی راہ الگ بنالی مثلاً خوارج، روافض، نواصب، معتزلہ اور مرجئہ وغیرہ۔ کیا ان کی
 روایات کو ان کے مخصوص نظریات کے باوجود شرف قبول عطا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ
 یہ موضوع علم حدیث کے مہمات مباحث ہیں اس لیے علماء نے اپنے مختلف
 عہدوں میں جی بھر کر اس پر دائر تحقیق دی ہے۔ چنانچہ امام ابو بکر الخطیب بغدادی
 رقمطراز ہیں:

علماء میں اہل ہوی سے روایت لینے کے موضوع پر ایک جماعت نے یہ خیال
 مدارس فکر میں۔ سلف میں سے ایک جماعت نے یہ خیال
 نہیں کرتی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کافر اور فاسق امام ہیں کی

پوزیشن بھی کافر معاند اور فاسق عابد کی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان کی روایت ناقابل قبول ہو اور کچھ کی رائے میں اہل اہوار کی روایت کو قبول کر لینا درست ہے بشرطیکہ وہ جھوٹ کو جائز نہ سمجھتے ہوں۔ فقہاء میں سے یہ امام شافعی کی رائے ہے۔ اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ اہل اہوار میں سے ان کی رائے قبول کر لی جائے جو ہوئی و بدعت کے داعی نہ ہوں۔ وعادہ کی روایت قابل احتجاج نہیں ہے۔ یہ امام احمد کی رائے ہے۔ مؤرخین اور متکلمین کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ سب اہل اہوار کی روایات قابل قبول ہیں چاہے وہ اپنے نظریات کی وجہ سے کفر ہی کے میدان میں ہوں یا نہ۔

روایت و تحدیث میں تمام اہل اہوار میں روافض کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس اہمیت کی بنیادی وجہ ان کے وہ نظریات ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اُمت کے جہور سے الگ ہوتے ہیں صحابہ کے واسطے میں ان کا موقف علم کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اور تفتیہ کا عقیدہ بھی ان کی صداقت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر امام اعظم کا فیصلہ عبداللہ بن المبارک نے یہ بتایا ہے۔

امام اعظم سے ابو عصمہ نے دریافت کیا کہ اہل اہوار سے روایت کے بارے میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ سب اہل اہوار سے روایت لے سکتے ہو بشرطیکہ وہ عادل ہوں لیکن شیعہ سے روایت نہ لینا۔ کیونکہ ان کے عقیدے کی عمارت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تضلیل پر ہے۔

ہمائے نزدیک یہ مسئلہ بھی دوسری اور تیسری صدی کے اختلافی مسائل میں سے ہے۔ اسی لیے حضرت امام مالک بھی اس مسئلہ میں امام اعظم کے ہم زبان ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ روافض سے روایت نہ کرو۔ مشہور محدث یزید بن ہارون کہتے ہیں ہر صاحب بدعت کی اگر داعی نہ ہو تو روایت لے لی جاتے لیکن روافض سے روایت نہ لی جائے۔ شریک بن عبد اللہ کی

ماتے ہے کہ جس سے تم ملو علم لے لو لیکن روافض سے علم نہ لو۔ عبداللہ بن المبارک نے عمرو بن ثابت کا نام لے کر بتایا ہے کہ اس سے حدیث نہ لو کیونکہ یہ سلف کو برا کہتا تھا۔ یہ دوسری صدی کے محدثین کے افکار ہیں۔ تیسری صدی میں ان افکار کی بندشوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش شروع ہوئی ہے اور رافضیوں کے پاس سے یہ محدثین نے اپنا موقف بدل دیا۔ امام شافعی نے عام روافض کو اس پابندی سے نکال کر خاص خطابت تک اسے محدود کر دیا۔ اور فرمایا کہ ان سے روایت نہ لینی چاہیے۔ اس کے بعد محدثین کی عام رائے تمام اہل اہوار کے پاس میں بلا استثنا شیعہ قائم ہو گئی کہ

تقبل غیر الدعاء من اهل الاهوار فاما الدعاء فلا تقبل
اخبارهم۔

ان میں جو داعی نہ ہوں ان سے روایت لی جائے داعی کی روایت نہ لی جائے۔

اسی کو محدثین کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے اس پر سب کا اتفاق نقل کیا ہے۔ حافظ ابن الصلاح نے اسی کو اعدل الاقوال قرار دیا ہے اور اس کے خلاف سوچنے کو بھی بارگاہِ محدثین میں گستاخانہ جرات بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

والقول بالمنع مطلقا مباح للشافع عن المنة الحديث۔^۱

مطلقاً اسے روکنا اس راہ سے دور مہٹنا ہے جو ائمہ حدیث سے مشہور ہے

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ طے کیا گیا ہے اور جسے اعدل الاقوال کہا گیا ہے کیا واقعات اور حالات نے بھی اس کا ساتھ دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ خود بخاری و مسلم نے دعا سے روایات لی ہیں چنانچہ حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ بخاری و مسلم نے دعا اہل اہوار کی روایات لی ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں بخاری و مسلم کے ان راویوں کی فہرست دی ہے جن سے شیخین نے روایات لی ہیں اور توبت بایں جارسید کہ کہنے والوں نے کہہ دیا۔

کتاب مسلم ملان من رواة الشيعة۔^۲

^۱ تدریب الراوی ص ۲۱۸۔^۲ توضیح الافکار ج ۲ ص ۱۰۴۔^۳ اختصار علوم الحدیث ص ۹۹

^۴ تدریب الراوی ص ۱۲۸

اور حافظ ابن الصلاح کو اس نظریہ کو کہ روافضیوں سے روایت نہ لینی چاہیے یہ کہہ کر مرجوح قرار دینا پڑا کہ فان كتبهم طافحة بالرواية عنهم محدثین کی کتابیں ان کی روایات سے الٹی پڑی ہیں۔ امام ذہبی نے بدعت کی تقسیم کے ذریعے محدثین کی صفائی پیش فرمائی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

بدعت کی دو قسمیں ہیں صغریٰ جیسے تشیع زیادہ یا کم مثلاً وہ حضرات جنہوں نے حضرت علی سے نبرد آزما ہونے والوں کے بارے میں لب کشائی کی ہے۔ یہ طبقہ تابعین میں بہت ہے اور ایسے ہی اتباع تابعین میں اگر ان کی روایات کو تشیع کی بنا پر رد کر دیا جائے تو حدیث کا بیشتر حصہ ختم ہو جائے گا اور بدعت کبریٰ جیسے رفض کامل اور اس میں غلو مثلاً ابو بکر و عمر کے دامن احترام کو ہاتھ لگانا اور لوگوں میں اس کا پروپیگنڈا کرنا۔ یہ قسم بلاشبہ ناقابل احتجاج ہے۔ مجھے اس قسم کے لوگوں میں کوئی بھی صادق مامون نظر نہیں آتا بلکہ جھوٹ ان کا فیشن اور تفریہ اور نفاق ان کا شیوہ ہے بلکہ۔

اگرچہ خود امام ذہبی نے بقول حافظ سیوطی ایک دوسرے موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ :
اس موضوع پر لوگ مختلف الخیال ہیں۔ کچھ کی رائے میں شیعہ سے روایت قطعاً منع ہے اور کچھ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے اور تیسری رائے یہ ہے کہ جو شخص ان کی حدیث کو جانتا ہو اس کے لیے جائز ہے اور دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ۔

بعد ازیں حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سیوطی نے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرما کر محدثین کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری مساعی صرف اس لیے برفٹے کار آئی ہیں کہ محدثین سے جو طے شدہ پالیسی کے خلاف عمل ہوا ہے اس کا مداوا ہو جائے لیکن ان مساعی اور کوششوں کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ کتابوں کی مدد سے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرمائی ہے ہیں اور دوسری صدی کے محدثین مشاہدے

اور واقعات کے زور سے بتا رہے ہیں کہ :

فان اصل عقیدتہم تفضیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور عبداللہ بن المبارک نے آپ بیٹی سنا تی ہے کہ فانسہ کان لیسب السلف اور یہی صورت حال امام مالک کی ہے۔

اس آخری دور میں شام کے مشہور فاضل نے محدثین کی اس موضوع پر صفائی کرتے ہوئے کھلے بندوں اعلان کر دیا ہے کہ محدثین نے جن اہل اہوار سے روایات لی ہیں وہ مبتدعین نہیں ہیں بلکہ مبتدعین ہیں۔ یعنی ہیں تو وہ اہل السنۃ مگر یار لوگوں نے ان کو بدعتی مشہور کر دیا ہے۔ میری مراد علامہ جمال الدین قاسمی ہیں۔ انہوں نے خاص اس موضوع پر الجرح والتعذیل کے نام سے کتابچہ لکھا ہے جو مصر میں ۱۳۳۷ھ میں مطبع المنار نے شائع کیا ہے اور اس آخری دور میں مشہور محدث فاضل علامہ احمد محمد شاہر جن کی حدیث میں علمی خدمت اہل علم کے لیے سامان رشک ہے۔ الباعث الحثیث میں یہ کہہ کر معاملہ ہی صاف کر دیا ہے کہ کسی بھی مکتب فکر سے کوئی راوی تعلق رکھتا ہو روایت میں تو صرف راوی کی صداقت و امانت کا اعتبار ہو گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

العبرة فی الروایۃ بصدق الراوی وامانته، والثقة

بدینہ، وخلقه۔

روایت میں تو صرف راوی کی صداقت، امانت، دین میں

ثقاہت اور اخلاق کا اعتبار ہو گا۔

غور فرمائیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ امام اعظم نے یہ کہہ کر

الا الشیعة فان اصل عقیدتہم تفضیل اصحاب محمد

صلی اللہ علیہ وسلم۔

دینی ثقاہت اور اخلاقی امانت کو چیلنج کیا تھا۔ ان مساعی کے باوجود اس کا حل اب تک کوئی نہ بتا سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ خواہ کچھ کہا جائے مگر واقعات کی دنیا میں تحقیق کی بے لاگ عدالت کا فیصلہ البوحیفہ کے ساتھ ہے۔

لیکن امام اعظم کا یہ فیصلہ صرف ان کے بارے میں ہے جن کے تشیع کی عمارت اصحاب نبوت کی تفصیل کی اساس پر قائم ہے۔ اس تصریح کی ضرورت بھی حضرت امام کو اس لیے پیش آئی کہ ان کے گرد و پیش میں ایسا طبقہ موجود تھا جیسا کہ عبداللہ بن المبارک کی تصریح سے معلوم ہو چکا ہے اور اس طبقہ کے علاوہ اس دور میں ایسا بھی طبقہ تھا جو صرف حضرت علی کے لیے صحابہ میں برتری کا نظریہ رکھتا تھا جیسا کہ حافظ سیوطی نے تدریب میں بتایا ہے اور ایسا طبقہ تھا جو حضرت علی اور حضرت معاویہ کے سیاسی جھگڑوں میں حضرت علی کا طرفدار تھا جیسا کہ ذہبی نے تصریح کی ہے ان طبقوں کی روایت سے امام ابوحنیفہ نے نہیں دیکھا ہے امام اعظم نے جس دکھنی رنگ پر انگشت رکھ کر بتایا ہے وہ یہ اور صرف یہ ہے کہ،

اصل عقیدہ تہمہ تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اور بس اس عقیدے کا حامل طبقہ یقیناً امام اعظم کے زمانے میں موجود ہے اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے دوسری صدی کے محدثین کو حضرت علی کی بہت سی حدیثوں سے دست بردار ہونا پڑا حالانکہ حضرت علی کے علم، ان سے محبت اور ان سے عقیدت کا برابر تقاضا یہی رہا کہ ان کے بارے میں جو کچھ بھی سنا جائے اس کی تصدیق کی جائے لیکن یہاں حضرت علی کی عقیدت و محبت کا رسول کی عقیدت و محبت اور اس کی حدیث کی عظمت سے مقابلہ تھا۔ اس کی بہت کا تقاضا یہ اور صرف یہ تھا کہ اس کی جانب کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ ایمان کو بچانے کے لیے احتیاط کی راہ یہی تھی کہ چھان بین کی جائے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں :

قاتل اللہ الشیعة فانهم افسدوا کثیراً من علمہ بالکذب

علیہ ولہذا تجد اصحاب الحدیث من الصحیح لا یعتمدون من

حدیثہ الا ما کان من طریق اہل بیتہ واصحاب عبد اللہ

بن مسعود۔

اللہ شیعوں کا برا کرے کہ انہوں نے حضرت علی کے علم کا بڑا ہتھکنڈا

پر جھوٹ بول کر محدثین کی نظر میں مشتبہ کر دیا ہے اس لیے صحیح

حدیث کے متلاشی محدثین بجز حضرت علی کے گھر والوں اور عبداللہ بن

مسعود کے اصحاب کی وساطت سے آئی ہوئی حضرت علی کی حدیثوں پر
اعتماد نہیں کرتے ہیں بلکہ

اسی دور میں مشہور محدث حماد بن سلمہ نے یہ انکشاف کیا کہ:

اخبرني شيخ من الرافضة انه قال لو اجتمعون علي
وضع الاحاديث -

مجھے رافضیوں کے ایک سربراہ نے بتایا ہے کہ وہ حدیثیں بنانے کے
لیے باقاعدہ اجتماعات کرتے تھے بلکہ

اور آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن حافظ زبلی نے نماز میں جہر بسمہ کے موضوع پر خالص محدثانہ
نقطہ نظر سے تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنے کے
موضوع پر جس قدر روایات آئی ہیں ان کا سرچشمہ ہی شیعہ ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:
وغالب احاديث الجهر تجد في روايتها من هو منسوب الى
الشيعة۔^۱

بسم اللہ بلند آواز پڑھنے کی زیادہ روایات شیعہ اولیوں کی وساطت سے
آئی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ نماز میں بسم اللہ کے جہر پر اخبار اُحاد کا زیادہ ذخیرہ وضعی اور بناوٹی ہے
اور بناوٹی ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

لان الشيعة ترى الجهر وهم اكذب الطوائف فوضعوا في
ذلك احاديث -

کیونکہ نماز میں بسم اللہ بلند آواز پڑھنے کے قائل ہیں اور شیعہ گروہوں
میں سب سے زیادہ دروغ گو ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر
حدیثیں بنالی ہیں۔

ان تصریحات سے آپ امام اعظم کے اس دور رس فکر کی صداقت کا اندازہ لگا سکتے

^۱ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۶ - ^۲ الباعث الحثيث ص ۸۶

^۳ نصب الراية ج ۱ ص ۱۸۲ -

ہیں اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس میں تھوڑا سا تسامح بہت بڑی بلا کا سامان ہے۔

بحر و تعدیل روادۃ حدیث اور امام اعظم

علامہ جزائری نے توجیہ النظر میں حدیث کے سلسلے میں ۵۲ قسم کے علوم کی نشاندہی کی ہے ان ہی علوم کے برتنے پر کہا جاتا ہے کہ جو شخص بھی حدیث کے مختلف طرق و اسانید، ان کے راویوں کی راست گفتاری اور ان پر بحر و تعدیل کی داستان پڑھے گا۔ اس کو حدیث کی عظمت کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ امر آخر ہے کہ کوئی شخص مطالعہ کی محنت سے پہلو تہی کر کے خواہ مخواہ انکار کر ڈالے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ محدث کی مثال ایک صراف کی سی ہے۔ بسا اوقات روپیہ کی شکل و صورت اور آواز تک میں فرق نہیں ہوتا لیکن صراف کی چٹکی اس کا کھوٹ بتا دیتی ہے۔ یہ کھوٹ بتا دینے کا علم فن حدیث میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کی مدد سے علماء نے صحیح احادیث کو غلط سے اور قوی کو ضعیف سے چھانٹ کر علیحدہ کیا اور اس سلسلے میں علماء نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اسی کا نام علم بحر و تعدیل ہے۔ اسے ہی علم میزان رجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر راویوں کی امانت، ثقاہت، عدالت اور قوت ضبط کو بتایا جائے تو یہ علم تعدیل ہے اور اگر اس کے برعکس ان کے کذب، غفلت یا نسیان وغیرہ سے بحث کی جائے تو یہ علم البحر ہے۔ امام حاکم معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

وہما فی الاصل نوعان کل نوع منهما علم براسہ

اصل میں یہ دو قسمیں ہیں ان میں سے ہر قسم مستقل علم ہے۔

علم حدیث کے طفیل میں یہ عظیم الشان علم وجود میں آیا ہے اور اقوام عالم کی تاریخ میں اس طرح کے مفیدی علم کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اس فن کی ابتداء کیوں ہوئی؟ حافظ سیوطی انکاوی فی تاریخ السنخاوی میں رقمطراز ہیں کہ:

چونکہ حدیث نبوی صدر اقول میں سفینوں سے نہیں بلکہ لوگوں کے سینوں سے لی جاتی تھی اس لیے احادیث کی حفاظت اور ان کو

غلط سے بچانے اور مقبول میں تمیز کی خاطر جرح کو جائز کیا گیا۔
حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

لوگوں نے یہ علم صحابہ سے لیا اس کے یاد کرنے اور
اس کے پہنچانے میں اوقات لگاتے اور جانیں کھپاتیں لیکن صحابہ کے
بعد ہر دور میں ایسے لوگ اس میں داخل ہو گئے جن میں اس کی صداقت
اور قابلیت نہ تھی۔ انہوں نے نقل روایات میں غلطیاں کیں اور کچھ نے
عمداً خلاف واقعہ نقل میں دست اندازی کی۔ اس راہ سے حدیث ایک
بڑی آفت سے دوچار ہو گئی۔ اللہ سبحانہ نے اس وقت ایسے ارباب
فکر میدان میں رومہ کئے جنہوں نے حدیث نبوت کی چھان بین اور
اس کی مدافعت کا کام کیا۔ خیر خواہی کے جذبہ سے راویوں پر کلام
کیا۔

حافظ سخاوی نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :
پہلی صدی ہجری جو صحابہ و کبار تابعین کے دور میں گزری۔ اس دور
میں حارث اور مختار کذاب جیسے اکاذب شخص کو چھوڑ کر کسی
ضعیف الروایت شخص کا تقریباً وجود نہ تھا۔ پہلی صدی گزر کر جب
دوسری صدی آئی تو اس کے اوائل میں اوساط تابعین میں ضعفا کی
ایک جماعت پیدا ہوئی جو زیادہ تر حدیث کو زبانی یاد رکھنے اور اپنے
کوڑہ ذہن میں اس کو محفوظ کرنے کے لحاظ سے ضعیف سمجھی گئی چنانچہ
آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ موقوف کو مرفوعاً نقل کر جاتے ہیں۔ کثرت
سے ارسال کرتے ہیں اور ان سے روایت میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں
جیسے ابو یارون عبدی وغیرہ۔ پھر جب تابعین کا آخری دور آیا یعنی تیسرے
کے قریب قریب۔ تو ائمہ کی ایک جماعت نے توشیح و تصنیف کے
لیے زبان کھولی۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ ما رأیت الکذب من

جابر الجعفی میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا۔ اور امام اُمّش نے ایک جماعت کی تضعیف اور دوسری کی توثیق کی۔ اور شعبہ کے رجال کے بارے میں غور و فکر سے کام لیا۔ یہ بڑے محتاط تھے اور ہجر ثقہ کے تقریباً کسی سے روایت نہ کرتے تھے۔ امام مالک کا بھی یہی حال تھا اور اس دور کے ان لوگوں میں سے کہ جب وہ کسی کے بارے میں کچھ کہہ دیں تو ان کی بات مان لی جاتی ہے معمر، ہشام، ستوائی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابن الماجنون، حماد بن سلمہ اور لیث وغیرہ ہیں۔ پھر ان کے بعد دوسرا طبقہ ابن المبارک، ہشیم، ابواسحاق فزاری، معانی بن عمران، بشر بن المفضل اور ابن عیینہ وغیرہ کا ہے۔ پھر ان ہی کے ہم زبان ایک اور طبقہ ابن علیہ، ابن وہب اور وکیع جیسے حضرات کا ہے۔ بعد کو ان ہی کے دور میں دو ایسے شخص ہو حدیث کے حافظ اور اس فن میں حجت گزے ہیں۔ تنقید رجال کے لیے اٹھے یہ سچائی بن سعید القفطان اور عبد الرحمن بن مہدی ہیں۔

علامہ جزائری نے بھی اس پر تفصیلی تبصرہ فرمایا ہے یہ اور حافظ شمس الدین السخاوی نے الاعلان بالتوزیع لمن ذم التاريخ میں علم الجرح والتعديل کی ایک مورخانہ دستاویز ترتیب دی ہے۔ اس تاریخی ترتیب میں جن ائمہ جرح و تعديل کا تذکرہ کیا ہے ان کے تعارف کے لیے حافظ موصوف نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

اما المتكلمون في الرجال فخلق من نجوم الهدى ومصابيح الدجى
المستضاء بهم۔

ان اکابر میں جن کو نجوم الهدی اور مصابيح النظم کہا ہے۔ سب پہلے مقدمہ ابن عدی کے حوالہ سے اس فن کی امامت کے سلسلے میں صحابہ میں سے فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، ابن عباس، عبد اللہ بن سلام، عبادۃ بن الصامت اور عائشہ صدیقہ کا نام لیا ہے۔ پھر اکابر تابعین میں امام شعبی، امام ابن سیرین، سعید بن جبیر اور سعید بن المسیب کا تذکرہ کیا ہے اور اس

کے بعد لکھا۔

فلما كان عند آخر هذه عصر التابعين وهو حدود الخمسين و
مائة تكلم في التوثيق والتجريح طائفة من الامة
فقال ابو حنيفة ما رايته اكدب من جابر وضعف
الاعمش جماعة ووثق آخرين ونظر في الرجال شعبة لـ

اور اس کے بعد ان سب کا تذکرہ کیا ہے جو آپ فتح الميشت کے حوالہ سے پہلے پڑھ چکے ہیں
اور یہ بھی اضافہ فرمایا کہ :

پھر یحییٰ بن سعید القطان اور عبد الرحمن بن مہدی کے بعد امام شافعی
یہ زید بن یارون، ابو داؤد الطیالسی، عبد الرزاق، الفریابی، ابو عاصم النبیل
وغیرہ ہوئے ہیں اور ان کے بعد حمیدی، القعنبی، ابو عبیدہ یحییٰ اور
ابو الولید الطیالسی نے اس میں کام کیا ہے لے

اس تاریخی و سنادیز میں حافظ سخاوی نے صرف یہ نہیں بتایا ہے کہ آخر عصر تابعین میں
جرح و تعدیل کے فن میں امامت کا مقام امام اعظم کو حاصل ہے بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ امام
ابو حنیفہ کی ذات گرامی تابعی ہونے کی حیثیت میں توثیق و تجریح کے میدان میں صرف تعارفی
منہیں بلکہ ایک عظیم الشان استدلالی شخصیت ہے اور ائمہ جرح و تعدیل میں ان کو مرکزی حیثیت
حاصل ہے چنانچہ حافظ سخاوی کی یہ تصریح ہے۔

تکلم في التوثيق والتجريح طائفة من الامة فقال ابو حنيفة -

راويون في التوثيق والتجريح طائفة من الامة فقال ابو حنيفة -

چنانچہ ابو حنیفہ نے فرمایا -

اسی بنا پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں جرح و تعدیل پر امام اعظم کے ان دو فقروں کو
بالاسناد کتاب العمل میں روایت کیا ہے۔

حدثنا محمود بن غيلان قال حدثنا ابو يحيى الحماني قال سمعت
ابا حنيفة يقول ما ريت احداً اكذب من جابر الجعفي

ولا افضل من عطاء

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا اور عطا سے زیادہ فاضل کوئی نہیں دیکھا ہے۔

اس روایت کا تعلق راویوں کی جرح و تعدیل سے ہے اور امام ترمذی نے اسے سند کے طور پر پیش کیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک امام اعظم کا شمار ان ائمہ میں ہے جن کی بات جرح و تعدیل کے موضوع پر سند ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم کے مٹنے سے نکلے ہوئے تعدیل میں عطا کے متعلق اور جرح میں جابر جعفی کے متعلق دو فقرے علم حدیث میں دو اہم فنون کی بنیادی اینٹ ہیں۔ پہلا فقرہ یعنی مارایت افضل من عطاء بن ابی رباح علم التعدیل کی اور دوسرا فقرہ یعنی مارایت الکذب من جابر الجعفی علم الجرح کی۔ اور تعدیل بھی معمولی روات کی نہیں بلکہ امام فن کی فرمائی ہے اور صرف امام ترمذی نے نہیں بلکہ امام بیہقی نے بھی امام ابو حنیفہ کی اس موضوع پر استدلالی حیثیت کو تسلیم کیا ہے چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب المدخل میں بسند متصل عبد الحمید الحمافی کے حوالہ سے لکھا ہے:

سمعت اباسعد الصنعانی وقام الی ابی حنیفة فقال یا ابا حنیفة
ما نقول فی الاخذ عن الشوری فقال اکتب عنه فانہ
ثقتہ ما خلا احادیث ابی اسحاق عن الحارث و حدیث
جابر الجعفی۔

میں نے ابوسعید کو امام ابو حنیفہ سے یہ کہتے سنا ہے کہ آپ کی سفیان
ثوری سے روایت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فرمایا ان سے
حدیثیں لکھو کیونکہ وہ ثقہ ہیں لیکن ان کی وہ حدیثیں نہ لکھو جو
بحوالہ ابواسحاق ازحارث ہیں۔ اور حدیث جابر جعفی بھی نہ لکھو۔

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابوالزناد عبد اللہ بن زکوان کی تعدیل کرتے ہوئے
جہاں دوسرے اکابر نقاد کے تعدیلی کلمات درج کیے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابوالزناد
ربیعہ سے زیادہ عالم ہیں۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں ان سب سے

پہلے امام اعظم کے یہ تعدیلی کلمات نقل کیے ہیں :

ما اُیئت ربیعۃ و ابا النزا و ابو النزا و افقہ

میں نے ربیعہ اور ابو النزا و دونوں کو دیکھا ہے لیکن ابو النزا و زیادہ
فقیہ ہیں۔

مشہور امام جعفر صادق سے کون واقف نہیں ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کی تعدیل کرتے ہوئے
جہاں یحییٰ بن معین اور ابو حاتم سے ان کی توثیق نقل کی ہے وہاں امام اعظم کے یہ تعدیلی
کلمات بھی نقل فرماتے ہیں :

عن ابی حنیفۃ ما اُیئت افقہ من جعفر بن محمد

اسی بنا پر ہمیشہ اس فن کے اماموں کو جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کے سامنے
سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے چنانچہ حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں :

اعلم ان الامام ابا حنیفۃ قد قبل فتولہ فی الجرح و

التعدیل و تلقوا عنہ علماء هذا الفن و عملوا بہ

جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کی بات قبول کی گئی ہے اور
اس فن کے علماء نے اسے اپنا پسند اور اس پر عمل پیرا ہوئے ہیں۔

یہی جابر جعفی جن کے بارے میں امام ترمذی نے کتاب العلل میں امام اعظم سے یہ فیصلہ نقل
کیا ہے کہ ما اُیئت اکذب من جابر۔ دوسرے ائمہ کی اس کی نسبت آراء کو پیش نظر
رکھ کر امام ابو حنیفہ کی قوت فیصلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ امام ثوری کہتے ہیں کہ ما اُیئت
اورع فی الحدیث من جابر۔ میں نے جابر سے زیادہ حدیث میں محتاط نہیں دیکھا۔ امام
شعبہ کہتے ہیں کہ جابر اگر حدیث میں سماع، تحدیث اور انبار کی تصریح کرے تو قابل
اعتبار ہے۔ ایک بار امام ثوری نے شعبہ سے کہا کہ تم جابر کے بارے میں کچھ کہو گے تو پھر
میں تمہارے متعلق کچھ کہوں گا۔

ذرا غور فرمائیے کہ جابر کی توثیق کون لوگ کر رہے ہیں اور یہ کس شان کے اجلہ فن ہیں۔

لیکن تحقیق کی بے رگ عدالت نے جو فیصلہ دیا ہے وہ بھی سہی ہے کہ جابر جعفی کی روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ لیث بن ابی سلیم فرماتے ہیں کہ کذاب ہے۔ امام زہاوی کہتے ہیں کہ متروک ہے امام ابو داؤد نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے نزدیک قوی نہیں ہے۔ جہیر بن عبد الحمید اور یحییٰ المحاربی کی رائے سے کہ غالی قسم کا شیعہ تھا اور حضرت علی کی حجت کا معتقد تھا۔ سید الحفایا یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ جابر کچھ نہیں قطعاً کذاب تھا بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ راوی تھا اور رافضی شتم اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رافضی ہے حضور انور کے صحابہ کا گستاخ ہے صرف جابر جعفی نہیں بلکہ دوسرے راویوں کے متعلق بھی امام اعظم سے تنقیدات منقول ہیں جن کو محدثین کے یہاں شرف قبول حاصل ہے مثلاً زید بن عیاش کے بارے میں امام اعظم اور امام مالک کے درمیان اختلاف ہے۔ امام اعظم اسے مجہول قرار دیتے ہیں لیکن امام مالک نے اس کے حوالہ سے مؤطا میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی وہ روایت نقل کی ہے جس میں حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور اور تھوڑے کو ملا کر نیچنے سے منع فرمایا ہے۔

بعد کو اگرچہ بعض محدثین نے امام مالک کی تقلید میں اس روایت کو صحیح قرار دیا لیکن خود امام بخاری اور امام مسلم نے اس بارے میں امام ابو حنیفہ کے فیصلے سے موافقت کی ہے چنانچہ محدث حاکم نے یہ حدیث درج کر کے امام بخاری اور امام مسلم کی جانب سے اس حدیث کی تخریج نہ کرنے پر معذرتاً اس طرح پیش کی ہے :

والشیخان لا یجرحا ہا لا خشیا من جہالۃ زید بن عیاش
شیخین نے زید بن عیاش کے مجہول ہونے کے اندیشے سے اسے
روایت نہیں کیا۔

حافظ ابن الہمام نے اسی موضوع پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ
امام اعظم بغداد شریب دہلوی کے ارباب روایت نے
اس مسئلہ میں کہ غالی کی جگہ سے جائز ہے۔ یہ کہہ کر امام اعظم کے
خلافہ آواز اٹھائی کہ یہ حدیث لیث کے خلاف ہے۔ ارباب
روایت نے امام سے حسیہ سے دریافت کیا کہ بتائیے آپ کھجور

کی بیع تمر سے کیسے جائز بتاتے ہیں؟ امام صاحب نے جواباً فرمایا کہ دو حال سے خالی نہیں کہ رطب تمر ہے یا نہیں اگر ہے تو بیع جائز ہے تمر بالتمر حدیث میں اس کی اجازت ہے اور اگر تمر نہیں ہے تو پھر بھی اس کی بیع جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے - اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شکتم - ارباب روایت نے لا جواب ہو کہ حدیث سعد پیش کی جس میں حضور نے بیع الرطب بالتمر سے منع فرمایا ہے - امام اعظم نے جواباً فرمایا کہ اس حدیث کا مدار زید بن عیان سے ہے - اس کی حدیث قابل پذیرائی نہیں ہے -

معارف الرجال اور امام اعظم

محدثین لکھتے ہیں کہ اسماء الرجال کا علم حدیث کے علم کا نصف ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے روح اللقیہ میں امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے اور وجہ اس کی یہ بتاتی ہے کہ حدیث ن اور سند کے مجموعے کا نام ہے اور سند کا تعلق راویوں سے ہے اور راویوں ہی کے مات کی واقفیت علم اسماء الرجال ہے - اور راویوں پر جرح و تعدیل ایک نہیں بلکہ دو - جیم المرتبت اور جلیل القدر فنوں کے مجموعے کا نام ہے - نقد و نظر اس کی جان ہے - اگر شخص کی ذات کو اس فن میں استدلالی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے تو اس کا واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اس کی رجال میں معرفت کی پختگی اور راویوں کے احوال سے واقفیت کو تسلیم لیا گیا ہے کیونکہ علم الجرح میں جرح اور علم التعلیل میں معدل ہونے کی بنیادی شرط یہی ہے - علماء نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے - تاج الدین السبکی، علامہ بدر بن جماعہ - حافظ ابن حجر نے اس کی تصریح کی ہے کہ جو شخص جرح و تعدیل کے اسباب و وسائل سے غافل ہو اس کی کوئی رائے اس فن میں کسی درجہ میں قبول نہ کی جائے گی اور حافظ ذہبی نے مابہ :

وہ عالم و عارف جو حدیثوں کے راویوں کا تذکرہ یا ان پر جرح کرتا ہے

نقادِ نجیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تلاش و جستجو
میں جان نہ کھپائے اور بہت زیادہ مذاکرہ، شب بیداری، تپتہ
اور فہم و فراست کے ساتھ درنداری، پارسائی اور انصاف سے
ہم آغوش نہ ہو سکے۔

دوسرے علمائے بھی اسی قسم کی تصریحات پیش فرمائی ہیں۔

اہل فن کی یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ ناقد کے لیے راویوں کے حالات سے واقفیت ضرور
ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ جس پر تنقید کر رہا ہے یہ جانے کہ کون ہے کیا کرتا ہے، اس کا چال چلن
کیسا ہے، اس کی سمجھ بوجھ کس درجہ کی ہے، ثقہ ہے یا غیر ثقہ، عالم ہے یا جاہل، ذہین ہے
یا غبی، یادداشت کا کیا حال ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے۔ کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے وغیرہ
وغیرہ۔ جب تک ان بنیادی امور سے پوری واقفیت نہ ہو کوئی شخص ناقدین میں شمار نہیں
ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ اگر امام اعظم کا شمار معدلین رجال میں ہے اور نہ ہونے کی وجہ سے کیا
ہے جبکہ محدثین نے ان کے اس مقام کو تسلیم کیا ہے تو اس کے باور کرنے میں کس کوتاہی
ہو سکتا ہے کہ امام اعظم کو اسما الرجال میں اونچا مقام حاصل تھا۔ امام اعظم اس موضوع پر بھی بعدین
آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ حافظ عبد القادر قرشی نے ابو سلیمان الجوزجانی کے حوالہ
سے مشہور امام حدیث حماد بن زید جو عبد الرحمن بن مہدی اور علی بن المدینی کے استاد ہیں
ان کا جو بیان لکھا ہے اس سے امام اعظم کی رجال شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سمعت حماد بن زید یقول ما عرفنا کنیۃ عمرو بن دینار
الا بائی حنیفۃ کنا فی المسجد الحرام والیہ حنیفۃ مع عمرو
بن دینار فقلنا لا یا ابا حنیفۃ کلمۃ یحد ثنا فقال یا ابا
محمد حدیثہم۔

میں نے حماد بن زید سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمیں عمرو بن دینار کی
کنیت کا علم نہ تھا۔ ابو حنیفہ کے ذریعہ ہمیں ان کی کنیت کا علم ہوا
ایک بار ہم مسجد حرام میں تھے ابو حنیفہ عمرو بن دینار کے پاس ہی

کھڑے تھے ہم نے امام صاحب سے کہا کہ آپ ان سے کہتے کہ حدیث بیان
 کریں آپ نے ان سے فرمایا کہ اے ابو محمد ان کو حدیث سناؤ۔
 امام حماد بن زید کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو عبد الرحمن بن مہدی کا یہ بیان پڑھیے فرماتے
 ہیں کہ:

میں نے ان سے زیادہ سنت کا جانکار کوئی نہیں دیکھا ہے۔
 حافظ ابن عبد البر نے سلیمان بن حرب کے حوالہ سے جہاں ان کے متعلق یہ انکشاف کیا ہے
 کہ حماد کہتے ہیں بخدا مجھے ابو حنیفہ سے محبت ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ:
 روی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثا کثیرا۔

ان احادیث کثیرہ کی صحیح تعداد بھی سن لیجئے۔ امام عجمی فرماتے ہیں کہ حماد بن زید کو چار ہزار
 حدیثیں یاد تھیں اور یہ آپ پہلے امام حسن بن زید کی زبانی سن چکے ہیں کہ امام اعظم کی مجموعی مرویات
 کی تعداد چار ہزار ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ امام ابو حنیفہ کی ساری مرویات
 حماد بن زید روایت کرتے تھے۔ واضح ہے یہ عمرو بن دینار ہی ہیں جن کے متعلق امام سفیان
 بن عیینہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن دینار کی حدیثیں بیان کرنے کے لیے مجھے تحدیث کے لیے مقرر
 فرمانے والے بھی امام اعظم ہیں لگے حماد بن زید کہتے ہیں کہ ہم عمرو بن دینار کے پاس ہوتے جب
 امام اعظم تشریف لاتے تو عمرو بن دینار ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف سرپا توجہ ہو جاتے ہم امام اعظم سے
 پوچھتے وہ ہم سے حدیثیں بیان کرتے۔

تاریخ رجال میں امام اعظم کی مہارت اور برتری کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے جو داؤد
 بن الجحر نے بتایا ہے کہ امام اعظم سے پوچھا گیا کہ احرام والے کو اگر تہ بند نہ ملے تو کیا شلوار پہن سکتا ہے
 فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اسے تہ بند باندھنا چاہیے۔ پوچھا اگر اس کے پاس تہ بند نہ ہو تو کیا کرے؟
 فرمایا شلوار فروخت کرے اور تہ بند خرید لے۔

پوچھنے والے نے کہا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

الحرم یلبس السراویل اذا لم یجد الازار

احرام والا شلوار پہنے جب اسے تہ بند دستیاب نہ ہو۔

امام اعظم نے جواب میں فرمایا کہ:

لَمْ يَصِحْ فِي هَذَا عِنْدِي عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ -

میرے نزدیک اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے بلکہ

اور فرمایا کہ ہمارے نزدیک تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت یہی ثابت ہے کہ حضور انور نے احرام والے کو شلوار پہننے سے منع فرمایا۔

کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو کی راویوں پر نظر ہو اور اسانید و طرق کا پتہ ہو اس لیے امام اعظم کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ امام اعظم تاریخ رجال سے پورے طور پر واقف تھے۔ امام مالک سے جب اس حدیث کے بارے میں یہی سوال کیا گیا تو امام مالک کا جواب یہ تھا:

لَمْ أَسْمَعْ بِهَذَا وَلَا أَرَىٰ أَنْ يَلْبَسَ الْحِمَامُ سِرَادِيلَ

میں نے یہ حدیث نہیں سنی ہے اور احرام والے کے لیے میری

راے میں شلوار پہننے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ

الغرض امام مالک اور امام ابو حنیفہ دونوں ہی احرام والے کے لیے شلوار پہننے کے جواز کے قائل نہیں ہیں لیکن حدیث کی حد تک ایک باریک سا فرق ہے اور وہ یہ کہ امام مالک حدیث کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں۔ اور نہ سننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں اسی لیے حافظ ابن حجر عسقلانی کو امام مالک کی جانب سے یہ معذرت پیش کرنے کا خیال آگیا۔

كَانَ حَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ لَمْ يَبْلُغْ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کو یہ حدیث نہیں پہنچی بلکہ

برخلاف امام اعظم کے کہ انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں ہے

۱۔ الانتقار۔ ۲۔ اوجز المسالك مع موطا ج ۳ ص ۳۱۲۔

۳۔ فتح الباری ج ۲ ص ۴۶۔

بلکہ فرمایا ہے:

لما یصح فی هذا عندی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک میں بے خبری اور دوسری میں باخبری کا پتہ ان کے لحد یصح کہنے سے چلتا ہے۔ اس سے عارف عیاں ہے کہ حدیث تو موجود ہے لیکن اس کی صحت کا جو معیار ہی یہی ہے مقرر ہے اس پر پوری نہیں اترتی ہے۔ کیونکہ محدثین کے یہاں عدم صحت اس کو مستلزم نہیں ہے کہ گھڑی ہوئی اور موضوع ہے۔ علامہ زرکشی نے نکت علی ابن الصلاح میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدد اور نتائج الافکار میں اور ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں تصریح کی ہے اور باخبر ہو کر روایت کی عدم صحت کا اعلان فنکار ہونے کی نشانی ہے۔ اسی بنا پر اس حدیث پر علی الاطلاق امام احمد کے سوا کسی نے عمل نہیں کیا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

قال القرطبی: اخذ بظاهر هذا الحديث احمد فاجاز بس الخف

والسراويل ثم الذی لا یجوز النعمین ولا ذار علی ما

لہما واشتراط الجمهور قطع الخف وفتق السراويل۔

قرطبی فرماتے ہیں اس حدیث کے ظاہر پر امام احمد نے عمل کیا ہے انہوں نے خف اور شلوار کے پھٹنے کو جیسے بھی ہوں جائز سمجھا ہے لیکن جمہور نے خف کے لیے قطع اور شلوار کے لیے فتق کی شرط لگائی ہے۔

بہر حال امام اعظم ابو حنیفہ علم الجرح والتعديل کی طرح تمام الرجال کے فن میں کیتے روزگار تھے۔

تَحْمَلُ رَوَايَةَ حَدِيثِ اَمَامِ عَظَم

امام اعظم نے علم حدیث کے ہر شعبے میں خاص رہنمائی فرمائی ہے اور مستقبل میں جب کہ علوم و فنون میں بہار آنے والی تھی آپ نے سینے کے نشانات کا کچھ اس انداز سے پتہ دیا ہے کہ

بعد میں آنے والوں نے ان ہی بتائے ہوئے نشانات پر پوری عمارت قائم کی ہے۔ یہ واقعہ ہے جیسا کہ حافظ ابن حزم نے بتایا ہے کہ اقوام دنیا میں کسی کو اسلام سے پہلے یہ توفیق عطا نہیں ہوئی ہے کہ اپنے پیغمبر کی باتیں صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے یہ شرف صرف امت اسلامیہ کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کو صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کیا ہے آج روئے زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کر سکے اس کے برعکس اسلام نے اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک شوشہ پوری صحت و اتصال کے ساتھ محفوظ کیا۔ اور صرف اس سرمایہ علمی کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اس علمی سرمایہ کو لگے پہنچانے، ایک دوسرے سے اسے حاصل کرنے کے طرق بھی مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ اسی کو محدثین کی اصطلاحی زبان میں تحمل روایت کہتے ہیں۔

تحمل روایت کے طرق

تحمل روایت کے لیے ارباب روایت نے آٹھ صورتیں مقرر فرمائی ہیں۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں:

الاحذ للحدیث وتحمل، عن الشیوخ ثمانية اقسام ۛ

پھر ان طرق سے حاصل کردہ احادیث کو بیان کرنے کے لیے تعبیر کا بھی ایک خاص پیمانہ مقرر کیا ہے۔

محدثین نے تحمل روایت کی جو آٹھ صورتیں بتائی ہیں یہ ہیں۔ سماع، عرض، اجازہ، منادہ، مکاتیب، اعلام، وصیۃ، وجاہہ۔

سماع و عرض

سماع یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے مشافہتہ احادیث سنے چاہے استاد اپنے حافظہ کے بھروسہ پر زبانی سناتے یا پھر کتاب سے دیکھ کر سناتے۔ لکھائے یا نہ لکھائے۔ چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

سماع الشیخ وهو املاء وغیره من حفظ و من کتاب یہ
حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں :

سواء احدث من کتابہ او من حفظہ باملاء او بغیر
املاء۔ ۲

عرض یہ ہے کہ شاگرد پڑھے اور اُستاد سنے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :
القرائة على الشيخ حفظا او من كتاب وهو العرض
عند الجمهور۔ ۳

سماع ہو یا عرض ان دونوں میں اس موضوع پر تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان دونوں طریقوں
سے روایت کرنا صحیح ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں برابر ہیں یا ان دونوں میں
اعلیٰ و ادنیٰ کی نسبت ہے۔

جمہور محدثین نے سماع کو ارفع اقسام قرار دیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ
میں، حافظ زین الدین عراقی نے الفیہ میں، امام نووی نے تقریب میں، حافظ ابن کثیر نے
اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ سیوطی نے تدریب میں اس کی تصریح کی ہے لیکن اس
موضوع پر دوسری صدی کے محدثین کی آراء ان بزرگوں سے مختلف ہیں۔ دوسری صدی
میں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام تیبث بن سعد، امام ابن ابی ذئب، امام شعبہ، امام یحییٰ
بن سعید الانصاری، امام عبد العزیز بن حمیر، امام سفیان ثوری اور امام سعید بن ابی عروبہ
جیسے اساطین اُمت کی رائے میں کمال روایت کی دوسری صورت یعنی شاگرد پڑھے اور اُستاد
سنے جسے قراءۃ علی الشیخ اور عرض کہتے ہیں ارفع اقسام ہے۔ اس سلسلے میں محدثین کی
تصریحات یہ ہیں۔

حافظ سیوطی نے امام بیہقی کی مدخل کے حوالہ سے مکی بن ابراہیم کا بیان درج کیا ہے :

ابن بریج، عثمان بن الاسود، خطلہ بن ابی سفیان، طلحہ بن ابی سفیان،
طلحہ بن عمرو، امام مالک، محمد بن اسحاق، سفیان ثوری، ابو حنیفہ، ہشام
بن عروہ، ابن ابی ذئب، سعید بن ابی عروبہ، المثنیٰ بن الصباح،

ان سب کا کہنا ہے کہ تمہارا استاد تمہارے سامنے پڑھے اور تم سنو۔
حافظ ابو بکر الخطیب نے مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے خاص امام ابو حنیفہ کی زبانی بیان کیا ہے
مکی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ میں اگر استاد کے
روبرو پڑھوں تو مجھے یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ استاد پڑھے
اور میں سنوں۔

اسی سلسلے میں امام حسن بن زیاد کے حوالے سے امام اعظم کا جو بیان آیا ہے وہ بھی سن لیجئے
اس سے امام صاحب کا موقف واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے:-

حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے۔ تمہارا محدث کے
روبرو پڑھنا اس سے سننے کے مقابلے میں زیادہ ثابت اور ٹوکہ
ہے کیونکہ جب استاد تمہارے سامنے پڑھے تو وہ صرف کتاب ہی
سے پڑھے گا اور جب تم پڑھو گے تو وہ کہے گا کہ میری جانب سے وہ
بیان کرو جو تم نے پڑھا ہے اس لیے یہ مزید تاکید ہو گی۔

حافظ ابن کثیر نے امام اعظم کے اس موقف کو ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:
وعن مالک وابی حنیفۃ وابن ابی ذئب النہا قوی
امام مالک، ابو حنیفہ اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ یہی قوی ہے
امام نووی نے امام صاحب کے اس موقف کو ذرا اور طرح پیش کیا ہے:
والثابت عن ابی حنیفۃ وابن ابی ذئب دھور وایتہ
عن مالک

امام ابو حنیفہ اور ابن ابی ذئب اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ
قرآن علی الشیخ کو شیخ سے سننے پر ترجیح دی جائے۔
حافظ ابن الصلاح نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا ہے:
فنقل عن ابی حنیفۃ وابن ابی ذئب وغیرہما ترجیح لقراءۃ

علی الشیخ علی السماع من لفظہ لہ

امام ابو حنیفہ امام ابن ابی ذئب نے قراۃ علی الشیخ کو سماع پر ترجیح دی ہے۔

حافظ زین الدین عراقی نے امام اعظم اور ابن ابی ذئب کا نام لکھ کر بتایا ہے
قد رجحنا العرض و عکسہ اصح
و جعل اهل المشرق مخوۃ جنح لہ

اس داستان کو طول دینے اور ارباب حدیث کی تصریحات کے تکرار سے میرا مقصود علم کے ان یتیم خانوں میں محدثین کی یہ صدائے غریب پہنچانا ہے جو بجلی کی روشنی اور پنکھوں کی ہوا میں بیٹھ کر یہ کہتے سہتے ہیں کہ ابو حنیفہ حدیث سے بے بہرہ تھے اور ابلہ فریبی کے لیے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ وہ فقیہ تھے اور صرف فقیہ۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔

بہر حال تحمل روایت کا کوئی طریق ہو سماع ہو یا قراۃ علی الشیخ اس پر سب کا ہی اتفاق اور ایک ہے کہ دونوں طرح سے روایت صحیح ہے لیکن بیان روایت کے لیے دوسرے طریق یعنی قراۃ علی الشیخ میں جو تعبیری پیمانہ اختیار کیا جاتا ہے اس میں اگرچہ اس حد تک تو سب یک زبان ہیں کہ تعبیریوں ہونی چاہیے قرأت علیہ (میں نے اس کے سامنے پڑھا) یا قرئ علیہ (اس نے سامنے پڑھا) اور میں سن رہا تھا وغیرہ۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس طریق میں حد ثنا یا اخبار کا تعبیری پیمانہ بھی استعمال کرنا درست ہے یا نہیں۔ عام ارباب روایت اور محدثین اس سے روکتے ہیں۔ امام احمد، نسائی اور دوسرے محدثین کا یہی مذہب ہے خطیب بغدادی نے لکھا ہے :

هو مذهب خلق كثير من اصحاب الحديث

محدثین کی اکثریت کا مذہب یہی ہے

حافظ ابن کثیر نے اسے مسلم، نسائی اور جمہور مشرق کا مذہب قرار دیا ہے لیکن اس موضوع پر امام اعظم ابو حنیفہ کا مذہب ان بزرگوں سے بالکل جدا گانہ ہے۔ امام اعظم اس صورت میں حد ثنا کی تعبیر کو جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابو بکر الخطیب فرماتے ہیں کہ :

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ ایک شخص جس نے حدیث محدث کو سنا کر حاصل کی ہے کیا اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ حدیث کہے؟ فرمایا کہ ہاں اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ حدیثی فلان اور سمعت فلانا اور اس کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کے سامنے اقرار ہی دستاویز کو پڑھا جائے اور کہہ دے کہ اس نے میرے سامنے اس دستاویز کے سامنے مندرجات کا اقرار کیا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر خطیب بغدادی ہی رقمطراز ہیں :
امام ابو عاصم النبیل کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک، ابن جریر، سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ سے دریافت کیا کہ ایک شخص اگر شیخ کے سامنے حدیث پڑھ رہا ہے تو کیا اسے نقل روایت کے موقع پر حدیث کہنا درست ہے؟ سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

امام ابو عاصم ہی کا ایک اور بیان اس سے زیادہ واضح ہے فرماتے ہیں :
میں نے امام مالک، ابن جریر، سفیان ثوری اور ابو حنیفہ سے پوچھا کہ محدث کے سامنے ایک شخص خود حدیث پڑھتا ہے پھر وہ کہتا ہے کہ حدیث فلان اس بائے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ سب کا جواب یہ تھا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ ابو عاصم کہتے ہیں کہ ان میں دو حجازی اور دو عراقی ہیں۔

مشہور محدث یحییٰ بن ایوب کہتے ہیں :
میں نے ابو قطن سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میرے سے امام ابو حنیفہ نے کہا میرے سامنے پڑھو اور حدیث کہو۔ اگر میرے خیال میں اس میں کوئی بھی مضائقہ ہوتا تو میں ایسا کرنے کا تمہیں ہرگز حکم

زوتیا۔^۱

امام نووی نے تقریب میں اسے دوسری صدی کے محدثین کا مذہب قرار دیتے ہوئے اس موضوع پر امام بخاری کی ہمنوائی کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

انہ مذہب الذہری ومالك وابن عيينة، ويحيى القطان
والبخاري وجماعة من المحدثين ومعظم الحجازيين والكوفيين۔^۲

قاضی عیاض، حافظ سیوطی، حافظ ابن کثیر بھی اس معاملے میں امام نووی کے ہم زبان ہیں۔

تکمل روایت اور اجازت

تکمل روایت کے طریقوں میں سے اجازت بھی محدثین کے یہاں ایک طریق ہے۔ محدثین کی زبان میں اجازت یہ ہے کہ شیخ کسی بھی شخص کو اپنی مرویات کی روایت کا زبانی یا تحریری پروانہ دے دے۔

اجازت کی ایک نہیں بلکہ محدثین کے نزدیک متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی خاص شخص کو کسی خاص حدیث کی اجازت دی جاتے مثلاً یوں کہے کہ میں نے تم کو حدیث کی اجازت دی ہے۔ جمہور محدثین اس کے جواز کے قائل ہیں اور اس طریق سے علمی سرمایہ کی روایت کو درست کہتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

والصحيح الذي قاله الجمهور من الطوائف واستقر عليه
العمل جواز الرواية والعمل بها۔

سب کے نزدیک صحیح اور سب کا عمل جس پر ہے وہ یہی ہے کہ اس کی روایت اور اس پر عمل درست ہے۔

لیکن محدثین میں مشہور امام نقد و نظر شعبہ اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں اور حافظ سیوطی نے تدریب میں امام آمدی کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کا اور قاضی عبدالوہاب کے حوالہ سے امام مالک کا بھی یہی موقف قرار دیا ہے چنانچہ آمدی نے تصریح کی ہے:

قال ابو حنيفة وابو يوسف لا تجوز الرواية بالاجازة مطلقاً۔^۳

^۱ الکفایہ ص ۳۰۴۔ ^۲ تقریب ص ۲۴۵۔ ^۳ تقریب ص ۲۴۵۔ ^۴ احکام الامامی ج ۲ ص ۱۹۲

تخل روایت اور مناولہ

تخل روایت کے طریقوں میں سے ایک طریق مناولہ بھی ہے مناولہ یہ ہے کہ محدث طالب کو اپنی مسموعات پر مشتمل کتاب دے اور کہہ دے کہ اسے تم میری جانب سے روایت کرو یا طالب کو کتاب کا مالک بنا دے یا بکھنے کے لیے کتاب عاریتہ دے دے یا طالب شیخ کے پاس اپنی مسموعات کی کتاب لے کر آئے شیخ اُسے دیکھ کر طالب کو کہہ دے کہ تمہیں اس کتاب کے مشتملات کی میری جانب سے روایت کی اجازت ہے اس کو عرض مناولہ کہتے ہیں۔ اس موقع پر محدثین کے یہاں یہ سوال ابھرا یا ہے کہ بلحاظ قوت اس کا کیا حکم ہے؟ اس ابھرے ہوئے سوال کے جواب میں علماء مختلف الخيال ہیں۔ امام نووی نے بتایا ہے کہ امام زہری، ربیعہ، یحییٰ بن سعید، مجاہد، امام شعبی، علقمہ، ابراہیم، ابوالعالیہ، ابوالزبیر مکی، ابوالمتوکل، مالک، ابن وہب، ابن القاسم، ان سب کی رائے یہ ہے کہ عرض مناولہ قوت میں تخل روایت کی پہلی صورت سماع کے برابر اور ہم پلہ ہے لیکن اس کے مقابلے میں امام ابو حنیفہ، سفیان، ثوری، امام اوزاعی اور عبد اللہ بن المبارک وغیرہ کہتے ہیں کہ عرض مناولہ کا درجہ سماع اور قراءۃ علی الشیخ دونوں سے کمتر ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں :

والصحيح نهما منخطة عن السماع والقراءة وهو قول الثوري

والاوسراهي وابن المبارک وابی حنیفة

صحیح یہی ہے کہ مناولہ عرض کا مقام سماع اور قراءت علی الشیخ سے نیچے

ہے یہی ثوری، اوزاعی، ابن مبارک اور ابو حنیفہ کا کہنا ہے یہ

اور امام حاکم نے اسی بات کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے :

اما فقهاء الاسلام الذين افتوا في الحلال والحرام فانهم

لم يروا سماعاً منهم الشافعي والاوسراهي وابو حنیفة

والثوري وابن حنبل وابن المبارک

فقہاء اسلام جو اسلام میں حلال و حرام کا فتویٰ دیتے ہیں وہ عرض مناولہ کو سماع قرار نہیں دیتے جیسے شافعی، اوزاعی، ابو حنیفہ اور ثوری وغیرہ

بہر حال امام اعظم کا مذہب اس موضوع پر یہی ہے کہ عرض مناولہ سماع و قرأت کے ہم پلہ نہیں ہے اور متاخرین محدثین نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔

تخل روایت کی باقی صورتیں یعنی مکاتبہ، اعلام، وصیت اور وجاہہ پر بھی محدثین کے یہاں تفصیلی مباحث اصول حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علم حدیث کی ہر شاخ میں امام اعظم کی حلیل القدر خدمات موجود ہیں اور محدثین نے ہمیشہ سے اس فن میں ان کی جلالتِ شان کا لوہا مانا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن عبد البر نے مشہور محدث یزید بن ہارون کا امام اعظم کے بارے میں یہ تاثر نقل کیا ہے۔

ادركت الف رجل وكتبت عن اكثرهم ما دأيت فيهم

افقه ولا اورع ولا اعلم من خمسة اولهم ابو حنيفة

میں نے ہزار محدثین کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ،

سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم صرف پانچ ہیں ان میں اولین مقام ابو حنیفہ کا ہے۔

امام مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں:

كان ابو حنيفة نرا هداً عالماً راغباً في الاخرة صدوق اللسان
احفظ اهل زمانه۔

امام ابو حنیفہ زائد، عالم، آخرت کی طرف راغب، راست گو اور اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

محدث صیمری نے شیخ الاسلام حافظ یزید بن ہارون سے بھی اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے،

كان ابو حنيفة تقياً نرا هداً عالماً صدوق اللسان احفظ اهل
زمانه۔

اور امام یحییٰ بن سعید القطان جو مشہور ناقد حدیث اور جرح و تعدیل کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں،

جامع بیان العلم وفضلہ، الانتقاد ص ۱۶۳۔ اے مناقب موفّق، لکھ، قس بہ الحاجہ۔

انہ واللہ لا علم هذه الامّة بما جاء عن اللہ ورسولہ
واللہ امام ابو حنیفہ اس اُمت میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے
سب سے بڑے عالم تھے یہ

امام ابو عبد اللہ الحاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں نوع التاسع والاربعین میں
ان ائمہ کا تذکرہ کیا ہے جن کی حدیثوں کو حفظ و مذاکرہ اور برکت کے لیے ذخیرہ کیا جاتا ہے
چنانچہ فرماتے ہیں:

هذا النوع من هذه العلوم معرفة الائمة الثقات
المشہورین من التابعین واتباعہم ممن یجمع حدیثہم
للحفظ والمذاکرۃ والتبرک بہم و ب ذکرہم من
الشرق الی الغرب۔

یہ قسم علوم حدیث میں سے ان معتمد، مشہور تابعین اور اتباع تابعین کے
بنانے کے لیے ہے جن کی حدیثوں کو حفظ، مذاکرہ کے لیے جمع کیا
جاتا ہے۔ اور جن سے برکت یابی اور مشرق سے مغرب تک جن کے
ذکر سے برکت لی جاتی ہے یہ

یہ عنوان قائم کر کے امام حاکم نے مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، الجزیرہ، بصرہ،
واسط اور خراسان کے محدثین کا تذکرہ کیا ہے ان میں امام ابو حنیفہ کا نمایاں تذکرہ کیا ہے۔
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم محدث ہونے کی حیثیت سے محدثین کی برادری میں صرف
جانے پہچانے نہیں بلکہ بارگاہ محدثین میں ان کی جلالت و امامت علم حدیث میں مسلم ہے

حدیث شاذ اور امام اعظم

یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی بدین حدیث کے بعد حدیث کے نام پر جو علمی سرمایہ موجود ہے
وہ تین قسم کا ہے۔ کچھ وہ حدیثیں ہیں جن کے الفاظ محفوظ ہیں اور کچھ وہ ہیں کہ الفاظ تو
محفوظ نہیں لیکن ان کے معانی محفوظ ہیں۔ اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کے الفاظ میں

اختلاف ہے اور ساتھ ہی ان کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے۔ قسم اول اور قسم ثانی محدثین اور فقہاء کے یہاں مفہوم و مدلول کی تعین میں اختلافی ہے اور آخری قسم خود محدثین کے یہاں صحت اور ثبوت کے لحاظ سے اختلافی ہے۔ چنانچہ حافظ ابوبکر عقال الصقلی فرماتے ہیں :-

احادیث محدثین کے یہاں دائرہ ضبط میں اس طرح آتی ہیں کہ کچھ ایسی ہیں جن کی نقل میں حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعینہ الفاظ محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جو ہر قسم کی علت سے پاک و صاف ہیں۔ کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ نقل میں معانی تو محفوظ ہیں مگر اصل الفاظ بالکل محدثین کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ اور کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ جن کے الفاظ مختلف ہیں اور جن کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جن میں علتیں ہوتی ہیں۔ فساد ہی اصول صحیح کے مطابق ان میں صحیح اور ضعیف کی تمیز کر سکتے ہیں۔

محدثین نے صحیح حدیث کی تعریف یہ بتائی ہے کہ جس کے راویوں میں ضبط، عدالت کے ساتھ سند کا اتصال ہو اور اس میں تشذوذ اور علت قاضی نہ ہو۔ گویا حدیث کے صحیح ہونے کی ایک ناگزیر منفی شرط یہ ہے کہ وہ تشاذ نہ ہو لیکن تشاذ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں محدثین میں باہم اختلاف ہے۔

حافظ ابن کثیر نے حافظ ابویعلیٰ الخلیل سے تشاذ کی یہ تعریف نقل کی ہے :

والذی علیہ الحفاظ ان اذ شاذ ما لیس لہ الا اسناد واحد یثذبہ ثقۃ او غیر ثقۃ۔

حفاظ کے نزدیک تشاذ یہ ہے کہ اس کی صرف ایک ہی سند ہو اور اس

طرح ثقہ یا غیر ثقہ اس میں تشذوذ پیدا کر رہا ہو۔

اور امام حاکم نے تشاذ کی یہ تعریف بتائی ہے :-

هو الذی یفر د بہ الثقۃ و لیس لہ متابِع

لہ شروط الائمۃ الخمسۃ ذکر الکوثری فی تعلیقہ ناقلہ عن ابی بکر بن عقال الصقلی فی فوائدہ علی ما رواہ ابن بشکوال

لہ اختصار علوم الحدیث ص ۵۷۔

تقریباً ہی کا ایسا بیان جس کا متابیح کوئی نہ ہو شاذ کہلاتا ہے۔ لیکن حافظ ابن الصلاح نے دونوں پر بڑی کڑی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر شاذ یہی ہے تو امام بخاری کی پہلی حدیث بھی شاذ ہے اور اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

اس تعریف کی بنیاد پر تو حدیث انما الاعمال بالنیات بھی شاذ ہے ۔

کیونکہ یہ بھی ایک فرد ہے جسے حضرت عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منفرداً روایت کرتے ہیں پھر حضرت عمر سے علقمہ بھی منفرداً روایت کرتے ہیں اور علقمہ سے اسے روایت کرنے میں محمد بن ابراہیم اور محمد بن ابراہیم سے یحییٰ بن سعید منفرد ہیں ۔ محدثین کے نزدیک یہی ثابت ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال عبداللہ بن دینار کی یہ حدیث ہے ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن بیع الاولاد وھبۃ ۔ اس میں بھی عبداللہ بن دینار منفرد ہے ۔ ایسے ہی وہ حدیث جو بحوالہ مالک از زہری از انس آئی ہے جس میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور آپ کے سر پر ڈھال تھی ۔ اس میں مالک امام زہری سے منفرد ہیں ۔ یہ سب روایات صحیحین میں موجود ہیں اور ان کی سند بھی صرف ایک ہی ہے جس کا تعلق ثقہ کے فرد سے ہے ۔ غرائب صحیح میں اس کا وافر ذخیرہ ہے ۔ امام مسلم کا اپنا اقرار ہے کہ امام زہری کی نوے حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی اسناد میں وہ منفرد ہیں اور ان کی کوئی ہمنوائی نہیں کرتا ہے ۔

حافظ ابن الصلاح نے اس اڑچن کا مداوا اور اس مشکل کا خود ہی حل بھی پیش فرمایا ہے لیجئے وہ بھی ان کی زبانی سن لیجئے وہ فرماتے ہیں :

اصل واقعہ یہ ہے کہ راوی اگر کوئی روایت منفرداً پیش کرتا ہے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس کی یہ روایت اگر اس سے زیادہ

کسی حافظ و ضابط کی روایت کے خلاف ہو تو یہ شاذ مردود ہے۔ اور اگر اس کی روایت میں مخالفت کا کوئی پہلو نہ ہو تو پھر اس منفرد کی حیثیت کو دیکھا جائے اگر حافظ عادل اور ثقہ ہو تو اس کے تفرّد کو شرف پذیرائی دیا جائے اور اس میں یگانگت قاذح نہیں ہوگی جیسا کہ پہلی مثالوں میں ہے اور اگر راوی کے حفظ و اتقان پر بھروسہ نہ ہو تو اس کی روایت دائرہ صحت سے خارج تصور کی جائے گی۔

قاضی بدرالدین بن جماعہ نے حافظ ابن الصلاح کی اس پیش فرمودہ قرار داد کی تائید فرمائی ہے لیکن حافظ محمد بن ابراہیم نے اس پر بھی ایک سوال قائم کر دیا ہے اور بہت کچھ چنبن و چٹاں کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:

شاذ اور نکارت کی بنا پر حدیث میں محدثین کے لیے قدر سے حد مشکل ہو گئی ہے۔

یہ خالص محدثانہ رنگ ہیں ان محدثین کا نقطہ نظر ہے جن پر اسناد و روایت کا غلبہ ہے۔ دوسری صدی میں شاذ کی تعریف اور اس کی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے محدثین نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس سے بالکل جدا گانہ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ ہر ایسی حدیث کو شاذ قرار دیتے ہیں جو اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے خلاف ہو۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البر نے امام اعظم کے نقطہ نظر کو ایک موقع پر محدثین کو جواب دیتے ہوئے اس طرح واضح کیا ہے:

کثیر من اهل الحديث استجازوا الطعن على ابي حنيفة
لعدة كشيروا من اخبار الاحاد والحدول لافه كان يذهب
في ذلك الى عرضها على ما اجتمع عليه من الاحاد بيت و
معاني القرآن فما شذ من ذلك مردود وسواء شاذاً -

بہت سے محدثین نے امام ابو حنیفہ پر اس لیے اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے بہت سے ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ امام صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے مجموعہ سے ہٹا کر دیکھتے

اگر خبر واحد کا مضمون ان سے مطابقت کھا جاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث فرماتے بلکہ

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام اعظم اس حدیث کو شاذ بتاتے ہیں جو معانی قرآن اور اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں کے خلاف ہو۔ امام اعظم کا شاذ کے موضوع پر یہ موقف قابلِ داد ہے اور امام مالک بھی امام صاحب کے ہم نوا ہیں۔ اسی بنا پر امام مالک حدیث دلوغ کلب کی تصنیف فرماتے تھے۔ شاطبی فرماتے ہیں کان مالک یضعفہ امام مالک سے ضعیف کہتے تھے بلکہ لیکن حالات کے تحت طبیعتوں اور مزاجوں میں اختلاف رونما ہو گیا۔ جن کے مزاجوں میں تفقہ کا رنگ غالب تھا۔ انہوں نے امام اعظم کی ہم نوائی کی۔ چنانچہ امام شافعی سے جو شاذ کی تعریف منقول ہے وہ بھی اس کے قریب قریب ہے وہ فرماتے ہیں کہ :

شاذ یہ نہیں ہے کہ ثقہ راوی کوئی ایسی حدیث روایت کرے جس کو اس کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا بلکہ شاذ یہ ہے کہ ثقہ راوی ایسی حدیث روایت کرے جو عام لوگوں کی روایت کے مخالف ہو گئے

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ بخلاف ما روی الناس سے امام اعظم کے موقف کی تائید فرمائی ہے لیکن چونکہ امام موصوف نے تیسری صدی کا کچھ حصہ پایا ہے اور اس دور میں جملہ بلادِ اسلامیہ کے افراد و غرائب بازار میں عام ہو گئی تھیں اس لیے تعبیر اس ماحول کی علمی فضا سے متاثر ہو گئی ہے اور معاملہ صرف روایت و اسناد پر آکر بٹھ گیا ہے۔

قاضی ابویوسف نے ایسی روایت کو شاذ قرار دیا ہے۔

جو کتاب سنت کے موافق نہ ہوں اور جو فقہاء مجتہدین میں معروف نہ ہوں۔

چنانچہ وہ ایک موقع پر لکھتے ہیں :

فایات و شاذ الحدیث و علیہ الجماعة من الحدیث
وما یعرفہ الفقہاء ما یوافق الکتاب و السنۃ۔

۱۔ الانتقار ص ۴۲، الموافقات ج ۲ ص ۲۴۔ ۲۔ الموافقات ج ۳ ص ۲۱
۳۔ توضیح الافکار ج ۱ ص ۳۷۷۔

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں :

وهو عندنا شاذ والشاذ من الحديث لا يوجب حذبه
 یہ حدیث شاذ ہے اور شاذ حدیث ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے بلکہ
 بہر حال دوسری اور تیسری صدی کے محدثین شاذ حدیث کے موضوع پر مختلف خیال ہیں ۔

روایت بالمعنی اور امام اعظم

اس نقطہ پر متقدمین اور متاخرین سب کا تقریباً اتفاق ہے کہ اگر روایت کرنے والا حافظ
 اور عارف نہ ہو تو اس کے لیے روایت بالمعنی کی کوئی گنجائش نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن الصلاح
 فرماتے ہیں :

اگر کوئی شخص حدیث بالمعنی روایت کرنا چاہے تو اگر الفاظ اور مقاصد
 روایت سے آشنا نہ ہو تو سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کے لیے
 روایت بالمعنی جائز نہیں ہے ۔ اسے روایت باللفظ ہی کرنی چاہیے یہ
 امام نووی فرماتے ہیں کہ :

اگر الفاظ اور مقاصد سے نا آشنا ہو اور معانی کے ڈھانچہ سے ناواقف
 ہو تو بالاتفاق اس کے لیے روایت بالمعنی ناجائز ہے ۔ روایت باللفظ
 ہی کرنی چاہیے یہ

حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں بھی تصریح فرمائی ہے ۔ لیکن علماء کا اس موضوع
 پر اختلاف ہے کہ اگر راوی عالم و عارف ہو تو کیا اس کے لیے روایت بالمعنی کی کوئی
 گنجائش ہے ۔ حافظ ابوبکر الخطیب نے اکثر سلف کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ اسے بھی
 ناجائز کہتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

سلف کی اکثریت اور حدیث میں ارباب تحقیق کہتے ہیں کہ روایت
 بالمعنی ناجائز ہے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ روایت باللفظ ہو اس میں
 کسی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی اور کسی طرح کی تقدیم اور تاخیر نہ کی جائے ۔

اس موضوع پر کچھ روایات ہم پیش کر چکے ہیں ان اکابر نے عالم اور غیر عالم میں اس موضوع پر کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ حافظ جلال الدین سیوطی نے اسی کو سلف میں قاسم بن محمد، امام ابن سیرین اور رجاء بن حیوہ کا مسلک قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

كان القاسم بن محمد وابن سيرين و رجاء بن حيوة يعيدون الحديث على حروفه بلکہ

قاسم، ابن سیرین رجاء روایت باللفظ کرتے تھے۔
امام ذہبی نے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو اسی نظریہ کا علم بردار بتایا ہے وہ فرماتے ہیں :

كان ممن يتحري في الاداء ويشدد في الرواية، ويجزئ تلامذته عن التهاون في ضبط الالفاظ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ادائیگی میں تحری کرتے تھے اور روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو ضبط الفاظ میں تہاؤن سے بڑے زور سے روکتے تھے بلکہ

اگرچہ امام غزالی نے المستصفیٰ میں، امام زاری نے محصول میں، علامہ قرافی نے شرح تنقیح الفصول میں، حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں یہ بتایا ہے کہ امام ابو حنیفہ نقل روایت میں روایت بالمعنی کے جواز کے قائل ہیں لیکن مشہور محدث ملا علی قاری نے شرح مسند امام میں امام اعظم کے بارے میں حافظ ابو جعفر طحاوی کی ایک روایت کی وجہ سے دعویٰ کیا ہے کہ امام اعظم کسی درجے میں بھی روایت بالمعنی کے جواز کے قائل نہیں ہیں حافظ ابو جعفر کی وہ روایت جس کو دلیل بنا کر انہوں نے امام اعظم کا یہ موقف بتایا ہے یہ ہے :

حدثنا سليمان بن شعيب حدثنا ابي قال املأ علينا

۱۔ الکفایہ فی علوم الراویہ ص ۱۹۸۔ ۲۔ تدریب الراوی ص ۳۱۱۔

۳۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۔

ابو یوسف قال قال ابو حنیفۃ لا ینبغی للرجل ان
یحديث من الحدیث الا ما یحفظ من لیوم سمعہ الی
لیوم یحدث بہ۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اس وقت تک حدیث نہیں
بیان کرنی چاہیے جب تک اسے سننے کے دن سے لے کر بیان
کرنے کے دن تک یاد نہ ہو۔

اور اس سے ملا علی قاری نے امام اعظم کا یہ مسک مقرر فرمایا ہے کہ:
حاصلہ انہ لم یجوز الروایۃ بالمعنی ولو کان مراداً
للمبني خلافاً للجمهور من المحدثین۔

امام اعظم روایت بالمعنی کو ناجائز کہتے ہیں چاہے وہ مراد الفاظ
ہی میں کیوں نہ ہو یہ جمهور محدثین کے خلاف ہے۔

یہی قرن قیاس ہے کیونکہ وہ جب یہ پابندی لگاتے ہیں کہ جب تک روایت سننے کے
دن سے بیان کرنے تک زبانی یاد نہ ہو روایت بیان نہ کرے اور وہ حفظ کے ساتھ یہ قید
بھی اضافہ کرتے ہیں کہ راوی روایت کا حافظ ہونے کے ساتھ عارف بھی ہو تو وہ یہ کب گوارا کر
سکتے ہیں کہ روایت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا جاتے۔ بلکہ امام اعظم نے تو اس میں اتنی
شدت اختیار کی ہے کہ اگر حفظ و معرفت کا سرمایہ راوی کے پاس نہ رہا ہو چاہے وہ روایت
باللفظ ہی ہو لیکن راوی کو یاد نہ ہو مگر لکھی ہوئی اس کے پاس موجود ہو تو صرف کتاب کے
سہارے راوی کو روایت کی اجازت نہیں دیتے چنانچہ امام نووی رقمطراز ہیں:

اذا وجد سماعہ فی کتابہ ولا یدکرہ فحق ابی حنیفۃ
و بعضی الشافعیۃ لا یجوز روایتہ۔

اگر حدیث راوی کے پاس کتاب میں لکھی ہوئی ہو لیکن اسے زبانی
یاد نہ ہو تو امام ابو حنیفہ اس کی روایت کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔

اس سے محدث قاری ہی کی تائید ہوتی ہے خطیب بغدادی نے یحییٰ بن معین کا جو

بیان لکھا ہے اس سے امام اعظم کے اس موقف پر جس کی نشاندہی ملا علی قاری نے کی ہے۔ مزید روشنی پڑتی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :

یہی بن معین سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی شخص کے پاس اپنی لکھی ہوئی حدیث ہو لیکن وہ اسے زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے ؟ فرمایا کہ ابو حنیفہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس حدیث کا آدمی حافظ اور عارف نہ ہو اسے بیان نہ کرے یہ

ظاہر ہے کہ حفظ کا الفاظ سے اور معرفت کا معانی سے ہی تعلق ہے یعنی راوی کو الفاظ بھی محفوظ ہوتے چاہئیں اور الفاظ کے ساتھ معانی بھی اس کے جاننے پہچاننے ہوں۔ اس قید اور پابندی کے پیش نظر روایت بالمعنی کی امام اعظم کے یہاں کب گنجائش ہو سکتی ہے۔ صاحب کشف الاسرار نے اسی کو عزیمت قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

العزيمة ان يحفظ المسموع من وقت السماع والضمير الى وقت الاداء وهذا مذهب ابی حنيفة في الاخبار والشهادة عزيمت یہی ہے کہ سنی ہوئی بات کو سننے اور سمجھنے کے وقت سے نقل روایت کے وقت تک یاد رکھے یہی اخبار و شہادت میں ابو حنیفہ کا مذہب ہے یہ

اور عزیمت کے مقابلے میں رخصت بنا کر جس چیز کا ذکر کیا ہے وہ محدثین کی رخصت نہیں بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی حدیث معلوم ہو اور اس سے کوئی شخص علمی استفادہ کرنا چاہتا ہے تو یہ اپنے جواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے ارشاد نہ صرف یاد ہو بلکہ اسے پورے طور پر سمجھے ہوتے بھی ہو لیکن اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ :

اول : ارشاد کا تعلق محکمات سے ہو۔

دوم : بیان کرنے والا وجوہ لغت سے آشنا ہو، اس کا منشا یہ ہے کہ ۔

اگر ارشاد عام ہو تو پھر اس میں روایت بالمعنی کی اجازت نہیں ہے۔ ایسے ہی اگر ارشاد

مشکل، مشترک اور مجمل کا حامل ہو تو پھر روایت بالمعنی کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رقمطراز ہیں :-

والرخصة ان ينقله بمعناه فان كان محكما لا يحتمل غيره
 يجوز نقله بالمعنى لمن له بصيرة في فحوى اللفظة وان
 كان ظاهراً يحتمل غيره فلا يجوز نقله بالمعنى الا
 للفقهاء المجتهدين ما كان من جوامع الكلم او المشكل او
 المشترك او المجمل لا يجوز نقله بالمعنى للكل -

رخصت یہ ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ
 محکم ہو اور روایت کرنے والا لغت و زبان کی گہرائیوں سے واقف ہو
 اور اگر حدیث عام ہو تو پھر بالمعنی روایت غیر مجتہد کے لیے ناجائز
 ہے۔ ایسے ہی وہ حدیثیں جن میں جوامع الکلم، مشکل، مشترک اور
 مجمل آئے ہوں ان سب میں روایت بالمعنی ناجائز ہے۔

فقہ مجتہد کی قید بھی یہ بتانے کے لیے لگائی ہے کہ وہ فتاویٰ میں روایت کے معافی کو
 اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اس موقع پر حافظ ابن خرم بڑی عمدہ بات لکھ گئے ہیں -

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا حکم تو یہی ہے کہ اس کی روایت
 باللفظ ہو لی چاہیے کسی حالت میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہ ہو
 صرف ایک صورت میں روایت بالمعنی کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ راوی
 حدیث کا حافظ ہو اور ساتھ ہی حتمی طور پر اس کے معافی سے بھی
 پورا واقف ہو۔ اس حالت میں اگر اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا
 جائے تو یہ مفتی کی حیثیت میں حدیث کے معنی اور مدلول کو جواب
 میں اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے یا کسی سے مباحثہ کر رہا ہو
 موقع استدلال میں اپنے لفظوں میں حدیث کے معنی پیش کر سکتا
 ہے۔ یہی قرآنی آیات کا حکم ہے۔ اس حد تک اس میں کوئی اختلاف

نہیں ہے لیکن اگر راوی ہونے کی حیثیت میں حدیث بیان کرے اور
ارشاد کی حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرے تو اس کے
لیے ناگزیر ہے کہ الفاظ نبوت ویسے ہی پیش کرے جیسے سُننے میں اس
میں حرف کی بھی تبدیلی جائز نہیں ہے چاہے الفاظ میں معنوی تلافی
بھی ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ ملا علی قاری نے امام اعظم کے مذہب کی اس موضوع پر جو نقاب کشائی
کی ہے۔ اس کا مفاد بھی قریب قریب یہی ہے اور فقہاء اصولیین نے روایت بالمعنی میر
جو رخصت دی ہے ان کا منشا بھی اسی قسم کی رخصت کی نشاندہی ہے۔ بہر حال امام اعظم
امام مالک اور خطیب بغدادی کے الفاظ میں سلف کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔ لیکن بعد
کو محدثین اس کی پابندی نہ کر سکے اور انہوں نے پہلے کتابت کے سہائے حفظ کی گرفت
کو ڈھیلا کیا۔ بعد ازیں راوی سے معرفت کی قید کو یہ کہہ کر ہٹا یا کہ عارف ہو یا نہ ہو حدیث روا
کر سکتا ہے اور معلوم ہے کہ الفاظ کی نگرانی اگر حفظ کے ذریعے ہوتی ہے تو معافی کی حفاظت
کا واحد ذریعہ معرفت ہے لیکن محدثین کو اس میں شدت معلوم ہوئی تاکہ حافظ سیدوطی
نے برملا اس کی سنگینی کی یہ کہہ کر شکایت کی۔

هذا مذهب شديد قد استقر العمل على خلافه

یہ مذہب بہت سخت ہے محدثین کا عمل اس کے خلاف ہے۔
اور اس شکایت کے بعد انہوں نے واشکاف لفظوں میں اقرار کیا کہ
لعل الرواة في الصحيحين ممن يوصف بالحفظ لا
يبلغون النصف۔

شاید صحیحین کے نصف راوی بھی حفظ کی قید پر پورے نہ اتریں۔
اس کے بعد محدثین کی بارگاہ میں روایت بالمعنی کی بھی اجازت دے دی گئی ہے
اس سلسلے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں :
حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

اگر راوی عالم ہو الفاظ اور اس کے مدلولات سے واقف ہو، جمہور علماء نے روایت بالمعنی کو جائز قرار دیا ہے اور اسی پر عمل ہے یہ حافظ ابو بکر الخطیب بغدادی لکھتے ہیں۔

جمہور فقہاء کہتے ہیں عالم بمواقع الخطاب کے لیے روایت بالمعنی جائز ہے اور علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ جابل بمواقع الخطاب کے لیے یہ ناجائز ہے۔

حافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں:

صحیح یہی ہے کہ سب صورتوں میں روایت بالمعنی جائز ہے بشرطیکہ راوی عالم ہو۔

امام نووی فرماتے ہیں:

جمہور سلف اور خلف مختلف گروہوں میں سے کہتے ہیں کہ سب میں روایت بالمعنی جائز ہے جبکہ قطعی طور پر معنی کی ادائیگی کر سکتا ہو۔ علامہ الجزائری نے اس موقع پر جو بیان قلم بند کیا ہے اس سے پوری صورت حال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے وہ فرماتے ہیں:

علماء کا ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ روایت بالمعنی مطلقاً ناجائز ہے یہی اکثر محدثین، فقہاء اور اصولیین اور ظاہریہ کا مذہب ہے عبد اللہ بن عمر اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے استاد ابواسحاق اسفرائینی اور ابو بکر رازی کا بھی یہی کہنا ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ امام مالک کا بھی صحیح مذہب یہی ہے اور امام مالک کا یہ ارشاد کہ لا اکتب الا عن رجل يعرف ما يخرج من راسہ میں صرف اس شخص کی روایت قلم بند کرتا ہوں جو اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات کو جانتا ہے، اسی کا موید ہے کیونکہ یہ بات آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ آپ

نے زمانہ پانے کے باوجود بہت سے لوگوں سے روایت کیوں نہیں لی؟ نیز امام مالک نے ایسے بہت سے لوگوں سے بھی روایت نہیں لی ہے جو فضل و تقویٰ میں مشہور تھے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اکابر اپنی حدیثوں کے عارف نہ تھے۔ امام بیہقی اور خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ امام مالک حدیث میں روایت بالمعنی کے جواز کے قائل نہ تھے اور باقی میں اسے درست سمجھتے تھے۔ بعض بزرگوں نے روایت بالمعنی میں اتنا تشدد اختیار کیا ہے کہ وہ حرف کی تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کرتے چاہے وہ مرادف ہی کیوں نہ ہو اور کلمات کی تقدیم و تاخیر کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ بعض تو مشدد کو مخفف اور مخفف کو مشدد کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ اور ان کا موقف یہ ہے کہ اگر روایت میں کسی درجے میں بھی تبدیلی ہوگی تو اس سے راوی اس وعید کا مصداق ہو جائے گا۔ جو اس سلسلے میں آئی ہے اور اس لیے بھی روایت بالمعنی درست نہیں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جو امع الکلم کی صفت سے موصوف ہے اور آپ کے سوا دوسرا کوئی خواہ فصاحت و بلاغت کے کتنے ہی اپنے مقام پر ہو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردیا بھی نہیں پاسکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بسا اوقات روایت بالمعنی کرنے والا اپنی جگہ مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے معنی کا حق ادا کر دیا لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوتا اس کا احادیث میں مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر امام شعبہ کا حدیث میں جو مقام ہے وہ سب ہی جانتے ہیں لیکن شعبہ ہی نے جب اسماعیل بن علیہ سے یہ حدیث سنی کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یتزعف الرجل اور اسے اپنے لفظوں میں اس طرح پیش کیا کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المتزعف تو معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ شعبہ کی روایت بالمعنی نے ایک

عمومی ضابطہ کی صورت اختیار کر لی جب کہ اسماعیل کی روایت اسے
مردوں سے مخصوص بنا رہی تھی۔ معاملہ میں کتنی بڑی نزاکت ہے
اور نزاکت بھی ایسی کہ شعبہ جیسا امام فن محسوس نہ کر سکتا۔ لیکن
اسماعیل نے ناٹھ لی اور شعبہ کو بتا دیا۔ لے

اور پوری وضاحت اور قوت سے یہ بات لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:
کان ينبغي ان يكون هذا المذهب هو الواقع ولكن له
ينفق ذلك

اچھا تو یہی تھا کہ یہی مسلک اختیار کیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا ہے۔
ایسا نہیں ہوا تو پھر کیا ہوا؟ یہ بھی ان کی زبانی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:
ذهب جمهور العلماء الى جواز الرضا بآية بالمعنى لمن
يحسن ذلك بشرط ان يكون جازما بانها ادى معنى
اللفظ۔

جمہور علماء نے روایت بالمعنی کے جواز کو اپنا لیا ہے بشرطیکہ راوی کو
مطلب کی ادائیگی پر یقین ہو اور اسے اس کا ڈھنگ آتا ہو جہ
بے محل نہ ہو گا اگر اس موقع پر ۵۴۲ھ کے ایک محقق کی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے
حدیث میں روایت بالمعنی کے جواز نے جو عام شکل اختیار کر لی تھی اس پر بحث کرتے
ہوئے یہ قابل مصنف رقمطراز ہے:

روایت بالمعنی میں یہ اختلاف صرف زمانہ صحابہ تک ہے۔ صحابہ
کے علاوہ کسی کے لیے بھی روایت بالمعنی کی گنجائش نہیں ہے
چاہے راوی معنی کو اپنے الفاظ میں کیسے ہی بھرپور انداز میں پیش
کرے۔ اگر ہم صحابہ کے بعد اوروں کے لیے بھی اس کی گنجائش
پیدا کر لیں تو ہم حدیث کی روایت پر اعتماد نہیں کر سکیں گے
کیونکہ ہر ایک ہمارے زمانے تک منقول میں تبدیلی کرتا ہے

اور اپنی رائے سے حرف کی جگہ حرف لے آتا ہے اس طرح خبر خبر نہیں رہتی صحابہ کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے ان میں دو اہم خصوصیتیں ہیں۔ ایک فصاحت و بلاغت، کیونکہ ان کی جبیت عربی ہے اور ان کی زبان میں صحیح سلیقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مشاہدہ معنی کے سمجھنے میں معین و مددگار ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مخر اور معاین میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے صحابہ احادیث میں جو یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ اے رسول اللہ اور نہی رسول اللہ ہکذا۔ تو حضور کے الفاظ ذکر نہیں کرتے بات حضور کی ہوتی ہے اور الفاظ کا جامہ صحابہ کا ہوتا ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح ہوتی ہے۔ اس میں کسی انصاف پسند کے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ

اس حد تک دوسری صدی کے محققین میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ بات صحابہ کی حد تک ایک عقلی ضابطہ کی بات ہے واقعی یہ بہترین مسئلہ کا حل ہے اور اس میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہوا کیا؟ کیا فی الواقع روایت بالمعنی حدیث میں صحابہ تک محدود رہی ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب محدثین کے یہاں نفی میں ہے۔ عربی تو عربی، عجمی اور مولدین راویوں نے احادیث کو بالمعنی روایت کیا ہے حتیٰ کہ عربی ادب اور علماء بلاغت کے یہاں حدیث کی زبان بھی اس وجہ سے حجت و استدلال کی زبان نہ رہی۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تو زبان کی حد تک اس کے صرف اس حصے سے استدلال کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ روایت باللفظ ہوتی ہے اور یہ حدیث میں بے حد کم اور نادر ہے ”وذلك نادر جداً“ صرف چند گنتی کی چھوٹی

چھوٹی حدیثوں کو چھوڑ کر اکثر حدیثوں کی روایت بالمعنی ہے اور یہ روایت بالمعنی بھی مجموعوں اور مولدین کے ہاتھوں تدریس حدیث سے پہلے ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اسے اپنے انداز میں اپنی عبارت میں روایت کیا ہے انہوں نے کمی بیشی بھی کی ہے اور تقدیم و تاخیر بھی اور الفاظ کی تبدیلی بھی ہے

اور اس آخری دور میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے بھی تشریح کی ہے کہ
جمہور السواتۃ کانوا یعتنون بروس المعانی لا بجواشیہا
عام راوی صرف روایت بالمعنی کرتے ہیں اور بس یہ
بلکہ علامہ جزائری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ :

روایت بالمعنی پر مشتمل حدیث سے صرف اصل مستند پر استدلال کیا جاسکتا ہے کسی کلمہ کی حدیث میں تقدیم و تاخیر یا حروف عطف وغیرہ سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا ایسے ہی الفاظ اور ان کی ترکیب سے بھی کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ روایت بالمعنی کرنے والے راویوں کی اکثریت نقل روایت میں اس کا نہ کوئی اہتمام کرتی ہے اور نہ لحاظ۔ بلکہ احادیث کے کچھ راوی تو ایسے ہیں جن کو عربی زبان سے بھی پوری واقفیت نہیں ہے چہ جائیکہ زبان اوداد کے اسرار و لطائف سے یہ

ہمیں چاہیے کہ معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

یقیناً اگر روایت بالمعنی کا دائرہ کار صرف صحابہ تک ہی رہتا تو معاملہ میں اتنی سنگینی نہ آتی جس قدر اسیوطی، الجزائری اور حکیم الامت نے محسوس کی ہے کہ روایت بالمعنی کی وجہ سے حدیث کی زبان حجت نہ رہی اور حدیث میں انداز کلام اور پیرایہ بیان سے استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ صحابہ بہر حال عرب تھے ان کو لسانی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ متکلم کے مذاق سخن سے بھرپور واقفیت تھی۔ ان کے دلوں پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی

شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کے لیے آپ کی بات اور آپ کے واقعات و حالات کی حیثیت عام انسانی وقائع جیسی نہ تھی۔ وہ آپ کی ایک ایک تقریر ایک ایک گفتگو اور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کر رہے تھے جو ان کو اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے جاہل تھے اور یہ پاکیزہ ترین شخصیت ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کر رہی ہے اس لیے وہ آپ کی ہر بات کو پوری توجہ سے سنتے اور آپ کے ہر کام کو دیکھتے تھے کیونکہ ان کو اپنی زندگی میں اسی کی کاپی کرنی تھی ظاہر ہے کہ اس احساس کے ساتھ آدمی جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہے اسے سمجھنے اور یاد رکھنے میں وہ سہل انگاری سے کام نہیں لے سکتا۔ وہ قرآن کی رو سے یہ بھی جانتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ نبوت کے ذمہ جھوٹ تراشنا ایک سنگین گناہ ہے۔ وہ اپنے اندر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ کی ہدایت و تعلیمات کو پہنچانا قرآن کا عائد کردہ فریضہ ہے

لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

اسی وجہ سے صحابہ کے حالات میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوتے وہ کانپ جاتے تھے ان کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے ابو عمر و الشیبانی کی زبانی حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ:

میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھتا سال سال بھر کبھی بان پر قال رسول اللہ نہ آتا۔ اگر کبھی آتا تو کپکپی طاری ہو جاتی اور فرماتے کہ حضور نے یوں فرمایا یا اس جیسا یا اس کے قریب فرمایا۔ اے

پھر اکابر صحابہ خاص طور پر عام صحابہ کی احادیث روایت کرنے میں نگرانی کرتے ان کو روایت میں احتیاط کی تلقین کرتے تھے۔ امام ذہبی نے حضرت ابو بکر کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ احادیث میں احتیاط اور تحریر کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم کے متعلق بھی یہ انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے محدثین کے لیے نقل روایت میں احتیاط کی شاہراہ قائم کی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کے بارے میں خاص طور پر لکھا ہے کہ:

فقہ زہر الامام علی عن روایت المنکر وحث علی الحدیث
بالمشہور۔

حضرت علی نے منکر روایت سے منع کیا ہے اور مشہور روایات کو
بیان کرنے کی ترغیب دی ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ زمانہ صحابہ میں حضور انور کی احادیث کا بہت بڑا حصہ وہ
تھا جس کی حیثیت محض زبانی روایات کی نہیں تھی بلکہ صحابہ کے معاشرے میں ان کی شخصی
زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت اور حکومت و عدالت میں اس کی پوری کمرانی
تھی اور عملاً نافذ تھی۔ اس کے آثار و نقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے پورا
معاشرہ اس کو استعمال کرتا تھا۔ فقہاء کی زبان میں اسی کا نام السنۃ ہے اور حدیث اسی کی تالیف
ہے اور یہ السنۃ ہی زمانہ تابعین میں حدیث کی صحت کا ایک معیاری پیمانہ تھی۔
حافظ ذہبی نے دور تابعین کے بارے میں طبقہ خامسہ کے آخر میں جو نوٹ لکھا ہے اس کو
پڑھ کر آپ دو صحابہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مسلمان عزت و برتری میں اور علم کی گہرائی میں بہت اونچے مقام پر تھے
جہاد کے پھر میرے لئے ہے تھے، سنتیں شاہراہ عام پر تھیں اور
بدعتیں سرنگوں۔ اعلان حق کرنے والوں کی کثرت تھی عبادت گزاروں
کا ہجوم تھا۔ پوری انسانیت زندگی میں سکھ اور چین کا سانس لے
رہی تھی۔ اسلامی فوجیں اقصائے مغرب میں جبرائیل، جیشہ اور
ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ دور تابعین کی نقاشی ہے صحابہ تو پھر صحابہ ہیں۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

بہر حال صحابہ کی ذات گرامی کا موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر روایت
بالمعنی کا دائرہ کار صحابہ کرام تک ہی محدود رہتا تو شاید معاملہ میں اتنی سنگینی ہرگز نہ آتی
اسی بنا پر امام اعظم کے نزدیک روایت باللفظ کا اعتبار ہی مقام صحابہ کے بعد ہے۔ چنانچہ ان

کے یہ الفاظ صراحتاً اس کی دلیل ہیں کہ :

لا ينبغي للرجل ان يحدث من الحديث الا بما حفظ من
يوم سمع الى يوم يحدث به

سوال تو صحابہ سے لینے کے بعد روایت کرنے والوں کا ہے کیا ان کے لیے بھی روایت
بالمعنی کی گنجائش ہے جبکہ ان میں عجمی اور مولدین بھی ہیں۔ اس بارے میں امام اعظم کا موقف
وہی ہے جو ملا علی قاری نے پیش کیا ہے۔ اگرچہ محدثین کے دربار سے اس پر تشدید کا
آوازہ کسا گیا ہے لیکن فی الحقیقت تاریخ ستہ کی یہ بڑی ہی درد انگیز بے انصافی ہے جو
حدیث کے اس عظیم الشان امام کے ساتھ جائز رکھی گئی ہے۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں
نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح معتقدوں نے بھی اس کے فہم و بصیرت سے حدیث
میں بے رخی اختیار کر لی۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فخر الاسلام بزدوی نے
ضبط کی تشریح کرتے ہوئے جو یہ لکھ دیا ہے کہ :

ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ کلام کو ایسے طریق سے سنا جائے جیسے سننے
کا حق ہے پھر اس کی مراد کو سمجھا جائے پوری کوشش سے اسے
یاد کیا جائے پھر اس کی حفاظت کر کے اس کی پابندی کی جائے اور
اسے ادا کرتے وقت اس کے مذاکرہ کا اہتمام کرتے رہنا چاہیے
مبادا وہ ذہن سے اتر نہ جائے یہ

تو اس سے ان کا مقصود بھی یہی سمجھنا ہے کہ ضبط میں الفاظ کا یاد رکھنا، ان کی حفاظت
کرنا بنیادی شرط ہے۔ اس لیے یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک
روایت بالمعنی کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اور فخر الاسلام ہی سے روایت بالمعنی پر شدید
پابندی جو حافظ ابن الہمام نے نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ
فرماتے ہیں :

والعنينة في الاداء باللفظ والرخصة معناه بلا نقص
ونزيادة للعالم باللغة ومواقع الالفاظ وقال فخر الاسلام

الا في نحو المشترك والمجمل والمتشابه، بخلاف العام
والحقيقة المحتملتين للخصوص والمجازا لما المحكم منها
فتكفي اللغة -

عزیمت تو روایت میں باللفظ ہی ادائیگی ہے اور نہ صحت روایت
بالمعنی ہے بشرطیکہ راوی زبان دان اور مواقع الفاظ سے واقف
ہو اور کمی زیادتی نہ کرے اور فخر الاسلام نے یہ شرط بھی لگائی
ہے کہ روایت کا تعلق مجمل، مشترک اور متشابہ سے نہ ہو ہاں اگر
عموم و خصوص ہو تو اس سے مستثنیٰ ہے اور محکم اگر ہو تو صرف
زبان دان ہونا کافی ہے یہ

دوسرے اصولیین بھی فخر الاسلام کے ہمنا ہیں۔ سعد الدین تفتازانی اور اصول بزدوی
کے شارح علامہ عبدالعزیز بخاری نے بھی اسی قسم کی تصریح کی ہے۔

مراتب حدیث اور امام اعظم رحمہ اللہ

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ قوت کے لحاظ سے ہر حدیث کا درجہ ایک نہیں ہے بلکہ ان میں
فرق مراتب ہے۔ فقہاء اور محدثین دونوں کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں۔ متواتر، مشہور
اور اخبار واحد۔ علامہ فخر الاسلام بزدوی نے متواتر کی یہ تعریف کی ہے۔

متواتر ان حدیثوں کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے لا تعداد
ہوں اور ان کی عدوی اکثریت، ان کی عدالت اور بعد مقامات کی
وجہ سے اس احتمال کی گنجائش نہ ہو کہ یہ سب جھوٹ پر متفق ہو
گئے اور اجماع ہر زمانہ میں موجود ہے اور اس کا آخر اور اوسط
شہرت کے لحاظ سے یکساں ہو جیسے قرآن، پانچ نمازیں، تعداد
رکعت، مقدار، زکوٰۃ وغیرہ۔

اتنے زیادہ لوگوں کی کسی محسوس کے بارے میں خبر جن کا جھوٹ پر متفق

ہونا عادت محال ہو گئے

حافظ ابن حجر عسقلانی نے خبر کے متواتر ہونے کی چار شرطیں بتائی ہیں۔ اول بیان کرنے والوں کی تعداد کثیر ہو۔ دوم ان کا جھوٹ پر متفق ہونا عادت محال ہو۔ سوم جس کثرت سے بیان کرنے والے ہوں اسی جیسی کثرت از ابتدا تا انتہا رہے۔ چہارم روایت کا انجام کسی محسوس و مشاہدہ معاملہ پر ہو اور ان شرطوں کے ساتھ سننے والوں کو اس خبر سے علم یقینی حاصل ہو رہا ہو تو ایسی خبر متواتر ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے متواتر کی دو قسمیں بتائی ہیں لفظی اور معنوی۔ تواتر لفظی کی حد تک حافظ ابن حبان بستی اور امام حازمی کا دعویٰ یہ ہے کہ موجودہ ذخیرہ حدیث میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ حافظ ابن الصلاح اور امام نووی بھی ان کے ہمنا ہیں بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے تو حدیث عزیز کا بھی انکار کر دیا ہے۔ حدیث عزیز یہ ہے کہ اس کے بیان کرنے والے سلسلہ سند میں کہیں بھی دو سے کم نہ ہوں اسے نادرا الوجود ہونے کی وجہ سے عزیز کہتے ہیں لیکن حافظ ابن حجر نے نزہۃ النظر میں اس کی تغلیط کی ہے اور ایسے ہی قاضی ابوبکر بن العربی کا یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے کہ حدیث کا عزیز ہونا بخاری کی شرائط میں داخل ہے۔ ابن رشید نے صحیح کہا ہے کہ :

لقد كان يكفي القاضي في بطلان ما ادعى انه شرط البخاري

اقل حدیث منکوء فیہ -

قاضی کے دعویٰ کی تغلیط کے لیے بخاری کی پہلی ہی روایت کافی ہے۔

بعض علماء نے تواتر معنوی کی بھی تین قسمیں بتائی ہیں۔ تواتر اسناد، تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک۔

تواتر اسناد

یہ کہ حدیث کو مشروع سند سے لے کر آخر تک اتنی جماعت روایت کرنے والی ہو جس کا

جھوٹ پر ایک محال ہو۔ اس لحاظ سے محدثین نے حدیث من کذب علی متعمداً کو متواتر قرار دیا ہے حافظ ابن الصلاح نے اس کے راویوں کی تعداد ۶۲ اور حافظ عراقی نے اس سے زائد لکھی ہے حافظ سیوطی نے اسنادی تواتر پر مشتمل حدیثوں کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ کتاب کا نام "الفوائد المتکاثرہ فی الاخبار المتواترہ" ہے۔ اس کتاب کی تلخیص بھی ان کے ہی قلم سے "الازہار المتکاثرہ" کے نام سے نکلی ہے۔ محمد بن جعفر الکتانی نے اس کا ذیل نظم المتکاثر من الحدیث المتواترہ کے نام سے لکھا ہے۔ امیر میانی فرماتے ہیں کہ تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین کی حدیثیں اسی تواتر کی مثال ہیں۔ کیونکہ ان کو روایت کرنے والے پچاس صحابہ ہیں ان میں عشرہ مبشرہ بھی داخل ہیں۔ حافظ زبیر الدین عراقی لکھتے ہیں کہ میں نے اس کے راویوں کو اکٹھا کیا تو ان کی گنتی پچاس ہوئی۔ حافظ ابن منیر اور امام حاکم نے دعویٰ کیا ہے کہ عشرہ مبشرہ اس کی روایت پر جمع ہیں۔ امام بیہقی امام حاکم کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

لَا نَعْلَمُ سُنَّةَ أَتَّفَقَ عَلَيَّ رِوَايَتُهَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْخَلَفَاءُ الْأَرْبَعَةُ وَالْعَشْرَةَ

الَّذِينَ شَهِدُوا لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بِالْجَنَّةِ فَمِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ أَكْبَرِ الصَّحَابَةِ عَلَى تَفَرُّقِهِمْ

فِي الْبِلَادِ الْمَشَارِقِ غَيْرِ هَذِهِ السُّنَّةِ -

ہمارے علم میں ایسی کوئی سنت نہیں ہے جس کی روایت پر حضور

انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خلفاء راشدین عشرہ مبشرہ اور پھر

اکابر صحابہ متفق ہوئے ہوں سوائے اس سنت کے بلکہ

یاد رہے کہ یہ تواتر تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین کو حاصل ہے امیر میانی کی آپ تصریح

پڑھ چکے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیری نے بھی یہ بات صراحتاً لکھی ہے کہ

فَمِنْ أَمْثَلِ ذَلِكَ حَدِيثُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ عِنْدَ تَلْبِيَةِ الْإِحْرَامِ

بِالصَّلَاةِ -

یہی وجہ ہے کہ تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین پر اُمت میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی

ہیں۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں حافظ ابن حزم، حافظ ابن المنذر اور علامہ السبکی کے حوالے سے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ ابن عبد البر کے حوالے سے تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین کو یہ کہہ کر پوری امت کا فیصلہ قرار دیا ہے کہ :

اجمع العلماء علی جواز رفع الیدین عند افتتاح الصلوٰۃ

تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین پر پوری امت کا اجماع ہے۔ لہ

یہ اسنادی تواتر ہے اور یہی محدثین کے یہاں زیر بحث آتا ہے۔ حافظ ابن کثیر اور علامہ شوکانی نے ختم نبوت سے متعلق حدیثوں کے بارے میں اسی تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ علامہ الجزائری نے یہاں ایک فیصلہ کن نوٹ لکھا ہے اس جگہ اس کا ذکر یقیناً فائدے سے خالی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

جب علماء کے یہاں متواتر کا بلا قید ذکر آتا ہے تو ہر شخص کا ذہن متواتر کی قسم اول کی طرف ہی جاتا ہے یعنی متواتر لفظی، علماء کا کچھ حدیثوں کے بارے میں اختلاف ہے، کچھ متواتر بتاتے ہیں اور کچھ انکار کرتے ہیں اس میں محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ نزاع محض لفظی ہے دونوں صحیح کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ متواتر ہے ان کی مراد تواتر معنوی ہے اور جو انکار کرتے ہیں ان کا منشا تواتر لفظی ہے علماء اصول کہتے ہیں کہ قرآن تو تواتر ہی سے ثابت ہے لیکن سنت تواتر اور آحاد و دونوں سے ثابت ہے لیکن سنت میں متواتر کم ہے بلکہ راجح فیصلہ یہی ہے کہ سنت میں اگر ہے تو صرف تواتر معنوی ہے اور جو بھی سنت میں تواتر کا مدعی ہے اس کی مراد تواتر معنوی ہے۔

تواتر عمل

اسی کو تواتر کہتے ہیں۔ زمانہ نبوت سے لے کر آج تک کسی کام کو کرنے والے اس قدر ہوں کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ اسلامی عبادات امت کو اسی تواتر سے ملی ہیں

اور فرائض منہیں بلکہ واجبات و سنن بھی اسی راہ سے آتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو اولاً صحابہ کے معاشرے نے اپنایا۔ ان کی شخصی زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت میں، ان کی تعلیم گاہوں میں، ان کی عدالت اور ان کی حکومت میں، غرض صحابہ کرام کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر گوشہ میں جس اُسوۂ حسنہ کا ٹھپہ لگتا تھا اور جس کو ان سے والذین اتبعوہم یا حسان کی تعمیل میں تابعین نے لیا اور جس کی اتباع تابعین نے کاپی کی ہے اسی کو محدثین تابعین کی زبان میں السنۃ اور اسی کا نام فقہاء تابعین کے یہاں ما علیہ الجماعت ہے۔ نماز پنجگانہ، نمازوں کی رکعتیں، رمضان کے روزے، تراویح کی رکعتیں، مفادیر زکوٰۃ، اعمال حج، وضو اور حتیٰ کہ وضو میں مسواک کا استعمال اسی تواتر عمل سے ثابت ہے اور یہ بات سب ہی مانتے ہیں کہ عمل میں قول سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اس پر اجمالی تبصرہ تلمیذی الامۃ بالقبول کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر سند کے لحاظ سے حدیث ضعیف بھی ہو لیکن اس کی پشت پر عمل کی قوت ہو تو وہ حدیث بھی صحیح قرار پاتی ہے بلکہ حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ :

ینزل منزلة المتواتر في انه ينسخ المقتطوع

اس کے ساتھ متواتر جیسا معاملہ ہوتا ہے یعنی اس سے قطعی منسوخ بھی ہو سکتا ہے۔

محدثین نے تواتر عمل کی وجہ سے ایک سے زیادہ ضعیف حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے مثلاً حدیث "لا وصیۃ لوارث" الفاظ مختلفہ میں مروی ہے اور امام ترمذی نے اس کے کچھ طریقوں کی تصحیح اور کچھ کی تخریج بھی فرمائی ہے لیکن حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں :

لا یخلو اسناد کل منها عن مقال

اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے کہ :

جنع الشافعی فی الامالیٰ ہذا الفتن متواتر

اس کے متواتر ہونے کی وجہ خود امام شافعی نے جو بتائی ہے وہ ان کی زبانی سینے :

وجدنا اهل الفتيا ومن حفظنا عنهم من اهل العلم

بالمغازی من قریش لا یختلفون فی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال عام الفتح «لا وصیۃ لوارث» ویاترونہ ممن لقوا من اهل العلم فکان نقل کافۃ عن کافۃ فہو اقویٰ من نقل واحد۔

ہم نے اہل فتویٰ کو اور ان اہل علم کو جن سے ہم نے اسلام کا علمی سرمایہ حاصل کیا ہے پایا ہے کہ وہ اس میں متفق ہیں کہ حضور اللہ نے فتح مکہ والے سال لا وصیت لوارث فرمایا ہے اور یہ لوگ اس ارشاد کو اپنے سے قبل اہل علم ہی سے نقل کرتے ہیں اس لیے یہ نقل کافہ عن کافہ ہے یہ خبر واحد سے بھی قویٰ ہے یہ

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تواتر عمل کی کس قدر طاقت ہے۔ اس پر تو تابعین صحیح حدیثوں کو جانچتے تھے اور حدیث کی صحت کا یہ ایک معیار تھا۔

تواتر قدر مشترک

حافظ سیوطی اس کو تواتر معنوی کہتے ہیں۔ ایسی روایات جو متعدد طرق سے آئی ہوں، الفاظ مختلف ہوں، واقعات الگ الگ ہوں لیکن اس میں کوئی قدر مشترک ہو مثلاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شب بیداری کے سلسلے میں کوئی کہتا ہے کہ آپ نے پانچ رکعت نماز پڑھی، کوئی سات، کوئی نو، کوئی گیارہ، کوئی تیرہ، کوئی پندرہ اور کوئی سترہ بتاتا ہے تعدد کو چھوڑ کر رات کو نماز تہجد اس میں قدر مشترک ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ دعائیں میں ہاتھ اٹھانے کی حدیثوں میں بھی اسی قسم کا تواتر ہے۔ اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سو سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔

جیسے قرآن تواتر لفظی کے ذریعے اُمت کو ملا ہے۔ ایسے ہی سنت کا علمی سرمایہ بھی اُمت کو تواتر عمل، تواتر اسناد اور تواتر قدر مشترک کے ذریعے ملا ہے۔ اور میں کتاب کے آغاز میں بتا آیا ہوں کہ جیسے قرآن کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی سنت کے لیے

محدثین کی روایات ہیں نہ تو قرآن پر روایات قرار اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اور نہ سنت پر روایات محدثین اور نہ قرآن کا قرآن ہونا قرار سب سے کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا روایات محدثین پر موقوف ہے۔ حدیث تو دراصل تاریخ سنت اور اس کی روایت کا نام ہے۔ حدیث کے اس روایتی سلسلے سے پہلے بھی سنت موجود تھی اور اس کے بعد بھی ہے۔ علامہ الشیخ السید القوادشہ کشمیری نے کیسی عجیب بات فرمائی ہے کہ:

كان الاسناد لئلا يدخل في الدين ما ليس منه لا يخرج من

الدين ما ثبت منه من عمل اهل الاسناد۔

روایت و اسناد کا سلسلہ اس لیے بروئے کار آیا تھا کہ دین میں وہ چیز

نہ آنے پائے جو دین نہیں ہے اس لیے نہیں کہ دین سے ثابت

شدہ چیز کو خارج کیا جاتے رہے۔

قرآن ہوا سنت دونوں روایتی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ ایک علمی چیز ہے اس لیے اس کا تواتر بھی علمی ہے اور سنت ایک عملی چیز ہے اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے اسی بنا پر احناف نے حدیث مشہور کی عام شاہراہ سے ہٹ کر یہ تعریف کی ہے کہ:

ما كان احاد الاصل متواتراً في القرآن والثاني والثالث۔

اور حافظ ابوبکر نے اسی بنا پر مشہور کو متواتر کا تقسیم نہیں بلکہ اس کی قسم قرار دیا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ امام اعظم سے جو صحیح کی تعریف نقل کی گئی ہے اس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ امام عبد الوہاب الشمرانی رقمطراز ہیں:-

قد كان الامام ابو حنيفة يشترط في الحديث المنقول عن

رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل العمل به ان

يروي عن ذالك الصحابي جمع القيار عن مثله هكذا۔

جو حدیث حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت

امام اعظم عمل سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متفق لوگوں

کی ایک جماعت اس صحابی سے برابر نقل کرتی چلی آئے یہ
 یہ قید کہ ”اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت صحابی سے برابر نقل کرتی آئے“ اس بات
 کی غمازی کر رہی ہے کہ حدیث اگرچہ صحابی کی ذات تک خبر واحد ہو مگر اس کے بعد اسے نقل کرنے
 والے بہت سے متقی اور پارسارادی ہوں یعنی صحابی سے گزرنے کے بعد قرن ثانی اور قرن ثالث
 میں وہ متواتر ہو اور جس قید کا امام شعرانی نے پتہ دیا ہے وہ خود امام اعظم سے بصراحت منقول
 ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے امام بیہقی بن معین کی سند سے امام اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ
 اخذ بکتاب اللہ مما لہ اجد فبسنۃ رسول اللہ والاثار
 الصحاح التي فشت عنه في ایدی الثقات عن الثقات۔

اس میں یہ فقرہ کہ ”آپ کی وہ صحیح حدیثیں جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے
 ذریعے شائع ہوئی ہوں“ خاص طور پر قابل غور ہے۔ اس میں آپ نے صراحت کے ساتھ
 بتایا ہے کہ آپ ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو ثقات میں مشہور ہوں۔ بلاشبہ امام
 اعظم کا زمانہ دور تابعین ہے۔ اس میں سنت تو تواتر عمل سے آنکھوں کے سامنے موجود تھی
 اور احادیث تو اثر اسناد کے ذریعے نیکو کار لوگوں کی وساطت سے آتی تھی۔ کشف الاسرار
 میں ہے :

احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم و سوم میں ہوگا۔ قرون ثلاثہ
 کے بعد شہرت کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اخبار آحاد
 مشہور ہو گئی تھیں حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے۔

اخبار آحاد اور امام اعظم

خبر واحد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ایک دو یا اس سے زیادہ ہوں لیکن اس میں
 شہرت کے اسباب نہ ہوں۔ امام اعظم اولین شخصیت ہیں جنہوں نے اخبار آحاد کو قابل استدلال
 قرار دیا ہے۔ چنانچہ خاص اس موضوع پر حافظ ابن حزم نے امام اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔
 هذا ابو حنیفۃ یقول ما جاز عن اللہ تعالیٰ فعلی الراہ

والعین وما جاور من رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمعاً وطاعةً وما جاور
عن الصحابة متخيراتاً من اقوالهم ولم يخرج عنهم وما جاور
عن التابعين فهم رجال ونحن رجال -

یہ ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ اللہ سبحانہ کی جانب سے آئے یعنی قرآن
وہ سرائیکھوں پر اور جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے
آئے اس کے لیے ہم سرائی شنید و طاعت ہیں اور صحابہ سے جو
کچھ آئے تو ان کے اقوال میں سے ہم انتخاب کریں گے اور کسی
درجہ میں ان کے ارشادات سے علیحدہ نہ ہوں گے اور اگر تابعین
سے آئے تو ہم بھی آدمی ہیں وہ بھی آدمی ہیں یہ
ابو حمزہ السکری نے امام اعظم کا جو ارشاد نقل کیا ہے وہ اس سے بھی واضح ہے -
امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث
صحیح سند سے آئے ہم اسی کو لیتے ہیں اور اس سے آگے نہیں
جاتے ۔

ابو حمزہ کو امام حافظ الدین ابن البرزازی کردی نے مناقب میں امام اعظم کے تلامذہ میں شمار
کیا ہے اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حفاظ حدیث کے طبقہ خامسہ میں ذکر کیا ہے ان
کا نام محمد بن میمون مروزی ہے اس لیے امام اعظم کے بارے میں ان کی سائے بڑی قیمتی ہے
الغرض خبر واحد کے حجت ہونے اور قابل عمل ہونے میں امام اعظم اور تیسری صدی کے
محدثین کا موقف ایک ہے ۔ حافظ ابوبکر الخطیب خبر واحد کے موضوع پر محدثین کے
موقف کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

خبر واحد پر عمل کرنے کے موضوع پر تمام تابعین کا اتفاق ہے
اور تابعین کے بعد آج تک کے فقہاء امصار کا اس پر ایک ہے
ہمائے علم میں اس کا کوئی بھی منکر نہیں ہے اور نہ اس پر آج
تک کسی نے کوئی اعتراض کیا ہے ۔ ان کا یہ اتفاق بتا رہا ہے

کہ ان سب کے نزدیک اس پر عمل واجب ہے اگر کہیں بھی انکا
کا کوئی کانسٹا ہوتا تو تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

اس اتفاق کے باوجود اخبارِ آحاد کے موضوع پر چند اہم مباحث فکر و نظر کی جولانگاہ
ضرور ہے پس مثلاً یہ کہ اخبارِ آحاد کے لیے معیارِ صحت کیا ہے؟ اور اخبارِ آحاد موجب العمل ہونے
کے ساتھ مفید یقین بھی ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں مخصوص نہیں ہیں
اس لیے ان میں فکر و نظر کا اختلاف ناگزیر ہے۔

اخبارِ آحاد کا معیارِ احتجاج

جمہور محدثین کا موقف تو یہ ہے کہ اخبارِ آحاد اس وقت تک قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتیں
جب تک ان میں خاص خاص شرائط نہ ہوں۔ امام شافعی نے ایک سائل کے جواب میں ان
شرائط کا تفصیلی جائزہ پیش فرمایا ہے:

خبر واحد میں حجت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یہ شرائط
ہوں۔ راوی میں ثقاہت اور صداقت کے ساتھ آنا علم ہو کہ
وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے جانتا ہو اور الفاظ سے ہٹ کر معنی
کو دوسرے لفظوں کا لبادہ پہنانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا پھر
روایت باللفظ کرتا ہو۔ اگر حافظہ کی مدد سے بیان کرتا ہے تو
حدیث کا حافظ ہو اور اگر کتاب سے روایت کرتا ہے تو کتاب
کا حافظ، ثقافت راویوں کا ہمنوا ہو۔ مدلس نہ ہو، اس طرح
راویوں کی ساری ٹرمی اوپر سے نیچے تک ہوتا آنکہ حدیث حضور
النور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔

دوسرے محدثین نے بھی اسی معیار کو اپنایا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں:

اما الحديث الصحيح فهو الحديث المسند الذي يتصل
اسناده بنقل العدل الضابط عن العدل الضابط الى

منتهاء ولا يكون شاذاً ولا معطلاً -

صحیح وہ بات حدیث ہے جس کی سند میں اتصال ہو، جو عادل ضابط
عادل ضابط کی وساطت سے تا آخر روایت کرے اور شاذ و معطل

نہ ہو۔

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ :

فهذا الحديث الذي محكمه بالصحة

یہی وہ حدیث ہے جس کے صحیح ہونے کا ہم فیصلہ کرتے ہیں یہ
حافظ ابن الدین عراقی فرماتے ہیں کہ جب محدثین کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ صادر
کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سند کے لحاظ سے یہ صحیح
ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس حدیث کی قطعیت بتا رہے ہیں چنانچہ علامہ عراقی فرماتے ہیں :
حيث يقول المحدثون هذا حديث صحيح فمرادهم فيما
ظهر لنا عملاً بظاهر الاسناد لا انه مقطوع بصحته
في نفس الامر یہ

اور حافظ ابن الصلاح نے بھی یہی بات لکھی ہے :

ليس من شرطه ان يكون مقطوعاً به

حافظ ابن ابراہیم الزیر نے اس کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ :

لجواز الخطأ والنسيان على الثقة به

مطلب یہ ہے کہ صحت سے ان بزرگوں کی مراد صرف اصطلاحی صحت ہے۔ قرآن جیسی
واقعی صحت نہیں ایک روایت پر اس اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں لگ جائیں لیکن
بہر حال غیر معصوم انسانوں کی شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ
ہر بات کے لیے حجت کا فائدہ دے سکتا ہے مگر یقینیات اور قطعیات کے خلاف نہیں
ہو سکتا۔ اگر کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعہ سے ٹکرا جائے گی تو یقینیات اپنی جگہ
سے نہ ہٹیں گی۔ راوی کی شہادت کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں کا مزاج الگ الگ ہے ایک حدیث کی صحت اور دوسرے حدیث کی مقبولیت۔ حدیث کی صحت سے بحث کرنا اگر ارباب روایت کا کام ہے تو حدیث کی قبولیت کو بتانا مجتہدین کا فن ہے ہر گوشہ کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط کی دورانی پیدا ہو گئی ہیں۔

کچھ وہ ہیں جن کے نزدیک کسی بھی حدیث کا فقہ کی کتابوں میں آجانا ہی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے اور ان کتابوں کے مؤلفین کی جلالت علمی سے وہ سب سزاوارتہ حدیث کو صحیح مان لیتے ہیں حالانکہ فقہ کی کتابیں بہر حال مسائل کی کتابیں ہیں ان میں حدیث کی صحت سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے۔ نہ ان کا یہ فن ہے حدیث کے لیے محدثین ہی کی خوشہ چینی چاہیے۔ فقہ احناف میں معرکہ کی کتاب اگر ہدایہ ہے تو فقہ شافعی میں رافعی کی شرح الوہیز ہے۔ ان دونوں کتابوں کی حدیثوں کو دیکھنا ہو تو حافظ زلیحی کی نصب الراية اور حافظ ابن حجر کی التلخیص کو دیکھنا ہو گا یہ دونوں محدث ہیں اور یہ ان کا فن ہے۔

ملا علی قاری محدث نے اس حدیث کو جو جمعۃ الوداع میں قضائے عمر کے بارے میں آئی ہے موضوعات میں قطعاً باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

لا عبرة بنقل صاحب النهاية وغيره من بقية
شرح الهداية ليسوا من المحدثين ولا اسناد الحديث
الى احد من المحققين۔

اس حدیث کو صاحب نہایہ اور ہدایہ کے دوسرے شارحوں کے نقل کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ نہ خود محدث ہیں اور نہ محدثین کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں۔

اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے عمدۃ الرعايہ کے مقدمہ میں جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیتے :-

ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے یہ عجیب بات معلوم ہو گئی کہ فقہ کی کتابیں اپنی جگہ مسائل کے لیے خواہ کتنی معتبر سہی اور ان کے

مؤلفین بھی چاہے کتنے ہی صاحب کمال اور معتمد ہیں لیکن فقہ کی کتابوں میں آمدہ حدیثوں پر محدثانہ نقطہ نظر سے بھرپور اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ کتنی ہی حدیثیں ہیں جو فقہ کی معتبر کتابوں میں آئی ہیں لیکن فی الواقع وہ موضوع ہیں۔ ہاں اگر مصنف کتاب زمرہ محدثین سے ہو تو بے شک اس کی بیان کردہ حدیث پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا اگر مصنف حدیث کو کسی محدث کے حوالہ سے پیش کرے تو اس پر بھروسہ ہو سکتا ہے۔ راز اس میں یہ ہے کہ اللہ نے ہر فن کے لیے فن کی شخصیتیں بنائی ہیں۔ اپنی مخلوقات میں سے ہر طبقہ کو کچھ نوعی خصوصیات سے مالا مال کیا ہے۔ کچھ محدثین ایسے ہیں جن کو روایت و اسناد ہی سے کام ہوتا ہے فقہ ان کا میدان نہیں ہے اور کچھ فقہاء ایسے ہیں جن کا مقام بس فقہ میں ہے حدیث میں ان کو کوئی مہارت نہیں ہوتی۔

مولانا نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خود انسان کا وجدان بھی باور کرتا ہے کہ فن والوں سے ہی فن کی بات معلوم ہو سکتی ہے اگر آپ شاعروں سے مسائل یا فقہاء سے اشعار کی تحقیق کریں تو یہ بے محل بات ہے۔ اس موقع پر حافظ محمد بن ابراہیم وزیر بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں کہ :

اختلاف طبقات کے باوجود مسلمانوں کے سائے فرقے اس پر متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی بات سے استدلال کیا جاسکتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو سائے علوم حرف غلط ہو کر رہ جائیں کیونکہ جو فنکار نہیں وہ یا تو اس میں لب کشائی ہی نہ کرے گا اور کرے گا تو غیر تسلی بخش ہوگی۔ غور کرو اگر قرآن و سنت کے غریب الفاظ کی تحقیق تم قاریوں سے کرو یا قرأت کے مسائل اہل لغت سے پوچھو، معافی، بیان اور نسخہ کی باتیں تم محدثین سے

دریافت کرو اور علم الاسناد، علل حدیث کی تحقیق کے لیے تم بارگاہ مشکوٰۃ کی
کارخ کرو تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ علوم و فنون ملیا میٹ ہو کر
رہ جائیں گے۔

دوسری طرف اگر باب روایت میں جنہوں نے محدثین کی تصحیح کو ہی صرف حدیث کی مقبولیت
کا معیار بنا لیا ہے۔ انہوں نے ائمہ نقد میں سے دارقطنی وغیرہ پر محدثانہ نقطہ نظر غالب دیکھ کر
اپنی توجہات کامرکز صرف اسناد ہی کو بنا لیا اور متن سے نظریں ہٹا لی ہیں۔ حالانکہ حدیث
اسناد و متن دونوں کا نام ہے۔ حدیث کی صحت کی حد تک اسناد کی تحقیق کرنا اگر محدثین کا کام ہے
تو حدیث کے متن کی حد تک مقبولیت کو بتانا مجتہدین و فقہاء کا کام ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر
نے حافظ ابن حبان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

ان النظر ان كان للسند فالشیوخ اولى وان كان للمتن فالفقهاء
اگر سند سے متعلق تحقیق کرنی ہو تو محدثین سے کرنی چاہیے اور اگر
متن کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو فقہاء سے پوچھنا چاہیے۔
اس کی وجہ امام حارمی نے یہ بتائی ہے۔

لان قصد هذا اثبات الاحكام ومجال نظرهم في ذلك متسع
فقہاء کا پیش نہاد احکام ثابت کرنا ہے اور اس میں ان کا میدان
وسیع ہے۔

علامہ خطابی کو بھی اس افراط و تفریط کی نسکایت ہے۔ یہاں ان کے بیان کو ناظرین کی
ضیافتِ طبع کی خاطر پیش کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ:-
میں نے اپنے زمانے میں علماء کو دو گروہ میں منقسم دیکھا ہے۔
محدثین اور اگر باب فقہ ان دونوں علموں میں مقام اور محل کے لحاظ
سے انتہائی قرب کے باوجود یہ دونوں طبقے باہم بچھڑے ہوئے
بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ محدثین کی اکثریت کی نگاہ و دلوں صرف
روایات سمیٹنے اور طرُق بیجا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ غرائب اور

شواہد کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں متون کا ان کو کوئی پتہ نہیں ہے
معانی سے نابلا اور استنباط سے بالکل نا آشنا ہیں۔ فقہاء پر زبان
طعن و تشنیع استعمال کرتے ہیں۔ فقہاء کے خلاف ان کا آوازہ
ہے کہ یہ سنت کی مخالفت کرتے ہیں لیکن فقہاء کے مقام علمی کی
ان بیچاروں کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ زبان کی اس غلط کروٹ
سے خود ہی گناہ کما ہے ہیں۔ فقہاء کا حال یہ ہے کہ حدیث کی
حد تک ان کو قدس علم تو ہے مگر ان میں صحیح، سقیم، کھری کھوٹی
میں تمیز کا بالکل سلیقہ نہیں ہے بلکہ

علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں بھی اس قسم کی شکایت کی ہے۔ بہر حال یہ موضوع تفصیل
طلب ہے لیکن چونکہ ایک اہم اصولی سوال ہے اس لیے اس باب میں تحقیق کی راہ یہ
ہے کہ حدیث کی صحت کے بارے میں محدثین سے اور حدیث کی قبولیت کے متعلق مجتہدین و
فقہاء سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اخبار احواد سے احتجاج کا مسئلہ صرف حدیث کی صحت سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا صحت
کے ساتھ قبولیت سے بھی تعلق ہے۔ امام اعظم محدث ہونے کے ساتھ چونکہ فقیہ اور مجتہد بھی ہیں
اس لیے حدیث کی صحت کے ساتھ حدیث کی قبولیت کی بھی شرطیں بتائی ہیں۔ حدیث کی
صحت کے موضوع پر وہ بھی وہی کچھ فرماتے ہیں جو عام ارباب روایت کا مسلک ہے لیکن
حدیث کے مقبول اور قابل عمل ہونے کے لیے انہوں نے کچھ شرائط پیش کی ہیں۔ ان میں اہم
یہ ہیں کہ :

- ۱۔ روایت دین کے مسئلہ اصولوں کے خلاف نہ ہو۔
- ۲۔ معانی قرآن سے متصادم نہ ہو۔
- ۳۔ سنت مشورہ کے خلاف نہ ہو۔
- ۴۔ صحابہ و تابعین کے عمل متواتر کے خلاف نہ ہو۔
- ۵۔ خبر واحد کا تعلق عموم بلوئی سے نہ ہو۔

مسئلہ اصول خلا روایت

امراول یعنی یہ کہ روایت دین کے مسئلہ اصول کے خلاف نہ ہو۔ اس کی اہمیت تمام ارباب اجتہاد نے ہمیشہ تسلیم کی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز امام اعظم کے اس معیار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
 شریعت کا علمی سرمایہ دو قسم کا ہے قوانین کلیہ اور حوادث جزئیہ۔
 قوانین سے مقصود ضوابط عامہ ہیں مثلاً یہ کہ شہادت پیش کرنا مدعی کا کام ہے شریعت و اصل ان ہی قوانین کا نام ہے۔ مجتہد کا کام ہے کہ ان ضوابط کو حوادث جزئیہ سے متاثر نہ ہونے دے۔

(فتاویٰ عزیزی)

علامہ شاطبی اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-
 قوانین عامہ پر جزئی اور خصوصی واقعات اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ قواعد کلیہ قطعی ہوتے ہیں اور حوادث جزئیہ ظنی ہوتے ہیں۔ گمان و ہم سے یقین و اذعان کی عمارت منہدم نہیں ہو سکتی اور نہ ظن میں یقین کا مد مقابل بننے کی تاب ہے۔ نیز قواعد کلیہ و لائق قطعیت سے غذا حاصل کرتے ہیں اس لیے ان میں کسی دوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی رہ بخلاف حوادث کے کہ ان میں ہر وقت اور ہمہ آن دوسرے احتمالات کا امکان رہتا ہے۔ احادیث و اخبار کی حیثیت جزئیات کی ہے اور قواعد کا مقام کلیات کا ہے۔

شریعت میں ان کی ایک سے زیادہ مثالیں ہیں۔ صرف ایک مثال بدیہ ناظرین کرتا ہوں۔
 قرآن و سنت میں وضو میں سر کے مسح کا ایک عمومی ضابطہ قرآن میں ہے۔

وامسحوا برؤسکم

اور سنت سے بھی اس ضابطہ کی کلیت معلوم ہوتی ہے لیکن کچھ حدیثوں میں سر کی جگہ تمام پر مسح کا ذکر آیا ہے۔ مسند احمد، بخاری، ابن ماجہ میں بحوالہ عمرو بن أمیہ، ترمذی، ابن ماجہ،

مسند احمد، مسلم، نسائی میں بحوالہ بلال، ترمذی میں بحوالہ میسرہ۔ طبرانی میں بحوالہ ابی امامہ اور مسند احمد میں بحوالہ ثوبان اور سلمان عمامہ پر مسح کے بارے میں احادیث آتی ہیں۔

ان حدیثوں کی وجہ سے مسح راس کے اس ضابطہ حتمی کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا جو قرآن اور سنت متواترہ سے ثابت ہے۔ اگر روایات مسح عمامہ صحیح بھی ہوں تو ان کو مطالبہ کیا ایسا جامہ پہنایا جائے گا جس سے مسح راس کی قطعیت پر کوئی حرف نہ آسکے۔ علامہ عبداللہ دراز دمیٹی رقمطراز ہیں:

جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح عمامہ کی روایات آتی ہیں۔ یہ روایات وضو میں مسح راس کے قاعدہ عام پر ہرگز اثر انداز نہ ہوں گی۔ اگر روایات صحیح بھی ہوں تو ان کو کسی وقت عذر پر محمول کیا جائے گا مثلاً سر میں زخم یا کسی اور بیماری کو اس قاعدہ عامہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

علامہ شاطبی اس پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

جب بذریعہ استقرار ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے پھر اگر کوئی جزئیہ سامنے آجائے جو اس قاعدہ کے خلاف ہو تو جزئیہ کے لیے ایسا محمل تجویز کرنا ہوگا جس سے وہ قاعدہ عام سے ہم آہنگ ہو جائے کیونکہ قاعدہ کی کلیت کا علم تو پوری شریعت کے سسٹم کو دیکھ کر ہوا ہے یہ ناممکن ہے کہ اس خاص جزئیہ کی وجہ سے قواعد کی عمارت کو مسمار کیا جائے۔

اس میں امام مالک بھی امام اعظم کے ہمینوا ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دوسری صدی فقہاء و محدثین کا مسلک ہے کہ اخبار اُحاد کے قابل عمل اور قابل احتجاج ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے قوانین کلیہ کے خلاف نہ ہوں اور ان بزرگوں کو یہ مسلک البویجہ، عمر، عائشہ اور ابن عباس سے ورثہ میں ملا ہے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر مستقل عنوان کے تحت بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ، ابن عباس اور عمر بن الخطاب نے

اخبارِ اُحاد کو اصولِ اسلامیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے رو کر دیا تھا اور اس موضوع پر شاطبی نے امام مالک کا مذہب بھی کھول کر بتایا ہے وہ فرماتے ہیں:

اس مسئلے کی سلف میں اصل موجود ہے حضرت عائشہ نے حدیث
 ان المیت لیعذب ببکاء اہلہ کو اسی وجہ سے رو کر دیا کہ قرآن
 کے اس ضابطہ عام کے خلاف ہے لا تزود ذرۃ ذرۃ خیر
 ابن عباس کی اس روایت کو جس میں روایت باری کا ذکر ہے حضرت
 عائشہ نے لا تدکک الا بصار کے ضابطہ کی وجہ سے نامنظور کیا۔
 ایسے ہی حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ
 کی اس روایت پر تنقید کی جس میں برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے
 پہلے ہاتھ دھونے کی ہدایت ہے۔ نیز حضرت ابن عمر کی نحوست والی
 روایت کو ضابطہ انی ان الامر کلہ للہ کے خلاف قرار دیا اور بتایا
 کہ یہ بات نہایت محسوس کا اسلام نے اعلان کیا ہے بلکہ اصل یہ ہے
 کہ حضور فرمادے کہ یہ ایم جاہلیت میں لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ

الغرض دوسری صدی کے محدثین کا نقطہ نظر اخبارِ اُحاد کے بارے میں واضح اور صاف یہ
 تھا کہ خبر واحد اگر شریعت کے کسی مسلمہ قاعدے کے خلاف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں ہے
 علامہ شاطبی نے امام مالک کا بھی یہی مذہب بتایا ہے اور علامہ ابن عربی نے بھی امام مالک
 کا راجح مسلک یہی قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

اذا جاء الخبر معارضا لقاعدة من قواعد الشرع هل يجوز
 العمل به أم لا؟ فقال أبو حنيفة لا يجوز العمل به و
 قال الشافعي يجوز و تردد مالك في المسئلة قال ومثله
 قتوله والذي عليه الميعول ان الحديث ان عندنا
 قاعدة أخرى قال به وان كان وحده تركه
 اگر خبر واحد کسی قاعدہ شریعت کے معارض ہو تو کیا اس پر عمل جائز ہے؟

امام ابو حنیفہ تو فرماتے ہیں کہ ناجائز ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ جائز ہے
اور امام مالک کا قول مشہور اور قابل اعتماد یہی ہے کہ حدیث کی تائید
میں اگر کوئی قاعدہ ہو تو عمل جائز ہے اور اگر نہ ہو تو اس کو چھوڑ دینا
چاہیے۔

اس کے برعکس تیسری صدی کے محدثین نے اس اساس سے ہمنوائی نہیں کی بلکہ انہوں نے
اخبارِ اہلِ اہل کے ذریعے آئی ہوئی ہر خبر واحد کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ ہر صحیح حدیث بجاتے خود
ایک اصول ہے جس طرح قرآن حکیم ایک اصول ہے اور صحیح حدیث وہ ہے جو محدثین کی طے
کردہ اصطلاحی صحت پر پوری اتھارے۔ چنانچہ علامہ خطابی رقمطراز ہیں :

والاصل ان الحدیث لما ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم وجب القول به وصار اصلاً في نفسه۔

حدیث جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جاتی ہے تو اسے
اپنا ناداجب ہے اور وہ خود ایک اصل ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ :

الحدیث الصیح اصل بنفسہ

حدیث صحیح خود ایک اصل ہے۔

ابن السمعانی کے حوالہ سے بھی یہی بتایا گیا ہے کہ :

متی ثبت الخبر صار اصلاً من الاصول ولا يحتاج الى

عرضہ علی اصل اخر۔

جب حدیث ثابت ہو جاتی ہے تو وہ خود ایک اصل ہو جاتی ہے۔

فکر و نظر کے اس اختلاف کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کے مسلمات میں ترمیم کرنی پڑ گئی
اور ہر حدیث کے صحیح ہونے کے بعد تیسری صدی میں اسلام میں اصول ہی اصول ہو گئے۔
مثلاً عرض کرتا ہوں کہ صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں حدیث آتی ہے۔

عن ابی ہریرۃ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم لکذب ابراہیم الا ثلاث کذبات
ثنتين منها في ذات الله تعالى قوله اني سقيم وقوله
بل فعله كبيرهم هذا واحدة في سارۃ -

اگر اس معیار کو مان لیا جائے کہ ہر حدیث ثابت ہونے کے بعد ایک اصل ہے تو نبی
کا کذب بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اصل بن جائے گا معاذ اللہ ثم معاذ اللہ
حالانکہ نبی کی سچائی اور اس کی صداقت ماننے ہوئے اصولوں میں سے ایک مسئلہ اصول ہے۔
وحی و نبوت کے سارے کارخانے کی رونق نبوت کے اسی وصف سے وابستہ ہے۔ اسی
بنا پر علماء اور شراح حدیث کو اس حدیث کے لیے مطالب کے جانے تلاش کرنے پڑے
اور ایک نہیں۔ بلکہ متعدد توجہات کرنی ناگزیر ہو گئیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ حضرت
ابو ہریرہ کی یہ حدیث دین کے مسئلہ اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ نبوت ایک سیرت ہے جو
صرف سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک
نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا لیکن اس بات سے کہ سچ نہ بولے وہ قطعاً عاجز ہوتا ہے
حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے کبھی وہ نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے
انبیاء کی سچائی اور عصمت دین کے یقینیات قطعیہ میں سے ہے اور روایت چاہے کتنی ہی
بہتر قسم کی کیوں نہ ہو لیکن ہر حال میں راوی کی شہادت ہے اور راوی بھی غیر معصوم۔ اس
کی شہادت ایک لمحہ کے لیے یقینیات قطعیہ اور دین کے مسئلہ اصولوں کے مقابلے میں تسلیم
نہیں کی جاسکتی۔ اور الجزا ئری نے جو بعض کی طرف منسوب کر کے اور امام رازی نے جسے امام
اعظم کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ :

هذا الحديث لا ينبغي ان يقبل لان فيه نسبة الكذب

الى ابراهيم -

اس حدیث کو شرف قبول حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت

ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت ہے۔

اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ :

جب ایک غیر معصوم راوی کی غلطی ماننے اور معصوم نبی کی طرف
جھوٹ کی نسبت میں تعارض ہو جائے تو ہم راوی کی غلطی مان لیں گے

نیلن نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت گوارا نہ کریں گے یہ

حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے :

انما لاتدعی العصمة فی السوادة

ہم راویوں میں عصمت کے دعویدار نہیں ہیں۔

راویوں میں محدثین زیادہ سے زیادہ عدالت کے مدعی ہیں اور عدالت اور عصمت میں

جب بھی تعارض ہوگا تو عصمت کو رائج قرار دیا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ اس قسم کی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

معانی قرآن سے متضادم روایت

حدیث کی اصطلاحی صحت کے بعد دین کی زندگی میں اسے اپنانے اور اس کی مقبولیت کے لیے

امام اعظم ایک شرط یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ حدیث کسی وجہ سے متضادم نہ

ہو اور اس شرط کے عائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مدلول اور مفہوم میں قطعی نہیں

ہے لیکن اپنے منطوق میں وہ حتمی اور قطعی ہے اور احادیث اخبار احاد ہونے اور روایت

بالمعنی کی وجہ سے اپنے منطوق، اپنے مفہوم میں ہرگز ہرگز قطعی نہیں ہیں۔ ایک روایت پر

اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں ثبت ہو جائیں مگر آپ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں

کر سکتے کہ راوی جو کچھ بتا رہا ہے یقیناً یہ الفاظ نبوت ہی ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ

فرماتے ہیں :

قد یختلف صیغ حدیث لاختلاف الطرق و ذالک

من جهة نقل الحديث بالمعنی۔

حدیث میں الفاظ متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے مختلف ہوتے

ہیں اور یہ اختلاف الفاظ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کی

روایت بالمعنی ہوتی ہے۔

امام اعظم کا یہ ضابطہ حافظ ابن عبد البر نے اس طرح پیش کیا ہے کہ :

امام اعظم اخبارِ احاد کو اپنے یہاں جمع کردہ حدیثوں اور معانی قرآن پر پیش فرماتے تھے۔ ان حدیثوں میں جو اپنے معنی میں منفرد ہوتی تھیں ان کو ترک کر دیتے اور ان کا نام شاذ رکھتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبارِ احاد اگر معانی قرآن کے خلاف ہوتی تھیں تو آپ کے یہاں درجہ قبولیت نہ ملتا تھا۔ خواہ وہ معانی قرآن کا منطوق ہوں یا مدلول۔ اگر خبر واحد ان کے خلاف ہوتی تو خبر کی صحت میں آپ اسے علت قاعدہ قرار دیتے۔ دراصل اخبارِ احاد میں تعلیل کا مسئلہ نہایت ہی نازک ترین مسئلہ ہے۔ محدثین کی نظر تو اس موضوع پر صرف اسناد اور الفاظ متن ہی پر ہوتی ہے لیکن مجتہدین کی نظر اس معاملہ میں الفاظ متن اور اسناد ہی پر نہیں ہوتی بلکہ ان کو تقابلی مطالعہ میں اسے شریعت کے پورے نظام کو سامنے رکھ کر جانچنا ہوتا ہے اسی لیے کسی حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ نہ صرف متعدد ہوتی ہیں بلکہ متباین ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ امام حازمی رقمطراز ہیں :

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اخبارِ احاد کے ضعیف ہونے کی وجہ ایک سے زیادہ ہونے کے ساتھ مختلف بھی ہوتی ہیں اور اہل علم اس موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں اور ان میں بزرگترین یہ ہے کہ حدیث کی مقبولیت کا دار و مدار ظاہر شرع کی ہمنوائی پر ہے اور محدثین کے نزدیک دوسرے اسباب ہیں جملہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے یہاں تعلیل اخبار کے جو یہاں مقرر ہیں ان کا تعلق تلامذہ محدثانہ نقطہ نظر سے ہے اور فقہائے یہاں صرف یہی پیمانہ نہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ دوسرے سانچوں میں بھی اخبار کو رکھ کر جانچتے ہیں۔ ایک مثال سے اس کی توضیح کرتا ہوں۔

یثغین اور دوسرے ارباب صحاح نے حدیث روایت کی ہے کہ :

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المتبايعان

بالخيار مالم يتفرقا۔

یہ حدیث صحیح ہے اور حدیث کی کتابوں میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ محدثین نے اس

حدیث پر غور کیا اور غور و فکر کے بعد ان کو اس کی سند میں ایک جگہ نازک ترین علت معلوم ہوئی۔
بتانے والوں نے اس کا سلسلہ سند یوں ظاہر کیا۔

یعلیٰ بن عبید عن سفیان الثوری عن عمرو بن دینار عن ابن عمر عن النبی۔
حدیث متصل ہے لیکن الجزائری کہتے ہیں کہ اس میں علت موجود ہے اور اس علت کی
وجہ سے بلحاظ سند حدیث صحیح نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں:
وہو معطل غیر صحیح

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ علت کیا ہے؟ الجزائری نے بتایا ہے کہ
والعلة في قوله عن عمرو بن دينار انما هو عن عبد الله
بن دينار عن ابن عمر هكذا رواه الائمة من اصحاب
سفیان فوهم یعلی بن عبید و عدل عن عبد الله بن
دینار الی عمرو بن دینار و کلاهما ثقة۔

اس میں علت یہ ہے کہ سند میں عمرو بن دینار آیا ہے حالانکہ عمرو بن
دینار نہیں بلکہ عبد اللہ بن دینار ہے۔ المترم نے ایسا ہی روایت کیا
ہے یعلیٰ بن عبید کو وہم ہو گیا اور عبد اللہ کی جگہ عمرو مذکور ہو گیا۔
یہ محدثانہ تعلیل ہے لیکن حدیث میں جو فقہار یعنی امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے علت قاذرہ
معلوم کی ہے وہ اس کے سوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث زمانہ فقہار سبعہ میں منظر عام پر
نہیں آئی اور ان کے معاصرین اس سے آشنا نہیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں،
فراعی مالک والیہ حنیفۃ هذا علت قاذرة في الحديث۔
بہر حال امام اعظم اخبار احمد کو معانی قرآن کے سانچے میں تول کر حدیث کی مقبولیت کا فیصلہ
کرتے ہیں۔ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں:-

خلاصہ یہ کہ حدیث جب شریعت کے موافق ہو قرآن اس کا مصدق
ہو اور آثار اس کے مؤید ہوں تو ایسی حدیث کی تصدیق واجب
ہے لیکن اگر حدیث شریعت کے خلاف ہو قرآن اس کی تکذیب

کہتا ہو تو ایسی حدیث کا رد کرنا ضروری ہے اور یہ اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ یہ فرمودہ نبوت نہیں ہے بلکہ

مشہور محدث ابو بکر خطیب بغدادی فرماتے ہیں :
 اخبار آحاد کو مندرجہ ذیل صورتوں میں قبول نہ کیا جائے گا جب عقل صریح کے خلاف ہو، جب حکم قرآنی کے خلاف ہو، جب سنت مشہورہ کے خلاف ہو اور جب کسی ایسے عمل کے خلاف ہو جو سنت کے قائم مقام ہو کر چل رہا ہے اور جب کسی بھی دلیل قطعی کے خلاف ہو۔

خطیب بغدادی ہی نے الفقیہ والمتفقہ میں یہ بات اس سے زیادہ وضاحت سے پیش کی ہے۔ علامہ زاہد کوثری نے الفقیہ والمتفقہ کے حوالہ سے ان کا یہ بیان قلم بند کیا ہے اور اسے مولانا ابوالوفاء افغانی نے الرد علی سیرالاوزاعی کی تعلیق میں نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں :
 جب ثقہ مامون راوی کوئی حدیث منقول الاسناد روایت کرے تو اسے صرف ان وجوہ کی بنا پر رد کیا جاسکتا ہے۔

اول عقل کے صریح خلاف ہو۔ دوم حکم قرآنی یا سنت متواترہ کے خلاف ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو یقیناً حدیث بے اصل ہے اور یا پھر منسوخ سوم اجماع کے خلاف ہو کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ حدیث صحیح ہو اور امت کسی ایسی چیز پر مجتمع ہو جائے جو اس کے خلاف ہو۔ چہارم راوی کسی ایسی بات کے بیان میں منفرد ہو جسے سب کو جانتا چاہیے۔ پنجم راوی کوئی ایسا انکشاف کرے جسے عادتاً متواتر ہونا چاہیے۔ ان پانچوں صورتوں میں خبر واحد قابل پذیرائی نہ ہوگی۔

حافظ ابوبکر الجصاص نے قرآنی آیت اتبعوا ما انزل الیکم من دیکر پر یہ نوٹ لکھا ہے اس آیت قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن کا اتباع بہر حال واجب

۱۔ المعترض ص ۴۶۲ - ۲۔ الکفایہ ص ۴۳۲ -

۳۔ الفقیہ والمتفقہ بحوالہ التعلیق الرد علی سیرالاوزاعی ص ۲۸ -

ہے اور قرآن پر اخبارِ آحاد کو بالادستی حاصل نہیں ہے کیونکہ قرآن کی اتباع دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہے اور آحاد کا ثبوت ظنی ہے اس لیے کسی حال میں کسی حدیث کی بنا پر قرآن کو نہ چھوڑا جائے گا اور نہ آحاد کی وجہ سے قرآن پر کوئی اعتراض ہوگا۔

اس موقع پر علامہ عبدالعزیز بخاری کے اس بیان سے چشم پوشی کرنا اس مقام سے انصافی ہوگی جو انہوں نے کشف الاسرار میں لکھا ہے :

ثقة راوی کی حدیث کو قرآن کی مخالفت کی بنا پر رد کرنا سب کے درمیان اتفاقی ہے۔ علاوہ ان ظاہریہ کے جو اخبارِ آحاد کو بھی متواتر کی طرح قطعی کہتے ہیں۔ ان کے مکتب میں خبر واحد اور کتاب اللہ کو ایک ترازو میں تولایا جاتا ہے ان سے اس موضوع پر بات ہی بیکار ہے۔

بہر حال امام اعظم اور امام مالک حدیث کی صحت کے بعد اس کی مقبولیت میں معافی قرآن کے خلاف ہونے کو علتِ قاذمہ قرار دیتے ہیں اور اس بنا پر انہوں نے ایک سے زیادہ حدیثوں کو معطل قرار دے کر ناقابلِ پذیرائی بتایا ہے۔ ترمذی، ابن ماجہ اور بیہقی میں حدیث آتی ہے

عن عبد الله ان غيلان بن سلمة الثقفي اسلموا

عشرة نسوة في الجاهلية فاسلمن معه فامر النبي

صلى الله عليه وسلم ان يتخير منهن اربعة۔

امام ترمذی نے اسے بحوالہ زہری عن سالم عن عبد اللہ روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے تو محدثانہ انداز میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ

هذا حديث غير محفوظ

اور صحیح روایت کی نشاندہی کی ہے۔ شیخ علاء الدین مغلطی فرماتے ہیں کہ

احادیث هذا الباب كلها معلولة وليست اسانيد هاقوية

لیکن قاضی ابو یوسف نے اس کے باوجود جو فیصلہ فرمایا ہے اس سے ان کی حدیث و

فقہ میں جلالتِ نشان کا اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں :

هو عندنا شاذ والشاذ من الحديث لا يؤخذ به
یہ تو محدثانہ فیصلہ ہے لیکن اس کی جو توجیہ ارشاد فرمائی ہے اس سے ان کی مجتہدانہ جمالت
قدر معلوم ہوتی ہے فرماتے ہیں :

لان الله تعالى لم يجعل الا نكاح الاربع فما كان من فوق
ذالك كله فحرام من الله في كتابه -

کیونکہ اللہ سبحانہ نے ایک وقت میں چار سے نکاح حلال کیا ہے
پانچ کا ایک کے نکاح میں اجتماع حرام ہے۔

دیکھ لیجئے معافی قرآن سے تصادم ہونے کو شاذ ہونے کی علت قرار دیا ہے۔ اسی قبیل
سے حدیث مصراۃ ہے یعنی حضرت ابو ہریرہ کی مندرجہ ذیل حدیث -

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
کہ اونٹ، بکری کو مصراۃ نہ بناؤ جو کوئی ایسا جانور خریدے تو وہ دودھ
دوہنے کے بعد اختیار رکھتا ہے چاہے اسے لکھے اور چاہے تو اسے
واپس کرے اور اس کے ساتھ بائع کو ایک صاع کھجور دے دے۔

امام اعظم نے اس حدیث کو معافی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے غیر مقبول قرار دیا ہے۔
اس حدیث کی رو سے سو دے کی واپسی کی صورت میں خریدار کو دودھ کا تاوان کھجور کی صورت میں ادا
کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلاشبہ عیب کی موجودگی میں مشتری کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل
ہے لیکن خریدار پر دودھ برتنے کی پاداش میں کھجور کا تاوان قرآن کے بتلائے ہوئے ضابطہ ضمان کے
خلاف ہے۔ قرآن نے منلفات اور عدوانات میں تاوان ذوات الامثال میں مثلی بتایا ہے۔ قرآن
کی یہ آیات اس کی صریح شہادات ہیں -

فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم
پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو چاہیے کہ جس طرح کا معاملہ اس نے
تمہارے ساتھ کیا ہے بالکل ویسا ہی معاملہ تم بھی اس کے ساتھ کرو۔

ایک اور ارشاد ہے :

وان عاقبتكم فحاقبوا بمثل ما عواقبتكم به
 اور اگر تم سزا دو تو چاہیے کہ اتنی ہی سزا تم دو جیسی تمہیں دی گئی ہے۔
 یہ آیات قرآنی صراحتاً کہہ رہی ہیں کہ عدوانات کی حدود میں تاوان منہیات میں مشمل ہوتا ہے
 ان ارشادات ربانی کی روشنی میں دودھ کا تاوان دودھ ہونا چاہیے کیونکہ دودھ ذوات الامثال سے
 ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد تاوان کے موضوع پر ایک ضابطہ کی صورت
 میں اہمیت کو شہرت کی راہ سے ملا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے یہ آپ کا عادلانہ فیصلہ ہے۔

عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی ان الخراج بالضمان
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ خراج ضمان کے ساتھ ہے
 یہ قرآن و سنت کے واضح اصول ہیں اور یہ روایت ان کے معارض ہے اس لیے امام اعظم
 اس روایت کو مقبول نہیں قرار دیتے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے اس روایت کا دوسرے پہلو
 سے جائزہ لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

دودھ جسے خریدار نے کھ لاکر نکالا ہے اس میں خریدنے سے پہلے
 کچھ مالک کی ملک تھا اور کچھ خریدار کے یہاں اگر پیدا ہوا ہے۔ وہ
 خریدار کی ملک ہے۔ کھجوروں کا جو صاع مالک کو دیا جا رہا ہے وہ
 اگر سائے دودھ کا بدل ہے تو یہ حدیث الخراج بالضمان کے خلاف
 ہے کیونکہ جو دودھ خود ملک مشتری میں پیدا ہوا ہے وہ تو اس کا
 ہے خریدار پر کھجور کا تاوان بلا وجہ ہے چنانچہ امام شافعی کا بھی
 یہی مذہب ہے کہ اگر خریدار نے صیرورۃ کے علاوہ کسی اور وجہ
 سے جانور واپس کر دیا تو خریدار پر ضمان نہیں ہے۔ اور اگر یہ صاع
 اس دودھ کا بدل ہے جو سوئے کے وقت جانور کے پستانوں
 میں موجود تھا تو پھر بیع الکالی بالکالی ہے جس سے جناب رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دودھ خریدار کی ملک
 نہیں ہے نہ سوئے کی وجہ سے اور نہ حدیث الخراج بالضمان کی
 رو سے۔ خریدار نے اگر پی لیا ہے تو اس کے ذمہ دین ہے اس
 لیے دونوں میں سے کوئی صورت ہو ایک حدیث کا چھوڑنا

ناگزیر ہے۔

علامہ خطابی نے جہاں اس حدیث پر گفتگو فرماتے ہوئے امام اعظم کے موقف کا تذکرہ کیا ہے وہاں واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ امام اعظم اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں انہ خبر مخالف للاصول لان فیہ تقویم المتلف بغیر الغنود فیہ ابطال رد المثل فیما لم یثقل۔

یہ حدیث اصول کے خلاف ہے اس میں تلف شدہ چیز کا ضمان بغیر نقدی کے دیا جا رہا ہے اور اس طرح یہ حدیث مثلیات میں مثلی کے دینے کے اصول کو رد کرتی ہے۔

اور معلوم ہے کہ یہ اصول قرآن کا بتایا ہوا ہے اس لیے یہ حدیث معانی قرآن کے معارض ہے۔ علامہ ابن دینار العید نے یہ فرما کر کہ

لم یقل ابو حنیفۃ بهذا الحدیث

لکھا ہے کہ ابو حنیفہ اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ حدیث ان کی رائے میں اصول معلومہ کے خلاف ہے اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اخبار آحاد اگر اصول معلومہ کے مخالف ہوں تو ان پر عمل واجب نہیں ہے۔ حدیث کے اصول معلومہ کے مخالف ہونے پر امام اعظم کے موقف کو جن آٹھ وجہوں سے منقح کیا ہے ان میں اولین وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ کہ مثلیات میں تاوان مثلی اور قیمتی اشیاء میں قیمت سے ہوتا ہے اس حدیث میں دودھ اگر مثلیات سے ہے تو اس کا تاوان دودھ سے ہونا چاہیے اور اگر قیمتی ہے تو اس کی قیمت دی جانی چاہیے لیکن حدیث میں تاوان جو بخیر کیا گیا ہے نہ وہ مثلی ہے اور نہ قیمتی بلکہ تاوان میں کھجوریں دی گئی ہیں اس لیے یہ حدیث اس اصول کے مخالف ہے۔

امام اعظم کے موقف کی وضاحت کے بعد ان لوگوں کی جانب سے جو بات بھی نقل کیے گئے ہیں جو ظاہر حدیث پر عمل پیرا ہیں۔ مخالفین اس حد تک کہ امام اعظم کے ہمنوا ہیں کہ اخبار آحاد

اگر اصول معلومہ کے معارض ہوں تو قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ ابن دقیق العید رقمطراز ہیں:
 خص الرد مخبر الواحد بالمخالفة للأصول لا بمخالفة
 قیاس الاصول۔

لیکن اس میں ان کو تامل ہے کہ حدیث مصراۃ بھی اصول معلومہ کے مخالف ہے یا نہیں
 ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اصول معلومہ کے مخالف نہیں ہے بلکہ قیاس اصول کے خلاف
 ہے۔ علامہ شوکانی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔

ان المتوقف فی خبر الواحد انما هو اذا كان مخالفا للأصول
 لا بقیاس الاصول لہ

یہی جواب امام شوکانی کی سوائے میں سب زیادہ شاندار ہے یعنی حدیث مصراۃ اصول معلومہ
 کے نہیں بلکہ قیاس اصول کے مخالف ہے لیکن علامہ ابن دقیق العید نے اس جواب کی یہ کہہ
 کر د فی هذا نظر (محل نظر ہے) کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ
 خطابی کو جب اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ملی کہ حدیث مصراۃ اصول معلومہ کے خلاف
 ہے تو انہوں نے اصول اور قیاس اصول سے نظر ہٹا کر اپنے مخصوص ذہن کے تحت یہ حدیث
 پیدا کر دی کہ محدثین کی اصطلاحی صحت کے بعد ہر حدیث خود ہی ایک اصل کی حیثیت اختیار
 کر لیتی ہے چنانچہ علامہ خطابی فرماتے ہیں:

ان الحدیث اذا ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 وجب القول بہ وصار اصلاً فی نفسه۔

حدیث جب حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اسے اپنا
 واجب ہے اور وہ حدیث خود اصل ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات دہرائی ہے

الحدیث الصیح اصل بنفسہ۔

لیکن یہ صرف ان ذہنوں کا تخلیقی کارنامہ ہے جو قرآن کے ساتھ بلحاظ ثبوت احادیث
 کی قطعیت کو مانتے ہیں۔ یہ عامہ اہل علم کا موقف نہیں ہے اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ اپنے مقام

پر اسے گا۔

حدیث مصراۃ کے بارے میں امام اعظم کا صحیح موقف تو یہی ہے کہ یہ حدیث معانی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خود احناف نے بھی امام اعظم کے موقف کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا اس لیے یہاں چند در چند سواات ابھر آئے۔

عیسیٰ ابن ابان نے امام اعظم کے موقف کی ترجمانی اس طرح کی کہ ایسی اخبار اُحاد جن کے لیے کسی صورت میں بھی قیاس میں گنجائش نہ نکل سکے اور راوی فقہ نہ ہو اسے رو کر دیا جائے اور یہ حدیث مصراۃ اسی قبیل سے ہے چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی لکھتے ہیں :

مذهب عیسیٰ بن ابان من اصحابنا اشتراط فقہ الراوی
لتقدیم الخبر علی القیاس و خرج علیہ حدیث المصراۃ
و تابعہ اکثر المتأخرین لہ

حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن القیم، حافظ ابن تیمیہ، علامہ ابن دقیق العید اور علامہ شوکانی نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ حافظ ابن حجر تو یہاں تک فرما گئے۔
ھو کلام اذی قائد ربہ نفسہ و فی حکایتہ غنی عن تکلف
الرد علیہؒ

فخر الاسلام بزدوی نے امام اعظم کی جو ترجمانی کی ہے وہ بھی بے شمار شبہات کی تخلیق کا ذریعہ بنی ہے انہوں نے صرف قیاس کا سہارا لیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ حدیث مصراۃ قیاس کے معارض ہے اس لیے اسے امام اعظم نے نہیں اپنایا ہے چنانچہ وہ اس حدیث کے مقبول نہ ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وودھ کے عوض میں ایک صاع کھجور کا دینا ضروری سمجھا گیا ہے ظاہر ہے کہ وودھ خریداری اور بکری پر قبضہ کے بعد ہی دیا گیا ہوگا لہذا وہ خریدار کی ذمہ داری میں داخل ہے کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اس لیے نادان کا سوال ہی نہیں۔ وودھ مال کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ

ایسے ہے جیسے بکری کا بچہ۔ اس لیے مشتری پر تاوان کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نیز اگر دودھ کو مال فرض بھی کر لیا جاتے تو یہ اُون کی طرح بکری کے تابع ہے پھر بھی خریدار اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر خریدار پر تاوان اس لیے ہے کہ اس نے عقد بیع کیا ہے تو دودھ کے مقابلے میں بکری کی قیمت اتنی کم ہو جانی چاہیے۔ اور اگر اس کی وجہ مشتری کی تعدی ہے تو وہ آئنا دودھ واپس کرے یا اس کی قیمت دے کسی بھی صورت میں ایک صاع تمر دینے کا کوئی تہواز نہیں ہے۔

اس بیان کی روح یہ اور صرف یہ ہے کہ حدیث مصراۃ قطعاً خلاف قیاس ہے اور خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کی اپنی اپنی ہے۔ ان کی یہ تخریجات امام اعظم کے مسک کی تخریجاتی نہیں کرتی ہیں اور ان کے بیانوں سے امام اعظم کے اصل مسک کی تصویر سامنے نہیں آتی چنانچہ امام ابو الحسن کرخ نے تصریح کی ہے کہ

ہم اے اصحاب ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ کتاب اللہ اور سنت کے خلاف ہیں نہ کہ اس لیے کہ راوی فقہ نہیں ہے حدیث مصراۃ کتاب و سنت دونوں کے خلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اس لیے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے اور یہی امام اعظم کا موقف ہے کہ حدیث مصراۃ مطابق قرآن اور سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے اس لیے نہیں کہ یہ حدیث خلاف قیاس ہے جیسا کہ نزدیکی کا خیال ہے اور اس لیے نہیں کہ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ ہیں اور وہ غیر فقیہ ہیں جیسا کہ عیسیٰ بن ابان کی رائے ہے۔ یہاں حافظ ابن تیمیہ کی یہ بات بے حدود زنی ہے کہ واپسی کی علت حدیث میں عیب کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی علت وہ جعل سازی اور تدلیس ہے جس کا مالک نے دودھ روک کر منظر ہرہ کیا ہے

قاضی ابو یوسف بھی خریدار کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ ایسا مویشی واپس کر دے۔ اگر فی الواقع حدیث میں جانور کی واپسی کا حکم دھوکے اور تدلیس کی بنا پر ہے تو پھر اس ارشاد نبوت کے ذریعے امام اعظم کا موقف بے حد مستحکم اور پائیدار ہو جاتا ہے کیونکہ دھوکہ دو ہی طرح سے ہوتا ہے گفتار سے یا کردار سے۔ اگر لہٰذا دین میں گفتار کے ذریعے دھوکہ دیا گیا تو عدالت کے ذریعے اس کا اقالہ ضروری ہے۔ اور اگر کردار کے ذریعے تدلیس کی گئی ہے تو قانونی طور پر تو اقالہ ضروری نہیں ہے لیکن از روئے دیانت ضروری ہے۔ قانون ہمیشہ کھلے اور صاف متعلق پر لاگو ہوتا ہے۔ پوشیدہ اور مستور کارروائیاں قانون کے احتساب سے باہر ہیں۔ مان لیا جائے کہ نہ یہ دھوکہ اور تدلیس ہے اور اس میں بائع پر واجب ہے کہ معاملہ کو فسخ کرے لیکن یہ وجوب از روئے دیانت ہے نہ کہ از روئے قانون۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جعل سازی اور تدلیس کرنے والوں کو از روئے دیانت حسن معاشرت کی خاطر فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی ایسی جعل سازی وجود میں آجائے تو اخلاق اور باہمی رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ جانور واپس لے لیا جائے اور مشتری کی موت یہ ہے کہ وہ اسے ایک صاع کھجور دے دے یا اس کی قیمت ادا کر دے جیسا کہ خطابی نے قاضی ابو یوسف کی رائے بتائی ہے درہم جہاں تک معنائی نقطہ نظر سے اس کی قانونی حیثیت کا تعلق ہے وہ تو وہی ہے جو قرآن اور سنت سے ثابت ہے۔ کیونکہ اگر جانور کی واپسی عیب کی بنا پر ہو جیسا کہ محدثین کہتے ہیں یا جعل سازی کی بنا پر ہو جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں تو نقصان عیب میں قرآن و سنت کا ضابطہ یہی ہے کہ منسلقات اور عدوانات میں تاوان ذوات الامثال میں مشکی ہوتا ہے۔

بہر حال اخبار احمد کا معانی قرآن کے معارض ہو جانا امام اعظم کے نزدیک علت قادمہ ہے

سنت مشہورہ سے معارض حدیث

اخبار احمد اگر سنت سے معارض ہوں خواہ ان پر اصطلاحی صحت کی محدثین نے کتنی ہی مہریں لگا دی ہوں۔ امام اعظم اس کو بھی اخبار احمد کے لیے علت قادمہ قرار دیتے ہیں اور اس میں امام اعظم جی کا منہ نہیں بکد دوم صدی کے سب محدثین کا موقف یہی ہے۔ ابو بکر الحنفی کی زمانی آپ اس کی پوری داستان پہلے سن چکے ہیں۔ ان ظاہریہ کو چھوڑ کر جن کے یہاں ہر حدیث محدثین کی اصطلاحی صحت کا لبادہ پہن لینے کے بعد خود ہی اصل بن جاتی ہے اور جن کے

یہاں احاد کو جانچنے کا کوئی معیار ہی پایا نہ نہیں ہے سب کہتے ہیں کہ اخبارِ احاد اگر سنتِ مشورہ کے معارض ہوں تو یہ علتِ قاضیہ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کا جو محسوس پیمانہ صحابہ میں چھوڑا ہے اور جسے جماعت صحابہ نے اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اپنایا اور جسے خلافتِ راشدہ نے اپنے دورِ اقتدار میں تمام ممالکِ اسلامیہ میں قانونی طور پر نافذ کیا ہے اور جسے اسلام کہہ کر دُنیا نے پکارا ہے۔ یہی حضور انور کی سنتِ مشورہ ہے۔ چونکہ یہ عملاً متواتر ہے اس لیے اس کے خلاف سند کی بڑی سے بڑی قوت بھی بطورِ چیلنج قبول نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال بدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمر بھر کے عمل اور صحابہ کے تعامل سے اُمت کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امامت کے لیے وہ شخص آگے ہونا چاہیے جو عاقل، بالغ ہو اور اس ضابطہ کلیہ میں کہیں کوئی استثناء نہیں ہے۔ صرف عمرو بن سلمہ کی ایک منفرد روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ میں صرف چھ سال کی عمر میں امامت کی ہے۔ حدیث صحیح بخاری میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس طرح آتی ہے کہ:

عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ زمانہ فتح مکہ میں سب نے اسلام کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے والد نے ہماری قوم میں سے اسلام لانے میں پہل کی۔ مسلمان ہونے کے بعد جب میرے والد واپس تشریف لائے تو بتایا کہ میں تمہارے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حق لے کر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوقات میں نماز پڑھا کرو۔ جب نماز کا وقت آجاتے تو تم میں سے ایک اذان کہے اور جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ امامت کرے۔ لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ قرآن کسی کو یاد نہیں ہے کیونکہ میں آنے والے مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا۔ لوگوں نے مجھے ہی آگے کر دیا اس وقت میری عمر صرف چھ یا سات سال تھی۔ میں ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھا رہا تھا جب سجدے میں جاتا تو برہنہ ہو جاتا۔ قبیلہ کی ایک عورت نے کہا کیا تم اپنے ابا کی جائے شرم نہیں ڈھانپتے۔ لوگوں نے میرے لیے کپڑا خرید کر قمیض تیار کیا،

جس قدر مجھے اس روز خوشی ہوئی کبھی ایسی خوشی نہ ہوئی تھی۔
 تیسری صدی کے محدثین نے اس حدیث سے چھ سالہ بچے کے لیے امامت کے جواز کا پروا
 حاصل کر لیا۔ چنانچہ مشہور محدث محمد بن نصر مزنی نے امام اسحاق بن راہویہ کے حوالہ سے لکھا
 ہے کہ :

امامامۃ الغلام بعد ان یعقل الامامۃ ویفقه
 فی الصلاة فجازة وان لم یحتلم و فیما قال النبی صلعم
 لیوم القوم اقراءهم وان کان اصغرهم دلالة
 علی ذالک علیہ

لڑکے کی امامت عقل و فہم کے بعد درست ہے اگرچہ نابالغ ہو
 اور حضور کا یہ ارشاد کہ لوگوں میں جو زیادہ پڑھا ہوا ہو وہ امامت
 کرے اس کی دلیل ہے۔
 علامہ شاکانی فرماتے ہیں کہ

فیہ جواز امامۃ الصبی و وجہ الدلالة ما فی قوله
 لیؤمکم اکثرکم قرأنا من العموم علیہ
 یہ حدیث بچے کی امامت کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ اقراکم... الخ کا
 جملہ عام ہے۔

لیکن دوسری صدی کے محدثین اور فقہانے اس حدیث کو اس موضوع پر سنت مشہورہ کے
 خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں سمجھا۔ لیث بن سعد، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی،
 شعبی، مالک اور ابو حنیفہ نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا اور اس جزئی واقعہ کی یہ تاویل کر
 دی کہ یہ ان نو مسلموں کا اپنا اجتہاد تھا کہ معصوم بچے کو امام بنالیا۔ اس لیے اس موضوع پر یہ حجت
 نہیں ہے۔ دین میں نبوت کا چھوڑا ہوا ضابطہ اور محسوس و مرقی عمل کا پیمانہ امامت کے متعلق
 وہی ہے جس پر ہمیشہ صحابہ نے عمل کیا ہے۔

تاریخ سنت میں بھی اس محسوس پیمانہ عمل کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ

ارشاد اُمت کو ملا ہے۔ مثلاً مالک بن الحویرث کہتے ہیں کہ :

ہم ایک وفد کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے بیس روز آپ کی خدمت میں پہلے آپ بڑے ہی مہربان اور شفیق تھے جب آپ نے ہم میں واپسی کا اشتیاق محسوس کیا تو ارشاد فرمایا کہ واپس جاؤ جہاں رہو تعلیم جاری رکھو اور نماز پڑھو جب نماز کا وقت آئے چاہیے کہ تم میں سے ایک اذان کہے اور لیو مکہ اکبر کہ جو تم میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔

اس واقعہ کو امام بخاری نے ایک جگہ نہیں بلکہ چھ جگہ اپنے مختلف اساتذہ کے حوالے سے نقل کیا ہے ان میں زیادہ مبسوط وہ واقعہ ہے جو ابوالنعمان کے حوالہ سے لکھا ہے۔

منتقى الاخبار میں اس موضوع پر صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس کے فتاویٰ بھی نقل کیے ہیں کہ بچتے کے لیے امامت کی گنجائش نہیں ہے اور قیام لیل میں لیث بن سعد، یحییٰ بن سعید الانصاری، ابن جریر، مجاہد، سفیان ثوری، ابراہیم نخعی کے آثار بھی اسی موقف کی تائید میں آئے ہیں بلکہ عمر بن عبدالعزیز کا وہ مکتوب بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے گورنر کو اس حرکت پر ڈانٹ پلائی ہے کہ اس نے نماز کے لیے اپنے بچے کو امام بنا دیا تھا لکھا ہے کہ :

قدمت غلاماً لم تختك السن ولم تدخله تلك

النیت اماماً للمسلمین فی صلاتہم

تم نے چھوٹے بچے کو امام بنا لیا۔

امام اعظم نے ان صاف اور واضح ہدایات کی روشنی میں اپنی خدا وادفعاہت سے امامت

کے اس ضابطہ عام کو جو سنت کی راہ سے آیا ہے اپنی جگہ سے نہ ہلنے دیا۔

یہ تو اس پر خالص مجتہدانہ نظر تھی جس سے سنت کے معارض ہونے کی وجہ سے حدیث

پایہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف یہی علت قاعدہ ہے

اور اس حدیث کی صحت بالکل ٹکسالی ہے۔

محدثین نے اس کی صحت میں بھی کلام کیا ہے۔ الخطابی فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کا واقعہ ضعیف ہے اور حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے فیہ رجل مجهول فهو غیر صحیح اس میں ایک مجہول راوی ہے لہذا روایت صحیح نہیں ہے۔ اور تو اور حافظ ابن حزم بھی ظاہریت کے باوجود یہاں بول پڑے کہ:

اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے معلوم ہو جانے کے بعد اس پر نیکر نہیں فرمائی تو ہم نپتے کی امامت ضرور جائز کہتے لیکن ہمارے علم میں یہ نہیں آیا۔ اگر مان لیا جائے کہ عمرو بن سلمہ بھی اپنے والد کے ساتھ حضور کے پاس گئے تھے اور حضور اس وفد کو جب حکم دے رہے تھے تو یہ بھی موجود تھے۔ پھر بھی اس عمر کا آدمی نہ مامور ہے اور نہ مکلف ہے اس لیے عمر امامت کے لیے فحی طہ ہی نہیں ہیں۔ اس حکم کے مخاطب صرف مامورین ہیں۔

اخبار احاد کا توارث سے معارضہ

امام اعظم اخبار احاد کو توارث کے پیمانے میں بھی تو لیتے ہیں اور ہر ایسی حدیث کو معلول قرار دیتے ہیں جو توارث کے خلاف ہو۔ اسی توارث کو السنۃ اور ما علیہ الجماعت کہتے ہیں اور اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے محدثین کی تہنوائی بھی حاصل ہے چنانچہ مصر کے مشہور محدث و فقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امام موصوف نے اس معیار کو واضح طور پر پیش فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے جس پر مصر، شام، عراق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے زمانہ ابوبکر و عمر و عثمان میں عمل کیا ہو اور اسی پر تا آخر حیات رہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلے کے بارے میں رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کی برگزیدہ گز

اجازت نہ دی جاتے گی کہ وہ اب کوئی ایسا کام کریں جو صحابہ و تابعین
میں ان کے اسلاف کے مترادف ہو۔
امام مالک عمل اہل مدینہ کی حجیت کے جو قائل ہیں اس کا مبنیٰ بھی توارث ہے۔ حافظ ابن
القیم اسی کو عمل مستمر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ قابل اتباع حجت ہے۔ چنانچہ ایک
موقعہ پر وہ اعظام میں فرماتے ہیں :

فهذا النقل وهذا العمل حجة يجب اتباعها وسنة
متقاة بالقبول على الساس والعينين وادانها للعالم
بذلك فرت به عينه واطاعت اليه نفسه
يقتل اور یہ عمل واجب الاتباع دلیل ہے اور ایک ایسی سنت
ہے جسے تلفی بالقبول حاصل ہے اگر ایسی کوئی دلیل مل جائے تو دل
کی ٹھنڈک اور الہامین کا موجب ہے یہ

واضح ہے کہ اگرچہ حافظ ابن القیم نے عمل اہل مدینہ کی حجیت سے اختلاف کیا ہے جیسا کہ آپ
پڑھ چکے ہیں لیکن وہ زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کے عمل کی حجیت کے قائل ہیں۔ ہاں
جب دور خلافت کے بعد صحابہ کی اکثریت مدینہ سے باہر چلی گئی ہے تو پھر وہ اہل حرمین کے
عمل کی حجیت کو نہیں مانتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی بھی شہر میں صحابہ نے ڈیرا لگایا ہو
اور وہاں صحابہ کا قائم کردہ جادہ عمل استمرار کے ساتھ امت کو ورثہ میں ملا ہو تو اس میں اور
اہل مدینہ کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

اگر کسی ایسے شہر والوں کا کہہاں صحابہ منتقل ہو گئے تھے وہاں صحابہ
کی تعلیم کے مطابق کوئی عمل مستمر چلاتا ہے تو اس عمل میں اور اہل
مدینہ کے عمل میں کیا فرق ہے ؟

ان کو استمرار عمل اور توارث کی حد تک اختلاف نہیں ہے اختلاف کام کنزی نقطہ مکان
اور درو دیوار میں۔ توارث کو تو وہ اس حد تک طاقتور دلیل قرار دیتے ہیں کہ کتاب الریح میں
ایک مقام پر تلقین میت فی القبر کے تذکرے میں ایک حدیث ضعیف لے کر آئے ہیں اور

خود فرماتے ہیں کہ یہ اس موضوع پر ضعیف حدیث ہے مگر اس کے ساتھ جوازِ عمل کا پروانہ انہوں نے جس بنیاد پر دیا ہے وہ بھی تعامل اور توارث ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

فہذا الحدیث دان لم یثبت فاقصال العمل بہ فی
سائر الامصار والاعصار من غیر انکار کافی فی العمل بہ بلہ
حدیث اگرچہ ثابت نہیں لیکن اس کی پشت پر اتصالِ عمل کی طاقت
ہے اس لیے عمل کے لیے کافی ہے۔

حافظ ابن عبد البر نے الاستذکار میں امام مالک کے حوالے سے یہ تصریح کی ہے کہ :
جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف حدیثیں آئیں اور ہمیں
یہ معلوم ہو کہ حضرت ابو بکر نے اس پر عمل کیا ہے تو یہ اس بات
کی دلیل ہوگی کہ جس روایت پر انہوں نے عمل کیا ہے وہ ہی صحیح اور
مقبول ہے۔ ۱۷

حافظ ابو بکر الخطیب بغدادی نے امام مالک کا ایک دوسرا بیان نقل کیا ہے :
اگر یہ حدیث معمول ہو جاتی کہ امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر
ہی نماز پڑھو تو اس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر
و عمر و عثمان ضرور عمل کرتے۔ ۱۸

اسی سلسلے میں امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں جو ضابطہ لکھا ہے وہ بھی سن لیجئے :
جب دو حدیثیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف آئیں تو یہ
دیکھا جائے گا کہ آپ کے صحابہ نے کس پر عمل کیا ہے۔ ۱۹
امام عثمان دارمی محدث کے حوالے سے مشہور محدث امام بیہقی بیان کرتے ہیں کہ :
جب کسی موضوع پر احادیث مختلف ہوں اور راجح و مرجوح کا پتہ
نہ ہو تو ہم یہ دیکھیں گے کہ خلفاء راشدین نے حضور انور صلی اللہ
علیہ وسلم کے بعد کس پر عمل کیا ہم اسی کو راجح قرار دیں گے جس

۱۷ کتاب الروح ص ۱۴۔ ۱۸ التعلیق المجید ص ۴۷۔ ۱۹ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۴۷
۲۰ سنن ابی داؤد۔

پر خلفاء راشدین کا عمل ہے۔ یہ
مشہور مجتہد اور اصولی امام حافظ ابو بکر الجصاص فرماتے ہیں کہ :
جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوا رشاد مروی ہوں اور ان
میں سے ایک پر سلف کا عمل ہو تو اسی کو ثابت کہا جائے گا۔ جس
پر سلف کا عمل ہے۔ یہ

دوسری صدی میں تعامل و ثورات کی طاقت اس درجہ معلوم تھی کہ اس دور کے مصنفین
اپنی کتابوں میں صرف ان حدیثوں کو اپناتے تھے جن کی پشت پر تعامل کی قوت ہوتی تھی
چنانچہ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں :

عِلَّتْ مِنَ الْحَدِيثِ مَا تَعْرِفُهُ الْعَامَّةُ - ۳

الغرض امام اعظم ابو حنیفہ اخبار آحاد کے مقبول ہونے کے لیے تعامل کے ہمنوا ہونے کی
شرط لگاتے تھے اور اسی معیار پر اخبار آحاد کو چاہتے تھے چنانچہ ایک سے زیادہ مسائل میں اسی
معیار سے اخبار آحاد کو ناپا گیا ہے نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہیے یا بلند آواز سے - (۳۱)
موضوع پر ایک سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔ انس بن مالک کی صحیح مسلم کی حدیث بھی ابو حنیفہ
کی موید ہے۔ محدثین نے اس حدیث کو معطل قرار دیا ہے اور متن میں علت ہونے کی مثال
میں سب نے اس حدیث کو پیش کیا ہے چنانچہ الجزائری لکھتے ہیں :

فَعَلَّ قَتُومٌ دَوَايِئَ اللَّفْظِ الْمَذْكُورِ لِمَا رَأَوْا كَثْرَتَهُ انَّمَا قَالُوا

فِيهِ فَكَانُوا يَسْتَفْهَمُونَ --- الخ

کچھ لوگوں نے اس حدیث انس کو معطل قرار دیا ہے ۔

اور صاحب دراسات اللہیب نے دعویٰ کیا ہے کہ

هَذَا حَدِيثٌ بِسْمَلَةٍ قَدْ عُلِّلَ بِرَوَايَةِ مُسْلِمٍ لِبَيْعِ عُللِ

بِسْمَلَةٍ كِي حَدِيثٌ رَوَايَتِ مُسْلِمٍ فِي سَاتِ عُلِّلَ مَوْجُودٌ فِيهِ يَكْفِي

اگرچہ اس کا واضح اور ثنائی جواب حافظ ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں دے دیا ہے اور بتایا

ہے کہ اس موضوع پر حضرت انس کی حدیث میں کوئی اضطراب نہیں ہے سب کی سب

ہم آہنگ ہیں چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ۔

فاحادیث لیسر الصحیحة کلہا متلفۃ متفقۃ تبیین لہ نفی
الجهل بالقراءۃ وان لم یتکلم فی قراءتہا سر لا
بنفی ولا اثبات وحکم فلا اضطر اب فی احادیثہ
الصحیحة۔

حضرت انس کی ہماری حدیثیں مٹی جلی اور ہم آہنگ ہیں سب یہ بتا
رہی ہیں کہ قراۃت میں بسم اللہ باندہ و نہ سے نہیں پڑھی گئی تھی۔
پڑھی گئی یا نہیں اس سے حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے
حدیث انس مضطرب نہیں ہے۔

لیکن حافظ زبلی نے اس موضوع پر تواریث اور تعامل کا سہارے کر جو فیصد کن بات فرمائی
ہے وہ بھی گوش گزار فرمائیے۔

بسم اللہ کا نواز میں آہستہ پڑھتا تھا۔ میں حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ
میراث تھی جس پر لوگ چل رہے تھے اور صرف اتنی ہی بات نہ کہ
میں اطمینان کے لیے کافی ہے کیونکہ چہرہ نمازیں صبح و شام ہمیشہ پڑھی
گئی ہیں۔ اگر حضور النور کا اس موضوع پر کوئی بھی عمل ہوتا تو ہمیشہ اس
محسوس عمل میں کبھی تغلف نہ ہوتی یہ بات ہر کس و ناکس کو معلوم
ہوتی اور حضرت انس یوں نہ کہتے کہ حضور نے بسم اللہ نازل
بلکہ آواز سے پڑھی اور نہ غنائے۔ اور حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم
کی مسجد میں آہستہ پر عمل نہ ہوتا۔ اس کی جہت یہ تھی کہ ہر جگہ جو
ہماری معیشت میں مدد اور صاع کی تہہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری
کیونکہ نماز تو تمام مسلمانوں کا شہ آبی ہے۔ نیز نمازیں رات و دن
میں پانچ بار پڑھی جاتی ہیں۔ ایسے اشقیاء تو مسلمانوں میں مل سکتے
ہیں جن کو صاع اور مد کی نہ ورتے نہیں سکتے۔ اگر ان مسلمان تہہ

جسے نماز کی ضرورت نہ ہو اور پھر اکابر صحابہ کے بارے میں کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ خلاف پیغمبر پر موافقت کریں۔^۱ اس موقع پر حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں۔ اس کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہے۔ امور وجودیہ ہی وہ امور ہیں جن کے نقل کرنے اور یاد رکھنے کا عادت اور ہمتیں استہام کرتی ہیں اور ان کا نقل کرنا ضروری ہے۔ باقی رہا امور عدمی اور منقہی چیزیں۔ تو ان کے نقل کی نہ چنداں ضرورت ہوتی ہے اور نہ عادت اس کا کوئی اہتمام ہوتا ہے۔ اگر پانچ نمازوں کے علاوہ چھٹی نماز کی کوئی حدیث پیش کرے یا رمضان کے روزوں کے علاوہ کسی روزے کی فرضیت کا دعویٰ کرے یا رکعات نماز یا فریضہ زکوٰۃ میں کوئی انکشاف کرے تو ہم اس کو بلا ریب غلط اور جھوٹ کہیں گے اور دلیل ہمارے پاس اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا ہونا منقول ہوتا۔ منقول نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ بس یہی بسم اللہ کو بلند آواز سے نہ پڑھنے کی دلیل سے ملے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر اسی معیار سے رفع یدین کے موضوع پر اخبار آحاد کو ناپ بیچتے تبکیر تحریر کی حد تک تو رفع یدین کا مستند امت میں اتفاق ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ

لَمْ يَخْتَلَفُوا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ

يَدَيْهِ حِينَ يَفْتَحُ الصَّلَاةَ -

تبکیر تحریر کے وقت رفع یدین میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔

اگرچہ حافظ ابن خزم نے مطلق رفع یدین میں تواثر کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے جیسا کہ ان سے علامہ محمد معین سندھی نے دراسات البیہب میں نقل کیا ہے کہ :

ان احادیث الرفع فی کل خفض و رفع متواترة لتوجب لعین العلم^۲

لیکن جیسا کہ آپ پہلے سن آئے ہیں کہ دوسرے علماء کو ان کے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ صرف تبکیر افتتاح کے وقت رفع یدین متواتر ہے۔ چنانچہ علامہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے تنقیح الانظار میں، علامہ محمد بن اسماعیل نے توضیح الافکار میں اور حافظ زین الدین عراقی کی تصریحات اس موضوع پر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ چونکہ تبکیر تحریمہ کے وقت رفع یدین متواتر ہے اس لیے اس میں علماء کی کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ رفع یدین کے موضوع پر اگر اختلاف ہے تو تبکیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر ہے۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ مشہور روایت حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے۔ یہ روایت خود مواقع رفع یدین میں مختلف ہے چنانچہ حضرت ابن عمر کی روایت بطریق سالم میں تین مواقع پر مذکور ہے، تبکیر تحریمہ، عند الکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت۔ اور بطریق نافع میں قعدۃ اولیٰ سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین مذکور ہے اور دونوں بخاری کی روایات ہیں۔ نیز طبرانی کی روایت میں ایک پانچواں رفع یدین سجدہ میں جلتے وقت بھی مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

و عند الکبیر حین یھوی ساجداً

اور صاحب دراست اللیب نے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے بین السجدتین رفع یدین کو حضرت انس، الحسن اور ابن سیرین کے حوالہ سے پیش کیا ہے اور علامہ ابن دقیق العید نے شرح النعمہ میں بین السجدتین رفع یدین کو قانونی قرار دیا ہے اور علامہ عراقی نے بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اسے سراہا ہے وہ فرماتے ہیں۔

ھی مثبتۃ و ھی مقدمۃ علی المنفی

امام اعظم نے ان اخبار آحاد کو توارث سے معارض ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا اور ان تمام مواقع میں سے صرف اس رفع یدین کو اختیار فرمایا جو اسناداً متواتر ہے اور جسے توارث کی تائید حاصل ہے یعنی تبکیر تحریمہ کے وقت۔ انہوں نے ان روایات کا جس روشنی میں مطالعہ فرمایا وہ اُمت کا عمل متواتر ہے۔ کیونکہ کوفہ میں اصحاب امیر المومنین علی مرتضیٰ اور اصحاب عبداللہ بن مسعود رفع یدین نہ کرتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر نے کوفہ کی پوری آبادی کے بارے میں مشہور محدث محمد بن نصر مروزی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ :

لا فعمله مصلً من الامصار تركوا رفع الیدین باجماعهم
عند الحفص والس رفع الا اهل الكوفة۔^۱

کوفہ کے سوا تمام شہروں میں ایسا کوئی شہر ہمیں معلوم نہیں جس کی
آبادی نے بالاتفاق رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین
چھوڑا ہو۔

اور یہی حال زمانہ امام مالک میں مدینہ طیبہ کا ہے۔ چنانچہ ابن رشد نے بدایہ میں اسی کو امام
مالک کے روایت ترک کو اختیار کرنے کی بنیاد بتایا ہے وہ فرماتے ہیں :
ان السبب لروایۃ الترتک عن مالک هو عمل المدینۃ
اذ ذاک فلما اعدوا العظیم لعلہ مبنی علی الترتک
امام مالک سے ترک رفع یدین کی روایت آنے کا سبب اہل مدینہ کا
عمل ہے۔

مکہ میں رفع یدین عبد اللہ بن الزبیر کے زمانے میں شروع ہوا اس سے قبل اہل مکہ کا عمل ترک
رفع یدین ہے جیسا کہ میمون مکی کے سوال ابن عباس اور اس انداز بیان سے کہ لہذا ارجحاً
بصیلتها ظاہر ہے۔

جب کوفہ، مدینہ اور مکہ کے فقہاء اس پر عمل کر رہے ہیں تو یہ تعامل اور توارث نہیں تو
اور کیا ہے؟ بس اسی پیمانے پر احادیث رفع یدین کو امام اعظم نے ناپ کر صرف تکمیر تحریم
والے رفع یدین کو اختیار فرمایا اور باقی کو خلاف اولیٰ قرار دیا۔ واضح ہے کہ رفع یدین میں
اختلاف جواز اور عدم جواز میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں،
حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ اور فتاویٰ میں اور حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے
صرف اولویت اور عدم اولویت میں ہے۔

بہر حال امام اعظم انجاء آحاد کو توارث اور تعامل کی ترازو میں تولتے ہیں۔ حافظ ابن عرب
حنبل نے اسے ائمہ فقہاء اور محدثین کا فیصلہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فضل علم سلف علی الخلف
میں رقمطراز ہیں۔

فاما الائمة و فقہاء اهل الحديث فانهم يتبعون
الحديث الصحيح حيث كان، اذا كان معمولاً به عند الصحابة
ومن بعدهم، وعند طائفة منهم فاما ما اتفق على
تركه فلا يجوز العمل به لانهم ما تركوه الا على علم
انهم لا يعمل به۔

ائمہ مجتہدین اور فقہاء محدثین حدیث صحیح کی پیروی کرتے ہیں بشرطیکہ
وہ صحابہ اور تابعین میں معمول بہ ہو یا ان میں سے کسی گروہ کے
نزدیک اگر حدیث ایسی ہو جس کے چھوڑنے پر وہ متفق ہو چکے
تو اس پر عمل جائز نہیں ہے کیونکہ انہوں نے بہر حال یہ جان کر
ہی چھوڑا ہے کہ یہ ناقابلِ عمل ہے۔

امام ترمذی نے سنن میں اسی کو اپنا پایہ ترمذی کا مطالعہ کیجئے وہ قدم قدم پر ہر موضوع
پر حدیث لکھتے ہیں اور پھر اس کی تائید میں اُمت کا عمل یہ کہہ کر پیش فرماتے ہیں والاعمل
على هذا عند اهل العلم۔ اس سے ان کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اس حدیث کو
صحابہ و تابعین کی عملی تائید حاصل ہے اس لیے یہ صحیح ہے اور یہ ترمذی کی خصوصیت نہیں
بلکہ تمام اہل علم کا مسلک یہی ہے سکھ بند ظاہر یہ کو چھوڑ کر سب یہی کہتے ہیں علامہ محمد معین
سندھی نے نہ معلوم کس دلیل کی قوت سے یہ دعویٰ کیا ہے۔

ليس احد من المحدثين يلفت في صحة الحديث وحسنه

الى اشتراط اخذ اهل العلم له

محدثین میں سے کوئی بھی حدیث کی صحت یا حسن میں یہ شرط نہیں
لگاتا کہ اسے اہل علم کی عملی تائید حاصل ہو۔

اس کے بعد خود ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ امام ترمذی کا سنن میں طرزِ عمل یہی ہے۔
اولاً امام ترمذی کے عمل کے لیے تاویل کا جامہ تلاش کرنا شروع کیا۔ جب تاویل چست نہ بیٹھی
اور بات بنانے کے باوجود نہ بنی تو یہ کہہ کر طرح دے گئے کہ

وان كان الترمذی يرى ذالك فهو مما اختص به على
خلاف جماهير العلماء - ۱۷

پتہ نہیں وہ جماہیر علماء کون سے ہیں جو اس موضوع پر امام ترمذی کے مخالف ہیں۔ امام مالک کی تصریح خطیب بغدادی اور ابن عبد البر کی زبانی ابو داؤد صاحب سنن کی سنن میں، محدث عثمان الدارمی کا بیان امام بیہقی کی معرفت، حافظ ابن حجر عسقلانی کا فتح الباری میں بیان، حافظ ابن رجب کا وضاحتی نوٹ اور حافظ ابوبکر الجصاص رازی کا اعلان آپ پہلے اس موضوع پر پڑھ چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث ازالۃ الخفا میں فرماتے ہیں :

اتفاق سلف و توارث ایشان اصل عظیم است در فقہ
در اصل یہ بات جس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہی گئی ہے وہ کچھ اور ہے اگر وہ واضح ہو کر سامنے آجائے تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

اعمال و اقوال صحابہ کا اسلام میں مقام

اصل بات یہ ہے کہ محدثین اور فقہاء کے یہاں اعمال و اقوال اور فتاویٰ صحابہ سب حجت ہیں ان کو وہ قبول کرتے ہیں۔ ان میں اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ انداز قبول میں ہے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں :

اگر مجھے کتاب و سنت میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو میں اقوال صحابہ پر عمل کرتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کے اقوال سے تجاوز کر کے کسی اور کا قول لوں بلکہ

امام مالک تبصرہ کے اعمال و اقوال کو سنت کا درجہ دیتے ہیں وہ فتویٰ صحابی اور حدیث کے مابین موازنہ کرتے تھے چونکہ ان کا بر کے یہاں صحابہ کے اعمال و اقوال کا یہ وزن ہے اس لیے ان کے یہاں احادیث کی سحت اور مختلف حدیثوں میں ترجیح کا معیار بھی یہی ہے صرف شیعہ کو اس سے اختلاف ہے وہ صحابہ کے اعمال و اقوال کو قابل احتجاج قرار نہیں دیتے

پس حافظ ابن القیم نے جمہور کے مذہب کو ۶۶ دلائل سے ثابت کیا ہے اور بلاشبہ وہ دلائل قوی اور مؤثر ہیں۔ لیکن یہاں ان کی تفصیل موجب طوالت ہوگی لہٰذا آخری دور میں علامہ شوکانی نے اپنی کتاب ارشاد النحول میں محدثین و فقہاء کے اس مسک پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اقوال صحابہ حجت نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں:

حق یہ ہے کہ قول صحابی حجت نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو امت کے لیے مبعوث نہیں فرمایا ہے اور ہمارا رسول ایک ہے، کتاب ایک ہے اور جمیع امت اتباع کتاب و سنت پر مامور ہے پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ کے دین میں بغیر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے یہ قول حجت ہے تو وہ دین میں ایسی بات کہتا ہے جو ثابت نہیں اور شریعت اسلامیہ میں ایسی شرع ایجاد کرتا ہے جس کی پیروی کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے اور ایسا کہنا بہت بڑی بات ہے لہٰذا اللہ کے سوا کسی ایک یا چند بندوں کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ اس کا یا ان کا قول مسلمانوں پر حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے غلط ہے یہ

ظاہر ہے کہ اس ذہنی سنگینی کے بعد اخبار آحاد کو اعمال صحابہ میں تو لے کر جانچنے کی گنجائش کب گوارا ہو سکتی ہے۔ سندھ کے مشہور عالم محمد معین نے اسی بنا پر لکھ دیا ہے کہ
و یترک عمل الصحابة الثابت عنہم بالمحدث الضعیف
صحابہ سے ثابت شدہ اعمال کو حدیث ضعیف کی وجہ سے بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

اور تقلید کی تردید کے جوش میں یہاں تک فرما گئے کہ

۱۔ اس سلسلے میں حافظ ابن القیم کی اعلام المتوفعین کی جلد چہارم از ص ۱۲۰ تا ۱۵۲ کا مطالعہ مفید ہے اس میں بے حد مفید علمی جواہر پائے ہیں۔ ۲۔ ارشاد النحول الی تحقیق الحق فی علم الاصول ص ۲۱۴۔ ۳۔ دراسات اللیبب ص ۸۶۔

التمسك بأثر الصحابة عند وجدان المرفوع الصحيح

على خلافه، تمسك ضعیف

جب حدیث مرفوع موجود ہو تو آثار صحابہ کو اختیار کرنا ایک غلط

استدلال ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اسلام کا سارا علمی سرمایہ روایت و اسناد کی پستی تلی ترازو کے ذریعے صرف حدیث مرفوع کی صورت میں اُمت کو ملا ہے حالانکہ صورت معاملہ یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جسے ہم سنت کہتے ہیں وہ صحابی کی محسوس اور مرنی زندگی کے ذریعے آئی ہے انہوں نے ہر سنی ہوئی حدیث کو نہ روایت کیا ہے اور نہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس موقع پر حافظ ابن القیم مفید بات فرما گئے ہیں :

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام نے حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سنی ہوئی حدیث کو روایت نہیں کیا سوچتے حضرت ابو بکر الصدیق اور حضرت فاروق اعظم اور دوسرے کبار صحابہ نے جو کچھ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۳ سالہ حیات نبوت میں سنا ہو گا اس کو کچھ بھی اس سے نسبت ہے جو حدیثوں کی مقدار ان سے مروی ہے حضرت ابو بکر سے صرف سو حدیثیں مروی ہیں۔ درآں حالیکہ حضرت ابو بکر وفات تک حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے حضور النور کی کوئی بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے حضرت ابو بکر کو مشرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قول و فعل کا علم رہا۔ آپ کی سیرت و کردار کا ہر پہلو ان کی نظر کے سامنے تھا۔ اُمت میں سب سے زیادہ حضور النور سے ابو بکر ہی واقف تھے۔ یہی حال دوسرے کبار صحابہ کا ہے یعنی جو کچھ انہوں نے حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا یا جو آپ کے حالات مشاہدہ کیے تھے ان کے مقابلے میں ان کی

مرویات کی تعداد بہت کم ہے اور اگر یہ اپنے مشاہدات اور سموعات کو روایت کرتے تو ان کی روایات کی تعداد حضرت ابو ہریرہ سے کہیں زیادہ ہوتی۔

ان بزرگوں سے روایات کم آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ سنت چونکہ صحابہ کی عملی زندگی میں موجود تھی اس لیے اس کا کوئی داعیہ ہی نہ تھا۔ اور یہ عملی زندگی ان سے منتقل ہو کر تابعین میں آئی ہے اور تابعین میں اس کا داعیہ پیدا ہوا۔

ذرا اس پہلو پر غور فرمائیے کہ ایک طرف اُمت کا عمل ہے اور دوسری طرف راوی کی شہادت ہے۔ اُمت کو یقیناً عصمت حاصل ہے لیکن راوی کی روایت کو عصمت نہیں بلکہ صرف اصطلاحی صحت کا مقام دیا گیا ہے۔ یہ مان لینا ہے کہ راوی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا یا حافظہ غلط ہو گیا لیکن یہ کہ خیر القرون میں پوری اُمت پیغمبر کے خلاف جمع ہو گئی ہونا ممکن ہے یہ تو اثر عمل ہے اور اس کے خلاف جب بھی ایک شخص کی روایت چیلنج بن کر آئے گی اس کی صحت متدوہ ہو جائے گی۔

یہ ارشاد نبوت کو رد کرنا نہیں بلکہ ارشاد ہی کے ثبوت کا ایک استحکم اور محتاط معیار ہے۔

اخبارِ احاد میں مفاہمت اور امامِ اعظمؒ

اللہ سبحانہ نے حضورِ نور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے
ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

پھر ہم نے تم کو الامر کی صاف راہ پر لگایا ہے اسی کی پیروی کیجئے اور بے علم لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

مشریعت من الامر کے معنی ہیں امر کی راہ۔ امر یا امور کا واحد ہے اور یا اوامر کا۔ اگر امور کا واحد ہے تو مقصود یہ ہے کہ آپ کو زندگی کے حقائق کو پورا کرنے کی راہ اللہ نے بتادی ہے اور اگر اوامر کا واحد ہے تو مطلب یہ ہے کہ آئینی اور قانونی اقدار کی راہ پر ہم نے تم کو

نکادیا ہے۔ شرعیہ کے معنی راہ کے آتے ہیں دونوں صورتوں میں آیت کا مدلول یہ ہے کہ سلام کی شریعت صاف اور واضح ہے اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں الشریعة لا تعارض فیہا البتہ لیکن چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی زندگی کی پوری تاریخ ہم تک شہور و سنین کی تبعیدیں اور ایام کی ترتیب سے نہیں پہنچی اور کچھ صحابہ کے ذریعے پہنچی اس میں بھی بعد کوراویوں نے روایت بالمعنی کی ہے اس لیے ہماری نگاہ میں تعارض محسوس ہوتا ہے اور تعارض کا حاصل یہ ہے کہ

ان یاقی حدیثان متضادان فی المعنی ظاہراً
اس تضاد کو دور کرنے کا موضوع اہم ترین موضوع ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ کام صرف محدثین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ فقیہ ہو۔ چنانچہ حافظ ابوبکر حازمی فرماتے ہیں :

ذالك من وظيفة الفقهاء لان قصدهم اثبات
الاحکام و مجال نظرهم في ذلك متبع
یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ حدیث میں ان کا مطلع نظر احکام ثابت
کرنا ہوتا ہے اور اس موضوع پر ان کی فکری جولانیاں وسیع ہیں یہ
اور امام نووی فرماتے ہیں :

انما یجمل له الائمة الجامعون بین الفقه والحديث
والاصوليون لخصوا صون على المعاني
یہ کام زیبا ہے ان ائمہ کے لیے جن میں حدیث و فقہ کی نشان
جامعیت پائی جاتی ہے اور وہ اصولیین جو معانی کی گہرائی
میں اترے ہیں یہ

حافظ سخاوی کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم قسطنطاز ہیں :
هذا فن تكم فيه الائمة الجامعون بین الفقه
والحديث وقواعد مقترنة فی اصول الفقه

اس موضوع پر ان اماموں نے لب کشائی فرمائی ہے جو حدیث و فقہ

کے جامع ہیں اور اس کے قواعد اصول فقہ میں مقرر ہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام باہم ہونے کے ساتھ بے حد نزاکت بھی رکھتا ہے اس کی نزاکت یہ ہے کہ یہ ایک کام نہیں بلکہ اس میں بیک وقت متعدد کاموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مختلف احادیث میں منافعت کرائی پڑتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شریعت کے سارے احکام باہم ٹکرا جائیں اور شرعی و قانونی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت نہ رہے۔ حافظ ابن حزم نے اس سلسلے میں جس فراخ دلی کا یہ فرما کر مظاہرہ کیا ہے کہ

اذا تعارض الحدیثان - ففرض علی مسلم استعمال کل ذلک

اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو ہر مسلم کا فرض یہ ہے کہ سب پر ہی عمل کرے۔

یقیناً ایک منفرد زندگی کے لیے آزادی کی حد تک یہ ایک خوبی کی بات ہے لیکن تشریح جب اجتماعی زندگی میں نظم کی مضبوطی، عمل کی سختگی اور توازن اور فکر کی استقامت قائم کرنا چاہیے تو ان کی خوبیوں سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے اس فراخ دلانہ آزادی کے ساتھ یہاں حد بندی کا کوئی خط خود زندگی کا ایک باہم تقاضا ہے جو ان تمام کی پوری پوری ضمانت دے سکے۔ آئین و قانون کے تمام احکام ان ہی حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور ابھرنے ہیں یہ خطوط جو نہیں بنے لگتے ہیں۔ نظام قانون کی پوری عمارت ہل جاتی ہے۔ بلاشبہ ہر حدیث پر عمل کرنے کی آزادی کا پروانہ ایک بہت بڑی فراخ دلی ہے لیکن حیات اجتماعی میں یہی آزادی ہوائے نفس سے ہمدوش ہو کر بے راہ روی کے نام سے پکاری جاتی ہے ماننا پڑے گا کہ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا ایک منفرد زندگی کے دائرہ کار کی حد تک حافظ ابن سزمن نے سوچا ہے بلکہ یہاں زندگی کے حقائق کے تقاضے کچھ اور بھی ہیں۔ کسی ایک گوشہ ہی کو سامنے رکھ کر نہ سوچنا چاہیے دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی ضروری ہے۔ یقیناً اگر ہمیں اخبار احاد میں آئین و قانون کی اقدار کو پہچاننے کے لیے کبھی منافعت کرائی پڑتی ہے تو کبھی دو حدیثوں میں راجح و مرجوح قرار دینا پڑتا ہے۔ اور

ن کے ساتھ ہی اگر ہماری نظر تاریخ احکام پر ہے اور ہمیں کسی طریق سے دونوں میں سے
س کا پہلے ہونا اور دوسرے کا بعد میں ہونا معلوم ہو گیا ہے تو ایک کو کالعدم قرار دینا
تا ہے اور اس کے لیے ہمیں نبوت کی جانب سے نسخ کی صراحت کا انتظار ضروری نہیں ہے
انٹوس ہے کہ علامہ معین سندھی نے ریاسات میں اتنی موٹی سی بات کو یہ کہہ کر پیچیدہ
دیا کہ

لیس نسخ الحديث بالحديث فان ذلك لا يتحقق لا بصريح
النسخ المرفوع الى رسول الله صلى الله عليه وسلم
یہ حدیث کا حدیث سے نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کے ثابت ہونے
کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت نسخ ثابت ہونا چاہیے
گویا موصوف نے یہ فرض کر لیا ہے کہ حدیث کے نام پر جو تاریخ سنت محدثین کی روایات
مدون ہوئی وہ پوری کی پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب و مدون ہوئی ہے حالانکہ
رت معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ حضور انور کی پوری ۲۳ سالہ زندگی میں سنت کی یہ
نسخ کیف ما اتفق امت کو ملی ہے اور وہ بھی صحابہ سے راویوں نے سن کر اپنے الفاظ
حدیث تک پہنچائی ہے اور ہر محدث حافظ تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے
کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کے مغز سخن کو سمجھ کر ہی کہہ رہا ہے۔ مشہور محدث محمد بن المنثنی
حدیث یاد بخشتی۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی الی عنزة
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عنزہ (نیزہ) کو سترہ بنا کر نماز پڑھی۔
لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ محمد بن المنثنی جو ائمہ ستہ حدیث کے شیوخ میں
ہیں یعنی امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ کے
ہیں اور جن کا تعلق قبیلہ عنزہ سے ہے وہ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھتے ہیں
کہ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عنزہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے اور
مطلب کے سہائے وہ اپنے عنزی ہونے پر ناز کرتے تھے اور کہتے تھے۔

نحن قوم لنا شرف نحن من عنزة صلى الله عليه وسلم
 صلى الله عليه وسلم

ہماری قوم کو شرف حاصل ہے کہ ہم قبیلہ عنزہ سے ہیں ہماری
 طرف رسول اللہ علیہ وسلم نے ناز پڑھی ہے

امام حاکم نے اسی حدیث میں ایک اور راوی کی کہانی بتائی ہے کہ وہ اس میں عنزہ کو ثنا
 (بکرمی) کے معنی میں سمجھتا تھا اور روایت بالمعنی اس طرح کرتا تھا کہ
 صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الى شاة يله

ان حالات میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ جب تک نسخ کی صراحت نہ ہو نسخ کا فیصلہ نہ
 ہو سکتا۔ زندگی کے تقاضوں اور قانونی ضروریات کو نظر انداز کر کے محض جذباتی نعرہ لگ
 اور کہنا کہ تعارض کے وقت میں دو حدیثوں میں سے ایک کو منسوخ کہنا شریعت کے مقابلہ
 میں بے باکانہ جرات ہے نعرے کی حد تک تو درست ہے لیکن حقائق اور واقعات کی دنیا
 اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ خود محدثین نے اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے البتہ اس
 علماء کے افکار مختلف ہیں کہ ان تینوں مفاہمت، ترجیح اور نسخ میں سے احاد میں تعارض
 کے وقت کس کا پلٹر بھاری ہے لیکن اس قدر مشترک پر سب ہی متفق ہیں کہ روایتی
 اسنادی حیثیت سے اگر دونوں حدیثیں ایک جیسی ہوں اور تاریخ احکام کے نقطہ
 ان کی تقدیم و تاخیر کا پتہ ہو یا خیر القرون میں امت نے کسی ایک کو عمل اپنایا تو چہر ایک
 کا لعدم اور دوسری کو معمول بہ قرار دیا جائے گا۔ ایسا ممکن نہ ہو تو مفاہمت اور ترجیح۔
 کام لیا جائے گا۔ مفاہمت یہ ہے کہ دو حدیثوں میں ہم آمبگی اس طرح پیدا کی جائے کہ دو
 زندگی کے حقائق کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ مفاہمت قانون کی ایک بنیادی ضرورت ہے
 اخبار احاد میں تشریحی زندگی کے مفاہمت ہی کا نام ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک سے
 مقامات پر تصریح کی ہے کہ اہمال حدیث سے جمع بین الحدیثین زیادہ بہتر ہے۔ امام حاکم
 نے مفاہمت ہی کو عموم فائدہ کا حامل قرار دیا ہے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے مخرج معانی
 میں ایک مقام پر اسی سلسلے میں یہ ضابطہ لکھا ہے :

اولی الاشیاء اذا روى حدیثان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فاحتملا الاتفاق واحتملا التضاد ان تحملهما على الاتفاق -

اچھا یہی ہے کہ دو حدیثوں میں باہم مفاہمت کرائی جائے یہ
حضرت مولانا عبدالحی نے علامہ ابن امیر الحاج کے حوالہ سے نقل کیا ہے
الجمع متعین عند الامکان اذا دار الامر بینہ و بین اھدر
العمل باھدھما بالکلیۃ -

جب صورت حال یہ ہو جائے کہ مفاہمت ہو ورنہ دونوں میں سے
ایک ہاتھ سے جائے گی تو مفاہمت ضروری ہے یہ
مفاہمت کے موضوع پر امام اعظم کی ذہانت اور فطانت کو سب نے سراہا ہے احکام تو احکام
غیر احکام سے متعلق احادیث میں مفاہمت کے لیے بھی امام اعظم کی ذات گرامی محدثین کے
یہاں استدلالی ہے -

دنیا میں اسلام کے رونما ہونے کے بعد اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کا سب سے پہلے
شرف کسے حاصل ہوا ہے؟ یہ سیرت و تاریخ کا اہم بحث ہے اور اختلاف روایات کی وجہ سے
فقہاء مدینہ میں بھی اس میں اختلاف رہا ہے اور ویرکبار تابعین میں فقہاء کوفہ بھی اس میں
مختلف ہیں۔ کئی حدیثوں میں اولین مسلم حضرت علی کو بتایا گیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کی
حدیثوں میں یہ شرف حضرت ابو بکر کو دیا گیا ہے کچھ روایات میں حضرت خدیجہ البکری کا نام
آیا ہے اور بعض حدیثوں میں حضرت زید بن حارثہ کو سب سے پہلا مسلمان ظاہر کیا گیا ہے
محدثین نے ان روایات میں روایتی نقطہ نظر سے تحلیل کا کام کیا اور خالص محدثانہ نظر سے
ان پر بحث فرمائی۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس ساری داستان کو لکھنے کے بعد جو فیصلہ کن
بات فرمائی ہے وہ یہ نہیں کہ ان روایات میں راجح کون ہے؟ بلکہ اس موقع پر انہوں نے
حضرت امام اعظم کا وہ فیصلہ لکھ دیا ہے جس میں امام صاحب نے ان حدیثوں میں مفاہمت
کا فارمولا پیش کیا ہے :

قد اجاب ابو حنیفۃ بالجمع بین هذه الاقوال ان اول
من اسلم من الرجال الاحرار ابو بکر و من النساء خدیجۃ
و من الموالی زید بن حارثہ و من الخلمان علی بن ابی طالب -
ابو حنیفہ نے ان سب میں اس طرح ہم آمیگی پیدا کر دی ہے کہ
آزاد مردوں میں سے اسلام لانے کی اولیت کا شرف ابو بکر کو
عورتوں میں سے خدیجہ الکبریٰ کو غلاموں میں سے زید کو اور ترکوں
میں سے علی مرتضیٰ کو حاصل ہوا ہے یہ

احکام اور فقہ پر مشتمل حدیثوں میں مفاہمت کی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہاں
ہم تطویل سے بچتے ہوئے اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ
مفاہمت کے موضوع پر امام اعظم کی خداوند ہانت کا صحیح انداز ہو سکے۔

رفع یدین کی صورت

نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت جو رفع یدین کیا جاتا ہے اس کی کیفیت میں روایات مختلف
آئی ہیں حافظ ابن حجر نے تلخیص میں ساری روایات سمیٹ دی ہیں اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار
میں بھی سب روایات کو یکجا کیا ہے ان میں ابن عمر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیه حد
منکبیه اذا افتتح الصلاۃ -

حضور انور نماز کے آغاز میں مؤذنین تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔

ابو داؤد، نسائی میں وائل کی روایت میں یہ الفاظ ہیں

یرفع ابهامیه الی شحمة اذنیہ

آپ اپنے دونوں انگوٹھوں کو کانوں کی پاڑوں تک اٹھاتے تھے

احمد اور مسلم میں ابو قلادہ کی روایت میں ہے

کان اذا کبر رفع یدیه حتی یحاذی بہما اذنیہ

ہاتھ اٹھاتے وقت دونوں ہاتھ کانوں کے سامنے ہوتے تھے۔
 حذو منکبین یعنی مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانے کو علامہ ابن دقیق العید نے امام شافعی کا مذہب
 دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں ہو اختیار الشافعی فی منتہی الرفع اور مذکورہ بالا حدیثوں میں
 محدثانہ نقطہ نظر سے بلحاظ قوت سند حدیث ابن عمر کو راجح قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :
 وراجح مذهب الشافعی بقوة السند لحديث ابن عمر
 امام شافعی کے مذہب کو قوت سند کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے
 علامہ شوکانی نے بھی قوت سند ہی کو پیش نظر رکھ کر ان حدیثوں کے ساتھ ترجیح کا معاملہ فرمایا
 لیکن امام اعظم نے تجرید تحریر کے وقت رفع یدین کی جو صورت بتائی ہے کہ
 ید رفع یدین حتیٰ یجازی بابہا مین شتمتی اذنیہ
 رفع یدین اس طرح کرے کہ ہاتھ کے دونوں انگوٹھے کانوں کی پاٹریوں
 کے آمنے سامنے ہو جائیں بلکہ

تو اس سے انہوں نے ان حدیثوں کے بائے میں اپنا موقف واضح فرما دیا کہ وہ اس موضوع
 ائی ہوئی حدیثوں میں ترجیح کو نہیں بلکہ مفاہمت کو اپناتے ہیں اور مفاہمت اس طرح
 کہ جب انگوٹھے کان کی پاٹری سے متصل ہوں گے تو ہاتھ کا بالائی حصہ اگر کانوں کے
 منے ہو گا تو ہاتھ کا زیرین حصہ مونڈھوں کے محاذ میں ہو گا اور اس طرح ابن عمر، وائل
 مالک بن الحویرث کی تمام مختلف روایات میں مفاہمت ہو گئی۔ اور یہ میری ذاتی رائے
 میں ہدایہ کے مشہور شارح حافظ ابن الہمام نے بھی رفع یدین کی اس صورت سے یہی نتیجہ
 لایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

ولا معارضة فان محاذات الشتمین بالابہا مین تسوغ

حکایۃ محاذات الیدین بالمنکبین والاذنین

ان حدیثوں میں کوئی معارضہ نہیں ہے کیونکہ جب انگوٹھے پاٹریوں کے
 سامنے ہوں گے تو ہاتھ کانوں اور مونڈھوں کے سامنے آجائیں گے بلکہ
 روایات میں ہر راوی کا بیان اپنی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ تجرید تحریر کے وقت ہاتھ

اٹھانے کی مدت قلیل ہوتی ہے۔ ہر شخص کی اضطراری نگاہ ہاتھ کے جس حصہ پر پڑی اسی کا رو
میں اظہار کر دیا۔

ہبہ کی واپسی پر احادیث میں منفا ہمت

حدیث میں آتا ہے

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم العائد
في هبته كالكلب يعود الى قيئه

حنور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہبہ لے کر واپس لینے والا
ایسا ہے جیسے کتا کہ قے کر کے چاٹنے لے

یہ حدیث امام بخاری اپنی صحیح میں دو طریق سے لائے ہیں ایک بحوالہ سعید بن مسیب اور
دوسری بحوالہ عکرمہ۔ دونوں حدیثوں کی وجہ سے امام بخاری نے پوری قطعیت کے ساتھ
فیصلہ فرمایا ہے کہ

لا یحل لاحد ان یرجع فی ہبته و ما قتلہ

ہبہ اور صدقہ کو لے کر واپس لینا کسی کے لیے روا نہیں ہے

لیکن اس کے ساتھ ایک دوسری حدیث بھی آتی ہے

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا یرجع فی ہبته
الا اموالہ من ولده

ہبہ کر کے واپس کا حق کسی کو نہیں ہے سوائے والد کے کہ وہ اپنے
لڑکے سے لے کر واپس لے سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حدیث ابن عباس کی صرف ظاہری سطح کو دیکھا کہ ہبہ لے کر واپس
کو کتنے قے چاٹنے سے تشبیہ دی ہے انہوں نے ہبہ کی واپسی کے لیے حرمت کا فیصلہ
کر دیا اس لیے کہ قے ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام ہے لیکن امام احمد نے یہاں صراحت
پر مہنیں دیکھا کہ قے سے تشبیہ دی ہے بلکہ تشبیہ پر بڑے گہرے غور کے بعد بتایا کہ

واقعی ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام بھی ہوتی ہے لیکن حضور انور نے جو تشبیہ دی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہمہ دے کر واپس لینے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹے۔ بلکہ تشبیہ یہ ہے کہ ہمہ دے کر واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹے۔ ظاہر ہے کہ قے حرام ہے لیکن کتے کے لیے حرام نہیں ہے کیونکہ حلت و حرمت کا تعلق تکلیف سے ہے اور کتا مکلف نہیں ہے اس لیے حدیث کی روح یہ ہے کہ ہمہ کی واپسی مکروہ اور خلاف اولی ہوگی۔ اگر تشبیہ آدمی سے دی جاتی تو پھر ہمہ کی واپسی حرام ہوتی کیونکہ آدمی کے لیے حرام ہے اور یہ کراہت بھی اس وقت ہے جب کہ موہوب لہ ہمہ کنندہ کا قریبی رشتہ دار نہ ہو اور موہوب لہ کی جانب سے ہمہ کنندہ کو اس کا کوئی بدل نہ ملا ہو اور یہ دونوں شرطیں امام اعظم نے دو حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر مقرر فرمائی ہیں۔ رشتہ داری کی شرط نسائی میں آئے ہوئے استثناء الا الوالد من ولدہ سے اخذ کی ہے اور بدل کی شرط دارقطنی اور ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے لی ہے۔

الرجل احق بمہبتہ مالم یثب منها

ہمہ کا حقدار ہے جب تک اس کا بدل نہ پائے

دیکھ لیجئے کس شاندار طریق سے تمام ارشادات کے درمیان مفاہمت ہو گئی۔

ارشاد نبوت اور صحابی کے فتویٰ میں مفاہمت

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا شرب

الکلب فی اناء احدکم فلیغسلہ سبغاً۔

تمہارے برتن میں جب کتا منہ ڈالے تو چاہیے کہ اسے سات بار

دھو ڈالے۔

سنن دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہ کی دوسری حدیث ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغسل الاناء

من ولوغ الکلب ثلاثاً او خمساً او سبغاً۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتے کے برتن میں منہ

ڈالنے سے برتن کو تین یا پانچ یا سات بار دھویا جائے چہ
حافظ زبلی نے ابن عدی کے حوالہ سے ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ کی یہ بھی لکھی ہے
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دلیغ الکلب فی اناء
احدکم فلیہرقہ، ویغسلہ ثلاث مرات ۛ
برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے گرا کر تین بار دھوؤ۔
نیز دارقطنی نے اپنی سنن میں حضرت ابو ہریرہ کا یہ فتویٰ بھی روایت کیا ہے
اذا دلیغ الکلب فی الاناء فاهرقہ ثم اغسلہ ثلاث
مرات۔ ۛ

جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے اٹھاؤ اور اسے تین بار دھوؤ
اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ کا یہ عمل بھی نقل کیا ہے کہ
انہ کان اذا دلیغ الکلب فی الاناء اھرقہ وغسلہ ثلاث مرات
برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اسے گرا کر تین بار دھوتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ سے ان کا فتویٰ اور ان کا عمل نقل کرنے والے مشہور محدث و مجتہد حضرت
عطاء بن ابی رباح ہیں۔

محدثین نے اپنے روایتی مذاق کے مطابق ان حدیثوں کی اسنادی بحث کو سامنے رکھ کر سبع
کی روایت کو راجح قرار دیا اور تین کی مرفوع روایت میں عبد الوہاب پر افراد کا الزام لگا دیا اور
ابن عدی کی روایت میں احمد حسین کراچی پر یہ تنقید کی کہ ان کا تعلق لفظیہ سے ہے یعنی
ان لوگوں میں سے ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن کے جو الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں وہ مخلوق
ہیں۔ یہ کلامی مسائل میں امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہیں اور جو جرح ان پر کی گئی ہے
بالکل اسی قسم کی جرح امام بخاری پر بھی کی گئی ہے چنانچہ حافظ ابوالولید حسان بن محمد نیش
پوریؒ نے جب صحیح بخاری پر مستخرج لکھنے کا ارادہ کیا تو ان کے والد بزرگوار نے ان
کو ہدایت کی۔

علیک بکتاب مسلم فانہ اکثر بركة فان البخاری کان ینسب الی اللفظ

تمہیں مسلم کی کتاب پر مستخرج لکھنا چاہیے کہ اس میں برکت زیادہ ہے کیونکہ
امام بخاری مسئلہ لفظ کی طرف منسوب ہیں۔

چنانچہ سعادت مند بیٹے نے باپ کی تعمیل ارشاد میں بجاتے صحیح بخاری کے صحیح مسلم پر مستخرج
تصنیف کیا۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابوالولید مذکور کے ترجمہ میں اس واقعہ کو نقل کر کے
بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ

و مسلم ایضاً منسوب الی اللفظ والمسئلت مشکلتاً۔

اور خود امام مسلم پر بھی لفظیہ ہونے کا الزام معاملہ پیچیدہ ہے
اسی فکری اختلاف کی وجہ سے امام مسلم نے امام ذہبی سے جو تمام ارباب صحاح کے فن حدیث
میں استاد ہیں اور جن کو تلفظ بالقرآن کے مسئلہ پر امام بخاری سے سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ اپنی
صحیح میں روایت نہیں لی اور صرف امام ذہبی سے ہی نہیں بلکہ اس اختلاف کے نتیجے میں
امام مسلم نے امام بخاری سے بھی اپنی صحیح میں روایت نہیں لی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی
لکھتے ہیں :

قد انصف مسلم فلم یحدث فی کتابہ عن ہذا ولا عن ہذا

امام مسلم نے اچھا کیا ہے کہ اپنی کتاب میں کسی سے بھی روایت نہیں لی۔

بہر حال یہ علمی چٹمک کوئی تبحر کی بات نہیں ہے اور اس بنیاد پر نہ امام بخاری مجروح ہو
سکتے ہیں اور نہ کراہیسی۔ اس لیے حضرت ابو ہریرہ کی روایت کو شک کی نگاہوں سے نہیں دیکھا
جاسکتا۔ امام بیہقی نے اس روایت کو یہ کہہ کر درخود اعتناء نہیں سمجھا کہ

اس حدیث کا راوی عبد الملک تمام عطاء بن ابی رباح کے تلامذہ میں

اور پھر عطاء تمام ابو ہریرہ کے اصحاب میں سے اس روایت میں

منفرد ہیں حالانکہ عطاء اور ابو ہریرہ کے تلامذہ سب کے سب

سات بار کی روایت کر رہے ہیں۔ اس لیے عبد الملک کی روایت

مخالفتا ہونے کی وجہ سے قابل پذیرائی نہیں ہے۔

لیکن امام بیہقی کی یہ مغدرت اصول محدثین کے مطابق کچھ حجتی نہیں ہے جب کہ جمہور

محدثین اور فقہاء لکھتے ہیں کہ ثقہ کا تفرق قابل قبول ہے۔ عبد الملک بن ابی سلیمان مسلم کے راویوں میں سے ہے۔ اور تمام ارباب سنن نے ان سے روایت لی ہے۔ ابن سعد، ابن عمار موصلی، الثوری، ترمذی، احمد، یحییٰ اور نسائی ان کی ثقاہت اور امانت کے گن گاہے ہیں۔ امام شعبہ نے اگر ان سے حدیث شفعہ نہیں لی ہے تو خطیب کہتے ہیں کہ یہ ان کی بے انصافی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

شعبہ سے اس معاملہ میں بڑی بے انصافی ہوئی ہے کہ انہوں نے محمد بن عبد اللہ کی حدیث کو اپنا لیا اور عبد الملک بن ابی سلیمان کی حدیث کو چھوڑ دیا کیونکہ محمد بن عبد اللہ کی روایت کے غیر معتبر ہونے میں تمام محدثین متفق ہیں۔ برخلاف عبد الملک کے کہ ان کے بارے میں سب محدثین رطب اللسان ہیں اور ان کا تذکار حسن درجہ شہر کو پہنچا ہوا ہے۔

آئیے امام شعبہ کا وہ بیان بھی سن لیجئے جس کے سہارے امام بیہقی نے عبد الملک بن ابی سلیمان کو متروک اور ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

حدثنا نعیم بن حماد قال سمعت دکیعا یقول سمعت شعبۃ یقول لوروی عبد الملک بن ابی سلیمان حدیثاً آخر مثل حدیث الشفۃ طرحت حدیثہ

شعبہ کہتے ہیں کہ اگر عبد الملک حدیث شفعہ کے علاوہ کوئی اور حدیث روایت کرے گا تو میں اس کی حدیث کو پھینک دوں گا۔

کیوں؟ اس کی وجہ کوئی نہیں بتائی گئی۔ شعبہ کا یہ بیان ہمیں نعیم کی وساطت سے ملا ہے۔ نعیم کی خود شخصیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابو داؤد کہتے ہیں کہ نعیم کی بیس حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام نسائی ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ازہری لکھتے ہیں کہ:

کان نعیم یضع الحدیث فی تصویۃ السنۃ وحکایات نروہا فی ثلب نعان کما کذب۔

نعیم سنت کی تقویت کے لیے حدیثیں گھڑتے تھے اور امام ابو حنیفہ کے مشابہ ہیں جھوٹی حکایتیں بناتے تھے بلکہ

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ نعیم نے یہاں بھی اپنے گمان کے مطابق سات کے عدد کی سنت کو قومی سے قومی تر بنانے کے لیے مدافعانہ کارروائی کی ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ تین کی روایات کو مجروح کر دیا جائے اور اس کے لیے بیچاے عبد الملک کو نشانہ بنالیا ورنہ عبد الملک کو جملہ محدثین کی حمایت حاصل ہے اور سب کے نزدیک ثقہ ہیں ان کا قصور صرف یہ ہے کہ :

کان من ا حفظ اهل الكوفة - ۱۷

یہ کوفہ کے حفاظ حدیث میں سے ہیں۔

امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ حفاظ حدیث لوگوں میں یحییٰ بن سعید، عبد الملک بن ابی سلیمان، اور اسماعیل بن خالد ہیں۔ عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ امام شعبہ عبد الملک کے حافظ پر بے حد حیران ہوتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین سے عبد الملک کی حدیث شفعہ کے بارے میں جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ لوگوں نے اس حدیث پر گرفت کی ہے لیکن عبد الملک ثقہ ہیں، صدوق ہیں۔ ان جیسوں پر گرفت نہیں ہو سکتی۔

بہر حال محدثین نے اپنے نقطہ نظر سے ان حدیثوں میں رد و قبول کا رویہ اختیار کیا اور حافظ ابن القیم اور علامہ شوکانی کو تو یہاں تک جوش آگیا کہ

حدیث جب کسی موضوع پر صحیح ہو جائے اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسری حدیث صحیح نہ ہو ہمارا فرض یہی ہے کہ حدیث کو اپنائیں اور اس کے مخالف ہر چیز کو چھوڑ دیں اور ہم حدیث کو کسی کی بھی مخالفت کی وجہ سے نہ چھوڑیں گے خواہ وہ کوئی ہور اوہی یا غیر اوہی تھے

اور علامہ شوکانی رقمطراز ہیں

کسی حال میں بھی کسی کا قول حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں حجت نہیں ہے بلکہ

اتباع سنت کی حد تک تو یہ بات بالکل درست ہے اور واقعی ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہی ہے لیکن یہاں یہ بحث بے محل ہے کیونکہ یہاں حضور کے ارشاد کا مقابلہ حضور کے ارشاد سے ہے ایک وہ ارشاد ہے جو بخاری میں بحوالہ ابو ہریرہ ہے اور دوسرا ابو ہریرہ ہی کے حوالہ سے سنن دارقطنی میں ہے اور اس کی تائید میں حضرت ابو ہریرہ کا عمل اور ان کا فتویٰ یہی ہے ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر حضرت ابو ہریرہ کا یہ بیان درست ہے کہ حضور نے فرمایا کہ برتن میں کتا منہ ڈال دے تو تین مرتبہ دھویا جائے اور درست نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ روایت صحیح ہے اور اس پر ابو ہریرہ کا عمل بھی ہے اور عمل کے ساتھ اسی پر ابو ہریرہ فتویٰ بھی دے رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ کا یہ بیان بھی درست ہے کہ حضور نے فرمایا کہ برتن کو سات بار دھویا جائے تو یہ سوال یہاں بے حد اہم ہے کہ اس سات بار والے بیان کے ہوتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ نے تین پر کیونکہ عمل کیا اور اس پر فتویٰ کیوں دیا۔ حضرت ابو ہریرہ کے لیے تو ارشاد نبوت کا درجہ قطعیت میں آیت قرآنی کا ہے کیونکہ وہ خود حضور سے سنتے ہیں۔ یہاں حافظ ابو جعفر طحاوی کی یہ بات جی کو لگتی ہے کہ اگر حضرت ابو ہریرہ نے اس ارشاد کو محمد اترک کیا ہے تو اس سے ان کی عدالت پر حرف آتا ہے اور ان کی روایات کا سرمایہ ہی ناقابل قبول ہو جاتا ہے اس لیے ہم ایسا سوچنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ نے ان سب حدیثوں کو اور حضرت ابو ہریرہ کے فتویٰ اور عمل کو پیش نظر رکھ کر ان میں ایسی مفاہمت کر دی ہے کہ جس سے ان حدیثوں میں سے کوئی حدیث بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے ہے فرماتے ہیں کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات کا عدد استحباب کے لیے ہے۔ چنانچہ امام طحاوی فرماتے ہیں:

.. يحمل ما زاد على الثلاث في المرفوع والموقوف على ابى هريرة كليهما

على الاستحباب لورود التثليث في المرفوع والموقوف عند

تین سے زیادہ عدد کو مستحب قرار دیا جائے گا۔

اور حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں

طهارۃ الاناء الذی دلیغ فیہ، الکلب لا توقف علی السبع

بل تثبت قبل السبع بالثلاث على ما ذكره المحاكم في اشاراته
وهو ايضا مقتضى نقلهم عن ابى حنيفة وجوبها و
استحباب الامر بجهة بعدها -

جس برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا اس کا پاک ہونا سات پر موقوف
نہیں بلکہ وہ سات سے پہلے ہی تین سے پاک ہو چکا ہے جیسا کہ
حاکم نے بتایا ہے اور یہی تقاضا ہے امام ابو حنیفہ کی اس روایت کا
جس میں کہا ہے کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات بار مستحب ہے یہ
اس طرح دونوں ارشاد نبوت میں اور راوی حدیث کے فتویٰ میں مفاہمت ہو گئی اور تمام حدیثوں
پر اپنی اپنی جگہ عمل ہو گیا -

جماعت کھڑی ہو جانے پر سنتیں پڑھنا

اسی قسم کی ایک اور مثال سنئے - صحیح مسلم میں حدیث آتی ہے :
عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقيمت
الصلوۃ فلا صلوة الا المكتوبة -
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز قائم کر دی جائے تو فرض
نماز کے سوا کوئی نماز نہیں ہے -

اگرچہ حفاظ حدیث کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا
حضرت ابو ہریرہ کا فتویٰ ہے - حضرت امام شافعی نے کتاب الام میں اسے حضرت ابو ہریرہ کا
فتویٰ ہی قرار دیا ہے - ابن ابی شیبہ کا مصنف میں اور طحاوی کا شرح معانی الآثار میں یہی
میلان ہے - حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ شاید اسی اختلاف کی بنا پر امام بخاری نے اس
کو اپنی صحیح میں روایت نہیں کی ہے -

ظاہر مینوں نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے کہ اگر جماعت کھڑی ہو جائے اور کوئی شخص
سنتیں وغیرہ پڑھ رہا ہو تو اس کی سنتیں کا عدم اور باطل ہوں گی - چنانچہ علامہ شوکانی نے ظاہر یہ

کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

واہل الظاہر انہما لا تنعقد صلاۃ تطوع فی وقت اقامۃ
الفریضۃ۔^{۱۷}

ظاہریہ کی سڑتے میں فرض قائم ہونے پر کوئی نفل نماز نہیں ہوتی ہے
اور علامہ شوکانی کا اپنا میلان بھی یہی ہے و هذا القول هو الظاہر یہی قول ظاہر ہے
لیکن اس حدیث میں نماز کے باطل ہونے کے لیے دُور کا بھی اشارہ نہیں ہے۔ نہ یہ اس کا
منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم۔ اسی بنا پر ائمہ اربعہ میں سے ہر کسی کا مذہب نہیں ہے۔
جمہور کا مذہب یہی ہے کہ توڑے نہیں بلکہ پوری کرے۔ امام اعظم کا مذہب صحیح یہ ہے کہ
اگر ایک رکعت طے کی توقع ہو تو سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے۔ رکعت کی قید اس حدیث
سے لی گئی ہے۔

من ادرك الركعة من الصلاة فقد ادرك الصلاة

(رواہ ابوداؤد)

جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی
امام اعظم کا یہ مذہب امام محمد نے جامع صغیر میں ان الفاظ میں لکھا ہے۔
رجل انتہی الی الامام فی الفجر ولم یصل رکعتی الفجر فحشی
ان یفوتہ رکعة ویدرك الاخری فانہ یصلی رکعتی
الفجر عند باب المسجد فان نحشی ففوتہما دخل مع الامام
ولم یصل رکعتی الفجر۔

اگر کوئی نماز میں آیا اور اس نے صبح کی سنتیں نہ پڑھی ہوں اسے
ایک رکعت جانے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت طے کی اُمید
ہو تو اسے اجازت ہے کہ مسجد کے دروازے کے پاس صبح کی
سنتیں پڑھے اگر دونوں رکعتوں کے نہ طے کا اندیشہ ہو تو
جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتیں نہ پڑھے۔

صاحب ہدایہ نے باب اور اک الفرغیہ میں اسی کو مختار قرار دیا ہے اور علامہ کا شافی نے امام صاحب کا یہی مذہب بتایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت میں نماز کھڑی ہونے پر نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے اور اس کا منشا دوسری حدیثوں کو ملا کر صبح کی سنتوں اور فرض کو بلا فصل ادا کیگی پر نیکر کرنا ہے۔ کیونکہ دوسری حدیثوں میں جماعت کھڑی ہونے سے پہلے جماعت کھڑی ہونے پر اور جماعت سے فرات کے بعد سب پر نیکر آتی ہے اور ہر جگہ منشا یہی ہے کہ صبح کی سنتوں اور فرضوں میں اتصال نہ کیا جاتے بلکہ انفصال ہونا چاہیے اور حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے سب کی روح یہ ہے کہ نماز فجر کی سنتوں اور فرضوں میں فصل کیا جائے بلکہ ایک موقع پر آپ نے یہ بات صراحتاً فرمائی ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من بعید اللہ بن مالک
وهو منتصب یصلی ثم قبل صلوٰۃ الصبح فقال لا
تجعلوا هذه الصلوٰۃ كصلوٰۃ قبل الظهر وبعدها
واجعلوها بينها فصلاً۔

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن مالک کے پاس سے گزرے وہ نماز صبح سے پہلے سنتیں پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اس نماز کو ظہر کی نماز سے پہلے اور بعد کی سنتوں جیسا نہ بناؤ ان میں کچھ فاصلہ کرو۔

اس میں وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ مقصود یہ ہے کہ صبح کے فرضوں اور سنتوں میں فاصلہ ہو۔ چاہے یہ فاصلہ زمانی ہو یا مکانی۔ حضور ہی کے دوسرے اعمال سے مکانی فصل معلوم ہوتا ہے اس لیے امام اعظم نے اس ارشاد کی روح سمجھ کر بتایا کہ سنتوں کی ادائیگی اگر مسجد میں نہیں بلکہ مسجد سے باہر ہو جاتے تو منشا نبوت پورا ہو جائے گا۔ تصریح کے بعد قیاس آرائی کا کوئی محل نہیں ہے۔ جب فرماتے ہیں کہ ان میں فاصلہ کرو تو منطوق کلام اسی کو قرار دیا جائے ورنہ نماز سے قبل سنتوں پر ٹوکنے کے معنی کوئی نہیں ہیں۔ اور نماز کے بعد بھی سنتوں کی ادائیگی پر نیکر آتی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے :

حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لاتے نماز کھڑی ہو گئی ہیں نے جماعت سے صبح کی نماز ادا کی حضور النور اٹھے تو مجھے نماز پڑھتے

دیکھا۔ فرمایا قیس چھوڑا کیا دو نمازیں یک دم میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے صبح کی دو سنتیں نہیں پڑھی ہیں۔ فرمایا پھر بھی نہیں۔

نماز ہوتے ہوتے بھی سنتیں پڑھنے پر نیکر آئی ہے چنانچہ صبح بخاری میں ہے : حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جماعت کھڑی ہو جانے پر نماز کی سنتیں پڑھتے دیکھا۔ جب حضور نماز سے فارغ ہو گئے تو حضور انور نے اس سے فرمایا کیا صبح کی نماز چار رکعتیں ہیں؟ کیا نماز صبح چار رکعت ہے؟

ایک اور حدیث صحیح مسلم میں ہے : ایک شخص مسجد میں آیا حضور انور صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے دو رکعت مسجد میں پڑھی پھر جماعت میں مل گیا۔ حضور نے سلام پھیر کر فرمایا دونوں نمازوں میں کون سی نماز کو تو نے قرار دیا ہے؟ انفرادی کو یا جماعت والی کو؟

ان تمام ارشادات کو غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے آپ کے سامنے یہ بات منہج ہو کر آجاتے گی کہ منشاء نبوت سنتوں اور فرضوں کو ایک ہی جگہ ملا کر پڑھنے سے روکنا ہے اور مقصد یہ ہے کہ دونوں میں فصل کیا جاتے۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں : اس حدیث نے بتایا ہے کہ حضور انور نے ابن الجینہ کے لیے جس بات پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے وہ سنتوں کو ایک ہی جگہ پر فرضوں سے بغیر کسی فصل کے ملانا ہے یہ۔

اس لیے اگر صبح کی سنتوں کی ادائیگی مسجد سے باہر کر کے مکان کا فصل کر دیا جاتے تو منشاء نبوت پورا ہو جاتا ہے صرف امام اعظم ہی نے نہیں بلکہ خود صہبہ کرام نے بھی حضور انور کا یہی منشاء سمجھا ہے کیونکہ اذا اقيمت الصلوة میں اذا اگر ظرفیہ ہے تو دو ہی صورتیں ہیں ظرف زمان یا ظرف مکان۔ ظاہر ہے کہ ظرف مکان ہے۔ مکان ہونے کی صورت میں اس کی

عبد بنی ناکزیر ہے موٹی سے موٹی عقل والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ لاہور کی شاہی مسجد میں صبح کی جماعت کھڑی ہونے پر تمام روئے زمین پر ہر قسم کی نماز حرام ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو پھر اذا قیمت الصلوٰۃ میں مکان سے مکان نماز یعنی مسجد ہی مراد ہے اس لیے نماز کھڑی ہو جانے پر مسجد میں سنتیں نہ پڑھنی چاہئیں۔ یہی امام ابو حنیفہ کا اصل مذہب ہے صحابہ کرام کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ محمد بن کعب نے حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں بتایا ہے:

خرج عبد اللہ بن عمر من بیتہ فا قیمت صلوٰۃ الصبح ف رکع
رکعتین قبل ان یدخل المسجد و هو فی الطريق ثم
دخل المسجد فصلى الصبح مع الناس رکعتین -

عبداللہ بن عمر گھر سے نکلے نماز صبح کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے سنتیں مسجد میں داخل ہونے سے پہلے راستہ ہی میں ادا کیں بعد ازیں مسجد میں آئے اور جماعت سے نماز پڑھی۔ یہ اور اس قسم کے ایک سے زیادہ آثار صحابہ آتے ہیں۔ امام ابوبکر بن شیبہ نے انیس صحابہ کے آثار پیش کئے ہیں جن سے بیرون مسجد صبح کی نماز کھڑی ہو جانے کے باوجود ادا پر سنت کا پتہ چلتا ہے :-

شاید آپ یہاں یہ غلط محسوس کریں کہ امام اعظم کو صبح کی سنتوں کی ادائیگی پر اس قدر اصرار کیوں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اصرار بھی امام اعظم کا اپنا نہیں بلکہ براہ راست کمرج رسالت منیر کا اصرار ہے۔
مسند احمد، ابوداؤد میں ارشاد ہے :

لا تدعوا رکعتی الفجر و لوسطہ و تکم الخیل -
صبح کی سنتیں نہ چھوڑو چاہئے تمہاری گھوڑے روند والیں -

حضرت عائشہ نے حضور انور کے عمل کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بھی سن لیجئے :

لما یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی شیئ من النوافل اشد
تعاہداً منه علی رکعتی الفجر -

روایت کو پہلی روایت عمر کے معارض بنا دیا اور بطور خود صبح کی نماز کے بعد سنتیں پڑھنے کا پروانہ دے دیا۔ اور اس واقعہ ہی میں مہلا یا قیس (چھوڑا لے قیس) کی گرفت سے ایسے بے خبر ہو گئے کہ یا یہ بات زبان نبوت نے فرمائی ہی نہیں۔ لیکن امام اعظم نے مہلا یا قیس کے زور کی وجہ سے فلاذن کے معنی فلاذن اذن تبت بھی اجازت نہیں ہے تاکہ مراد نبوت کو مقرر فرمایا اور اس طرح اس واقعہ کو دوسرے ارشادات کے ساتھ متصادم ہونے سے بچا لیا۔ اور فلاذن کے معنی بھی امام اعظم نے صرف سیاق کلام کی مدد سے نہیں بلکہ حدیث ہی میں آمدہ دوسرے شواہد سے لیے ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں واقعہ آیا ہے کہ نفعان بن بشیر نے اپنے ایک لڑکے کو کچھ مال دے دیا۔ ان کی خواہش ہوئی کہ اس معاملہ میں حضور انور بھی گواہ ہو جائیں۔ نفعان حضور انور کی خدمت میں آئے۔ آپ نے دریافت کیا اھل نخلت سائر ابنائک مثلاً کیا تم نے اپنے سائے بیٹوں کو اسی طرح دیا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ حضور نے فرمایا کہ فلاذن۔ یہاں معنی صاف ہیں کہ پھر اجازت نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں امام اعظم نے صبح کی نماز کے بعد سنتوں کی ادائیگی سے منع فرمایا اور آفتاب کے بعد ان کی ادائیگی کو جائز قرار دیا۔ طلوع آفتاب کے بعد کے متعلق خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد بھی آیا ہے جو حاکم نے مستدرک میں، دارقطنی، بیہقی اور ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں بحوالہ حضرت ابو ہریرہ نقل کیا ہے۔

من لم یصل رکعتی الفجر فليصلهما بعد ما تطلع الشمس
جس شخص نے صبح کی سنتیں نہیں پڑھیں اسے چاہیے کہ آفتاب نکلنے پر پڑھ لے۔

اس طرح امام اعظم نے اس موضوع پر آئی ہوئی مختلف حدیثوں میں شاندار طریق پر مفاہمت کر دی کہ ایک ارشاد نبوت بھی امت کے عمل سے بیگانہ نہ رہا اور سب حدیثوں پر عمل ہو گیا۔ یہ چند مثالیں بطور نکلے از گنزار عرض کر دی گئی ہیں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ مختلف حدیثوں میں مفاہمت کے موضوع پر سینہ ابو حنیفہ سے ابلی ہوئی نقاہت کیا ہے؟

وجہ ترجیح اور امام اعظم

اگر دو صحیح حدیثوں میں تعارض ہو اور ان میں باہم مفاہمت کی کوئی صورت نہ ہو تو ان میں ایک کو

راج اور دوسری کو مرجوح قرار دیا جاتا ہے۔ ترجیح کی حقیقت یہ ہے کہ دو حدیثیں اگر صحت و قوت کے لحاظ سے یکساں اور ہم پلہ ہوں لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے باہم متعارض ہوں تو ان دونوں میں سے ایک کو دوسری کے مقابلہ میں کسی ایسے سہارے کے ذریعے جس میں خود مستقل طور پر جھٹ بننے کی صلاحیت نہ ہو رائج قرار دیا جاتے۔ جن سہاروں کے ذریعے ترجیح کا عمل کیا جاتا ہے۔ محدثین کی اصطلاحی زبان میں ان کو وجوہ ترجیح کہتے ہیں علماء نے ایک سے زیادہ وجوہ ترجیح کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ عازمی نے دوسرے علماء کے پاس میں بتایا ہے کہ

قد اورد بعض الممتنا فی باب الترجیحات نیفا و اربعین
وجہا فی ترجیح احد الحدیثین علی الآخر۔

ہم اسے بعض ائمہ نے وجوہ ترجیح چالیس سے زیادہ بتاتے ہیں۔
خود علامہ عازمی نے کتاب الاعتبار میں جن وجوہ ترجیح کا پتہ دیا ہے ان کی تعداد پچاس ہے اور آخر میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ

فهذا المقدركاف في ذكر الترجیحات و ثم وجوه كثيرة
اضربنا عن ذكرها كيلا يطول هذا المختصر۔

وجوہ ترجیح کی یہ مقدار کافی ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں لیکن ہم نے طوالت کے اندیشہ سے ان کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ حافظ سیوطی نے وجوہ کثیرہ کے چہرہ ابہام سے یہ کہہ کر نقاب مٹا دیے ہیں کہ
وصلها غیرہ الی اکثر من مائة كما استوفى ذلك العراقي
فی نکتہ۔

عازمی کے علاوہ اوروں نے اس تعداد کو ایک سو تک پہنچا دیا ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے نکت علی ابن الصلاح میں اس کی تفصیل کی ہے بلکہ علامہ جمال الدین قاسمی نے تمام وجوہ ترجیح کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے۔
بہ شخص صحابہ تابعین اور اتباع تابعین کے حالات کا مطالعہ کرے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ بزرگ اس پر متفق تھے اور ان کی

اس موضوع پر کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں کہ راجح پر عمل کیا جائے اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے۔ ترجیح کے طریقے بہت ہیں۔ لیکن ترجیح کی بنیاد یہ ہے کہ وجہ ایسی ہو جو مسالک شرعیہ کے مطابق اور مزاج نبوت کے موافق ہو۔ جس میں یہ چیز موجود ہو وہ وجہ معتبر ہے۔ ترجیح کبھی بلحاظ اسناد، کبھی باعتبار متن، کبھی بحیثیت مدلول اور کبھی کسی بیرونی چیز کی وجہ سے ہوتی ہے۔^۱

ان وجوہ ترجیح کا یہاں موقع نہیں ہے جو محدثین کرام نے قلم بند فرماتی ہیں اور جن کو فقہاء کرام نے اسلام کی قانون سازی کے مختلف مرحلوں پر استعمال کیا ہے۔

ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اگر دو حدیثیں صحیح ہونے کے باوجود باہم متعارض ہو جائیں تو کیا ان میں سے کسی ایک کو اس بنا پر راجح قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس کے بیان کرنے والے علم و فکر اور فقہ و نظر کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اس حد تک سب متفق ہیں کہ راویوں میں فقہانیت یقیناً وجہ ترجیح ہے چنانچہ امام حازمی رقمطراز ہیں۔

وجوہ ترجیح میں سے تیسویں وجہ یہ ہے کہ دو حدیثوں میں سے کسی ایک کے بیان کرنے والے اگر حفظ و ضبط میں ہم پلہ ہوں لیکن ان میں سے ایک کے راوی فقہاء ہوں تو فقہاء کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ علی بن خنزلہ محدث کہتے ہیں کہ ہم سے امام وکیع نے کہا کہ ان دو سندوں میں سے تمہیں کون سی سند پسند ہے؟ اعمش عن ابی وائل عن عبد اللہ یاسفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ۔ ہم نے جواباً عرض کیا کہ ہمیں تو الاعمش عن ابی وائل عن عبد اللہ کا سلسلہ سند زیادہ پسند ہے۔ امام وکیع نے بتایا کہ اس سند میں اعمش اور ابو وائل شیوخ حدیث ہیں۔ اور دوسری سند میں سفیان، منصور، ابراہیم اور علقمہ فقہاء ہیں اور وہ حدیث جو فقہاء کی راہ سے آئے بلاشبہ اس حدیث سے بہتر ہے جو محدثین کی وساطت سے آئے۔^۲

^۱ قواعد التحدیث ص ۳۱۲۔^۲ کتاب الاعتبار ص ۱۵، معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۱، الکفایہ ص ۴۱۲۔

علامہ ابو سعادت محمد الدین ابن الاثیر نے جامع الاصول میں اس موقع پر بڑے پستے کی بات لکھی ہے :

یہ سلسلہ روایت فقہاء کی راہ سے عبد اللہ بن مسعود تک رباعی ہے اور محدثین کی راہ سے ثنائی ہے یعنی فقہاء کے طریق میں عبد اللہ تک چار راوی ہیں اور محدثین کے سلسلے میں صرف دو راوی ہیں۔ اس کے باوجود صرف راویوں کی فقہائیت کی وجہ سے فقہاء کی روایت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو جائے اور بلحاظ سند دونوں قوی ہوں۔ لیکن ایک کے سلسلہ سند میں شیوخ حدیث ہوں اور دوسری فقہاء کی وساطت سے آرہی ہو تو خود ارباب حدیث کے نزدیک بھی فقہاء کی روایت کا پلڑا بھاری ہوگا۔ چاہے فقہاء کی روایت کے مقابلے میں محدثین کی روایت کو علو کا مقام بھی حاصل ہو۔ یعنی فقہاء کے سلسلے میں راویوں کی تعداد زیادہ اور محدثین کے طریق میں راویوں کی تعداد کم ہو۔ علامہ محمد معین سندھی نے اس مقام پر یہ کہہ کر کہ

فقه الرواة لا اثر له في صحة الرواية وانما مدارها على العدالة والقبط۔

راویوں کی فقہائیت کا روایت کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے روایت کا دار و مدار تو راویوں کی عدالت و ضبط پر ہے۔
اختلاف سے کام لیا ہے۔ گفت گور روایت کی صحت میں نہیں ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ روایت کی صحت کے لیے فقہ راوی شرط نہیں ہے۔ اس میں دو رائے نہیں ہیں۔ گفت گور تو اس میں ہے کہ اگر دو صحیح روایتوں میں تعارض ہو جائے، دونوں روایتوں کے راویوں میں عدالت و ضبط یکساں ہو اور ان میں باہم کسی طرح منافقت نہ ہو سکے تو کسے راجح قرار دیا جائے ظاہر ہے کہ محدثین فقہ راوی کو ترجیح میں سبب مؤثر قرار دیتے ہیں۔ آپ امام حازمی کی تصریح پڑھ چکے ہیں۔ حافظ سیوطی اور حافظ عراقی جیسے اساطین حدیث بھی امام حازمی کے ہم زبان ہیں چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں،

ثالثها۔ اسی من وجوہ الترجیح۔ فقہ الراوی سواء کان الحدیث
مرذیاً بالمعنی او باللفظ۔ لان الفقیہ اذا سمع ما یتنفع حملاً علی
ظاہرہ بحث عنہ حتی یطلع علی ما یزول بہ الاشتکال۔
وجوہ ترجیح میں سے تیسری وجہ فقہ راوی بھی ہے چاہے حدیث کی روایت
باللفظ ہو یا بالمعنی ہو کیونکہ فقیہ جب کوئی ایسی بات سنتا ہے جسے ظاہر
پر محمول کرنا دشوار ہو تو اس کے بارے میں بحث و تمحیص سے کام لیتا ہے
تا آنکہ وہ ایسی چیز پر مطلع ہو جاتا ہے جس سے راہ کی مشکلات حل
ہو جاتی ہیں۔
خطیب بغدادی لکھتے ہیں :

ویرجح بان یکون رواۃ فتہار لان عناية الفقیہ بما یعلق
من الاحکام ومثلہ من عناية غیرہ بذالک۔
کسی حدیث کو اس کے راویوں کے فقیہ ہونے کی بنا پر ترجیح دی جاتے
گی کیونکہ فقہاء کی مرکزی توجہ احکام پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ
ہوتی ہے۔

بہر حال علامہ معین الدین سندھی نے یہ کہہ کر اپنے منیٰ طلبوں کو ایک سنگین غلط فہمی میں ڈالنے کی
کوشش ہے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ روایت کی صحت کے لیے فقہ راوی کسی کے نزدیک بھی شرط
نہیں ہے۔ فقہ راوی صحت کے لیے نہیں بلکہ صرف دو صحیح روایتوں میں ترجیح کا سبب ہے۔
ترجیح روایت اور صحت روایت دو الگ الگ موضوع ہیں ان کو باہم خلط ملط کرنا سنگین مغالطہ
بہر حال فقہ راوی کے ترجیح روایت کے لیے وجہ ہونے میں محدثین اور فقہاء کا نقطہ نظر ایک
ہے اور یہ ایک بے غبار حقیقت ہے۔ شیخ عبداللطیف سندھی کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ
لا یرتاب احد فی ان فقیہ الراوی مما ثبت بہ الترجیح
راوی کی نقاہت روایت کی ترجیح کے لیے مثبت ہے اور اس میں
کوئی بھی شبہ نہیں ہے۔

ہاں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر دونوں روایتیں صحیح ہوں اور دونوں میں تعارض ہو اور دونوں میں ایک کے راوی فقہاء ہوں اور دوسری متعدد طرق سے مروی ہو۔ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ محدثین اور ارباب روایت کا موقف یہ ہے کہ کثیر الطرق روایت کو راجح قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ امام حازمی ارقام فرماتے ہیں :

کسی حدیث کو راجح قرار دینے کے وجوہ میں سے ایک وجہ کثرت عدد ہے
اس کا روایت پر خاص اثر ہوتا ہے اس طریق سے روایت کے بارے
میں علم میں پختگی آتی ہے ۔

خطیب بغدادی فرماتے ہیں :

ويزنح بكثرة الرواية لاحد الخبرين ۔

لیکن اس موضوع پر امام اعظم کو محدثوں سے اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسی دو روایتوں میں ترجیح اس روایت کو دی جائے گی جس کے بیان کرنے والے فقہاء ہوں۔ چنانچہ رفع یدین کے موضوع پر انہوں نے امام اوزاعی سے مناظرے کے وقت اسی اصول کو اپنایا ہے۔ امام اوزاعی سے امام اعظم کا یہ مناظرہ امام موفق نے امام الحارثی کے حوالہ سے بسند متصل نقل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں امام حارثی کا ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے :

عالم ماوراء النہر ومحدث الامام العلامة ابو محمد عبد اللہ بن یعقوب بن الحارث

الحارثی البخاری الملقب بالاساذ جامع مسند ابی حنیفہ ۔

امام حارثی نے اس واقعہ کی سند یہ لکھی ہے :

حدثنا محمد بن ابراہیم بن زیاد الرازی حدثنا سليمان بن الشاذ

کوفی قال سمعت سفيان بن عيينة يقول اجتمع ابو حنيفة

والاوزاعي بمكة ۔

حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں ، علامہ اکمل الدین نے عنایہ میں ، ملا علی قاری نے شرح منہج میں ، الشیخ ابوالطیب سندھی نے ترمذی کے حاشیہ میں اور السید مرتضیٰ زبیدی نے عقود الجواب المنیفہ میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے ۔ ایسی معروف و مشہور داستان کے بارے میں

اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی معروف و مشہور داستان کے بارے میں راویوں کی معاشرہ چٹمک سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بے اصل ہونے کا دعویٰ کرنا فن کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ حیرت ہے کہ علامہ محمد معین سندھی نے اس قصہ کے معلق ہونے کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے :

ان هذه الحكاية عن سفیان بن عیینہ، معلقة ولم
ار من اسندھا۔^۱

اور ساتھ ہی یہ چیلنج بھی دیا ہے :

ومن عنده السند فليات به۔

حالانکہ یہ واقعہ تو غیر مندرجہ جیسا کہ آپ امام حارثی کی زبانی سن آتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مندرجہ اسے باسند لکھا ہے چنانچہ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں :

فقد اسندھا ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب
بن الحارث الحارثی البخاری المعروف بالاستاذ تلمیذ
ابی حفص الصغیر بن ابی حفص الکبیر تلمیذ الامام
محمد بن الحسن فی مسندہ بقولہ حدثنا محمد بن ابراہیم
بن زیاد... الخ^۲

اور نہ معلق ہے جیسا کہ امام موفق نے لکھا ہے۔ آئیے اب اصل واقعہ گوش گزار فرمائیے :
سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ اور امام اوزاعی مکہ کے دارالخلافین
میں جمع ہوئے گفتگو کے دوران امام اوزاعی نے امام اعظم سے
دریافت کیا آپ رکوع میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت
رفع یدین کیوں نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ اس لیے کہ
رفع یدین رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا یہ کیونکر ہو سکتا ہے
مجھے زہری نے بتایا، انہوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ سے
سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت رکوع کو

جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نے جواب دیا مجھے حماد نے بتایا۔ انہوں نے ابراہیم سے سنا ابراہیم نے علقمہ اور اسود سے سنا اور انہوں نے عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے اور پھر اسے منہیں دہراتے تھے۔ امام اوزاعی نے پھر جواب میں کہا۔ میں آپ کو زہری، سالم اور ان کے والد ابن عمر کی روایت سنا ہوں اور آپ مجھے حماد اور ابراہیم کی روایت سنا تے ہیں۔ امام ابو حنیفہ جواباً بولے حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے۔ ابراہیم سالم سے بڑھ کر عالم تھے اور اگر صحابی ہونے کا پاس نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ عبد اللہ بن عمر سے زیادہ عالم فقہ تھے اور عبد اللہ تو آخر عبد اللہ ہیں۔

عبد اللہ سے مراد عبد اللہ بن مسعود ہیں یعنی ان راویوں میں کوئی شخص بھی عبد اللہ بن مسعود کا ہم پلہ نہیں ہے۔

حافظ ابن الہمام نے یہ واقعہ درج کر کے لکھا ہے کہ

رفع یدین کے موضوع پر آثار صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بہت ہیں اور ان میں گفتگو بڑی طویل الذیل ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ دونوں رفع اور عدم رفع ثابت ہیں اور دونوں کے ثابت ہونے کی صورت میں باہم ترجیح کی ضرورت ہے کیونکہ تعارض موجود ہے۔ عدم رفع ہمارے نزدیک اس لیے راجح ہے کہ نماز اس موجودہ صورت میں مختلف احوال سے گزر کر آتی ہے اقوال اور رفع یدین کی جنس کے افعال ایک وقت میں نماز میں مباح تھے اور وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔ اگر یہ حرکتیں بھی اسی وجہ میں آجائیں تو کوئی بعید نہیں ہے۔ رفع یدین چونکہ وجودی حرکت کا

نام ہے اس لیے اس میں اس کا احتمال ہے برخلاف عدم رفع کے کہ وہ ایک منفی چیز ہے اس میں اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے عدم رفع حرکت نہیں بلکہ سکون کا نام ہے وہ بالاجماع نماز میں خشوع کے عموم کی وجہ سے مطلوب ہے اور ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ عدم رفع کی روایت کے راوی فقہائیت کی وجہ سے رفع یدین کے راویوں پر برتری رکھتے ہیں جیسا کہ امام ابو حنیفہ نے امام اوزاعی کو جواب دیا ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

رفع یدین اور عدم رفع دونوں قسم کی روایتوں میں موازنہ کرتے ہوئے امام ابو حنیفہ نے عدم رفع کی روایات کو راویوں کی فقہائیت کی بنا پر اور امام اوزاعی نے سند کے عالی ہونے کی بنا پر ترجیح دی ہے۔ امام اعظم نے روایت کے اسنادی علو سے ہٹ کر فقہائیت کو ترجیح کے لیے کیوں وجہ قرار دیا ہے؟ اس لیے کہ

فقہائیت کے ذریعے فقیہ میں صحیح اور غیر صحیح کا شعور اور سلیقہ ہوتا ہے جب اسے کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے جس کا ظاہر مزاج شریعت سے مطابقت نہیں رکھتا تو وہ اس کو اول نظر میں ہی روایت نہیں کرتا بلکہ اس کی حقیقت کا کھوج لگاتا ہے اور اس کے معنی میں سرگرداں رہتا ہے جب وہ مطمئن ہو جاتا ہے تو روایت کرتا ہے برخلاف غیر فقیہ کے کہ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہوتی ہے وہ سنی ہوئی بات کو آگے چلا دیتا ہے۔ اس تعلیل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ افتہ کی روایت کو فقیہ کی روایت پر ترجیح دی جائے۔

ترجیح روایت کے بارے میں دراصل امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے اور فقہائیت ان کے نزدیک دو صحیح حدیثوں میں ترجیح کا سبب مؤثر ہے۔ مگر الاسلام بنو دوی نے تصریح کی ہے کہ ہذا

مذہبنا فی الترجیح اور حافظ ابن الہمام نے اسی کو فتح القدیر میں مذہب منصور قرار دیا ہے
اور ملا علی قاری نے واشکاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ

والمذہب المنصور عند علماء الحنفیۃ الافقیۃ دون
الاکثریۃ -

کامیاب مذہب احناف کے نزدیک افضلیت ہے اکثریت نہیں ہے ۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ عدوی طاقت اور ووٹوں کی زیادتی سے کسی
روایت کو رائج نہ قرار دیا جائے بلکہ یہ دیکھا جاتے کہ معنویت کہاں ہے ؟

ظاہر بین بزرگوں نے امام اعظم کے اس زیریں ضابطہ کو تخریجی قسم کا ضابطہ قرار دے کر بے جان
بنانے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن شاید ان کو علم نہیں ہے کہ محدثین کے علم حدیث کے
متعلق سائے ہی اصول وضوابط تخریجی ہیں ۔ اصول حدیث کا کوئی ضابطہ اور قاعدہ بھی مخصوص
نہیں ہے یہ بات کہ تعدد طرق کی بنا پر روایت کو ترجیح دی جاتے خود تخریجی ہے اور اس کا
پس منظر افراد و غرائب کے لیے گنجی تشنگی نکالنا ہے یعنی اس کو افراد و غرائب کے لیے بنایا گیا
ہے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ورنہ اللہ کے دین میں احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ دین میں
فکر و نظر اور فقہ و بصیرت رکھنے والوں کی بات کا پلڑا بھاری ہو ۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ نماز کی
صفِ اول کے بارے میں حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم تھا جو بحوالہ ابو مسعود انصاری اور
بحوالہ عبد اللہ بن مسعود و مسند احمد، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں ان الفاظ میں موجود ہے ۔

لیبیتی ادلو الاحلام والنہی منکم

مجھ سے قریب نماز میں تم میں سے اہل عقل و فہم ہوا کریں ۔

اہل علم و فضل کو صفِ اول میں رکھنے کی اس کے سوا وجہ کیا ہو سکتی ہے جو علامہ شوکانی نے
بتا دی ہے :

لیأخذوا عن الامام ویأخذ عنهم غیرہم لانہما امتی

بضبط صفتہ الصلاۃ وحفظہا ونقلہا وتبلیغہا

تاکہ وہ امام کے اعمال و افعال کی کاپی کریں اور رائے عامہ ان کے اعمال و

افعال کی کاپی کرے ۔ کیونکہ اہل علم ہی نماز کے طریقہ کو زیادہ ضبط اور

حفظ کر سکتے ہیں اور ان میں سے آگے نقل کرنے اور پہنچانے کی

صلاحتہ ہے

امام اعظم نے اوزاعی کے سامنے رفع یدین کے موضوع پر یہی کہوٹی پیش فرمائی ہے۔ رفع یدین کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے اور عدم رفع کے موضوع پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے۔ ان دونوں حدیثوں کی روایتی اور اسنادی حیثیت دونوں کو مسلم ہے اور ان دونوں روایتوں کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ امام اعظم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کو رائج قرار دیا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کبار صحابہ سے ہیں۔ نماز میں یہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صفِ اول میں ہوتے تھے حضور النور نے معلمین قرآن میں سب سے پہلا نمبر ان کا بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود پسند کرے میں تمہارے لیے اسی پر راضی ہوں۔ اور فرمایا کہ ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو اور اس پر جیسے رہو۔ حضرت عمر نے ان کو علم کا انبار کہا ہے اور کوفہ والوں کی طرف معلم قرآن و سنت بنا کر روانہ کیا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود خلفاء راشدین سے بھی زیادہ عالم تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت حضور النور کے پاس بیٹھے تھے اور حضور النور ان سے کسی وقت حجاب نہ کرتے تھے۔ ان کی وفات ساٹھ سال کی عمر میں ۲۲ھ میں ہوئی ہے۔ مسلمان ہونے والوں میں یہ چھٹے مسلمان ہیں اس لیے ان کا شمار ابو بکر و عمر، عثمان و علی کے ساتھ السابقون الاولون میں ہے۔ ان کا بیان امام اعظم کو پہنچا ہے کہ حضور النور صرف تکبیر تحریر کے وقت رفع یدین کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر بے شک بزرگ ترین صحابی ہیں لیکن حضور النور کی ہجرت کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی اور وفات کے وقت یہ عمر کی چوبیسویں بہار دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا شمار السابقون الاولون میں ہے۔ اور نہ یہ ابو بکر و عمر کے علم و فضل میں ہم پلہ ہیں۔ نماز میں حضور کے پیچھے جو مقام عبداللہ بن مسعود کا ہے وہ یقیناً عبداللہ بن عمر کا نہیں ہے اس لیے امام اعظم نے عبداللہ بن مسعود کے بیان کو رائج قرار دیا ہے۔

حدیث ضعیف اور امام اعظم
محدثین نے حدیث ضعیف کی یہ تعریف کی ہے کہ

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں حسن اور صحیح کی صفات نہ ہوں۔
اور کچھ نے یہ بتایا ہے کہ

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جو حسن کے پاتے کی نہ ہو۔

لیکن حدیث ضعیف کی یہ تعریف ان بعد میں آنے والے محدثین کرام کی اختراعی ہے جن کے نزدیک حدیث تین قسموں پر مشتمل ہے۔ صحیح، حسن اور ضعیف۔ ورنہ متقدمین حدیث کی اس تلافی تقسیم سے آشنا نہ تھے۔ ان کے یہاں حدیث کی تقسیم ثنائی تھی یعنی حدیث کی دو ہی قسمیں بتاتے تھے صحیح اور ضعیف۔ چنانچہ امام احمد کے زمانے تک حدیث دو ہی قسموں میں منحصر تھی ان دو کے درمیان حسن کا کوئی درجہ نہ تھا لیکن بعد کے محدثین نے ان دونوں کے درمیان حسن کی صورت نکال لی۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

حدیث کی یہ تقسیم صحیح، حسن اور ضعیف امام ابو علیسی ترمذی کی بنائی ہوئی ہے ترمذی سے پہلے یہ تقسیم کسی سے مروی نہیں ہے اور ترمذی نے اس سلسلے میں اپنی مراد بھی واضح کر دی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ ہی شاذ ہو۔ یہ مرتبہ میں اس صحیح سے کم ہے جس کے راویوں کی عدالت اور ضبط معلوم ہوتا ہے۔ ضعیف وہ ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو یا مروی الحفظ ہو۔
علامہ خطابی نے حسن کی یہ تعریف کی ہے :

جس کا مخرج معلوم ہو اور جس کے راوی مشہور ہوں۔

لیکن حافظ ابن تیمیہ کو علامہ خطابی سے اختلاف ہے وہ امام ترمذی کے ہمنا ہیں حدیث حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ وہ شاذ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ متاخرین جسے حسن کہتے ہیں وہ متقدمین کے یہاں ضعیف ہے چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

ليس المراد بالحديث الضعيف في اصطلاح السلف هو الضعيف
في اصطلاح المتأخرين بل ما يسميه المتأخرون حسناً قد
يسميه المتقدمون ضعيفاً۔

ضعیف کے بارے میں متقدمین اور متأخرین کی اصطلاحیں الگ الگ
ہیں۔ متأخرین جسے حسن کہتے ہیں متقدمین کی زبان میں اس کا نام
ضعیف ہے۔ لہ

اسی ضعیف کے بارے میں محدثین نے امام اعظم کا یہ موقف بتایا ہے کہ وہ اسے رائے اور قیاس
کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حزم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:
اس پر اجماع ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ حدیث ضعیف رائے
اور قیاس پر مقدم ہے بشرطیکہ اس موضوع پر صحیح حدیث نہ ہو۔ لہ
حافظ ابن القیم رقمطراز ہیں:

اصحاب ابی حنیفۃ مجمعون علی ان مذہب ابی حنیفۃ ان
ضعیف الحدیث اولی عندہ من القیاس والرای۔

ابو حنیفہ کے اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب
یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس اور رائے سے بہتر ہے۔ لہ
بلکہ حافظ ابن القیم ہی نے اس موضوع پر امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل کی ہم آہنگی کا
دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

فتقدیم الحدیث الضعیفہ واثار الصحابة علی القیاس والرای
قولہ وقول الامام احمد بن حنبل۔

حدیث ضعیف اور آثار صحابہ کو قیاس اور رائے پر مقدم کرنا امام
ابو حنیفہ اور امام احمد کا قول ہے۔ لہ

لیکن ضعیف سے متأخرین کی مراد اصطلاحی ضعیف نہیں بلکہ حسن مراد ہے۔ چنانچہ حافظ

ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

ہمارا یہ کہنا کہ حدیث ضعیف رائے اور قیاس سے بہتر ہے۔ اس سے ضعیف متروک مراد نہیں ہے بلکہ حسن ہے اور اصطلاح میں ترمذی سے قبل حدیث کی دو ہی صورتیں تھیں صحیح یا ضعیف اور ضعیف کی دو قسمیں تھیں ضعیف متروک اور غیر متروک۔ چنانچہ ائمہ حدیث کی زبان پر یہی اصطلاحیں جاری تھیں۔ اس کے بعد وہ لوگ آئے جن کو صرف اصطلاح ترمذی ہی کا پتہ تھا جب ان کے کان میں بعض ائمہ حدیث کا یہ قول پڑا کہ حدیث ضعیف قیاس سے بہتر ہے تو انہوں نے خیال کیا کہ ایسی حدیث سے حجت طاعتی جاری ہے جو بہ اصطلاح ترمذی ضعیف ہے تو یہ ان لوگوں کے طریقہ کو ترجیح دینے کے جو حدیث صحیح کے اتباع کا اظہار کرتے ہیں۔^۱

حافظ ابن قیم نے یہی بات پوری صراحت سے لکھی ہے فرماتے ہیں : ضعیف سے باطل و منکر مراد نہیں ہے اور نہ وہ روایت ہے جس کے راویوں میں کوئی متہم ہو بلکہ حدیث ضعیف ان کے یہاں صحیح کی قسم ہے۔ قسم نہیں ہے ان کے یہاں حدیث کی ثلاثی نہیں بلکہ ثنائی تقسیم ہوتی تھی اور ضعیف ان کے یہاں مراتب والی تھی۔^۲

علامہ ابن علان صدیقی نے امام احمد کے اس ارشاد پر کہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے، بشرطیکہ اس موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ہو۔ یہ نوٹ لکھا ہے کہ :

حدیث ضعیف کے بارے میں امام احمد سے جو منقول ہے تو اس میں ضعیف سے مراد وہ ضعیف ہے جو صحیح کے مقابلے میں ہو یہ خود امام احمد اور متقدمین کا عرف ہے کیونکہ ان کے یہاں حدیث کی دو ہی قسمیں صحیح اور ضعیف ہیں اور یہ ضعیف حسن کو بھی شامل ہے اور باقی متاخرین کی اصطلاحی ضعیف تو وہ امام احمد کی ہرگز مراد

نہیں ہے۔ لہ

اور یہ صرف امام احمد ہی کی نہیں بلکہ امام اعظم ابو حنیفہ کے ارشاد میں بھی ضعیف ہے متقدمین کی اصطلاحی ضعیف مراد ہے چنانچہ علامہ ابن عدنان ہی نے علامہ زرکشی کے حوالہ سے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

وقریب من هذا قول ابن حزم الحنفية متفقون على ان
مذهب ابی حنیفة ان ضعیف الحدیث عندہ اولی من
الماہی والظاہر ان مرادہ بالضعیف ما سبق لہ
الغرض صرف امام اعظم ہی کا نہیں بلکہ تمام ائمہ کا مذہب یہی ہے کہ قیاس و رائے کے مقابلے
میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے چنانچہ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں :
لیس احد من الائمة الا وهو موافقہ علی هذا الاصل
من حیث الجملة -

اماموں میں سے ہر ایک بالاجمال اس موضوع پر امام احمد کا ہمنوا ہے۔ لہ
لیکن یہاں اتنی بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ یہ ائمہ جس حدیث ضعیف سے استدلال کرتے
ہیں وہ ضعیف الاسناد تو محدثین تک پہنچنے میں ضرور ہوتی ہے مگر ضعیف المتن نہیں ہوتی ہے
اتصال عمل کی کسی شاہد صحیح کی ظاہر قرآن کی اور بالآخر کثرت طرق کی اسے یقیناً تائید حاصل ہوتی ہے
اسنادی کمزوری کی حد تک حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں :
ایک شخص محدثین کے یہاں حدیث میں غلطیوں کی وجہ سے ضعیف
قرار پا جاتا ہے لیکن اس کی حدیثوں میں زیادہ تر صحیح ہوتی ہیں۔ وہ
اس سے محض اعتبار و اعتقاد کی خاطر حدیثیں روایت کرتے ہیں کیونکہ

لہ، لہ شرح الاذکار ج ۱ ص ۸۶، ۸۷ - لہ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۱ -

لہ اعتبار اصول حدیث کی ایک اصطلاح ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روایت کی مختلف سندیں جمع کر
کے دیکھی جائیں تاکہ پتہ چل جائے کہ قدر مشترک کے طور پر سند و متن کا کتنا حصہ درست اور صحیح ہے۔ حافظ
سیوطی فرماتے ہیں کہ اعتبار متابعت اور شاہد محدثین کی خاص اصطلاحی زبان ہے اس کے ذریعے وہ احادیث
کے مختلف احوال معلوم کرتے ہیں سب سے یہ جانتے ہیں کہ راوی اپنے بیان میں منفرد ہے یا نہیں پھر یہ کہ
(باقی ص ۸۷ پر)

تعدد طرق اور کثرت اسانید سے روایت میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ اس کے ذریعے علم حاصل ہو جاتا ہے۔ چاہے روایت کرنے والے فاسق و فاجر ہی ہوں اور اگر روایت میں غلطیوں کے باوجود بیان کرتے والے علما اور عادل ہوں تو پھر کیا ہی کہنے میں جیسے عبداللہ بن لہیعہ۔ یہ اکابر علماء میں سے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی روایات میں غلطیاں ہوتی ہیں حالانکہ ان کی روایات بیشتر صحیح ہوتی ہیں۔
 آئیے سرے سے چند مثالیں بھی سن لیجئے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ائمہ دین نے دین کی زندگی میں ضعیف حدیثوں سے کس طرح اور کس انداز میں فائدہ اٹھایا ہے۔

حدیث قہقہہ سے وضو کے ٹوٹنے پر استدلال

مسئلہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں اگر قہقہہ مار کر ہنسا جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس موضوع پر احادیث مسندہ اور مرسلہ دونوں آتی ہیں۔ احادیث مسندہ میں ابی موسیٰ اشعری، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جابر بن عبداللہ، عمران بن حصین اور ابی الملیح کی احادیث آتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی روایت بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اصطلاحی صحت کے معیار پر پوری نہیں ہے۔ ابی موسیٰ کی روایت طبرانی میں ہے اگرچہ حافظ بیہقی نے اس کے رجال کی توثیق کی ہے لیکن ان میں محمد بن عبدالملک مختلف فیہ ہے۔ حدیث ابی ہریرہ سنن دارمی میں ہے مگر منقطع ہونے کے ساتھ عبدالعزیز اور عبدالکریم کی وجہ سے ضعیف ہے۔
 حافظ ابن عدی فرماتے ہیں :

۶۵۵ کا بقیہ حاشیہ :- معروف ہے یا مجہول دستور۔ اعتبار یہ ہے کہ کسی روایت کی مختلف سندیں یکجہ کی جائیں اور دیکھا جائے کہ سند میں کسی اور کی ہمنوائی بھی اسے حاصل ہے یا نہیں اس ہمنوائی کے بہم پہنچانے کا نام اعتبار ہے۔ پھر اس تلاش میں اگر راوی کی یا راوی کے استاد کی یا استاد کے استاد کی آخر سند تک ہمنوائی مل جائے تو اس کا نام متابعت ہے اور پھر اگر اس روایت کے ہم معنی کوئی اور روایت بھی دستیاب ہو جائے تو اس کا نام تباہ ہے حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اعتبار کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث کے لیے توابع اور شواہد معلوم ہو سکیں۔ لے قواعد التحدیث ص ۱۱۵۔

والبلاء فی هذا الاسناد من عبدالعزیز و عبدالکرم و هما
ضعیفان ۱۷

عبداللہ بن عمر کی حدیث کے بارے میں ابن الجوزی کا الحلل المتناہیہ میں فیصلہ یہ ہے کہ
هذا حدیث لا یصح -

حدیث انس سنن دارقطنی میں ہے اس میں بھی داؤد و متروک الحدیث اور ایوب ضعیف
ہے۔ وار قطنی فرماتے ہیں -

راؤدہ داؤد بن المجہور و متروک یضع الحدیث عن ایوب
و هو ضعیف ۱۸

حدیث جابر بھی سنن دارقطنی میں ہے لیکن اس میں یزید بن سنان ضعیف ہے۔ عمران بن
الحصین کی روایت عمرو بن قیس اور عمرو بن عبیدہ کی وجہ سے پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہے -
ابوالملیح کا اس موضوع پر بیان اپنے اضطراب کی وجہ سے محدثین کے دربار میں مخدوش ہے
یہی حال ان روایات کا ہے جو مسندہ نہیں بلکہ مرسلہ ہیں۔ ان پر تفصیلی کلام حافظ زلیعی نے نصب الراہ
میں فرمایا ہے۔ بہر حال نماز میں قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کے موضوع پر جس قدر روایات آتی ہیں
وہ مسند ہوں یا مرسل۔ محدثین کے یہاں متکلم فیہ ہیں اور حافظ ابن القیم کا یہ کہنا درست ہے کہ
اجمع اهل الحدیث علی ضعفہ ۱۹

اس کے باوجود کہ عقلیت کا تقاضا بھی ہے اور قیاس بھی چاہتا ہے کہ قہقہہ سے وضو نہ ٹوٹے
امام ابوحنیفہ نے قہقہہ کو وضو کے لیے ناقص قرار دیا ہے۔ اس باب میں بہت سے امور تفصیل
طلب ہیں لیکن یہاں مزید اطناب کا موقع نہیں ہے۔

نبیذ تمر سے وضو کی حدیث

اگر اور کوئی پانی نہ ہو اور صرف کھجوروں کی نبیذ ہی ہو تو نبیذ ہی سے وضو جائز ہے اس کے
لیے تیمم روا نہیں ہے۔ اس موضوع پر دو حدیثیں آتی ہیں۔ ایک حدیث ابن مسعود اور دوسری
حدیث ابن عباس۔ حدیث ابن مسعود پر محدثین نے خاص محذمانہ اور مورخانہ کلام کیا ہے۔ ابن

ابی حاتم نے کتاب العلل میں حافظ ابو زرہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ
حدیث ابی خزاسہ فی الموضوع لیس بصیح والیوزید مجہول۔
حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں :

ان حدیث ابن مسعود مروی من طرق لا تقوم بمثلها حجة۔
اگرچہ حدیث ابن مسعود کو ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے لیکن محدثین
کے یہاں اس کی صحت مخدوش ہے۔ خود صاحب بدایہ کو اس کے اضطراب کی شکایت ہے۔
حافظ منذری نے مشہور محدث ابو احمد الکراہیسی سے نقل کیا ہے۔

لا یتثبت فی هذا الباب من هذه الروایة حدیث بل
اخبار الصحیحة عن عبد اللہ ناطقة بخلافه
اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے بلکہ عبد اللہ سے صحیح حدیثیں
اس کے خلاف ہیں۔

عبداللہ بن عباس کی حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے لیکن حافظ بزار کا فیصلہ ہے :
هذا حدیث لا یتثبت
یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔

حدیث مقدار ایام حیض

حیض کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کے موضوع پر جو حدیث آتی ہے وہ اگرچہ
ابو امامہ، وائل بن الاسقع، معاذ بن جبل، ابو سعید، انس بن مالک اور عائشہ کے حوالہ سے
آتی ہے اور حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے لیکن ان کے راویوں میں مجاہیل ضعیف کا
اتنا نجوم ہے کہ محدثین کے معیار کے مطابق اس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں ملتی ہے
لیکن اس کے باوجود قابل قبول سمجھ لی گئی۔

بہر حال امام اعظم قیاس اور رائے کے مقابلے میں حدیث ضعیف پر بھی عمل کرتے ہیں۔ اس
کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ امام اعظم کے زمانے میں معاشرے کی عملی تائید کی وجہ سے ان حدیثوں

کا درجہ حسن ہو جاتا ہے۔ علامہ بابر قی نے شاید اسی بنا پر لکھا ہے کہ :
والحدیث مشہور ثبت بطرق مختلفہ و عملت بہ الصحابہؓ۔

حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں :

فہذا عدة احادیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم متعددة

الطرق و ذالک یرفع الضعیف الی الحسن۔

یہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں ہیں اور متعدد طرق سے

آنے کی وجہ سے درجہ حسن کو پہنچ گئی ہیں۔

حافظ سخاوی فرماتے ہیں :

حسن لغيرہ بھی قابل احتجاج ہو جاتی ہے جب وہ متعدد طرق سے آئے۔

امام نووی بھی علامہ سخاوی کے ہم زبان ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

حدیثوں کی سندیں اگر الگ الگ ہوں چاہے وہ ضعیف ہوں ان کا

مجموعہ باہم تقویت کی وجہ سے حدیث کو حسن اور قابل احتجاج بنا

دیتا ہے۔

امام بیہقی کی بھی یہی رائے ہے کہ حدیث ضعیف کثرت طرق سے آئے تو قوی ہو جاتی ہے

بلکہ عون الباری میں امام نووی کے حوالہ سے یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ :

حدیث ضعیف اگر متعدد طرق سے مروی ہو تو وہ ضعیف سے حسن اور

مقبول و معمول بہ ہو جاتی ہے۔

ارباب روایت کے یہاں عمل کے بائے میں تین مسلک ہیں۔

اول یہ کہ ضعیف پر قطعاً عمل نہ کیا جاتے۔ ابن سید الناس نے اسی کو یحییٰ بن معین کا مسلک

قرار دیا ہے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں ابو بکر بن العربی کا یہی میلان بتایا ہے بلکہ صاحب

قواعد التحدیث کی تصریح کے مطابق محدثین میں بخاری اور مسلم کا بھی یہی مسلک ہے۔

دوم یہ کہ حدیث پر ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں :

عنری ذاللت الی ابی داؤد واحمد لانہما یریان اقوی من رای الرجال۔
 سوم یہ کہ صرف فضائل میں ضعیف پر عمل کیا جائے احکام میں ضعیف پر عمل نہ کیا جائے چنانچہ
 امام حاکم رقمطراز ہیں:

میں نے ابو زکریا عنبری سے سنا وہ فرماتے تھے کوئی حدیث اگر حلال کو
 حرام اور حرام کو حلال نہ کرتی ہو اور کسی حکم کو واجب نہ کرتی ہو اور
 صرف ترغیب و ترہیب سے تعلق رکھتی ہو تو اس سے چشم پوشی
 کی جائے گی اور اس کے راویوں پر جرح میں تساہل سے کام لیا جائے
 گا اور جیسا کہ امام عبد الرحمن بن مہدی فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم
 صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور احکام کی روایت کرتے ہیں تو
 اسانید کے بارے میں سختی برتتے ہیں اور رجال پر نقد کرتے ہیں
 اور جب فضائل و عقاب کی روایت کرتے ہیں تو اسانید میں نرمی
 اختیار کرتے ہیں اور احادیث میں تسامح سے کام لیتے ہیں۔ میمون
 نے امام احمد کا بھی ایسا ہی بیان بتایا ہے کہ رقائق کی حدیثوں میں
 تساہل مناسب ہے لیکن احکام میں نہیں۔
 علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ:

اگر حدیث ضعیف ہو لیکن موضوع نہ ہو تو محدثین اس کی اسناد میں
 تساہل کو جائز سمجھتے ہیں اور یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ ضعف کی تصریح
 کے بغیر بیان بھی کر سکتا ہے جب کہ حدیث کا تعلق احکام و عقائد
 سے نہ ہو بلکہ مواعظ، قصص اور فضائل میں ترغیب و ترہیب سے
 ہو۔ اگر حدیث احکام و عقائد سے متعلق ہو تو اس میں تساہل قطعاً
 ناجائز ہے۔ امہ حدیث میں عبد الرحمن بن مہدی، عبد اللہ بن المبارک
 اور احمد بن حنبل کی یہی رائے ہے۔
 حافظ ابن الہمام نے تصریح کی ہے کہ:

حدیث اگر ضعیف ہو اور موضوع نہ ہو تو اس سے استنباط ثابت ہو جاتا ہے۔
 لیکن حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور حافظ سخاوی نے القول البدیع میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حدیث ضعیف کی قبولیت کے لیے تین شرطیں ہیں۔
 اول یہ کہ حدیث میں ضعف زیادہ نہ ہو یعنی حدیث کے راوی ایسے نہ ہوں جو جھوٹ میں شہرت رکھتے ہوں یا ان پر دروغ گوئی کی تہمت ہو یا کھلم کھلا غلطیوں کا شکار ہوں۔
 دوم یہ کہ حدیث جس مضمون پر مشتمل ہے اس کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو بات محسن بے اصل اور من گھڑت نہ ہو۔

سوم یہ کہ عمل کے وقت میں اس کے ثابت ہونے کا عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ از روئے احتیاط اس پر عمل ہو۔ آخری دو شرطیں حافظ عزالدین بن عبد السلام اور علامہ ابن دقیق العید کی بتائی ہوئی ہیں۔ اور پہلی شرط کو علامہ علائی نے اتفاقی قرار دیا ہے۔
 مولانا عبدالحی نے طفر الامانی فی شرح مختصر الجرجانی میں ان سہ گانہ شرطوں کا تذکرہ کر کے مثالیں بھی دی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :

فقہاء احناف کا فیصلہ ہے کہ اذان کے کلمات آہستہ آہستہ دہری
 آواز سے اور تبکیر جلدی اکبری آواز سے کہی جائے اور ایسا کرنا مستحب
 ہے اور اس پر انہوں نے ترمذی کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے
 جو بحوالہ حضرت جابر ان الفاظ میں آئی ہے کہ — حضور انور صلی اللہ
 علیہ وسلم نے بلال سے فرمایا ہے کہ اے بلال جب اذان دو تو آہستہ
 آہستہ دو اور جب تبکیر کہو تو جلدی کرو۔ ۱۰۰۰ — امام ترمذی نے
 اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ ہوا سند مجھول۔ امام
 دارقطنی نے اس کے راوی عبد المنعم کی تصنیف کی ہے اس کے
 باوجود چونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف کافی ہو جاتی ہے
 اس لیے فقہائے اس پر عمل کو مستحب قرار دیا ہے۔ نیز فقہاء حنفیہ
 دسویں گردن کے مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں اور اس پر وہ

ایک ایسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو خالص محدثانہ نقطہ نظر سے ضعیف ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ طلحہ بن مصرف اپنے والد اور دادا کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کا مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے تا آنکہ آپ نے قذال تک مسح کیا۔ قذال گردن کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں۔ یہ روایت معانی الآثار میں بھی ہے لیکن یہ سب روایات طلحہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہیں۔ ابن القفطان نے طلحہ ان کے والد اور ان کے دادا کو مجہول قرار دیا ہے۔

علامہ دوانی کا شبہ اور اس کا جواب

علامہ دوانی نے النموذج العلوم میں یہاں ایک شبہ اٹھا کر ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے ایک پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ علامہ موصوف کے اس شبہ کو مولانا عبدالحی نے الابوابۃ الفاضلہ میں، مولانا عبدلیق حسن خاں نے المحطہ میں اور علامہ جمال الدین القاسمی نے قواعد التحدیث میں بڑی آب و تاب سے بیان کیا ہے۔ ان کے شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء ایک طرف فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب اور جواز معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ان کا ہی ارشاد ہے کہ استحباب ہو یا جواز۔ یہ بھی احکام شرعیہ میں سے ایک حکم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف احکام کے اثبات کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب و جواز ثابت ہو گا تو اس کے نتیجے میں اس سے حکم شرعی کا اثبات ہو گا۔ اس لیے ایک طرف یہ کہنا کہ حدیث ضعیف سے استحباب و جواز ثابت ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بتانا کہ حدیث ضعیف سے احکام ثابت نہیں ہوتے دونوں میں اس لحاظ سے یقیناً تضاد ہے کہ استحباب اور جواز بھی خود حکم شرعی ہے۔ اگر حدیث ضعیف سے حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا تو لازماً استحباب بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

علماء نے اس شبہ کے متعدد جوابات دیے ہیں اور خود علامہ دوانی نے بھی اس کے ازالہ کی بہترین کوشش فرمائی ہے۔

علامہ احمد الخفاجی نے نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض میں جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ ہے :

حدیث ضعیف سے فضیلت کا ثابت ہونا کسی حکم کے ثابت ہونے کو مستلزم نہیں ہے ایسا عمل جس کا استحباب صحیح حدیث سے ثابت ہو اس کا ثواب یا اسے کرنے کی ترغیب یا صحابہ کی فضیلت یا اذکار و آثار کی فضیلت اگر کسی ضعیف حدیث سے معلوم ہو جائے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل حکم ہی حدیث ضعیف سے ثابت ہو رہا ہے۔ اعمال اور فضائل اعمال میں بہت بڑا فرق ہے۔

علامہ خفاجی کی بات بڑی گہری ہے اور اپنے اس بیان کے ذریعے وہ پڑھنے والوں کے ذمہ دین میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے کسی عمل کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا بلکہ ثابت شدہ موجود عمل جس کا وجود دلائل شرعیہ سے پہلے ثابت ہو چکا ہے صرف اس کی فضیلت کو حدیث ضعیف کے ذریعے ظاہر کیا جاسکتا ہے مثلاً نماز تہجد کی سنیت مآئل شرعیہ سے ثابت ہے اب اس ثابت شدہ سنت کی ترغیب کے لیے یا اس کی رگی کے اظہار کے لیے حدیث ضعیف کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ علامہ موصوف نے اس طرح امر دوانی کے اٹھائے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے۔ مولانا صدیق حسن خاں نے صرف امر موصوف کے جواب پر ہی اکتفا فرمایا ہے اور اس سلسلے میں اپنی کوئی قیمتی رائے ظاہر نہیں فرمائی ہے۔ جمال الدین القاسمی نے علامہ موصوف پر بہت بڑی برہمی کا اظہار فرمایا ہے۔

مولانا عبدالحی نے یہ فرما کر علامہ خفاجی کی بنائی ہوئی عمارت کو بے جان کر دیا ہے کہ خفاجی بموقف فقہاء اور محدثین دونوں کے خلاف ہے۔ فقہاء کے اس لیے کہ وہ ضعیف حدیث سے بلاشبہ ایسے عمل کے استحباب کو ثابت کرتے ہیں جس کا استحباب احادیث صحیحہ ہرگز ثابت نہیں ہے۔ محدثین کے اس لیے کہ وہ حدیث ضعیف کا فضائل، مناقب

اور ترغیب و ترہیب کے موضوع پر ذکر کرتے ہیں۔ اگر فضائل اعمال سے وہی کچھ مراد ہے جو خفاجی بتا رہے ہیں تو اس کا مقابلہ ترغیب و ترہیب میں قبولیت سے نہیں ہو سکتا۔ علامہ کا یہ ارشاد امام نووی کی اس تصریح کے بھی خلاف ہے جو انہوں نے الاذکار میں کی ہے:

اذا ورد حدیث ضعیف بکراهیة بعض البیوع او
الانکحة، فالمستحب ان یتنزه عنه لہ

جب کوئی ضعیف حدیث نکاح یا سوئے کی کراہت کو بتائے تو
اس سے بچنا ہی اچھا ہے۔

اور حافظ ابن الہمام کے اس نظریہ کے بھی خلاف ہے۔

یثبت الاستحباب بالمحدث الضعیف لہ

استحباب حدیث ضعیف سے ثابت ہو جاتا ہے۔

نیز اگر بالفرض وہ ہی کچھ امر واقعہ ہے جو خفاجی بتا رہے ہیں تو پھر ان شرائط میں کوئی افادیت نہیں رہتی جو قبول ضعیف کے لیے محدثین میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے قائم فرمائی ہیں کیونکہ اگر ضعیف سے صرف ان اعمال کی فضیلت ہی بیان ہو سکتی ہے جو احادیث صحیحہ کے ذریعے ثابت ہو چکے ہوں تو پھر یہ قید بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کہ حدیث ضعیف جس مضمون پر مشتمل ہو اس کی کوئی اصل موجود ہو اور یہ بشرط بھی بالکل بے جان ہو جاتی ہے کہ عمل کے وقت اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس مقام پر واقعی اور سچی بات یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کا جواز یا استحباب کسی خاص حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو اور اس موضوع پر کوئی ضعیف حدیث آجائے لیکن اس کا ضعف شدید نہ ہو تو اس سے جواز و استحباب ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کام کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو اور یہ کام اصول شرعیہ اور دلائل صحیحہ کے منافی نہ ہو۔ لہ

خود علامہ ودانی نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ اگرچہ ذرا طویل ہے لیکن اسے یہاں نظر انداز کرنے سے بات ادھوری رہ جاسے گی اس لیے یہاں اس کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

اس موضوع پر قابل اعتماد بات یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کی خوبی کسی حدیث سے معلوم ہو جاتے اور وہ کام ناجائز اور مکروہ ہونے کے اندیشے سے بالا ہو تو ایسے موقع پر ضعیف پر عمل جائز اور مستحب ہے کیونکہ یہ ناجائز ہونے کے اندیشے سے پاک ہے اور اس پر ثواب کی توقع ہے اور اس توقع کی وجہ کام میں اباحت اور استحباب کی کثرت ہونا ہے بنا بریں ثواب کی امید پر عمل ہی میں احتیاط ہے۔ اور اگر خود کام ہی ناجائز اور استحباب کے درمیانی مقام پر ہو تو پھر ناجائز ہونا راجح ہے۔ اور اگر کام کراہت اور استحباب سے دو چار ہو تو اس میں فکر و غور کے لیے کافی گنجائش نکل سکتی ہے عمل کی صورت میں مکروہ کا شکار ہو سکتا ہے اور ترک کی حالت میں مستحب دستبرداری کی راہ ہے۔ اگر کراہت کا اندیشہ قوی ہو اور استحباب کا احتمال کمزور ہو تو ایسی حالت میں ترک کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر کراہت کا اندیشہ کمزور ہو تو عمل میں احتیاط کا پہلو ہے۔ اور اگر طرفین برابر ہوں تو پھر بھی عمل میں استحباب کو اپنایا جائے گا۔ ان تمام صورتوں میں حدیث ضعیف پر عمل اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ عدم جواز کا احتمال نہ ہو، حاصل کلام یہ ہے کہ کسی کام کا جواز ان صورتوں میں حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ باہر سے معلوم ہوتا ہے اور استحباب کا پتہ بھی حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ ان قواعد شرعیہ سے ہوتا ہے جو دین کی زندگی میں احتیاط کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ اس لیے احکام میں سے کوئی چیز بھی حدیث ضعیف سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ان میں حدیث ضعیف کے ذریعے استحباب کا احتمال رونما ہوتا ہے اس لیے احتیاط اس پر عمل کیا ہے اور احتیاط عمل کا استحباب خود قواعد شرعیہ سے معلوم ہے۔

مولانا عبدالحی نے اس موضوع کے تفصیلی مباحث اور ان کی گہرائیاں ظفرالامانی میں سمیٹ دی ہیں۔ بہر حال متقدمین ہوں یا متاخرین ضعیف میں اختلاف کے باوجود عمل بالضعیف پر متفق ہیں۔ اگرچہ اس کی وجوہات میں اختلاف ہے۔

متقدمین حدیث ضعیف پر عمل تابعین اور اتباع تابعین کی عملی تائید کی وجہ سے کرتے ہیں اور متاخرین تعدد طرق سے آنے کی بنا پر۔

متاخرین کے مابین جس حدیث ضعیف پر عمل کے بارے میں اختلاف ہے وہ ان کی اپنی اصطلاحی ضعیف ہے۔ اس کا متقدمین کی ضعیف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حدیث و قیاس میں تعارض اور امام اعظم

قانون کی اصولی کتابوں میں قیاس کی جو تعریف کی گئی ہے ہم آپ کو یہاں اس میں الجھانا نہیں چاہتے۔ اس کے تفصیلی مباحث آپ کو انشاء اللہ امام اعظم اور علم الشرائع میں ملیں گے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احکام متناسی میں اور حوادث و واقعات جو روزانہ سنتے پیش آتے ہیں وہ ان گنت ہیں۔ الشہرستانی رقمطراز ہیں:-

ہمیں اس کا قطعاً علم ہے کہ حوادث و واقعات خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، بے حساب اور بے شمار ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں پتہ ہے کہ ہر واقعہ اور حادثہ کے بارے میں صاف اور صریح حکم نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ جب صورت حال یہ ہے کہ حوادث و واقعات ان گنت اور احکام مقررہ ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ لا متناسی متناسی کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ بات حتمی اور قطعی ہے کہ اسلام میں اجتہاد و قیاس کا خاص مقام ہے تاکہ ہر پیش پا افتادہ حال کے لیے اجتہاد کے ذریعے راستہ معلوم ہو سکے۔

قرآن نے ان حوادث کے لیے اعتبار اور نبوت نے اجتہاد کا اُمت کو پروانہ دے کر ایک طرف اسلامی قانون کو باز پھر اطفال بننے سے محفوظ کر لیا اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کو

بے راہ روی، آوارگی اور بے قیاس زندگی کی برائیوں سے بچا لیا۔ اس بنا پر چند گئے چنے لوگوں کو چھوڑ کر پوری امت نے قیاس کی شریعت کو مانا ہے۔ امام شافعی کے مشہور شاگرد امام مزنی رحمہ اللہ قیاس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک دینی معاملات میں فقہاء قیاس سے برابر کام لیتے رہے ہیں۔ ان کا اس پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے لہذا قیاس کا انکار درست نہیں ہے کیونکہ وہ مماثل اشیا پر مماثل احکام کا نام ہے۔ لے حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پیش آنے والے حوادث میں اجتہاد سے کام لیتے تھے اور بعض احکام کو بعض پر قیاس کرتے تھے وہ ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے۔ لے

امام ابوبکر سرخسی نے اس موضوع پر مفید اور بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔ قیاس سے شریعت میں کام لینا صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور ائمہ دین کا مذہب ہے۔ سب سے پہلا شخص جس نے قیاس کے جواز کا انکار

لے جامع بیان العلم وفضلہ - ۲ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷۶۔

لے ان کا نام محمد بن احمد کنیت ابوبکر اور لقب شمس الائمہ ہے۔ شمس ان کی تاریخ وفات ہے۔ اصول فقہ میں ان کی یہ کتاب اب مصر میں طبع ہو چکی ہے۔ حاجی خلیفہ نے ان کی اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب سرخسی نے خوارزم کے جیل خانہ میں لکھی ہے۔ جب باب شردط پر پہنچے تو رہائی ہو گئی آپ فرغانہ پہنچے اور اس کتاب کی تکمیل کراچی (کشف انطون ص ۹۰) فرغانہ کو آج کل تاشقند کہتے ہیں۔ ڈاکٹر حسی نے اپنی تاریخ ادب العرب میں اس کی تصریح کی ہے۔ مولانا عبدالحی نے مدینۃ العلوم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اصول فقہ کی اس کتاب اور شرح السیر البکیر ان دونوں کو شمس الائمہ نے قید میں تصنیف کیا۔ حکام وقت کو نصیحت کی پاداش میں قید کیے گئے تھے (الفوائد البہرہ ص ۵۷) یہ اس مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے جس کا خود شمس الائمہ نے اپنی کتاب بسوط کے مختلف مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ ان کو یہ تکلیف مسئلۃ الزنا تب کے سلسلہ میں اٹھانی پڑی۔ یعنی حکومت کی جانب سے بلا وجہ بھاری بھلی

(باقی صفحہ ۶۶۸ پر)

کیا ہے وہ ابراہیم نظام ہے۔ بغداد کے کچھ متکلمین نے اسی کی پیروی کی ہے۔ بعد ازیں ایک سادہ لوح شخص داؤد نامی گئے اور انہوں نے متقدمین کے اس سے متعلق افکار معلوم کیے بغیر ہی قیاس پر عمل کے ابطال کا اعلان کر دیا۔ اور لوگوں کو بتایا کہ تہذیب میں قیاس حجت نہیں ہے۔ ان کی پیروی میں وہ تمام ظاہریہ جو غور و فکر کی نعمت سے ان کی طرح بے نیاز ہیں کچھ کہنے لگے۔ اور ان میں سے کچھ نے یہی بات قتادہ، مسروق اور ابن سیرین کی طرف منسوب کی ہے۔ یہ ان بزرگوں پر مہتان ہے۔ ان کا مقام اس سے کہیں بالا و بالا ہے کہ وہ اس قسم کی بات کہیں نہ علامہ شوکانی بھی انکار قیاس کی خشیت اول کی نشاندہی میں السرخسی کے ہمزبان ہیں۔

۱۱۸، ۱۱۹۔ اصول سرخسی ص

مذہب کا بقیہ ماشیہ :- ٹیکس لگاتے گئے۔ اس کے خلاف انہوں نے احتجاج کیا ان ٹیکسوں کا فتنہ القدریز میں اس طرح ذکر آیا ہے کالجایات فی زماننا ببلاذ فارس علی لخیاط و الصباغ و غیرہم للسلطان فی کل یوم او الشهر او ثلاثة الشہر یعنی جیسے ہمارے زمانے میں بادشاہ فارس کے لیے درزی، رنگر، وغیرہ روزانہ اور ماہانہ اور سہ ماہی ٹیکس لیا کرتے ہیں (ج ۵ ص ۳۳۲) اس کے بعد حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ شمس الامم نے ان ٹیکسوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بتایا کہ اکثر المنوائب توخذ ظلماً و من ممکن من دفع الظلم عن نفس، فهو خیر من زیادہ ٹیکس ظلماً ہی لیے جاتے ہیں اور جو شخص اپنی ذات سے ظلم دور کر سکتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ ایسا ہی کرے اور ان کو صرف اسی پر اصرار نہ تھا بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ ٹیکس دینا ہی چاہتا ہے تو وہ ایسے شخص کو دے جو ظلم کی خود مدافعت نہ کر سکتا ہو یا ایسے فقیر کو دے جو کسی ظلم کا مقابلہ اس کے ذریعے کر سکے۔ اس طرح دینے والا ثواب کا مستحق ہوگا (فتح القدریز ج ۵ ص ۴۳۲) بظاہر جیل میں قید کی مدت بہت لمبی تھی کیونکہ مبسوط، مشرح السیر البکیر نیز اصول فقہ کا اکثر حصہ جیل ہی میں لکھا گیا ہے۔ شمس الامم کی تحریک کامیاب ہوئی۔ ابن خلدون نے ملک شاہ سلجوقی کے بارے میں لکھا ہے وابطل الملکوس الخفایا فی جمیع البلدان تمام ٹیکس وغیرہ ختم کر دیے۔

اولین شخص جس نے قیاس کا کھلم کھلا انکار کیا نظام ہے۔ اور اس کی معتزلہ میں سے کچھ لوگوں نے پیروی کی ہے مثلاً جعفر بن حرب، جعفر بن جعشر، محمد بن عبد اللہ، ان ہی کے سیکھے تائسے داؤد ظاہری نے باٹے ہیں۔

حافظ ابن عبد البر مغربی نے حافظ ابوالقاسم بغدادی کے حوالے سے بتایا ہے کہ ما علمت احدا سبق، لنظام الی القول بنفی القیاس نظام سے پہلے قیاس کا منکر میرے علم میں کوئی نہیں ہے۔ اور اپنا یہ تاثر ظاہر کیا ہے :

لا خلاف بین فقہاء الامصار و سائر اهل السنة في نفی القیاس فی التوحید و اثباتہ فی الاحکام الاداؤد الظاہری فانہ نفاک۔

فقہاء اور تمام اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ عقائد میں قیاس روا نہیں ہے۔ اور احکام میں درست ہے داؤد نے احکام میں بھی انکار کیا ہے۔

تمام اہل سنت کی قید پر حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ شیعہ کا موقف اس موضوع پر اہل سنت سے بالکل جدا ہے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ فرماتے ہیں : ایک طبقے نے قیاس کے موضوع پر شدید مخالفت کی ہے ان میں سب سے مخالف شیعہ ہیں وہ اسے قطعاً حجت نہیں مانتے ہیں۔

۱۔ ابراہیم بن سبیر نظام غالی معتزلی ہے اس کے حالات کے لیے الفرق بین الفرق ص ۱۱۳ تا ۱۲۶ دیکھئے۔ سان المیزان ج ۱ ص ۶۴۔ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۹۴۔ خطیب لکھتے ہیں کان احد فرسان اهل النظر والكلام على مذهب المعتزلة۔ الحی فظ بھی ان کے ہی شاگرد ہیں شعر میں صرف ملکہ ہی نہ تھا بلکہ لکھا ہے کہ وقت معانی کے مالک تھے۔ المرزبانی کا بیان ہے کہ ترقیق شعر اور ترقیق معانی میں نظام ایک مثالی شخصیت تھے تاریخ بغداد، ۲۔ ارشاد المغول ص ۱۸۶۔ ۳۔ جامع بیان العلم و فضله ج ۲۔

ان کے بعد اہل الظاہر ہیں اور ان کے سرگروہ داؤد ظاہری اور مذہب
ظاہریہ کے مشہور ناشر حافظ ابن حزم ہیں۔

الغرض یہ مسئلہ اہل حق میں کوئی خاص اختلافی نہیں ہے اور جن کو اختلاف ہے ان کی مخالفت
اجماع میں قاذح نہیں ہے جیسا کہ سیوطی نے تصریح کی ہے۔
البتہ محل بحث یہ ہے کہ اگر قیاس اور خبر واحد میں تعارض ہو جائے تو کیا کیا جائے۔
کیا خبر واحد کو مخالف قیاس ہونے کی وجہ سے رد کر دیا جائے اور یا پھر خبر واحد کو قبول
کر کے قیاس کو رد کر دیا جائے۔

اس موضوع پر امام اعظم کی ترجیحانی کرتے ہوئے بیگانوں نے نہیں بلکہ یگانوں نے کچھ
پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

فخر الاسلام ہندوی علی بن محمد کا کہنا یہ ہے کہ اگر خبر واحد کے راوی اصحاب کبار ہوں مثلاً خلفاء
راشدین، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری، عائشہ اور دیگر صحابہ
جو علم و فضل میں شہرت رکھتے ہوں تو ان کی روایت کردہ حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دی جائے
گی۔ خود فخر الاسلام نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کا حفظ و ضبط بڑا کٹھن کام ہے
آپ کو اللہ کی جانب سے شان جامعیت ملی تھی۔ صحابہ میں روایت
بالمعنی کا عام رواج تھا۔ اگر راوی حدیث کے معلوم کرنے اور اس
کا احاطہ کرنے سے قاصر ہو تو اس بات کا خطرہ درپیش ہوتا ہے کہ
حدیث کا کوئی جز اس سے نہ رہ جائے اور اس طرح حدیث میں قیاس
سے ایک شبہ زائد داخل ہو جائے گا لہذا اس میں احتیاط بھی زیادہ
چاہیے۔ اور اس قصور فہم سے ہمارا مطلب صرف مقابلے کے وقت
میں فقہ حدیث میں احتیاط ہے صحابہ کی تحفہ ہرگز مقصود نہیں ہے
امام محمد متعدد مواقع پر امام ابو حنیفہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں
نے انس بن مالک کی روایت کو اپنا یا ابو ہریرہ تو ان سے بڑھ کر ہیں

اس باب میں ہمارے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ ایسے راویان حدیث کی روایت اس وقت ترک کی جائے گی جب اس کے قبول کرنے میں کسی طرح کی گنجائش نہ ہوگی۔ جب قیاس کے سبب دروازے بند ہو جائیں گے اس وقت وہ حدیث کتاب اور سنت مشورہ کی مخالفت تصور کی جائے گی اور اجماع کی بھی بلے

فخر الاسلام بزدوی نے امام اعظم کا جو موقف قرار دیا ہے یہ دراصل امام اعظم کا نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان کا موقف ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالغفر بن بخاری رقمطراز ہیں؛
هذا مذهب عیسیٰ بن ابان و تابعہ اکثر المتأخرین۔

یہ عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور اسی کی اکثر متاخرین نے پیروی کی ہے ورنہ جہاں تک امام اعظم کے اس موضوع پر موقف کا تعلق ہے وہ نہیں جو فخر الاسلام بتا رہے ہیں بلکہ وہ ہے جو ان کے بھائی صدر الاسلام سے صاحب تحقیق نے نقل کیا ہے کہ حدیث

لے کشف الاسرار ج ۲ ص ۱۶۔

۱۵ یہ دو بھائی ہیں۔ ایک کا نام علی بن محمد لقب فخر الاسلام، کنیت ابوالحسن ہے۔ اور ان کے چھوٹے بھائی کا نام محمد بن محمد لقب صدر الاسلام اور کنیت ابوالیسر ہے۔ دونوں بھائی اپنے وقت کے امام ہوتے۔ ان کے جد امجد علامہ عبدالکریم صرف یہی نہیں کہ امام الہدی ابوالمنصور الماتریدی کے تلامذہ میں سے تھے بلکہ اپنے وقت میں درس و تدریس کا حلقہ بھی انہوں نے قائم کیا تھا۔ فخر الاسلام سمرقند کے قاضی تھے اور صدر الاسلام کا مستقر بخارا تھا۔ آخر زمانے میں بڑے بھائی کے انتقال کے بعد صدر الاسلام کو بھی سمرقند کا قاضی القضاۃ بنادیا گیا۔ کان قاضی القضاۃ بسمرقند (الجواہر ج ۲ ص ۲۷۱) دونوں صاحب تصنیف ہیں۔ صدر الاسلام کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب ”اصول دین ہے“، علامہ قاسم بن قطلوبغا نے ان کی تصانیف کے بارے میں ان کے شاگرد رشید نجم الدین محمد نسفی صاحب عقائد نسفیہ کا یہ تاثر لکھا ہے کہ قدملاً الشرق والغرب بمؤلفاتہ فی الاصول والفروع۔ فخر الاسلام کی تصانیف میں ایک سے زیادہ کتابیں ہیں۔ مورخین نے ان کو امام فی الدنیا فی الفروع والاصول لکھا ہے۔ فخر الاسلام کی وفات بخارا میں رجب ۸۲۷ھ میں ہوئی۔ اور صدر الاسلام کی وفات رجب ۸۹۳ھ میں ہوئی ہے۔

اور قیاس میں اگر تعارض ہو جائے تو حدیث کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا بشرطیکہ حدیث صحیح ہو اور کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ صدر الاسلام نے امام اعظم کے اس مسلک کی توجیہ فرمائی ہے کہ راوی کی عدالت اور ضبط ثابت ہو جانے کے بعد روایت میں تغیر و تبدل کا خیال ایک امر مہموم ہے۔ ظاہر ہے کہ راوی جو کچھ پیش کرتا ہے یہ اس کی سنی ہوئی بات ہے بالفرض اگر الفاظ میں اس کی جانب سے کوئی تغیر بھی ہوتا ہے تو یہ ایسا تغیر نہیں ہوتا جس سے مطلب بدل جائے کیونکہ ارباب عدالت راویوں کے بارے میں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ اہل زبان ہیں اور زبان دانی کے ساتھ معنی کی تبدیلی کا گمان محض ایک خیال ہے اور ان کی عدالت و تقویٰ مان کر ان پر زیادتی اور کمکی کا شبہ کرنا بھی بے محل ہے۔ نیز جس قیاس کی بنا پر روایت کو رد کیا جا رہا ہے خود اس قیاس کی صحت ہی کی کیا ضمانت ہے؟ قیاس صحیح سے واقفیت بھی دشوار تر ہے لہذا حدیث کو اپنا ضروری ہے۔

شیخ ابوالحسن کرخی نے بھی امام اعظم کے مسلک کی یہی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعزیز بخاری فرماتے ہیں:

شیخ ابوالحسن کرخی اور ان کے ہمناؤں کے نزدیک حدیث کے قیاس پر مقدم کرنے کے لیے راوی کی فقہیت شرط نہیں ہے بلکہ روایت کی قبولیت کے لیے صرف راوی میں عدالت اور ضبط ہونا کافی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ حدیث قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ بلاشبہ ایسی حدیث کو قیاس پر بھی مقدم کیا جائے۔

حافظ ابن الہمام نے بھی امام اعظم کا یہی مسلک بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اذا تعارض خبر الواحد والقیاس بحیث لا جمع قدم الخبر مطلقاً عند الاکثر منہم ابو حنیفۃ والشافعی واحمد

حدیث اور قیاس میں اگر تعارض ہو جائے اور کسی طرح بھی دونوں کا باہم جمع کرنا ممکن نہ ہو تو پھر حدیث کو بلا شرط مقدم کیا جائے گا۔ اکثر کی رائے یہی ہے ان ہی میں ابو حنیفہ، شافعی اور احمد ہیں۔
دوسرے اکابر نے امام اعظم کے اس موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں لیکن علامہ عبدالعزیز بخاری نے اسی سلسلے میں جو بات پوری ثبوت سے بتائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں :

جو بات فخر الاسلام نے پیش فرمائی ہے یہ ہمارے اصحاب سے قطعاً منقول نہیں ہے ان سے اس کے برعکس جو کچھ روایت ہمیں معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہے اور اس بارے میں تفصیلاً ان سے کچھ بھی مروی نہیں ہے۔ واقعات بھی اسی نظریہ کے مؤید ہیں۔ چنانچہ حدیث ابی ہریرہ کی وجہ سے بھول کر کھانے پینے سے روزہ ٹوٹنے کا فیصلہ ابو حنیفہ نے اسی بنا پر کیا ہے حدیث اگرچہ خلاف قیاس ہے لیکن اس کے باوجود اسی پر عمل ہے حتیٰ کہ امام اعظم سے منقول ہے کہ لولا الروایۃ لقلت بالقیاس۔ اس موضوع پر اگر یہ روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے کام لیتا۔ اور یہ بھی امام اعظم سے منقول ہے کہ ما جاءنا عن الله والرسول فهو على الناس والعين لله اور اس کے رسول کی جانب سے جو کچھ ہمارے پاس آئے وہ ہمارے سرانگھوں پر ہے۔ اس بنا پر ہمارے اسلاف میں سے کسی سے بھی روایت کی صحت کے لیے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط منقول نہیں ہے بلاشبہ یہ بات بعد کو گھڑی گئی ہے۔

فقہ احناف میں جن روایات پر عمل نہیں کیا گیا ہے مثلاً حدیث عرایا، حدیث مصراۃ، اور حدیث قرعہ، اور جن کے متعلق لوگوں نے عمل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ خلاف قیاس ہیں۔

ان کا جواب دیتے ہوئے امام علامہ ابوالحسن کرخی رقمطراز ہیں :

یہ غلط ہے کہ ہمارے اصحاب نے ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ یہ خلاف قیاس ہیں بلکہ ان حدیثوں پر عمل نہ کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف ہیں۔ اور یہ وجہ بھی نہیں کہ ان کے راوی نقاہت کی نعمت سے محروم ہیں۔ حدیث عربیہ سنت مشہورہ کے خلاف ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ التمس بالحق مثل بشل کیل بکیل کجور کے بدلے کجور برابر برابر ہم یہ تسلیم کرتے کو ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ابو ہریرہ فقیر نہیں تھے۔ آپ زمانہ صلحاہ میں فتویٰ دیتے تھے حالانکہ اس زمانے میں غیر فقیہ کے فتویٰ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ نے ان کے حتیٰ میں دعائے خیر فرمائی ہے اور آپ سے روایت کردہ حدیثوں کو کافی شہرت ہوئی ہے۔

بہر حال یہ حقیقت بے غبار ہے کہ امام اعظم اور آپ کے اصحاب سنت بلکہ اخبار احوال تک کو قیاس کے مقابلے میں راجح قرار دیتے تھے اور یہی امام اعظم کے موقف کی صحیح ترجمانی ہے۔

حدیث میں امام اعظم کے اصول

حدیث کی صحت اور اس کی قبولیت کے بارے میں امام اعظم نے جو اصول مقرر فرمائے ہیں۔ اور اس فن میں جو ایک فن کار کی حیثیت سے علمی خدمت سرانجام دی ہے اس کی ایک ادنیٰ سی جھلک آپ بالا صفحات میں دیکھ چکے ہیں اور آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ تیسری صدی میں امام شعبہ اور یحییٰ بن معین کے زمانے تک امام اعظم کی ذات گرامی اس فن میں ارباب حدیث کے یہاں صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی شخصیت تھی۔

امام اعظم کے وضع فرمودہ اصولوں کے بارے میں کچھ بزرگ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس کے نتیجے میں یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ امام اعظم کے

نام سے اس موضوع پر جو بھی سرمایہ ہے وہ سب یار لوگوں کا گھڑا ہوا ہے اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خاص خطیبانہ انداز میں برملا کہہ دیا کہ

امام ابو حنیفہ اور ان کے صاحبزادے کو ان اختراعی اصول و قواعد کا وہم و خیال بھی نہ گزرا ہو گا۔

میرے خیال میں یہ ان بزرگوں کی جانب سے بہت بڑی زیادتی ہے۔

در اصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں اپنے مزاج کے لحاظ سے الگ الگ ہیں صحت حدیث اور قبولیت حدیث۔

صحت حدیث کے لیے اصول و قواعد اور قوانین و ضوابط بنانا اگر محدثین کا کام ہے تو قبولیت کے لیے شرائط اور قواعد مرتب کرنا ارباب اجتہاد اور فقہاء کا کام ہے۔ حدیث کی صحت کے لیے بخاری اور مسلم کے نام سے جو شرائط، جو اصول و قواعد اور جو ضوابط متناخرین نے بنائے ہیں اور بتائے ہیں ان میں ایک بھی معاصرت اور تقاضا کو مستثنیٰ کر کے امام بخاری اور امام مسلم سے صراحتاً منقول نہیں ہے۔ بلکہ بتانے والوں نے کھلے بندوں یہ انکشاف کیا ہے۔

اعلم ان البخاری و مسلماً و من ذکرنا بعدہم لم یقل

عن واحد منهم انه قال شرطت ان اخرج فی کتابی

ما یکون علی الشرط الفلانی و انما یعرف ذالک من

سیر کتبہم فیعلم بذالک شرط کل رجل منهم۔

امام بخاری اور مسلم وغیرہ سے ایسی کوئی ثابت تصریح نہیں آتی جس میں ان بزرگوں نے یہ بتایا کہ کتاب میں تخریج روایت کی فلاں شرط کی میں نے پابندی کی ہے ان کی شرائط کا پتہ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے اور بس۔

الجزائری بھی علامہ مقدسی کے ہم زبان ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اعلم ان البخاری لم یوجد عنده تصریح بشرط معین

وانما اخذ ذالک من تسمیة الکتاب والاستقراء من تفرقه

خود بخاری کی کسی شرط کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے ان کی کتاب کے نام اور کتاب میں ان کے تفرقات سے لوگوں نے خود یہ اخذ کر لیا ہے۔

اگر حدیث کی صحت کے لیے شرائط و ضوابط کا پیمانہ ان بزرگوں کے طرز عمل سے معلوم کر کے بنایا جاسکتا ہے اور اسے ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے تو پھر ائمہ مجتہدین ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد کی کتابوں میں طرز عمل سے اگر متاخرین نے کچھ قواعد معلوم کر کے ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیے تو اس میں کون سی قباحت ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ صحت حدیث کے موضوع پر قوانین کی تخریج کو صرف برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ اس پر سختیں و آفرین کے نعرے لگاتے جاتے ہیں۔ لیکن قبولیت حدیث کے میدان میں ائمہ اجتہاد کی طرف منسوب اصول و قوانین طبع نازک پر گراں ہوتے ہیں اور ان پر تخریجی سونے کی پھبتی اور اختراعیت کا آوازہ کسا جاتا ہے فیاللاسف ویا للعاد والی اللہ المشتکی دوسرے علوم و فنون کی طرح حدیث بھی ایک فن ہے اس کے بھی دوسرے علوم کی طرح تقاضے ہیں۔ بتایا جاتے آئندہ کون سا علم ہے جس میں قواعد و ضوابط تخریجی نہیں ہوتے۔ اشتقاق، تصریف، معانی، بدیع، بیان، نحو وغیرہ زبان اور لغت سے متعلق اصول و قوانین کا نام ہے۔ کیا ان میں کوئی بھی منصوص ہے؟ سب کے سب بعد میں آنے والوں کے اختراعی اور تخریجی قوانین و ضوابط ہیں۔ اس طرح کی تخریج اگر علمی طور پر غلط ہے تو علوم و فنون کی پوری دنیا مشکوک ہو کر رہ جائے گی اور کسی فن کے قواعد و ضوابط کو بھی اعتماد و وثوق کا پروانہ نہیں مل سکتا۔

اس سلسلے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کا اسم گرامی بھی پیش کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور انصاف میں ان اصول و ضوابط کے تخریجی ہونے کی تصریح کی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا اختلاف بنیادی وغیرہ کی کتابوں میں بیان شدہ اصولوں پر مبنی ہے لیکن

امرواقع یہ ہے کہ یہ اصول زیادہ تر ان کے اقوال پر تخریج کیے گئے ہیں بلکہ
 شاہ صاحب کی اس عبارت سے یہ سمجھنا کہ جملہ قواعد کا علمی سرمایہ تخریجی ہے اور چونکہ تخریجی ہے۔
 اس لیے یہ سرمایہ ناقابل اعتبار ہے بہت بڑی زیادتی اور بے انصافی ہے۔ شاہ صاحب تو اس
 عبارت کے ذریعے اپنے مخاطبوں کے دماغوں میں مقدسی اور حازمی کی طرح ان قواعد کی تاریخی
 حیثیت پیش فرماتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ قوانین تخریجی ہیں اور صاحب مذہب سے
 خود مروی نہیں ہیں اور اس موضوع پر شاہ صاحب کے اس انکشاف کی حیثیت حرف بحرف
 وہی ہے جو مقدسی اور حازمی کے اس انکشاف کی ہے کہ صحت حدیث کے موضوع پر شرائط وغیرہ
 کا سرمایہ بخاری و مسلم کا خود ساختہ اور پرداختہ نہیں ہے بلکہ ان کے بعد میں آنے والے
 محدثین کا اختراعی اور تخریجی ہے جیسا کہ آپ پہلے سن آئے ہیں۔

انصاف ہی میں شاہ صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ
 ان قواعد کی پابندی اور ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات میں
 تکلف سے کام لینا جیسا کہ نزدیکی کا کام ہے۔ متقدمین کا ہرگز
 شبہ نہیں ہے بلکہ

شاہ صاحب کے اس ارشاد کی حیثیت بھی بالکل اس محاکمہ کی ہے جو حافظ ابن الہمام
 نے ان متاخرین محدثین کے جواب میں پیش کیا ہے جنہوں نے حدیث کی اصحیت کو بخاری و
 مسلم کے دائرے میں محدود کر دیا تھا۔ حافظ ابن الہمام نے بتایا کہ
 یہ خواہ مخواہ کی آپسج ہے اس میں کسی کی تعلید روا نہیں ہے
 کیونکہ اصحیت کا مدار تو صرف ان شروط پر ہے جو ان بزرگوں نے
 اپنی کتابوں میں ملحوظ رکھی ہیں۔ اگر یہی شرطیں ان دو کتابوں
 کے علاوہ کہیں اور بھی پائی جائیں تو پھر اصحیت کو ان میں محدود
 کرنا بالکل بے معنی ہے۔

یہ بات حافظ ابن الہمام نے ان سے کہی ہے کہ جو صحیحین کی حدیثوں کی اصحیت کا صرف
 صحیحین میں ہونے کی وجہ سے دعویٰ کرتے ہیں۔ اور تو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو

شیخ ابن الہمام کے خلاف استغاثہ کرنا پڑا۔ وہ فرماتے ہیں :

ابن الہمام نے اس طرح کے اصول بنانا شروع کر دیے کہ صحیحین کی ترجیح صحیحین کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ان شروط کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اگر دوسری کتاب کی روایت بھی ان شرطوں پر آئی تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہو جائے گی حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان شروط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے۔ اور اس پر تمام اُمت کا اتفاق ہو چکا ہے یہ

اتفاق اُمت، شہرت اور قبول کی پوری داستان محدثین کی زبانی آپ پہلے سُن چکے ہیں اس لیے یہاں اس کا تکرار بے معنی ہے۔

بہر حال اگر شاہ صاحب اور حافظ ابن الہمام دونوں کا آپ موازنہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ دونوں میں ایک رُوح کام کر رہی ہے فرق ہے تو صرف یہ کہ شاہ صاحب متاخرین فقہاء کے بائے میں وہی بات کہہ رہے ہیں جو ابن الہمام نے متاخرین محدثین کے بائے میں کہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اصول و قواعد صحت حدیث سے متعلق ہوں یا قبولیت سے۔ دونوں تخریجی اور اختراعی اور بعد میں آنے والوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ نہ تو محدثین کے یہاں صحت حدیث کے اصول بذریعہ وحی آتے ہیں اور نہ فقہاء کے پاس قبولیت حدیث سے متعلق قوانین منصوص ہیں۔ اگر قواعد و ضوابط کو یہ کہہ کر پس انداز کر دیا جائے کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں تو تمام نظام شریعت درہم برہم ہو جائے گا۔

اس میں علمی طور پر کوئی شک نہیں کہ اصول و قواعد تخریجی ہیں اس لیے ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہاں اس کی جگہ یہ بات عقل کو اپیل کرتی ہے کہ فن کے قواعد اہل فن کے بنائے ہوئے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ کسی فن میں غیر فنکاروں سے استفادہ فن سے اعتماد ہٹا دینا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الزہری اس موقع پر بڑے سہمتے کی بات فرما گئے۔

تمام اسلامی فرقے اس پر متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی

بات جنت ہو گی۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو علوم و فنون کی دنیا ختم ہو جائے
کیونکہ انارمی اول تو فن میں بات نہ کر سکے گا اور اگر بات کرے گا
تو غلط کرے گا۔

یہ بات تو مبنی بر انصاف ہے لیکن اس میں کوئی معقبت نہیں ہے کہ اصول و قواعد کو
تخریبی بنا کر غیر معتبر قرار دیا جائے۔ اسے اگر بطور اصل تسلیم کر لیا جائے تو فنِ قرارت میں
تجوید کے اصول، ادب و لغت میں لغت و زبان کے قواعد، فقہ میں اصول فقہ، حدیث میں
اصول حدیث، تفسیر میں اصول تفسیر سب ہی انسانوں کے وضع کردہ اور تخریبی ہیں۔ ان کو
اگر یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ وضعی اور تخریبی ہیں تو اسلام کے پورے علمی سرمایہ سے دستبردار
ہونا پڑے گا۔ اصول و قواعد حدیث کے ہوں یا فقہ کے۔ سب انسانی محنتوں کے رہیں منت
ہیں اس لیے یہ کہنا کچھ وزن نہیں رکھتا کہ احناف نے کچھ شرطیں لگالی ہیں جیسا کہ حافظ ابن
تیمیہ نے مجموعۃ الرسائل میں لکھا ہے۔

بہت سے اہل الرائے نے اکثر احادیث کا ایسی شرطوں کی وجہ سے
انکار کر دیا جو انہوں نے خود لگائیں۔

کس قدر انسوس کی بات ہے کہ حدیث کی صحت کے لیے اگر محدثین متاخرین شرطیں مقرر
کریں تو یہ درست اور علم کی خدمت سمجھی جائے اور حدیث ہی کی قبولیت کے میدان میں
اللہ کے دین میں احتیاط کی خاطر اگر احناف شرطیں بتائیں تو ان کو خود لگائی ہوئی شرطیں
قرار دیا جائے۔ دونوں اُمتی ہیں دونوں فن کی خدمت اللہ کے دین کی خاطر کر رہے ہیں دونوں
کا پیش مناد دین کی حفاظت ہے دونوں میں یہ امتیاز کچھ قرین انصاف نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ اصول و ضوابط بخاری و مسلم کی طرح امام اعظم سے صراحتہ منقول نہیں
ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تدوین قانون کے موقع پر حدیث کے بارے میں کچھ
ضوابط ان ائمہ مجتہدین کے ضرور پیش نظر ہوں گے جن کی روشنی میں انہوں نے حدیث و
سنت کو قانون سازی میں استعمال کیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے حدیث کی تصنیف کے
موقع پر کچھ قوانین و ضوابط ضرور ائمہ ستہ حدیث کے پیش نظر تھے جن کی روشنی میں انہوں نے

حدیث کے یہ مجامیع تیار کر کے اسلام کی پیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ ان سے اگر صراحتہً اصول و ضوابط کا کوئی سرمایہ منقول نہیں ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت حدیث کے لیے ان بزرگوں کے پیش نظر کوئی ضابطہ ہی نہ تھا ایسے ہی حدیث کی قبولیت کے بارے میں اگر ائمہ مجتہدین ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد سے اصولی سرمایہ صراحتہً منقول نہیں تو اس کا بھی ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تدوین شریعت کے میدان میں یہ بزرگ حدیث کی حد تک کسی قاعدے اور آئین کے پابند نہ تھے۔ یقیناً آپ کچھ قواعد کے ضرور پابند ہوں گے۔ باقی ان کا مدون نہ کرنا۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں اصول و قوانین کا وجود ہی نہ تھا اور تدوین شریعت کا سارا کام محض جزاف سے ہو رہا تھا۔

جن علماء نے اصول و قوانین پر تدوین کی خدمت انجام دی ہے انہوں نے اس کو ائمہ مذہب سے منقول فروعی علمی سرمایہ سے اخذ کر کے ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج، اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ، الرد علی سیر الاوزاعی اور امام محمد کی الحجۃ علی اہل المدینہ، موطا، کتاب الامارہ پر ایک نثرانہ نگاہ ڈال کر امام اعظم کے استدلال کے قواعد عامہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحب کا منشا

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اپنے مطالعہ میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاہ صاحب انصاف اور حجتہ اللہ میں ان اصول و قوانین کے خلاف نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان جیسے حضرات کی ان آراء کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر حنفی فقہ میں داخل ہو گئی ہیں اور جن کو بعض جاہد قسم کے فقہاء نے جدل و مناظرے کے لیے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اس احتجاج میں شاہ صاحب منفرد نہیں بلکہ امام ابو الحسن کرخ اور حافظ ابن الہمام کی زبانی آپ پہلے اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ چنانچہ جن قواعد کا نام لے کر شاہ صاحب نے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ صاحب مذہب سے منقول نہیں ہے۔ وہ ان کے لیے جن محققین کا حوالہ دیا ہے وہ وہی آراء ہیں جن کو متاخرین نے اصول کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ان قواعد کے ائمہ مذہب سے منقول نہ ہونے پر محققین کا یہ قول

کافی ہے کہ یہ قاعدہ کہ ایک راوی جو ضبط و عدالت میں معروف ہو مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو تو اس کی وہ روایت واجب العمل نہ ہو گی جس سے رائے اور قیاس کا دروازہ بند ہو جانا ہو جیسے حدیث مصراۃ۔ یہ عیسیٰ بن ابان کا مذہب سب سے اور بہت سے متاخرین اس کے قائل ہیں۔ لیکن امام کمرخی اور بہت سے علماء کے نزدیک راوی کا فقیہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ قول ہمارے اصحاب سے منقول نہیں ہے بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث قیاس پر مقدم ہے۔

یہ تصریح اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ شاہ صاحب اصول و قواعد کی مطلق نفی نہیں فرماتے ہیں جو ائمہ نے ارباب مذاہب کی فروعات سے اخذ کیے ہیں بلکہ ان آراء کی تردید کرتے ہیں جن کا نام اصول رکھ لیا گیا ہے اور جن کا ارباب مذاہب سے تعلق نہیں ہے ورنہ جہاں تک ان اصول و قواعد کا تعلق ہے جو ہم نے کتاب میں حدیث کے موضوع پر امام اعظم کا نام لے کر پیش کیے ہیں وہ امام اعظم نے دلیل و برہان کے تحت اختیار کیے ہیں اور ان پر آج تک کسی بھی محدث نے یہ تنقید نہیں کی ہے کہ یہ انتہائی ہیں اور امام اعظم سے ثابت نہیں ہیں۔ اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے محدثین کی پوری پوری حمایت حاصل ہے۔ بلاریب جیسے معافی قرآن سے تصادم کے موقع پر کسی حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ حدیث کی موجودگی میں قیاس سے متعلق بحث و اجتہاد کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ حکیم الامت نے امام اعظم کے اس موقف کی یہ کہہ کر وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں؛ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ روزے دار اگر بھول کر کھاپی لے تو امام اعظم حضرت ابوہریرہ کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے روزہ نہ ٹوٹنے کا فتویٰ دیتے ہیں حالانکہ روایت ابی ہریرہ قطعاً خلاف قیاس ہے اس موقع پر امام اعظم فرماتے ہیں کہ اگر روایت نہ ہوتی تو میں قیاس کے مطابق فتویٰ دیتا۔

اسی سے ان تمام اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین کا اندازہ لگا لیجئے جو حدیث سے متعلق آپ پیچھے اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔

اصول و ضوابط صحت و قبولیت حدیث

ادب باب روایت اور ائمہ اجتہاد کے نقطہ نگاہ میں چونکہ بنیاد ہی پر ایک عظیم فرق ہے۔ اس لیے ان کے پیش فرمودہ اصول و ضوابط میں بھی اختلاف ناگزیر ہے جو حیثیت محدثین کی حدیث کی صحت اور رجال اسناد میں ہے وہی حیثیت مجتہدین کی حلال و حرام کے احکام کی معرفت میں ہے اور دونوں میں ایسے بھی ہیں جن کو دونوں فنوں میں امامت حاصل ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کتاب الاستغاثہ میں جو بکری کی تردید میں لکھی ہے رقمطراز ہیں۔

امام یحییٰ بن معین، بخاری، مسلم، ابوسلم، ابوزرعہ، نسائی، ابن عدی، دارقطنی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی حیثیت رجال اور صحیح و ضعیف احادیث کے بارے میں وہی ہے جو امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی احکام اور حلال و حرام کی معرفت کے باب میں ہے۔ اور ائمہ میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو محدثین میں بھی امام ہیں اور فقہائیں بھی اور دونوں جماعتوں میں شامل ہیں۔ گو ان میں سے ایک جماعت کی طرف ان کا انتساب زیادہ موزوں ہے۔ اور حدیث و فقہ کے اکثر امام جیسے مالک، شافعی، احمد اور اسحاق ابن راہویہ اور اسی طرح اوزاعی، ثوری اور لیث ایسے ہی تھے اور اسی طرح ابو یوسف صاحب ابی حنیفہ اور خود امام ابو حنیفہ کا بھی وہ ہی مرتبہ ہے جو ان کے شاہان شان سے ہے۔

محدثین کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا ہے اور بس۔ اس لیے ان پر اخباری نقطہ نظر غالب ہے اور وہ روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں صرف اس کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ اسناد و رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہے؟

اس کے برعکس مجتہدین کے پیش نظر صرف اسناد و رجال ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کے پیش نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کا پورا سسٹم ہوتا ہے اس بنا پر حدیث کی قبولیت کے ضوابط ان کے یہاں اس کے زیر اثر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام حازمی فرماتے ہیں:

اما الفقہاء فمدارک الضعف عندهم مخصوصة و جعلها منوطا بمرعاة ظاہر الشرع۔

فقہاء کے یہاں اسباب ضعف حدیث محدود ہیں اور ان میں غلطیہ تدریجہ کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث ظاہر شریعت سے کس قدر موافق ہے یہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے شریعت کے پورے سسٹم پر نظر ہونے کا مطلب بتایا ہے کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچ علموں کا جامع ہو۔ قرآن کی قرأت اور تفسیر، احادیث کا علم مع اسانید اور صحیح و ضعیف کی معرفت، مسائل میں سلف کے ارشادات سے واقفیت، ۶ بی زبان کا علم، استنباط مسائل اور نصوص میں تطبیق کا علم یہ مولانا محمد اسماعیل الشہید نے مجتہدین کو شریعت کے پورے سسٹم پر بحیثیت مجموعی نظر ہونے میں انبیاء کے مشابہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

پس مشابہ با نبیاء دریں فن مجتہدین مقبولین اند۔ پس ایشان را از ائمہ فن باید شمر و مثل ائمہ اربعہ۔ ہر چند مجتہدین بسیار از بسا گزشتہ فاما مقبول در میان جمہور امت ہمیں چند اشخاص اند۔ پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشان گردیدہ۔ بناء علیہ در بیان جمہور اسلام از خواص و عوام بقلب امام معروف گردیدند۔

اس فن میں انبیاء سے مشابہت رکھنے والے مجتہدین ہیں ان کو اس فن کا امام سمجھنا چاہیے جیسے ائمہ اربعہ۔ اگرچہ مجتہدین بہت ہوتے ہیں لیکن جمہور امت میں مشہور یہی چند ہستیاں ہیں۔ اس لیے گویا پوری پوری مشابہت اس فن میں ان کے ہی حصہ میں آتی ہے

یہی وجہ ہے کہ جمہور اُمت کے خواص و عوام میں یہی بزرگ امام کے لقب سے مشہور ہوتے ہیں۔^۱
 اور امامت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ
 امامت درہر کمال عبارت است از حصول مشابہت تامہ بانبیاء اللہ
 در اہ کمال۔

اور علامہ شاطبی نے اسی کمال کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ
 انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين احدهما
 فہو مقاصد الشريعة علی کمالها والثانی من الاستنباط۔
 درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو ملتا ہے جو دو صفتوں سے موصوف
 ہوتا ہے ایک یہ کہ پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو۔ دوسرے
 یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔^۲

اسی کی جھلک آپ ان اصولوں میں دیکھیں گے جو ان بزرگوں نے رد و قبولیت روایات
 لیے وضع فرماتے ہیں اور جن کے پیش نظر ان بزرگوں کی یہ حیثیت نہیں وہ ذرا سے فکری لغت
 کو دیکھ کر بدک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جس طرح روایت و اسناد کو شب و روز کنگھالنے
 کنگھالنے محدث کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح اور غیر صحیح سند کو اپنے ذوق سے پہچان لیتا ہے
 چنانچہ تہانے والوں نے عبدالرحمن بن مہدی کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے۔
 میں نے عبدالرحمن بن مہدی سے دریافت کیا کہ آپ سلسلہ روایت
 میں جھوٹے کا پتہ کیسے لگالیتے ہیں؟ فرمایا جیسے حکیم مجنون کا پتہ
 لگالیتا ہے۔

اور اسی کمال کو وہ اپنے الفاظ میں یوں تعبیر کرتے تھے کہ:

معرفۃ الحدیث الہام
 حدیث کی معرفت الہام ہے۔^۳

ٹھیک ٹھیک اسی طرح مجتہد کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ متن حدیث پر نظر ڈالتے ہی یہ تباد

ہے کہ حدیث شریعت اسلامیہ کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے یا نہیں۔ احادیث پر نظر ڈالتے وقت مجتہد کا یہی ملکہ رد و قبول کا معیار بن جاتا ہے۔ شریعت کا مزاج عین مزاج نبوت ہے جو شخص شریعت کے مزاج کو سمجھتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ متون احادیث کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ ان میں سے کون سا ارشاد اور کون سا عمل صاحب نبوت کا ہو سکتا ہے۔ بہر حال صحیح اور غیر صحیح سند کو پہچاننے کا ملکہ ہو جو محدثین کو ہوتا ہے یا متن حدیث کے رد و قبول کا ملکہ ہو جو مجتہدین کو ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں حالتیں سر تا سر ذوقی ہیں اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی ہیں اس لیے ان میں باہم اختلاف کی گنجائش ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے متن حدیث کی حد تک جیسے ائمہ مجتہدین میں بکثرت مسائل میں اختلاف ہوا ہے ایسے ہی صحت اسناد کی حد تک ائمہ روایت کے ذمیان بھی روایات میں بکثرت اختلافات ہوتے ہیں :

ایک حدیث کو امام مسلم اس سند ہی کے ساتھ اپنی صحیح میں لاتے ہیں کہ
لیس کل شیء عندی صحیح وضعتہ ہما انما وضعت ہما
ما اجمعوا علیہ ۔

ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں
درج نہیں کیا۔ میں نے صحیح مسلم میں صرف ان حدیثوں کو درج
کیا ہے کہ جن کی صحت پر شیوخ کا اجماع ہے لے

لیکن اس کے باوجود بہت سی حدیثیں ہیں جن کو کسی علت قاذمہ کی بنا پر امام بخاری نے
روایت نہیں کیا۔ یہاں حافظ عبد القادر قرطبی کا بہت قیمتی بیان پڑھنے کے لائق ہے جو انہوں
نے ایک ناقد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

حافظ رشید عطار نے ان حدیثوں پر ایک کتاب لکھی ہے جو
صحیح مسلم میں مقطوع آتی ہیں۔ اس کتاب کا نام ”الفوائد المجموعہ
فی شان ما وقع فی مسلم من الاحادیث المقطوعہ“ ہے۔ اور یہ جو
لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حدیث کو اگر شیخین روایت کر لیں تو معاملہ ہمارے

ہے۔ فنی لحاظ سے یہ محض ادعائے اور حدیث کی قوت کی یہ کوئی قانونی ضمانت نہیں ہے۔ آخر یہ مسلم ہی تو ہے جس میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے بھی روایات آتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مسلم میں اس قسم کے راویوں کی روایات کا درجہ محض شواہد، توابع اور اعتبار کا ہے درست نہیں ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ شواہد اور توابع کی مدد سے کسی حدیث کا حال معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ امام مسلم نے کتاب میں اگر صحیح کا التزام کیا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ وہ حدیث جو خود ان راہوں سے آتی ہو وہ صحیح کیسے ہوگی؟ سب مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ محدثین کے یہاں حدیث میں اَنَّ اور عَنْ کی تعبیر القطاع کی نشاندہی کرتی ہے لیکن بخاری اور مسلم دونوں اپنی کتابوں میں عنعنہ پر مشتمل روایات لاتے ہیں اس کے جواب میں یہ کہنا کوئی معنویت نہیں رکھتا کہ عنعنہ صحیحین کے علاوہ دوسری کتابوں میں منقطع ہونے کی نشانی ہے۔ امام مسلم نے بحوالہ ابی الزبیر عن جابر بہت سی معفن حدیثیں روایت کی ہیں حالانکہ حفاظ کا فیصلہ ہے کہ ابوالزبیر مدلس ہے۔ حافظ ابن حزم اور حافظ عبدالحق نے لیث بن سعد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ انہوں نے ابوالزبیر سے دریافت کیا کہ مجھے وہ حدیثیں سننا تو جو تم نے خود جابر سے سنی ہیں۔ انہوں نے صرف سترہ حدیثیں سنائیں۔ اس بنا پر حفاظ کہتے ہیں کہ لیث کی حدیثیں بحوالہ ابی الزبیر عن جابر صحیح ہیں لیکن مسلم میں جابر کی بحوالہ ابی الزبیر ایسی بھی حدیثیں ہیں جو لیث کی وساطت سے نہیں آتی ہیں اور جن میں عنعنہ ہے۔ نیز امام مسلم نے جابر اور ابن عمر کے حوالہ سے حجۃ الوداع کے موضوع پر یہ روایت پیش کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دسویں ذی الحجہ کو مکہ تشریف لے گئے آپ نے وہاں طواف افاضہ کیا پھر مکہ ہی میں نماز پڑھ کر منیٰ واپس تشریف لائے۔ دوسری روایت

میں ہے کہ آپ طواف افاضہ کر کے منیٰ تشریف لاتے اور نماز ظہر منیٰ میں ادا کی۔ دونوں روایتوں کو جمع کرنے کے لیے یہ توجیہ کرتے ہیں کہ نماز تو مکہ ہی میں ادا کی مگر منیٰ میں بیان جواز کے لیے دوبارہ پڑھی۔ مگر حافظ ابن حزم کہتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں سے ایک بلاشبہ جھوٹ ہے۔ ایسے ہی مسلم میں حدیث اسرار میں یہ اضافہ آیا ہے کہ واقعہ اسرار آپ کو وحی آنے سے پہلے پیش آیا ہے۔ حافظ حدیث نے اس پر بڑی لے لے کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ایسے ہی مسلم کی حدیث خلق اللہ الترتیبہ یوم السبت باتفاق حفاظ ضعیف ہے۔

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جیسے ائمہ مجتہدین قبولیت حدیث کی حد تک مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں ایسے ہی محدثین بھی روایت حدیث کی حد تک صحت حدیث میں اختلاف رکھتے ہیں اور قبولیت و صحت میں ان کے فکری اختلاف کا مظاہرہ ان اصول و ضوابط میں بھی ہوا ہے جو اس موضوع پر ان بزرگوں سے منقول ہیں۔

تلامذہ حدیث اور امام اعظم

اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو پھر جیسا کہ امام ابن حجر مکی نے لکھا ہے کہ امام اعظم کی عظمت نشان کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کو ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کرنے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مشیخ ائمہ مجتہدین اور علماء را سخیین میں سے بڑے بڑے لوگوں نے امام اعظم کی شاگردی اختیار کی ہے مثلاً امام جلیل عبد اللہ بن المبارک جن کی جلالت قدر پر اتفاق عام ہے اور جیسے امام لیث بن سعد و مالک بن انس۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ماہیک بہو لاد الامت ابو حنیفہ کو سمجھنے کے لیے بس یہ ائمہ کافی ہیں۔

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں حدیث میں امام اعظم سے یہ تلامذہ بتائے ہیں۔

ردی عنہ — عباد بن العوام — ابن المبارک، شمیم و وکیع —

وسلم بن خالد — وابو معاویہ — والمقرئ —

شیخ الاسلام ابو محمد عبد الرحمن بن ابی حاتم رازی نے ان پر عبد الرزاق بن ہمام اور ابو نعیم کا اضافہ اور کیا ہے — حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان ناموں کا اور اضافہ کیا ہے —

حماد - ابراہیم بن طہمان، حمزہ بن حبیب الزیات، زفر بن الہذیل -

ابو یوسف القاضی - ابویسحی الحمائی، عیسیٰ بن یونس، یزید بن ذریع،

اسد بن عمرو البجلی، حکام بن یعلیٰ الرازی، خارجہ بن مصعب، عبد المجید

بن ابی رداد، علی بن مسر، محمد بن بشیر العبیدی، مصعب بن المقدم،

یسحیٰ بن یمان، نوح بن ابی مریم، ابو عاصم — کہ

حافظ عسقلانی نے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ و آخر دن یعنی ابو حنیفہ کے حدیث میں صرف

یہی نہیں بلکہ اور بھی تلامذہ ہیں -

خطیب بغدادی نے ان ناموں کی اور نشاندہی کی ہے -

یزید بن ہارون، علی بن عاصم، یسحیٰ بن نصر، عمرو بن محمد، ہوزہ بن خلیفہ —

حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب کے سامنے زائوتے ادب نہ کرنے والے دو قسم

کے تلامذہ ہیں - ایک وہ ہیں جنہوں نے فقہ میں امام صاحب سے استفادہ کیا ہے اور دوسرے

وہ ہیں جنہوں نے حدیث میں امام صاحب کے سامنے زائوتے تلمذ نہ کیا ہے اور دونوں

کے لیے حافظ ذہبی نے جو تعبیری زبان اختیار کی ہے وہ الگ الگ ہے قسم اول کے لیے وہ

لکھتے ہیں کہ :

تفقہ بجماعة من الکبار منهم زفر بن الہذیل وابو

یوسف القاضی الی آخرہ

اور قسم ثانی کے لیے وہ فرماتے ہیں :

ردی عنہ من المحدثین والفقہاء عدة لا یحصون -

۱۔ تاریخ کبیر ج ۴ ص ۸۱ - ۲۔ کتاب الجرح والتعديل ج ۴ ص ۴۴۹ -

۳۔ تہذیب، تہذیب ج ۱۰ ص ۴۴۹ - ۴۔ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۴ -

اس کے بعد ان گنت محدثین میں سے چند محدثین کا بطور مشتبہ از خرواز ذکر کیا ہے۔ خود ان کی زبانی یہ نام گوش گزار فرمائیے۔

فمن اقراء مبنیة بن مقسم وزکریا بن ابی زائدہ ومسر بن کدام
وسفیان الثوری و مالک بن مقول ویونس بن ابی اسحاق ومن
بعدہم زائدہ وشریک والحسن بن صالح والوبکر بن عیاض وحفص
بن غیاث، جریب بن عبد الحمید المحارب، ابواسحاق الغزالی، اسحاق
بن یوسف الارزق، المعانی بن عمران، زید بن الحباب، سعد
بن الصلت، حفص بن عبد الرحمن، عبید اللہ بن موسیٰ، محمد بن عبد اللہ
الانصاری، ابواسامہ، ابن نمیر، جعفر بن عون، اسحاق بن سلیمان
الرازی

ہم نے بالا روایت تکرار سے بچنے کے لیے ان ناموں کو چھوڑ دیا ہے جو پہلے اچکے ہیں حافظ
ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں اگرچہ سارے تلامذہ کا استقصا نہیں کیا ہے۔ اس کے
باوجود انہوں نے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے۔ حافظ
ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں تلامذہ کی بہتات کا تذکرہ کرنے اور نمونہ کے چند نام ذکر کرنے کے
بعد ”دبش کثیر“ اور مناقب میں ”و خلائی“ فرما کر تلامذہ کی کثرت کو بتایا ہے۔
اس بہتات کے اجمالی تذکرے کو حافظ عبد القادر قرشی نے یہ کہہ کر بے نقاب کیا ہے کہ
سروی عن ابی حنیفۃ ... نحو من اربعة الاف نفر

تلامذہ کی اسی کثرت اور بہتات کے تذکرے میں حاشیہ نسائی میں حافظ ابن حجر کے حوالہ
بعض ائمہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے کہ

اسلام کے مشہور اماموں میں سے کسی کے اتنے اصحاب اور شاگرد
نہیں ہوتے جس قدر امام ابو حنیفہ کے ہوتے اور جس قدر علماء
نے آپ سے استفادہ کیا ہے اور سے نہیں کیا۔

امام اعظم کے تلامذہ کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود مملکت بھی اس سے

زیادہ وسیع نہ تھیں۔ امام حافظ الدین بن البرزراکوردی نے امام اعظم کے مخصوص تلامذہ کا تفصیلی تذکرہ لکھنے کے بعد سات سو تیس مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نسب لکھے ہیں اور صوبہ وار ان کو شمار کیا ہے۔ چنانچہ جن صوبہ جات و ممالک کا اس سلسلے میں انہوں نے نام لیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقة،
 نصیبین، دمشق، رملہ، مصر، یمن، یامامہ، بحرین، بغداد، اہواز،
 کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نهاوند، رے، اصفہان،
 قوس، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، مرو، بخارا، ترمذ،
 کش جفانیان، ترمذ، بلخ، ہرات، قہستان، بختان، رم، خوارزم،
 حافظ الدین بن البرزراکوردی نے ان ائمہ کے جن خاص خاص تلامذہ کا تذکرہ زیر عنوان
 من دوی عنہ الحدیث والفقه شقاً وغرباً بلداً بلداً لہ
 لکھا ہے ان کی تعداد سات سو تیس مشاہیر علمائے ہیں۔

علامہ ابن النذیم نے الفہرست میں اسی بہتات کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔
 اعلم بآدابنا و بآدابنا بعد اوقرباً بآدابنا رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ۔ لہ

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دوسری صدی کے نصف ثانی میں امام اعظم کے تلامذہ
 - مائے دنیا کے چپہ چپہ پر پھیل چکے تھے اور ہر جگہ علم کی اشاعت میں مصروف تھے۔ زندگی
 کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہ تھا جہاں ان کا پرچم نہ لہراتا ہو۔ اقتدار حکومت سے مدرسوں اور
 خانقاہوں تک ان ہی کا پھیرا اڑ رہا تھا۔ بلکہ بہتوں کے لیے ان کی یہ مقبولیت اور ہر گوشہ
 حیات پر قبضہ ہوا۔ ان رتبہ بنا ہوا تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان شہروں میں
 آپ نے مودکانہم پڑھا ہے۔ یہاں عرصہ سے فقہ حنفی کی حکمرانی تھی اور امام اعظم کے
 تلامذہ کی ایک بڑی جماعت یہاں قضا، افتاء اور تدریس میں مشغول تھی۔ علامہ نصر بن شعیب
 جب بصرہ سے مامون کی علمی قدردانیوں کی شہرت سن کر یہاں آئے تو امام اعظم کے علوم

کی یہ قبولیت عام اور اشاعت عام دیکھ نہ سکے اور کچھ نو عمر محدثین کو اپنے ساتھ ملا کر امام اعظم کے علوم کے خلاف ایک منظم اسکیم بنالی۔ چنانچہ صدر الامر نے بہ سند لکھا ہے کہ فتح بن عمر کہتے ہیں :

نضر بن شمیل جس زمانے میں مرو میں مقیم تھے میں وہیں تھا۔ انہوں نے امام اعظم کی کتابوں کو آب رواں میں بھیج کر دھونا شروع کیا۔ خالد بن صبیح نے جو ان دنوں مرو کے قاضی تھے۔ یہ کہانی سنی۔ تو وہ خود اور خالوادہ صبیح کے دیگر افراد فضل بن سہل کے پاس پہنچے۔ یہ مامون کا وزیر اعظم تھا۔ وراق کہتے ہیں کہ اس زمانے میں خالوادہ صبیح میں سچاس یا اس سے بھی زیادہ ایسے علما موجود تھے جو عدلیہ میں کام کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ خالد کے ساتھ ابراہیم بن رستم اور سہل بن مزاحم بھی تھے ان سب حضرات نے اگر فضل بن سہل کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ فضل نے واقعہ سن کر جواب دیا کہ میں اس وقت تک اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ صورت واقعہ کو خلیفہ کے رد پر وپیش نہ کر دوں۔ یہ کہہ کر فضل مامون الرشید کے پاس گیا اور اسے سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ مامون نے فریقین کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فضل نے بتایا کہ یہ نوخیز تو اسحاق بن راہویہ اور احمد بن زبیر ہیں مگر نضر بن شمیل ان کے ساتھ ہیں اور دوسرے خالد بن صبیح، سہل بن مزاحم اور ابراہیم بن رستم ہیں۔ مامون نے دوسرے روز دونوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ اسحاق اور ان کے ساتھیوں کو مامون کی گفتگو معلوم ہوئی تو اسحاق بن راہویہ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ مامون سے گفتگو کون کرے گا۔ آخر مشورے سے یہ طے پایا کہ احمد بن زبیر مامون سے گفتگو کریں۔ چنانچہ دوسرے روز دوبارہ میں حاضری ہوئی۔ مامون نے آتے ہی سلام کیا اور نضر بن شمیل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ امام ابو حنیفہ کی کتابوں کے متعلق آپ

لوگوں نے یہ کیا رد یہ اختیار کیا ہے؟ نضر تو خاموش رہے مگر احمد بن زہیر
 بولے کہ امیر المومنین اگر اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔ مامون نے
 کہا ہاں فرمائیے وہ بولے امیر المومنین! ہم نے ان کی کتابوں کو کتاب اللہ و
 سنت کے خلاف پایا ہے۔ مامون نے کہا کتاب و سنت کے خلاف
 کیسے؟ آنا کہہ کر خالد بن صلیح سے ایک مسئلہ دریافت کیا کہ اس کے بارے
 میں ابو حنیفہ نے کیا کہا ہے؟ خالد نے امام موصوف کے قول کے مطابق
 فتویٰ بتایا۔ احمد بن زہیر اس کے خلاف روایت بیان کرنے لگے
 مگر مامون نے امام ابو حنیفہ کی تائید میں وہ احادیث پیش کیں جو
 ان لوگوں کے علم میں نہ تھیں۔ آخر میں مامون نے کہا کہ لمود وجدناھا
 مخالفاً لکتاب اللہ و سنتہ رسولہ، ما استعملناک اگر ہم ان کو
 کتاب و سنت کے خلاف پاتے تو ان پر عمل کرنے کے خواہش مند
 ہی کیوں ہوتے۔ خبردار اب آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ اگر نضر بن حنبل
 تم میں نہ ہوتے تو میں تم کو ایسی سزا دیتا کہ یاد رکھتے رہے

الغرض امام اعظم کے تلامذہ کی ہمدردی دیکھی نہ جاسکی۔ ان تلامذہ میں ایسی گرامی قدر شخصیتیں
 ہیں جو اپنے وقت میں نہ صرف حافظ حدیث بلکہ علم حدیث کے آفتاب ہوتے۔ ان کا دائرہ
 اگرچہ بہت وسیع ہے مگر ہم یہاں صرف تقریب کی خاطر چند کائنات بطور گلے از گلزار
 لکھتے ہیں۔

الحافظ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابی حنیفہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ابوسعید
 کنیت اور کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ الخطیب نے امام علی بن المدینی کے سوال سے ان کے بارے
 میں یہ انکشاف کیا ہے کہ

حدیث میں روایت و اسناد کے سائے سلاسل کا محور صرف چھ بزرگ

ہیں۔ ان کے نام بتائے ان کے بعد ان چھ بزرگوں کا علم ارباب تصنیف کے حصے میں آیا ہے۔ بعد ازیں ان ارباب تصنیف کا سارا علم دو یحیی نامی شخصیتوں میں سمٹ کر آیا ہے۔ اول یحیی بن زکریا۔ دوم یحیی بن سعید۔ ۱۷

اور یہ بھی امام علی بن المدینی کا تاثر ہے کہ:

زمانہ ابن عباس میں علم ابن عباس پر زمانہ شعبی میں شعبی پر اور زمانہ ثوری میں ثوری پر اور زمانہ یحییٰ میں یحییٰ پر ختم ہے ۱۸
صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔ حافظ ذہبی نے تو صرف اس قدر بتایا ہے کہ امام صاحب المتصانیف لیکن ابن ابی حاتم کا کہنا ہے کہ کوفہ میں کتابوں کے سب سے پہلے مصنف یہی ہیں خطیب بغدادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ

انہ اول من صنف الکتاب فی الکوفۃ وکان یحد فی فقہا
محدثی الکوفۃ۔

لیکن بات ابھی ناقص اور ادھوری ہے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے اس کی پوری وضاحت فرمائی ہے وہ بسند متصل اسد بن الفرات سے ناقل ہیں کہ
ہام عظیم البرخیقہ کے وہ تلامذہ جنہوں نے تدوین کتب کا کام کیا ہے
ان کی تعداد چالیس ہے۔ ان دس حضرات میں جو ان تمام میں
اولین صف کے سمجھے جاتے تھے امام ابو یوسف، امام زفر،
داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد اور یحییٰ بن زکریا بن
ابی زائدہ ہیں۔ اور یحییٰ کے سپرد لکھنے کا کام تھا اور یحییٰ
تیس سال تک اس مجلس میں لکھنے کا کام کرتے رہے ۱۹

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ یحییٰ بن زکریا نے تدوین کا یہ کام پورے تیس سال امام اعظم کی نگرانی میں کیا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ یحییٰ کا تصنیفی کارنامہ ہے کیونکہ

۱۷ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۱۵۔ ۱۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۴۴۔

۱۹ الجواہر المصنیۃ ج ۲ ص ۲۶۲۔

وہ کتابت کا کام کرتے تھے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ یحییٰ کا کارنامہ نہیں بلکہ امام اعظم کا تصنیفی کارنامہ ہے۔ یحییٰ تو صرف کتابت کا کام کرتے تھے کتابت کی بنا پر بعد کو محدثین نے یحییٰ کی طرف نسبت کر دیا۔ امام اعظم کے یہاں تصنیف کا طرز یہی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو املا کر یا کرتے تھے اور تعلیم و تصنیف کا سارا کام زبانی تھا۔ چنانچہ حافظ قاسم بن قطلوبغا نے منیۃ الالمعی میں تصریح کی ہے :

ان المتقدمین من علمائنا كانوا یلون المسائل الفقهیة و ادلتها من الاحادیث النبویة باسانیدهم۔

ہمائے علماء متقدمین مسائل اور ان کے دلائل کا احادیث نبویہ سے اپنی اسانید کے ساتھ املا کرتے تھے۔

حال کے غیر مسلم محققین میں سے ڈاکٹر فلیپ حتی نے بھی یہی انکشاف کیا ہے :

قد رها ابو حنیفة فی الکوفة وبغداد و قوفی شہ وکان قد احترف التجارة ثم مال عنہا الی الفقة فاصبح اعظم علما فی الاسلام و قد افضی بتعالیمہ شفہا للتلاصیة ابو حنیفة کوفہ اور بغداد میں پروان چڑھے۔ شہ میں وفات پائی پہلے کاروبار کرتے تھے پھر شرائع کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلام کے علما میں عظیم ترین شخصیت بن کر سامنے آئے۔ آپ نے اپنی تعلیمات کو اپنے تلامیذ کتاب زبانی پہنچایا ہے۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی زمانے میں امام اعظم نے اختلاف الصحابہ، کتاب السیر، کتاب الآثار جیسی کتابیں اپنے شاگردوں کو املا کرائی ہیں۔ ان کے اولین کاتب یحییٰ ہیں۔ بعد میں یہی کتابیں ان کے شاگردوں سے موسوم ہو گئی ہیں مثلاً کتاب السیر امام حسن بن زیاد، کتاب السیر امام محمد وغیرہ وغیرہ۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن وکیع بن الجراح کا نام لے کر تو خطیب بغدادی نے علائیہ اور برملا لکھ دیا ہے کہ :
وکیع انا صنف کتبہ علی کتب یحییٰ بن ابی زائدہ۔

یحییٰ بن زکریا کے سامنے جن ائمہ حدیث نے زانو تے ادب تہ کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان میں امام احمد، ابراہیم بن موسیٰ، ابو کریب اور زیاد بن الرب کا نام لیا ہے لیکن حافظ ابو بکر الخطیب نے یحییٰ بن آدم، قتیبہ بن سعید، ہناد بن السری، محمد بن عیسیٰ، یحییٰ بن معین، ابو بکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ اور سریح بن یونس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ

کاں علی قضاء المدائن و بعد من حفاظ الکوفیین للحدیث
مفتیا مثبتا۔

مدائن کے قاضی تھے اور ان کا شمار کوفہ کے حفاظ حدیث میں ہے۔^۱
ان کی جلالت علمی کا اندازہ کرنا ہو تو یحییٰ بن سعید القطان کا وہ بیان پڑھیے جو حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ،

سائے کوفہ میں مجھے یحییٰ سے زیادہ اپنی مخالفت کا کسی سے
اندیشہ نہ تھا۔^۲

ارباب صحاح نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ اور بمقام مدائن بعمر ۶۳ سال وفات پائی ہے

امام ابو عبد الرحمن المقرئ

عبد التمر بن یزید نام ابو عبد الرحمن کنیت اور المقرئ لقب ہے۔^۳ میں پیدا ہوئے۔ علم قرأت میں امام نافع کے شاگرد ہیں۔ حدیث میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ امام اعظم کے تلامذہ ہیں سے ہیں۔ حافظ ذہبی رقمطراز ہیں :

سمع من عون وابی حنیفة۔

بصرے میں ۳۶ سال اور مکہ معظمہ میں ۳۵ سال قرآن پڑھایا ہے اسی لیے مقرئ کر کے مشہور ہیں۔ حدیث کی ساری کتابوں میں ان کی روایات ہیں۔

حافظ ابو بکر الخطیب نے بسند متصل ان کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ :

بشیر بن موسیٰ کا بیان ہے کہ امام ابو عبد الرحمن المقرئ ہم سے
حدیثیں روایت کرتے تھے لیکن جب امام موصوف امام اعظم ابو حنیفہ

کے حوالہ سے روایات پیش فرماتے تو ان کا دستور یہ تھا کہ تعبیر کا
پیرا یہ اختیار فرماتے تھے کہ حدثنا شاہنشاہ یعنی محدثین
کے ملک معظم نے ہم سے بیان کیا ہے

حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ان کے حوالہ سے بسند متصل ایک حدیث روایت کی ہے جس میں نہ
صرف ان کو امام اعظم کا شاگرد ظاہر کیا ہے بلکہ بتایا ہے کہ قطعیات میں یہ سند عالی ہے چنانچہ
فرماتے ہیں:

انباہنا ابن قدامۃ اخبرنا ابن طبرزدانا ابو غالب
بن الہنادانا ابو محمد الجوهری انا ابو بکر القطیعی نابشر
بن موسیٰ انا ابو عبد الرحمن المقرئ عن ابی حنیفۃ
عن عطاء عن جابر انہ یراہ یصلی فی قمیص خفیف لیس
علیہ ازار ولا رداء۔ قال ولا اظنہ صلی فیہ
الا لیرینا انہ لا یاس بالصلاۃ فی الثوب الواحد

ابن ابی حاتم کا مغالطہ

کتاب الجرح والتعديل میں امام مقرئ کے ترجمہ میں امام مقرئ کا ایک ایسا بیان درج کیا
ہے جو نہ صرف امام مقرئ کی نشان جلالت کے خلاف ہے بلکہ تاریخی طور پر ثابت بھی نہیں ہے
دیکھتے ہیں کہ ابو عبد الرحمن مقرئ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو حنیفہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور جب
احادیث کے بیان سے فارغ ہو جاتے تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یوں فرماتے تھا الذی
سمعتم کلمہ رایح و باطل۔ یعنی تم نے مجھ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات
سنے ہیں وہ ہوائی اور باطل ہیں۔ بیان کی رکاکت ہی تیار ہی ہے کہ ذہنوں نے امام اعظم
کی نشان محمد ثناء سے مرعوب ہو کر یہ افسانہ تراشا ہے۔ امام اعظم تو امام اعظم ہیں ایک فاسق سے
فاسق تر مسلمان کی زبان پر بھی ارشادات نبوت بنا کر یہ کلمات نہیں آتے۔ آئیے ذرا تاریخی
طور پر بھی اس کا تجزیہ کر لیجئے اور دیکھئے کہ اس کی روایتی پوزیشن کیا ہے۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ مجھے ابراہیم الجوزجانی نے ایک خط میں امام ابو عبد الرحمن کا یہ بیان لکھا ہے۔

کیا ابراہیم الجوزجانی نے خود یہ بیان امام مرقی سے سنا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے یعنی ان کو کسی نے بتایا ہے۔ یہ بتانے والا کون ہے؟ جوزجانی نے اس کا نام نہیں بتایا۔ سند کا یہ انقطاع ہی زبان حال سے بول رہا ہے کہ کسی نے نہیں بتایا ہے۔ بلکہ یاروں کا بنایا ہوا افسانہ ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے؟ آپ مانیں یا نہ مانیں یہ خود ابراہیم الجوزجانی کے ہاں بقول کی صفائی ہے کہ نہ اسماعیل بن ابان کہتے ہیں کہ جوزجانی حق سے منحرف اور روگردان تھے اور ناصبی مذہب رکھتے تھے۔ یہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام حبان فرماتے ہیں کہ جوزجانی ضروری تھے یعنی حضرت علی کے مخالف تھے۔ حافظ صاحب نے ہی تہذیب میں واقعہ لکھا ہے کہ ان سے دروازے پر ایک بار محدثین کا مجمع تھا۔ جوزجانی کی کینیز چوڑہ باہر گئی کہ اسے کوئی ذبح کرے مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان کے تمام شاگردوں میں کسی کو اسلامی زندگی برتنے کا اتنا بھی سلیقہ نہ تھا کہ کوئی چوڑہ ہی ذبح کرے۔ کینیز نے جوزجانی کو صورت حال سے آگاہ کیا تو بولے واہ آج چوڑہ کو ذبح کرنے والا کوئی نہیں ہے ایک وقت وہ تھا کہ علی مرتضیٰ صرف چاشت کے وقت میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو ذبح کر دیتے تھے۔ لاجول ولا قوت الا باللہ

اسی بنا پر حافظ صاحب نے جوزجانی کا نام لے کر صاف لکھ دیا ہے کہ

اما الجوزجانی فلا عبرة بحطه على الكوفيين

اور صرف تہذیب میں نہیں بلکہ لسان المیزان میں اس موضوع پر ایک فصل قائم کی ہے اور یہ بات کھول کر بتاتی ہے کہ کوفہ والوں کے بارے میں جوزجانی کے جارحانہ اقدامات ناقابل برداشت ہیں :

المحاذق اذا تامل ثلب ابی اسحاق الجوزجانی وای العجب وذالک

لشدۃ الخرافۃ فی النصب۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ کون ہے جن کے دامن تقدس پر جوڑ جانی کے لگاتے ہوئے دھبے نہیں ہیں۔ امام اعظم، امام ابو نعیم اور عبید اللہ بن موسیٰ بات کو مختصر کر کے فرماتے ہیں کہ اس کی چیرہ دستیوں سے اساطین حدیث اور ارکان روایات نالاں ہیں۔ اس بنا پر اگر جوڑ جانی نے امام اعظم کے خلاف یہ بے پر کی اڑائی ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں، بلکہ میں حافظ عسقلانی سے ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ — آپ اس شخص کی زبان قلم ہے، دامن امامت کی حفاظت چاہتے ہیں جس کی زبان دہن سے دامن خلافت محفوظ نہیں ہے۔ فانا للہ والی اللہ الممشتکی۔ حیرت جوڑ جانی پر نہیں بلکہ ان کی سادہ لوحی پر ہے جو جانتے بوجھتے اس قسم کی من گھڑت کہانیوں کو بلا تنقید نقل کر جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں سے ابو حنیفہ کے فضل اور علم کو دیکھا نہیں گیا ہے۔ سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی جب کتابیں خورد برد کرنے کی سازش میں ناکامی ہوئی تو اس راہ سے دل کی بھڑاس نکالنے میں لگ گئے۔ عبید اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ لوگ امام اعظم کے متعلق صرف ازراہ حسد چہ میگوئیاں کرتے ہیں، حافظ ابن ابی داؤد محدث کہتے ہیں کہ امام اعظم کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے والے دو ہی قسم کے ہیں: حاسد اور ناواقف، میرے نزدیک ناواقف دونوں میں غنیمت ہے، ناواقفیت کا ایک اقدار بھی سن لیجئے، عبید اللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی ہے جس کی کنیت ابو حنیفہ ہے۔ یہ سن کر میں گھر واپس آیا اور امام اعظم کی کتاب سے کچھ مسائل کا انتخاب کیا۔ تیسرے روز کتاب ہاتھ میں لے کر اوزاعی کی خدمت میں حاضر ہوا امام اوزاعی مسجد میں تھے۔ دریافت کیا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ میں نے ان کو کتاب دے دی اس میں وہ مسکے بھی ان کی نظر سے گزرتے جن کی پیشانی پر میں نے لکھ دیا تھا کہ نعمان اس کے متعلق یوں فرماتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اوزاعی نے اذان دے کر کھڑے کھڑے نماز سے پہلے جب کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ لیا تو کتاب رکھ دی اور نماز سے فراغت کے بعد کتاب کا پھر مطالعہ کیا تا آنکہ کتاب ختم کر دی۔ پھر مجھ سے دریافت کیا کہ اے خراسانی یہ نعمان کون ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ایک بزرگ ہیں میری ان سے عراق میں ملاقات ہوئی ہے۔ فرمایا یہ تو بڑے پائے کے بزرگ ہیں

جاؤ ان سے ملو اور علم حاصل کرو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو وہی ابو حنیفہ ہیں جن کے پاس جانے سے مجھے آپ روکتے تھے۔ لے

بہر حال امام ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن یزید المقرئ امام اعظم کے حدیث میں تلامذہ میں سے ہیں اور بعد کے محدثین کے بالواسطہ یا بلا واسطہ استاذ ہیں حتیٰ کہ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ حدیث کی کوئی کتاب بھی ان کی روایات سے خالی نہیں ہے۔ امام عبد اللہ بن المبارک ان کی امانت، ثقاہت، عدالت اور دیانت کو کھرے سونے سے تعبیر کرتے تھے۔ لے

امام عبد اللہ بن المبارک

حافظ جمال الدین المزنی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ذہبی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبصیر الصغیرہ میں اور امام بخاری نے تاریخ میں عبد اللہ بن المبارک کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔

عبد اللہ بن المبارک کی جلالتِ قدر کا اندازہ کرنا ہو تو امام الحسن بن عیسیٰ کا یہ بیان پڑھیے وہ فرماتے ہیں کہ۔

عبد اللہ بن المبارک کے تلامذہ نے ایک میٹنگ اس ارادے سے منعقد کی کہ امام موصوف کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ جن خوبیوں پر سب کا اتفاق ہوا یہ تھیں۔ فقہ، ادب، سخن، لغت، زہد، شجاعت، شرف، فصاحت، قیام لیل، حج، جہاد فی سبیل اللہ، گھوڑے کی سواری، ترک مالا یعنی، انصاف، رفقائے کم اختلاف۔ یہ سب خوبیاں آپ کی ذات گرامی میں جمع ہیں۔

حافظ ذہبی نے بتایا ہے کہ امام بخاری نے پہنچنے میں عبد اللہ کی کتابوں کو ازبر کر لیا تھا۔ لیکن حافظ ابن حجر نے مقدمہ میں سولہ سال کی قید لگائی ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے سامنے ایک بار امام اعظم کا تذکرہ ہوا فرمایا اس شخص کے بارے میں کیا کہا جاتے جس کے سامنے دنیا و داس کا پورا سرمایہ آیا مگر اس نے لات مار دی۔ کورے کھاتے

تکلیفیں برداشت کیں مگر اس چیز کو ہرگز قبول نہیں کیا جس کے لیے اس وقت لوگ تمنا میں کر رہے تھے اور درخواستیں لیے پھر رہے تھے۔

امام ابن المبارک فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے زیادہ پارسا کوئی نہیں دیکھا ہے اور ایک نظم میں جو انہوں نے امام اعظم کی شان میں لکھی ہے امام اعظم کی محدثانہ شان کو سراہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام ابن المبارک کے قلب میں امام اعظم کا کیا مقام تھا چنانچہ فرماتے ہیں۔

روى آثاره فاجاب فيها كطيران الصقور من المنيفه
انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلند پروازی دکھائی جیسے شکاری
پرندے بلند مقام سے اڑ رہے ہوں۔

ولم يكن له بالعراق نظير ولا بالمشرقين ولا بالكويتيه
نہ عراق میں ان کی کوئی مثال تھی نہ مشرق و مغرب اور نہ کوفہ میں
امام اعظم کے فقہ کے بارے میں عبد اللہ بن المبارک کا جو تاثر حافظ عبد القادر نے سوید بن
نصر کے حوالہ سے لکھا ہے اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو لوگوں کو فقہ ابی حنیفہ کے
بارے میں عبد اللہ کی طرف منسوب کر کے افسانے سناتے رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

لا تقولوا راي ابي حنيفة ولكن قولوا انه تفسير الحديث
اسے ابو حنیفہ کی رائے نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ یہ حدیث کی تفسیر ہے۔

اور یہ بھی عبد اللہ بن المبارک ہی کا کہنا ہے کہ حدیث سے چمٹ جاؤ اور حدیث کی خاطر
امام اعظم سے کیوں؟ اس کی وجہ بھی خود عبد اللہ بن المبارک کی زبانی سنئے۔

يصرح تاويل الحديث ومعناه

اور خود ابن المبارک کا اپنی ذاتی تربیت کے بارے میں امام اعظم کے متعلق تاثر یہ تھا کہ
لو لا ان الله اعانني بابي حنيفة وسفيان كنت بدعياً

امام ابو حنیفہ کے علوم سے پورے طور پر سیراب ہونے کے بعد سفيان ثوري سے سرفراز

حاصل کیا ہے۔ امام ذہبی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ
 ما لم مت سفیان حتی جعلت علم ابی حنیفۃ بکذا
 و اشار بقبض یدہ -

میں سفیان کے پاس اس وقت گیا جب میں نے ابو حنیفہ کے علم
 کو پورے طور پر سمیٹ لیا ہے
 ان کے زہد و تقویٰ اور پارسائی کا عالم یہ تھا کہ مشہور محدث سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ
 میں نے صحابہ اور عبد اللہ بن المبارک دونوں کے حالات کا مطالعہ
 کیا مجھے صحابہ میں عبد اللہ سے زائد صرف دو چیزیں معلوم ہوتی ہیں
 ایک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اور دوسرے
 عزرات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفقت ہے
 امام اعظم نے ان سے ان کی زہدانہ زندگی کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا کہ ایک دن
 میں اپنے بھائیوں کے ہمراہ ایک باغ میں تھا۔ رات تک سارا وقت کھانے پینے میں گزر گیا۔
 میں اس زمانے میں گانے بجانے کا بہت دلدادہ تھا۔ سحری کے وقت میں سو رہا تھا کہ
 میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ درخت پر بیٹھا ہوا ایک پرندہ کہہ رہا ہے -
 الحمد للہ الذین امنوا ان تخرج قلوبہم لذلک اللہ و
 ما نزل من الحق -

میں نے اس سوال پر ہاں کہہ کر جواب دیا۔ آنکھ کھل گئی باجے وغیرہ توڑ کر نذر آتش کر دیے
 یہ میری زہدانہ زندگی کا روز اول ہے
 ان علوم کا منبع تو آپ ان کی زبانی سن چکے ہیں۔ کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے علم کو پورے طور
 پر سمیٹ لیا تھا۔ آئیے اب ان کی اس علم پر مشتمل تصانیف کا حال بھی سن لیجئے۔ یہ آپ
 پہلے پڑھ چکے ہیں کہ امام بخاری نے سولہ سال کھ عمر میں ان کی کتابوں کو زبانی یاد کیا تھا علی
 طور پر ان کتابوں کا کیا مقام تھا اور ان میں کس قسم کے مسائل تھے۔ مشہور محدث یحییٰ بن آدم
 سے خطیب بغدادی نے بسند متصل نقل کیا ہے کہ :

جب میں دقیق مسائل کی تلاش میں ہوتا اور مجھے عبداللہ بن المبارک کی کتابوں میں بھی نہ ملے تو میں مایوس ہو جاتا۔

ان کی کتابوں میں حدیثوں کی تعداد کس قدر تھی؟ حافظ ذہبی نے یحییٰ بن معین کی زبانی بتایا:
ان کی کتابیں تقریباً بیس ہزار حدیثوں پر مشتمل تھیں۔

یتیم فی الحدیث کا مطلب

بزرگوں نے ان کو بھی معاف نہیں کیا اور امام اعظم کے متعلق ان کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کو غلط معنی پہنا کر ہنز کو عجیب بنا دیا۔ بعد کو ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی میں بھی ابو حنیفہ کے بارے میں ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لوگ غلط معنی پہنانے کی کوشش کرتے تھے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے حماد بن احمد مروزی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

میں نے ایک بار عبداللہ بن المبارک کو یہ کہتے سنا کہ

کان ابو حنیفۃ ایۃ

ایک شخص بول پڑا اے ابو عبدالرحمن! یہ بتائیے کہ آیت کس میں تھی
مشرقی یا خیر میں۔ عبداللہ بن المبارک نے فوراً ڈانٹ کر کہا کہ خاموش
رہو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ آیت کا لفظ خیر ہی کے لیے آتا ہے شر کے
لیے آیت نہیں غایت آتا ہے یوں بولا جاتا ہے ایۃ فی الخیر
او غایۃ فی الشر اور بعد ازیں قرآن کی یہ آیت تلاوت کی —
و جعلنا ابن مریم و امۃ ایۃ —

جیسے اس شخص نے عبداللہ کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے فقرے کو جس میں وہ امام اعظم کو اللہ سبحانہ کی نشانی بتا رہے تھے عبداللہ ہی کے سامنے غلط معنی پہنا دیے ٹھیک اسی طرح عبداللہ ہی کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کان ابو حنیفۃ یتیم فی الحدیث کو یار لوگوں نے ایسے معنی پہنا دیے جس سے ان کا جی تو خوش ہوا ہو گا لیکن مشکلم کی روح تڑپ کہ رہ گئی ہو گی اور۔

اسی پر بس نہیں بلکہ روایت بھی بالمعنی شروع کر دی کہیں یتیم کہیں مسکین روایت کیا خطیب بغدادی اور محمد بن نصر مروزی کی روایت میں یتیم آیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعديل میں یتیم کی جگہ مسکین لکھا ہے اور ابن عبد البر نے جو روایت بحوالہ ابوالموجہ پیش کی ہے اس میں نہ یتیم ہے نہ مسکین بلکہ یتیم آیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب بات نہ بنی تو اسے بنانے کی دوبارہ کوشش میں روایت میں نیرنگی آگئی ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ جن راہوں سے یہ روایت گزر کر آئی ہے اور جن جن سندوں اور طرق سے عبد اللہ بن المبارک کا یہ بیان آیا ہے ان میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں جسے صحیح کہہ دیا جاسکے لیکن اگر ہم روایت کا محدثانہ نقطہ نظر سے پوسٹ مارٹم نہ لیں اور مان لیں کہ واقعی حضرت عبد اللہ نے یہ بات فرمائی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسے غلط معنی پہنا کر لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ کوشش کریں کہ امام اعظم کو حدیث نہ آئی تھی کیونکہ غلط یتیم دو معنی میں استعمال ہوتا ہے ایک لغوی اور دوسرے محدثین کے اصطلاحی۔

لفظ میں یتیم کے معنی صاحبِ قلموس نے یگانہ اور نادار کے لکھے ہیں الیتیم الفرد وكل شئ یغنی نظیراً۔ یگانہ اور ہر ایسی چیز جو نادار المثال ہو۔ زمر شری رقمطراز ہیں کہ درۃ یتیم یتیم اور حرمت یتیم کے محاورات بے مثال اور نادار و جوہ کے پئے ہوئے جاتے ہیں۔ پھر یہ باب کے ہو کر فروہ جاتا ہے اس لیے وہ یتیم کہلاتا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ امام اعظم حدیث میں نادرۃ الدہر اور عظیم النظم شخصیات ہیں اور ہے بھی یہ بات ٹھیک۔ عبد اللہ بن المبارک کے دوسرے بیان بھی اس کے مؤید ہیں۔

اصطلاح محدثین میں یتیم وہ شخص کہلاتا ہے جو ایک حدیث کو کم از کم ایک سو سندوں سے روایت نہ کرے چنانچہ مشہور محدث ابراہیم بن سعید جوہری کہتے ہیں۔

کل حدیث لم یکن عندی من مائۃ وجہ
فانافیه یتیم۔

جو حدیث مجھے سو سندوں سے نہ ملے تو میں اس میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں
حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے بھی یہی بات المروءۃ الباسم میں نقل کی ہے۔
اگر اس معنی کے لحاظ سے امام اعظم حدیث میں یتیم ہیں تو یہ بات نہ امام اعظم کے لیے

قدح ہے اور نہ کسی کے لیے قابل مدح ہے۔ امام اعظم کا زمانہ اکثر طرق کا زمانہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے تو سائے تابعین اور سائے صحابہ حدیث میں یتیم ہیں کیونکہ صحابہ اور تابعین میں کسی کو بھی کوئی ارشاد نبوت سو سو طرق سے معلوم نہ تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ حدیث تو دراصل نام نہ حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور آداب و احوال کا۔ نہ کہ آٹا۔ طرق کا۔ اسلام کی زندگی میں مسائل کے لیے ضرورت کی چیز حدیث ہے نہ کہ طرق۔ اور امام اعظم کو یہ چیز بخوبی حاصل تھی جیسا کہ آپ سن آئے ہیں کہ امام اعظم چار ہزار احادیث روایت کرتے تھے اور یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ احادیث احکام کی کل تعداد بھی چار ہزار ہی ہے یہی تعداد بعد کو فن پیدا ہونے پر محدثین کے زمانے میں تیسری صدی میں چار ہزار سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔

اس فن کے مشہور محدث اسرائیل اس موقع پر بڑے پتے کی بات فرما گئے کہ نعمان کیا ہی مزے دار شخص تھے فقہ سے متعلق ہر حدیث ان کو خوب یاد تھی اس کی ان کو بے حد جستجو تھی اور اس میں جو کچھ فقہ ہوتا اس کے خوب ہی عالم تھے انہوں نے حماد سے حدیثیں یاد کی تھیں اور خوب یاد کی تھیں اس لیے ان کی خلفاء، امرار اور وزراء سب عزت کرتے تھے۔

بہر حال عبداللہ بن المبارک امام اعظم کے تلامذہ میں سے تھے بعد کے تمام محدثین ان سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔ امام احمد کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور یہی وہ مثالی شخصیت ہے جو زید و تقویٰ میں امام اعظم سے پوری پوری مشابہت رکھتی تھی۔ جو دوزخ بد، تھوڑی پونجی پر گزر بسر کرنا، بادشاہوں اور ارباب اقتدار سے دور رہنا، دین کو اپنے رزق کے لیے راہ نہ بنانا، دین کے معاملات میں پستی اور دنائت کا اظہار نہ کرنا۔ یہ تمام باتیں عبداللہ بن المبارک کی ذات گرامی میں پائی جاتی تھیں رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الامام ابراہیم بن طہمان

حافظ ذہبی نے ان کا حفاظ حدیث کے پانچویں طبقے میں ذکر کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے کبار

تلامذہ میں سے تھے۔ اور ان کے فخر کے لیے یہ کافی ہے کہ خود امام اعظم نے استاد ہونے کے باوجود ان سے روایت لی ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے۔

حدثنا عنه من شیوخہ صفوان بن سلیم و ابو حنیفۃ

الامام۔

محدثین کے عرف میں اس قسم کی روایات کو روایۃ الاکابر عن الاصاغر کہتے ہیں۔ اور ایک محدث کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے بالا اور کمتر اور اپنے جیسوں سے روایت کرے۔ علامہ ترمذی نے محدثین کی بارگاہ فیصلہ لکھا ہے کہ

لا یکون محدثا حتی یاخذ عن فوقہ ومثلہ ودونہ

محدث ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے سے برتر، کمتر اور مثیل

سے روایت لے لے

۱۰۔ اسی بنا پر محدثین نے اس کی عظمت نشان اور جلالت قدر کا اقرار کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ذو عہم تدعو الیہ الہم العالیۃ والافس

الذکیۃ۔

بہر حال امام اعظم نے استاد ہونے کے باوجود ابراہیم بن طہمان سے روایت لی ہے ابراہیم کی جلالت قدر کا اندازہ ان کے تلامذہ سے ہو سکتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں ابو بکر الخطیب نے عبد اللہ بن المبارک، سفیان بن عیینہ، خالد بن نزار، وکیع بن الجراح، عبد الرحمن بن مہدی، ابو عامر العقدری، محمد بن سابق، یحییٰ بن ابی بکر کا نام لیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الامام کے لقب سے نوازا ہے۔ مشہور محدث اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم کی حدیث میں ثقاہت مسلم ہے ہمیشہ سے ائمہ ان کی حدیثوں کے خواہاں رہے ہیں اور سب نے ان کی ثقاہت کی منادی کی ہے۔

افسوس ہے کہ ایسا باکمال اور بلند پایہ محدث بھی ارباب ظواہر کی فرقہ وارانہ چشمک سے بچ نہ سکا۔ چونکہ امام اعظم کے شاگرد تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ ایمان و عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے اس بنا پر بزرگوں نے ان پر بھی مرتبہ ہونے کی

تہمت لگا دی۔ یہاں بھی نعیم بن حماد اور ابو اسحاق الجوزجانی نے اپنی جہولانی طبع کا ان کو نشانہ بنایا۔
لیکن ان کو پھر بالآخر منہ کی کھانی پڑی۔ اور حافظ ذہبی کو کہنا پڑا۔

فلا عبرة بقول مضعف

اس فرعونہ کے خلاف تمام ارباب صحاح ان کی حدیث سے احتجاج پر متفق ہیں اور مشہور محدث
اقرار کرتے ہیں کہ:

انہ حسن الحديث يميل شيئا الى الارجاع في الايمان حبيب الله

حديثه الى الناس

دراکٹر جاتیے اور یمل شیئا الی الارجاع فی الايمان کی حقیقت بھی گوش گزار فرما لیجئے۔
خدا بھلا کرے محدث خطیب بغدادی کا کہ وہ اس مقام پر ارجاع کی حقیقت ابو الصلت کے حوالہ
سے یہ کہہ کر بے نقاب کر گئے۔

قال علی:- قال ابو الصلت لم يكن ارجاء هم هذا المذهب
النجیث ان الايمان قول بلا عمل وان ترك العمل لا يضر
بالايمان بل كان ارجاء هم انهم كانوا يرجون لا بل
الكبار الغفران ردا على الخوارج و غيرهم الذين يكفرون
الناس بالذنوب فكانوا يرجون ولا يكفرون بالذنوب
و نحن كذا

ان کا ارجاع یہ مذہب خبیث نہ تھا کہ ایمان قول بغیر عمل ہے اور
ترک عمل سے کچھ نہیں بگڑتا ہے بلکہ ان کا ارجاع تو صرف یہ تھا کہ
وہ گنہ گاروں کے لیے اُمیدوار مغفرت تھے وہ خوارج کی تردید
کرتے تھے جو لوگوں کو صرف گناہ کی پاداش میں دائرۃ اسلام سے
نکال دیتے ہیں وہ بخشش کی اُمید کرتے تھے اور کسی کو گناہ کی
وجہ سے کافر نہ کہتے تھے اور ہم بھی ایسے ہی ہیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ خطیب نے بتایا ہے کہ امام دکیع بن الجراح اور سفیان ثوری جیسے

محدثین کا بھی یہی مذہب ہے۔

دکین بن الجراح کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے بھی آخر میں یہی سنت
سے کہ وہ فرماتے تھے کہ ہم سارے مسلمان گنہگاروں کے لیے جو ہماری
نماز پڑھتے ہیں اُمیدوارِ مغفرت ہیں خواہ وہ کیسا ہی عمل کریں۔
اور واقعہ یہ ہے کہ مانتے تو سب تھے لیکن محدثین فقہاء کی یہ تعبیر سننے کو تیار نہ تھے کہ ایمان
عملِ جہاد ہیں اور ان میں ہر ایک کا حکم مختلف ہے۔ صرف یہ دیکھ کر کہ ایمان و عمل کو جہاد
سمجھنا مرتبہ کا مذہب ہے اس کی تردید کرتے تھے۔ چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں اس کے
خلاف عنوان پر عنوان لاتے ہیں۔ حالانکہ مہجرت کے نزدیک عمل کی حیثیت ہی کوئی نہیں ہے
ان کا تو کھلا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک شخص سچے دل سے توحید و نبوت پر ایمان رکھتا ہے تو پھر
اسے گناہ کی کوئی پروا نہیں اور وہ سارے گناہوں کے باوجود آخرت کی باز پرس سے آزاد ہے
لیکن محققین اہل سنت جو عمل کو جزوِ ایمان نہیں بتاتے ان کے نزدیک ایک گنہگار مسلمان
کا معاملہ اللہ سبحانہ کے اختیار میں ہے چاہے تو اپنے فضل سے بخش دے اور چاہے تو اپنے عدل
کے مطابق سزا دے اور خود امام بخاری کا بھی یہی مذہب ہے۔ بہر حال ابراہیم بن طہمان کی
برگزیدہ شخصیت اس سے برتر تھی۔

امام احمد بن حنبل کے دل میں ان کی اس قدر عظمت تھی کہ ایک بار ان کی مجلس میں ابراہیم
کا ذکر ہوا تو امام احمد بخاری کی وجہ سے ڈھاسنا لگاتے بیٹھے تھے اٹھ بیٹھے اور فرمایا:
لَا يَنْبَغِي أَنْ يَذْكُرَ الصَّالِحُونَ فَيَذْكَبُوا
صالحین کا ذکر ہو تو ڈھاسنا لگانا اچھا نہیں ہے۔

ولادت برات میں ہوئی اور وفات ۲۳ھ میں حرمِ محترم میں ہوئی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الامام الحافظ مکی بن ابراہیم

حافظ ذہبی نے ان کا ذکر اس طرح شروع کیا ہے۔ الحافظ الامام شیخ خراسان۔ اور ان کے
اساتذہ میں یزید بن ابی عبید اور بہز بن حکیم کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

حدث عن يزيد بن ابی عبید و جعفر الصادق و بھرن بن حکیم و ابی حنیفۃ و هشام -

امام مکی بن ابراہیم امام اعظم کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ صدر الائمہ رقمطراز ہیں کہ مکی بن ابراہیم کو فہ آئے اور امام اعظم کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے اور آپ سے فقہ و حدیث حاصل کیا اور بکثرت روایتیں لیں یہ

امام مکی علم حدیث میں بہت بڑے امام ہیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے ادب نہ کیا ہے۔ خود امام مکی کا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ حج کیے، دس سال تک حرم محرم کا مجاور رہا ہوں اور سترہ تابعین سے حدیثیں لکھی ہیں اور یہ بھی فرماتے تھے کہ ۲۶۱ھ میں پیدا ہوا۔ اور سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل شروع کی یہ حافظ عسقلانی نے تہذیب میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پیش آئے گی تو میں سوائے تابعین کے کسی سے بھی حدیث نہ لیتا یہ ان کے آغاز علم کی داستان بھی بڑی مزے دار ہے۔ کیونکہ ان کو تحصیل علم کے لیے امام ابو حنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا۔ چنانچہ امام حارثی عبد الصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ میں کاروبار کرتا تھا ایک بار امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ تم تجارت کرتے ہو مگر تجارت میں علم کے بغیر سترہ تاسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔ تم علم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث کیوں نہیں لکھتے۔ امام موصوف مجھے برابر اس طرف توجہ دلاتے رہے حتیٰ کہ میں نے اس وادی میں قدم رکھ دیا اور کثرت علم کی طرف متوجہ ہو گیا اور اللہ سبحانہ نے مجھے علم کی دولت مرحمت فرمائی اس لیے میں ہر نماز کے بعد اور جب بھی امام ممدوح کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے حق میں دعا کرتا خیر کرتا ہوں۔

لان اللہ تعالیٰ ببرکتہ فتح لی باب العلم

کیونکہ آپ ہی کی برکت سے اللہ سبحانہ نے میرے لیے علم کا دروازہ کھولا ہے۔

۱۔ مناقب صدر الائمہ ج ۱ ص ۲۰۳ - ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۳ -

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۹۵ - ۴۔ مناقب صدر الائمہ ج ۲ ص ۱۶۱

ظاہر ہے کہ آپ امام اعظم سے پندرہ سولہ سال کی عمر میں کاروبار ہی کے سلسلے میں ملے ہوں گے اسی عمر کے لڑکے کو علم کی ترغیب دی جاتی ہے۔ سال ڈیڑھ سال سوچ بچار میں گزر گیا اور بالآخر آپ نے سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت اختیار کر لی اور اس سلسلے میں اولین استاد آپ کے امام اعظم ہوتے اور آپ ۳۳۰ھ سے ۳۵۰ھ تک امام اعظم کے علوم سے خوشہ چینی کرتے رہے اور آپ کی وفات کے بعد آپ نے حجوں کا سلسلہ شروع کیا اور پہلا حج ۳۵۰ھ ہی میں کیا۔ خطیب نے عبدالصمد بن الفضل کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ آپ نے ساٹھ حج کیے ہیں۔ اگر آپ کی وفات جیسا کہ محمد بن سعد نے بتایا ہے ۳۵۰ھ میں ہوئی ہے تو حجوں کی یہ تعداد اسی طرح پوری ہو جاتی ہے کہ آپ کا پہلا حج ۳۵۰ھ میں ہو۔

امام اعظم کے علم کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ کان اعلیٰ اہل زمانہ اور محدثین کی اصطلاحی زبان میں علم سے مراد حدیث ہی ہوتا ہے۔
امام مکی کے دل میں امام اعظم کی حدیث دانی کی عظمت کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو صدر الامۃ نے اسماعیل بن بشر کی زبانی نقل کیا ہے کہ

ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے انہوں نے درس شروع کیا کہ حدیثنا ابو حنیفہ... الخ حاضرین میں سے ایک بول پڑا کہ حدیثنا ابن جریر ہم سے ابن جریر مکی کی روایات بیان کھتے اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فرمانے لگے۔

ان لا یحدث السفہاء من علیہ ان تکتب عتی قم
من مجلسی ہم بیوقوفوں سے حدیثیں بیان نہیں کرتے تمہیں میرے
سے حدیث لکھنا روا نہیں ہے میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔
چنانچہ جب تک اس شخص کو اپنی مجلس سے نہ اٹھا دیا حدیث بیان نہیں
کی اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حدیثنا ابو حنیفہ کا سلسلہ
شروع کر دیا۔

امام مکی کو امام اعظم کے تلامذہ میں صرف حافظ ذہبی نے ہی نہیں بلکہ حافظ ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں جہاں امام بخاری کے اساتذہ و مشائخ حدیث کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کی ہے کہ مکی بن ابراہیم کا تعلق امام بخاری کے اساتذہ میں اس طبقہ اولیٰ سے ہے جنہوں نے تابعین کے سامنے زائونے شاکر دی تھا کیا ہے۔ گویا مراتب شیوخ میں امام بخاری کے اساتذہ اتباع تابعین ہیں۔ اور ان اتباع تابعین میں جو امام بخاری کے طبقہ اولیٰ کے شیوخ ہیں سب سے اوچا اور بالا مقام مکی بن ابراہیم کا ہے۔ چنانچہ امام بخاری کی مرویات میں جو روایات سب سے عالی ہیں اور جن کو ثلثیات کہا جاتا ہے جن کی تعداد بائیس ہے ان میں زیادہ تعداد امام بخاری کو مکی بن ابراہیم ہی کے حوالہ سے ملی ہے یعنی بائیس میں سے گیارہ اور باقی گیارہ دوسرے مختلف اساتذہ سے آئی ہیں جیسا کہ آپ نیچے پڑھ آئے ہیں اور مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے جو ثلثیات امام بخاری کو ملی ہیں وہ صحیح بخاری کے مندرجہ ذیل ابواب میں آئی ہیں۔

باب اثم من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قدر کم یبغی ان یکون بمن المصلی والسترة، باب الصلوة الی الا سطوانة، باب وقت المغرب، باب صوم عاشوراء، باب اذا احال دین المیت۔ باب البیعة فی الحرب، باب من رای العدو، باب غزوة خیبر، باب انیة المجوس، باب اذا قتل نفسه خطا۔

الامام الضحاک بن محمد البوعاصم البزبیل

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں، حافظ ابوالحجاج المزنی نے تہذیب الکمال میں اور محدث صیمری نے مناقب میں ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ان کو فرمے کہ ان کے حلقہ تلمذ میں امام محمد بن حنفیل، امام اسحاق بن راہویہ، امام علی بن المدینی اور امام بخاری جیسے اساطین علم حدیث داخل ہیں۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں۔ کہ امام ابو عاصم کو ایک ہزار صحیح حدیثیں نوک زبان تھیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے خود ان سے سنا ہے فرماتے تھے کہ مجھے جب سے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی ہے۔ میں نے کبھی غیبت نہیں کی۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا سارا علم ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ چنانچہ ابن خراش کہتے ہیں لیسر فی یدہ کتاب ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔

حافظ ذہبی نے بھی ان کی اس خوبی کو یہ کہہ کر سراہا ہے کہ

لم یحدث قط الا من قبل حفظہ۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کے زہد، علم و دیانت پر علماء کا اتفاق کہتے ہیں۔
ان کو نبیل کیوں کہتے ہیں۔

اس میں علماء کے مختلف خیالات ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی زیر کی اور فراست کی وجہ سے ان کو نبیل کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ شہر میں ایک روز ہاتھی آگیا۔ عام شہری اسے دیکھنے گئے لیکن ابو عاصم اس نظارہ سے لطف اندوز نہیں ہوئے۔ ابن جریر نے یہ سن کر فرمایا کہ انت النبیل تو ہی عقل مند ہے لیکن امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ :

امام زفر کے یہاں ان کی اکثر حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں ان کا ہم نام ایک اور شخص بھی آتا تھا جن کی وضع قطع بالکل گنتی گزری تھی۔ یہ حسین و جمیل اور خوش پوش تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی۔

لوٹدی نے آکر دریافت کیا کون؟ جواب ملا کہ ابو عاصم۔ کنیز نے اندر جا کر اطلاع دی کہ ابو عاصم دروازے پر حاضر ہیں۔ امام زفر نے دریافت کیا کون سے ابو عاصم ہیں؟ لوٹدی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

النبیل (معزز)، ابو عاصم اندر آئے تو امام زفر فرمانے لگے کہ اس لوٹدی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہو گا۔ اس نے تمہیں نبیل کے لقب سے ملقب کیا ہے ابو عاصم کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا ہے۔

حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل نقل کیا ہے۔ بصرے میں ابو عاصم النبیل

ہی امام اعظم کے مذہب کی نشر و اشاعت کا باعث بنے ہیں۔ ابو عاصم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوے سال کی تھی۔ فقہیت میں یگانہ روزگار تھے۔ ابن سعد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ کان ثقتہ ففیہا۔ ائمہ سترہ میں امام بخاری تو ان کے بلا واسطہ شاگرد ہیں اور امام ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی بواسطہ حافظ بدیع عبد اللہ بن اسحاق ابو محمد الجوبیری ان کے تلامذہ ہیں۔ حافظ عبد القادر قرظی فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ میں نے خود امام ابو عاصم کی زبانی سنا ہے فرماتے تھے کہ ہم امام اعظم کی خدمت میں حاضر تھے آپ کے پاس فقہ و حدیث کے تشنگان علوم کا بے حد ہجوم ہوتا تھا۔ ایک روز آپ نے فرمایا کہ کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو صاحب خانہ سے جا کر کہے کہ وہ اس ہجوم کا بندوبست کرے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جاتا ہوں لیکن ذرا مجھے کچھ مسائل کے بارے میں پوچھنا ہے فرمایا پاس آؤ اور پوچھ لو۔ میں آگے بڑھ گیا اور مسائل دریافت کیے۔ اسی آٹنا میں اوروں نے بھی کچھ سوالات کیے اور آپ نے ان کو جوابات دیے۔ میں ان میں کچھ ایسا محسوس کیا کہ مجھے صاحب خانہ کے پاس جانا یاد نہ رہا۔ پھر آپ ہجوم سے کچھ پریشان ہوئے اور فرمایا کہ ابھی ابھی یہاں کسی شریف آدمی نے صاحب خانہ کے پاس جانے کا وعدہ کیا تھا وہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ہوں۔ فرمایا کیا تم جاؤ گے نہیں؟ تم نے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ عرض کیا کہ میں نے بلا قید و قوت جانے کو کہا تھا جب چاہوں جاسکتا ہوں فرمایا کیا کہہ رہے ہو؟ مخاطبات اور محاورات میں کلام کا محمل ارادہ سے مقرر نہیں ہوتا ہے اس کا محمل فی الفور ہے۔

حافظ ابن حجر نے ابو عاصم ابن بیل کو بھی امام بخاری کے اساتذہ میں صف اول اور طبقہ اولیٰ کا درجہ دیا ہے۔ یہ بھی اتباع تابعین سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے ایک ہیں جن کی وساطت سے امام بخاری کو ثلاثیات ملی ہیں۔ ان کی وساطت سے آتی ہوتی ثلاثی حدیثوں کی تعداد صحیح بخاری میں چھ ہے۔

امام اعظم سے ان کو جو گہری اور بے پایاں عقیدت تھی اس کا اندازہ کرنا ہو تو امام نصر بن علی کا یہ بیان پڑھیے کہ :

میں نے ایک بار ابو عاصم سے دریافت کیا کہ آپ کے خیال میں

سفیان ثوری زیادہ فقیہ ہیں یا ابو حنیفہ۔ فرمایا سفیان سے مقابلہ کرتے
ہو۔ بخدا ابو حنیفہ کا فقہ میں مقام تو میرے نزدیک ابن جریر سے
بھی بالا ہے۔ میری آنکھوں نے آج تک علم پر اتنا قابو یافتہ شخص
کوئی نہیں دیکھا ہے۔

بہر حال ابو عاصم ابنیل کی شخصیت امام اعظم کے تلامذہ میں جیسے گرامی قدر ہے ایسے ہی ان کی
ذات گرامی بعد میں آنے والے محدثین کے اساتذہ میں عظیم ترین مہستی ہے۔ سائے محدثین کا
شجرہ علمی بالواسطہ اور بلاواسطہ ان سے جا کر ملتا ہے۔

الامام الحافظ یزید بن ہارون

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مبسوط ترجمہ لکھا ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے 'الحافظ
القُدوہ، شیخ الاسلام اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کے چہرے کا آغاز اس طرح
کیا ہے 'احد الحفاظ المشاہیر الاعلام، امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے
بڑھ کر کسی کو حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ ابن ابی شیبہ کہتے ہیں کہ ہم نے یزید بن ہارون سے زیادہ
حفظ میں کسی کو پکا نہیں دیکھا۔ علی بن عاصم کا بیان ہے کہ یزید رات بھر نوافل پڑھتے۔ انہوں نے
کچھ اوپر چالیس سال تک عشتا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے۔ حافظ ابو بکر الخطیب نے
بسنہ متصل یحییٰ بن ابی طالب کا بیان لکھا ہے کہ میں نے بغداد میں ان سے حدیث کا سماع
کیا ہے اس وقت ان کے درس میں ستر ہزار حاضرین کی تعداد بتائی جاتی تھی۔ حافظ عبد القادر
قرشی نے الجواہر المفیۃ میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں تصریح
کی ہے کہ یزید بن ہارون نے امام اعظم سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ امام صاحب کے فضل و کمال
اور حفظ حدیث کے نہایت مصترف تھے۔ ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو میں نے
دیکھا ہے ان میں ابو حنیفہ سے زیادہ فقیہ کوئی نہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے یزید بن ہارون کے
حوالہ سے لکھا ہے :

۱۔ مناقب صدر الامم ج ۲ ص ۶۵ - ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲ -

۳۔ تاج السیاح بغداد ج ۱۴ ص ۱۴۶ -

اور کت الف رجل فکتبت عن اکثرهم ما رأيت فيهم افتقدوا
اوراع ولا اعلم من خمسة اولهم ابو حنیفۃ۔

میں ایک ہزار اکابر سے ملا ہوں اور ان میں اکثر سے حدیثیں لکھی ہیں۔
لیکن میں نے ان میں پانچ سے زیادہ پارسا، فقیہ اور عالم کوئی نہیں
دیکھا ہے ان میں اولین ابو حنیفہ ہیں۔

ان کی حدیث دانی کا حال یہ ہے کہ علی بن شعیب کہتے ہیں کہ میں نے خود ان کو یہ کہتے سنا ہے
کہ مجھے بالاسناد چوبیس ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں۔

ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کے یزید بن ہارون منشی ہے ہیں یعنی جس زمانے میں ابوشیبہ واسطہ
میں قاضی تھے تو یزید ان کے منشی تھے ان کے بارے میں یزید کا بیان ہے کہ :
اپنے زمانے میں ابوشیبہ سے زیادہ عادلانہ فیصلہ کوئی نہ کرتا تھا۔

یہ امام یزید کے حدیث میں استاد بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ ابوشیبہ کو بعد کے محدثین نے
جرحی تیروں کا نشانہ بنالیا ہے اور اس کی بنیاد محض ایک افسانے پر رکھی ہے ورنہ یزید بن ہارون
تک ان کی تقابلیت اور دیانت میں کسی کو کوئی کلام نہ تھا۔

یزید اپنے علمی جلال میں اس قدر اونچا پایہ رکھتے تھے کہ مامون حبیب عظیم المرتبت خلیفہ بہت بڑے
علمی جلال کے باوجود ان سے خائف تھا۔ حافظ ذہبی نے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید
ہوتی ہے۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ ایک بار ہم سے مامون نے کہا کہ اگر مجھے یزید کی
عاجل سے اندیشہ نہ ہوتا تو میں اعلان کر دیتا کہ قرآن مخلوق ہے ورنہ
کیا کیا یہ یزید کون ہیں؟ جن سے آپ کو اندیشہ ہے۔ جواب دیا کہ مجھے
اندیشہ ہے کہ میں اعلان کر دوں اور یزید میری تردید کہیں اور لوگوں میں
اختلاف برپا کر لائے عامہ فتنہ کا شکار ہو جاتے۔ مامون کی یہ باتیں سن
کر ایک شخص یزید بن ہارون کے پاس واسطہ پہنچا اور کہا کہ امیر المؤمنین
آپ کو سلام کہتے ہیں اور یوں فرماتے ہیں کہ میرا براہ ہے کہ میں

قرآن کے مخلوق ہونے کا اعلان کروں۔ امام یزید نے سنتے ہی فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو امیر المومنین نے یہ بات نہیں کہی اور نہ امیر المومنین سے یہ توقع ہے کہ وہ سائے عامہ کے سامنے ایسی بات رکھیں جس سے عوام آستنا نہیں ہیں۔

آپ یس کمر حیران ہوں گے کہ مامون الرشید نے یزید کی زندگی میں اس بات کا اعلان نہیں کیا۔ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یزید کی وفات ۲۰۶ھ میں ہوئی اور مامون نے یزید بن ہارون کی وفات کے پورے چھ سال بعد ۲۱۲ھ میں اس کا اعلان کر دیا۔

ابھی صرف اعلان تھا اور ۲۱۸ھ میں اس نے طے کر لیا کہ اپنی قوت سے کام لے کر لوگوں کو خلق قرآن کا مسئلہ ماننے پر مجبور کرے چنانچہ اس فیصلہ کو جبراً نافذ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اللہ اکبر یزید کی شخصیت میں کس قدر برتری ہوگی جو ایک فتنہ کے لیے تاحین وفات روک بنی رہی۔ بہر حال امام یزید بن ہارون کی ذات گرامی محدثین کے یہاں ایک استدلالی شخصیت ہے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے ان کے سامنے زانوتے نشاگردی طے کیا ہے جیسے امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی، امام ابو نعیم، امام ابو جکر بن ابی شیبہ، خلف بن سالم، امام احمد بن مینع وغیرہ، اس لحاظ سے بعد کے تمام محدثین کے لیے امام یزید بن ہارون استاد الاساتذہ ہیں۔

الامام الحافظ وکیع بن الجراح

وکیع بن الجراح بن ملیح بن عدی نام، البوسفیان کنیت، نسباً المر داسی اور بلحاظ بود و باش کو فی ہیں۔ علم حدیث کے مشہور امام ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام الثبت الحافظ محدث العراق کے القاب سے یاد کیا ہے۔ مشہور ناقد رجال یحییٰ بن معین علم حدیث میں ان کا پایہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں وکیع فی زمانہ کالادنی اعی فی زمانہ عبد اللہ بن المبارک، امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی، امام یحییٰ بن معین، امام اسحاق بن راہویہ، امام زہیر، امام ابو جکر بن ابی شیبہ اور ابو کریب نے ان کے آگے زانوتے ادب کر کیا ہے۔

یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔ سجدائیں نے اللہ کی خاطر وکیع کے علاوہ حدیث روایت کرنے والا

کوئی نہیں دیکھا اور مجھے وکیع سے زیادہ حافظ بھی کوئی نظر نہیں آیا اور فرماتے تھے کہ محدثین تو چار ہیں وکیع، یعلیٰ بن عبید، القعنبنی اور احمد بن حنبل۔ امام احمد جب وکیع کا ذکر فرماتے تو کہتے کہ میرے مشاہیر میں وکیع سے زیادہ حدیث کا ضابطہ اور حافظ کوئی نہیں ہے۔ ان کا ہی ایک اور بیان ہے کہ میں نے وکیع جیسا علم، حفظ و ضبط میں روایت و اسناد، فقہ و احکام میں اور پارسی و تقویٰ میں کوئی نہیں دیکھا یہ جسم کے ذرا بھاری بھرلم تھے، مکہ تشریف لائے۔ فضیل بن عیاض سے ملاقات ہوئی۔ سعید بن منصور کہتے ہیں کہ فضیل نے ان سے پوچھا کہ راہب عراق ہو کر یہ موٹا پایا کیسا؟ جواب بڑا ہی مسکت دیا فرمایا کہ مسلمان ہونے کی خوشی میں پھول گیا ہوں۔ حافظہ اس قدر غضب کا تھا کہ ابو داؤد کہتے ہیں کہ وکیع کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔ یہ صرف یہی نہیں کہ امام اعظم کے تلامذہ میں سے تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے ترجمہ ابی حنیفہ میں تصریح کی ہے بلکہ یہ امام اعظم کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کے بارے میں خود امام صاحب نے یہ تاثر ظاہر فرمایا ہے۔

تم میرے دل کی مسرت اور میرے رنج و غم کا جلا ہو، فقہ و شریعہ کی زمین میں نے تمہارے لیے تئیں دی ہے اور نگام تمہارے ہاتھ میں ہے چکا ہوں۔ اے عامہ تمہارے پیچھے چلے گی اور تمہارے الفاظ کی مثللاشتی ہوگی تم میں سے ہر ایک عدلیہ میں کام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ میرا تم سے اللہ کے نام پر اور اس علم کی بزرگی کے نام پر مطالبہ ہے کہ علم کو کراہی پر چلانے سے بچنا۔ اگر تم میں سے کوئی عدلیہ کی آزمائش میں پڑ جائے اور اسے اپنے اوپر اعتماد نہ ہو تو اس کے لیے عہدۂ قضا ہرگز روا نہیں ہے اور اگر ناگزیر حالات میں طبیعت کے خلاف یہ کام کرنا ہی پڑ جائے تو لوگوں سے علیحدگی ہرگز اختیار نہ کرنا۔ نماز پنجگانہ مساجد میں عوام کے ساتھ ادا کرنا اور نماز کے بعد اعلان کے ذریعے ارباب ضرورت کو تلاش کرنا اور نمازِ غشا کے بعد خصوصاً اس مقصد کے لیے تین بار

اعلان کرنا۔ اگر بیمار ہو جاؤ تو بیماری کے زہلے کی تنخواہ نہ لینا۔ اور
اگر سربراہ مملکت خزانہ حکومت میں بددیانتی کرے اور ظلم و جور کا
روئیہ اختیار کرے تو اس کی سربراہی باطل اور اس کی حکومت
ناجائز ہے بلکہ

وکیع کے والد اگرچہ سرکاری ملازم تھے یعنی سرکاری خزانہ کے نگران تھے اور حکومت کا مالیاتی
مسئلہ ان سے متعلق تھا۔ خود امام وکیع کے حوالہ سے خطیب رقمطراز ہیں کہ :

میں امام اعمش کے پاس گیا اور ان سے احادیث روایت کرنے کی
درخواست کی انہوں نے مجھ سے میرا نام دریافت کیا۔ بتایا کہ وکیع
ہے۔ فرمایا کہ نام تو بڑا ہی پر عظمت ہے۔ میرا خیال ہے کہ مستقل میں
تمہارا نام ہوگا۔ بتاؤ کوفہ میں کہاں رہتے ہو؟ میں نے بتایا کہ بنی اداس
میں۔ بولے کہ جراح بن یلع کے گھر سے کتنی دور؟ میں نے عرض کیا
کہ وہ تو میرے والد ہیں۔ بولے جاؤ پہلے ان سے میرا ماہانہ لے آؤ
وہ کیشیر ہیں۔ میں بعد ازیں تمہیں پانچ حدیثیں سناؤں گا۔ میں
گھر آیا اور صورت حال سے والد کو مطلع کیا۔ والد نے کہا کہ آدھا
روزینہ لے جاؤ اور پانچ حدیثیں سن آؤ پھر آدھا لے جانا اور پانچ
حدیثیں سن آنا اس طرح تمہیں دس حدیثیں آجائیں گی۔ چنانچہ میں
آدھا روزینہ لے کر پہنچا امام اعمش نے لے لیا اور مجھے نقد دو حدیثیں
سنادیں میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو مجھ سے پانچ حدیثوں کا وعدہ
کیا تھا فرمایا پورا ماہانہ کہاں ہے میرا خیال ہے کہ تمہارے والد
نے تمہیں یہ ترگیب سمجھائی ہوگی۔ لیکن ان کو پتہ نہیں کہ اعمش جہاں
دیدہ گھاگ ہے جاؤ پورا روزینہ لے کر آؤ اور پوری پانچ حدیثیں
سن لو۔ میں واپس آیا وظیفہ لے گیا اور پانچ حدیثیں سنیں۔ لے

اس کے باوجود کہ ان کے والد کا سرکار میں اس قدر عمل دخل تھا اور اتنی اونچی کلیدی

ملازمت پر تھے اور ہارون الرشید سربراہ مملکت عباسی نے امام وکیع کو عدلیہ میں لانے کی کوشش بھی کی لیکن لکھا ہے کہ انہوں نے عہدۂ قضا قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ :

ادالہ رشیدان یولی وکیعاً قضا الکوفۃ فامتنع۔^۱

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ امام وکیع نے اپنے استاد ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور اس راہ میں اپنی ذات پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے استاد کی نصیحت پر عمل کیا تھا۔

امام وکیع صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔ ہم نے ان کی تصانیف کاگزشتہ اوراق میں ذکر کیا ہے امام ذہبی نے ان کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ نماز میں بسم اللہ باواز بلند کو بدعت کہتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر اور حافظ ابو بکر الخطیب دونوں اس پر متفق ہیں کہ امام وکیع نے حدیث میں امام اعظم کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا ہے۔ چنانچہ الخطیب نے اگر یہ بتایا ہے کہ :

کان قد سمع منہ شیئاً کثیراً۔^۲

تو حافظ ابن عبد البر نے بھی یہی لکھا ہے کہ :

وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً۔ وکان یحفظ حدیثہ کملہ۔^۳

اور صرف حدیث میں ان کو نسبت تلمذ ہی حاصل نہ تھی بلکہ امام اعظم کے علم پر ان کو اس قدر اعتماد تھا کہ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں، الخطیب نے تاریخ بغداد میں اور ابن عبد البر نے الانتقاء فی فضائل الثلاثمۃ الفقہاء اور جامع بیان العلم میں یحییٰ بن معین کے حوالہ سے تصریح کی ہے کہ کان یفتی بقول ابی حنیفۃ۔ ان کی وفات ۱۹۷ھ میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ علی بن مسہر

علی بن مسہر نام ابو الحسن کنیت، نسبت دلاہی وجہ سے قرشی اور سکونت کے لحاظ سے

^۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲۔ ^۲ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۴۱۔

^۳ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹۔

کوفی ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کا ترجمہ الامام الحافظ کے القاب سے شروع کیا ہے۔ ان کے تلامذہ میں مشہور محدثین میں ابو بکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن حجر اور ہناد ہیں۔ یہ فقہ و حدیث دونوں کے جامع تھے۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابو زرعہ، نسائی اور ابن حبان ان سب نے متفقہ طور پر ان کو ثقہ کہا ہے۔ امام عجل کے ان کے بارے میں الفاظ یہ ہیں کہ ان میں جمع الحدیث والفقہ۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ان ثقہ کثیر الحدیث۔

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظم کی مجلس درس میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں مگر امام اعظم کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے۔ اور سفیان ثوری نے اپنی کتاب جامع کی تصنیف میں بھی زیادہ تر ان سے ہی مدد لی ہے۔ چنانچہ عبدالقادر قرشی نے مشہور محدث صیری سے جو خطیب بغدادی کے علم حدیث میں استاد ہیں نقل کیا ہے۔

و هو الذي اخذ عنه سفیان علمه ابی حنیفۃ و نسخ منه کتبہ
اسی بنا پر سفیان ثوری کی جامع کے بارے میں حافظ ابن عبدالبر نے قاضی ابویوسف کا یہ تاثر بنایا ہے،

سفیان الثوری اکثر متابعه منی لابی حنیفۃ۔
علی بن مسہر آرمینیا میں عدلیہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قاضی کہلاتے تھے۔ حافظ ذہبی نے ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ۱۸۰ھ میں کوفہ ہی میں وفات ہوئی۔ محدثین نے ان کی ثقاہت، دیانت اور امانت کے بہت گن گاتے ہیں۔

الامام الحافظ حفص بن غیاث

حفص بن غیاث نام، ابو عمر و کنیت، نسباً نخعی اور وطناً کوفی ہیں خطیب بغدادی نے ان کے تلامذہ میں جن اجلہ محدثین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ابو نعیم، عفان بن مسلم، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، زہیر بن حرب اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔
اولاً بغداد پھر کوفہ میں منصب قضا پر فائز رہے ہیں۔

حفص بن غیاث بھی امام اعظم کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کو امام اعظم نے قلبی مرتب قرار دیا ہے۔ ان کے قاضی بننے کی داستان خطیب بغدادی نے جو لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بکراہت قاضی بننا گوارا کیا تھا۔ چنانچہ حمید بن الربیع کہتے ہیں کہ جب عبداللہ بن ادریس، حفص بن غیاث اور وکیع بن الجراح کو ہارون الرشید نے عدلیہ میں کام کرنے کے لیے بلایا تو مجلس میں پہنچتے ہی عبداللہ بن ادریس نے ہارون الرشید کو سلام کیا اور سلام کے بعد جان کر زمین پر گر پڑے یوں محسوس ہوتا تھا کہ دورہ پڑ گیا۔ وکیع نے اپنے کو آنکھ پر ہاتھ رکھ کر یک چشم بنالیا۔ ہارون نے یہ صورت حال دیکھ کر دونوں کو مارا ہل قرار دے دیا۔ حفص کہتے ہیں کہ اگر مجھ پر قرض اور اولاد کا بار نہ ہوتا تو میں کبھی بھی یہ عہدہ قبول نہ کرتا۔

قاضی بن گئے لیکن ان کی عدلیہ کی پوری زندگی زہد و پارسائی کی مثالی زندگی سے چنانچہ ابوشام الرفاعی کہتے ہیں کہ حفص بن غیاث ایک روز عدالت میں مقدمہ سن رہے تھے کہ رئیس مملکت نے بلا بھیجا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ عدالت کا وقت ہے میں اس وقت نہیں آ سکتا۔ ایک روز آپ بیمار ہو گئے اور پوسے پندرہ دن بیمار رہے۔ حفص بن غیاث کے پوتے عبید کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے ایک سو درہم دیے اور کہا کہ جاؤ یہ رقم خزانہ حکومت میں داخل کر آؤ اور بتایا کہ یہ ان پندرہ دنوں کی تنخواہ واپس کر رہا ہوں جن میں میں نے کام نہیں کیا۔ یہ میرا حق نہیں ہے بلکہ

ان کی حدیث دانی، حدیث میں تقابست اور حفظ و ضبط کا سبب محدثین کو ہا مانتے ہیں۔ چنانچہ امام سیحی بن معین فرماتے ہیں:

وہ تمام احادیث جو امام حفص بن غیاث نے کوفہ و بغداد میں بیان کی ہیں۔ وہ سب زبانی یادداشت کے سہارے روایت کی ہیں ان میں کوئی بھی لکھی ہوئی نہ تھی اور ان حدیثوں کی تعداد جو لوگوں نے ان سے لکھیں تین ہزار ہے اور چار ہزار حدیثیں ان کو یاد تھیں۔

زبد و پارسانی اور اس شانِ محدثانہ کے ساتھ آپ جذبہ سخاوت سے بھی مالا مال تھے۔ چنانچہ ابو جعفر السندی نے ان کو اسخی العرب کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان سے ان کا یہ اعلان بھی نقل کیا ہے :

من لم یاکل من طعامی لا ھدیت

محدثین کے لیے تاریخ رجال سے واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ بیشتر احادیث اخبارِ احاد ہیں اور احاد کا تمام تر مدار رجالِ اسناد پر ہے۔ لہذا جب تک راویانِ حدیث کے حالات پر کج فہمی اطلاعات نہ ہو۔ اس کی سند کی صحت و ضعف کا پتہ نہیں چل سکتا۔ پہلی صدی میں تو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اس زمانے میں حدیثوں کے راوی تمام تر صحابہ کرام اور اکابر تابعین ہی تھے۔ قرنِ اول گزر جانے پر بے شک ضعیف راویوں کا کچھ پتہ ملتا ہے۔ لیکن ان کا ضعف بیشتر بددیانتی کی بنا پر نہیں بلکہ حافظہ کی کمزوری، قلت ضبط یا روایت میں تساہل کی وجہ سے ہے۔ بہر حال اس دور تک حدیث کے راویوں میں کسی دروغ گو کا وجود نادر اور ضعیف الروایت بہت کم تھے۔ امام اعظم اور امام مالک کی اکثر و بیشتر حدیثیں اسی طبقہ کے راویوں سے منقول ہیں۔ اسی لیے وہ صحت و وثوق کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ دوسری صدی میں کچھ لوگوں نے روایتِ حدیث میں کذب بیانی سے کام لیا تو ائمہ جرح و تعدیل نے تاریخ کی روشنی میں روایتوں کو جانچا۔ چنانچہ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں :

جب راویوں نے جھوٹ سے کام لیا تو ہم نے ان کے لیے تاریخ استعمال کی۔ اور امام حفص بن غیاث نے وقت کے اس تقاضے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسی سلسلے میں بڑے پتے کی بات فرمائی ہے :

إذا تھبتم ایشخ فحاسبوه بالسنین۔

جب کسی شیخ کو متہم کرو تو دونوں کی عمروں کا حساب لگا لو۔

یعنی اس راوی کی عمر کا اس شخص کی عمر سے حساب لگا لو جس سے یہ روایت کر رہا ہے کہ یہ اس سے ملا بھی ہے یا ویسے ہی اس سے روایت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ بہر حال امام حفص

بن غیاث امام اعظم کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی وفات ۱۹۴ء میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ، مشیم بن بشیر

مشیم بن بشیر بن ابی خازم القاسم بن دینار نام، ابو معاویہ کنیت، نسبت و لاکی وجہ سے سلمیٰ۔ اصلاً بخاری، وطن واسطی اور بلخاؤد و بادش بغدادی ہیں۔ ۳۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بڑے اچلے تابعین کے سامنے زانوئے شاگردی نہ کیا ہے۔ مثلاً عمرو بن دینار اور زہری۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظم کے ترجمہ میں جن ائمہ کے متعلق تصریح کی ہے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حدیث روایت کی ہے ان میں مشیم بن بشیر کو بھی شمار کیا ہے۔ امام ذہبی نے مناقب میں بھی اس کی تصریح کی ہے اور یہ بھی تذکرہ میں لکھا ہے کہ لا نزاع فی انہ من الحفاظ الثقات۔

ان کے والد حجاج بن یوسف ثقفی کے باورچی تھے۔ مچھلی پکانے میں خاص مہارت تھی۔ اس خاندان میں مشیم پہلے منفرد فرزند ہیں جنہوں نے اپنے لیے خاندان سے الگ ہو کر علم کی راہ تجویز کی۔ اولاً والد نے علم حاصل کرنے سے روکا لیکن مشیم علم کے نشہ سے چور تھے وہ بالکل خاموشی سے والد کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت سہتے رہے اور علم میں لگے رہے۔ حافظ، مشیم قاضی البوشیہ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور ان سے علم حدیث حاصل کرتے۔ ایک بار مشیم بیمار ہو گئے اور قاضی البوشیہ کے درس میں نہ جاسکے۔ قاضی صاحب نے اپنے شاگرد کی غیر حاضری کا لوگوں سے سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ ابو بکر الخطیب بغدادی نے بسند متصل یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ :

ایک بار مشیم بیمار ہو گئے۔ البوشیہ نے لوگوں سے دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ بیمار ہیں۔ فرمایا کہ چلو مشیم کی عیادت کریں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہو گئے اور قاضی صاحب کی ہمرکابی میں مشیم کی عیادت کے لیے بشیر طباح کے گھر پہنچے۔ ان کو گھر پر کھڑا دیکھ کر ایک شخص بھاگا ہوا بشیر کے پاس آیا اور بتایا کہ تبرکے گھر شہر کا قاضی

ایا ہوا ہے والد گھرائے تو قاضی صاحب ہشیم کے پاس بیٹھے ہوئے
تھے۔ جب قاضی صاحب واپس چلے گئے تو بشیر نے اپنے بیٹے سے
کہا۔ یا بنی قد کنت امنعت من الحدیث فاما الیوم فلا۔ بیٹے
میں تم کو حدیث پڑھنے سے روکتا تھا لیکن آج سے نہیں روکوں
گا۔ ابو شیبہ جیسا میرے گھرائے واہ سے میرے نصیب بھلا میں
اس کی کبھی آرزو بھی کر سکتا تھا۔

بغداد میں علم حدیث کی اشاعت میں امام ہشیم کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی نے امام
ذہبی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ :

بغداد جو عراق کا سب سے بڑا شہر ہے اس کی آبادی تابعین کے آخری
دور میں ہوئی۔ سب سے پہلے یہاں جس نے حدیث کی اشاعت کا کام
کیا وہ ہشام بن عروہ اور ان کے بعد شعبہ اور ہشیم ہیں۔
ان کی حدیث دانی کا حال معلوم کرنا ہو تو حماد بن زید کا وہ بیان پڑھیے جو خطیب بغدادی
نے بسند متصل پیش کیا ہے۔

محدثین میں ہشیم سے زیادہ میں نے بلند پایہ کوئی نہیں دیکھا ہے
کچھ محدثین تو ان کو سفیان ثوری سے بھی برتر کہتے تھے۔ امام مالک
ان کی بے حد تعریف کرتے تھے وہ اسے تسلیم ہی نہ کرتے تھے
کہ عراق میں ان کے سوا کوئی محدث ہے وہ فرماتے تھے کہ کیا
ہشیم سے بڑھ کر بھی عراق میں کوئی محدث ہے۔

ہشیم امام عظیم کے خاص تلامذہ میں سے ہیں اور ہشیم کے تلامذہ میں دوسرے محدثین
کے ساتھ امام احمد بن حنبل کو خاص مقام حاصل ہے اس لحاظ سے جیسے ہشیم اور ابو یوسف
کا باپیم رشتہ استاد و برادر ہونے کا ہے۔ ایسے ہی امام احمد کا رشتہ بھی ہشیم اور قاضی ابو
یوسف سے نسبت تلمذ میں ایک ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل علم کا کام

م شروع کیا تو سب پہلے قاضی ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیثیں لکھیں۔ فن حدیث میں اگر قاضی صاحب کی جلالتِ قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے دو شاگرد امام احمد اور امام یحییٰ بن یعین ان کے بارے میں آرا پر چھتے۔ افسوس کہ یہ تفصیل کا محل نہیں ہے۔

بہر حال منہم بن بشیر علم حدیث کے امام اور امام ابو حنیفہ کے تلمیذ ہیں۔ الخطیب نے ان کی تاریخ وفات ۱۸۰ھ بتائی ہے۔

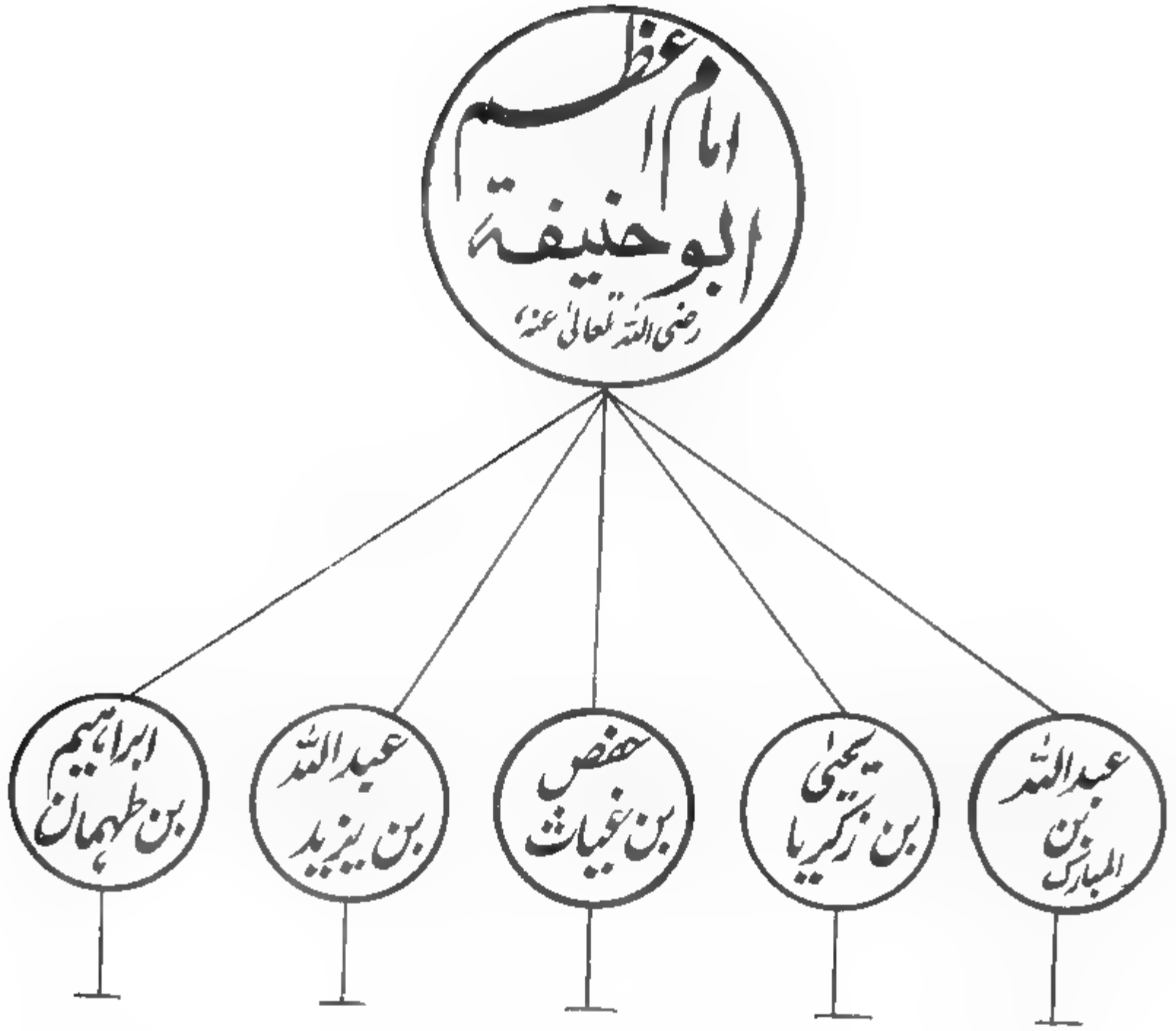
یہاں امام اعظم کے تمام تلامذہ کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے تراجم حفاظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں اور جن کے بارے میں خود امام ذہبی کی تصریح ہے کہ یہ امام اعظم کے تلامذہ ہیں یا پھر جن کا امام علی بن المدینی، امام بخاری، حافظ عسقلانی نے امام اعظم کے تلامذہ حدیث میں ذکر کیا ہے۔

اگر ہم یہاں حافظ الدین البرزازی اور علامہ خوارزمی کی تصریح کے مطابق امام اعظم کے تمام تلامذہ بیان کریں تو ایک طول طویل داستان ہو جائے گی اس لیے ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ان ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

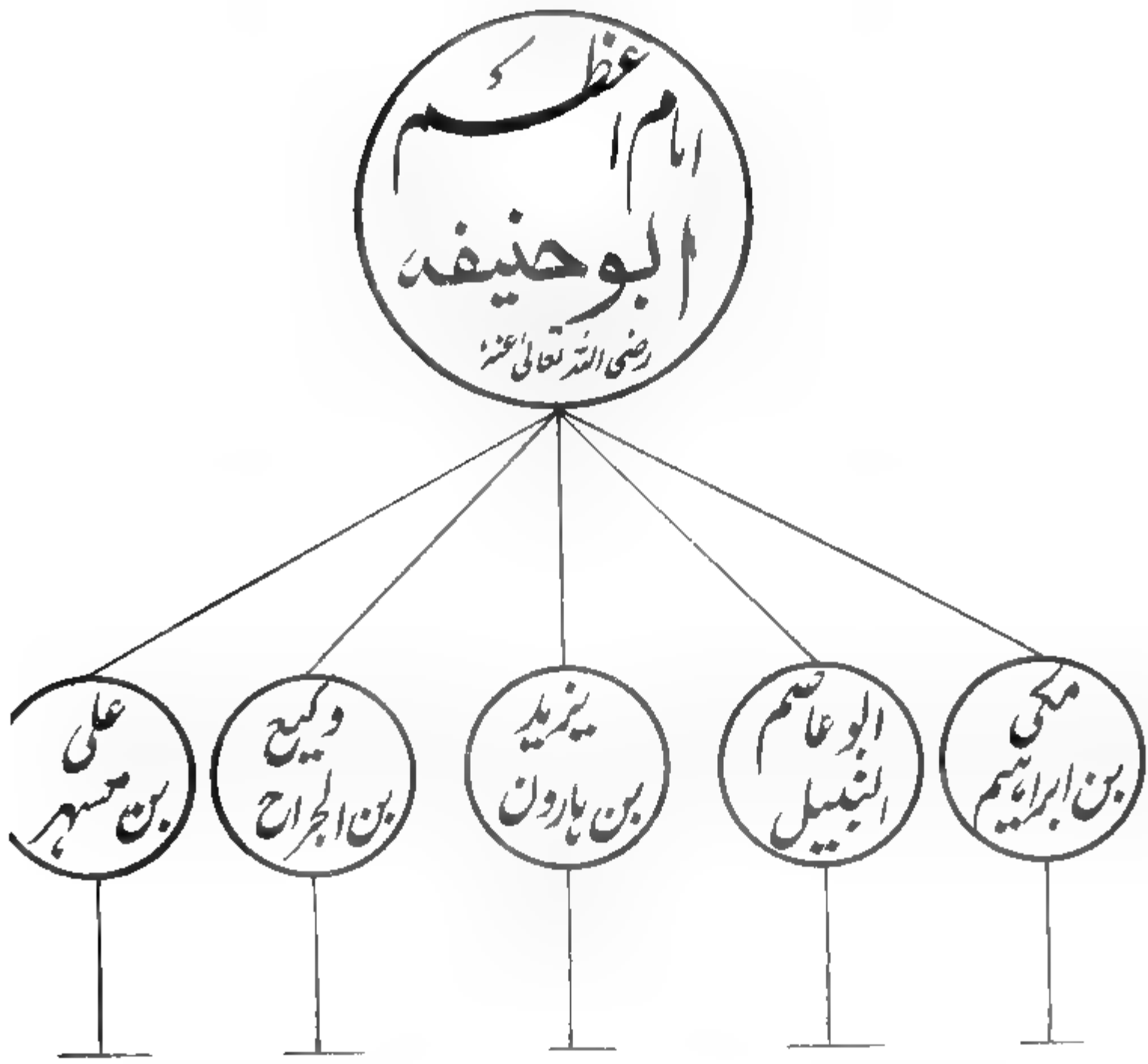
محدثین کرام کا امام اعظم سے علمی رشتہ

یہ امام اعظم کے چند مخصوص تلامذہ ہیں۔ لیجئے ان ہی کی مدد سے بعد میں آنے والے محدثین کا امام اعظم سے علمی رشتہ معلوم کر لیجئے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس آفتابِ عالمناں کی شعاعیں کہاں کہاں پہنچی ہوئی ہیں۔

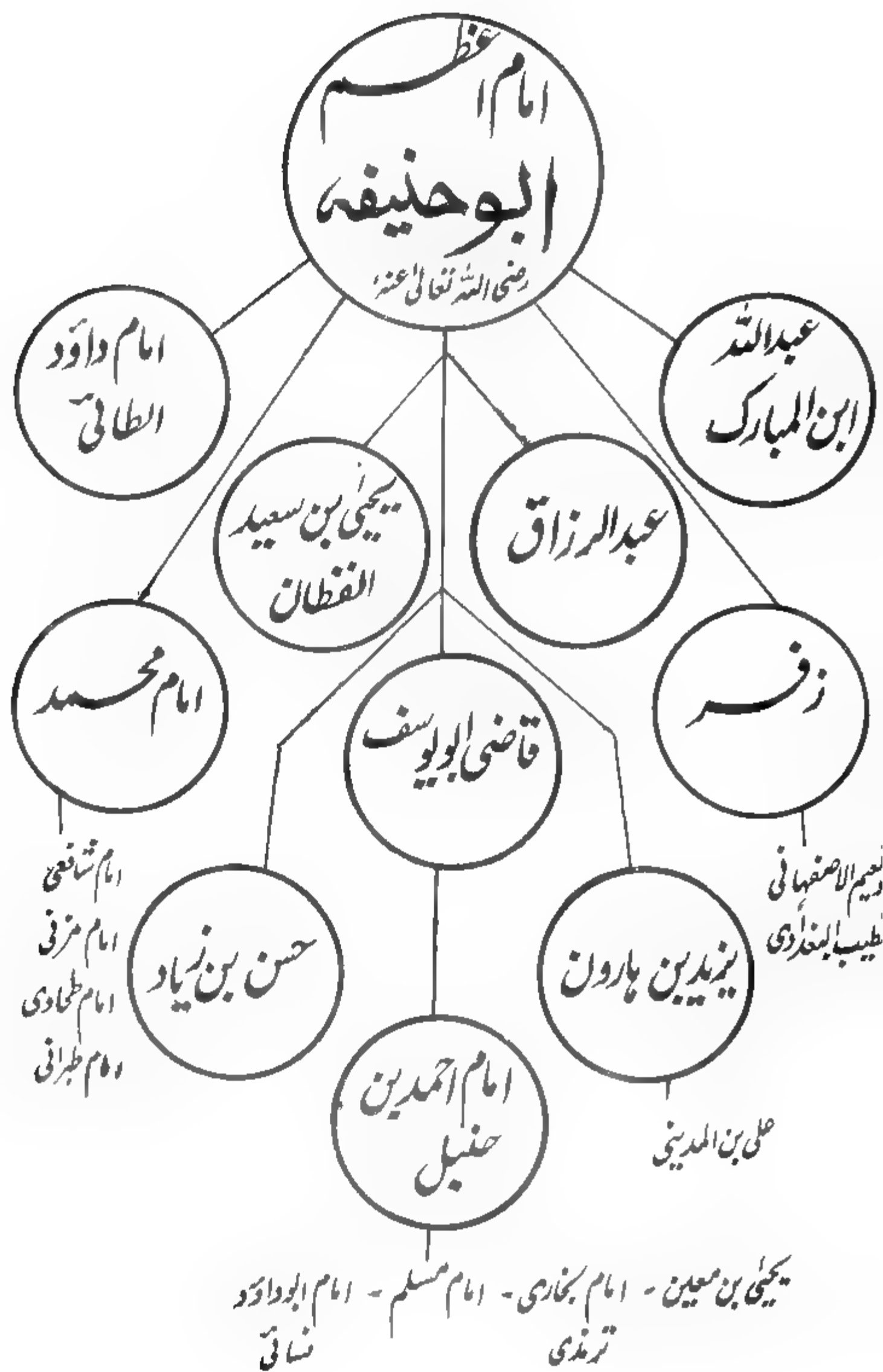
اس شجرہ علمی کی ایک ایک شاخ کی نشاندہی تو از بس مشکل ہے۔ ہم یہاں صرف بطورِ نکلے از گنزار اجمالی طور پر عرض کرتے ہیں۔ اسی اجمال سے آپ کو پوری تفصیلات کا اندازہ ہو جائے گا۔



- | | | | |
|------------------------|----------------------|---------------------|------------------------|
| ۱- ابراهیم بن طہمان | ۱- اسحاق بن راسوید | ۱- ابو کریب | ۱- عبد الرحمن بن مہدی |
| ۲- عبد اللہ بن یزید | ۲- عثمان بن ابی شیبہ | ۲- یعقوب | ۲- یحییٰ بن معین |
| ۳- حفص بن غیاث | ۳- علی بن المدینی | ۳- ابراہیم بن موسیٰ | ۳- ابو بکر بن ابی شیبہ |
| ۴- یحییٰ بن زکریا | ۴- یحییٰ بن معین | | ۴- احمد بن حنبل |
| ۵- عبد اللہ بن المبارک | | | |



- | | | | | |
|------------------|-------------------|------------------------|------------------------|------------------|
| ۱- علی بن حجر | ۱- ابو کریب | ۱- عبد بن حمید | ۱- الدارمی | ۱- انکدیمی |
| ۲- ہناد بن اسیری | ۲- علی بن المدینی | ۲- ابو خثیمہ | ۲- ابو مسلم البکی | ۲- یحییٰ بن معین |
| ۳- سدید بن سعید | | ۳- ابو بکر بن ابی شیبہ | ۳- الحارث بن ابی اسامہ | ۳- الذہلی |
| | | | | ۴- عباس الدوری |



عظ
امام
ابو حنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عبدالرحمن بن مہدی، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، محمد بن یحییٰ، الذہلی

عبداللہ المبارک

یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، ابو زرہ

امام احمد، امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، ابو زرہ، ابوالقاسم البغوی

عبداللہ بن یزید
المقبری

امام بخاری، محمد بن نصر موزنی، ہزہ، مطین، ابن خزمیہ

الدارمی، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، جعفر الطبرانی

ابو مسلم الکجی، ابو بکر القطیعی، ابوالقاسم الطبرانی، النجاشی، القزاز

ابو عامر النبیلی

الکدیمی، ابن الانباری، ابو بکر القطیعی، ابو بکر الشافعی

الذہلی، ابو زرہ، ابن خزمیہ، السراج، بخاری

مکی بن ابراہیم

ابو کریب، بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ

یعقوب بن ابراہیم، یحییٰ بن صاعد، قاسم المطرز، یحییٰ بن محمد

یحییٰ بن زکریا



اسحاق بن ابراہیم : بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی
عثمان بن ابی شیبہ : ابویعلیٰ، جعفر القریابی، نسائی، ابن ماجہ

حفص بن غیاث

بخاری، محمد بن نصر دوزی، ابن خزیمہ، صالح بن جزیرہ
نسائی، ابوبشر الدولابی، ابوالقاسم الطبرانی

ابراہیم بن طہمان

علی بن المدینی : ذہبی، بخاری، ابویعلیٰ

ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوزرعة، یحییٰ بن محمد، الفریابی

دکین بن الجراح

علی بن حجر، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی

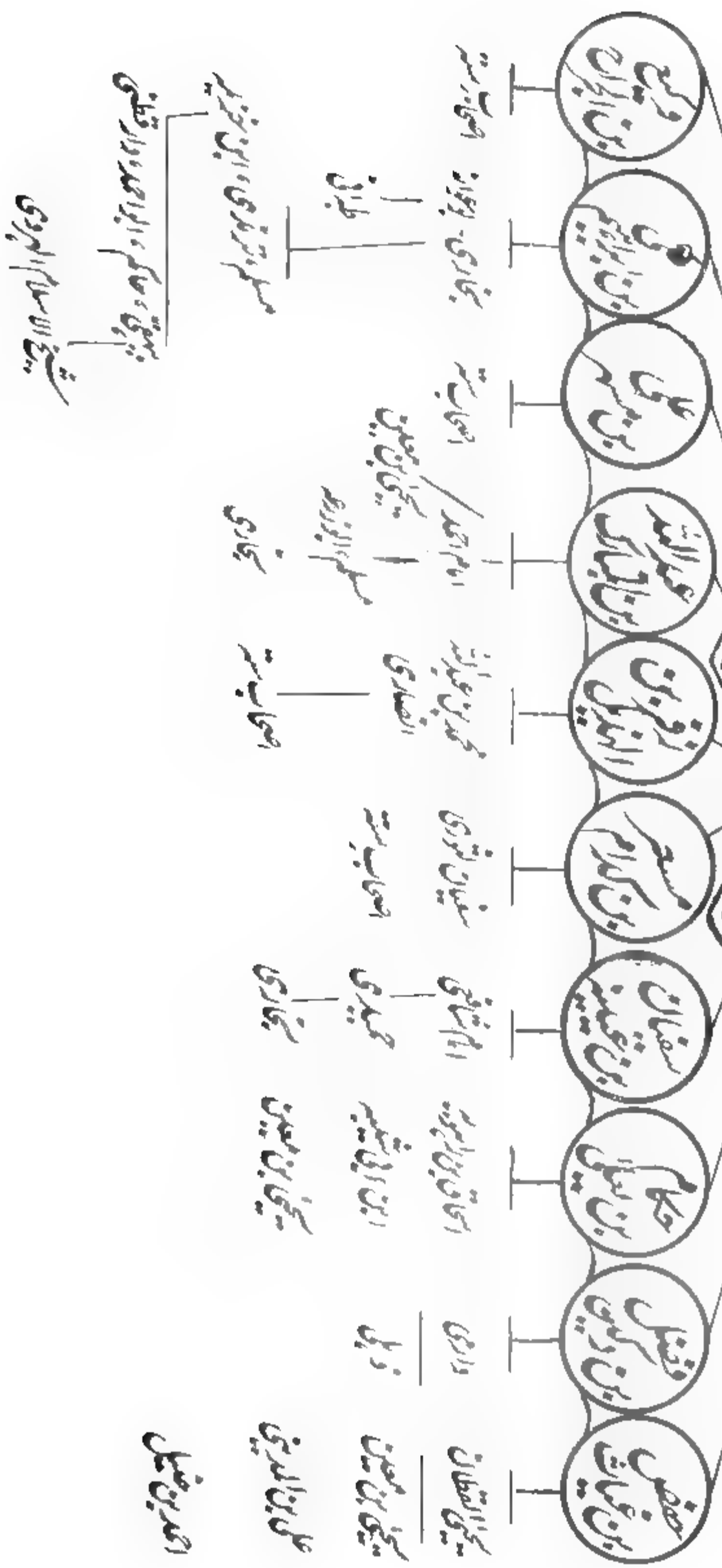
ہناد بن السمری : ابوزرعة، ابوالعباس، عبدان

علی بن مسهر

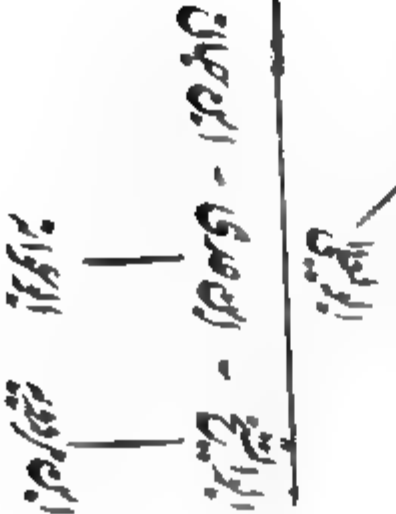
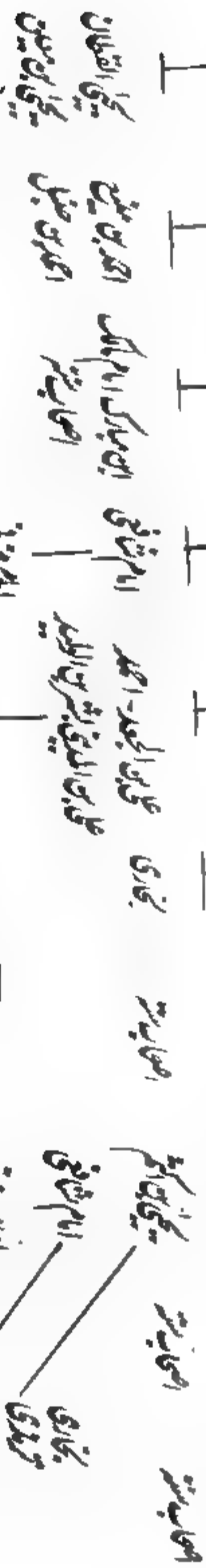
یحییٰ بن آدم : احمد، اسحاق، عبد بن حمید، الحسن بن علی
ابونعیم : محمد بن یحییٰ الذہبی، بخاری، دارمی، القعات

مسعر بن کداح

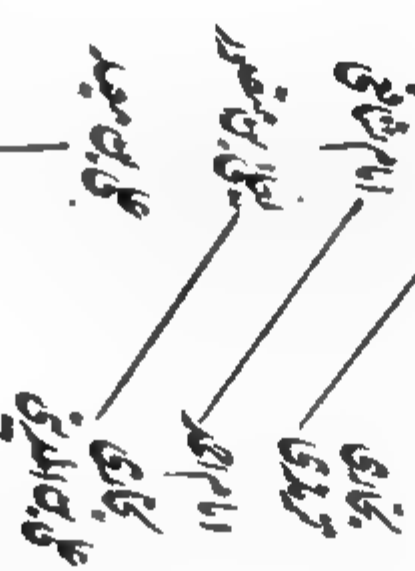
امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

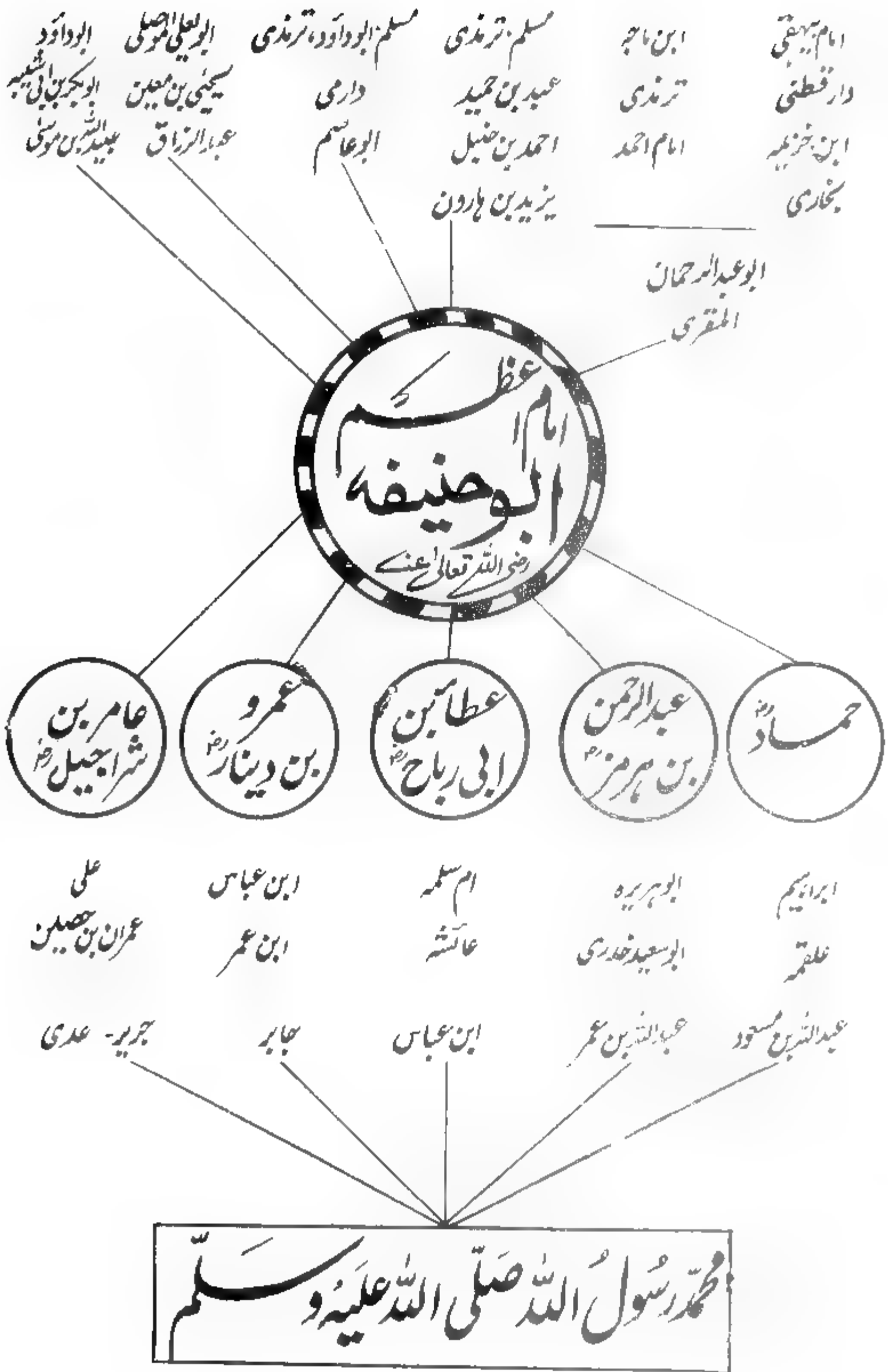


امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ



یحییٰ بن یحییٰ - محمد بن اسحاق
قاسم بن سلام - ابو حاتم - ابن ابی حاتم





اشایہ

مرتبہ: عبدالوکیل علوی

_____ اسماء کُتب

_____ اسماء رجال

_____ اسماء اماکن

اسماء الكتب

(الف)

آداب القاضي ٢١٩

ابو حنيفة (البزبره) ٣٥٢، ٣٥٥، ٣٥٦

اتحاف النبلاء (نواب صديق حسن خان) - ٤٤

١٢٥ ، ١٢٦ ، ٢٦٩ ، ٢٩٩ ، ٣٥٠ ، ٣٥٢

٣٤٣ ، ٣٣٩ ، ٣٣٠ ، ٣٦٣

الاتفاق في علوم القرآن ١٥٠، ٤٨، ٦٨، ٦٤

٣٢٣، ٣٢٢

الاجابة فيما استدركة حاشية على الصحابة ١٠٦

اجوبة الفاضل ٢٨٨، ٥٨٤، ٦٢٥، ٦٢٤

٦٦٨، ٦٦٩، ٦٦٢، ٦٦٣

اجوبة المفيدة عن اعتراضات ابن ابي شيبة ٣٣٦

الاحكام في اصول الاحكام ٣٦٤، ٢٧٣، ٢٨٠

١٠ احكام الاحكام ٣١٣، ٣١٤، ٣١٥، ٣١٦، ٣١٧، ٣١٨

٥٨١، ٦٠٠، ٦٢٢، ٦٢٤، ٦٥٣

ابن حزم، احكام الاحكام (أندلس) ٥٥١

احكام القرآن (ابن العربي) ٥٦٨

احكام القرآن (بليغ ص) ١٩٠، ٢١٥، ٢٢٠، ٢٢١

٥٩٤، ٦١١، ٦١٥ -

احمد بن حنبل ٢٣٤

انخبار ابى حنيفة ١٢٣، ٣٦١

الانخبار الطوال ٢٢٥

اختصار علوم الحديث ٢٣٦، ٢٨٢، ٢٨٨، ٢٨٩

٥١٩، ٥٢٢، ٥٢٩، ٥٢٤، ٥٢٨، ٥٥٥

ابن كثير ٥٥٩، ٥٦٥

اختلاف ابى حنيفة وابن ابي ليلى ٢٥٨، ٦٨٠

اختلاف الصحابة ٢١٩، ٦٩٢

اختيار اعتماد المسانيد ٣٩١

الادب المفرد ٢٢٠

الاذكار ٦٦٣

ارشاد النحول (شوكاني) ٦١٨، ٦٦٩

ارشاد السارى ١٢٢

ازالة الخفا ٥٦، ١٠١، ١٠٤، ١١١، ١١٥، ١١٦، ١١٧

١٣٦، ٢٥٦، ٣٣٤، ٣٣٨، ٣٣٩، ٣٣٠، ٣٣١

٦٨٣، ٦١٤

الازهار المتناثرة ٥٤٥

اساس البلاغة ١٢٠

الاستذكار لمذاهب علماء الامصار ٢٨٨، ٣٩٤

ابن عبد البر ٦١٠

اقوم المسالك ٢٦٥، ٢٦٤، ٢٦٣
الكمال ٣٥٦، ٣٥١
الفقيه ١٢٢، ٣٢٢، ٣٢٦، ٢٢٨، ٢٢٤، ٢٥٢
- ٥٢٨

الامام ٢٦٩
المقاصد الحسنية ١٨١
الامالي وقاضي البرقي ٢٥٨
امام ابن ماجه اور علم ٣٥٦، ٣٥٢
الامتناع ٣٥٨، ٣٥٦
امام اعظم اور علم الشرائع ٣١٢، ٣١٦
المصاير ذوات الآثار ٢٤٣، ٢٣٣
الانتباه ٣٤٩

الانتصار والترجيح ٣٠٦، ١٨٨
(سبط بن الجوزي)

الانتصار السالك ١٨٥، ١٨٦
الانتصار في فضائل الثلاثة الآخرة الفقهاء ٤٧،
(ابن عجلان)
٢٨٨، ١٢٩، ١٥٨، ١٩٠، ١٩٦، ١٩١، ٢٠٩
٢٣٩، ٢٥٨، ٢٤٦، ٣٦١، ٣٤١، ٣٠٩
١٠١، ٢٢٢، ٢٢١، ٢٢٠، ٢٢٤، ٢٢٣، ٢٢٢، ٢٢١
٥٥٣، ٥٥٨، ٥٥٨، ٥٥٩، ٥١٤، ٤١٨
- ٤١٩

الانسان العيون ٣٨٨، ٣٨٩
الانسان العيون في سيرة الامين والمؤمن ١٨٠
الانصاف ٤١، ٥٠١، ٥٠٢، ٥٠٤، ٥١٣، ٥١٥
٥١٥، ٥١٦، ٥١٧، ٥١٨

الاستيعاب الاسماء لصحاب ٢٥١، ٢٨٩، ٢٨٨
اسد الغابة ١٣٢، ١٠٨

اسعاف المبطل ٢٥٨، ٢٥٣، ٢٥٢
اشارات المرام ٢٤٥، ١٦٥، ١٦٣، ١٦٢
اشعة المصطفى ٢٨٩

اصابر في تميز الصحابة ٣٣٨، ١٨٨، ١٠٨، ١٠٣، ١٠٨، ١٠٣
اصول دين نزدوي ٢٤١، ١٦٥، ١٦٢، ١٦٣

اصول الدين (عبد القادر) ٢٢٦، ١٦٤
اطراف ابن القيسراني ٣٩١، ٣٩٠

اطراف احاديث ابي حنيفة ٣٩٩، ٣٩١

اعلام السالكين عن كتب سيد المرسلين ٩٣، ٨٩

اعلام الموقعين ٢٤٨، ٢٢٥، ١٠٥، ٥٥، ٥٣
٣٥٩، ٣٦٥، ٣٦٦، ٣٦٣، ٣٦٢، ٣٦١، ٣٦٠، ٣٥٩

٥٣٣، ٥٣٩، ٥٤٠، ٥٤١، ٥٤٢، ٥٤٣، ٥٤٤

٦٥٤، ٦٥٥، ٦٥٦، ٦٥٧

اعلان بالتوزيع ٢٣٣، ٢٢٢، ١٨٥، ١٢٨، ١٢٧

٢٣٣، ٢٣٩، ٢٤٠، ٢٤٣، ٢٤٤، ٢٤٥، ٢٤٦، ٢٤٧، ٢٤٨

٢٤٩، ٢٥٠، ٢٥١، ٢٥٢، ٢٥٣، ٢٥٤، ٢٥٥، ٢٥٦

- ٥٣٤

اصول شرعية ٦٦٨

اطراف صحيحين ٣٩٠

الفقه الاوسط ١٦٢

الانصاف ٣٣٨

الانصاف ٢٨٦

الفقه الاكبر ١٦٣

انفاس الحارفين ۳۱۵

انموذج العلوم (دوانی) ۶۶۲

اوتلی النبلیه ۳۶۰

ادجز المسکب ۱۲۱، ۵۴۳، ۵۴۴

(مع موطا)

الاخبار معرفه رواته الآثار ۳۵۰

(ب)

الباعث الحديث (احمد محمد شاکر) ۸۴، ۸۳

۵۸۶، ۵۳۳، ۵۳۱

بدایه المجتهد ۶۱۵

بدائع الفوائد ۶۰۸

البدایه والنهايه ۱۳۰، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۸۲

۱۸۶، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۵

۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۹۱، ۳۶۶

البدر الطالع ۳۹۲

الاستان ۵۳۸

الاستان المحدثین ۳۷۲، ۳۷۹، ۳۹۰، ۳۹۱

۴۸۷، ۴۹۴

بلوغ الامانی ۲۰۶

(ت)

تاریخ الاسلام (سماعی) ۱۸۵

تاریخ ابی الفداء ۲۴۵

تاریخ (ابن خلکان) ۱۳۱

تاریخ الادب العربي ۴۱۳، ۴۱۴

تاریخ اصفهان ۱۲۵، ۲۰۰

تاریخ الاسلام (ذہبی) ۱۲۸، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹

تاریخ الاسلام سیاسی ۱۵۱، ۱۵۷، ۲۲۴، ۲۲۵

تاریخ بغداد ۳۷، ۴۱، ۱۲۳، ۱۵۱، ۱۷۳

۱۷۴، ۱۸۶، ۱۹۷، ۲۰۹، ۲۴۹، ۳۰۹، ۳۱۲

۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۸، ۳۶۹

۳۷۷، ۳۷۹، ۳۸۲، ۳۸۵، ۴۰۴

۴۰۴، ۴۰۶، ۴۱۱، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸

۴۳۲، ۴۳۳، ۴۶۹، ۴۸۸، ۴۹۳، ۴۹۴

۴۹۶، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۰۸

۵۱۲، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۲۰ -

تاریخ الخلفاء ۹۲، ۳۲۸، ۳۹۹، ۴۰۴، ۴۰۵

تاریخ دمشق ۳۸۷

تاریخ طبری ۱۴۷، ۱۴۸

تاریخ العرب (حتی) ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹

تاریخ الفقہ الاسلامی ۴۴۵، ۶۰

تاریخ آداب العرب ۶۹۴

تاریخ القرآن (الزنجانی) ۳۲۳

تاریخ کبیر (بخاری) ۱۰۲، ۳۷۷، ۳۷۸، ۴۱۱

۶۸۷، ۶۸۸، ۶۹۹

تاریخ کبیر (ذہبی) ۴۰۶

تاریخ اللغة العربیه ۲۴۴

تاریخ فیثا پور ۲۲۳، ۲۵۵

۳۸۵

تانیب ۲۴۹، ۲۹۹، ۳۰۶، ۳۲۹، ۳۷۸

القبصر ۱۶۷

تبصیر الصحیفه ۷۷، ۱۲۵، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۳

(سیوطی)

التعليقات على الدراسات ١١٩، ٢٢٢

توبيخ علوم الحديث ٨٢

التعليق المجدد ٢٤٠، ٣٣١، ٣٥٢، ٣٦٠، ٣٦١

التعليقات على الأجوبة الفاضلة ٥٤٩

التعليقات على توضيح الأفكار ٣٩٤، ٣٩٩، ٣٠٠

٢٢٨

التعليقات على الحارمي ٢٩٠

التعليقات على كتاب الآثار ٣٥٢

التعليقات على الموافقات ٥٨٩

التعليق على الانتفا في فضائل الثلاثة ٢٦٤، ٢٦٦، ٢٥٢

التعليقات على الانتفا ٢٦٨، ٢٦٩، ٢٧٠، ٢٧١

التعليقات على شروط الأئمة الخمسة ٥١٠، ٥٠٦، ٢٩٣

التعليقات على المناقب ١٢٣

التعليقات ذب ذبائبات ٢٢٢

التعليقات الاحمد محمد شاكر على اختصار علوم الحديث ٢٣٨

التعليقة المنيعة ٣٩١

تفسير ابن كثير ٢٤٤

تفسير منظري ١٢٦

تقديم الجرح والتحليل ٢٦٩، ٢٧٨

تقديم على نصب الراية ١٩١، ٢٠٠، ٣٨٦، ٣٨٩

التقريب (لودي) ١٣٩، ١٤١، ١٩١، ٢٤٤، ٣٠١

٣٠١، ٣٠٨، ٣١٨، ٥١٩، ٥٢٢، ٥٢٤، ٥٢٨

٥٥١، ٥٥٩، ٥٦١، ٥٦٥، ٥٦٦، ٥٦٧، ٥٦٨

تقريب التهذيب ١٣٤، ٣٥١

التقرير والبيان ٢٦٥

تفسير العلم ٨٢

التقيد والايضاح ٢٩٠

تكملة شرح الترمذي ١٢٢

التلخيص الكبير ٥٨، ٢٢٦، ٢٢٠

تقيق فہوم اہل الاثر ١٠٢، ١٩٦، ٢٢١، ٢٢٦

(ابن الجوزي) ٣٩٩

التمهيد ٢٨٨، ٢٨٩، ٣٢٩، ٣٩٤، ٢٨٥

تنقيح الانظار ٩١، ٢٥٣، ٢٨٢، ٢٨٣، ٢٨٤

٣٩٣، ٢٣٠، ٢٩١، ٢٩٢، ٢٩٥، ٥٠٣

٥٥٤، ٥٥٥، ٥٨٣، ٥٨٤، ٥٨٥، ٦٢٢

تنقيح الفصول (قرافي) ٥٦٠

تنوير الحوالك (مقدم) ٣٢٢، ٣٢٩، ٣٦٢

٣٩٣، ٥٢٠

توالي التأسيس ٢٢١، ٢٤١

توجيه النظر ٤٨، ٤٩، ٢٥٥، ٢٩٠، ٣٠٦

٣٠٠، ٣١٦، ٣٢٦، ٣٢٧، ٢٥٤، ٢٥٥

٢٦٢، ٢٦٣، ٢٦٩، ٢٧١، ٢٧٢، ٢٧٣

٢٥٣٦، ٢٥٦٠، ٢٥٦١، ٢٥٦٢، ٢٥٦٣، ٢٥٦٤

٢٥٩٥، ٢٦٢، ٢٦٦

التوسل والوسيلة ٢٥٢، ٢٥٣

توضيح الأفكار ٨٤، ١٤١، ٢٠٣، ٢٣٠، ٢٨٢

٣١٨، ٣٢٨، ٣٢٩، ٣٣٠، ٣٣١، ٣٣٢

٢٥٢، ٢٥٥، ٢٥٦، ٢٥٧، ٢٥٨، ٢٥٩

٢٦٢، ٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦، ٢٦٧

٢٨٩، ٢٩٦، ٢٩٧، ٢٩٨، ٢٩٩، ٣٠٠

دول الاسلام ٢٢٦، ٣٤٥، ٣٤٦

الديباج المذهب ٣٢٦

ذ

ذب ذباب الدراسات ٦٢٥

ذخائر الموارث ٢٥١

ذيل طبقات الحفاظ ١٢٠

ر

راعي الفقه السبعة ٢٢٤

الرد على البكري ٦٨٢

الرد على سيرة الوداعي ٢٥٨، ٢٨٤، ٢٨٩، ٢٢٦،

٥١٠، ٥٥٩، ٥٩٦، ٥٩٨ - ٦١١، ٦٨٠

الرحمة ٢١٥

الرد على الشافعي ٢٢٦

الرد على من رد على أبي حنيفة ٢٢٤

الرسالة ١٤٥، ١٤٣، ١٤٢، ٣٠٥، ٣٠٦

رسالة أبي داود ٢٠٢، ٥٠٨

رسالة تسعينيه ٤٩

الرسالة المستطرفة ٣٥١، ٣٥٢، ٣٨٦

٣٩٠، ٤٠٠، ٤٠٥، ٤٠٨، ٤٢١، ٤٢٩، ٤٣٢،

٤٣٥ -

رسالة البكر شرخي ٣٠٦

رسالة سمر بن جندب ٣٢٥

رسالة البراءة عبد الكريم ١٨٤، ٣٠٥

الرفع والتكامل ١٤٨، ٢٥١، ٢٨١، ٣٨٥، ٥٣٥

الروض الباسم ٩٠، ٩١، ٩٩، ١٠١، ١٠٣، ١٣٣،

٢٠٩، ٢١١، ٢٢٣، ٢٢٩، ٢٣٩، ٢٤٣، ٢٤١،

٢٨٤، ٢٨٩، ٢٩٣، ٢٩٤، ٢٩٥، ٢٩٦،

٢٩٧، ٢٩٨ -

ح

الحج على أبي المدينة ٦٨٠

حجة الله البالغة ٥٣، ١١٠، ١١٢، ١١٣، ١١٨، ٢١٤،

٢٥٥، ٢٥٦، ٢٦٦، ٢٦٥، ٢٦٥، ٢٦٥،

٢٦٦، ٢٦٦، ٢٦٦، ٢٦٦، ٢٦٦، ٢٦٦،

الحديث والمحدثين ٢٢٦

حسن المتأخر ٢٢١

حصار الشار ٣٥٨

الخط في ذكر الصحاح الستة ١٢٤، ١٣٥، ٢٠٢،

٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦،

٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦،

٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦، ٢١٦،

عليه الأوليا - ٢٩٨، ٣٨٢

خ

الخط في ذكر الحج الأكبر ١٨٠، ١٨١

خلاص المستند ٢٣٦، ٢٣٦

الخيرات الحسان ١٠٠، ١١٩، ١٢٠، ١٢١، ١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥،

١٢٦، ١٢٧، ١٢٨ -

د

دراسات اللبيب ١١١، ١١٣، ١١٤، ١١٥، ١١٦، ١١٧، ١١٨،

١١٩، ١٢٠، ١٢١، ١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥،

الدر المنيف في الرد على ابن أبي شيبة ٢٢٦

ش

شذرات الذهب ٢٢٦، ٢٢٢

شرح الاذكار ٦٥٥

شرح اصول ٦٩

شرح بخاري (زكريا انصاري) ٢٦٣

شرح الاحياء (عراقي) ٢٥١

شرح ترمذي ٢٢٢

شرح الفقيه ١٢٢، ١٨١، ٢٠٣

٢٨٦، ٢٨٨، ٢٨٩، ٢٩٠

شرح بخاري (قسطلاني) ٣٢٠

شرح تنقيح الفضول ٥٢٠

شرح السير الكبير ٦٦٨، ٦٦٩

شرح صحيح امام مسلم (نودي) ١٢٢، ١٣٥، ١٣٣

٢٥٥، ٢٤٣

شرح العقيدة الاصفهانية ١٣٥، ١٥٦

شرح الحمد (العبد) ٦١٢

شرح مسند امام عظيم (علاء على قاري) ١٤٣، ١٨٤

١٩٨، ٢٠٨، ٢٥٦، ٥٤٢

شرح مسند احمد ١٤١، ٢١٢، ٢٢٢

شرح معاني الآثار ٩٤، ٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦

شرح المواهب اللدنية ١٤٨، ١٤٩

شرح المذهب ١٢٢، ٢٨٣، ٥٠٨

شرح سجنه الفكر ١٣٩، ٢٢٢، ٦٢٦

شرح الوجيز ٥٨٢

شرح بداية (عيني) ٣٥٨

شروط الاثر الخمسة (تجليقات) ٢١٤، ٢٥٠

٢٥٣، ٢٥٨، ٢٥٩، ٢٦٠، ٢٦٥

٢٦٦، ٢٦٧، ٢٦٨، ٢٦٩، ٢٧٠، ٢٧١

٢٥٢٣، ٢٥٢٤، ٢٥٥٥، ٢٥٨٦، ٢٥٩٢

٢٦٢، ٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦

شرح والمقدم ٢٨٣

الشروط الاثر الستة ٢٤٤، ٢٤٨، ٥٢٢

شفا السقام في زيارة خير الانام ٢٥١، ٣٨٤

شمال نبوي ٩٢-

ص

صحيح ابن حبان ٥١، ٩٠، ٩١

صحيح بخاري ٥٠، ٥٢، ٦٢، ٩٥، ٩٦، ١٢١

١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٣٤، ١٣٨، ١٣٩، ١٣٩، ١٣٩

٢١٢، ٢٣٠، ٢٣١، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤

٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨

٢٣٩، ٢٤٠، ٢٤١، ٢٤٢، ٢٤٣، ٢٤٤

٢٤٥، ٢٤٦، ٢٤٧، ٢٤٨، ٢٤٩، ٢٥٠

٢٥١، ٢٥٢، ٢٥٣، ٢٥٤، ٢٥٥، ٢٥٦

٢٥٧، ٢٥٨، ٢٥٩، ٢٦٠، ٢٦١، ٢٦٢

٢٦٣، ٢٦٤، ٢٦٥، ٢٦٦، ٢٦٧، ٢٦٨

٢٦٩، ٢٧٠، ٢٧١، ٢٧٢، ٢٧٣، ٢٧٤

٢٨٠، ٢٨١، ٢٨٢، ٢٨٣، ٢٨٤

صحيح مسلم (ومقدم) ٥٢، ٨٠، ١٢٢

١٢٣، ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦، ١٢٧، ١٢٨

١٢٩، ١٣٠، ١٣١، ١٣٢، ١٣٣، ١٣٤

طبقات الفقهاء (شيرازي) ٢٢٢، ٢٢٥

طبقات القراء (ذبيح)

طبقات كاشغري ٤٤

طبقات المحدثين ٣٥٦

طلوع اشرايا ١٨

ظ

نظر الاماني (مولانا عبدالحق) ٦٦٦، ٦٦٢، ٦٦١

ع

العالم والمتعلم ١٦٣، ١٦٣

عارضه ان حوزي ٢٨١، ٢٨٠

عجالة نافذة ٣٤٠

عقائد نسفيه ٦٤١

عقد الجيد ٥٨

عقود الجمان ٢٨٠، ٢٩٩، ٢٨٤

عقود الجواهر المنيفه ٣٦٣، ٣٦٦

عقود الجواهر المضيه في ادلة تدبير امام ابي خليفه ٣٩٢

العقيدة والشرعية ٢٢٥

العلل المتناهيه ٦٥٤

علوم الحديث ٨٢، ٩٩، ٥٨٣

عمدة الرعاية ١٢٢، ٥٨٢، ٥٨٥

عمدة القاري ٢٠٥، ٢٣٥، ٢٣٢

غناية ٦٢٦، ٦٥٩

العواصم ٢٨٢

عون الباري على ادلة البخاري ١٢٥، ٦٥٩

عين الاجابة في استدراك عائشة على الصحابة ١٠٦

١٣٥١، ٣٦٣، ٣٦٩، ٣٤٠، ٣٩٣، ٣٩٤

١٢٤، ٢٢٨، ٢٥٢، ٢٥٣، ٢٥٤، ٢٥٥

١٢٤، ٢٦٢، ٢٦٥، ٢٦٨، ٢٦٩، ٢٦٣، ٢٨٩

١٢٩١، ٢٩٢، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤، ٢٩٤

٦١١، ٦٢٦، ٦٣٠، ٦٣١، ٦٣٥، ٦٣٥، ٦٣٥

٦٥٠، ٦٨٥

صحيفة جابر ٢٢٥، ٣٢٠، ٩٨، ٩٤

صحيفة سمرة (جباله) ٩٨

صحيفة صادقة ٣٢٥، ٩٩، ٩٣

صحيفة صديقي ٣٢٥، ٩٦

صحيفة صحيم - ٣٢٥، ٩٩

صحيفة حضرت علي ٣٢٥، ٩٥

صحيفة بجام بن بنهيه ٢٨٢، ٩٩، ٢٠١، ٢٢٠، ٢٢١

صيد الخاطر ٢٣٤

صدر الامة ١٣١، ٢٢٣، ٢٢٦، ٢٢٦، ٢٢٦، ٢٢٦، ٢٢٦

ض

الضعفاء الصغرى (البخاري) ٢٤٦

الضوء الامع ٣٥٢

ط

طبقات ابن سعد ١٠٢، ١٠٥، ١٩٠، ٢٩٨، ٣٢٤

٢١٤

طبقات الحفاظ ٣٤٢

طبقات الخليل ٢٣٥، ٣٨٥، ٤٤٥

طبقات اشافعية الكبرى ١٩١، ٢٩٢، ٢٢٦

طبقات سيوطي ١٢٢، ٨١

عيون الاثر في فنون المغازي والسير ٣٥٢، ١٨٠

ع

غيبات النمام ٢٠٣

غاية المأمول ٣٥٣

ف

فتاوى ابن تيمية ٦١٣، ٦١٥

فتاوى عزيزي ٥٨٨

فتح الباري ١٢٨، ١٣٥، ١٤٥، ١٤٦، ١٩٢

٢١٨، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨، ٢٣٩

٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨، ٢٣٩

٢٣٤، ٢٣٥، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨، ٢٣٩

٢٣٥، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨، ٢٣٩، ٢٤٠

٢٤١، ٢٤٢، ٢٤٣

فتح القدير ١٣٨، ١٣٩، ١٤٠، ١٤١، ١٤٢

١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ١٤٦، ١٤٧

١٤٨، ١٤٩

فتح المغيب ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٣٨، ٢٣٩، ٢٤٠

٢٤١، ٢٤٢، ٢٤٣، ٢٤٤، ٢٤٥

٢٤٦، ٢٤٧

فتح المليم (مقدم) ٢٤٠

فتوح البلدان ١٨٩

(اصول) فخر الاسلام ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦، ١٢٧

٥٤٣

الفرق بين الفرق ٦٦٩

الفصل في الملل والاہوار والنحل ٣١٠، ٣١١، ٣١٢

٣٣٠

فضل علم السلف على الخلف ٦١٥

الفقه الايسر ١٩٢، ١٩٣

الفقه الاكبر ١٩٠، ١٩١

الفقيه والمنفعة ٥٩٦

الفوائد البهية ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦، ١٢٧

الفوائد المتكاثرة في الاخبار المتواترة ٥٤٥

الفوائد المجموعة ٦٨٥

فرائح الرحمن ٢٨٢، ٢٨٣، ٢٨٤

الفرست ١٦٤، ١٦٥، ١٦٦، ١٦٧، ١٦٨

١٦٩، ١٧٠، ١٧١، ١٧٢، ١٧٣

الفرست الاوسط ٣٠٥

فيض الباري ٦١٥

فيوض الحرمين ١٢٤

ف

القاموس ١٤٩

قرآن مجيد ١٤٩، ١٥٠، ١٥١، ١٥٢، ١٥٣، ١٥٤

١٥٥، ١٥٦، ١٥٧، ١٥٨، ١٥٩، ١٦٠، ١٦١

١٦٢، ١٦٣، ١٦٤، ١٦٥، ١٦٦، ١٦٧

١٦٨، ١٦٩، ١٧٠، ١٧١، ١٧٢، ١٧٣

١٧٤، ١٧٥، ١٧٦، ١٧٧، ١٧٨، ١٧٩

١٨٠، ١٨١، ١٨٢، ١٨٣، ١٨٤، ١٨٥

١٨٦، ١٨٧، ١٨٨، ١٨٩، ١٩٠، ١٩١

١٩٢، ١٩٣، ١٩٤، ١٩٥، ١٩٦، ١٩٧

١٩٨، ١٩٩، ٢٠٠، ٢٠١، ٢٠٢، ٢٠٣

٢٠٤، ٢٠٥، ٢٠٦، ٢٠٧، ٢٠٨، ٢٠٩

کتاب التفسیر (ابن طهمان) ۴۲۲
 کتاب التفسیر (ابن المبارک) ۴۱۱
 کتاب التفسیر ابن علیہ ۴۲۲
 کتاب التفسیر (نزائده) ۴۰۴
 کتاب التفسیر (مشیم) ۴۱۰
 کتاب النفقات ۴۱۹
 کتاب التمیز ۳۷
 کتاب الثقات ۲۲۲
 کتاب الجلی مع (قرشی) ۶۰۲
 کتاب الجرح والتعديل (۱۳، ۱۹، ۲۸۹، ۲۹۴)
 ۶۸۸
 کتاب الجمع بین رجال الصحیحین ۳۹۱
 کتاب الجهاد (ابن المبارک) ۴۲۲
 کتاب الخراج ۱۰۸، ۲۵۸، ۴۱۹، ۴۸۰
 کتاب الخراج (حسن بن زیاد) ۴۱۹
 کتاب الخصال ۴۱۹
 کتاب الذکر والدعار ۴۲۲
 کتاب خطا البخاری ۲۹۰
 کتاب الروایت خطیب بغدادی ۲۶۵
 کتاب الرد علی اهل المدینه ۴۱۹
 کتاب الرواة
 کتاب الرقاق ۲۸۶
 کتاب الروح (۴۵، ۶۰۹، ۶۱۰)
 کتاب الرهن ۳۵۳
 کتاب الزهد (ابن المبارک) ۴۱۰، ۴۱۱

کتاب السنن (ابن ابی ذئب) ۴۱۹، ۴۲۲

کتاب الزهد (نزائده) ۴۰۴

کتاب السنن (ابن جریر) ۴۰۵، ۴۰۶

کتاب السنن (ابن ابی عرویه) ۴۰۹، ۴۱۰

کتاب السنن (ابن طهمان) ۴۲۲

کتاب الکامل فی الجرح والتعديل ۳۸۴

کتاب السنن (عبدالمک بن عبد الغزنی) ۴۲۱

کتاب السنن (اوزاعی)

کتاب السنن (حماد بن مسلم) ۴۲۱

کتاب السنن (نزائده) ۴۰۴

کتاب السنن (محمد بن فضل) ۴۲۲

کتاب السنن (ملکول) ۳۳۵

کتاب السنن (دکیح) ۴۰۸، ۴۲۱

کتاب السنن (ولید) ۴۰۵، ۴۲۲

کتاب السنن (مشیم) ۴۱۰

کتاب السنن (یحیی بن زکریا) ۴۰۴

کتاب السیر ۴۱۹، ۶۹۴

کتاب السیر (حسن) ۶۹۴

کتاب الصدوق (۹۱، ۳۲۵)

کتاب الصلوة ۳۵۳

کتاب الصدقات (امام سلم) ۳۳۵

کتاب الصلوة ۲۹۲

کتاب العالم والمتعلم ۱۶۲، ۶۳، ۱۶۴

کتاب العلل (علی بن مدینی) ۹۲، ۲۹۲، ۴۸۲

۶۵۸

مسک الختام ۲۶۵، ۲۸۹
 مسند ابراهیم بن سعد
 مسند ابی بکر صدیق ۳۴۲، ۳۴۳
 مسند ابو جعفر عبداللہ ۲۳۱
 مسند ابی جعفر محمد کوفی ۳۸۵، ۴۳۱
 مسند یحییٰ بن خالد ۴۳۱، ۴۳۴، ۴۳۸
 مسند تنوخی ۴۳۱
 مسند عبید اللہ بن موسیٰ ۴۲۹
 مسند فاروق اعظم ۳۴۲
 مسند مسدد بن مسرید ۴۲۹، ۴۳۱
 مسند یحییٰ بن عبد الحمید ۴۳۱
 مسند بزاز ۵۱، ۴۲۳
 مسند شافعی ۳۵۱، ۳۴۲، ۳۸۳
 مسند حارثی ۱۸۵، ۲۱۳، ۳۸۱، ۳۸۹، ۴۱۴
 مسند موسیٰ بن زکریا حبشکی ۲۶۳
 مسند خوارزمی ۱۹۸، ۲۰۴
 مسند دارمی ۸۵، ۸۸، ۹۰، ۱۱۲، ۱۲۴
 ۳۲۱، ۶۵۶
 مسند خزاعی ۴۲۹
 مسند امام اعظم ۳۸۸
 مسند محمد بن حسن ۳۹۰، ۴۲۱
 مسند قاضی ابویوسف ۳۹۰
 مسند امام حسن بن زیاد ۳۹۰
 مسند امام حماد ۳۹۰

محاسن الاصطلاح
 المحاضر ۱۲۳
 المحدث الفاضل ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۱۹۰
 محصول ۵۶۰
 المحلی (ابن حزم) ۶۰۸
 المدخل (بیہقی) ۵۲۸، ۵۴۴
 مدینۃ العلوم ۶۶۴
 المدخل فی اصول الحدیث ۱۰۱، ۳۴۳، ۴۱۴، ۴۲۰
 ۴۲۹، ۴۶۰
 مرآة الجنان ۱۲۱
 مراتب الدیانۃ ۴۴۶
 مراسیل ابی داؤد
 مرآة المفاتیح ۱۳۳، ۳۳۳
 مستخرج ۴۹۵
 مستخرج (ابو نعیم صنفی) ۳۳۱، ۴۹۶، ۴۹۸
 (ابو الفضل البزار) ۴۹۶
 (محمد بن محمد نیشاپوری) ۴۹۶
 (ابو عوانہ سفرائی) ۴۹۶
 (احمد بن موسیٰ مردودیر) ۴۹۶
 (محمد بن العباس) ۴۹۶
 (محمد بن ابی حامد قطری) ۴۹۶
 (احمد بن ابرہیم الجرجانی) ۴۹۶
 مستصفی ۵۶۰
 مستند فی اختیار مختصر المسند ۳۹۱
 مستدرک حاکم ۹۰، ۱۱۲، ۳۳۲، ۴۱۴، ۶۵۱

مناقب صدرالائمة (١٥١، ١٥٢، ١٥٣، ١٥٥، ١٦٠)
 (١٤٣، ١٨٣، ٢٢٢، ٢٩٢، ٤٠٨، ٤٠٩، ٤١٣)
 المقاصد الحسنة وعيد الوطب (٣٩٢)
 مناقب بنار می (٢٢٥، ٢٩٤)
 مقالید الاسانید (٣٨٨)
 مناقب صیمری (١٢٣، ٤١٠)
 الملل و نحل شهرستانی (٦٦٦)
 المنار (٥٦٣)
 مناقب کردری (١٥١، ١٦٢، ١٤١، ٢٢٠، ٢٦٠، ٢٩٠)
 مناقب احمد لابن الجوزی (١٦١، ١٨٥، ٢٠٠، ٢١٢)
 (٣٥٣، ٢٥٢، ٢٣٢)
 مناقب للموفق (١٢٣، ١٥١، ١٥٢، ١٤٥، ١٩٠)
 (٢٠١، ٢٢٨، ٢٥٤، ٣٦٠، ٣٦٢، ٣٦٥)
 (٣٦٨، ٥٢١، ٥٥٣)
 مناقب از امام زهبی (٣٦، ٣٨، ٤٦، ١٢٣)
 (١٢٩، ١٣١، ١٤٢، ١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ١٢٢، ٢٢٣)
 (٢٣٦، ٢٣٢، ٢٥٨، ٢٤٢، ٣٥٨، ٣٦١)
 (٢٠٦، ٥٢٣، ٥٢٥، ٦٨٩، ٤٠٠، ٤٠١، ٤٠٢)
 المنتظم (٣٢١، ٣٤٤، ٣٩١، ٤٤٦)
 المنتقى من منهاج الاعتدال (٣٩٤، ٥٨)
 منتقى الاخبار (٥١٥، ٥٩٨، ٦٠٦، ٦٠٧)
 منصب الامت (٥٦، ٥٤، ٦٨٢)
 المنقذ من الضلال (١٦٥)
 منهاج السند (٦٢، ١٥٠، ١٤٤، ٢٢٠، ٢٣٠، ٢٥٤)
 (٣٣٣، ٣١٥، ٢٣٦، ١٥١)

لمنہج ذوی النظر (٢٣٣، ٤٠٥)
 منظومه علم الاثر (سیوطی) (٢٢٦)
 منیة الراعی (٣٢٩، ٦٩٢)
 الموافقات (٢٨، ٥٨، ٥٩، ٦٠، ٦٢، ٦٦، ٦٧)
 (٥٥٨، ٥٨٨، ٥٨٩، ٥٩٠، ٥٩١، ٦٨٢)
 مواہب (١٢٥)
 موضح ادھام الحج والتفریق (٢٩٠، ٢٩١، ٢٩٣)
 موضوعات کبیر (٥٢٥)
 میزان الاعتدال (٢٠١، ٢٠٢، ٢٠٣، ٢٠٦، ٢٦٦)
 (٢٩٠، ٥٣٩، ٥٩٣، ٦٣٣، ٦٩٤)
 المیزان الکبری (٣٤٥، ٥٢٣، ٥٢٤، ٥٨٠)
 ن
 النبوات (١٣٦)
 نتائج الافکار (٥٢٥)
 نزهة النظر (٥٤٢)
 نسیم الریاض شرح شفا (٦٦٣)
 نصب الراية (زیلعی) (٩٠، ٩٢، ٥٣٣، ٥٨٢)
 (٦١٣، ٦٣٠، ٦٣١، ٦٥٤، ٦٥٨)
 نصیحة المسلمین (١٦٥)
 نظم العقیان فی اعیان الاعیان (٨)
 نظم المتناثر من الحدیث المتواتر
 انکلت الطرفیة عن رد ابن ابی شیبہ (٢٢٦)
 انکلت علی ابن الصلاح (٢٦٥، ٥٢٥، ٦٢٢)
 نہایت المقصد فی زوائد المسند (٣٣٤)
 النور السافر فی القرن العاشر (١١٩)

النهاية ٥٨٢

نيل الاماني ١٤٦، ١٤٤، ٢٢١

نيل الاوطار (شوكاني) ٢٥١، ٥٠٨، ٥١٤، ٥١٥

١١٠، ٢٠٦، ٢٢٦، ٢٣٣، ٢٣٦، ٢٣٧، ٢٥١

و

الوابل الصيب ٥٣، ١٠٥، ٢٨٩

الوثائق السياسية ٩٣

الوصية ١٦٣

وفاء الوفا ٢٥٠، ٢٥١

وقيات الاعيان واثبات الزمان ١١٢، ٢٦٣، ٣٦٩

برايه ٦٢٤، ٦٣٤، ٦٥٨

الهدى السارى ٣٩٣، ٣٩٤، ٣٩٥، ٣٩٦، ٣٩٧، ٣٩٨

٣٣٣، ٣٥٣، ٣٥٤، ٣٥٥، ٣٥٦، ٣٥٧، ٣٥٨، ٣٥٩

٣٩٣، ٣٥٠، ٤١٠

۱۰۳	حدیبیه
۳۸۰	حمران
۶۹۰، ۶۶۳	حلوان
۵۲	حرم نبوی
۴۴۶	حرمین
۴۴۵، ۳۸۰، ۳۳۹	حمص
	حوض کوثر
۴۴۰، ۳۹۱، ۳۵۰	حیدرآباد سندھ
خ	
۳۱۱، ۲۹۲، ۲۶۱، ۲۴۸، ۹۲	خراسان
۴۴۰، ۳۳۲، ۳۸۴، ۳۴۸، ۳۴۳	
۴۴۹، ۵۰۰، ۵۵۴، ۶۹۸، ۷۰۷	
	خندق
۶۹۰، ۶۶۶	خوارزم
۴۹	خیبر
د	
۴۳، ۴۱	دارالعلوم الشہابیه
۲۹۵	دائرہ المعارف
۱۰۳	دارالندوہ
۶۹۰، ۳۸۴	دامغان
۶۲۷	دارالخلائفین
۴۴۱، ۲۹۵	دکن حیدرآباد
۲۷۳، ۴۶	دجلہ
۱۷۴، ۱۴۱، ۱۲۲، ۹۹، ۸۲، ۶۳، ۴۷	دمشق
۴۲۸، ۴۲۷، ۴۲۵، ۴۲۴، ۴۲۳، ۴۲۲، ۴۲۱، ۴۲۰، ۴۱۹	
۴۸۹	

پ	
۱۴۶، ۱۴۵	پاکستان
۴۴۰	پنجاب یونیورسٹی
ت	
۶۶۷	تاشقند
۴۰۰	ترکی
۱۴۵	ترکستان
	تبوک
۶۹۰، ۶۹۲	ترمذ
۳۸۰، ۵۲	تستر
ٹ	
۴۴۱	ٹونک
۵۲	ٹھٹھہ
ج	
۳۹۲، ۱۱۹	جامعہ ازہر
۴۰۰	جامعہ انقرہ
۴۴	جامعہ اسلامیہ بہاولپور
۵۷۱، ۱۴۵	جبرالٹر
۶۹۰	جبرجائ
۶۹۰، ۵۵۴، ۳۸۱، ۲۹۹، ۲۲۱، ۱۹۲	جزیرہ
ح	
۵۷۱، ۱۴۹، ۱۳۴، ۱۰۳	حیدر
۴۲۵، ۲۲۱، ۱۹۷، ۱۹۲، ۱۸۲، ۱۴۵، ۱۲۸	حجاز
۳۶۶، ۳۶۵، ۳۶۴، ۳۶۳، ۳۶۲، ۳۶۱، ۳۶۰، ۳۵۹	
۵۰۰، ۴۴۲، ۴۰۴، ۳۹۳، ۳۷۸	

ق

قاهره

٣٥٦١٢٢

قدس

٣٨٠

قطب شريف مصر

١١٩

قهرستان

٦٩٠

قبا

١٠٣

قرطبه

٨٨

قوس

٦٩٠

قيروان

٣٢٣، ٣٢٣

ك

كرمان

٦٩٠

كش

٦٩٠

كعبه (حرم) مسجد حرام

كوفه

...

...

...

...

...

...

...

...

...

...

ماوراءالنهر

مجدل

مجمع البحرين (مقدم)

مدائن

مدارس اشرافيه

مدینه منوره

...

...

...

...

...

...

...

...

...

...

...

مستان

مرد

مصر

...

...

...

...

۶۹۰	نصار	مصر ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹
۱۲۸	نصر آباد	۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹
۶۹۰	نصیبین	۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹
۶۹۰	نهادند	۶۹۰، ۶۹۱
۱۲۲	نوحی	مکتبہ قاسمیه ۳۲، ۳۳
۶۹۰، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰	نیشاپور	مکہ معظمہ ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹

و

واسط ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹

ز

ہرات ۶۹۰، ۶۹۱
ہمدان ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹
ہندوستان ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹

ح

یامہ د جنگ ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹
ہین ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹
۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹

ط

ملتان ۱۴۶، ۱۴۷
منی ۶۸۴، ۶۸۵
موصل ۶۹۰، ۶۹۱
ن
نجران ۸۸

ض

ضیب (قبیله)

۱۲۸

ظ

ظاہرہ ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۴۰، ۶۴۵

ع

عنزہ (قبیله) ۶۲۳، ۶۲۴

۵۴۵

عشرہ مبشرہ

عبدالقیس (قبیله) ۱۰۱، ۱۰۰

ق

قدریہ قدری ۲۳۴

قریش (قبیله) ۵۴۸، ۵۴۶

قشیر (قبیله)

۱۲۸

م

مرحبتہ ۱۵۵، ۱۶۱، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۳۴

۴۵۹، ۵۲۴، ۵۴۵، ۵۰۶

مرزاتیہ ۴۱

معتزلہ، معتزلی ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۴، ۲۰۵، ۲۳۴

۲۴۰، ۵۲۴، ۶۶۹

ن

ناصبی، نواصب ۵۲۴

ک

نذیل (قبیله) ۱۳۴

فہرست اسماء رجال

ابراہیم بن محمد ابوالسحاق نیشاپوری ۲۰۸، ۳۶۱، ۴۴۳

” محمد انصاری ۱۹۴

” محمود ابومحمد شیخ ۳۵۷

” معتزل النقی حافظ ۲۹۵، ۴۳۱، ۴۵۲

۴۶۸، ۴۶۷

” مغیرہ ابن بردزب ۹۶

” موسیٰ بن یزید التیمی ۶۹۵، ۷۲۵

” یزید التیمی ۲۹۲، ۱۹۴

” میسرہ ۴۴۲، ۴۴۳

” یزید ابوعمران النخعی ۹۸، ۲۹۵

۱۹۴، ۱۹۶، ۱۹۸، ۳۰۰، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۱۲

۲۴۹، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰

یزید۔ نسخی ابراہیم امام کے ضمن میں ملاحظہ ہو

ابن ابی حاتم الرازی ابو محمد عبدالرحمن امام ۳۲۷، ۱۹۱

۲۶۸، ۳۹۰، ۱۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۳۴۷، ۳۵۰

۶۵۸، ۶۸۸، ۶۹۳، ۶۹۶، ۶۹۷، ۷۰۳، ۷۰۴

ابن ابی داؤد محدث ابوبکر ابن ابی داؤد ۶۳۷، ۶۹۸

ابن ابی ذئب محمد بن عبدالرحمن ابوالحارث ۵۹، ۱۲۱

۲۴۹، ۳۹۶، ۴۱۹، ۴۲۲، ۴۲۳، ۵۴۸، ۵۴۹

آزاد، ابوالکلام مولانا ۶۳۴، ۶۴۵، ۶۴۷

الآمدی، سیف الدین ابوالحسن علی بن ابی علی بن محمد

۵۵۱، ۴۸

آوسی علامہ ابوالفضل محمود البغدادی ۶۹، ۷۰

ابان بن ابی عیاش ۲۸۷، ۲۸۸

ابان بن عثمان ۴۱۲، ۵۰۹

ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ۶۵، ۱۲۰، ۱۳۲، ۵۹۲

ابراہیم بن ادھم بن منصور بنجی ۲۲۲

ابراہیم بن اسماعیل ۲۸۸، ۴۳۱

ابراہیم بن جعفر ۳۵۴

” رستم المروزی ابوبکر ۶۹۱

” زیاد الرازی ۶۴۶، ۶۴۷

” سعید بن ابراہیم ابوالسحاق ۲۴۹، ۲۳۱

۳۴۹، ۴۳۱

” طہسان امام ابوسعید الہروی ثم نیشاپوری ۲۴۳

۲۶۸، ۴۲۲، ۶۸۸، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۷

۷۲۹، ۷۳۱

ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ ابواسطلی قاضی ۳۰۷، ۳۰۸

۷۴

ابن زبير ٣٨٢

ابن زواد ٢٨٩

ابن اسبكي علامه راج الدين ابو نصر عبد الوهاب بن تقي الدين

٢٨٣

١٤٤٠ هـ

ابن سعد ابو عبد الله محمد ٢٣٠ هـ ١٠٣، ١٠٢، ١٠٥

١٣٤، ١٢٠، ١٢٣، ١٨٥، ١٩٠، ٢٢٩، ٢٩٨

٣١٣، ٣٢٤، ٣١٤، ٣٢٠، ٣٥٩، ٣٣٣

٤١٢، ٤١٩

ابن السكيت حافظ ٢٥١، ٤٤٨

ابن سيرين، محمد ابو بكر امام مسلم ١٩٠، ١٩٢، ٢٣٠

٢٢٦، ٢٥٥، ٢٦١، ٢٤٣، ٢٤٢، ٢٨٨

٣٠٩، ٣٢٤، ٥٣٦، ٥٦٠، ٦١٢

ابن سيد الناس ابو الفتح علامه الحافظ ابو بكر محمد بن احمد

يعمرى ثنائى ٦٥٩ هـ ١٨٠، ٣٥٣، ٦٥٩

ابن الشاين الحافظ ابو حنص عمر بن احمد البغدادي

٣٨٥ هـ ٢٦٥، ٣٤٤، ٣٨١، ٣٨٩

ابن شيراز، عبد الله ابو بشير النضبي ٣٣٣ هـ

١٢٩، ١٩٤، ٣٢١، ٣٢٦

ابن شداد ٢١٣، ٢١٤

ابن صاعد ٣٤٤

ابن صلاح حافظ شيخ تقي الدين ابو عمر ٦٣٣ هـ

١٢٢، ١٣٩، ١٨٤، ٢٥٣، ٢٦٥، ٢٨٢

٢٨٣، ٢٩٠، ٣٠٢، ٣٢٨، ٣٢٩، ٣٩٥

٣٢٨، ٣٥٣، ٣٦١، ٣٦٢، ٣٦٣، ٣٦٤، ٣٦٥، ٣٦٦

٣٨٥، ٣٩٤، ٣٩٥، ٤٠٣، ٤١٩، ٤٢٢، ٤٢٩، ٤٣٠

٤٣٥، ٤٣٦، ٤٣٧، ٤٣٨، ٤٣٩، ٤٤٠، ٤٤١، ٤٤٢

٤٤٣، ٤٤٤، ٤٤٥، ٤٤٦، ٤٤٧، ٤٤٨، ٤٤٩

٤٥٢

ابن الضياء ٢٦٦

ابن طاهر حافظ محمد بن طاهر مقدسي ابو الفضل ٥٠٤

٣٩١، ٤٥٠، ٤٥٨، ٤٦٠، ٤٦٣، ٤٦٤، ٤٦٥

٤٩٨، ٥٢٢

ابن طبرزاد ٦٩٦

ابن طولون حافظ شمس الدين محمد بن علي بن احمد ٩٥٣ هـ

٨٩، ٩٣، ٣٠٥

ابن عابد بن الشامي علامه محمد امين بن عمر ١٢٥

ابن عامر عبد الله بن عامر بن يزيد بن تميم الدمشقي ٦٣

ابن عباس جرانت عبد الله ٣٤، ٥٣، ٥٤، ١٠١

١٠٤، ١٠٥، ١٠٦، ١١٤، ١٢٢، ١٢٣، ١٢٤، ١٢٥، ١٢٦

١٢٧، ١٢٨، ١٢٩، ١٣٠، ١٣١، ١٣٢، ١٣٣، ١٣٤

١٣٥، ١٣٦، ١٣٧، ١٣٨، ١٣٩، ١٤٠

١٤١، ١٤٢، ١٤٣، ١٤٤، ١٤٥، ١٤٦

١٤٧، ١٤٨، ١٤٩، ١٥٠، ١٥١، ١٥٢، ١٥٣

١٥٤، ١٥٥، ١٥٦، ١٥٧، ١٥٨، ١٥٩

١٦٠، ١٦١، ١٦٢، ١٦٣، ١٦٤، ١٦٥، ١٦٦

١٦٧

ابن عبد ديردراق ٢٩٣

ابن عجلان ابو عبد الله محمد ١٢٨ هـ ٢٢٩

ابن عبد البر مغربي حافظ يوسف بن عبد الله ابو عمر

٢٦٣ هـ ٨١، ٨٢، ٨٩، ١١٦، ١٢٩، ١٣٠

ابن مردويه حافظ ابو بکر احمد بن موسى الاصفهاني ١٠٦ هـ

١٣٨٢ - ٤٣١

ابن مسعود عبد الله بن ام عبد ١٠٥ هـ

١٠٦ هـ ١٠٧ هـ ١٠٨ هـ ١٠٩ هـ ١١٠ هـ ١١١ هـ ١١٢ هـ ١١٣ هـ ١١٤ هـ ١١٥ هـ

١١٦ هـ ١١٧ هـ ١١٨ هـ ١١٩ هـ ١٢٠ هـ ١٢١ هـ ١٢٢ هـ ١٢٣ هـ ١٢٤ هـ ١٢٥ هـ

١٢٦ هـ ١٢٧ هـ ١٢٨ هـ ١٢٩ هـ ١٣٠ هـ ١٣١ هـ ١٣٢ هـ ١٣٣ هـ ١٣٤ هـ ١٣٥ هـ

١٣٦ هـ ١٣٧ هـ ١٣٨ هـ ١٣٩ هـ ١٤٠ هـ ١٤١ هـ ١٤٢ هـ ١٤٣ هـ ١٤٤ هـ ١٤٥ هـ

١٤٦ هـ ١٤٧ هـ ١٤٨ هـ ١٤٩ هـ ١٥٠ هـ ١٥١ هـ ١٥٢ هـ ١٥٣ هـ ١٥٤ هـ ١٥٥ هـ

١٥٦ هـ ١٥٧ هـ ١٥٨ هـ ١٥٩ هـ ١٦٠ هـ ١٦١ هـ ١٦٢ هـ ١٦٣ هـ ١٦٤ هـ ١٦٥ هـ

١٦٦ هـ ١٦٧ هـ ١٦٨ هـ ١٦٩ هـ ١٧٠ هـ ١٧١ هـ ١٧٢ هـ ١٧٣ هـ ١٧٤ هـ ١٧٥ هـ

١٧٦ هـ ١٧٧ هـ ١٧٨ هـ ١٧٩ هـ ١٨٠ هـ ١٨١ هـ ١٨٢ هـ ١٨٣ هـ ١٨٤ هـ ١٨٥ هـ

٤٣٢ -

ابن المسيب ١٢٢

ابن المنظر حافظ محمد ابو الحسين البغدادي ٣٤٤ هـ ٣٨١ هـ

٣٨٩

ابن المقرئ (محمد بن ابراهيم الاصفهاني ابو بکر ٢٨١ هـ

٣٨٠ هـ ٣٨١ هـ ٣٨٢ هـ ٣٨٣ هـ ٣٨٤ هـ

ابن المقرئ ٣٥٢

ابن مكرم حافظ الامام المسند ابو بکر محمد بن الحسين ٣٠٩ هـ

١٢١

ابن الملقن، عمر بن علي علامه مزارع الدين ابو جنص

٢٩٨ - ٨٠٣ هـ

ابن منده حافظ ابو عبد الله محمد بن اسحاق ٣٩٥ هـ

٢٩٨ هـ ٢٩٩ هـ ٣٠٠ هـ ٣٠١ هـ ٣٠٢ هـ ٣٠٣ هـ ٣٠٤ هـ ٣٠٥ هـ ٣٠٦ هـ ٣٠٧ هـ

ابن المنذر ٥٤٦

ابن القسيم ٥٥٣ هـ ٥٥٤ هـ ٥٥٥ هـ ٥٥٦ هـ ٥٥٧ هـ ٥٥٨ هـ ٥٥٩ هـ ٥٦٠ هـ ٥٦١ هـ ٥٦٢ هـ

٥٦٣ هـ ٥٦٤ هـ ٥٦٥ هـ ٥٦٦ هـ ٥٦٧ هـ ٥٦٨ هـ ٥٦٩ هـ ٥٧٠ هـ ٥٧١ هـ ٥٧٢ هـ

٥٧٣ هـ ٥٧٤ هـ ٥٧٥ هـ ٥٧٦ هـ ٥٧٧ هـ ٥٧٨ هـ ٥٧٩ هـ ٥٨٠ هـ ٥٨١ هـ ٥٨٢ هـ

٥٨٣ هـ ٥٨٤ هـ ٥٨٥ هـ ٥٨٦ هـ ٥٨٧ هـ ٥٨٨ هـ ٥٨٩ هـ ٥٩٠ هـ ٥٩١ هـ ٥٩٢ هـ

٥٩٣ هـ ٥٩٤ هـ ٥٩٥ هـ ٥٩٦ هـ ٥٩٧ هـ ٥٩٨ هـ ٥٩٩ هـ ٦٠٠ هـ ٦٠١ هـ ٦٠٢ هـ

٦٠٣ هـ ٦٠٤ هـ ٦٠٥ هـ ٦٠٦ هـ ٦٠٧ هـ ٦٠٨ هـ ٦٠٩ هـ ٦١٠ هـ ٦١١ هـ ٦١٢ هـ

ابن كثير قري ٢٣٨

ابن كثير حافظ ابو الفداء عماد الدين سماعيل بن عمر ٢٣٨ هـ

٢٣٩ هـ ٢٤٠ هـ ٢٤١ هـ ٢٤٢ هـ ٢٤٣ هـ ٢٤٤ هـ ٢٤٥ هـ ٢٤٦ هـ ٢٤٧ هـ ٢٤٨ هـ

٢٤٩ هـ ٢٥٠ هـ ٢٥١ هـ ٢٥٢ هـ ٢٥٣ هـ ٢٥٤ هـ ٢٥٥ هـ ٢٥٦ هـ ٢٥٧ هـ ٢٥٨ هـ

٢٥٩ هـ ٢٦٠ هـ ٢٦١ هـ ٢٦٢ هـ ٢٦٣ هـ ٢٦٤ هـ ٢٦٥ هـ ٢٦٦ هـ ٢٦٧ هـ ٢٦٨ هـ

٢٦٩ هـ ٢٧٠ هـ ٢٧١ هـ ٢٧٢ هـ ٢٧٣ هـ ٢٧٤ هـ ٢٧٥ هـ ٢٧٦ هـ ٢٧٧ هـ ٢٧٨ هـ

٢٧٩ هـ ٢٨٠ هـ ٢٨١ هـ ٢٨٢ هـ ٢٨٣ هـ ٢٨٤ هـ ٢٨٥ هـ ٢٨٦ هـ ٢٨٧ هـ ٢٨٨ هـ

٢٨٩ هـ ٢٩٠ هـ ٢٩١ هـ ٢٩٢ هـ ٢٩٣ هـ ٢٩٤ هـ ٢٩٥ هـ ٢٩٦ هـ ٢٩٧ هـ ٢٩٨ هـ

ابن الجينة ٦٣٨

ابن لصيه ٢٠٥

ابن الماجنون ابو عبد الله عبد العزيز بن عبد الله بن ابي

سلمه ٦٣٨ هـ ٦٣٩ هـ ٦٤٠ هـ ٦٤١ هـ ٦٤٢ هـ ٦٤٣ هـ ٦٤٤ هـ ٦٤٥ هـ ٦٤٦ هـ ٦٤٧ هـ

ابن ماجه امام ابو عبد الله محمد بن يزيد ٢٤٣ هـ ٢٤٤ هـ ٢٤٥ هـ ٢٤٦ هـ ٢٤٧ هـ ٢٤٨ هـ ٢٤٩ هـ ٢٥٠ هـ ٢٥١ هـ ٢٥٢ هـ

٢٥٣ هـ ٢٥٤ هـ ٢٥٥ هـ ٢٥٦ هـ ٢٥٧ هـ ٢٥٨ هـ ٢٥٩ هـ ٢٦٠ هـ ٢٦١ هـ ٢٦٢ هـ

٢٦٣ هـ ٢٦٤ هـ ٢٦٥ هـ ٢٦٦ هـ ٢٦٧ هـ ٢٦٨ هـ ٢٦٩ هـ ٢٧٠ هـ ٢٧١ هـ ٢٧٢ هـ

٢٧٣ هـ ٢٧٤ هـ ٢٧٥ هـ ٢٧٦ هـ ٢٧٧ هـ ٢٧٨ هـ ٢٧٩ هـ ٢٨٠ هـ ٢٨١ هـ ٢٨٢ هـ

٢٨٣ هـ ٢٨٤ هـ ٢٨٥ هـ ٢٨٦ هـ ٢٨٧ هـ ٢٨٨ هـ ٢٨٩ هـ ٢٩٠ هـ ٢٩١ هـ ٢٩٢ هـ

ابن ماکول حافظ ابو نصر امير ٢٤٥ هـ ٢٤٦ هـ ٢٤٧ هـ ٢٤٨ هـ ٢٤٩ هـ ٢٥٠ هـ ٢٥١ هـ ٢٥٢ هـ ٢٥٣ هـ ٢٥٤ هـ

ابن المديني حافظ ابو الحسن ٢٣٣ هـ ٢٣٤ هـ ٢٣٥ هـ ٢٣٦ هـ ٢٣٧ هـ ٢٣٨ هـ ٢٣٩ هـ ٢٤٠ هـ ٢٤١ هـ ٢٤٢ هـ

ابو معشر حافظ عبد الحكيم الشافعي الطبري ٤٨٠ هـ	١٠٢	ابو قتادة
ابو مقاتل حصن بن مسلم رستم قندي ٢٠٨ هـ ١٩٠ ١٩٣	٥٥٠	ابو قطن
ابو مقدم شريح المذحجي ١٩٢	٦٢٦ ٦٢٨	ابو قلاب
ابو الميخ ٦٥٤ ٦٥٦	٦٢٢ ٦٩٥ ٤١٥ ٤٢٥ ٤٢٦ ٤٢٨	ابو كريب
ابو موسى اشعري وعبد الله بن قيس ٢٩ ١٠٣ ١٠٢	٢٥٣	ابو لبابة
١٥٦ ١٥٨ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	١٩٨ ١٨٥	ابو محمد الحارثي الى فظ (عبد الله) ٣٠ هـ
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٢٦٣ ٢٣٨ ٢٢٢ ٢١٣ ٢١٣ ٢١٠ ٢٠٤	٢٦٣ ٢٣٨ ٢٢٢ ٢١٣ ٢١٣ ٢١٠ ٢٠٤
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٣٨٣ ٣٨٣ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١	٣٨٣ ٣٨٣ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١ ٣٨١
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩	٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩ ٣٨٩
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	١٩٨	ابو محمد بن حارث حافظ ١٩٨
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٣٥٤	ابو محمد يوسف بن عبد الرحمن ٣٥٤
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	١٩٢ ١٩٢	ابو محمد الجوهري ١٩٢ ١٩٢
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	١٩٥ ١٩٥	ابو محمد الجويني امام الحرمين ١٩٥ ١٩٥
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٥٥٢	ابو المتوكل ٥٥٢
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٦٥٠ ١٦٦	ابو مسعود انصاري ٦٥٠ ١٦٦
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٢٩٨ ٢٩٠	ابو مسعود حافظ دمشق ٢٩٨ ٢٩٠
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٢٢٦	ابو مسلم خراساني ٢٢٦
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	١٦٤	ابو المنظر اسفرائيني علامه ١٦٤
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٣٦٨	ابو مسلم ستملي ٣٦٨
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٤٢٨ ٤٢٦	ابو مسلم البجلي ٤٢٨ ٤٢٦
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٦٤ ٦٤	ابو المنظر يوسف القاضي الجرجاني امام الحرمين ٦٤ ٦٤
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٣٨٢	٣٨٢
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٦٨ ٦٤	ابو المعالي عبد الملك الجويني امام الحرمين ٦٨ ٦٤
١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩ ١٥٩	٦٨٨ ٦٣٤	ابو معاوية ٦٨٨ ٦٣٤

احمد بن منیع حافظ ابو جعفر البغدادی ۲۲۲ھ

۴۰۹، ۴۳۱، ۴۸۶، ۴۱۵، ۴۳۱

ازدی ۶۳۲

الازهری ۳۵۳

اسامه بن زید ۵۴ھ ۱۰۲

اسحاق الازرق ۲۲۲ھ ۶۸۹

اسحاق بن ابراهیم ابو یعقوب البصری ۲۳۸ھ

۴۲۹، ۴۵۳، ۴۳۱، ۴۵۹

اسحاق بن راجویه امام ۳۳۴ھ ۹۵۵، ۲۷۷

۴۰۴، ۴۰۹، ۴۲۹، ۴۵۲، ۴۷۶، ۴۸۲، ۶۸۲

۶۹۱، ۷۰۵، ۷۱۰، ۷۱۵، ۷۱۹، ۷۲۵، ۷۲۸

۷۳۰، ۷۲۹

اسحاق بن سلیمان الرازی ۱۹۵، ۶۸۹

اسحاق البوسعدی ۲۲۷

اسحاق بن منصور نیشاپوری ۲۵۱ھ ۴۳

اسد بن عمرو البجلي ۱۸۸ھ ۲۲۲، ۴۰۸، ۴۱۶

۴۱۹، ۴۲۳، ۴۲۴، ۶۹۳، ۷۳۱

اسد بن فرات ۱۷۶، ۴۰۸، ۴۲۳، ۶۹۳

اسد بن موسیٰ حافظ ۲۱۲ھ ۴۲۹

اسرائیل بن یونس السبیتی ۱۶۲ھ ۱۹۴، ۲۲۲

۲۷۹، ۳۲۰، ۷۰۴ -

اسماعیل بن احمد السمرقندی ۳۵۷

اسماعیل صفهانی ابو القاسم شیخ الاسلام ۳۸۵

اسماعیل بن ابان ۶۹۷

اسماعیل بن ابراهیم بن منیر ۹۶

احمد بن خلیل ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۹، ۴۲۰، ۴۳۱، ۴۳۳

۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹

۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷

۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶

۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲

۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹

۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵

۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱

۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷

احمد بن رسته ۳۵۶

احمد بن زبیر ۶۹۱، ۶۹۲

احمد بن شان ۲۵۸ھ ۴۳۱

احمد بن سلمه ابو الفضل حافظ ۲۸۶ھ ۴۹۶

احمد بن اصبحت ابو العباس الحماقی ۳۰۸ھ ۱۸۵

احمد بن عبد الله ۲۱۷ھ ۱۴۸، ۱۹۵

احمد بن عبد الله ابو الحسن امام ۴۳۱، ۴۳۲

احمد بن علی مروزی ۲۹۲ھ ۴۳۱

احمد بن عمرو البصری البرکک ۲۹۲ھ ۴۳۱

احمد بن عوف ابو مصعب (الزهري) ۳۲۶

احمد بن محمد بن سعید ابو العباس ۳۳۲ھ ۳۷۶

۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱

احمد بن محمدی الاصفهانی ۲۷۲ھ ۴۳۱

احمد محمد شاکر ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱

احمد بن علی ۱۶۳، ۳۵۲، ۴۵۳

احمد بن منصور البرکک ۲۶۵ھ ۴۳۱، ۴۴۰

۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴
 ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳
 ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲
 ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱
 ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰
 ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹
 ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸
 ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷
 ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶
 ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵
 ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴
 ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳

ام حرام طلیکة نیت طحان ۸۳

ام سلمه ۳۱۱ ۲۵۲ ۱۴۱۴ ۳۳۴

ام مانی ۱۲۲ ۱۲۳ ۱۲۴ ۱۲۵

امیر رطله ۷۷۵ -

ابن الرشید ۳۹۶

انس بن حبه ۱۴۷

انس بن مالک ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳

۱۴۰ ۱۴۱ ۱۴۲ ۱۴۳ ۱۴۴ ۱۴۵ ۱۴۶ ۱۴۷ ۱۴۸

۱۴۹ ۱۵۰ ۱۵۱ ۱۵۲ ۱۵۳ ۱۵۴ ۱۵۵ ۱۵۶ ۱۵۷

۱۵۸ ۱۵۹ ۱۶۰ ۱۶۱ ۱۶۲ ۱۶۳ ۱۶۴ ۱۶۵ ۱۶۶

۱۶۷ ۱۶۸ ۱۶۹ ۱۷۰ ۱۷۱ ۱۷۲ ۱۷۳ ۱۷۴ ۱۷۵

۱۷۶ ۱۷۷ ۱۷۸ ۱۷۹ ۱۸۰ ۱۸۱ ۱۸۲ ۱۸۳ ۱۸۴

انور نشاء کشمیری الطاهر ۵۲ ۳۱۵ ۵۷۹

امام اعظم ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۷

۳۰۸ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۶

۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۵

۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۴

۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۳

۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۲

۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۱

۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۷۰

۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۹

۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۸

۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷

۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶

۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵

۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴

۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳

۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲

۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱

۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰

۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹

۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸

۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷

۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶

۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵

۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴

۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳

۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲

اوزاعی امام ابو عمرو عبد الرحمن ۵۵۰ (۲۱۲/۲۱۱)
 ۲۳۵ (۲۱۲/۲۱۱) ۲۵۸ (۳۰۴/۳۰۳) ۳۰۶ (۳۰۴/۳۰۳)
 ۳۹۹ (۳۰۴/۳۰۳) ۴۰۵ (۴۰۹/۴۰۸) ۴۱۹ (۴۱۹/۴۱۸)
 ۵۰۵ (۵۰۵/۵۰۴) ۵۵۲ (۵۵۲/۵۵۱) ۶۴۴ (۶۴۴/۶۴۳)
 ۶۸۰ (۶۸۰/۶۷۹) ۶۹۸ (۶۹۸/۶۹۷) ۷۱۵ -

اصحاب اوس الاسلمی ۱۹۲

ایوب بن زید ۹۵

ایوب بن عاصم ۶۵۹ ۶۵۰

ایوب الخلوئی محدث ۱۰۰ ۳۵۸

ایوب ابن تیمیة سختیانی (۳۰۹/۳۰۸) ۲۳۵

۳۴۴ (۳۴۴/۳۴۳) ۳۴۵ (۳۴۵/۳۴۴) ۳۴۶ (۳۴۶/۳۴۵)

۳۹۹ ۵۱۲

ایوب بن عیسی بن ابی بکر ۳۸۵

ب

باقراام ۹۸

بایر قی علامه ۶۵۹

امام بخاری محمد بن اسماعیل ۵۰ (۴۰۸/۴۰۷)

۸۵ (۸۵/۸۴) ۹۲ (۹۲/۹۱) ۹۶ (۹۶/۹۵) ۹۸ (۹۸/۹۷)

۱۲۲ (۱۲۲/۱۲۱) ۱۲۵ (۱۲۵/۱۲۴) ۱۲۸ (۱۲۸/۱۲۷)

۱۴۳ (۱۴۳/۱۴۲) ۱۴۵ (۱۴۵/۱۴۴) ۱۴۸ (۱۴۸/۱۴۷)

۱۹۱ (۱۹۱/۱۹۰) ۱۹۳ (۱۹۳/۱۹۲) ۱۹۸ (۱۹۸/۱۹۷)

۲۰۳ (۲۰۳/۲۰۲) ۲۰۹ (۲۰۹/۲۰۸) ۲۱۲ (۲۱۲/۲۱۱)

۲۳۰ (۲۳۰/۲۲۹) ۲۳۶ (۲۳۶/۲۳۵) ۲۳۸ (۲۳۸/۲۳۷)

۲۵۳ (۲۵۳/۲۵۲) ۲۵۹ (۲۵۹/۲۵۸) ۲۶۰ (۲۶۰/۲۵۹)

۲۸۴ (۲۸۴/۲۸۳) ۲۹۰ (۲۹۰/۲۸۹) ۲۹۳ (۲۹۳/۲۹۲)

۳۰۸ (۳۰۸/۳۰۷) ۳۰۹ (۳۰۹/۳۰۸)

۳۱۰ (۳۱۰/۳۰۹) ۳۱۲ (۳۱۲/۳۱۱) ۳۱۴ (۳۱۴/۳۱۳)

۳۳۰ (۳۳۰/۳۲۹) ۳۳۲ (۳۳۲/۳۳۱) ۳۳۴ (۳۳۴/۳۳۳)

۳۶۹ (۳۶۹/۳۶۸) ۳۷۰ (۳۷۰/۳۶۹) ۳۷۲ (۳۷۲/۳۷۱)

۳۹۴ (۳۹۴/۳۹۳) ۳۹۶ (۳۹۶/۳۹۵) ۳۹۸ (۳۹۸/۳۹۷)

۴۰۴ (۴۰۴/۴۰۳) ۴۰۶ (۴۰۶/۴۰۵) ۴۰۸ (۴۰۸/۴۰۷)

۴۵۲ (۴۵۲/۴۵۱) ۴۵۵ (۴۵۵/۴۵۴) ۴۵۹ (۴۵۹/۴۵۸)

۴۶۴ (۴۶۴/۴۶۳) ۴۶۵ (۴۶۵/۴۶۴) ۴۶۶ (۴۶۶/۴۶۵)

۴۶۸ (۴۶۸/۴۶۷) ۴۶۹ (۴۶۹/۴۶۸) ۴۷۰ (۴۷۰/۴۶۹)

۴۷۲ (۴۷۲/۴۷۱) ۴۷۴ (۴۷۴/۴۷۳) ۴۷۶ (۴۷۶/۴۷۵)

۴۹۱ (۴۹۱/۴۹۰) ۴۹۲ (۴۹۲/۴۹۱) ۴۹۳ (۴۹۳/۴۹۲)

۵۰۶ (۵۰۶/۵۰۵) ۵۰۸ (۵۰۸/۵۰۷) ۵۱۲ (۵۱۲/۵۱۱)

۵۵۵ (۵۵۵/۵۵۴) ۵۵۸ (۵۵۸/۵۵۷) ۵۶۰ (۵۶۰/۵۵۹)

۶۲۳ (۶۲۳/۶۲۲) ۶۲۸ (۶۲۸/۶۲۷) ۶۲۹ (۶۲۹/۶۲۸)

۶۳۵ (۶۳۵/۶۳۴) ۶۵۹ (۶۵۹/۶۵۸) ۶۶۵ (۶۶۵/۶۶۴)

۶۸۲ (۶۸۲/۶۸۱) ۶۸۵ (۶۸۵/۶۸۴) ۶۸۶ (۶۸۶/۶۸۵)

۷۰۸ (۷۰۸/۷۰۷) ۷۱۰ (۷۱۰/۷۰۹) ۷۱۲ (۷۱۲/۷۱۱)

۷۳۸ (۷۳۸/۷۳۷) ۷۳۹ (۷۳۹/۷۳۸) ۷۴۲ (۷۴۲/۷۴۱)

بحر العلوم مولانا ۳۳۰

بدر بن جماعة علامه محمد بن بریهما لکھنوی الحمیری ۳۳۵

۵۵۴ ۵۵۱

بدر بن عاصم ۷۱۲

بدر بن عاصم ۷۱۲ ۷۰۹ ۷۱۰

بروکلمن ۳۱۴ ۳۱۳

برزید ۹۶

برهان الدین الانبازی الشیخ ۸۰

ترمذی ۶۲۳، ۶۳۲، ۶۳۴، ۶۴۰، ۶۴۱

۶۵۲، ۶۵۴، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵

۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲

ترمذی علامہ ۷۰۵

تفتازانی سعد الدین علامہ ۶۹۲، ۵۷۳

تقی الدین سبکی حافظ ابو الحسن علی بن عبد الکافی

۱۰۵، ۲۵۱، ۳۸۷

التموخی ابو یعقوب ۲۵۲، ۶۳۱

توربشتی حافظ شهاب الدین فضل اللہ ابن الحسین

۶۶۰، ۱۳۷

تیمی اسماعیل ۳۹۱

ث

ثابت بن عجلان ۱۸۲

ثابت بن قیس ۱۸۲، ۲۷۶

ثابت (بن نعمان) ۱۲۴

ثابت البنانی ۹۷، ۱۴۲، ۲۷۳، ۳۹۹

ثعلب بن عمرو بن مالک بن عبد مناف ۳۵۸

الثعلبی محمد بن شجاع ۳۷۱

ثمامہ بن عبد اللہ بن انس بن مالک ۹۷

ثنا اللہ پانی پتی، قاضی ۱۲۲۵، ۱۲۶

ثوبان ۵۲، ۱۰۳، ۵۸۹

ثور بن یزید ۴۵۹

ج

جابر بن سمرہ ۱۹۲

جابر الجعفی ۲۴۱، ۲۸۷، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸

۵۴۰، ۵۳۹

جابر بن عبد اللہ (صحابی) ۹۸۰، ۱۰۱، ۱۳۸

۱۸۳، ۲۱۶، ۲۳۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳

۳۰۹، ۳۱۳، ۳۲۵، ۳۹۶، ۴۸۵

۶۵۶، ۶۵۷، ۶۶۱، ۶۸۶، ۶۹۶، ۷۳۲

الجبلی ابو عثمان عمرو بن بحر

جامع بن ابی راشد ۴۸، ۲۱۳

جامع بن شاذان الحارثی ۲۱۳

حضرت جبریل روح القدس ۶۷۷، ۶۸۱، ۶۹۹

۳۳۶، ۳۳۸

جبلہ بن آسم ۴۱۶

جبیر بن مطعم ۵۱

جراح بن مسیح ۷۱۷

جرجی زیدان ۲۴۵

جربج ۵۰۹

جریر بن حازم ۱۷۰، ۲۴۱، ۲۴۲

جریر بن عبد الحمید ۱۷۰، ۱۹۴، ۲۴۲، ۴۰۶

۴۲۴، ۴۳۸، ۴۴۷، ۴۵۵، ۴۷۷، ۴۸۰

۵۴۰، ۶۸۹

جریر بن عبد اللہ ۱۰۳، ۱۹۲، ۳۴۴، ۷۳۲

جریر بن عثمان ۱۴۲، ۳۹۷، ۴۵۹

الجزائری علامہ طاہر بن صالح الدمشقی ۷۸

۱۳۴، ۲۸۸، ۲۹۰، ۳۰۶، ۳۱۶، ۴۵۴

۴۵۷، ۴۶۳، ۴۶۹، ۴۷۹، ۵۳۴، ۵۳۶، ۵۶۰

۵۶۰، ۵۹۲، ۵۸۷، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸

۶۷۱، ۶۷۵

حکام کبریا احمد محمد بن محمد نیشاپوری ۴۷۸ھ ۲۹۲

۱۶۳، ۳۷۳، ۴۰۰، ۴۰۷

حکام بن یحییٰ ابرازی ۶۸۸

حامد بن محمد شعیب صوفی ابو العباس ۳۰۹ھ ۹۱

حبیب بن عصبیه ۴۲

حبیب بن علی امام ۱۷۲ھ ۲۲۴

حبیب بن ابی ثابت ۱۱۹ھ ۱۹۴

حبیب بن ابی موسیٰ ۱۴۲

حجّی، ملک، ڈاکٹر ۱۹۷، ۳۱۳، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱

حجاج بن ارطاة ۱۹۴

حجاج بن یوسف ثقفی ۱۵۵، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۹۰

۷۲۲

حجر بن عقیس ۵۱۴

الحمد ادا احمد ابو الفضل ۳۸۴

الحمد، الحسن، ابو علی، المقرئ ۳۸۴

حذیفہ بن لیثان ۱۴۶، ۱۸۳، ۱۹۳، ۳۲۳، ۴۲۵

حسان بن موسیٰ ۲۷۷

حسان بن محمد ابو الولید حافظ نیشاپوری ۶۳۰، ۶۳۱

حسن ابراہیم حسن ڈاکٹر ۱۵۰، ۱۶۷، ۳۳۴، ۴۱۲

حسن بصری امام ابو سعید ۱۱۰ھ ۲۵، ۹۸، ۴۰۰

۱۶۹، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۱۱، ۲۱۶، ۲۴۴، ۲۸۸

۳۷۴، ۴۰۲، ۴۱۱، ۴۰۵

حسن بن سفیان بن عمر الشیبانی حافظ ابو العباس ۹۱

حسن بن شجاع بلخی ۸۵

حسن بن عرفہ ابو علی العبیدی ۲۷۰ھ ۳۰، ۳۱، ۳۵

حسن بن زیار امام ابو لوی امام ابو علی ۲۰۴ھ ۲۲۲، ۲۲۳

۳۵۰، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۹۰، ۴۰۷

۴۱۶، ۴۱۹، ۴۲۴، ۴۳۳، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۹

حسن بن عمارہ ۲۸۶، ۳۰۸

الحسن بن الربیع ۲۲۱ھ ۱۹۵

الحسن بن سعد ۲۱۳

الحسن بن صالح ۱۶۹ھ ۶۳، ۱۱۹، ۱۶۶، ۲۸۹

الحسن بن علی ۹۲۹

الحسن بن محمد ۲۱۴

الحسن بن عیسیٰ ۶۹۹

الحسین بن علی ۱۸۳، ۲۵۹

الحسن بن موسیٰ ۳۱۱

الحسین بن علی ابو علی نیشاپوری ۱۱۹۵، ۲۵۹، ۲۶۹

الحسین بن محمد بن خسرو الحافظ ابو عبد اللہ ۱۹۸، ۲۵۲

الحسین بن محمد نیشاپوری ۲۸۹ھ ۲۳۱

حصین بن عبد الرحمن ۱۹۴

حصفی، امام علامہ (موسیٰ بن زکریا) ۱۹۸، ۳۰۷، ۳۳۸

حضرمی حافظ ۳۰۵

حطان بن عبد اللہ ۴۵۳

حفص بن عبد الرحمن بلخی ۱۹۹ھ ۴۲، ۶۸۹

حفص بن غیاث بن علق قاضی ابو عمر ۱۹۹ھ

۱۹۵، ۳۶۰، ۳۶۱، ۴۱۶، ۴۱۹، ۴۲۲، ۴۸۹، ۴۹۰

۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۵، ۴۲۹، ۴۳۰

حفتی علامہ ۱۲۶

حکام بن یحییٰ ۳۰

نخشب بن الارت ۱۹۳

نخشمه بن عبدالرحمن ۴۱۵

نخسجه الكبرى ۶۲۶، ۶۲۵

النخريسي عبداللہ بن داود، حافظ ۳۶۸

النخريجي علامہ صفی الدين ۴۵۲، ۳۳۹

نخزيمہ (صحابی) ۳۰۸

النخلاف امام البرکة احمد بن عمر ۲۶۱ھ

نخسرو حافظ ۱۸۳

خطابی علامہ امام محمد بن محمد البرکة سليمان ۳۸۸ھ

۴۹، ۸۲، ۴۱۷، ۳۲۲، ۴۱۲، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۱۶

۵۰۳، ۵۸۶، ۵۹۱، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۸، ۶۰۲

خطيب بغدادی حافظ البرکة احمد بن علی ۶۳۴ھ

۱۲۳، ۱۵۲، ۱۷۰، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۵، ۱۸۶

۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۰۶، ۲۶۵، ۲۶۶

۲۶۷، ۲۶۹، ۲۶۹، ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۹۰

۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۸، ۳۴۸، ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۸

۳۷۰، ۳۷۷، ۳۸۱، ۳۸۳، ۳۸۷، ۳۸۷، ۳۹۰

۴۰۷، ۴۱۱، ۴۱۴، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳

۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹

۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳

۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹

۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵

۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱

۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷

۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳

۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹

۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵

۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱

۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷

خلاص بن عمرو ۴۱۵

خلف بن الوب ۲۰۵ھ، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۹

۳۱۱

خلف بن سالم ۲۳۱ھ ۷۱۵

خلف بن بنجيم ۱۹۵

خلف بن محمد ابو محمد حافظ (۴۰۱)، ۳۹۱، ۳۹۸

خليلی حافظ ابو يعلى خليل بن عبد الله ۴۴۶ھ

۱۲۲۱، ۱۲۵۴، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱

خليفة حاجي ۶۶۷

خوارزمی علامہ محمد بن محمود ۱۶۸، ۱۸۳، ۱۹۸

۲۰۰، ۲۰۷، ۲۱۲، ۲۶۷، ۲۷۲، ۲۷۷، ۲۸۰

۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶

۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲

۷۲۴



الدارقني، البرکة سليمان ۴۸، ۱۶۳

دارقطنی امام حافظ ابو الحسن علی بن عمر ۳۸۵ھ

۸۹، ۹۵، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳

۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹

۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵

۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱

۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷

۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳

۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹

۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵

۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱

۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷

۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳

۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹

۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵

سبط بن الجوزی ۳۰۶، ۱۸۴

سحنون علامہ ۲۳۵

سحاوی حافظ الشمس الدین ابو الخیر ۱۲۴ھ

۱۴۴، ۱۸۳، ۲۰۳، ۲۲۳، ۲۳۳، ۲۴۶

۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۹۰

۳۰۵، ۳۱۱، ۳۵۲، ۳۸۱، ۳۸۶، ۳۹۲

۴۴۸، ۴۵۱، ۴۴۲، ۴۸۶، ۴۹۳، ۵۳۵

۵۳۶، ۵۳۷، ۵۴۷، ۵۶۱، ۶۵۹

۶۶۱، ۷۲۳

السراج ۷۲۸

سراج الدین البلقینی الشیخ ۸۱

سراقہ بن مالک ۲۲۳

السرخی شمس الامم ابو حامد محمد بن احمد ۴۸۳ھ

۶۶۷، ۶۶۸

مشریح بن یونس ۶۹۵

سعد بن ابی وقاص اللیثی ۵۲، ۱۰۲، ۱۴۶

۱۴۷، ۳۳۹، ۴۱۴، ۵۱۵، ۵۴۰

۵۴۱

سعد بن الصلب ۶۸۹

سعید بن ابی سعید نیشاپوری ۱۸۱

سعد بن طارق ۳۱۴

سعید بن ابی عروبہ ۹۷، ۲۷۸، ۳۲۰

۳۴۳، ۳۴۵، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۵۳، ۵۴۷

سعید بن ابی ہلال ۱۴۲

سعید بن اشوع ۴۱۶

زیاد بن ایوب بن زیاد طوسی ابو ہاشم ۱۵۲ھ ۶۹۵

زیاد بن حمیر الاسدی ۲۱۳

زیاد بن علامہ ۲۱۳، ۲۱۴

زید بن ابی انیسہ ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۹۴

زید بن اسلم ۳۹۶، ۳۹۹، ۴۱۵

زید بن ارقم ۲۰۹، ۲۱۳

زید بن ثابت ۷، ۱۵، ۱۹، ۲۳، ۲۴، ۲۵

۳۶۵، ۳۶۶، ۴۱۴، ۴۷۰

زید بن الحباب ۱۹۵، ۳۰۸، ۶۸۹

زید بن حارثہ ۶۲۵، ۶۶۶

زید بن حیاش ۵۴۰، ۵۴۱

زید بن صوحان ۴۱۵

زید بن وحب ابوسلیمان ۱۹۴، ۲۰۰

زبلیج جمال الدین حافظ ۷۶۲ھ ۹۰، ۹۲

۵۳۳، ۵۸۴، ۶۱۲، ۶۳۰، ۶۵۷

زینی، محمد بن یحییٰ ۲۵۵ھ ۸۵

سی

سائب بن یزید ۲۴۱

سالم بن عبد اللہ ۱۰۶ھ ۹۲، ۱۳۰، ۲۴۲

۲۴۴، ۲۴۵، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۹، ۲۶۴

۲۹۴، ۳۲۳، ۳۲۸، ۳۳۴، ۳۳۵

۴۱۳، ۵۹۷، ۶۴۶، ۶۴۸

السباحی ڈاکٹر ۳۴۴

اسبکی تاج الدین علامہ ابو نصر عبد الوہاب

۹۷، ۱۴۳، ۱۹۱، ۲۵۱، ۲۹۲، ۵۷۷

عاصم الاحول (محدث) ۱۲۲، ۱۶۹، ۱۵۰، ۱۵۴، ۱۴۰، ۱۴۰، ۱۴۰
 ۲۰۰، ۲۰۸، ۳۱۰، ۳۹۹-
 عاصم بن ابی النجود البکری الاسدی بهدله ۱۲۴ هـ
 ۱۵۰، ۶۳
 عاصم بن علی، ابوالحسین ۱۴۵، ۱۴۶
 عامر بن شرجیل الهمدانی ۱۹۴، ۳۴۶، ۳۳۲
 عافیه بن یزید ۱۹۱، ۲۲۳
 عامر بن وثله ابوالطفیل ۱۸۸
 عباد بن العوام ۱۴۰، ۱۳۸، ۱۲۸، ۱۲۸، ۶۸۸
 عباده بن الصامت (۱۰)، ۱۰۲، ۱۱۵، ۱۲۸، ۳۳۹
 ۵۳۶
 عباد بن یعقوب ۳۹۴
 عباس بن مصعب ۴۱۱
 عباس حسین رئیس اعظم ۳۵
 عبد بن حمید ۲۲۹ هـ (۲۳۱، ۴۲۶، ۴۲۹، ۴۳۲-
 عباس دوری (۱۳)، ۱۴۵، ۳۵۳، ۴۲۶
 عبد بن محمد ۴۸۷
 عبدان ۴۲۹
 عبد الجبار بن وائل ۵۱۴
 عبد الحق، حافط ۲۵۱
 عبد الحق شاه دیوبندی شیخ (۱۳۹، ۴۵۰، ۴۸۹)
 ۶۸۶
 عبد الحمید بن بهرام ۳۲۰
 عبد الحمید بن عبد الرحمن ۲۰۲ هـ ۴۲۴
 عبد الحمید محمد محی الدین ۳۴۸

طحادی (۳۹)، ۱۹۷، ۱۲۲، ۱۲۳، ۲۶۵، ۲۶۳
 ۳۸۵، ۳۸۴، ۳۸۱، ۳۷۱، ۳۶۹، ۳۵۲، ۳۱۳
 ۴۰۸، ۴۱۹، ۴۲۳، ۴۷۶، ۴۸۱، ۵۱۸، ۵۶۰، ۵۹۵
 ۵۹۹، ۶۲۴، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۸، ۶۵۸
 ۶۹۳، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۴، ۷۲۴، ۷۳۱-
 طریف بن سفیان، ابوسفیان ۲۴۴
 ظلمه (صحابی)
 ظلمه بن ابی سفیان ۵۴۴
 ظلمه بن عمرو ۵۴۴
 ظلمه بن مصرف ۶۶۲
 ظلمه بن محمد حافط (اشاعر) ۱۹۸، ۲۵۲، ۲۶۳
 ۳۸۹، ۳۸۷، ۲۴۶
 ظلمه بن نافع ۹۸
 طلق بن حبیب ۲۰۴
 طیالسی، ابوالولید، دیبجو الولید طیالسی
 طیالسی، ابوداؤد، حافط سلیمان بن داؤد ۲۰۴ هـ مزید
 دیبجو ابوداؤد میں۔

ع

عائشہ بنت جبر ۳۰۵

عائشہ صدیقہ، ۴۲، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۳۵، ۱۴۲
 ۴۰۴، ۴۱۳، ۴۱۸، ۴۱۰، ۴۱۳، ۴۱۶، ۴۳۴
 ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۶، ۲۶۶
 ۳۹۶، ۳۹۷، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۲۱، ۴۲۲
 ۵۰۳، ۵۳۶، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۹، ۶۳۹
 ۶۵۸، ۶۶۰، ۷۳۲-

٢٩٤	عبد الله بن ذكوان	عبد القاهر بغدادى المنصور ١٢٢٦، ١٢٤٠، ٢٦٩	عبد القاهر تميمى المنصور ٢٦٩
٣١٥	عبد الله بن سالم		عبد الكريم علامه ٦٤١
٥٣٦	عبد الله بن سلام	٦٥٤، ٦٥٦، ٦٨٤	عبد الكريم بن ابى المنارق
٤١٥	عبد الله بن سحر	٣٤٩	خطيب جمال الدين عبد الكريم ابو الفضل النصارى
١٢٢	عبد الله بن عبد الرحمن الطائفى	١٦٣	عبد الكريم ابى اليسر
٣٩٩	عبد الله بن طادس	٣٠٥، ١٣٩	عبد الكريم شافعى ابو معشر
٢١٥	عبد الله بن عقيب بن مسعود قاضى	٣٨٢	عبد اللطيف الشيخ
٢٢٣	عبد الله بن عبد الرحمن النولى	١٣٩	عبد الله نسفى ابو البركات
٢٢٣	عبد الله بن عثمان، ابو عثمان	١٠٢، ١٨٤، ١٨٦، ١٩٣	عبد الله بن ابى اوفى
٢٦٢	عبد الله بن على بن الحسين	٣٠٥	
١٠٢، ٩٩، ٩٣، ٨٥	عبد الله بن عمرو بن العاص	٢٢٣	عبد الله بن ابى زياد
٦٣٢٥، ٢٠٩		٢٣٢	عبد الله بن ابى سنجح
١٦٩، ١٢٢	عبد الله بن عون	١٢٢	عبد الله بن ابى ليكه
٢٤٣	عبد الغنى حافظ	١٩٢، ٢٣٣، ٢٣٤	عبد الله بن (احمد بن حنبل)
٦٣	عبد الله بن كثير القرشى ابو معبد	٢٨٤، ٢٣٥	
٢٦٥	عبد الله بن الفضل	٥٦٣	عبد الله بن احمد نسفى
٢٠٥	عبد الله بن لميعه	٤٣، ٤٢٠، ٢٢٢، ١٩٢	عبد الله بن ادريس
٦٣٤	عبد الله بن مالك	٣٠٥، ٢٢٠	عبد الله بن انيس
١٤٥، ١٦٩، ١٩٦، ٢٠٠	عبد الله بن المبارك	٢٢٠، ٢٢٠	عبد الله بن بريد
٢٦٣، ٢٦٠، ٢٥٨، ٢٢٦، ٢٢٤، ٢٢٦، ٢٠٨		٣٥٤	عبد الله بن الحسن ابو القاسم
٢٤٤، ٢٠٠، ٢٣٣، ٢٣٠، ٢٣٦، ٢٣٣، ٢٠٣		١٨٥، ١٨٣، ١٦٨، ١٢٣	عبد الله بن الحارث
٢٠٥، ٢٠٩، ٢١٠، ٢١١، ٢٢٢، ٢٢٣، ٢٢٤، ٢٢٤		٣١٢، ٢٢٣، ٢٢٢، ٢٠٥، ٢٠٣	
٢٦٤، ٢١٢، ٢٠٤، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠، ٢٠٠		١٩٨، ١٩٥	عبد الله بن داود الخربى
٥٣١، ٥٣٢، ٥٣٦، ٥٥٢، ٥٥٤، ٥٥٤		٥٩٥	عبد الله بن دينار ١٩٨، ٢٢٢، ٢٩٥، ٣٣٢، ٥٥٦
٤٠٣، ٤٠٢، ٤٠٠، ٤٠٠، ٤٠٠، ٤٠٠			
٤٠٢، ٤٠٢، ٤٠٢، ٤٠٢، ٤٠٢، ٤٠٢			

عبد الله بن محمد بن جعفر ٢٢٦ هـ ٣١١
 عبد الله بن محمد النضاري ٣٨٦
 عبد الله بن محمد، البربر ٢٣٣ هـ ١٩٥
 عبد الله بن محمد بن عبد المؤمن بن يحيى ٢٨٠
 عبد الله بن محمد بن عقيل ٢٢٠
 عبد الله بن مسلم، البربر عبد الرحمن ٣٩٨
 عبد الله بن معقل (١٠١، ١١٥)
 عبد الله بن نعيم ١٩٥
 عبد الله بن وهيب بن سلمة البربر محمد ٢٠٠، ٢٦٣، ٣٩٤
 (ديوري) ٢٢٢
 عبد الله بن يزيد (المقرئ) ١٢٢، ١٣٣، ١٩٣
 ١٩٥، ٣٦٠، ٤٢٥، ٤٢٨
 عبد المجيد بن أبي رداد ٦٨٨
 عبد الملك بن جريج ١٢٢
 عبد الملك بن حبيب ٢١٨
 عبد الله الحمري ١٢٢
 عبد الله بن يوسف البربر محمد ٣٩٨
 عبد الملك بن سليمان ١٩٤، ٢٣١
 عبد الملك بن عبد العزيز (امام) ٣٣٣، ٣٣٨، ٣٤١
 عبد الملك بن أبي سليمان ٦٣٢، ٦٣٣
 عبد الملك بن عمير ١٢٦ هـ ١٩٣، ١٩٦، ١١١، ٣١١
 ٢٩٥، ٢٩٤
 عبد الملك بن مروان ١٨٢
 عبد الملك بن محمد بن أبي بكر ٢٢٢
 عبد الواحد بن زياد ٢٤٦

عبد المنعم ٢٦١
 عبد الوارث ٥٥١، ٣٠٢
 عبد الوهاب قاضي ٣٤٢، ٢٣٠
 عبد الوهاب استاذ كلية شرعية جامع ٣٩٢
 عبدة بن سليمان ١٩٥
 عبدة بن محمد وراق ٢٥١
 عبدة بن نضلة ٤٢٠، ٢١٦
 عبدة الله (محدث كوفي) ١٩٥
 عبدة الله الاشجعي ١٩٥
 عبدة الله بن عامر ٢٢٥
 عبدة الله بن عبد الله البربر عبد الله ٩٨ هـ ٢٢٢
 ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٢٧، ٢٢٨، ٢٢٩، ٢٣٠، ٢٣١، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥
 عبدة الله بن عمر قوامري ٢٢٩، ٢٢٥
 عبدة الله بن موسى العنسي حنظلي البربر محمد ١٤٢، ٢١٣
 ١٩٥، ١٩٩، ٢٩٤، ٢٢٨، ٢٣١، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤
 ٢٣٨، ٢٣٩، ٢٤٠، ٢٤١، ٢٤٢
 عبدة بن حميد ١٢٩، ١٩٥
 عبدة بن عمرو السلمي المروزي ٤٣ هـ ١٢٩، ١٩٤
 ١٩٦، ١٩٥
 عتبة (صحابي) ١٢٤
 عتبة بن فرقان ٢١٦
 عتبة بن عبد الله بن عتبة ٢١٣
 عثمان بن أبي شيبة حنظلي البربر الحسن ٢٣٩ هـ ١٩٥
 ٢١٨، ٢٢٩، ٢٣٠، ٢٣١، ٢٣٢، ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٥
 عثمان بن الاسود ٥٢٤

عمر بن رجا - البرياسر ٢٦٤ هـ ٢٣١

عمر بن ياسر ١١٨٩، ١١٨٨، ١١٨٧، ١١٨٦، ١١٨٥، ١١٨٤

عمر بن امية ٥٨٨

٣٢٥

عمر بن حزم بن زيد الانصاري ١١٨٨، ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢

عمر بن ثابت ٥٢٩

عمر بن دينار حافظ (مكي) ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن دينار بصري ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن سلم ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن شرحبيل الهمداني ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن شبيب البراءي ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن العاص ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن عاصم ٣٨٢

عمر بن عبد الله البراسقي ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن عبيد بن عثمان ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن علي الفلاس ٦٣

عمر بن قيس ٦٥٤

عمر بن مروه بن عبد الله ١٩٢

عمر بن محمد ٦٨٨

عمر بن ميمون الودعي بن عبد الله ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن حفص السدوسي ١٤٥

عمر بن احمد بن حفص الشجاع ٣٩٢

عمر بن ربيعة بن الخطاب ١٠١ هـ ٣٢١

عمر بن زائدة ١٩٩

عمر بن عبد العزيز (خليفة) ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن مك ٩٢

عمر بن قناس ٣٣٠

عمر، فاروق اعظم ١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

١١٨٩، ١١٩٠، ١١٩١، ١١٩٢، ١١٩٣، ١١٩٤

عمر بن لارون ٣١١

عمران بن عبد الله حليم ابن ابي الورود ٢٦٦، ٢٦٥، ٢٦٤، ٢٦٣، ٢٦٢، ٢٦١

٢٦٦، ٢٦٥، ٢٦٤، ٢٦٣، ٢٦٢، ٢٦١

٢٦٦، ٢٦٥، ٢٦٤، ٢٦٣، ٢٦٢، ٢٦١

٢٦٦، ٢٦٥، ٢٦٤، ٢٦٣، ٢٦٢، ٢٦١

عمر بن عبد الله بن عبد الله ٢٠١ هـ ٢١٠ هـ ٢٢٠ هـ ٢٣٠ هـ ٢٤٠ هـ ٢٥٠ هـ

فضل بن عباس بن عبدالمطلب ١٨ هـ ١٢٢
 فضل بن موسى ١٩٢ هـ ٢٢٢
 فضل بن عياض ١٨٤ هـ ٢٢٢ ٢٢٦ ٢٤٦
 فضيل بن عياض ٢٥٩
 فضيل بن عينية ٢٣٢
 فيروز آبادي مجد الدين ١٨١ ١٤٩ ١٥٥
 فلاس ٢٥٩
 فيض الله آفندي ٢٠١
 فواد داکتر ٢٠١

ق

قاسم المطرز ٤٢٨
 قاسم زين الدين حافظ ٨٤٩ هـ ١٣٩١ ١٣٩٢
 قاسم بن اصبح ٢٤٨ ١٣٤٨ ١٣٦٦
 قاسم بن الحكم العرفي ٢٦٥
 قاسم بن عبد الرحمن ١٢١٣ ١٢١٦
 قاسم بن سلام ٤٣١
 القاسم بن محمد ١١٩٨ ١٢٢٢ ١٢٢٥ ١٢٢٦ ١٢٢٩
 ٢٥٠ ٣٥٩ ٢٦٠ ٢٦١ ٢٦٢ ٢٦٥
 ٣٢٤ ٢٢٢ ٥٦٠
 القاسم بن عارون ابو محمد ٢٦٦ ٢٦٦
 القاسم بن فخمير ابو عروه ١٩٢ ٢١٣
 القاسم بن محسن ١٤٥ هـ ١٩٢ ٢٩٥ ١٢٢٢ ١٢٢٣
 ٤٣١
 قاسم جمال الدين ٥٣١ ١٢٢٢ ١٢٢٣
 قبيصة بن عقيب ابو عامر ١٩٥ ١٢٢٢ ٢٥٥

عوف اعدالي ٢٢٢
 العبدروس، عبد القادر ١٢١
 عياض قاضي ابو الفضل ٥٢٢ هـ ١٨٤ ١٢٢٩
 ٢٦٣ ٥٥١
 حضرت عيسى عليه السلام ٣٢
 عيسى بن احمد البرسيكي ٢٦٨ هـ ٣١١
 عيسى بن ابان ٦٠٢ ٦٠٣ ٦٤١ ٦٨٠ ٦٨١
 عيسى بن يونس السبيعي حافظ ابو عمرو ١٨٤ هـ ١٩٢
 عيسى بن موسى ابو احمد ١٨٦ هـ ١٣٤ ١٤٢
 عيسى مغربي جعفري محدث ١٠٨٠ ٣٨٨
 عيسى بدر الدين حافظ ابو محمد محمود بن احمد ٨٥٥ هـ
 ١٣٩ ١٣٠ ٣٣٠ ٣٥٨ ٣٤٤

ع

عزالي، امام ابو حامد محمد بن محمد ٥٠٥ هـ ٦٤٩ ١٢٩١
 ٥٦٠ ١٦٦ ١٢٤٤
 عثمان بن محمد البرسيكي ٣٦٢
 غيدان بن سلمه الثقفي ٦٩١

ف

فتح بن عمر ٦٩١
 الفتح بن ابي علوان ١٦٣
 فضاله بن عبدة الانصاري ابو محمد ٥٣ هـ ٢١١
 الفريابي ٥٣٤ ٤٤٩
 الفضل بن سهل ابو عبد الله ذو الرياستين ٢٠٢ هـ
 ٦٩١ ٢٥١
 الفضل بن وكيان ابو النعيم عمرو بن حماد ٢١٦ هـ ١٣١ ٣٠٠

محمد بن العلاء بن کریب الهمدانی ۲۲۸ هـ ۱۹۵، ۲۲۲
 محمد بن علی الصائغ ۳۶۱
 محمد بن علی الواسطی ۲۶۵
 محمد بن علی بن طرخان ۳۱۱
 محمد بن علی، ابوالحسن شمس الدین حافظ ۳۸۳، ۳۹۸
 محمد بن هادی شیخ، ابوعبدالله ۳۵۴
 محمد بن عمر رازی ابوبکر ۴۲۶
 محمد بن عمر قاضی ۳۸۱
 محمد بن عیسیٰ ۶۹۵
 محمد بن فضل ۱۹۵، ۲۴۴
 محمد بن الفضل ۴۲۲
 محمد بن قاسم ۱۴۶
 محمد بن کعب قرظی ۴۳۹، ۴۴۴
 محمد بن المثنیٰ ۶۲۳، ۶۸۶
 محمد بن محاده ۱۴۲
 محمد بن قیس ۳۱۰
 محمد بن محمد نیشاپوری ۲۸۰ هـ ۴۹۶
 محمد بن المبارک القرشی ۳۹۸
 محمد بن محمد ابوالنضر ۳۵۵
 محمد بن مخزوم ۲۶۵
 محمد بن مخلد، ابوعبدالله حافظ ۲۶۶، ۳۴۵
 محمد بن مزاحم، ابوصاحب مروزی ۳۵۵، ۳۵۶
 محمد بن المیفره ۲۶۴، ۳۵۶
 محمد بن منقار ۱۶۳
 محمد بن المنکدر، ابوعبدالله ۲۶۴ هـ ۴۲۴، ۲۶۵ هـ ۳۹۹

محمد بن موسیٰ ابوبکر الحارثی ۳۶۶، ۴۱۸
 محمد بن نصر مروزی ۴۰۳
 محمد بن یارول الحضری، ابوعامر ۳۰۵
 محمد بن یزید ۱۶۳
 محمد بن یعقوب ۳۵۳
 محمد بن یوسف الصالحی شافعی ۲۸۰، ۲۹۹، ۴۴۴
 محمد بن یوسف الغریبی ۲۴۴، ۲۶۴
 محمد بن یوسف غریابی ۲۱۲ هـ ۴۳۱
 محمد سعید علامه ۳۶۰
 محمد المهدی، عباسی، محمد بن ابی جعفر المنصور ۱۶۹ هـ
 ۳۶۸، ۳۶۶
 محمد یوسف، ڈاکٹر ۴۴۱، ۶۶۹
 محمد موسیٰ مولانا ۴۴۱
 محمود بن الرزیح ۱۸۴
 محمد بن یحییٰ زینی ۸۵، ۴۲۸
 محمود بن عیسیٰ ۲۰۸، ۴۸۶، ۴۸۴، ۵۳۴
 محی الدین ابن الجوزی ۳۰۰
 مرداس اسلمی ۲۸۲
 مرداس بن مالک ۱۹۳
 المرزبانی ۶۶۹
 مرغینانی امام ۱۵۴
 مردان بن معادیہ ۱۹۵
 مروزی، محمد بن نصر، امام ۳۵۵، ۶۰۹، ۶۱۴
 ۴۲۸، ۴۲۹
 مردان الغزالی ۳۱۴

موسی بن جبال، العبدی ۲۵۱

موسی، محمد یوسف ڈاکٹر

مہاجر ۲۱۲

المویدین محمد بن علی الطوسی البواکین ۱۳۱ھ

الموفق امام ۲۲۴، ۲۲۸، ۲۲۹

میر سید شریف

المیدونی ۳۸۶

میمون بن مهران، قاضی ۶۱۵، ۳۳۵

ن

نابلس، عبدالغنی بن اسماعیل ۱۱۳ھ ۴۵۱

نافع، امام، ابو عبد اللہ العدوی مولیٰ ابن عمر ۱۱۸ھ

۱۹۵، ۱۳۰، ۱۹۸، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۵۲، ۲۵۳

۲۵۴، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۹۵، ۳۰۷

۳۰۹، ۳۳۵، ۳۹۶، ۵۱۲، ۵۱۶، ۶۹۵

نافع بن جبر بن مطعم ۱۸۹، ۲۳۶، ۲۶۵

نافع بن عبد الرحمن البوردیم ۱۶۱ھ

نبیط ۱۸۳

النجاد ۷۲۸

سجیب ۳۸۶

نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم اللیشی مدنی ۱۶۱ھ ۶۳

سخفی، ابراہیم، امام ۹۵ھ ۱۹۴، ۱۹۶، ۱۹۸

۲۰۰، ۲۰۵، ۲۱۴، ۲۰۷، ۲۱۲، ۲۱۶، ۲۵۸

۲۵۹، ۲۶۰، ۲۸۸، ۳۱۴، ۳۲۱، ۴۱۶

۴۱۶، ۵۰۹، ۵۰۷، ۵۰۵، ۵۰۳، ۵۰۲، ۵۰۱، ۵۱۶

۵۵۲، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۱۳، ۶۱۶، ۶۳۲

نسائی، امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب ۳۰۳ھ

۱۹۱، ۲۰۸، ۲۱۱، ۲۳۸، ۲۶۲، ۲۶۷، ۲۸۶

۳۱۴، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۸۲، ۳۸۵، ۴۵۹

۴۶۳، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۸۹

۴۹۳، ۴۹۴، ۵۱۱، ۵۲۵، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۸۹

۶۲۳، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۹، ۶۳۲، ۶۸۲

۶۱۲، ۶۱۹، ۶۲۵، ۶۲۷، ۶۲۹

نسفی، نجم الدین محمد نسفی ۶۷۱

نصر بن سعد ۲۷۷

نصر بن سیار بن صاعد البواضیع ۵۷۳ھ

نصر بن عبد الحکیم ۱۶۹ھ ۲۲۲

نصر بن علی الازدی حافظ ابو عمر البصری ۲۵۰ھ ۷۱۲

نصیر بن یحییٰ ۱۶۳

نضر بن انس ۱۸۲

نضر بن شعیب البواکین ۲۰۳ھ ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳

نضر بن محمد مروزی، امام ۱۸۳ھ ۲۷۷، ۲۷۸

نضیح بن الحارث ۱۹۳

نظام، ابراہیم بن سیار ۶۶۸، ۶۶۹

نعمان بن بشیر ۵۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۱۹، ۱۲۱

نعمان بن مرزبان ۱۲۳

نعمان بن معترن ۱۹۳

نعیم بن حماد خزاعی ۲۲۶ھ ۴۲۹، ۴۳۲، ۴۳۳

نعیم بن الطوسی ۲۹۰ھ ۴۳۱

نعیم بن حماد ۷۰۶

نعیم بن عمرو ۱۵۴

حضرت نوح علیه السلام ۱۳۲

نوح بن دراج ۱۱۶ ۶۲۲

نور الدین ۱۷۸

نوح بن مریم ابو عیسیٰ ۶۸۸ ۱۲۲

نوروی، امام ابو ترکیا محی الدین سیحی بن شرف ۶۷۶

۹۵ ۱۲۲ ۱۲۸ ۱۲۹ ۱۳۵ ۱۳۹

۱۱۱ ۱۸۱ ۳۰۳ ۴۴۴ ۲۶۶ ۲۷۶ ۳۸۳

۲۹۸ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۱۸ ۳۳۳ ۳۵۱

۴۴۸ ۴۵۵ ۴۵۷ ۴۶۱ ۴۶۳ ۴۶۸ ۴۷۳

۴۷۸ ۴۹۰ ۴۹۷ ۵۰۸ ۵۱۹ ۵۲۲ ۵۲۶

۵۴۷ ۵۴۸ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۹ ۵۶۱

۵۶۵ ۵۷۴ ۶۵۱ ۶۶۱ ۶۵۹ ۶۶۶

منادین اسیری ۴۸۶ ۲۹۵ ۲۸۶

المنفی، علی بن احمد ۳۰۵

و

وائله بن اسفنج ۶۵۸ ۳۰۵

وائل بن حجر ۶۲۶ ۶۲۶ ۶۲۶

الواسطی، خالد ۳۶۱

واصل بن داود ۲۶۴

واقفی ابو عبد الله محمد بن عمر بن واقد ۲۰۴ ۱۹۳

الوحشی، ابو علی ۳۸۴

وراق ۶۹۱ ۲۹۱

ورقان بن عمر ۱۹۴

وزیر بن عبد الله ۲۲۶

وکیع بن الجراح طبع بن علی امام البوسفیان ۱۹۶

وکیع بن الجراح ۱۹۶ ۱۳۰ ۱۹۵ ۱۹۹ ۲۰۸

۲۲۵ ۲۴۰ ۳۵۸ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۳

۳۰۳ ۴۰۸ ۴۱۶ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۳۸ ۴۴۷

۴۸۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۳۶ ۵۴۸ ۵۴۸

۶۹۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷

۷۱۸ ۷۳۰ ۷۳۶ ۷۳۹ ۷۳۰

ولی الدین العراقي حافظ البوزرعه احمد بن عبد الرحیم ۸۲۶

۱۳۹ ۱۴۸

ولید بن کثیر ۵۱۳

ولید بن عبد الملك بن مروان ۱۲۶ ۱۲۵ ۱۲۶

ولید بن مسلم القرشی ابو العباس الدمشقی ۲۲۲

ولید بن یزید ۲۲۹ ۲۶۳

وصب بن عبد الله ۱۹۳

وصب بن منبیه ۱۴۲ ۱۴۳ ۳۹۹

۵

بارون الرشید، عباسی ابو جعفر بن محمد المهدی العباسی ۱۹۳

۲۳۳ ۳۶۴ ۳۹۶ ۴۱۸ ۴۲۰

البردی شیخ الاسلام ۷۳۰

باشم بن عتبه بن ابی وقاص ۲۶۴

باشم پیتر طنس، ڈاکٹر ۱۶۲

باشم بن حسان ۲۷۵

باشم بن عبد الملك ۲۵۹ ۲۴۰

باشم بن عروہ بن الزبیر ابو المنذر ۱۴۲

۲۶۴ ۲۶۸ ۲۹۵ ۳۹۹ ۴۱۷ ۴۵۰ ۴۵۴

۷۲۳ ۷۰۸

